جنوری تا دسمبر ۱۹۳۴

مجلد ۲۲ اشاعتیں جس میں ہے

رجسٹرڈ نمبر اے ۷۸۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# الناظر

ایڈیٹر: ظفر الملک علوی

| جلد ۲۶ | ماہ فروری سنہ ۱۹۲۴ء | نمبر ۱۵۲ |
|---|---|---|

فہرست مضامین



الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر و پبلشر: محمد اسحاق علی علوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# الناظر

نمبر ۱۵۲ جلد ۲۶ ماہ فروری سنہ ۱۹۲۴ء

## حدیث دیگران

(۱)

ایک فاضل و محترم بزرگ تحریر فرماتے ہین :-

"اہل حجاز کے اخلاق کی بابت جو بحث چھیڑی گئی ہو اُس سے عبرت ہوئی شریعت نے زنا کی شہادت کا نصاب چار عادل گواہ مقرر کیا ہی - یہ ایک شخص کے لیے ہو، ایک گروہ اور ایک ملک کے لئے کتنے گواہ ہونے چاہئیں - شہادت بھی وہ جو عین حالت ارتکاب کا مشاہدہ بیان کرے - کالمیل فی المکحلۃ - مسلم ہو کہ یہ شہادت آپ کے سامنے پیش نہین ہوئی ہو، خود ذات گرامی کا نسخۂ اصلاح سے مکمل ہو چکا - الناظر اہل ہند کے اخلاق کا معیار بلند کر چکا اس سے فارغ ہو کر اب حجاز کی باری ہو

بیا کہ نوبت شیراز دو دقت تبریز ست

الناظر مین دو چار مضمون چھپنے سے اصلاح تو معلوم البتہ یہ نتیجہ نقد الوقت ہو کہ آریہ فتنۂ ارتداد مین اس سے کام لین گے عیسائیون اور ہندوؤن سب کے کام آے گا سُست عقیدہ مسلمان بھی مستفید ہون گے -

طریقۂ اصلاح تو یہ تھا کہ آپ اُس سرزمین مین قیام فرماتے خلوص و خیر خواہی کے ساتھ عمر وہان بسر کر کے نصیحت کرتے اور فضل ربانی سے نتیجے کے امید وار رہتے -

قرب مکہ کا احساس اس سے ہوا کہ بھیک مانگنے والے لڑکے نظر آنے لگے اُس بُقعۂ پاک کے قرب کو تو قلوب نے

اُن تجلیات سے محروم کیا ہے جو اُس کو گھیرے ہوئے ہیں۔ اگر تجلیات سے دل منور نہ ہو تو کم از کم پاس ادب اور احترام تو واجب ہے۔ ارض مکہ تجلیات جلال کا مظہر ہے غیرت ربانی سے پناہ مانگنی چاہیے۔

مناسب یہ ہوگا کہ مضامین کا سلسلہ جاری رکھنے سے پہلے جن عالم ربانی سے آپ کو عقیدت ہو اُن کے سامنے پیش کر کے رائے حاصل کر لیجیے۔ جناب مولوی عین القضاۃ صاحب جناب مولوی سید محمد علی صاحب مونگیری جناب مولوی انور شاہ صاحب دیوبندی ہر آئینہ اس پایہ کے عالم ہیں کہ ان پر عقیدہ اطمینان کرے۔"

تحریر بالا اگرچہ محض "خانگی و ذاتی" تھی اور اس کی یہ حیثیت دو واضح لکیروں کے ذریعہ خاص طور پر نمایاں کر دی گئی تھی۔ مگر معاملہ کی اہمیت کے لحاظ سے ضروری ہے کہ ان خیالات کی اشاعت کر دی جائے فاضل موصوف مطمئن رہیں کہ جس صورت میں یہ تحریر شائع ہو رہی ہے اس میں اُن کا مقصد دلی فوت نہ ہوگا۔

(۲)

عبد الباطن صاحب عتیقی جونپوری نے "ظنوا المومنین خیراً" کے عنوان سے طولانی تحریر ارسال فرمائی ہے جس کے ضروری اقتباسات بجنسہ درج ذیل ہیں:۔

"مجھے اس مضمون کو دیکھ کر نہایت رنج ہوا اور غالباً ہر مسلمان کو جن کے دل میں حرمین شریفین کی وقعت اور ہمسایہ بیت اللہ شریف کی عظمت ہے ضرور صدمہ ہوگا۔ اس لیے کہ آپ نے جہاں تک ہو سکا اہل مکہ کے مسموعی ذمائم و عیوب شائع کرنے میں توقف نہیں کیا۔ اور بھولے بھالے مسلمان بھائیوں کے دلوں کو جس میں ارض مقدس اور دار الاسلام کی قدر و منزلت تھی پژمردہ کرنے میں کمی نہیں کی۔ میں آپ کے مضمون کو پڑھتا جاتا تھا اور آپ کے تحریر کردہ عیوب پر میرا خون فرط غیظ سے جوش مارتا تھا۔ کہ آپ کیا دنیا میں کسی فرد بشر کی یہ مجال نہیں ہے کہ اُس گھر کے رہنے والوں کے عیوب کو بر سر بازار بیان کرے اور ان کی تحقیر و تذلیل کے درپے ہو۔ اُسی ارض مقدس اور اُسی پیاری قوم کی ایک اعلیٰ اور بڑی ہستی ہم لوگوں کی ہادی اور ظلمۃ ضلالت سے نور ہدایت کی طرف لانے والی ہوئی۔ کیا عربوں کو اس کا فخر و شرف حاصل نہیں ہے . . . . . . جناب نے ان سب محاسن کو کیوں بھلا دیا اور مذمومات کو جو صرف سُنی سُنائی ہے اس قدر رلے اڑے۔ کیا خوب کسی نے زمانہ کی حالت بیان کی ہے:

ستم ہے لاکھ نگاہیں پڑیں جو ہو اک عیب ہنر ہو لاکھ تو اُن پر نظر کسی کو نہ ہو

. . . . . . کرمفرما بالفرض اگر جناب کو اہل مکہ کی اصلاح منظور تھی تو بجائے اس ہجو نامے کے خود وہاں جا کر خواہ تقریر سے ہو تحریر سے ہو ہر ممکن صورت سے اُن کی اصلاح کرتے اور ہر صورت میں اُن کی نیک نامی ملحوظ خاطر

رکھنے اور اس پہلو سے گریز کرتے جو ان کی بدنامی کا باعث ہو لیکن یہ طریقۂ ہدایت جو آپ نے اختیار کیا ہے یعنی اشتہار بازی ہرگز اصلاح کی صورت نہیں ہے بلکہ اہل مکہ کو بدنام اور اہل ہند کو بدگمان کرنے کے اچھے خاصے اسباب ہیں ۔ ابھی آپ اہل مکہ کی ہدایت کی طرف نہ جائیے ۔ بلکہ آپ پہلے اپنے لکھنؤ کی خبر لیجئے اور اصلاح کیجیے کہ وہ اس وقت اغلام بازی کا مرکز اور زناکاری کا مخزن اور جملہ فاحشات کا معدن ہو رہا ہے ۔ مجھے معاف کیجیے گا پہلے گھر کی خبر لیجیے پھر غیر کو سمجھائیے گا ۔ خود را فضیحت دیگرے را نصیحت کے مصداق نہ بنیئے . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

آپ نے اپنی تحریر میں اہل مکہ کی غیبت کی یا ان پر بہتان باندھا یعنی اگر آپ کی تحریر واقعات کے خلاف ہے تو یہ بہتان ہے اور اگر سچی ہے تو غیبت ہے ۔ (آگے غیبت اور بہتان کے متعلق حدیثیں منقول ہیں ) . . . . . .

خدا نے آپ کو اپنے گھر کی اگر خوش قسمتی سے سیر کرائی تھی تو آپ کی مضمون نگاری کے لیے اس پہلو کے علاوہ بھی میدان کشادہ تھا یعنی وہاں کے عاسن (محاسن) حج و ثواب طواف کی تفصیلات زیارت گاہوں کے فضائل وغیرہ بیان کرتے نہ یہ کہ اہل مکہ ہی کو چھیڑنا شروع کیا اور انھیں کی خبر لی ۔ سبحان اللہ ۔ یہ تو بتلائیے کہ دیگر اقوام پر آپ کے اس مضمون کا کیا اثر پڑے گا اور وہ اہل مکہ اور لواطت زنا شراب کو کس نگاہ سے دیکھیں گے ۔ کیا وہ ہماری ہی طرح اس خبر کو تحتمل الصدق والکذب پر محمول کریں گے ہرگز نہیں بلکہ وہ ایک تازہ حاجی سے یہ خبر سن کر دلوں سے اسلامی شان اور مسلمانوں کے قبلہ و کعبہ کی عظمت جو ان کے قلوب پر نقش کالحجر تھی مٹا دیں گے ۔

مکرمی ۔ اگر آپ حب العرب من الایمان کے جملہ کو نہیں بھولے ہیں تو کیا محبت کے یہی معنی ہیں کہ محبوب کے عیبوں کو اور ان کی شکایتوں کو غیروں سے بیان کیجیے بلکہ ان سے خود اس عیب کو ظاہر کر کے ان کی اصلاح کی حتی المقدور کوشش کرنی چاہیے ۔

مجھے ان سنی ہوئی باتوں پر ہرگز یقین ہی نہیں ہے کہ ایسے فاحشات کا ارتکاب اہل مکہ سے ہوا اور اس خیر البلد میں زناکاری اغلام بازی شراب خواری کا بازار گرم ہو جس کے بارہ میں خود حضور مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں ۔ حدیث عن عبد اللہ بن عدی بن الحمراء رضی اللہ عنہ ۔ انہ سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو واقف علی راحلتہ بمکتہ یقول واللہ انک لخیر ارض اللہ واحب ارض اللہ الی اللہ ولولا انی اخرجت منک ما خرجت رواہ الترمذی والنسائی ۔ جب مکہ معظمہ کو خیر الارض تسلیم کر لیا جائے تو ایسے مقام پر شر ضرور منافی ہوگا ۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا بھی یہی اعتقاد ہوگا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں سب سچوں سے بڑھکر سچے تھے اور اس ثقہ بزرگ سے بھی جنھوں نے ان فواحش کی خبر جناب کو دی ہے حضور

صلی اللہ علیہ وسلم بالاتر صادق الخبر تھے۔ اب مین کہتا ہون کہ جس ارض مقدس کے بارہ مین ارشاد ہو خیر الارض وہان فاحشات مذکورہ بالکل نسبت تضاد رکھتے ہین۔ اگر ایسی جگہ پر شرار و شریر لوگ پائے جائین تو پھر خیر کس بات کا اور اُس زمین کی خوبی کس بات کی۔ دوسرے یہ بھی حدیث ہی کی خبر ہے کہ قیامت تک حرمین شریفین مین دین اسلام رہے گا۔ ایسے اسلامی شہرین اور مذہبی مسکن مین شراب نوشی اور دیگر افعال قبیحہ بعید از فہم و دور از ادراک ہے۔

گذارش یہ ہے کہ ایسی خبرین جن کی تصدیق و تشہیر شرعاً ممنوع ہے انواہ و کذب ہی پر محل کرنا بہتر ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احادیث و اقوال کی تاویل کرنے سے بہتر ہے کہ آپ اس ثقہ مخبر کے قول اور خبر کی تاویل کرنے مین مصروف ہو جائیے تاکہ حدیث ظنوا المومنین خیراً پر پوری طرح سے عمل ہو جائے۔"

× × × × × × × × × × × × × × × × × ×

( ۳ )

ایک محترم کرمفرما جو فاضل و ادیب ہونے کے علاوہ سلسلۂ مشائخ سے بھی تعلق رکھتے ہین اپنے گرامی نامہ مین رقم فرماتے ہین :-

" نومبر و دسمبر کا الناظر پہونچ گیا۔ آپ کے رقم زدہ واقعات اہل عرب کے متعلق جن بزرگ نے نامقبول خانہ فرسائی کی ہے ہفوات و فضولیات سے زیادہ نہیں۔ آپ کے جواب پڑھنے سے پہلے ایک خاص جوش پیدا ہوا اور ارادہ کیا کہ اب سے ۳۰ برس پہلے کے واقعات چشم دید دکھاؤن اور ان کو چیلنج دون کہ اگر ان مین شک ہو تو پھر تکلیف سفر عرب اُٹھائین اور بامعان نظر مین سرسری او رگذران دیکھین لیکن آپ کے جواب کو پڑھ کر وہ جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ اور بیکار باسی کڑھی مین اُبال لانے کی کوشش ملتوی کرنی پڑی کہ بہرحال اس پردہ دری مین شماتت اعدا کی تکلیف ضرور ہے"

میرے عریضہ کے جواب مین صاحب موصوف نے تازہ گرامی نامہ مین وعدہ فرمایا ہے کہ

" ذرا فرصت ہوئے تو حجاز کے متعلق انبیر خوت لوتہ لام ضرور لکھون گا "

( ۴ )

شمس العلما مولوی سید محمد امین صاحب کا ایک طویل مضمون اودھ اخبار مورخہ ۹ رجنوری ۲۴ء مین شایع ہوا ہے اُسی مین فرماتے ہین :-

" راقم مضمون نے جو حالات مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے لوگون کے لکھے ہین وہ صحیح ہین۔ مجھے ذاتی طور پر ان امور کا

علم ہو اور افسوس زیادہ اس امر کا ہو کہ اب تک کہ میرے سفر کو تقریباً ۴۵ سال کا زمانہ گذر چکا کوئی اصلاح ان امور مین نہیین ہوئی۔ بلکہ شاید معاملہ برعکس ہو۔ راقم مضمون نے زیادہ تر اعتراضات اہل مکہ پر کیے ہین اور یہ ام بھی واقعہ

( ۵ )

جناب مولوی عبد الباری صاحب کی ایک تحریر اخبار ہمدم مورخہ ۱۶ فروری ۲۶ء مین شایع ہوئی ہو جسمین لکھا گیا ہو:۔

. . . . . . " ایک سلسلہ مضامین کا الناظر مین احوال مکہ مین نکلنا شروع ہوا ہو اس کا وہ حصہ جسمین اہالی مکہ کی اخلاقی کمزوریان بتائی گئی ہین نہایت دلخراش ہو اور فطرتاً اسکے دیکھنے سے اہل مکہ کو غصہ آتا ہو بلکہ ہر مسلم کے جذبات کو صدمہ ہوتا ہو کہ کے لوگ معصوم نہیین ہین۔ مگر جسقدر انھون نے لکھا وہ بھی قرینِ عقل نہیین ہو اور اس مقتدر کے قول پر انھون نے اپنی معلومات کی بنا قائم کی ہو وہ نا اہل غیر معتبر ہو اور اس نے یقیناً غلط بیانی کی ہو۔ بانی ظفر الملک باوجود استفسار حق گوئی کے اس کے نام کو بتا نہین سکتے۔ اس خوف سے کہ طرح طرح کے مصائب حتی کہ قتل ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ یہ کہا جا سکتا ہو کہ یا وہ فرضی ہو یا وہ جھوٹا ہو یا وہ خود مرتکب ہو یا کمزور ہو کہ جسکو حب وطن وحب جان اس درجہ ہو کہ وہ شہادت حق دینے سے جی چراتا ہو اگر صاحب اس کو ہوتے ثواب پاتے۔ اگر قتل کیا جاتا شہید ہوتا۔ اگر وہ اس قدر کمزور تھا تو اس کو غیبت اور ہتک حرمت اہل اسلام سے اجتناب لازم تھا . . . . . . اس مضمون مین صاف صاف اہل مکہ کے اکثر حصہ کو زنا و لواطت سے متہم کیا گیا ہو جو قذف کی حد تک پہونچتا ہو اور ہر اہل مکہ کو حق ہو کہ اس کا مطالبہ کرے کا شکلے ہی نادر پیدا اتفاق کی حد تک کہ کسی نے خبر دی تو حد قذف کا موجب نہ رہتا۔ اسمین تو بغیر شمال کے وقوع ثابت کیا گیا ہو"

## میرے معروضات

جو اصحاب میری تحریر سے ناراضی کا اظہار فرما رہے ہین ان سے شکایت نہین کرسکتا کیونکہ عقیدہ ومحبت کے غلبہ مین اکثر اصلاحی کوششون کا یہی حشر ہوا ہو۔ البتہ جو بحث مذہبی نقطۂ نظر سے میرے بیانات کے جواز و عدم جواز پر کی جاتی ہو وہ ضرور قابل لحاظ ہو۔ اگرچہ ذاتی طور پر ابتک مین اس بات کا قائل نہیین ہون کہ بغیر کسی شخص کو متعین کیے ہوے کسی شہر یا ملک کے عام حالات بیان کرنے کیلیے شرع کے مطابق شہادت پیش کرنا ضروری ہو لیکن جبکہ اہل علم مین سے بعض افراد کا خیال یہی ہو تو اس کی تحقیق ہو جانا چاہیے۔ اور جن حضرات کے فتاوی پر مین اعتماد رکھتا ہون مین ان سے مشورہ کر رہا ہون۔

انشاء اللہ آئندہ پرچہ مین اُن کی آرا سے مطلع کرسکون گا اور اگر احکام شرعیہ کی کوئی خلاف ورزی نادانستگی مین مجھ سے ہوگئی ہے تو مین اُس کا اقرار و اعتراف کرکے اظہار ندامت مین دریغ نہ کرون گا۔ اس لیے کہ احکام شرعیہ کے مقابلہ مین مین اپنی راے کو ہیچ جانتا ہون۔

تمام واقعات نگاری کی بحث اس سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ اور اگرچہ مین دیگر کثیر التعداد ارباب راے کی اصابت پر کوئی حرف گیری نہین کرسکتا۔ لیکن پھر بھی جب کبھی مجھے اپنی راے پر اطمینان ہوتا ہے تو مین اس کا اظہار ضروری جانتا ہون۔ اس بارہ مین ہر قسم کی رائین موجود ہین جو لوگ اس مضمون سے ناخوش ہین اُن کے خیالات کے نمونے اور جو اصحاب واقعات کو صحیح یا غلط قرار دیتے ہین اُن کی تحریرین اوپر گذر چکی ہین لیکن بہت سے ایسے اصحاب بھی ہین جو واقعات کی صحت و عدم صحت کی بحث مین پڑنا نہین چاہتے بلکہ میری تحریر کو خلاف مصلحت جانتے ہین۔ بعض عبارت کی درشتی پر معترض ہین۔ انداز تحریر کی درشتی کا مین معترف ہون مگر شاید یہ ایسی کمزوری ہے جو ہر زبان کے مباحثات مین کم و بیش نظر آئے گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ کہین یہ انداز پسندیدہ قرار دیا جاتا ہے اور کہین قابل گرفت۔ ہندوستان کے اخبار نویسون اور اہل قلم حضرات مین شاید کوئی بھی مجھ سے زیادہ عدم تشدد کا پابند ہوگا مگر ان کی بعض تحریرون کو بھی کم سے کم ایک جماعت درشت و ناملائم کہتی ہے اس لیے سمجھنا چاہیے کہ یہ کوئی نئی بات نہین اور معترض کی یہ حیثیت قابل معافی ہے۔

اب رہا مصلحت کا سوال تو اس بارہ مین رایون کا اختلاف بالکل قدرتی ہے۔ تاہم میرے دو جناب جن کی رایون کو مین حد درجہ وقیع مانتا اور تا امکان اُن کے مشورون پر عمل کرنا اپنے لیے باعث افتخار جانتا ہون، اگر کوئی صورت ایسی تجویز فرمائین گے جس سے میرے اور اُن کے متحدہ مقصد اصلاح کی صورت پیدا ہو اور ساتھ ہی ساتھ میری تحریر سے جو برافروختگی پیدا ہوگئی ہے وہ رفع ہو جائے تو مین یقیناً اُن کے مشورون پر کاربند ہونے کو اپنے لیے باعث سعادت جانون گا۔ اس لیے کہ میرا مقصد تحریر کسی کی دل آزاری یا اتحاد اسلامی اور مفاد قومی کو کسی نہج سے بھی نقصان پہونچانا نہ تھا۔ اور اگر خدانخواستہ اس قسم کے نتائج مرتب ہون یا مدبرین قوم کی راے مین اس کا قوی احتمال ہو تو یقیناً خود مجھکو اس کا بہت افسوس ہوگا اور مین یہ سمجھکر ساکت ہوجاؤن گا کہ

گفتن آن نہ ہوشیاری نیست        لیک دانستن اختیاری نیست

گو مصرعۂ اولی کی پابندی سے اب تک مین ہمیشہ قاصر رہا ہون۔

ظفر الملک

# رباعیات

(از منشی محمد مبین نازش بدایونی)

ہے شیوۂ دلفریب شاہانِ مجاز — سرمستِ مئے شوق ہین یارانِ مجاز
انوارِ حقیقت ہین اسی پردہ مین — دیرِ صنم آرا ہی شبستانِ مجاز

---

حیرت آباد ہی خیالِ عنقا — ہو روح کا ادراک مثالِ عنقا
اوجِ پرواز سے نہ ہو کچھ حاصل — ہون وہم و قیاس نقشِ بالِ عنقا

---

اے دل نہ تڑپ تو صورتِ بلبلِ زار — فانی ہی حسنِ خوبرویان کی بہار
جس پھول مین بو نہ ہو وہ ہی ننگِ چمن — جس نخل مین پھل نہ آوین وہ ہی بیکار

---

اچھی کبھی جذبات بُرے ہوتے ہین — کیا مے سے خیالات بُرے ہوتے ہین
پگڑی کو سنبھالے سرِ منبر واعظ — رندانِ خرابات بُرے ہوتے ہین

---

نیرنگِ فریب ہی کہ ہی بزمِ جہان — انفاس کی زیب ہی کہ ہی وہم و گمان
آثارِ وجود ہین کہ ہین نقشِ فنا — ہستی کی نمود ہی کہ ہی خوابِ گران

---

ہی خوبیٔ اجسام پہ مخلوق کو ناز — حیرت کدۂ خاک ہی سربستۂ راز
چلتا ہوا ساغر ہی کرشمہ گرِ مے — ڈھلتے ہوئے قالب مین ہی پنہان اعجاز

---

یہ شمعِ خرابات کے پروانے ہین — بحثِ حرم و دیر سے بیگانے ہین
سلجھے ہوئے ہین کیون نہ خدا کو مانین — کیا رندِ شراب خوار دیوانے ہین

## رباعیات

جب ہاتھ مین جام پُر فضا آتا ہی
پھر آبِ حیات کا مزا آتا ہی
ٹوٹے ہوئے خم ہین یادگارِ عشرت
میخانہ قدیم سے چلا آتا ہی

---

کھلتے ہین رازِ بادہ پیمائی مین
لذت ہی خرابات کی رُسوائی مین
آنکھین ہون تو رندون مین خدا کو دیکھے
زاہد نہ چھپے گوشۂ تنہائی مین

---

ہر وقت دلِ رشکِ زہد نازش کا اسیر
پیری مین ہر رندانِ خرابات کا پیر
مائل نہین ضعف مین بھی توبہ کی طرف
وہ شے جسے عقل و فہم کہتی ہی [illegible]

---

یارانِ عدم نہ ہون جُدائی سے ملول
لالہ زارِ جہان کی حسرت ہی فضول
ہم کو نیرنگیان ہین بالاے زمین
سنبل مین شکن ہی چاک دامن مین پھول

---

ضعفِ پیری کی سحر سازی ہی ستم
جی ہارتے ہین جوان یہ بازی ہی ستم
گر پڑ کے اٹھین وہ تو چھٹے ہاتھ سے جام
رندون کو حیات کی درازی ہی ستم

---

چشمِ مغرب ہی حُسنِ زیبا کی طرف
مشرق کی نظر بامِ خود آرا کی طرف
اِس دور مین ہر قوم کو یہ دُھن ہی کہ وہ
پستی سے بڑھے عالمِ بالا کی طرف

---

ہین خسروِ کج کلاہ سرمشقِ عذاب
نشہ ہی غرور کا نہ ہین عیش کے خواب
ہی خاک سے آلودہ کفنِ مرگ مین
اطلس ہی نہ پرنیان نہ تن پر کمخواب

---

دنیا مین ذلیل ہون کہ رسوا ہون مین
عقبیٰ مین بھی مایوسِ تمنّا ہون مین
ایسے ہونے سے تو نہ ہونا اچھا
کیون ہی مجھے ہونیکا گمان، کیا ہون مین

# سقراط

(۱)

گرچہ ہر قرنے سخن آیے بود  لیک گفت سابقان یارے بود

لِکُلِّ قَومٍ ھَادٍ - کیا اس سے کوئی انکار کرسکتا ہی؟ ہرگز نہین، اس جواب سے میری ہمت بندھتی ہی کہ سطور ذیل مین یونان کے ہادی اعظم کے کچھ حالات پیش کرون تاکہ اُس شخص کی اک دُھندلی سی تصویر آپ کے سامنے آجائے جس کا تیئیس[۲۳] چوبیس[۲۴] سو سال سے دنیا مین ڈنکا بج رہا ہی، اور کلام ربانی کی حقانیت ہویدا ہوسکے۔

ابھی حضرت مسیح علیہ السلام کو ظاہر ہونے کے لیے چار سو انہتر سال سے کچھ زیادہ باقی تھے کہ یونان کے شہر ایتھنس (Athens) مین ایک بُت تراش سفرونسکوس (Sophroniscus) کے گھر مین ایک لڑکا پیدا ہوتا ہی جس کے شان مین ڈلفی (Delphi) کی زبان غیب یہ اشارہ کرتی ہی کہ اس سے زیادہ دانشمند یونان مین نہین پیدا ہوا۔ اس عجیب وغریب لڑکے کے بچپن کا حال پردۂ خفا مین ہی۔ صحیح طور پر یہ نہین کہا جا سکتا کہ اسکے اخلاقی اور ذہنی ترقی کے اسباب کیا ہوے۔

اسی گمنامی مین اُسے تقریباً چالیس سال گذر جاتے ہین کہ محاصرۂ پوٹیڈیا (Potidaea) کا معرکہ پیش آتا ہی جسمین اُسکے جوہر کسی قدر ظاہر ہوتے ہین۔

سُقراط ظاہری شکل وصورت کے لحاظ سے کچھ وجیہہ نہ تھا۔ چھوٹا قد۔ موٹی گردن۔ جسم کسی قدر بلغمی آنکھین اُبھری ہوئی۔ ناک اوپر کو چپٹی دبی ہوئی اور نتھنے کشادہ۔ دہانہ بڑا۔ ہونٹھ بھدے۔ صورت دیکھنے سے ایک شہوت پرست احمق معلوم ہوتا تھا۔ مگر اندرونی صفات یہ بیان کیے گئے ہین۔ اسقدر پرہیزگار تھا کہ بغیر عقل سے استخارہ کیے کوئی کام نہین کرتا تھا۔ اس قدر انصاف پسند تھا کہ کبھی کسی شخص کو نقصان نہین پہونچایا۔ اسقدر اعتدال پسند تھا کہ امر حق پر کبھی عیش وراحت کو ترجیح نہین دی۔ اسقدر دانشمند تھا کہ حق وباطل کی تمیز مین اُس نے کبھی غلطی نہ کی۔

یہ زمانہ یونان کے بڑے صاحب کمال لوگوں کا گذرا ہے۔ سنہ ۵۰۰ قبل مسیح و سنہ ۴۰۰ ق م میں نظم، تاریخ، سنگ تراشی اور فن تعمیر میں ایسے ایسے لوگ گذرے ہیں جو آج تک مسلم الثبوت استاد مانے جاتے ہیں۔ سوفوکلیز (Sophocles) سنہ ۴۹۵ ق م میں پیدا ہوتا ہے۔ یوری پائیڈیز (Euripides) سنہ ۴۸۰ ق م میں پیدا ہوتا ہے اور سقراط سے سات سال قبل تقریباً سنہ ۴۰۶ ق م میں دونوں عالم جاودانی کا سفر اختیار کرتے ہیں۔ فی ڈیاس (Phidias) یونان کا مشہور بت تراش سنہ ۴۳۲ ق م میں اس عالم سے رخصت ہوتا ہے۔ پیری کلیز (Pericles) مشہور مدبر سنہ ۴۲۹ ق م میں وفات پاتا ہے۔ تھوسی ڈائیڈیز (Thucydides) مشہور مورخ سنہ ۴۷۱ ق م میں پیدا ہوتا ہے اور سنہ ۴۰۰ ق م و ۳۹۵ ق م کے مابین دنیا سے اٹھ جاتا ہے۔ اقطینوس (Ictinus) اپنے مشہور پارتھینان (Parthenon) کے بت کو سنہ ۴۳۸ ق م میں تکمیل کو پہنچاتا ہے۔ غرض یہ ایسا زمانہ تھا جس میں سقراط پیدا ہوتا ہے اور اپنا بچپن اور جوانی بسر کرتا ہے۔ خود اتھینز اس وقت ہر قسم کے صاحبان فن کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ یہاں رہنا ایک طرح کی تعلیم و تربیت گاہ میں رہنا تھا۔ سقراط خود کہتا ہے کہ اتھینز کے رہنے والے اپنی عقل اور قوت ذہن کے لحاظ سے بہت مشہور تھے۔ ملکی حکومت کی باگ ایک انجمن کے ہاتھ میں تھی جس کی رکنیت اتھینز (Athens) کے ہر باشندے کو حاصل تھی۔ اور اراکین کا اس انجمن میں حاضر ہونا قانوناً لازم کر دیا گیا تھا۔ یہ حکومت نہ تو کسی بادشاہ کی تھی اور نہ کسی مدبر کے ہاتھ [illegible] ذمہ داری کا کام [illegible] سلطنت اتھینز (Athens) پر خود اس شہر کے لوگ براہ راست حکومت کیا کرتے تھے۔ ہر باشندہ شہر قانونی بحثیں سنتا، ملکی انتظامات میں دخل دیتا تھا اور [illegible] مسائل کے طے کرنے میں حصہ لیا کرتا تھا۔ فریقین مقدمہ کی بحثیں سنا کرتا تھا جس سے اس کی ذہانت اور نظر میں وسعت پیدا ہوتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل اتھینز (Athens) کی جدت ذہن و ذکاوت کا معیار ایسا بلند ہو گیا کہ کسی دوسری سلطنت میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی تھی۔

یہ وہ حالات ہیں جن میں سقراط کی زندگی کے پچاس برس بسر ہوئے۔ زینوفن (Xenophon) کہتا ہے کہ وہ اکثر پراڈیکس (Prodicus) کی داستان ہرقل بیان کیا کرتا تھا اور حکمائے سلف جو علم کا اندوختہ چھوڑ گئے تھے وہ بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ اس کے مطالعہ میں منہمک رہا کرتا تھا۔ حکمائے سبعہ کے مقولے مثلاً اعرف نفسک وغیرہ اس کے ذہن میں جگہ حاصل کرتے جاتے تھے۔ اسے ریاضی۔

طبیعات، حکمت، ہیئت، اور ہندسہ پر خاصا عبور حاصل تھا۔ اپنے پیش رو حکما کے مسائل ہرکلیٹس
(Heraclitus) پارمنی ڈیز (Parmenides) اور انکساگورس
(Anaxagoras) کے علوم اُس کے خاص مطالعہ میں تھے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی کے سامنے
سقراط نے زانوے شاگردی تہ کیا۔ ۴۳۲ ق م و ۴۲۹ ق م کے درمیانی زمانہ میں ہم اُس شخص کو پوٹیڈیا
(Potidaea) کے محاصرہ میں مصروف پاتے ہیں۔ اور دیکھتے ہیں کہ بھوک پیاس اور جاڑے کی تکلیف
ناسکر تھریس (Thrace) کے جاڑے کے سخت مصائب برداشت کرنے میں سقراط کا کوئی مقابلہ
نہیں کر سکتا۔ الکیبیڈیز (Alcibiades) کی جان اُس معرکہ میں نہایت بہادری کے ساتھ
بچاتا ہے اور جرأت و بہادری کا انعام بھی اُسی کو دلواتا ہے۔ ۴۳۱ ق م میں جنگ ہائے پیلوپونیسس
(Peloponnisus) رونما ہوتی ہیں اور ۴۲۴ ق م میں معرکہ ڈیلیوم (Dalium) میں
ایتھنز (Athens) کو اہل تھیبا (Theba) کے ہاتھ سے ایک شکست فاش نصیب ہوتی ہے
لیکن سقراط اور لاشیز (Laches) اور چند لوگ ایسے نظر آتے ہیں جو ہمت نہیں ہارتے۔ من بعد افواج
پیلوپنیس (Peloponnisus) کے مقابلہ میں میدان امفی پولس (Amphipolis) میں
سقراط پھر شریک جنگ ہوتا ہے اور کارہائے نمایاں کرتا ہے۔

جنگ امفی پولس (Amphipolis) کے بعد سوا برس تک سقراط گمنامی اور خاموشی میں
بسر کرتا ہے۔ اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ ۴۰۶ ق م میں اہل ایتھنز (Athens)
ولیسی ڈمونیون (Lacedemonian) میں بحری لڑائی آرگی نوسا (Arginusae)
پر ہوتی ہے جس میں اول الذکر کو فتح ہوتی ہے۔ جنگ کے بعد، ایتھینی (Athenian) سرداران فوج
اپنے مقتولین کی لاشوں کو لیجانے اور اپنے بیکار شدہ بعض چھوٹے جہازوں کے لوگوں کو بچانے سے قاصر
رہ جاتے ہیں اس سے اہل ایتھنز کو غصہ آتا ہے۔ مردوں کی رسمہاے بعد الموت، بہت شان و شوکت
سے ادا کی جاتی ہیں۔ اور سرداران مذکور کو فوراً واپس طلب کیا جاتا ہے کہ اُن پر غفلت کا مقدمہ قائم کیا جائے
اُن کا یہ جواب کوئی تسلیم نہیں کرتا کہ اُنھوں نے اپنے ماتحت افسروں کو ضروری احکام دیدیے تھے لیکن ایسا
طوفان آیا کہ اُن احکام کی تعمیل نہو سکی۔ انجمن میں بحث مباحثہ ملتوی ہو جاتا ہے۔ اور اس پر غور کیا جاتا ہے کہ
اُن سرداروں پر کس طرح مقدمہ چلایا جائے۔ اہل ایتھنز (Athens) کی یہ رائے ہوتی ہے کہ الزام

اور جوابدہی دونون کو سُن کر فوراً سب کی راے لینا چاہیے تاکہ یہ آٹھون سردار سب چھوڑ دیے جائین یا سزا پائین۔ یہ رزولیوشن یہی نہیں کہ بے انصافی پر مبنی تھا بلکہ خلاف قانون بھی تھا اس لیے کہ معمولی مقدمہ چلانے کے بجاے عوام کی راے لینا پسند کیا گیا تھا۔ اور اُس قانون کے خلاف تھا جسکے رو سے ہر شخص کے متعلق علٰحدہ علٰحدہ تجویز صادر کرنی لازمی تھی۔ اس وقت سقراط بھی سنٹ (Senate) کا رکن تھا۔ اس سنٹ (Senate) مین پانچسو اہل شہر تھے جو بذریعہ قرعہ اندازی ایک دن کے لیے منتخب کیے گئے تھے۔ اور ہر روز ایک نیا میرمجلس مقرر ہوا کرتا تھا۔ چونکہ رزولیوشن خلاف قانون تھا اس لیے اگر کبھی میرمجلس نے مخالفت کی تو اُسے دھمکا کر چپ کر دیا گیا۔ لیکن سقراط ایسا نہ تھا کہ حق کی جانبداری مین کسی کی دہمکی مین آجاتا۔ اُس نے صاف کہدیا کہ مین قانون اور انصاف کی جانبداری مین خطرون کا مقابلہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہون۔ اور عوام الناس کی غیرمنصفانہ تجویزین اُن کا ہمزبان نہین ہوسکتا لیکن سقراط چونکہ صرف ایک ہی روز کے لیے میرمجلس ہوا تھا اس لیے اُس روز یہ کارروائی ملتوی کر دیگئی اور دوسرے روز ایک کمزور طبیعت شخص کو میرمجلس بناکر سرداران فوج کے قتل کا حکم لے لیا گیا۔ اور اُنھین قتل کر دیا گیا۔

دو برس بعد ۴۰۴ء قم مین اہل اتھنس (Athens) کو لیسی ڈمونیون (Lacedemonian) فوج نے شکست دی اور شہر پر دشمنون کا قبضہ اور اتھنس (Athens) کے جمہوری نظام کا خاتمہ ہو گیا۔ اُس کے بجاے اسپارٹی جنرل لسانڈر (Lysander) کی ماتحتی مین تیس منتخب اشخاص کی حکومت قائم ہوئی۔ اور طرح طرح کے مظالم شروع ہوے۔ لوگون کو اختلاف راے اور دولت و حشمت کی وجہ سے بیدریغ قتل کیا جاتا تھا۔ ایک شخص مسمی لیان (Leon) کو بھی حکومت نے اسی غرض کے لیے طلب کیا۔ اور پانچ آدمیون کو جنمین ایک سقراط بھی تھا یہ حکم دیا کہ لیان (Leon) کو پکڑ لائین۔ چار آدمیون نے تعمیل کی مگر سقراط نے کسی خطرہ کی پروا نہ کی اور اپنے گھر چلا گیا۔ اس واقعہ کے متعلق وہ خود کہتا ہے کہ "مین نے زبان سے نہین بلکہ اپنے فعل سے یہ دکھا دیا کہ مجھے موت کی ذرہ برابر بھی پروا نہین۔ لیکن اس کا مجھے بہت خیال ہے کہ میرے ہاتھ سے کوئی خطا سرزد نہو جاے"۔ اس حکم عدولی سے ناخوش ہو کر کریٹیاس (Critias) اور اُس کے شرکا حکومت نے اُسے طلب کر کے حکم دیا کہ ملک کے نوجوانون سے قطعًا باتین نہ کیا کرو ورنہ سزاے موت دی جائیگی۔

سقراط نے زان تھیپ ( Xanthipe ) کے ساتھ شادی کی تھی اس کے تین لڑکے ہوئے۔ لمپراکلیز ( Camprocles ) سفرانسکوس ( Sophroniscus ) اور منکسی نس ( Menexenus )۔ زان تھیپ ( Xanthipe ) بڑی بدمزاج عورت تھی لیکن سقراط نہایت تحمل کے ساتھ اُس سے درگذر کرتا تھا گو کچھ خوش نہ تھا اُس کا قول تھا کہ خدا نے مجھے لوگوں سے محاسبہ کرنے کے لیے حکم فرمایا ہے میں کسی طرح خاموش نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ اگر چُپ رہوں تو حق کی نافرمانی کا مرتکب ہوں گا۔ یہ خیال اُسکے دل میں اس قدر سختی سے جاگزین تھا کہ لوگوں کی مخالفت اور نفرت کوئی شے اُسے اس جادہ سے منحرف نہیں کر سکتی تھی، یہ ہم نہیں بتا سکتے کہ کس وقت سے اُس نے لوگوں کا محاسبہ کرنا شروع کیا۔ اور اس الٰہی فرض کی انجام دہی اپنے سر لی۔ لیکن ۴۲۳ ق م میں اپنی وفات سے چوبیس سال قبل اُس کو بحیثیت نئے خیالات پیدا کرنے والے کے خاص شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ اور یہی قیاس ہو سکتا ہے کہ اس سال کے قبل ہی سقراط نے اپنا الٰہی فرض ادا کرنا شروع کر دیا ہوگا۔

محاصرۂ پاٹیڈیا ( Potidea ) ۴۳۲ ق م لغایت ۴۲۹ ق م سے پہلے خود اُس نے اپنا محاسبہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اُس زمانہ میں سوفسطائیوں کے تعلیمات کا بہت چرچا تھا۔ مگر اُس کی تعلیم اس کے محض خلاف تھی، اُس کی تعلیم کا یہ طریقہ تھا کہ وہ نہ تو کسی سے کوئی اُجرت لیتا تھا اور نہ طلباء کو بٹھا کر سبق دیا کرتا تھا۔ اس کی تمام عمر احتساب میں گذری۔ جو کوئی اُس سے مخاطب ہوتا اُس سے فوراً سوالات کرنے اور محاسبہ کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا کبھی وہ السی بائیڈیز ( Alcibiades ) گارجیاس ( Gorgeas ) اور پروٹاگورس ( Protogoras ) سے باتیں کرتا نظر آتا تھا۔ اور کبھی ایک معمولی مزدور سے۔ غرضکہ وہ ایسے مقامات پر نظر آیا کرتا تھا، جہاں دیکھتا کہ لوگ بہت جمع ہوا کرتے ہیں اور شہر سے بہت کم باہر جاتا۔ وہ کہتا ہے کہ "میں علم کا شائق ہوں جو شہر ہی میں آدمیوں سے مجھے مل سکتا ہے، کھیت اور درخت مجھے کچھ نہیں سکھا سکتے" اُس نے اپنی تمام توجہ خدائے بزرگ و برتر کی خدمت میں منہمک کر دی تھی۔ اور اپنے خانگی معاملات تک سے غافل تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افلاس نے اُسے آگھیرا اور جس وقت اس مقدمہ کے زمانہ میں اُسے روپیہ کی ضرورت ہوئی تو ایک نقرئی سکہ مینا (معادل تقریباً ۱۱ سکہ عثمانیہ) سے زیادہ اُسکے پاس نہ تھا۔ افلاطون اپنے استاد کی ظاہری حالت کو بیان کر کے کہتا ہے:

"میں نہیں جانتا کہ تم میں سے کسی نے بھی ایسی ربانی صورتیں دیکھی ہونگی جو اُس کے اندر تھیں میں نے انہیں دیکھا ہے۔ وہ اس طرح حسین سونے کی طرح جگمگاتی ہوئی علوی الصفت عجیب وغریب ہیں کہ جس طرح خدائی آواز کو سن کر لوگ اطاعت کے لیے جھک جاتے ہیں سقراط کے احکام کو بھی سنکر جھک جاتے تھے۔"

کبھی کسی شخص نے اُسے شراب پیتے ہوے نہیں دیکھا۔ بڑے بڑے مصائب برداشت کرنیکی اُس میں غیر معمولی طاقت تھی سخت سے سخت جاڑے میں بھی جب تمام عالم علیظ کہرے سے گھرا ہوتا اور لوگ سمور پہنے ہوے اچھی طرح اوڑھ لپیٹ کر نکلتے تھے، سقراط اپنے معمولی کپڑوں میں نکلتا تھا۔ اور اس طرح چلتا تھا کہ گویا سردی کا کوئی اثر اُس پر نہیں ہے۔ وہ ننگے پیر برف پر آہستہ آہستہ چلتا تھا۔ ایک مرتبہ لوگوں نے دیکھا کہ ایک مقام پر کھڑا عالم فکر میں مستغرق ہے۔ دوپہر کو بھی اسی طرح نظر آیا۔ لوگ کہتے تھے کہ سقراط کو دیکھو صبح سے اسی طرح کھڑا سوچ رہا ہے۔ گرمی کا موسم تھا۔ رات ہوگئی بعض لوگ اُس کے قریب آکر سوگئے اُنھوں نے دیکھا کہ سقراط اُسی طرح بت بنا کھڑا ہوا ہے حتیٰ کہ تمام رات گذر گئی۔ اور جب آفتاب عالمتاب برآمد ہوا اُس وقت اُسے ہوش آیا، اُس کی مشکل حل ہوگئی اور اُس نے وہاں سے جنبش کی۔ افلاطون جنگ ڈلیوم (Dalium) کی ہزیمت کے وقت سقراط کا استقلال اس طرح بیان کرتا ہے:-

"سقراط کو اُس وقت دیکھنا چاہیے تھا جبکہ ہماری فوج جنگ ڈلیوم (Dalium) میں شکست کھا کر منتشر ہوگئی۔ یہ ایک دیکھنے کے قابل منظر تھا میں اس وقت رسالہ کے ساتھ تھا اور وہ پیدل تھا اور سرتاپا لوہے میں غرق تھا۔ جب ہماری فوج کو کامل شکست ہوئی تو سقراط اور لیشیز (Laches) دونوں ساتھ ساتھ ہزیمت کرتے نظر آئے۔ میں اتفاق سے وہاں آگیا اور اُن دونوں کو دیکھ کر سلام کیا اور اُن کے ساتھ ہولیا۔ چونکہ میں گھوڑے پر سوار تھا اس لیے اپنی حالت کے متعلق زیادہ تردد میں نہ تھا۔ یہ موقع پاٹیڈیا (Potidia) کے میدان سے بھی زیادہ نازک تھا۔ ایسی حالت میں سقراط کے طور و انداز میں ایک ایسا دلفریب منظر مجھے نظر آرہا تھا جو استقلال طبع اور جرأت میں لیشیز (Laches) سے بدرجہا زیادہ بلند مرتبہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایک شاہانہ انداز سے طمانیت قلب کے ساتھ قدم اُٹھاتا جاتا اور ہر دو جانب دوست اور دشمن دونوں پر اطمینان سے نگاہ ڈالتا

جاتا تھا۔ حتیٰ کہ دور سے دیکھکر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جو کوئی اسپر حملہ کا ارادہ کریگا اُسے ایک سخت مقابلہ کرنا ہوگا۔ جو لوگ ہزیمت کے وقت منتشر ہوگئے تھے اُن کا دشمنون نے تعاقب کیا اور وہ قتل ہوئے۔ لیکن یہ اور اُس کے ساتھی امن و امان کے ساتھ واپس آئے۔ جو لوگ سقراط کی طرح شجاعت کے وقت طور و انداز ظاہر کرتے ہین انھین لوگ ہاتھ لگاتے ہوئے جھجکتے ہین۔

اس کے بعد افلاطون نامور بڑے بڑے لوگون کا نام لیکر کہتا ہے کہ اُن سے اور سقراط سے کوئی مقابلہ نہین ہو سکتا۔ اس مین ایک غیر معمولی شے تھی جو کسی مین نہ تھی۔ خود اُس کی ذات اور اُس کی تقریر اور مقولے ایسے نہ تھے کہ انسان سے اُن کا مقابلہ کیا جا سکے۔

( ۳ )

۳۹۹ق م مین سقراط پر مقدمہ قائم کیا گیا کہ وہ ایتھنس کے نوجوانون کو خراب کرتا اور ایتھنس (Athens) کے دیوتاؤن کو نہین مانتا ہے۔ یہان ۵۰۰ آدمیون کا جلسہ عدالت کے لیے بیٹھتا ہے اس مین سے دو سو اکیاسی اس کو مجرم قرار دیتے ہین اور دو سو بیس اُس کو بری کرتے ہین۔ کثرت رائے پر فیصلہ ہوتا ہے اور سزائے موت سنائی جاتی ہے مگر ایک مذہبی رسم کی وجہ سے تعمیل مین تاخیر واقع ہوتی ہے اور تیس روز تک قیدخانہ مین رہنا پڑتا ہے۔ اُس کے دوست احباب سب التجا کرتے ہین کہ بھاگ جائے۔ مگر وہ نہین سنتا اور جب موت کا وقت قریب آتا ہے تو خوشی خوشی زہر کا پیالہ ہاتھ مین لیکر پی جاتا ہے۔

ایتھنس (Athens) والون کی عدالت کے سامنے جو تقریر اُس نے اپنے بچاؤ مین کی ہے اُس مین کہا:-

"میرے دوستو اگر تم سمجھتے ہو کہ ایک شخص جس کی کچھ بھی قدر و قیمت ہے ایک کام مین ہاتھ ڈالتا اور پھر موت سے ڈرتا ہے یا اس خیال کے علاوہ کہ آیا وہ حق پر عامل ہے یا باطل پر کوئی اور خیال کرتا ہے تو میرے دوستو تم غلطی کرتے ہو۔ مین اپنا تمام وقت تمہارے بڈھون اور جوانون کے پاس جانے اور انھین اس بات پر مائل کرنے کے لیے صرف کرتا ہون کہ وہ لوگ روحانی تکمیل کو اپنا مقصد خاص بنائین اور جب تک یہ مقصد حاصل نہ ہو جائے اپنے جسمون اور مال و دولت کی طرف توجہ نہ کرین۔ مین یہ بھی کہتا ہون کہ نیکی دولت کے ذریعہ سے نہین

حاصل ہوتی بلکہ دولت اور تمام نعمتین جو انسان حاصل کرتا ہی نیکی سے پیدا ہوتی ہین"

کرائٹو (Crito) جب مجلس مین آکر بھاگ جانے کی راے دیتا ہی تو یہ جواب ملتا ہی:-

"ہماری رہنمائی عقل سے ہوا کرتی ہی اور عقل یہ کہتی ہی کہ ہمین صرف ایک سوال پر غور کرنا چاہیے کہ اگر مین بھاگ جاؤن تو آیا مین حق پر ہون گا یا باطل پر اور اگر ہم یہ دیکھین کہ بھاگنے مین غلطی اور باطل کا اتباع ہی تو ہمین موت کی کچھ پروا نہ کرنی چاہیئے"

اُس زمانہ کے حالات وقت اور پست اخلاقی حالت پر اگر صرف ایک سرسری نظر ڈالی جاے تو معلوم ہوگا کہ جو رائین لوگ قائم کرتے تھے وہ ویسی ہی ناقص ہوا کرتی تھین جیسے کہ خود وہ حالات ناقص اور اصلاح طلب تھے ان حالات کی وجہ سے اُسے بےچینی سی پیدا ہوتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی لگا ہوا تھا کہ خداے جل و علی نے لوگون کی اصلاح کا فرض اُس کے سپرد کیا ہی۔ وہ جانتا تھا کہ ان غلط کاریون اور رسوم پرستیون سے جن پر سوفسطائی اپنے نظام کی بنیاد قائم کرتے تھے، وہ رد براہ نہین ہو سکتے۔ بایں ہمہ اصلاح کے فرض سے وہ کبھی نہین پیچھے رہا۔ گو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُسے موت کا سامنا کرنا پڑا جس اصول پر اُس کا مسئلہ اصلاح مبنی تھا وہ صرف ایک جملہ مین ادا ہو سکتا ہی یعنی اُس حق پر جسکی رہنما عقل ہو وہ انسان کے خیالات کی بنیاد قائم کرنا چاہتا تھا اور جو اصلاحات کہ جذبات جوش و خروش اور عادت کے تابع ہون اُنھین وہ نیکی اور خیر کا باعث قرار نہین دیتا تھا۔ اُس کی پوری تعلیم یہ تھی کہ "علم ہی نیکی اور خیر ہی" پس اگر علم خیر محض ہی تو جہالت شر محض کہی جاے گی۔ وہ خود کہتا ہی کہ اگر نوجوانون کے خراب کرنے کے جرم کا وہ واقعی مرتکب ہوا ہی تو نادانستگی اور جہالت کیوجہ سے ہوگا جب میلیٹوس (Meletus) اس پر بھی نوجوانون کو خراب کرنے کا الزام لگاتا ہی تو خود وہین جواب دیتا ہی کہ میلیٹوس (Meletus) تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم خوب جانتے ہو کہ یا تو مین نوجوانون کو خراب ہی نہین کرتا یا اگر کرتا ہون تو بلا وجہ اور اپنی جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے کرتا ہون گا۔ اور جس وقت مجھے یہ معلوم ہوگا کہ مین ایک جُرم کا ارتکاب کر رہا ہون تو فوراً اُسے ترک کر دون گا۔ جو آدمی حق کا شناسا ہی اُسے ہمیشہ حق بات کرنی چاہیے۔ اور جو اُسے نہین جانتا وہ اسکا عامل ہی نہین ہو سکتا جب کسی فائق ترین شے کو ہم دیکھین تو ہمین اس سے محبت کرنی چاہیے۔

سقراط اپنے الزام دینے والون کی دو نوعین قائم کرتا ہی۔ پہلی نوع وہ ہی جو اُسے سالہا سال سے بے وجہ الزام دیتے رہے۔ مثلاً ارسطو فنوس (Aristophanes) جس نے ایک ڈراما

"ابر" (Cloud) لکھ کر اُس کی ہنسی اُڑانے کی کوشش کی تھی اور دوسرے میلیٹوس (Meletus) اور اُس کے ساتھی۔ پہلے وہ پہلی نوع کے لوگون کا جواب دیتا ہے۔ یہ لوگ اسے سوفسطائی اور طبیعی ہونے کا الزام دیتے ہین۔ وہ ان دونون کی مخصوصہ صفتین بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اِن دونون قسم کے حکما مین سے وہ ایک بھی نہین ہے۔ اُسے لوگ اِس لیے ناپسند کرتے ہین۔ کہ اس نے لوگون کے محاسبہ کرنے کا کام اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مین علم نہین رکھتا لیکن یہ جانتا ہون کہ علم نہین رکھتا۔ اُس سے علم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ لیکن وہ جس کسی کو ٹٹولتا اور آزماتا ہے کہ اس سے کچھ علم کا پتہ چلے۔ یہی پاتا ہے کہ وہ بھی اس کی طرح علم سے معرّی ہے بلکہ باوجود علم سے عاری ہونے کے سمجھتا ہے کہ علم سے بہرہ وافعی رکھتا ہے۔ دوسرون مین اور اپنے مین وہ صرف یہی فرق دیکھتا ہے کہ لوگ نہین جانتے اور جانتے ہین کہ خوب جانتے ہین۔ اور وہ خود گو نہین جانتا۔ مگر یہ ضرور جانتا ہے کہ نہین جانتا۔ اسی بنا پر وہ ڈلفی کی غیبی زبان کا لوگون سے ذکر کرتا ہے کہ اگر اُس زمانہ مین کوئی عقلمند آدمی ہے تو وہ سقراط ہی ہے۔ میلیٹوس (Meletus) کی زبان سے اُسے جھٹلا دیتا ہے۔ ایک شخص اُس سے یہ کہتا ہے کہ کیا اپنی جان کو ایک ایسے زندگی کی خاطر جیسی کہ تم بسر کر رہے ہو جوکھون مین ڈالنا اچھی بات ہے۔ سقراط جواب دیتا ہے کہ دنیا وی سرداران فوج نے لڑائی کے میدانون مین جہان اُس کی جگہ قائم کر دی اُسے اُس نے کبھی نہین چھوڑا۔ پھر کیا جس جگہ خدا نے اُسے مامور کیا ہے وہان سے وہ بھاگ جائے۔ یہ نہین ہو سکتا۔ اِس لیے کبھی ایسے شرط کے ساتھ جس کے رُو سے وہ لوگون سے محاسبہ کرنے سے باز رہے۔ وہ اپنی برأت نہین قبول کرنا چاہتا تھا۔ اہل ایتھنس (Athens) کو پھر تنبیہ کرتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ اُن کو اُس سے ناراض نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اُس نے اُن لوگون کے بیدار کرنے کے لیے اُسے بھیجا ہے۔ اگر وہ لوگ اُسے قتل کر ڈالین گے۔ تو اُس کا جانشین نہ مل سکے گا۔

سقراط کی تمام عمر لوگون کی خدمت گذاری مین بسر ہوئی وہ امور ملکی مین سوائے ایک مرتبہ کے کبھی نہین پڑا۔ اگر پڑتا تو مدتون پہلے لوگ اُسے قتل کر چکے ہوتے۔ اور جو کام وہ کر رہا تھا ادھورا رہ جاتا۔ وہ انجمن تحقیقات کے سامنے علی رؤس الاشہاد کہتا ہے کہ کہان ہین وہ نوجوان لڑکے جنھین مین نے خراب کیا ہے کیون وہ جوان اور سمجھدار ہونے کے بعد اب آکر مجھے الزام نہین دیتے؛ اور اگر وہ خود نہین آنا چاہتے تو ان کے رشتہ دار ہی آئین۔ مگر وہ بھی نہین آتے تو سمجھ لو اس کی وجہ یہ ہے کہ سقراط حق بات بول رہا ہے اور اس کا الزام دہندہ

اینی ٹوس ( Anitus ) دروغ گو ہی۔ وہ ججون سے رحم وکرم کی استدعا نہین کرتا کیونکہ اس مین
اتھنس ( Athens ) کی ذلت ہی۔ ججون نے قانون کے مطابق عمل کرنے کا عہد وپیمان کرلیا ہی پھر
اگر وہ اُن سے رحم وکرم کا خواستگار ہو تو گویا نقض عہد پر آمادہ کرنے کا مُلزم قرار پائے گا۔ اُس پر بیدینی کا الزام لگایا
جارہا ہی مگر وہ اپنے تئین بیدین نہین جانتا اور ان الفاظ کے ساتھ وہ اپنی ذات کو ججون اور خدا کے
سپرد کرتا ہی۔

اُس کے بعد جج آپس مین ووٹ لیتے ہین۔ ۲۸۱ ووٹ اسکے خلاف ہوتے ہین اور ۲۲۰ ووٹ
اُس کے موافق۔ میلیٹوس ( Meletus ) پھر ایک تقریر کرتا ہی جسمین سزاے موت کی تائید کرتا ہی
پھر سقراط ایک تقریر کرتا ہی جسمین سزاے موت کے بدل کا ذکر کرتا ہی۔ وہ کہتا ہی کہ مین نے عوام الناس پر احسان
کیا ہی اور اولمپیا ( Olympia ) کے سورماؤن کی طرح مجھے بھی پرائے ٹنیم ( Prytaneum )
مین بیت المال سے وظیفہ ملنا چاہیئے۔ اُسے یقین ہی کہ اُس نے کوئی خطا نہین کی وہ نہین کہہ سکتا کہ موت
اچھی چیز ہی یا بُری۔ پھر جس شے کو وہ قطعی طور پر بُرا جانتا ہی۔ اسے کیون معاوضہ موت مین تجویز کرے۔ جرمانہ
ادا کرنا بُرائی مین داخل نہین ہی لیکن اُس کے پاس زر ومال نہین جو جُرمانہ ادا کرسکے۔ شاید ایک مینا
( Mina یعنی معہ سکہ عثمانیہ ) ہوگا، حاضر ہی۔ اُس کے دوست کہتے ہین کہ تیس مینا
تک دینا قبول کرلو اور وہ سب ہم کرا دا کردین گے۔ چنانچہ وہ اُن کی خواہش کے مطابق انجمن کے
سامنے تیس مینا پیش کرتا ہے۔ مگر اہل اتھنس ( Athens ) اس کے لیے سزاے موت
ہی تجویز کرتے ہین۔ جن لوگون نے اُس کے خلاف یہ تجویز کی اُن کو سخت ملامت کرتا ہی۔ اور پیشین گوئی کرتا ہی
کہ ایک بڑا سخت عذاب اُن پر نازل ہونے والا ہی اور جن لوگون نے اُسے بَری تجویز کیا تھا اُن سے کہتا ہی
کہ آپ سب لوگ ٹھہر جائین مین آپ سے باتین کرنا چاہتا ہون۔ اپنے حالات اور موت کے حالات اُن سے
بیان کرتا ہی۔ وہ کہتا ہی کہ "ایک نیک آدمی کو کوئی نقصان نہین پہونچ سکتا" اور ججون سے آخری استدعا
یہ کرتا ہی کہ "جس طرح اُس نے ان کے ساتھ محاسبہ کرکے پریشان کیا ہی اُسی طرح وہ بھی اس کو لڑکون کے ساتھ
برتاؤ کرین۔ اور اگر اس کو لڑکے زر ومال کو خیر وصلاح پر ترجیح دین اور اپنے تئین بڑا آدمی سمجھین۔ درانحالیکہ
وہ بڑے نہ ہون تو اُن کے ساتھ سختی کی جائے۔ وہ اپنے طرز عمل یعنی محاسبہ کی بابت بالکل افسوس ظاہر نہین
کرتا۔ اور اہل اتھنس ( Athens ) کے مقابلہ مین آستین چڑھا کر کھڑا ہوتا ہی۔ وہ جب اُن سے مخاطبت

کرتا ہی تو ہر شخص سے فرداً فرداً اور من حیث المجموع ہر طرح خطاب کرتا ہی لیکن نہایت محبت اور تلطف سے۔ کسی سے اُس کا لڑائی جھگڑا نہین ہی۔ وہ اُن کی کوتاہیون او قصورون پر اظہار افسوس کیئے بغیر نہین رہ سکتا۔ یہ بھی اس کے درد دل اور محبت کا تقاضا ہی جو ان کی اصلاح اور محاسبہ کے لیے آمادہ ہوتا ہی

فیصلہ مقدمہ کے بعد سقراط کو تیس روز تک محبس مین اس لیے انتظار کرنا پڑتا ہی کہ اہل اتھنس ( Athens ) ہر سال ڈیلاس ( Delas ) مین جو اپالو ( Appolo ) کا بُت تھا اس کی خدمت مین ایک وفد بھیجا کرتے تھے۔ اس وفد کی غیبت مین اتھنس ( Athens ) مین کوئی شخص قتل نہین کیا جا سکتا تھا۔ یہ وفد ابھی روانہ ہوا تھا اور جب تک واپس نہ ہو جاتا سقراط کو سزاے موت نہین دی جا سکتی تھی۔ محبس مین جس استقلال کے ساتھ اپنے احباب کو پند و نصیحت مین اس نے وقت صرف کیا اس کی نظیر نہین مل سکتی۔ اُسی زمانہ مین ایک روز صبح تڑکے کرائٹو ( Crito ) اس کے پاس پہونچتا ہی۔ سقراط ابھی تک سو رہا ہی۔ کرائٹو معمولی اوقات سے کسی قدر قبل آیا ہی اور ایک ایسی خبر اپنے ساتھ لایا ہی جو سقراط سے زیادہ خود اُس کے لیے تکلیف دہ ہی۔ وہ خبر یہ ہی کہ جو جہاز وفد کو لیکر واپس آرہا ہی وہ سونیوم ( [illegible] ) تک پہونچ گیا ہی اور بہت جلد بندرگاہ پیریوس ( [illegible] ) مین داخل ہونے والا ہی۔ اس کے دوسرے روز سقراط کو شربت مرگ پینا ہوگا۔ کرائٹو پھر ایک مرتبہ اپنے عزیز دوست اور استاد کو بھاگ جانے پر آمادہ کرتا ہی اور کہتا ہی کہ یہ کام بہت آسانی سے ہو جائے گا۔ اور اُس کے دوستون کو بھی ضرر نہ پہونچے گا۔ اور اگر سقراط اس موقع سے فائدہ نہ اُٹھاے گا۔ تو گویا وہ اپنے دشمنون کی من مانی مراد پوری کرے گا۔ اور اپنی اولاد کو لاوارث چھوڑ جاے گا۔ اور اپنے دوستون کے لیے تضحیک و ذلت کا سبب ہوگا۔ سقراط جواب دیتا ہی کہ ہمیشہ عقل نے اُس کی رہنمونی کی ہی جس کے مقابلہ مین اُس نے عوام کی راے کی کبھی پروا نہین کی۔ وہ اس کی پروا نہین کرتا کہ لوگ کیا کہین گے لیکن اُس کا اسے بہت خیال ہی کہ امر حق سے تجاوز نہ ہونے پائے۔ پس یہ سوال پیدا ہوتا ہی کہ اس طریقہ کا فرار امر حق پر مبنی ہوگا یا باطل پر۔ اور کرائٹو ( Crito ) اور دیگر احباب جو معاونت کرینگے وہ حق کی معاونت کرینگے یا باطل کی۔ اسپر سقراط تفصیل کے ساتھ کرائٹو سے گفتگو کرتا ہی۔ اور اپنے قدیم محاسبہ اور سوال و جواب کے طریقہ پر بحث کر کے اس نتیجہ پر پہونچتا ہی کہ اگر وہ محبس سے فرار اختیار کرے گا تو ملک کو نقصان پہونچے گا۔ ایک ایسا شہر جس کے عام باشندے اپنی مرضی کے موافق عدالتی فیصلون کو توڑ دیا کرین اور ان کی پروا نہ کیا کرین کبھی باقی

نہین رہ سکتا۔ اِس کی بربادی لازمی ہی۔ ممکن ہی کہ ایک شخص کو بلا وجہ حکم سزا دیا گیا ہو گو اس کے معنی یہ ہین کہ یا تو قوانین خود خراب ہین یا اُن کا استعمال خراب ہی۔ بایں ہمہ کسی فرد واحد کو عدالت کے مقابلہ مین قانون اپنے ہاتھ مین لینا نہ چاہیے۔ ہر شخص کا یہ فرض ہی کہ اُس ملک کی خاطر جسمین وہ رہتا ہی اپنی انفرادی راے اور ذاتی مرضی کی پروا نہ کرے اور سب پرسے اپنی ایک ذات کو قربان کردے ورنہ سلطنت قائم نہین رہ سکتی۔ اِن سب باتون پر غور کرنے کے بعد سقراط اپنے دوستون کو سمجھاتا ہی کہ مجھے یہین رہنے اور مرنے دو۔ وہ ایک مظلوم کے مانند دنیا سے جائے گا اور دوسرے عالم مین اُس پر نوازشات ہون گی۔

جس روز وفد کا جہاز بندرگاہ پر پہونچتا ہی۔ فیڈو (Phaedo) اور تمام دیگر احباب دوسرے ہی دن صبح تڑکے سے سقراط کے پاس جاتے ہین۔ اُن کی روایت ہی کہ عمال محبس ہین سقراط کے پاس پہونچاتے ہین جہان ابھی ابھی اُس کے پیرون سے بیڑیان دور کی گئی تھین اور اس کی بیوی زن تھیپ (Xanthippe) بیٹھی پاس رو رہی تھی۔ زان تھیپ (Xanthippe) کو وہان سے ہٹا دیتے ہین اور سقراط رنج و راحت کے باہمی تعلقات پر گفتگو کرتا ہی۔ رفتہ رفتہ خودکشی کا ذکر آتا ہی جسے سقراط سخت ناپسند کرتا ہی اور مبنی بر باطل ٹھہراتا ہی وہ کہتا ہی کہ ایک حکیم کو ہمیشہ موت سے محبت کرنا چاہیے۔ مگر خودکشی کرنا درست نہین۔ فلسفہ کے معنی دراصل مطالعہ احوال موت کے ہین۔ ایک فلسفی کی یہ خواہش ہونی چاہیے کہ جلد اِس جسمانی قید سے نجات حاصل کرلے۔ اور اپنے مقصود یعنی اس علم کو حاصل کرے جو صرف موت کے بعد نصیب ہوتا ہی۔ جو لوگ موت سے ڈرتے ہین وہ حکمت و دانش سے محبت نہین رکھتے اپنے جسمون اور زر و مال اور عزت کو دوست رکھتے ہین۔ اُن مین اگر جرأت آتی ہی تو ایک بدتر شے کے اندیشہ سے اور اعتدال و میانہ روی کو وہ اِس لیے پسند کرتے ہین کہ بے اعتدالی بعض راحتون اور سامان عیش و نشاط سے روکتی رہتی ہی۔ ایسی صفت کو خیر یا نیکی کے نام سے موسوم نہین کرسکتے۔ یہ بالکل جھوٹی نیکی اور غلامانہ صفت ہی۔ حقیقی نیکی تزکیۂ نفس مین مضمر ہی۔ جو لوگ تزکیۂ نفس کرلیتے ہین وہ موت کے بعد بڑے بڑے بزرگون کی صحبت مین پہونچ جاتے ہین۔ یہی وجہ ہی جو سقراط موت سے نہین گھبراتا۔ موت اور بقاے روح کے مسئلہ پر اچھی خاصی گفتگو ہوتی ہی جس کے آخر مین وہ کہتا ہی کہ "آدمی کو چاہیے کہ بجائے جسم کے روح سے لگاؤ پیدا کرے اور موت کا غم نہ کرے کیونکہ موت اس بند سے خلاصی کا نام ہی"۔ چونکہ وقت تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ اس لیے اس قدر تقریر کر کے خاموش ہوگیا۔ اور غسل کرنے کے لیے اُٹھا تا کہ موت کی تیاری

کرے۔ کراٹیو (Crito) اُستاد سے پوچھتا ہے کہ آپ کی آخری وصیت کیا ہے۔ اور تجہیز وتکفین کس طرح کرنی چاہیے۔ سقراط کہتا ہے کہ احباب کو اختیار ہے جس طرح چاہین اول منزل پہونچائین۔ یہ کہکر کراٹیو (Crito) کے ہمراہ غسل کے لیے جاتا ہے اور اپنے بال بچون سے رخصت ہوتا ہے اُس کے بعد بہت کم گفتگو کی نوبت آتی ہے۔ زہر کا پیالہ لایا جاتا ہے اور سقراط اُسے نہایت اطمینان سے پی لیتا ہے۔ اور جلاد سے طالب ہدایت ہوتا ہے جلاد کہتا ہے کہ تھوڑا ٹہلو جب پیر بھاری ہونے لگین تو لیٹ جاؤ۔ سقراط اس کی تعمیل کرتا ہے اور جب اُس کے پیر بھاری ہونے لگتے ہین تو وہ لیٹ جاتا ہے۔ جلاد پیرون کو دباکر دیکھتا ہے کہ انمین کچھ حس باقی ہے یا نہین۔ اور سقراط سے حال پوچھتا ہے۔ سقراط کہتا ہے کہ کوئی حس نہین رہا۔ یہی بے حسی اوپر کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے نزع روح کے چند لمحہ قبل اُسے ایک بات یاد آتی ہے اور وہ مُنھ پر سے چادر ہٹا کر کراٹیو (Crito) سے کہتا ہے کہ دیکھو اسکلیپیوس (Asclepius) کو میری طرف سے ایک مُرغ دیدینا اُس کے بعد منھ بند کرلیتا ہے اور تشنج کی سی ایک کیفیت کے بعد روح پرواز کرجاتی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(۳)

سقراط کے پہلے جو حکما تھے وہ بالکل طبیعات اور مابعد الطبیعات کے دائرہ مین محدود رہا کرتے تھے۔ انھون نے بھی عالم کے معمہ کو حل کرنا چاہا اور اُس کی حقیقت معلوم کرنی چاہی تھی۔ اور اصول ہائے اولین مثلاً ہوا۔ آگ۔ پانی۔ کو دریافت کرنے اور حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ یہ سوال کیا کرتے تھے کہ اشیا کیونکر وجود مین آتی ہین۔ اور کیسے زندہ رہتی ہین۔ اُن مین فساد کیون پیدا ہوتا ہے۔ لیکن پانچوین صدی قبل مسیح مین لوگون کو اُن کی تعلیم سے اطمینان مفقود ہونے لگا۔ اس لیے لوگون نے اُن کی طرف سے بے اعتنائی شروع کردی۔ مثلاً اہل ایتھنس (Athens) کو جن امور کی ضرورت تھی وہ بجائے اسرار عالم کے افراد شخصی اور سوسائٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ لوگ انصاف وظلم۔ حق وباطل۔ خوب وزشت کے معنی مین بحث کرنے لگتے تھے۔ اور پوچھتے تھے کہ انصاف، حق اور خوب سے کیا مراد ہے۔ ایک شے کو انصاف کے مطابق کب کہتے ہین؟ درست اور اچھا کسے کہتے ہین؟ سقراط سے پہلے کے حکما، ان سوالات کا جواب نہین دے سکتے تھے۔ انھین معاملت انسانی سے تعلق نہین رہا تھا بلکہ محض طبیعات اور مابعد الطبیعات مین انہماک رہا کرتا تھا۔ چونکہ لوگون کی طبیعت اب ادھر سے ہٹنے لگی تھی اور وہ اخلاقی اور سیاسی بحثون مین پڑنا چاہتے تھے۔ اور سوفسطائی اُن کا کسی قدر جواب دیتے اور ان بحثون پر گفتگو کرتے تھے۔ اس لیے اہل ایتھنس (Athens)،

انھین تنخواہین دے دے کر بیرون ملک سے بلاتے اور نوکر رکھا کرتے تھے۔ مگر اس وقت ہمین سوفسطائیون کے فلسفہ کی تنقیح کرنی مطلوب نہین ہی۔ اس لیے اُن کی تعلیم کی بھلائی بُرائی کسی کا ذکر کرنا نہ چاہیے۔ صرف اتنا ضرور کہا جاتا ہی کہ جس اخلاق کی وہ تعلیم دیتے تھے وہ اُن پریشان خیالات اور متضاد تصورات اور بے جوڑ سیاسی مسائل پر مشتمل تھی۔ جن کا ایتھنس (Athens) مین چرچا ہو رہا تھا۔ اور بہت سی معمولی معمولی غیر مربوط و پیچیدہ باتون کی تنقیح و تدقیق کی سخت ضرورت تھی کہ راہ مستقیم سے لوگ راہ راست پر آسکین یہ ایسی شدید ضرورت تھی کہ اُس کو رفع کرنے کے لیے خدائے تعالیٰ نے سقراط کو بھیجا جس نے ہر ایک سے محاسبہ کرنا اور اُس کے خیال کی تنقیح کرنا اپنا فرض منصبی قرار دیا اور آخر عمر تک اسی کام مین منہمک رہا۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ لوگون کو حق بات کی تمیز حاصل ہو تاکہ اسی حق کی معیار پر تمدنی اور سیاسی قابلیت کو جانچا جا سکے اور ملک مین غلط اور باطل کو صحیح اور حق کے پردہ مین فروغ نہ حاصل ہو۔ سوفسطائیون کو افلاطون اُس شخص سے مطابقت دیتا ہی جس نے تجربہ سے ایک عظیم الشان اور خطرناک جانور کے مزاج اور ضرورتون کو سمجھ لیا ہی اور یہ جان لیا ہی کہ کس وقت اُس کے قریب جانا چاہیے۔ اور کس چیز سے اُسے غصہ آتا اور کس شے سے وہ راضی ہوتا ہی اور اُس کی مختلف آوازون کے کیا معنی ہین۔ اس علم کو حاصل کر کے وہ شخص یہ دعوی کرتا ہی کہ یہی حکمت اور دانش ہی۔ اور اُس کو ایک فن بنا کر تعلیم دینا شروع کرتا ہی۔ جس شے سے جانور راضی ہوتے ہین اُس کو وہ حق بتلاتا ہی اور جس سے وہ ناراض ہوتے ہین اُسے باطل قرار دیتا ہی۔ اور یہ بالکل نہین جانتا کہ اُس کی کون سی خواہش اور ضرورت واقعی درست ہی اور کون سی نادرست۔ اسی کی تعلیم کے لیے سقراط دنیا مین آتا ہی۔ سوفسطائیون کی طرح وہ بھی اخلاقی اور سیاسی مسائل سے بحث کرتا ہی۔ زینوفن (Xenophon) کہتا ہی کہ سقراط ہمیشہ ان امور پر گفتگو کیا کرتا تھا جو آدمیون سے متعلق ہوا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ پوچھتا رہتا تھا کہ زہد و تقوی کس کا نام ہی۔ رندی و خرابی کسے کہتے ہین؟ شریفانہ بات سے کیا مراد ہی؟ کمینگی کسے کہتے ہین؟ انصاف کیا شے ہی؟ بے انصافی کسے کہتے ہین؟ اعتدال اور میانہ روی سے کیا مراد ہی؟ دیوانگی و جنون کیا شے ہی؟ جرأت کیا ہی؟ بُزدلی کیا ہی؟ ملک و ریاست کیا ہی؟ مُدبر کسے کہتے ہین؟ حکومت کس کا نام ہی؟ انسان کو حکومت کے قابل کون شے بناتی ہی؟ وغیرہ وغیرہ جو لوگ اِن سوالون کا جواب دے سکتے تھے اُنھین وہ اچھے لوگ کہتا اور جو جواب نہ دے سکتے انھین کہتا کہ یہ غلامون سے بہتر نہین ہین۔ مختصر یہ کہ حکمائے متقدمین اشیائے فطرت سے انہماک رکھتے تھے۔ اور سقراط خود انسان سے گفتگو کرتا تھا جس شے کے متعلق

کہ سوفسطائی محض قاعدہ اور صورت بتا کر الگ ہو جاتے تھے۔ سقراط اس کی اصلاح کرنا چاہتا تھا جسے، اس زمانہ مین لوگ علم کہا کرتے تھے۔ سقراط اس کی خرابیون اور لغویتون سے خوب واقف تھا وسیع یعنی الفاظ مخصوص معنون مین لے جانے لگے تھے اور وسیع مفہوم کے لفظ کو ایسے الفاظ کے بجائے استعمال کیا کرتے تھے جن کے معنی کا میدان تنگ ہوا کرتا تھا۔ فرد اور جنس کے لیے الفاظ مین تمیز باقی نہین رہی تھی۔ ارسطا طالیس کا بیان ہے کہ سقراط کی طرف دو شے منسوب کی جا سکتی ہین۔ ایک تو طریقہ استقرا اور دوسرے اصطلاح عامہ کی تعریف۔ اس کے پہلے تک وہ الفاظ جو روزمرہ معمولی معمولی مفہوم کے لیے استعمال ہوتے تھے واضح اور محدود معنی کے ساتھ مخصوص نہ تھے۔ جو شے اُن کے برسون کے جذبات شاعری اقتدار و فلایا سے پیدا ہو گئی تھی اس کی اصلاح عقل مدرکہ نے اُس وقت تک نہین کی تھی۔ شعرا خود اپنے نظمون کی توضیح نہین کر سکتے تھے۔ صاحبان فن یہ دعوی رکھتے تھے کہ چونکہ انھین فن کے متعلق کافی علم حاصل ہے۔ اس لیے دیگر اہم امور مین بھی اُنھین واقفیت ہے۔ کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس کے لوگ یہ دعوی نہ کرتے ہون کہ ہمین خاص علم حاصل ہے۔ درانحالیکہ وہ بالکل جاہل ہوتے تھے اور سقراط کی تحدید و محاسبہ کو بے ضرورت ناگوار خیال کیا کرتے تھے۔ غرض کہ جن اصول پر سقراط اُن کی اصلاح کرنا چاہتا تھا وہ

(۱) ایسی حقانیت پر مشتمل تھی جنھین دانش و حکمت کے معیار پر جانچ لیا گیا ہو۔ اور عقل انھین قبول کرتی ہو۔

(۲) جن کے معلوم کرنے کے لیے لوگون کے علوم کی تنقیح اور محاسبہ کی سخت ضرورت تھی۔

اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگون کو ان کی جہالت کے جہل سے بیدار کیا جائے اور اُن کی خامیون کو اُن کے سامنے اُنھین سے تسلیم کرا کے پیش کر دیا جائے۔

سقراط کی طبیعت مین جو سب سے زیادہ شے نمایان تھی وہ اُس کا سخت مذہبی میلان تھا۔ افلاطون کہتا ہے کہ اس کی تمام خصوصیات طبع پر گہرا مذہبی رنگ غالب تھا۔ اُس کے نزدیک مذہب کا مفہوم بُت پرستی یا دیوتاؤن کا سلسلہ نہین تھا۔ یونانی دیوتاؤن کے افسانون مین جو لغو حکایتین ہین انھین وہ سخت ناپسند کرتا تھا۔ جس وقت لوگون نے اُسے یہ الزام دیا کہ ایتھنس (Athens) کے دیوتاؤن کو وہ نہین مانتا تو گو اُس نے ملحد ہونے سے قطعی انکار کیا مگر اُن کے دیوتاؤن کو ماننے کا بھی اقرار کبھی نہین کیا۔ اس کے جواب الزام کے آخری الفاظ یہ تھے:-

"اہل ایتھنس (Athens) مین خدا کو بیشک مانتا ہون اور اسی طرح مانا کرتا ہون جسطرح میرے الزام دینے والے اپنے دیوتاؤن کو مانا کرتے ہین اور تمھارے اور تمھارے خدا ہی کے سپرد مین اپنے معاملہ کو کرتا ہون۔ جو کچھ تمھارے اور میرے لیے سب سے بہتر ہو وہ تصفیہ کرو"

سقراط کا خدا وہی تھا جو افلاطون کا تھا۔ اس کی صفت خیر ہی اور وہ تمام خیر کا منبع ہی۔ وہ خدا جسے کسی نے نہین دیکھا۔ صرف خدا ہی کی ذات سب اشیا کی دانا بینا ہی۔ وہ خیر کی شر سے محافظت کرتا ہی۔ وہ انسانون پر اپنی مرضی لسانہ غیب کے ذریعہ ظاہر کرتا ہی۔ اُس کے احکام و قوانین سب سے بالاترین اور ہر طرح اُن کی اطاعت کرنی چاہیے۔

سقراط حکمت و دانش کی تلاش اس لیے کرتا ہی کہ خدا نے اُسے اِس کام کے لیے مقرر کیا ہی اس کام کو وہ ہمیشہ خدا کے کام کے نام سے یاد کرتا ہی جسے ہر خطرہ کا مقابلہ کرکے انجام دینا چاہیے۔ اور جس کی راہ سے اُسے پھیرنے والا نہ خوف ہو سکتا ہی اور نہ خطرہ۔ اہل ایتھنس (Athens) کو وہ مخاطب کرکے کہتا ہی کہ مجھے تمھاری بڑی خاطر منظور رہی اور تم سے بڑی محبت کرتا ہون لیکن اطاعت خدا ہی کی کرون گا۔ تمھاری نہین اور اُسی اطاعت الٰہی مین اُس نے جان دے دی۔

سقراط یہ سمجھتا تھا کہ اُسے خدا کی طرف سے ایک قسم کا پیام ایک برہان ربانی کے ذریعہ پہونچتا رہتا ہی۔ اس برہان کو ایک جگہ وہ خدا کی آواز کہتا ہی جو بچپن سے اس وقت تک اس کے ساتھ ہی اور ہمیشہ اُسے چھوٹی سی چھوٹی باتون مین بھی تنبیہ کرتی رہتی ہی۔ یہ آواز ہمیشہ امتناعی ہی اور بعض افعال سے باز رکھتی ہی یعنی جس شے کو خدا چاہتا ہی کہ یہ نہ کرے اُسی برہان کے ذریعہ سے منع کر دیتا ہی اور اگر یہ چاہتا ہی کہ یہ کرے تو اُس طرف سے خاموش رہتا ہی اور کوئی ممانعت نہین ہوتی یہ "برہان ربانی" اُسے لوگون سے محاسبہ کرنے سے منع نہین کرتی۔ اور وہ اس کام سے باز بھی نہین رہ سکتا تھا۔ اِس لیے کہ خدائے جل وعلیٰ کی حکم عدولی ہوئی۔ زینوفن (Xenophon) کو اپنے استاد سے باطنی کچھ حصہ نہین ملا تھا۔ اس لیے وہ اِسے سمجھ نہ سکا اور اُس کی یہ تاویل کرنے لگا کہ قوت فیصلہ کو فی الفور کام مین لانے کی یہ ایک قوی استعداد تھی جو اشیا کے علم پر مبنی اور تجربہ کی بنیاد پر پختہ ہو گئی تھی۔ اور بغیر آگاہی سلسلۂ علت و معلول واطلاع واسطہ درمیانی کے نتیجہ پر پہونچا دیا کرتی تھی۔ لیکن افلاطون جیسے اُستاد سے باطنی دولت بھی ملی تھی خاموش رہتا ہی اور اُس کی تاویل کرنے سے گریز کرتا ہی۔

سقراط کہتا ہو کہ ہمین بدی کا عوض بدی سے نہین کرنا چاہیے۔ اِس کے ہمعصر اِس قسم کے خیالات کو حیرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یونانیون کا اخلاق یہ تھا کہ اپنے دوستون سے بھلائی کرو اور اپنے دشمنون کو نقصان پہونچاؤ۔

سقراط بدی کے عوض بدی کرنے کو نادرست کہتا ہو۔ وہ کہتا ہو جب بدی کرنا بجاے خود درست نہین تو کسی صورت مین اُسے درست نہین کہہ سکتے۔ وہ اپنے اہل وطن سے کہتا ہو کہ:۔

"مین تھین خدا کا گناہ کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہون۔ مجھے الزام مت لگاؤ۔ اور مین جو تمھارے لیے انعام الٰہی ہون مجھے ردمت کرو۔ اگر تم مجھے قتل کردوگے تو میرا جانشین آسانی سے نہ مل سکے گا۔ خدا نے تمھارے شہر مین مجھے بھیجا ہو۔ اگر مجھے خواہش نفسانی ہوتی جیسا کہ سب انسانون مین ہوا کرتی ہو تو مین اپنے ذاتی نفع و نقصان کے باتون کی طرف سے غفلت نہ کرتا۔ اور اپنے خانگی کامون کو اتنے سال تک برباد نہ ہونے دیتا۔ مجھے تمھارے کام نے ہمہ وقت مشغول رکھا ہو۔ مین تم مین سے ہر ایک کے پاس باپ یا بڑے بھائی کی طرح جاتا ہون۔ اور خیر و صلاح کی طرف مائل کرتا ہون۔ مجھے خدا کی طرف سے ایک بُرہان ربانی عطا ہوا ہو۔ اس خدا کے میلیٹوس (Meletus) تضحیک کرتا ہو۔ یہ بُرہان میرے ساتھ بچپن سے ہو۔ یہ ایک قسم کی آواز ہو جو مین سنتا ہون۔ اور جو کچھ مین اُس وقت کرتا ہون اگر نامناسب ہو تو اُس سے مجھے روک دیا کرتی ہو۔ لیکن کسی کام کے کرنے کا حکم نہین دیتی۔ یہی آواز مجھے سیاست مین دخل دینے سے روکتی رہتی ہو۔ ایتھنس (Athens) والو گوش دل سے میرے حالات سُن لو تا کہ تھین معلوم ہو جائے کہ کوئی شخص ایسا نہین ہو جو موت کا ڈر دلا کر باطل کے ارتکاب پر مجھے مائل کر سکے۔ مین مرنا ناپسند کرون گا لیکن باطل پر مائل ہونا پسند نہ کرون گا۔ وہ کہتا ہو کہ موت کوئی بُری شے نہین ہو بلکہ ایک طور پر دیکھین تو اچھی شے ہو۔ موت کی حالت دو حال سے خالی نہین۔ یا تو ہستی بالکل معدوم ہو جائے گی۔ اور تمام احساسات باطل ہو جائین گے۔ یا وہ ہو جیسا کہ عام طور پر لوگ یقین کرتے ہین کہ موت سے روح کا ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہونا مراد ہو۔ اگر موت سے تمام احساسات کا بطلان مراد ہو اور وہ اس نیند کے مانند ہو جو کسی خواب سے پریشان نہین ہوتی تو یہ ایک عجیب نفع کی چیز ہو۔ اگر کوئی کسی ایک

رات کو کہے کہ مین اِس شب کو اِس طرح سویا کہ کوئی خواب تک نہین نظر آیا۔ اور اُس شب کا مقابلہ اپنی زندگی کے دوسرے راتون سے کرے اور پھر اس سے پوچھا جائے کہ اس رات سے زیادہ پُر فرحت تم نے کون سا دن یا رات بسر کی ہو تو میرا خیال ہو کہ کیا رایہ اور کیا پرجا سب ہی ایسی رات یا اُس قسم کی دوسری راتون کو آسانی سے شمار کرکے بتلائین گے۔ اگر یہی معنی موت کے ہین تو مین اُسے ایک نفع سمجھتا ہون۔ لیکن اگر موت کے معنی ایک مقام سے دوسرے مقام تک سفر کرنے کے ہین اور عام عقیدہ صحیح ہو کہ جسقدر لوگ آج تک ہین سب اس دوسرے مقام مین موجود ہین تو اس سے زیادہ بھلائی میرے لیئے اور کیا ہو سکتی ہو مین ایسی موت دس مرتبہ مرنے کو تیار ہون جو مجھے وہان پہونچا دے جہان بڑے بڑے سب لوگ موجود ہین اور مین اُن سے ملاقات کرکے علم حاصل کر سکون۔ وہ کہتا ہو کہ اضداد اضداد سے پیدا ہوا کرتی ہین۔ اس لیے زندگی سے موت پیدا ہوتی ہو۔ اور موت سے زندگی۔ ہمارا تمام علم اِن باتون کے ایک قسم کی یاد ہو جو کسی زمانہ ماسبق مین ہمین معلوم تھین۔ پس ہماری ارواح ضرور اجسام مین داخل ہونے سے پہلے زندہ رہی ہونگی۔ روح بہ سبب جسم کے کم فساد پذیر ہو۔ جسم بھی اگر اُسے حنوط کرکے رکھدیا جائے تو صدیون تک خراب نہین ہوتا۔ اور اُس کے بعض اجزا مثلاً استخوان قریب قریب ہمیشہ باقی رہا کرتے ہین۔ جب جسم کی یہ حالت ہو تو روح کیا موت کے بعد فنا ہو سکتی ہو۔ وہ ہرگز فنا نہین ہوتی۔ وہ اپنے سامعین سے مخاطب ہو کر کہتا ہو کہ آپ سب تصورات مجردہ کے وجود کے قائل ہین۔ سقراط کے خیال مین یہ تصورات مظاہر قدرت کے اسباب ہین اشیاء جمیل کا سبب جمال ہو۔ اور اشیا عظیم کا سبب عظمت ہو۔ وقس علیٰ ہذہ۔ جو تصورات ایک دوسرے کے متضاد ہین ایک ہی شخص مین وقت واحد مین موجود نہین رہ سکتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ سمیاس ( Simmias ) لمبا اور چھوٹا دونون ہو اس لیے کہ وہ مجھسے (یعنی خود سقراط سے) لمبا اور فیڈو (Pheado) سے چھوٹا ہو تو کہا جائے گا کہ یہ دونون متضاد صفتین مقابلۃً جمع ہوئی ہین۔ ایک کے مقابلہ مین وہ لمبا ہو اور دوسرے کے مقابلہ مین چھوٹا۔ چھوٹا اور لمبا دونون ایک ہی کے مقابلہ مین کوئی نہین ہو سکتا۔ اس نظریہ پر اگر مزید نظر ڈالی جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ ایک تصور یہی نہین کہ اپنے متضاد تصور کے ساتھ رہنا پسند کرے گا۔ بلکہ جو اشیا متضاد تصور کے

جز و لاینفک ہین۔ اُن کے ساتھ بھی رہنا پسند نہین کریگا۔ مثلاً سردی کا ضد گرمی ہی۔ سردی جس طرح گرمی کی برداشت نہین کرسکتی۔ اسی طرح وہ آگ کی بھی برداشت نہین کرسکتی جو حرارت کا جزو لاینفک ہی۔ ایک ہی شی مین حرارت و برودت دونون ایک ساتھ جمع نہین ہوسکتیں۔ یہ حالت زندگی کی ہی جو موت کی ضد ہی۔ حیات و روح دونون باہم جزو لاینفک ہین۔ پس روح اور موت کا ساتھ کہین نہین ہوسکتا اور روح کو کبھی موت نہین آسکتی۔ وہ لازوال ہی اس لیے غیر قابل فساد ہی۔ جب ایک شخص مرجاتا ہی تو اس کی روح محفوظ ہوکر جسم سے منقطع ہوکر چلی جاتی ہی۔

یہان تک بیان کرکے پھر سقراط پوچھتا ہی کہ جب یہ تسلیم کر دیا گیا کہ روح جسم کے بعد بھی زندہ رہتی ہی تو اُس کی طرف سے غفلت کرنا کتنا خطرناک کام ہی

روح را توحید الله خوشتر است — غیر ظاہر دست و پای دیگر است
روح دارد بی بدن بس کاروبار — مرغ باشد در قفس بس بیقرار
باش تا مرغ از قفس آید برون — تا ببینی ہفت چرخ اندر زبون

حامد علی

# جذبۂ قناعت

(از ایڈ ناظم عدالت رانچی)

رات آخر ہوئی مین نیند سے بیدار ہوا — صبح کے چار بجے اور گجر بجنے لگا
لب پہ تھا نام خدا۔ ذکر خدا۔ شکر خدا — بند آنکھون مین مگر نیند کا باقی تھا مزا
کسل کہتا تھا ابھی وقت ہی پھر سو جاؤ
دل یہ کہتا تھا کہ سرگرم دعا ہو جاؤ
آخر الامر مین یون صرف مناجات ہوا — اے کبیر الکبرا بادشہ ہر دوسرا
مالک الملک ہی عالم پہ ہی قبضہ تیرا — تیرے احکام کا پابند ہی ہر ہر ذرا
تو نہ چاہے تو کسی کو کہین کچھ ملتا ہی
بے ترے حکم کے پتہ بھی کہین ہلتا ہی
گو سمجھتا ہی جہان صاحب دولت مجکو — فی الحقیقت ہی ابھی اور ضرورت مجکو
قابل شکر ہی بخشی ہی جو عزت مجکو — بار خاطر ہی حریفون کی عداوت مجکو

نہ غدغہ دور ہو عزت بھی سوائی ہوجائے
دشمنون کی جو ذرا چشم نمائی ہوجائے

فضل سے دی نہ مجھے اولاد بھی اور نیک نہاد  اب یہ خواہش ہے کہ کثرت سے ہو اُن کی اولاد
آل و اولاد کی جانب سے رہون مین دلشاد  رات دن جلتے رہین آتش غم مین حساد
یہ تمنا ہے کہ محسود جہان ہو کے رہون
جاؤن دنیا سے تو فردوس مکان ہو کے رہون

گو ہم آغوش شکر تھین دعائین میری  تھی مگر شکر کے جلوون مین جھلک شکوون کی
مین مناجات سے فارغ ہی ہوا تھا نہ ابھی  کان مین ایک سُریلی سی صدا آنے لگی
دلکشی کا عجب انداز اُس آواز مین تھا
عبد و معبود کا اِک راز اُس آواز مین تھا

نغمہ پرداز سر بام وہ اِک چڑیا تھی  جسکو شاما بھی کہا کرتے ہین کنڈ دی بھی
محوِ تسبیح تھی اور دل تھا وساوس سے بری  نہ کسی قسم کی خواہش نہ شکایت کوئی
کیا بتاؤن کہ ہوئی مجھکو ندامت کیا کچھ
دانے دُنکے پہ تھی چڑیا کو قناعت کیا کچھ

طالب جاہ نہ تھی طالب توقیر نہ تھی  آرزوے صلۂ خلعت و جاگیر نہ تھی
آشیان کے لیے کچھ خواہش تعمیر نہ تھی  دشمنون کے لیے کچھ طالب تعذیر نہ تھی
ذوق توحید مین تسبیح و ثنا کرتی تھی
شکر خالق کی عنایت کا ادا کرتی تھی

شکر کو اُس کے نہ تھی شکوۂ بیجا سے غرض  ذکر کو اُس کے نہ تھی خواہش دنیا سے غرض
اُس کو احباب کی پروا تھی نہ اعدا سے غرض  ہر گھڑی تھی اُسے خوشنودی مولا سے غرض
میرے اللہ مجھے بھی یہی دولت دیدے
چاہے کچھ لے لے مگر ذوق قناعت دیدے

# روح نے بچالیا

یہ کہانی مسٹر لیڈبیٹر کی کتاب پرفیوم آف ایجپٹ سے ترجمہ کی گئی ہے۔ عرصہ ہوا اس کتاب کے ترجمہ کی اجازت مصنف سے لی گئی تھی لیکن کم فرصتی کی وجہ سے یہ ترجمہ مکمل نہیں ہو سکا۔ اسی کتاب کی چند کہانیاں رسالہ شباب اردو لاہور میں شائع ہو چکی ہیں۔ اب کل کتاب کا ترجمہ انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب کتابی صورت میں شائع ہوگا۔ جناب مصنف اپنے دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ یہ واقعات سچے ہیں جو کچھ تو ان کے ذاتی مشاہدات ہیں اور بعض ان کے دوستوں کے ذاتی تجربات ہیں اس لئے ان میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ تو بلا صداقت ایک صوفی منش بزرگ ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ابھی تک مسٹر لیڈبیٹر اور ان کے پیرو اور معتقد اسلامی تصوف سے بیگانہ محض ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی کتابوں میں اسلام پر بعض جگہ غلط بیانیاں کر گئے ہیں۔ کاش مترجم بھی اللہ تعالیٰ مترجم کو یہ توفیق عطا فرمائے کہ اسلامی تصوف کا آئینہ ان حضرات کے سامنے پیش کرے کہ ان کو ان کی اصلی کیفیت سے آگاہ کر سکے اور پھر وہ اسلامی تجلیوں سے چکا چوند میں آجائیں۔

(محمد ظفر)

## پہلا باب

میرا نام وکٹر کننگ نارمن ہے اور اب میں بڈھا آدمی ہوں۔ اپنے بچپن کے جن واقعات پر میں قلم اٹھانے والا ہوں، اب سے پچاس سال پہلے کی باتیں ہیں۔ لیکن اس وقت بھی ان کی یاد میرے لئے دلخراش ہے اور میں واقعات کے ان پرانے گڑے مردوں کو اکھاڑ کے ان کی سنسنی خیز ہوشربائیوں کو ہرگز تازہ نہ کرتا اگر ایک معزز دوست کی درخواست نہ ہوتی جن کی خواہش میرے لئے بمنزلہ قانون ہے۔ اس حکم کی تعمیل میں میں اپنا قصہ شروع کرتا ہوں۔ البتہ اس تماشہ کے بعض افراد کے اصلی نام میں نے بدل دیئے ہیں۔

میرے باپ نارمن کننگ نارمن اپنے شباب میں لندن کے ایک مشہور آدمی تھے اور یہ بہت کچھ بدنام ولیم چہارم کا زمانہ تھا۔ میری ماں سے شادی کرنے کے بعد وہ لندن کے آسمان سے جس کا وہ ایک چمکدار تارا تھے یکایک غائب ہو گئے اور نارمن ہال میں جو شمالی علاقہ میں ان کا آبائی مکان

تھا۔ سال بھر کا سارا حصہ گذار دیتے۔

جب ریلوں کا چرچا ہونے لگا انھیں اُن میں ایک خاص دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اُن کو اُن کا مستقبل بہت عظیم الشان نظر آیا اس لیے اُنھوں نے اپنے سرمایہ کا بہت بڑا حصہ اُن میں لگا دیا۔ جب میں تیرھویں سال میں لگا وہ ایک ریل کے جو جنوبی امریکہ میں زیر تعمیر تھی ایک نمایاں مہتمم تھے اور اُس کے سلسلہ میں اُنھیں اُس براعظم میں جانا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دُخانی جہاز پیپہ کے ذریعہ چلائے جاتے تھے۔ ان دنوں یہ سفر بڑا خطرناک تھا۔

وہ اہل و عیال اپنے ساتھ لے گئے جن میں میری ماں، میں خود اور میرا چھوٹا بھائی جو سات سال کا بچہ تھا شامل تھے۔ ہم نے ایک بندرگاہی قصبہ میں جو ایک ریل کا اختتامی مقام تھا مکان لے لیا۔ اس ملک کے قیام کا بہت زمانہ ہم نے اس میں گذارا۔ لیکن میرے والد کو کاروبار کی وجہ سے اندرونِ ملک میں جہاں ریل غیر مکمل تھی اکثر جانا پڑتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ٹھیکہ دار کسی وجہ سے اس کام کو جاری نہ رکھ سکے۔ اس لیے بالآخر میرے والد نے کمپنی کی جانب سے ریل کی تکمیل کا کام اُن کے ہاتھوں سے لے لیا۔ کام کی اس تفصیل کے متعلق میرا خیال درست ہو یا غلط بہرحال اتنا مجھے معلوم ہے کہ ابتدائی چند ماہ بعد میرے والد اس قصبہ سے اکثر اور تا دیر غیر حاضر رہتے تھے۔

اِن چند سفروں میں میں نہایت خوش تھا۔ میرے والد مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور ایک مرتبہ جس کا تذکرہ میں کرنے والا ہوں میرا چھوٹا بھائی جیرلڈ بھی ساتھ لے لیا گیا تھا۔ میری ماں کی متفکر نظروں نے اس چھوٹے بچہ میں طاقت کے گھٹنے کے خفیف آثار جانچ لیے تھے یا ممکن ہے یہ ان کا محض خیال ہی خیال ہو۔ بہرحال یہ سوچا گیا کہ کھلے میدان میں ڈیرہ ڈال کے رہنے سے تبدیلی آب و ہوا ہو جائیگی اور اس سے اُس کی صحت پر خوشگوار اثر پڑے گا۔

اُن لوگوں کو جنھیں جنوبی امریکہ میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا اپنا قصہ سمجھانے کے لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس عجیب و غریب براعظم کے تمدنی حالات اختصار سے بیان کر دوں جس علاقہ میں میرا قصہ پیش آیا ہے اس میں چار قومیں آباد ہیں یا اُس وقت جس کا میں ذکر کر رہا ہوں آباد تھیں۔

شروع میں ہسپانوی اور پرتگالی فاتحوں کی نسلوں کا ذکر کرتا ہوں، یہ نسل مغرور اور

ـــــــــت الوجود تھی۔ اس نسل مین خوبیان بھی تھین یہ لوگ صحبت یافتہ اور متواضع تھے لیکن ان مین ایک بہت بڑا عیب یہ تھا کہ دوسری قومون سے خواہ وہ کوئی ہون سخت نفرت کرتے تھے یا اس کا اظہار کرتے تھے۔

ان کے بعد سُرخ رو دیسی تھے جو اس سرزمین کے ابتدائی مالک تھے۔ ان مین کے بہت سے جرگون نے ایک قسم کی ادھ کچری بھدی تہذیب اختیار کر لی تھی۔ لیکن اور بہت سے جرگے اس وقت تک وحشی تھے جو رام نہین ہوئے تھے اور نہ آئندہ کچھ امید تھی۔ جو ہر قسم کے کام کو انتہائی بے عزتی سمجھتے تھے! جو سفید چہرہ والی قوم کو روایتی شدید ترین حقارت سے دیکھتے تھے حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ نیلے خون والے ہسپانوی نیم شرفا سے۔ ان سے بھی زیادہ بیحد نفرت کرتے تھے۔ اس مین شک نہین کہ ہم مین سے بہت سے لوگون کی سمجھ مین یہ بات نہ آئے گی کہ ایک نیم برہنہ وحشی خواہ وہ خود ہم کو کتنا ہی ناپسند کرے ہماری اعلیٰ ترین تہذیب کے متعلق حسد کے علاوہ کوئی اور جذبہ بھی رکھ سکتا ہے۔ لیکن مین یہ کہہ سکتا ہون کہ سفید لوگون کے متعلق سُرخ دیسیون کا حقیقی اور غیر مصنوعی جذبہ خالص اور مکمل نفرت کا تھا۔ یہ ہماری خودبینی کو ناخوشگوار معلوم ہو لیکن یہ بالکل درست ہے۔ اور بعض اوقات ایک بےچین کرنے والا شک دل مین پیدا ہونے لگتا ہے کہ بعض صورتین ایسی ہین کہ اُن کا یہ جذبہ بالکل غیر معقول بھی نہین تھا۔

تیسرے درجہ پر حبشی تھے جو آبادی کا ایک غیر اہم حصہ تھے۔ اور بالخصوص غلامی کی حالت مین تھے۔ حکومت ان حالاتون سے اس لعنت کو دور کرنے مین حتی الامکان کوشش کر رہی تھی۔ آخر مین بدترین قسم اُن لوگون کی ہے جو دوغلے اور دو مذہبے تھے۔ یہ ایک مخلوط نسل تھی جسمین دوسری بیچ میل نسلون کی طرح اُن کے والدین کی نسلون کی تمام بدترین خصلتین اکٹھی ہوگئی تھین۔ دیسی، ہسپانوی اور حبشی سب اُن کو حقیر سمجھتے تھے اور وہ بھی اپنی جگہ دوسرون سے سخت ترین نفرت کرتے تھے۔ یہ جذبات اس درجہ بڑھے ہوئے تھے کہ جب فوج مین بھرتی ہونے کا سوال درپیش ہوا تو دوسری نسلون نے اس پلٹن مین کام کرنے سے انکار کر دیا جسمین یہ دوغلے شامل کر لیے گئے تھے اس لیے ان لوگون کی علیحدہ پلٹن بنا کے بھرتی کرنا پڑا۔ نظر برین فوجون مین دونون قسمون کے رسالے تھے جن کے جذبات ایک دوسرے کے متعلق حقیقت مین غیر دوستانہ تھے۔

بس زمانہ سے میرے قصہ کا آغاز ہوتا ہے کھلم کھلا مخالفت سے کے یہ بات بالآخر جنگ کی صورت اختیار کر گئی۔ مجھے یہ یاد نہیں رہا کہ اس سرکشی کے لیے کیا بہانہ تراشا گیا۔ چند احکام ان دو غلوں کی پلٹنوں کو دیے گئے جنکو لینے سے انھوں نے اپنی کسر شان سمجھا اور یکایک علانیہ بغاوت شروع ہو گئی۔ ان کی چار پلٹنیں ایک شخص مارٹیر نامی کے زیر کمان بغاوت پر آمادہ تھیں اس شخص میں تھوڑی بہت قابلیت موجود تھی لیکن اس کی شہرت بیحد بڑی تھی۔ یہ فوجی قواعد و انضباط کے بار بار توڑنے میں عام طور پر مشہور تھا۔ یہ بات درست ہو یا غلط اتنا ضرور ہے کہ یہ شخص وحشیانہ اور ظالمانہ بیرحمی [illegible] کا [illegible] ہر حال دل کا اچھا نہیں چاہا [illegible] سردار رہا۔ اور اس میں ایک قسم کی جرات تھی جس سے اس [illegible] آزاد [illegible] کی جانب کھنچے چلے گئے تھے۔

یہ معاملہ ایک جلد کی فرد ہو [illegible] بغاوت [illegible] حکومت ہم لوگوں کے دلوں میں ہی [illegible] ایک ریاست نازک حالت میں ہوتی ہے اور اس کی رعایا کا [illegible] حکومت کا تخت الٹ دینے پر تلا رہتا ہے [illegible] وہاں ان باغیوں کی نقل و حرکت کی مطلق [illegible] یا [illegible] حکمت عملی تھی کہ تمام معاملہ کو [illegible] [illegible]

بعد میں جب معاملہ رفع دفع ہو [illegible] ایک سیاسی [illegible] اور ہر قسم کے چیکنے چپڑے [illegible] ہاتھ [illegible] کی چال چلی تھی اس مزید سازش کے دونوں فریق [illegible] بے تھے۔ دو غلوں کا منشا یہ تھا کہ گوروں کا ان سرخوں [illegible] کے [illegible] اپنے ان شریکوں کے خلاف اٹھ کھڑے [illegible] کو غارت کر کے اپنی [illegible] مستحکم کر لیں۔ ادھر سرخوں کا یہ ارادہ تھا کہ باغی پلٹنوں کی مدد سے گوروں کو سمندر میں دھکیل [illegible] اور [illegible] دو غلوں سے سلٹ لیں اور ملک پر دوبارہ اپنا اقتدار قائم کر لیں۔

اس کا ہمیں ذرا بھی اندیشہ [illegible] کہ باغیوں سے اس اندرونی علاقہ میں ہمیں کوئی گزند پہنچ سکتا ہے۔ جو کچھ لڑائی تھی جنوب کی طرف سے سات سو میل دور تھی اور ہمارا سارا علاقہ اس سے

بالکل محفوظ تھا۔ بایں ہمہ اس کشمکش کا بہت بڑا حصہ ہمارے حوصلے سے زیادہ ہی دیکھنا لکھا تھا جیسا کہ میرا افسانہ ابھی ظاہر کرے گا۔

ریل باوا آدم کے وقت کے جنگل کے بڑے بڑے خطوں سے گذرتی تھی اور جنوبی امریکہ کے جنگل دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ دو دو سو فٹ لمبے اور اسی تناسب سے دور دور تک پھیلے ہوئے درخت حقیقت میں بھڑکتی ہوئی آگ کا ایک انبار معلوم ہوتے ہیں جن کے سرخ یا نارنجی رنگ کے گل نظر آتے ہیں۔ بڑی بڑی بیلیں جو آدمی کی ٹانگ کے برابر موٹی ایک درخت سے دوسرے درخت تک لٹکتی ہوئی تقریباً سیکڑوں فٹ تک [illegible] بیلیں اور درختوں کے پھولوں سے زیادہ خوشنما رنگوں سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ یہ جنگل ایک دلپسند کھیل تھا کہ وہاں ان بیل بیلوں میں ایک ایک کو چن کے اُن کی الجھنوں سے باہر واپس [illegible] تک پہنچنے کی کوشش کرے جس لڑکے کی [illegible] سب سے پہلے نکل آتی وہ جیت جاتا۔ یہ سچ مچ کا ایک بہشت تھا جس کی حیرت انگیز حسن و خوبی کی کوئی نظیر نہیں دی جا سکتی لیکن وہ اس قدر گنجان آباد تھا کہ انسانی آسائش مفقود تھی۔

بات یہ ہے کہ چونکہ انسان اس جگہ کم آباد ہے غیر انسانی باشندے اس درجہ بڑھے ہوئے ہیں کہ ان کی گنتی نہیں۔ ان میں سے بہت سے انسان کے لیے خطرناک ہیں۔ ان میں بہت سے شاندار مخلوقات ہیں لیکن کھلے بندوں تکلیف دہ اور خطرناک۔ یہاں کے سانپ [illegible] ہندوستان کے سانپوں سے زیادہ خوبصورت اور شاہانہ صورت ہیں لیکن اتنا ہی خطرناک ہیں [illegible] اور سیکڑوں سیکڑوں کے مارنے والا سانپ دنیا میں سب سے بڑا اور تیس ۳۰ فٹ لمبا اور آدمی کی ران کے برابر موٹا ہوتا ہے گھڑیال سمندر کی شارک مچھلی کے برابر خطرناک ہیں اور [illegible] کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ یہ سب اور بہت سی اور مخلوق ان حیرت ناک جنوبی امریکہ کے جنگلوں میں اپنا [illegible] ٹیڑھی کھیر بناتے ہیں۔

ان میں پرندے بھی کثرت سے ہیں جن کے رنگ پھولوں سے کچھ کم خوشنما نہیں ہیں۔ ہر قسم کے طوطے بڑے بڑے چیخنے والے [illegible] سبز نیلے اور زرد رنگوں سے خوشنما طرح سے مزین چھوٹے چھوٹے بھنبھنانے والے پرندے گو کہ قد میں مکھی سے بڑے ہیں نیلم اور ہیرے کے سے رنگ میں چمکتے ہوئے سچ مچ کے زندہ جواہرات معلوم ہوتے ہیں۔ سیکڑوں اور قسمیں سب کی سب رنگوں میں جگمگاتی

لیکن موسیقی سے محروم نہین۔ ایک کپا نیرو گھنٹی کی سی گہری آواز کے سُر نکالتا ہو۔ ہر قسم کی عجیب النظر مخلوقات رنگ روپ مین حیرت انگیز لیکن اُن مین کوئی نہ کوئی ندرت پائی جاتی ہو جو کسی اور مُلک مین نظر نہین آتی۔

لیکن ان سب سے بڑھ کے کیڑے مکوڑون کی دنیا ہو جو ایک نئے آدمی کی توجہ کو ناخوشگواری سے اپنی طرف کھینچتی ہو۔ زہریلی مکڑی اور سرطان اس دنیا کے سالار اعظم ہین۔ یہ کیڑون مین درست طور سے شمار بھی نہین ہو سکتے۔ بڑی بڑی چیونٹیان لاکھون کروڑون کی تعداد مین کسی مخفی سفر پر روانہ ہوتی اور پھر فضول واپس آجاتی ہین۔ چیگو وہ تکلیف دہ ننھی مخلوق ہو جو انگوٹھون کے ناخنون مین گھس کے اپنے انڈون سے بھری ہوئی ننھی ننھی تھیلیان رکھ دیتی ہو جن کو سونے سے پہلے ہر روز نوکر کاٹا کرتے ہین۔ فی الواقع یہ کیڑون کی دنیا ہر وقت ہمارے ساتھ ساتھ ہو اور ہم معمولاً تمنا کرتے ہین کہ یہ نہ ہوتی۔!

ان باتون کے باوجود ان قدیم ترین جنگلون پر کسی حملہ کا مطلق خوف نہ تھا کیونکہ ہم اس مین غیر معمولی طور پر موافق حالات مین کام کر رہے تھے۔ مزدورون کی چھوٹی فوج جو اس شاخ کے سرے پر کام کرتی تھی ایک جمعیتہ کا فائدہ دے رہی تھی۔ بڑے وحشی جانورون مین کوئی اتنے بڑے گروہ کے پاس آنے کی جرأت نہین کر سکتا تھا اور ہمین مصیبت ناک تجربون سے چھوٹے وحوش سے مقابلہ کرنے کا ڈھنگ معلوم ہو گیا تھا۔ ہمارے ساتھ ساتھ ہمراہی اور عام ساتھی کے طور پر ہمارا وفادار حبشی ملازم ٹیٹو تھا۔ یہ شخص غلام کی حیثیت سے ہماری نذر کیا گیا تھا لیکن ہم نے اُسے آزاد کر دیا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کا رُوان رُوان ہمارا شکر گذار تھا۔

ریل محض ایک خندق تھی جسے جنگل مین سے کاٹ کے بنا لیا گیا تھا اور یہ خط مستقیم تھی کیونکہ اسوقت تک کوئی درمیانی سٹیشن تعمیر نہین کیا گیا تھا۔ اور اگرچہ یہ چند گاؤن کے نواح مین سے گذرتی تھی لیکن ان مین سے کوئی اس جگہ نظر نہ آتا تھا۔ چنانچہ اس پر برابر چلے جانے مین کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اس ذکر سے جسکے متعلق مین نے قلم اُٹھایا ہو چند ہفتے قبل ایک دفعہ کی بات مجھے یاد ہو کہ مجھے اسی سڑک پر بہت بوکھلاہٹ کا تجربہ ہوا تھا۔

ایک روز جب ہم اختتامی مقام سے ۷۵ میل ادھر سڑک کے سرے پر تھے۔ ہمین ایک قُلی کے

بھائی کے ذریعہ اطلاع ملی کہ اختتامی مقام کے دفتر میں بڑا زبردست تغلب ہوا ہے اور خازن انجمن اپنی لوٹ کے ساتھ یورپ جانے والے دُخانی جہاز میں جو اسی روز روانہ ہونے والا تھا بار ہو رہا ہے یہ خبر اُس دُخانی جہاز کی روانگی سے ٹھیک ایک گھنٹہ پہلے ہمیں ملی میرے والد کے ہاتھ پاؤں پھول گئے کہ اب کیا کریں۔ اُن دنوں کوئی تار نہیں تھا اور ہرکارہ کو پندرہ میل اس نوساختہ ریل کی سڑک سڑک طے کرنے میں تین گھنٹے لگتے۔

ہمارے پاس ایک انجن تھا لیکن یہ ٹھیکہ داروں کے کام کا تھا جو تیز رفتاری کے لیے نہیں بنایا جاتا۔ اور اگر ایسا ہوتا بھی تو اُس کا باقاعدہ چلانے والا اُس روز بخار میں بیمار پڑا تھا وہ لڑکا جس کی نگرانی میں اب یہ انجن تھا اگرچہ چند گاڑیوں کو اِدھر اُدھر اچھی طرح لے جا سکتا تھا لیکن وہ اُسے غیر معمولی رفتار سے لے جانے کے ناقابل تھا۔ میرے والد کو انجن چلانے کا طریقہ معلوم نہ تھا اور علاوہ ازیں ایسے موقع پر یہاں سے اُن کا چلا جانا بہت اندیشہ ناک اور مضر تھا لیکن خوش قسمتی سے میں کلوں سے بچپن کے طبعی شوق کی بدولت انجن سے بخوبی واقف ہو گیا تھا اور میں نے اُسے چھوٹے چھوٹے فاصلوں ہی کے لیے سہی کئی دفعہ چلایا ضرور تھا۔

میں نے فوراً بھاگ دوڑ کے وہاں وقت پر پہونچ کے جہاز رُکوانے کا ارادہ ظاہر کیا اور مجھے کچھ یقین بھی ہوتا جاتا تھا کہ میں اس کام کو انجام دے سکوں گا گو میرے والد اس امر کو بالکل ناممکن تصور کرتے تھے وقت گذرا چلا جاتا تھا اور اب قیل و قال کی مطلق گنجائش نہ تھی چنانچہ وہ میری اس قسمت آزمائی پر رضامند ہو گئے گو اُن کے دل میں میری ناکامی کا خیال ابھی سے پکا ہو گیا تھا۔ انجن کی بھاپ اُٹھا دی گئی تھی اور بعد ہی مجھے اُسے کوئلے سے بھرنے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کے حوض لبریز ہیں کافی تھے۔ اُس کے بعد میں اُس لڑکے کے ساتھ جس نے اُسے بھٹی والے کی حیثیت سے پہلے چلایا تھا چل پڑا۔ یہ دوڑ نہایت مضطربانہ تھی۔ میں نے انجن کو اس کی انتہائی طاقت سے چلایا اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ سڑک خاصی سیدھی تھی اور مجھے موڑوں پر رفتار کم کرنے کی چنداں ضرورت پیش نہ آئی۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ میں نے وقت پر یہ فاصلہ طے کر لیا گو اسمیں شک نہیں کہ جب وہاں پہنچے تو انجن کے پہیے بالکل سُرخ انگارہ ہو رہے تھے۔

جیسے ہی ہم اختتامی مقام پر پہونچے میں کود کے پہاڑی کے اشارہ گھر کی طرف دوڑا گیا۔

جس کا افسر مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے خدا کا شکریہ ادا کیا کہ ایک جہاز خلیج ہی میں کھڑا تھا گو اُس کے لنگر اُٹھ چکے تھے۔ میری ہدایات کے مطابق میرے دوست افسر نے فوراً اشارہ دے کے ضروری حکم دیا کہ جہاز ابھی روانہ نہ ہو اور انتظار کرے۔ اس اثنا میں میں گاڑی سے پہنچ [illegible] حکام کے پاس دوڑا ہوا گیا اور بہت جلد ایک کشتی پر چند دیگر انسان کی رعب ڈالنے والی جماعت کے ساتھ جہاز کی طرف جلدی جلدی [illegible] چلنے لگی۔

یہ بندرگاہ جہاں میرے باپ ریل کی سڑکوں اور دیگر سامانوں کے بڑے بڑے انباروں کے وصول کنندہ کی حیثیت سے اچھی طرح جانے جاتے تھے۔ چنانچہ جب میں اُس مقام پر پہونچ گیا میرا کام بالکل آسان ہو گیا۔ جہاز کا کپتان بھی مجھے جانتا تھا اور جب اُس نے معاملہ کی اہمیت معلوم کی تو اُس نے میری اُس کے کام میں تاخیر ڈالنے کی [illegible] کو معاف کر دیا۔ خائن خزانچی فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ اگرچہ اُس نے سخت مزاحمت کی اور اسے ساحل پر قیدخانہ میں ڈال دیا گیا اور تمام روپیہ بخوبی برآمد کر لیا گیا۔ [illegible] احتیاطی سے چلانے کی وجہ سے اس انجن کو بہت نقصان پہونچا لیکن جو خطرہ [illegible] اُس سے کہیں زیادہ تھی۔

میرے والد کا یہ قاعدہ تھا کہ وہ ریل کی سڑک کے سرے پر ایک چھوٹی چھوٹی جھونپڑی [illegible] لیے بنوالیا کرتے تھے اور جب [illegible] کے اتنے فاصلہ پر پہونچ جاتی جسے وہ سہولت کے لحاظ سے دور سمجھتے، اُس وقت تک اُسی میں رہتے [illegible] فاصلہ پر اسی طرح کی اور جھونپڑی بنوالیتے۔ لکڑی اس کثرت سے تھی کہ [illegible] کو ایک دارالاقامہ سے دوسری تک لیجانا بالکل فضول تھا۔ اگرچہ یہ فاصلہ چند میلوں کا ہی ہوتا تھا۔ زمین پر کثرت سے لکڑی کے بڑے بڑے تنے [illegible] چند درخت جلدی سے کاٹ کے نئی جھونپڑی بہت تھوڑی سی محنت سے بن جاتی تھی۔

معمولاً طریقہ یہ تھا کہ ایک فٹ کی قطر [illegible] لکڑی کے شہتیر منتخب کیے جاتے تھے اور [illegible] لمبائی کی طرف سے آدھو آدھ چیر لیا جاتا تھا۔ اس طرح ایک اوندھی [illegible] جھونپڑی بن کے تیار ہو جاتی تھی جو اُس علاقہ کے وحشی جانوروں کے حملہ کو روکنے کے لیے خوب مضبوط ہوتی تھی۔ [illegible] شک نہیں ان شہتیروں میں بہت سی درازیں ہوتی تھیں جن میں سے روشنی اور ہوا [illegible] مقدار میں آتی تھی۔ عام طور پر اس قسم کی جھونپڑی بلا کسی کھڑکی کے بنائی جاتی تھی اور اُس [illegible] ایک

بھدا دروازہ ہوتا تھا جس کے کیواڑ دن میں کوئی قبضہ لگا نہیں ہوتا تھا لیکن رات کو اندر گرنے سے روکنے کے لئے ایک بھاری چوبی بلی سے اُس کو اس کی جگہ پر قائم رکھا جاتا تھا۔ دن میں یہ کیواڑ ایک طرف رکھ دیا جاتا تھا اور یہ کھلی جگہ کھڑکی کا کام دیتی تھی۔ میرے والد کے پاس ایک سادہ معمولی سا میز تھا جس پر وہ دفتری کام کیا کرتے تھے اور ہم لکڑی کی ڈھیون پر یا زمین پر جیسا دل چاہتا بیٹھ جایا کرتے تھے۔

## دوسرا باب

### دلیون کا حملہ

جس روز سے میرا قصہ شروع ہوتا ہے اس روز یہ جھونپڑی جنگل میں ایک کھلی جگہ کے سرے پر بنی ہوئی تھی۔ اِس جھونپڑی کے پیچھے اور دونوں طرف جنگل بیس گز سے زیادہ نہ تھا لیکن سامنے کی طرف یہ کھلی جگہ ایک چھوٹے سے چشمہ پر نشیب میں جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ یہ چشمہ اس جگہ سے ڈیڑھ سو گز پرے تھا۔ اِس چشمہ سے پرے اس وقت سڑک کا سرا تھا جو درختوں کے بڑے جھنڈ اور جگہ کی بلندی کی وجہ سے جھونپڑی سے نظر نہ آتا تھا۔ اس جگہ آدمیوں کا ایک گروہ اپنے کام میں مصروف تھا۔ دوپہر کو سب آدمی کچھ دیر ملک کے دستور کے مطابق آرام کیا کرتے تھے۔ اور ہم بھی بعض دفعہ آرام کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن عادی نہ ہونے کی وجہ سے مجھے کبھی نیند نہ آتی تھی۔ یہ قیلولہ ابھی جاری تھا اور اگر مجھے ٹھیک یاد ہے قریب الختم تھا۔ میرے والد بیٹھے میز پر لکھ رہے تھے اور میں فرش پر لیٹا ایک کہانی پڑھ رہا تھا اور ننھا جیرلڈ ایک کونے میں کوئی بچوں کا کھیل کھیل رہا تھا۔ نوکر ٹیٹو اپنے کسی کام پر چلا گیا تھا۔ کچھ بھی ہو۔ وہ جھونپڑی میں نہ تھا اور نہ وہاں سے وہ نظر آتا تھا۔

قطبی دوپہر کے سکون کو اچانک بندوقوں کی ایک باڑ نے توڑا جو نہایت حیرت انگیز بات تھی۔ کیونکہ جہاں تک ہمیں معلوم تھا کم از کم پچاس میل کے اندر ہمارے علاوہ اور کسی کے پاس بندوق نہ تھی۔ ہم فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور میرے والد دروازہ تک گئے اور میدان میں نیچے کی طرف نظر دوڑائی۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں وہ جگہ جہاں آدمی کام کر رہے تھے ہمارے دروازے سے نظر نہ آتی تھی۔ چونکہ وہاں کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی۔ میرے والد نے کونے سے لگی ہوئی اپنی بندوق اُٹھائی اور معاملہ معلوم کرنے کے لیے باہر نکلے۔ میں نے بھی اپنی بندوق اُٹھائی کیونکہ میرے

پاس بھی ایک بندوق تھی۔اس وحشی ملک مین ننھا جیرلڈ بھی اپنی بیٹی مین اپنا ننھا طمنچہ لگائے بغیر باہر نہین نکلتا تھا۔یہ احتیاط کسی طرح بیجا نہ تھین کیونکہ وہان کے انسانی باشندون سے قطع نظر قصبون کے اندر تک گھرون کے عین نزدیک خطرناک وحشی جانور درانہ چلے آتے تھے۔

ہم دروازہ سے بمشکل باہر نکلے تھے کہ ہمارا ایک مزدور چشمہ کے پاس کے درختون کے جھنڈ دن کے پیچھے سے بے تحاشا بھاگتا ہوا نکلا۔اُس نے ہمین دیکھتے ہی دور سے کچھ کہا لیکن ہم اس کا مطلب کچھ نہ سمجھ سکے۔قبل اس کے کہ وہ پھر کچھ کہنے کا موقع پاتا ایک بندوق اور سر ہوئی اور وہ غریب اپنی بانہین اُدھر کو اُٹھا دہم سے زمین پر بیجان آپڑا۔اُس کے بعد فوراً ہی اُس میدان کے نیچے کی طرف منقش وحشیون کا ایک ہجوم نکل پڑا جو اپنے ہتھیار ہلا رہے تھے۔اور خون خشک کرنے والی چیخین مار رہے تھے ہم پر چند گولیان چلائی گئین لیکن خوش قسمتی سے ہمین ایک نہ لگی۔ہم فوراً جھونپڑی مین چھپ آئے اور دروازہ کو اس کی جگہ رکھ کے بھاری بلی اس کے پیچھے لگا دی۔پھر میرے والد نے نہایت سکون سے مجھ سے جب کہ مین اُن کے پاس اپنی بندوق ہاتھ مین لیے کھڑا تھا کہا۔تم دروازہ کا بایان درز سنبھالو۔مین دایان لیتا ہون۔پہلے بندوقون سے کام لو۔پھر طمنچون سے جب تک وہ اس جھونپڑی تک پہونچین ان مین سے جتنے مر سکین ہمین مارنے چاہییے اب تیار ہو جاؤ۔ہم کو موقعہ ہاتھ سے دینے کی مطلق گنجائش نہین ہے۔

ہمارے پاس اس زمانہ کی جلد چلنے والی بندوقین نہ تھین۔اُنچائی کی طرف ابھی وہ سُرخ لوگ آدھا راستہ بھی طے کرنے نہ پائے تھے کہ ان مین سے دس لوٹ گئے،انھین کوئی حکم دیا گیا اور وہ یک لخت میدان کے دونون طرف پناہ مین ہو گئے اور ایک لحظہ کے لیے ہماری نظرون سے غائب ہو گئے۔دراز مین سے برابر دیکھتے ہوے میرے والد نے کہا۔اس سے ہمین ایک لمحہ کے لیے دم لینے کا موقع ہاتھ آگیا ہے بندوق پھر بھر لو۔ہر چیز تیار رکھو اور اپنی کل بارود اپنے پاس رکھو تاکہ چشم زدن مین اسے لے سکو۔وہ ہم پر ابھی ٹوٹ پڑین گے۔

مین نے کہا لیکن ابا جان یہ کون لوگ ہین اور یہ کیا بات ہے۔یہ کیون اس باگلانہ وضع مین ہمارے پیچھے پڑے ہین؟ ہم نے ان کا کچھ نہین بگاڑا۔میرے والد نے جواب دیا۔میرے بچے!اس کی

خود مجھے کچھ خبر نہیں اور جہاں تک مجھے نظر آتا ہے یہ بھی اغلب نہیں معلوم ہوتا کہ ہم اس بات کو کبھی معلوم کر سکیں گے۔ ان کی جو کچھ بھی منشا ہو اور جس غرض کے لیے یہاں آئے ہوں ہم اتنے بڑے مجمع کے مقابلہ میں اس جگہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتے۔ ہم جو کچھ کر سکتے ہیں یہ ہے کہ اپنی جانوں کو گراں سے گراں قیمت پر فروخت کریں۔ ہم قریب ترین امداد سے سو میل دور ہیں اور جب تک وہ یہاں پہونچے اس سے کہیں پہلے یہ ہمارا قصہ پاک کر چکیں گے۔ مجھے اس کی ذرا پرواہ نہیں لیکن خیال ہے تو یہ ہے کہ ننھا جیرلڈ ہمارے ساتھ ہے۔ آہ! میں اسے اس موقع پر اور بھی کسی وقت نہیں اپنے ہمراہ کیوں لایا تھا اور یہ "تو ہو کے رہے گا۔

میں نے کہا۔ آپ کے خیال میں ہمارے مزدوروں کا کیا حشر ہوا۔؟

میرے والد نے جواب دیا۔ اس باڑ میں جو ہمیں سنائی دی وہ سب کے سب مارے گئے ہوں گے۔ یہ بالکل صاف ہے کیونکہ اگر اُن میں کوئی بچتا ہمارے ساتھ پناہ لینے کی کوشش کرنے کے لیے اس طرف ہی دوڑا آتا۔

میں نے اختلاف رائے کرتے ہوئے کہا لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ انھیں ان لوگوں کو مارنے اور ہم پر نرغہ کرنے کی کیا غرض ہے؟

میرے والد نے کہا۔ میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آتا لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ یہ اس وقت اپنے جنگی نقش و نگار بدن پر چھاپے ہوئے ہیں جس کے ہمیشہ یہ معنی ہیں کہ وہ مارنے کے ارادہ سے نکلے ہیں اور وہ مرتے دم تک لڑتے جائیں گے۔ کوئی اس علت غائی کو نہیں بتا سکتا جس پر یہ وحشی لوگ کام کرتے ہیں۔

اس موقع پر ایک بلند چیخ نے ہماری باتوں کا سلسلہ توڑ دیا اور وحشیوں کا پورا دستہ جو جنگل کی پناہ میں ہمارے بہت نزدیک آگیا تھا دونوں طرف سے ہم پر ایک ساتھ ٹوٹ پڑا۔ آدمی پر آدمی زمین پر گرتے گئے لیکن وہ نہایت دلیری سے جھونپڑی تک بڑھتے چلے آئے۔ اور دروازہ پر آ کے ٹکر لگائی۔ خوش قسمتی سے بلی لگی ہوئی تھی اور جب اُنھوں نے دیکھا کہ وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور وہ خود ہماری آتشبازی کی پوری زد میں ہیں وہ ایک اور بلند چیخ مار کے دوبارہ آڑ میں گھس گئے۔

اب تک ہمیں ذرا بھی چرکا نہ لگا تھا اور اُدھر یہ کیفیت تھی کہ نعشوں کی کافی تعداد جھونپڑی کے

گرد پڑی تھی۔ ننھے جیرلڈ نے بھی اپنے برتے سے زیادہ اِس جدال و قتال مین حصہ لیا۔ اُس نے کم از کم دو وحشی مار ڈالے تھے اور تیسرے کو زخمی کر چکا تھا۔ میری طرف ایک تُند خُو وحشی نے اپنی بندوق کی نالی ایک درز مین گھُسا دی۔ مین جھُک کے ایک طرف ہو گیا۔ جیسے ہی اُس نے اُسے چلایا مین نے اُسے فوراً پکڑ لیا۔ اور اُس کے اوپر سے اپنا طپنچہ اس کے مالک کے عین مُنھ پر داغ دیا۔ وہ بندوق درز مین گھُسی چھوڑ کے ایک دردناک چیخ مارتا ہوا زمین پر جا رہا۔

اس کی گولی کا دُھوان جھونپڑی مین بھر گیا لیکن ہمین کوئی صدمہ نہین پہونچا۔ جب یہ لوگ جنگل مین بھاگ گئے تو مین نے دروازہ کھول کے بندوق کو اندر لانا چاہا لیکن میرے والد نے اِس کی مطلق اجازت نہین دی اور یہ کہا کہ دیسی جنگل سے ہمین بغور دیکھ رہے ہین اور اس سے ہم فضول اپنے آپ کو خطرہ مین ڈال لین گے۔ اِس کے علاوہ اُنھون نے بتایا کہ یہ بندوق ہمارے کسی مطلب کی بھی نہین کیونکہ ہم پہلے سے مسلح ہین اور ہمارے چھرّے وغیرہ اسمین آ بھی نہ سکین گے یہ عجیب شکل کی پُرانی وضع کی توڑے دار بندوق تھی جو ایک رگڑ پیدا کرنے والی ٹوپی سے چلتی تھی اور میرے والد کے کہنے کے مطابق ہمارے لیے بیکار تھی۔ بایں ہمہ مین نے اس مال غنیمت کو بیدلی سے چھوڑا۔ حالانکہ مین یہ جانتا تھا کہ امکانات اس بات کے ہین کہ ہم یہ غنیمت کسی کو دکھانے کے لئے زندہ نہ بچین گے۔ چنانچہ مین نے بندوق باہر ڈھکیل دی اور وہ نعشون کے بیچ مین جا پڑی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے حملہ کو پسپا کر دیا تھا اور اب تک ہمین کوئی گزند بھی نہ پہونچا تھا اس کے مقابلے مین دشمن کو سخت نقصان اُٹھانا پڑا تھا۔ ہمین ایک وقتی فتح حاصل ہو گئی تھی اور ہمین اپنے انجام کے متعلق کوئی دُھوکا نہ تھا۔ ہمارے پاس گولی بارود کا سامان کافی تھا۔ اور جس قسم کے بھاری شہتیرون کی آڑ مین جن پر گولی اثر نہ کرتی تھی ہم لڑ رہے تھے ہم اس قسم کے ایک یا کئی حملون کا کامیابی سے مقابلہ کر سکتے تھے۔ لیکن اسمین بھی شک نہ تھا کہ اگر کسی درز مین سے کوئی گولی نکل چلی آتی تو وہ ہم مین سے ایک کا کام تمام کر سکتی تھی۔ اور ہمارے پاس بسکٹون کے نصف ڈبہ کے سوا کھانے پینے کا سامان بھی نہ تھا اور اس سے بڑی بات یہ تھی کہ صرف آدھی بوتل پانی کی باقی رہ گئی تھی معمولی حالات مین ہمارا کھانا ہمارا غیر حاضر ملازم ٹیٹو پکایا کرتا تھا لیکن اُس کے زمانہ جاہلیت کے باورچی خانہ کے انتظام عموماً کھلے میدان مین یا کسی درخت کے نیچے ہوا کرتے تھے اور اس قسم کے خوراک کے سامان

جیسے ہمارے پاس موجود تھے اُدھر نشیب مین ریل کی سڑک کے قریب چھپے دن مین رہا کرتے تھے
ان حالات مین اگر وحشی بیٹھ کے ہمارا محاصرہ شروع کر دیتے تو ہمارا صرف ایک ہی انجام ہوتا۔
جیسا کہ اندازہ لگا لیا گیا ہوگا ہماری گفتگو مطلق امید افزا نہ تھی۔ صرف ایک بات کا رہ رہ کے میرے باپ کو خیال آرہا تھا اور وہ یہ قلق تھا کہ اُنھون نے میرے چھوٹے بھائی کو اس مصیبت مین لا ڈالا تھا۔ اور اس صدمہ کا غم تھا جو اس ننھے بچہ کی لازمی موت اس کی محبت کرنے والی مان کے قلب کو پہونچائیگی۔ ہم برابر غور کر رہے تھے کہ ان کم بختون نے ہم پر کیون حملہ کیا اور زیادہ تر یہ کہ اب وہ کیا کرنے والے ہین؟ گو اُن سوالات کے جوابات ہمارے لیے کچھ فائدہ مند نہ تھے ان کے وجوہات کچھ بھی ہون یہ یقینی امر تھا کہ وہ ہمین مارنے آئے تھے۔ بچ نکلنے کی کوئی صورت ہی نہ تھی اور ہماری جانب سے بس یہی بات ہوسکتی تھی کہ اٹل نتیجہ اُن کے لیے حتی الامکان دشوار تر بنا دیتے اور ہم پر فتح حاصل کرنے کی قیمت اُن سے حتی المقدور زیادہ سے زیادہ لین۔

اس دفعہ انتظار نے بہت طول کھینچا جو حملہ کے جوش و خروش کی نسبت بہت بےچین کرنیوالا تھا اور میرے پٹھے ڈھیلے ہوتے جاتے تھے ہمارے چارون طرف جنگل مین سناٹا تھا لیکن بدقسمتی سے ہمین یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ اس خاموشی کے یہ معنی نہین کہ وحشی ہمین چھوڑ کے چلے گئے۔
بڑی دیر کے بعد ہم نے چیرنے پھاڑنے کی آواز سنی۔ ہم حیران تھے کہ ہمارے دشمن کیا کر رہے ہین لیکن ہمین فوراً ہی اس آواز کا مطلب معلوم ہوگیا۔ کیونکہ یکلخت طرفۃ العین مین خاموشی غل غپاڑہ مین بدل گئی۔ وحشی جھونپڑی پر ایک مرتبہ پھر چلاتے ہوے حملہ آور ہوے اور ہماری طرف جلدی جلدی بڑھتے وقت پاگلون کی طرح جھونپڑی پر فضول گولیان چلاتے آتے تھے۔ پہلے کی طرح ہم نے حتی الامکان جلد جلد گولیان چلانا شروع کردین اور حملہ آورون مین سے بہت سے مار ڈالے اتنے مین میرے والد مجھے للکار کے بولے دیکھو ادھر! ان شہتیر لانے والے آدمیون کو نشانہ بنا ؤ۔

اس وقت مین نے دیکھا کہ ۹ یا ۱۰ وحشی اپنے جھرمٹ مین ایک بہت بڑا شہتیر اُٹھائے لا رہے تھے جس سے اُن کا ارادہ ہمارے دروازہ کو پیٹ پیٹ کے توڑ دینے کا تھا۔ اُن کی یہ غرض اس شہتیر کی بدولت آسانی سے پوری ہوسکتی تھی۔ لیکن اُنھین اُس کو صرف بیس گز لانا تھا وہ ہم تک نہ پہونچ سکا۔ میرے والد کی تیز فہمی سے اُن کا یہ ارادہ کم از کم اس مرتبہ ناکام رہا کیونکہ ہم نے

اپنے طپنچون کا رُخ ادھر کرکے تنا لانے والون پر آگ برسانا شروع کردی۔ وہ ابھی آدھا ہی راستہ طے کرنے پائے تھے کہ اُن مین سے آدھے کھیت رہے اور باقیون کے بس کا اتنا بڑا بوجھ رہا دوسرے ان کی جگہ لینے کے لیے دلیری سے آگے لپکے لیکن اتنی دیر ہوگئی تھی کہ وہ وہان تک پہونچین پہونچین لکڑ دھم سے نیچے آرہا۔ اور جب یہ زمین پر جا پڑا تو کسی کا اس تک پہونچنا یقینی موت تھا۔ ایک دفعہ پھر ہمارے حملہ آور منتشر ہوکے بھاگ کھڑے ہوے اور ہم پھر عارضی فتح پر خوش ہونے کے لیے تنہا رہ گئے اور اُن کے مقمعہ (ٹھوکنے پیٹنے کے آلہ) کے اوپر اور ارد گرد مردون کا ایک ڈھیر پڑا رہ گیا۔

اس دفعہ ہم بال بال بچے کیونکہ جب مین اور میرے والد اس شہتیر والے آدمیون کی طرف متوجہ تھے ایک بالی ویر لگائے جنگجو جھونپڑی کی پشت پر چپکے سے آ نکلا اُس نے ایک درز مین اپنی بندوق کی نالی بڑا کے ہم پر پیچھے سے گولی داغ دی۔ وہ تو یہ خیر ہوئی کہ وہ نشانہ بال بال خطا گیا ہم نے گولی دروازہ کے برابر والے شہتیر مین گڑی دیکھی ہمارے ننھے جیر لڈ نے اُسے دیکھ کے اُس پر طپنچہ سر کردیا تھا اور یہ اغلب ہے کہ اس کی خبردار کرنے کی چیخ نے اُس دیسی کا نشانہ خطا کردیا۔ جیر لڈ نے ہمین بتایا کہ اُس نے اُس آدمی کو مارا نہین بلکہ زخمی کیا تھا کیونکہ وہ ڈگمگا کے پیچھے ہٹا اور بہت زخمی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن وہ رینگ کے جنگل مین جان سلامت لے جانے کے قابل تھا۔ ہمارے دشمنون کو ہمین مغلوب کرنے کے تین حملون مین بہت نقصان اُٹھانا پڑا تھا لیکن ہم جانتے تھے کہ اس سے ان کا ارادہ اور پختہ ہوجائے گا کہ ہمین کسی طرح بچ کے نہ نکلنے دین۔

اب سخت جانکاہ تعطل کا وقت ہمارے لیے شروع ہوا گھنٹہ کے بعد گھنٹہ گذرا چلا جا رہا تھا اور کوئی نئی بات واقع نہوتی تھی۔ ہم یہ امید نہین کرسکتے تھے کہ اُنھون نے اپنے شکار کو ترک کردیا ہے۔ ہمین بخوبی معلوم تھا کہ اُن کے سردار اپنے آدمیون کے اس قتل عام سے گھبرا گئے تھے اور اب اُنھون نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اس وقت تک انتظار کرین جب رات کوئی عمدہ موقع مہیا کرے۔ مین اپنی تو کہتا ہون کہ مین چاہتا تھا کہ ہم پر وہ دوبارہ حملہ کرین اور حملہ کیے ہی جائین کیونکہ مجھے اس یقینی موت کے ہولناک انتظار کے مقابلہ مین سب کچھ پسند تھا۔ ہم نے غور کیا کہ ہمارا ٹیٹو کہان ہوگا اور اُنھون نے اُسے کسطرح مار ڈالا ہوگا۔ اُنھون نے کس طرح مزدورون پر حملہ کیا ہوگا۔ اور نگران کار پر جو ایک قوی ہیکل

سکاٹلینڈری (سکاچ) تھا اور جسے اُنھون نے یقیناً اچانک آلیا ہوگا کیا گذری ہوگی ۔ورنہ وہ ان وحشیون کو خواہ اُن کی کچھ بھی تعداد ہوتی چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتا ؟ ہمین گھر برابر ان کا خیال آیا اور حسرت مین تھے کہ کسی طرح ہمارے انجام کی خبر اُن تک بھی پہونچ سکے گی کیونکہ اس کہانی کے کہنے کے لیے کوئی بھی باقی رہتا دکھائی نہ دیتا تھا۔

مین سمجھتا ہون ہم وہ آدمی تھے جنھین لوگ مذہبی کہتے ہین۔ لیکن مجھے یاد نہین آتا کہ اس مصیبت کے وقت ہم نے مذہبی اُمور پر کچھ گفتگو کی ہو۔ البتہ ایک مرتبہ یاد پڑتا ہو کہ میرے والد نے ان باتون کا ذکر کیا۔ اُنھون نے کہا افسوس بچو! تم ابھی بالکل نئی کونپل ہو۔ تھارے مرنے کا یہ وقت نہ تھا کیونکہ ابھی تم نے دنیا کا دیکھا ہی کیا ہو۔ مجھے صدمہ ہو تو یہ کہ مین تم کو اپنے ساتھ کیون لے آیا۔ لیکن اب افسوس کرنے کا کیا فائدہ ؟ اور کون اس صورت کا پہلے سے خیال کرسکتا تھا ؟ لیکن یاد رکھو کہ ہماری جانین اللہ کے قبضۂ قدرت مین ہین۔ بغیر اس کے علم و مشیّت کے ہمارا بال بھی بیکا نہین ہوسکتا۔ ہمارے لیے جو کچھ بھی ہو اُس کی رضا ہو۔ ہماری اسی مین بہتری ہو اور اگر ہم بہادری سے جان دین جیسا انگریزون کو چاہیے تو تم یقین جانو کہ اس طرح ہم اُسی کی راہ مین جان دیتے ہین اور جب ہم اس کے بعد اس کی جناب مین حاضر ہون گے اس کی ذرا بھی پروا نہ ہوگی کہ ہم کب اور کس طرح مرے تھے ؟

میرا خیال ہو کہ گو ہم بچے تھے لیکن اُن کی حالت سے ہمین عبرت حاصل ہوئی اور ہم مین ہمت مردانہ پیدا ہوگئی اور یہ خیال ہمارے لیے موجب تسکین تھا کہ کچھ بھی ہو ہم سب ایک ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہین۔

وقت گذرتا چلا گیا اور آخر کار قطبون کی جلد پھیلنے والی تاریکی ہم پر طاری ہوگئی۔ میرا خیال ہو کہ انتظار کے بوجھ نے ہماری طاقت سلب کرلی تھی۔ مجھے یاد ہو کہ مین کئی مرتبہ اونگھتے اونگھتے سنبھلا اور خیال پڑتا ہے کہ ننھا جیرلڈ کچھ دیر کے لیے غافل سوگیا تھا۔ لیکن میرے والد ایک لمحہ کے لیے بھی پہرہ سے غافل نہین ہوے۔ جب تاریکی طاری ہوگئی اور قطبی رات کی آوازین ہمارے چارون طرف پھیل گئین اُنھون نے شفقت بھرے الفاظ مین ہمارا حوصلہ بڑھایا اور پہلی مرتبہ ایک ترکیب بتائی جو معلوم ہوتا تھا کہ اُمید کی دُھندلی کرن مین سوجھی ہو۔

اُنھون نے کہا بچو! پتہ نہین یہ کیا کر رہے ہین لیکن اگر وہ جلد ظاہر نہ ہوسے تو مین حتی الامکان آہستگی سے دروازہ کھول دون گا اور ہم درختون مین سے کھسک جانیکی کوشش کرین گے۔

مین نے تردید کے طور پر کہا لیکن ابا جان وہ ہمین ہر طرف سے بھانپ رہے ہون گے۔ والد نے کہا۔ ہان۔ گمان غالب یہی ہے کہ وہ بھانپتے ہون گے لیکن کچھ موقع تو نظر آتا ہے کہ شاید ہم بچ نکلین۔ زیادہ سے زیادہ خرابی یہی ہوگا کہ اگر ہم کامیاب نہون تو ہمین مار ڈالین گے تو یہ تو یون بھی یقینی بات ہے کہ اگر ہم یہین ٹھہرے رہین تو یہی ہمارے سامنے اسی وقت پیش آئے گا۔ جب اُنھون نے یہ بات کہی تو مین اس تجربہ کو عمل مین لانے کے لیے نعل در آتش ہو گیا لیکن پھر مجھے یہ ہول سمائی کہ شاید ہم سب نہ بچ سکین اور ہم مین سے ایک مارا جائے۔ اور فرض کرو وہ والد ہی ہون تو پھر مین اور جیرلڈ کیا کرین گے؟ یا فرض کرو ننھا جیرلڈ ہی ہو پھر مجھے جینے مین کیا مزا رہ جائے گا؟ مین نے اِن خیالات کا مطلق ذکر نہین کیا لیکن اس تدبیر کے بارہ مین میرا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔

لیکن ہمارے تُند خو دشمنون نے اِس تجویز کو عمل مین لانے کا ہمین موقع ہی نہین دیا۔ اچانک تاریکی مین سے آگ کی بوچھار سی آئی اور پھر یکے بعد دیگرے بوچھارین آنا شروع ہوئین۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب ہماری چھت پر پڑ رہی تھین۔ ایک لحظہ تک ہم اس کی نوعیت کا اندازہ نہ لگا سکے لیکن اُس کے بعد فوراً ہماری سمجھ مین آ گیا کہ وحشیون کو دور کی سوجھی۔ اگرچہ ہماری جھونپڑی کی دیوارین زمین مین بہت نیچے تک دبے ہوئے بھاری ادھورے شہتیرون کی بنی ہوئی تھین۔ لیکن اسکی چھت کھجور کے پتون سے پٹی ہوئی تھی۔ ہمارے دشمنون نے ہمارے کمزور مقام کو تاڑ لیا تھا اور اب وہ تیل مین ڈوبی ہوئی روئی سے بندھے جلتے ہوئے تیر چھت کی طرف چلا رہے تھے۔

چند ہی لمحون مین ہماری چھت بھڑک اُٹھی۔ جھونپڑی اندھا کرنے والے دھوئین سے بھر گئی۔ اور جلتے ہوئے ٹکڑے ہمارے ہر طرف گرنے لگے۔ ہم ان ٹکڑون پر کود کود کے اُنھین بُجھا دیتے تھے۔ ورنہ ہم سب جُھلس کے رہ جاتے۔ ہم تو اپنی جانون کے لیے اِن شعلون سے کشمکش کر رہے تھے اور دیسی اپنے چوبی گرز (مقمعہ) کی طرف دوڑے اور اُسے اُٹھا کے ہماری طرف حملہ کر کے آئے۔ زبردست

دھماکے سے دروازہ اور اس کی تّی اپنے سہاروں سے نکل کے آپڑے اور ایک ہی لحظہ مین ہم اپنے دشمنون کے نرغہ مین آگئے۔ ہمین دھوئین مین کچھ نظر نہ آتا تھا لیکن چھت کا بہت سا حصہ گر چکا تھا اور روشنیون کے ہلّہ مین شعلے دب کے بجھ گئے۔

میرے والد نے پکار کے کہا۔ کمر سے کمر ملالو۔ اور ایک لحظہ مین کسی طرح وہ مین اور ننھا جیرلڈ جھونپڑی کے بیچ مین سُرخون کے تعفن خیز ہجوم کے نرغہ مین جو ہر طرف سے ہم پر ایک ساتھ حملہ کر رہے تھے ایک دوسرے سے مل گئے۔ اُس وقت بھی ہمارے طپنچے گونج رہے تھے۔ مین کہتا ہون کہ ایک یا دو میرے پہلو مین چت ہو گئے۔ لیکن پیچھے سے میرے سر پر ایک زبردست چوٹ پڑی اور پھر مجھے کچھ دیر کے لیے کچھ ہوش نہ رہا کہ کیا ہوا اور کیا نہین ہوا۔

کچھ دیر بعد (مین کسی طرح نہین بتا سکتا کہ کتنی دیر بعد) مجھے ہوش آیا۔ مین دماغ پر زور ڈالتا ہون تو معلوم ہوتا ہی مجھے ہوش بہت آہستہ آیا اور طبیعت مین انتشار تھا۔ پہلے پہل مجھے درد کا عجیب طرح کے متواتر ہچکولون کا، ان ہچکولون کے بند ہو جانے اور سکون سے پڑے رہنے کی خواہش کا موہوم سا احساس ہوا۔ لیکن یہ جاری رہے اور بے آرامی کا احساس بڑھتا چلا گیا۔ مجھے جلد ہی کچھ یونہی سا ہوش آیا کہ مین کسی طرف چلا جا رہا ہون یا یون کہیے کہ مجھے کسی عجیب طرح کے بھدّے اور بے آرام طریقہ سے لیجایا جا رہا ہی۔ میرا خیال ہی کہ بہت دیر تک مجھے لڑائی کی یا دیسیون کی یا کسی اور بات کی یاد میرے دل سے محو رہی اور مین اس نیم بیہوشی کی حالت مین بہت دیر تک رہا ہون گا۔ یہ مجھے ناقابل اختتام گھڑیان معلوم ہوتی تھاین گو سچ یہ ہی کہ دراصل یہ چند ہی لحظے ہون گے (یہ معلوم کرنے کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہین) لیکن جب میرے ہوش وحواس رفتہ رفتہ عود کرنے لگے تو مجھے یہ معلوم ہوا کہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مین بے طرح گھسٹا اور اُوپر سے کسی چیز سے ٹکراتا اور نچتا جاتا تھا اور اُدھر نیچے سے کسی غیر آرام دہ طریقہ سے بندھا ہوا تھا۔

جہانتک مجھسے ہوسکتا ہی مین اپنے ہوش مین آنے کے صحیح جذبات بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہون اور حالت یہ ہی کہ مین پوری طرح ان کا اظہار نہین کر سکتا۔ کیونکہ یہ ہوشمندی من کل الوجوہ ناقابل بیان مبہم اور دھندلی تھی اور مین ان جذبات کی وجوہات قائم کرنے کے یا یہ سمجھنے کے کہ میرے ساتھ کیا پیش آرہا ہی بالکل ناقابل تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ کسی طرح مجھپر القا ہوا کہ مین کسی گھوڑے یا

خچر کی پشت پر ہوں اور ہچکولے گویا ناہموار زمین پر اُس کے ٹھوکر کھانے سے پیدا ہو رہے ہیں اور خراشیں ان درختوں کی نیچے لٹکی ہوئی شاخوں سے جن کے نیچے سے ہم گذر رہے تھے مجھے آرہی ہیں۔

میری رائے میں جب میرے خیالات نے یہاں تک یاری دی تو ایک قسم کی جھرجھری کے ساتھ میرے ہوش و حواس واپس آگئے اور اچانک میرے اندر بیداری کی سی کیفیت طاری کرنے لگے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں اس جانور کی کمر پر بندھا ہوں اور اُس کے ساتھ اسی قسم کے اور بھی جانور ہیں جن میں بعض اسباب کے گٹھڑوں سے لدے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور باقیوں پر دیسی سوار تھے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ بہت سے دیسی ہمارے اردگرد پیدل تھے۔ پھر ایک صدمہ کے ساتھ میری یاد تازہ ہوگئی اور مجھے معلوم ہوا کہ جلتی ہوئی جھونپڑی میں کسی چوٹ سے میں بیہوش ہوا ہوں گا اور وہیں مار ڈالنے کی بجائے یہ دیسی لوگ مجھے قیدی بنا کے لیے جا رہے ہیں۔

ہم جنگل میں ابھی تیز رفتاری سے چل رہے تھے۔ دران درختوں کے نیچے اندھیرا گھٹا ٹوپ تھا لیکن تقریباً میرے ہوش میں آتے ہی ہم ایک قسم کی کھلی فضا میں آگئے۔ جہاں میں دھندلکے میں سوار اور دوڑتے ہوئے وحشیوں کو جن میں ہم محصور تھے دیکھا۔ میرا پہلا خیال یہ تھا کیا میرے ابا بھی قید میں اور میرے منہ سے ابا کا لفظ زور سے نکلا۔ میں نے تو اُسے چیخ کی طرح نکالنا چاہا تھا لیکن میں یہ واقعہ کے طور پہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ بس ایک کمزور چیخ تھی۔ ایک لمحہ تک خوفناک کشمکش و پیچ رہا اور پھر شکر گزاری کی ایک بڑی لہر مجھ میں دوڑی۔ جیسے ہی میں نے ان کی خوش آیند آواز جواب میں اپنے سامنے کے دھندلے انبوہ میں سے کسی جگہ سے آتی سُنی۔ وہ چلائے۔ آہا میرے بچے تم تو زندہ ہو۔ تمھیں زیادہ چوٹ تو نہیں لگی؟

میں نے جواب میں پکار کے کہا میرا خیال ہے نہیں۔ لیکن میرے سر میں گرانی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن کیا آپ کے بھی چوٹ لگی ہے؟

مجھے جواب میں صرف "نہیں" سننے کا موقع ملا کہ ایک دیسی نے اپنا منہ میرے منہ پر اندر بڑھنے کے وحشیانہ طور سے خاموش رہنے کو کہا۔ اور اسی وقت میں نے اپنے سامنے کسی قسم کی کشمکش دیکھی جس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ میرے والد کے گرد حلقہ کر کے انھیں بھی خاموش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جس آدمی نے مجھے روکا تھا ایک قسم کی مخلوط ہسپانوی زبان میں بولا تھا جو آدھی ہسپانوی تھی اور

آدمی برتنا ان۔ لیکن ایک عجیب موٹے لہجے اور گلے ہی گلے مین بولا تھا کہ قریب قریب یہ الفاظ ناقابل فہم ہو گئے۔ لیکن جب یہ میرے آس پاس کے بدمعاش آپس مین بات چیت کرتے جو شاذ و نادر ہی ہوتی تھی وہ اپنی ہی زبان مین بولتے جسے مین ذرا بھی نہین جانتا تھا۔

مین حبشیون سے اُن کی عجیب لنگوا فرینکا مین جو وہ بولتے ہین خوب باتین کر سکتا تھا چنانچہ مین نے اس مین اپنے آس پاس کے وحشیون سے یہ پوچھنے کی کوشش کی کہ وہ ہمین کہان لئے جا رہے ہین اور میرا چھوٹا بھائی کہان ہے لیکن یا تو ان کی سمجھ مین میری باتین نہین آئین یا وہ سمجھنا نہ چاہتے تھے بہر حال انھون نے اس سے زیادہ اور کوئی جواب نہین دیا کہ انھون نے جب مین نے اپنے والد کو دوبارہ پکارنا چاہا۔ اکھڑے پن سے مجھے چپ رہنے کا حکم دیا۔ اس کے کچھ دیر بعد تک مین ننھے جیرلڈ کے انجام کے متعلق متفکر تھا لیکن آخرکار جب ہم ایک کھلے میدان سے گذر رہے تھے مجھے اُسے زندہ اور بظاہر بے چوٹ دیکھ کے بڑی خوشی ہوئی۔ ایک شخص جو ان وحشیون مین کچھ رتبہ کا معلوم ہوتا تھا سواری کی حالت مین اسے اپنے سامنے اپنے گھوڑے کی گردن پر بٹھائے تھامے ہوئے تھا۔ مین نے اُس سے پکار کے پوچھا کہ اُسے کوئی ضرب تو نہین پہونچی اُس نے جواب مین پکار کے کہا "نہین کچھ زیادہ نہین" اور میرا خیال ہے کہ اُس نے میری بابت بھی پوچھا لیکن جو آدمی اُسے تھامے ہوئے تھا اُس نے بری طرح جھنجھوڑ کے چُپ رہنے کا حکم دیا گیا۔ اب چونکہ میرا دل میرے والد اور بھائی کی حالت سے مطمئن ہو گیا مجھے اپنی حالت پر غور کرنے کی فرصت تھی لیکن یہ غور کرنے پر کچھ بھی واضح نہوئی۔ مین نے دیکھا کہ مجھے بالکل ننگا کر دیا گیا ہے اور نہایت مضبوطی سے میری مشکین کسی ہوئی ہین اور میرے ٹخنے ایک رسّی یا چمڑے کے تسمہ سے جو میرے گھوڑے کی پیٹ کے نیچے سے نکالا ہوا ہے بندھے ہوے ہین۔

میرے آگے کی طرف کمبلون کی گٹھری کی قسم کی کوئی چیز تھی اس سے بھی مین بظاہر ایک رسی سے جو گھوڑے سے بندھی ہوئی تھی کسا ہوا تھا۔ مین بیہوشی کی حالت مین غالباً اس لپٹی ہوئی گٹھری پر اُس سے بندھا ہوا پڑا رہا ہون گا۔ گویا مین خود بھی ایک گٹھری تھا اور اب ہوش آنے پر بھی مین بیٹھنے اور اچھی طرح سوار ہونے یا ان درختون کی جھکی ہوئی شاخون سے جن کے نیچے سے ہم گذر رہے تھے اپنے آپ کو بچانے کے لیے ہاتھ بڑھانے کے بالکل ناقابل تھا۔ میری حالت نہایت سقیم اور غیر آرام دہ

تھی اور جب اس پر یہ امر مستزاد کیا جائے کہ میرا سر اُس چوٹ سے جسکے لگنے سے مین بیہوش ہوگیا بُری طرح درد کر رہا تھا تو آپ آسانی سے سمجھ سکین گے کہ مین کسی خاص ہمت افزا حالت مین نہ تھا۔

جہانتک مین مسلسل غور کر سکا مجھے یقین ہر کہ مین نے اپنا کثیر وقت اس حالت پر متحیر ہونے مین صرف کیا جسمین ہم نے اپنے آپ کو پایا۔ یہ دیسی کون لوگ تھے اور اُس وحشیانہ طور سے جیسا انھون نے عمل کیا ہم پر حملہ کرنے اور پھر ہم کو اُسی وقت مار ڈالنے کی بجاے قیدی بنا کے لے جانے سے اُن کی کیا غرض ہو سکتی تھی؟ بہت سی کہانیون کے سننے سے یہ مجھے بخوبی معلوم تھا کہ قید کرنے کا ان کے ہان دستور نہین۔ اور اگرچہ سانس کے ساتھ آس ہے اور یہ ایک نعمت غیر مترقبہ تھی کہ اُنھون نے اب تک ہماری جانین بخش رکھی تھین لیکن مین ضرور مانون گا کہ جتنا مین اپنے اغلب مستقبل کے متعلق غور کرتا تھا اتنا ہی مجھے یہ ناخوشگوار نظر آتا تھا۔

ایسی بھیانک اور بے آرام حالت مین یہ یقین کی بات نہین معلوم ہوتی لیکن مجھے یقین ہر کہ مین واقعی سو گیا یا کم از کم اُونگھ گیا کیونکہ مجھے دن طلوع ہونے کی مطلق خبر نہین۔ اس وقت پورا دن نکل آیا تھا جب میرا گھوڑا ایک جھٹکے کے ساتھ رُکا اور مین اس احساس کے ساتھ جاگ اُٹھا کہ آخرکار ہم اس ناقابل اختتام جنگل سے باہر نکل آئے ہین۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب مین نے اِن دیسیون کے جھونپڑون کے بجاے ایک لشکر کے خیمے سے دیکھے اور اُس نظارہ سے مجھے امید کی ایک اچانک چمک معلوم ہوئی جس نے حیرت انگیز طریقہ سے مجھے بالکل متوحش کر دیا۔ اگر یہان فوجی خیمے ہین تو یقیناً یہان مہذب لوگ بھی ہون گے کیونکہ یہ دیسی لوگ ہمین مار ڈالنے کی بجاے اِس جگہ لے آئے ہین تو کیا بالآخر بچ نکلنے کی کوئی امید ممکن نہین؟ اس کے جو کچھ بھی معنی ہون اُن سے میرے پہلے خیالات مین کوئی اضافہ نہین ہوا۔ لیکن کم از کم یہ ہماری سواری کے سفر کے اس بھیانک انجام سے بالکل جداگانہ چیز تھا جس کی میرے اندیشے میرے سو جانے کے وقت مجھے توقع کرنے کی تحریک کر رہے تھے

(باقی آئندہ)

محمد ظفر

# افادات شاد

نظر ٹھہرا کے دیکھو او نقش باطل دیکھنے والے
سمجھ اِس نقش باطل کا بھی حاصل دیکھنے والے

وہ خنجر یون ہزار انداز معشوقانہ دکھلائے
نہ دیکھین گے پلٹ کر سوئے قاتل دیکھنے والے

تغافل کا ترے شکوہ تو ہو سارے زمانہ کو
مگر کچھ اور ہی سمجھے ہین عاقل دیکھنے والے

قیامت کر رہی ہین وہ نگاہین شرم آلودہ
ہوئے جاتے ہین بے شمشیر گھائل دیکھنے والے

لیے جاتا ہی طوفان ادر جانب تیری کشتی کو
ذرا آنکھین اُٹھا او سوے ساحل دیکھنے والے

کوئی جا حُسن کے جلوے سے عالم مین نہین خالی
بڑی حیرت ہی کس کس پہ ہون مائل دیکھنے والے

ہر اک جلوہ کے پردے مین بھی لاکھون لاکھ جلوے ہین
کرشمے تیرے کیا دیکھین گے بابل دیکھنے والے

ذرا تقدیر کے بھی مسئلہ کو دیکھ کھول آنکھین
حقارت کی نظر سے سوے سائل دیکھنے والے

نہ جب تک قیس سا وحشی ملے پردہ نہ اُٹھے گا
عبث چلاتے ہین لیلیٰ کی محمل دیکھنے والے

حقیقت مین وجود اپنا بھی ہی ہم بھی معترض ہین
مگر سمجھے ہین یہ بھی زعم باطل دیکھنے والے

وہ شے باقی کہان جس شی کی سب کو بدگمانی ہی
ٹٹولین آکے سینہ کو مرے بے دل دیکھنے والے

جھلک کچھ کچھ نظر آئیگی گو پردون پہ پردے ہین
ہوس گر ہو تو آئین میرے شامل دیکھنے والے

نہین کچھ خوف رستہ کا اگر اے خضر ڈر یہ ہی
نہ ہمت ہار بیٹھین بُعدِ منزل دیکھنے والے

طلب کرتے نہین ساقی سے گو افراطِ مے ہی
زبان روکے ہوئے ہین رنگِ محفل دیکھنے والے

نہ ان غزلون کو یون ضایع کرو ای شاد رہنے دو
وہ دیکھین گے جو ہین کامل سے کامل دیکھنے والے

# ہندوستان کے مشہور شہر اور قصبے

جسکے

حصۂ اول میں اُن مقامات کی فہرست درج ہے جن کی آبادی ۲۰ ہزار یا اس سے زیادہ ہے
حصۂ دوم " " " " " " " یا اس سے کم ہے
حصۂ سوم " " " " " جن کی تخمینی آبادی ۵ ہزار یا اس سے کچھ زیادہ ہے

## صوبہ جات ہند معہ رقبہ و آبادی

| نام صوبہ | رقبہ بحساب میل مربع | آبادی | نام صوبہ | رقبہ بحساب میل مربع | آبادی |
|---|---|---|---|---|---|
| برما | ۲۳۶۷۳۸ | ۱۰۲۵۰۰۰۰ | بہار و اڑیسہ | ۱۱۳۰۰۰ | ۳۵۰۰۰۰۰۰ |
| مدراس | ۱۴۱۷۲۶ | ۴۱۴۰۵۴۰۴ | صوبہ متحدہ | ۱۱۲۶۱۶ | ۴۸۵۰۰۰۰۰ |
| بنگال و آسام | ۱۲۶۰۰۰ | ۴۸۱۲۲۲۰۱ | پنجاب و سرحد | ۱۱۰۴۰۶ | ۲۲۰۰۰۰۰۰ |
| بمبئی | ۱۲۳۰۶۴ | ۱۹۶۷۲۶۴۲ | سی پی و برار | ۱۰۰۳۴۵ | ۳۰۰۰۰۰۰۰ |

رقبے کے لحاظ سے دیکھئے تو ہمارا صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ صوبۂ "پنجاب و سرحد" اور صوبۂ "بہار و اڑیسہ" کے برابر، صوبہ برما سے بہت چھوٹا، صوبہ مدراس، صوبہ بمبئی نیز صوبۂ "بنگال و آسام" سے چھوٹا اور صرف "سی پی و برار" سے کسی قدر بڑا ہے لیکن کثرت آبادی اور تہذیب و تمدن کے لحاظ سے اِن صوبوں میں سے کوئی بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ہندوستان کی ۲۰ ہزار سے زیادہ آبادی رکھنے والے ۲۰۰ مقامات میں سے ۴۰ صرف اسی ایک صوبہ میں واقع ہیں۔ باقی ۱۶۰ میں سے ۲۸ مدراس، ۲۲ پنجاب و سرحد، ۱۹ بمبئی، ۱۶ بنگال و آسام، ۱۳ بہار و اڑیسہ، ۷ سی پی و برار، ۴ ریاست حیدرآباد، ۳ صوبہ برما، ۴ ریاست گوالیار، ۳ ریاست بڑودہ، ۳ ریاست اندور، ۲ ریاست میسور، ۲ ریاست کشمیر، ۲ ریاست بھرتپور اور ایک ایک علاقہ دہلی، اجمیر، پانڈیچری، چند رنگر، نیپال نیز ریاستہائے دھولپور، جیپور، اودیپور، بھوپال

جودھپور، بھاؤنگر، بیکانیر، الور، پٹیالہ، نوانگر، کولھاپور، رام پور، ٹونک، میرج، جونا گڑھ، کوٹہ، رتلام۔ ریوان، ٹراونکور، پوربندر، دوھوان، بوندی، دتیا، جاورہ، مالیرکوٹلہ، قرولی، بھج، اور بھاولپور میں واقع ہیں۔

حصۂ اول کے ان ۲۰۰ شہروں حصۂ دوم وسوم کے ۳۰۰ اور مقامات بھی شامل کرلیے جائیں تو ہمارے صوبہ کا درجہ امتیاز اور بھی زیادہ بلند ہوجاتا ہے کیونکہ ہندوستان کے مشہور شہروں ضلعوں اور قصبوں کی اس مجموعی تعداد ۵۰۰ میں سے ۱۰۸ یعنی ⅕ سے زیادہ صرف اسی ایک صوبہ میں واقع ہیں۔ باقی ۳۰۲ میں سے بنگال وآسام میں ۴۶، پنجاب وسرحد میں ۱۵، مدراس میں ۴۵، بہار و اُڑیسہ میں ۲۵، سی۔پی میں ۲۳، حیدرآباد میں ۱۱، گوالیار میں ۴، میسور، برودہ، اندور اور بھرتپور میں تین تین کشمیر، بھاولپور اور ریوان میں دو دو باقی میں صرف ایک ایک ہے۔

| نمبر | نام شہر | صوبہ | آبادی معہ کیفیت | نمبر | نام شہر | نام صوبہ | آبادی معہ کیفیت |
|---|---|---|---|---|---|---|---|
| ۱ | کلکتہ | بنگال | ۱۲۳۲۲۳۱۳ | ۱۳ | آگرہ | یو۔پی | ۱۸۲۴۳۹ |
| ۲ | بمبئی | بمبئی | ۱۰۰۰۰۰۰ | ۱۴ | الہ آباد | ″ | ۱۷۵۷۴۸ |
| ۳ | مدراس | مدراس | ۵۱۸۰۰۰ | ۱۵ | امرتسر | پنجاب | ۱۶۲۰۰۰ |
| ۴ | حیدرآباد | دکن | ۴۴۹۰۰۰ ریاست | ۱۶ | دھولپور | دھولپور | ۱۶۱۰۰۰ ریاست |
| ۵ | دہلی | دہلی | ۳۹۱۰۰۰ | ۱۷ | بنگلور | میسور | ۱۵۹۰۳۰ ریاست |
| ۶ | لکھنؤ | یو۔پی | ۲۶۵۰۰۰ | ۱۸ | ہاوڑہ | بنگال | ۱۵۲۰۰۰ |
| ۷ | رنگون | برما | ۲۵۰۰۰۰ | ۱۹ | جےپور | جےپور | ۱۵۰۰۰۰ ریاست |
| ۸ | لاہور | پنجاب | ۲۳۰۰۰۰ | ۲۰ | بریلی | یو۔پی | ۱۳۷۴۳۳ |
| ۹ | احمدآباد | بمبئی | ۲۱۵۰۰۰ | ۲۱ | پٹنہ | بہار | ۱۳۵۰۰۰ |
| ۱۰ | بنارس | یو۔پی | ۲۰۹۰۰۰ | ۲۲ | ناگپور | سی۔پی | ۱۳۰۰۰۰ |
| ۱۱ | کانپور | ″ | ۲۰۰۰۰۰ | ۲۳ | ترچناپلی | مدراس | ۱۲۲۱۸۰ |
| ۱۲ | مانڈلے | برما | ۱۸۲۵۰۰ | ۲۴ | سری نگر | کشمیر | ۱۲۲۰۰۰ ریاست |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| ۲۵ | سورت | بمبئی | ۱۲۰۰۰۰ | |
| ۲۶ | کراچی | سندھ بمبئی | ۱۲۰۰۰۰ | |
| ۲۷ | میرٹھ | یو-پی | ۱۲۰۰۰۰ | |
| ۲۸ | پونا | بمبئی | ۱۱۲۵۸۰ | |
| ۲۹ | مدورا | مدراس | ۱۰۵۵۵۰ | |
| ۳۰ | گوالیار | گوالیار | ۱۰۵۰۰۰ | ریاست |
| ۳۱ | برودہ | برودہ | ۹۹۳۴۹ | ریاست |
| ۳۲ | اندور | اندور | ۹۸۷۵۰ | ریاست |
| ۳۳ | ڈھاکہ | بنگال | ۹۱۰۰۰ | |
| ۳۴ | پشاور | صوبہ سرحد | ۹۰۴۴۰ | |
| ۳۵ | جگناتھ پوری | بہار واڑیسہ | ۸۹۰۰۰ | |
| ۳۶ | اجمیر | اجمیر | ۸۶۲۷۳ | |
| ۳۷ | سیالکوٹ | پنجاب | ۸۱۶۴۸ | |
| ۳۸ | انبالہ | ″ | ۸۰۰۰۰ | |
| ۳۹ | مرزاپور | یو-پی | ۷۹۵۰۰ | |
| ۴۰ | بھوپال | بھوپال | ۷۸۵۰۰ | ریاست |
| ۴۱ | ملکاپور | سی-پی | ۷۸۴۶۰ | |
| ۴۲ | رامپور | رامپور | ۷۸۲۱۶ | ریاست |
| ۴۳ | ملتان | پنجاب | ۷۶۴۸۰ | |
| ۴۴ | مرادآباد | یو-پی | ۷۶۴۲۴ | |
| ۴۵ | شولاپور | بمبئی | ۷۶۴۰۰ | |
| ۴۶ | جبل پور | سی-پی | ۷۶۲۰۰ | |
| ۴۷ | شاہجہانپور | یو-پی | ۷۶۰۰۰ | |
| ۴۸ | فیض آباد | یو-پی | ۷۵۰۰۰ | |
| ۴۹ | بھاگلپور | بہار واڑیسہ | ۷۵۰۰۰ | |
| ۵۰ | راولپنڈی | پنجاب | ۷۵۰۰۰ | |
| ۵۱ | سالم | مدراس | ۷۲۰۰۰ | |
| ۵۲ | میسور | میسور | ۷۱۳۰۰ | ریاست |
| ۵۳ | گیا | بہار | ۷۱۰۰۰ | |
| ۵۴ | علی گڑھ | یو-پی | ۷۰۱۲۷ | |
| ۵۵ | حیدرآباد سندھ | بمبئی | ۷۰۰۰۰ | |
| ۵۶ | دربھنگا | بہار | ۶۶۰۰۰ | |
| ۵۷ | سہارنپور | یو-پی | ۶۴۰۰۰ | |
| ۵۸ | گورکھپور | ″ | ۶۳۵۰۰ | |
| ۵۹ | فرخ آباد | ″ | ۶۳۰۰۰ | |
| ۶۰ | ہبلی | بمبئی | ۶۰۰۰۰ | |
| ۶۱ | جودھپور | جودھپور | ۶۰۵۰۰ | |
| ۶۲ | چھپرا | بہار | ۶۰۰۰۰ | |
| ۶۳ | جھانسی | یو-پی | ۶۰۰۰۰ | |
| ۶۴ | بھاونگر | بھاونگر | ۶۰۰۰۰ | ریاست |
| ۶۵ | متھرا | یو-پی | ۵۹۸۶۰ | |
| ۶۶ | کڈپور | مدراس | ۵۹۰۰۰ | |
| ۶۷ | نگاپٹم | ″ | ۵۸۵۴۵ | |
| ۶۸ | بیکانیر | بیکانیر | ۵۸۰۰۰ | ریاست |
| ۶۹ | تانجور | مدراس | ۵۸۵۰۰ | |
| ۷۰ | بلاری | ″ | ۵۸۰۰۰ | |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| ۷۱ | الور | الور | ۵۶۷۴۰ | ریاست |
| ۷۲ | پٹیالہ | پٹیالہ | ۵۶۴۲۸ | ریاست |
| ۷۳ | مولمین | برما | ۵۶۰۰۰ | |
| ۷۴ | سراج گنج | بنگال | ۵۶۰۰۰ | |
| ۷۵ | شکارپور سندھ | بمبئی | ۵۴۴۱۶ | |
| ۷۶ | فیروزپور | پنجاب | ۵۴۰۰۰ | |
| ۷۷ | کوئمبٹور | مدراس | ۵۴۰۰۰ | |
| ۷۸ | پانڈیچری | پانڈیچری | ۵۲۶۰۰ | فرنچ |
| ۷۹ | جلندھر | پنجاب | ۵۲۲۰۰ | |
| ۸۰ | نوانگر | نوانگر | ۵۰۸۶۰ | ریاست |
| ۸۱ | لدھیانہ | پنجاب | ۵۰۸۰۰ | |
| ۸۲ | کولھاپور | کولھاپور | ۵۰۰۰۰ | ریاست |
| ۸۳ | بھرت پور | بھرت پور | ۵۰۰۰۰ | ریاست |
| ۸۴ | کھٹ پانڈو | نیپال | ۵۰۰۰۰ | آزاد ریاست |
| ۸۵ | امراؤتی | برار | — | |
| ۸۶ | کوکونڈا | مدراس | ۴۸۵۰۰ | |
| ۸۷ | آرہ | بہار | ۴۸۰۰۰ | |
| ۸۸ | کانجی درم | مدراس | ۴۷۲۰۰ | |
| ۸۹ | اُدے پور | اُدے پور | ۴۵۸۰۰ | ریاست |
| ۹۰ | ساگر | سی۔پی | ۴۵۶۸۰ | |
| ۹۱ | کامٹی | " | ۴۵۴۰۰ | |
| ۹۲ | مظفرپور | بہار | ۴۵۱۰۰ | |
| ۹۳ | داناپور | " | ۴۵۰۰۰ | |
| ۹۴ | احمدنگر | بمبئی | ۴۵۰۰۰ | |
| ۹۵ | منگلور | ملیبار مدراس | ۴۴۵۶۰ | |
| ۹۶ | پالگھاٹ | مدراس | ۴۴۲۰۰ | |
| ۹۷ | ویلور | " | ۴۴۱۶۰ | |
| ۹۸ | ہاتھرس | یو۔پی | ۴۳۲۰۰ | |
| ۹۹ | جونپور | " | ۴۲۵۰۰ | |
| ۱۰۰ | سیرام پور | بنگال | ۴۰۵۰۰ | |
| ۱۰۱ | مچھلی پٹن | مدراس | ۳۹۴۰۶ | |
| ۱۰۲ | غازی پور | یو۔پی | ۳۹۰۰۰ | |
| ۱۰۳ | ٹونک | ٹونک | ۳۹۰۰۰ | ریاست |
| ۱۰۴ | بھوانی | پنجاب | ۳۸۶۰۰ | |
| ۱۰۵ | ٹلی چری | مدراس | ۳۸۵۰۰ | |
| ۱۰۶ | بدایون | یو۔پی | ۳۸۰۰۰ | |
| ۱۰۷ | اٹاوہ | " | ۳۸۰۰۰ | |
| ۱۰۸ | پٹن | برودہ | ۳۶۳۲۰ | ریاست |
| ۱۰۹ | اجین | گوالیار | ۳۶۱۲۴ | ریاست |
| ۱۱۰ | امروہہ | یو۔پی | ۳۶۰۰۰ | |
| ۱۱۱ | نوساری | برودہ | ۳۵۴۸۳ | ریاست |
| ۱۱۲ | جوناگڈھ | جوناگڈھ | ۳۵۰۰۰ | ریاست |
| ۱۱۳ | مرشدآباد | بنگال | ۳۵۰۰۰ | |
| ۱۱۴ | منگیر | بہار | ۳۵۰۰۰ | |
| ۱۱۵ | وزیگاپٹم | مدراس | ۳۵۰۰۰ | |
| ۱۱۶ | بردوان | بنگال | ۳۵۰۰۰ | |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| ۱۱۷ | پیلی بھیت | یو۔پی | ۳۵۰۰۰ | |
| ۱۱۸ | احمد پور | بھاولپور | ۳۵۰۰۰ | ریاست |
| ۱۱۹ | جموں | کشمیر | ۳۴۲۰۷ | ریاست |
| ۱۲۰ | دھارواڑ | بمبئی | ۳۴۰۰۰ | |
| ۱۲۱ | وزیانگرم | مدراس | ۳۳۸۶۲ | |
| ۱۲۲ | کوٹہ | کوٹہ | ۳۳۵۰۰ | ریاست |
| ۱۲۳ | مدناپور | بنگال | ۳۳۰۰۰ | |
| ۱۲۴ | میرج | میرج | ۳۲۸۲۸ | ریاست |
| ۱۲۵ | سکھر | سندھ بمبئی | ۳۲۵۸۴ | |
| ۱۲۶ | راجمہندری | مدراس | ۳۲۴۶۰ | |
| ۱۲۷ | ندیاد | بمبئی | ۳۱۴۸۳ | |
| ۱۲۸ | سانتی پور | بنگال | ۳۱۰۵۶ | |
| ۱۲۹ | نیلور | مدراس | ۳۰۸۴۰ | |
| ۱۳۰ | ہردوار | یو۔پی | ۳۰۴۰۰ | |
| ۱۳۱ | کوہاٹ | سرحد | ۳۰۲۶۰ | |
| ۱۳۲ | کنانور | ملیبار مدراس | ۳۰۰۰۰ | |
| ۱۳۳ | چندوسی | یو۔پی | ۳۰۰۰۰ | |
| ۱۳۴ | خورجہ | 〃 | ۳۰۰۰۰ | |
| ۱۳۵ | چٹگام | بنگال | ۳۰۰۰۰ | |
| ۱۳۶ | بارکپور | 〃 | ۳۰۰۰۰ | |
| ۱۳۷ | چینورہ | 〃 | ۳۰۰۰۰ | |
| ۱۳۸ | ستارا | بمبئی | ۳۰۰۰۰ | |
| ۱۳۹ | برہان پور | 〃 | ۳۰۰۰۰ | |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| ۱۴۰ | سکندرآباد | حیدرآباد | ۳۰۰۰۰ | ریاست |
| ۱۴۱ | ڈیرہ غازی خاں | سرحد | ۳۰۰۰۰ | |
| ۱۴۲ | رتلام | رتلام | ۲۹۵۸۰ | ریاست |
| ۱۴۳ | بانکوڑا | بنگال | ۲۹۰۰۰ | |
| ۱۴۴ | ریواڑی | پنجاب | ۲۸۸۶۰ | |
| ۱۴۵ | پانی پت | 〃 | ۲۸۶۶۲ | |
| ۱۴۶ | منڈسور | گوالیار | ۲۸۴۶۰ | ریاست |
| ۱۴۷ | ٹوٹیکورن | مدراس | ۲۸۱۱۴ | |
| ۱۴۸ | ٹریونڈرم | ٹراونکور | ۲۸۰۰۰ | ریاست |
| ۱۴۹ | گجرانوالہ | پنجاب | ۲۷۰۰۰ | |
| ۱۵۰ | بٹالہ | 〃 | ۲۷۰۰۰ | |
| ۱۵۱ | بہرائچ | یو۔پی | ۲۷۰۰۰ | |
| ۱۵۲ | ڈیرہ اسمٰعیل خاں | سرحد | ۲۷۰۰۰ | |
| ۱۵۳ | دتیا | دتیا | ۲۷۰۰۰ | ریاست |
| ۱۵۴ | کرنول | مدراس | ۲۶۷۴۵ | |
| ۱۵۵ | بھج | بھج | ۲۶۵۰۰ | ریاست |
| ۱۵۶ | بیلگاؤں | بمبئی | ۲۶۲۳۷ | |
| ۱۵۷ | اورنگ آباد | حیدرآباد | ۲۶۲۶۵ | ریاست |
| ۱۵۸ | کرشن نگر | بنگال | ۲۶۰۵۰ | |
| ۱۵۹ | ادونی | مدراس | ۲۶۰۰۰ | |
| ۱۶۰ | ڈیرہ دون | یو۔پی | ۲۶۰۰۰ | |
| ۱۶۱ | بندرابن | یو۔پی | ۲۶۰۰۰ | |
| ۱۶۲ | چندرنگر | چندرنگر | ۲۶۰۰۰ | پرنگال |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| ۱۶۳ | سیتاپور | یو۔پی | ۲۵۱۱۲ | |
| ۱۶۴ | ناسک | بمبئی | ۲۵۱۰۰ | |
| ۱۶۵ | دوھولن | دوھولن | ۲۵۰۴۲ | ریاست |
| ۱۶۶ | برہام پور | بنگال | ۲۵۰۰۰ | |
| ۱۶۷ | گنتور | مدراس | ۲۵۰۰۰ | |
| ۱۶۸ | ڈنڈیگل | " | ۲۵۰۰۰ | |
| ۱۶۹ | نگینہ | یو۔پی | ۲۴۶۶۰ | |
| ۱۷۰ | نرار | گوالیار | ۲۴۵۰۰ | ریاست |
| ۱۷۱ | ریوان | ریوان | ۲۴۱۱۸ | ریاست |
| ۱۷۲ | نیمچ | اندور | ۲۴۱۰۹ | ریاست |
| ۱۷۳ | بتیا | بہار | ۲۴۰۰۰ | |
| ۱۷۴ | گدگ | بمبئی | ۲۴۰۰۰ | |
| ۱۷۵ | بجواڑا | مدراس | ۲۴۰۰۰ | |
| ۱۷۶ | قردلی | قردلی | ۲۴۰۰۰ | ریاست |
| ۱۷۷ | نرائن گنج | بنگال | ۲۳۱۲۰ | |
| ۱۷۸ | حاجی پور | بہار | ۲۳۰۰۰ | |
| ۱۷۹ | باندا | یو۔پی | ۲۳۰۰۰ | |
| ۱۸۰ | دیوبند | " | ۲۳۰۰۰ | |
| ۱۸۱ | بوندی | بوندی | ۲۲۵۴۴ | ریاست |
| ۱۸۲ | ہوشیارپور | پنجاب | ۲۲۵۰۰ | |
| ۱۸۳ | کرنال | " | ۲۲۵۰۰ | |
| ۱۸۴ | رائچور | حیدرآباد | ۲۲۴۶۰ | |
| ۱۸۵ | نصیرآباد | اندور | ۲۲۴۲۸ | ریاست |
| ۱۸۶ | جاؤرہ | جاؤرہ | ۲۲۴۰۰ | ریاست |
| ۱۸۷ | جھنگ | پنجاب | ۲۲۱۱۵ | |
| ۱۸۸ | مالیرکوٹلہ | مالیرکوٹلہ | ۲۲۱۰۰ | ریاست |
| ۱۸۹ | سنبھل | یو۔پی | ۲۱۸۹۰ | |
| ۱۹۰ | سری نگم | مدراس | ۲۱۸۰۰ | |
| ۱۹۱ | فتحپور ہسوہ | یو۔پی | ۲۱۵۰۰ | |
| ۱۹۲ | رانچی | بہار اڑیسہ | ۲۱۵۰۰ | |
| ۱۹۳ | جہلم | پنجاب | ۲۱۵۰۰ | |
| ۱۹۴ | مظفرنگر | یو۔پی | ۲۱۱۸۰ | |
| ۱۹۵ | بندھرپور | بمبئی | ۲۱۱۱۰ | |
| ۱۹۶ | اکولہ | سی۔پی برار | ۲۱۰۰۰ | |
| ۱۹۷ | نجیب آباد | یو۔پی | ۲۰۱۲۰ | |
| ۱۹۸ | پوربندر | پوربندر | ۲۰۰۶۲ | ریاست |
| ۱۹۹ | اعظم گڈھ | یو۔پی | ۲۰۰۰۰ | تقریباً |
| ۲۰۰ | مین پوری | " | ۲۰۰۰۰ | تقریباً |

(باقی)

حسرت موہانی بی اے

اللہ اکبر

# رسالۂ ہمایون کا معیارِ ادب

ہے آرزو کہ ابروے پُرخم کو دیکھیے اِس حوصلہ کو دیکھیے اور ہم کو دیکھیے

بریگیڈ میجر مولوی عطاء الرحمٰن صاحب بی اے کی ایک پُرلطف اور دلچسپ کہانی "تقاضائے محبت" (معیار ادب پر پورا بے اُترنے کے بعد) جنوری [illegible] کے ہمایون مین نذرِ ناظرین ہو چکی ہے، اسمین شک نہین کہ میجر صاحب کا دماغ (اگر صاحب موصوف کچھ اُردو بھی جانتے ہوتے) اُردو کی فضائے انشا پردازی مین مسرت خیز طوفان پیدا کرکے اُردو علم ادب کے ساتھ وہی کرتا جو ساون کی جی کو تڑپا دینے والی کالی کالی گھنگھور گھٹائین اور گنوار کی جواہر ریز و گوہر بیز بوندین کلراور بنجر زمین یا بستی کے ساتھ کرتی ہین،

کہانی صاف طور پر فسانہ نگار کی دماغی قابلیت کا اعتراف کر رہی ہے۔ نفس مضمون حلفاً ڈھانے کو تیار ہے کہ وہ کسی زبردست تخیل زا دماغ کا نتیجہ ہے۔ واقعہ بلندیِ خیال اور علوے فکر کا شاہد ہے۔ مگر فسانہ عبارت اور زبان، زبانِ شکایت ہی کھولے ہوے نہین بلکہ محو فریاد و فغان ہے۔ اور ہے بھی بجا۔

بقول غالب ؎

آگ سے پانی مین بجھتے وقت اُٹھتی ہے صدا ہر کوئی درماندگی مین نالے سے ناچار ہے

اُردو کی بدقسمتی کو کیا کیا جاے؟ ایسے ایسے لوگ اس کی حمایت کو تیار، ایسے ایسے دماغ اُس کی خدمت کو آمادہ اور ایسی ایسی زبردست شخصیتین اس کی ترقی کی خواہان ہین لیکن آخر کار نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ محض ناکامی اور محض ناکامی ہی نہین بلکہ الٹا تنزل :-

اُردو انشا پردازی کی باگ اس وقت انگریزی خوان فیشن ایبل طبقہ کے ہاتھ مین ہے۔ چونکہ وہ خود انگریزی تمدن کے عاشق، انگریزی طرزِ زندگی کے شیدا اور انگریزی شان و شکوہ پر مفتون ہین، اسلیے اُن کی تقریر و تحریر بھی انگریزی رنگ مین رنگی ہوئی ہے۔ وہ جب کبھی اتفاقاً کسی سے اُردو مین ہم کلام ہوتے ہین تو یا انگریزی اُردو ہو جاتی ہے یا بچاری اُردو کو انگریزی جون مین داخل ہونا پڑتا ہے۔ بات ایک ہی ہے۔ یہی حال تحریر کا ہے۔ آپ کسی فیشن ایبل انشا پرداز کی تحریر کو پڑھین۔ اگر اُردو پر انگریزی کا دھوکہ نہ ہو تو میرا ذمہ۔ مضمون زیر تنقید بھی اسی صنعت سے مرصع ہے۔ ہر ہر قدم پر انگریزی قواعد نے اُردو

صرف ونحو کو شکست فاش دی ہے۔ ہر ہر سطر مین اسی بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ کہین اُردو انگریزی پر غالب نہ آجائے۔ یقین ہے کہ اردو لٹریچر اس سے پہلے کسی سے ایسی شکست کھا کر پسپا و نابود نہ ہوا ہوگا۔ ملاحظہ ہو

(۱) "مجھے جانتا ہے" لڑکی نے حیران ہو کر کہا

(۲) "اصل مین معاملہ اس طرح ہے" الفاظ اس کے مُنھ سے رُک رُک کر نکلتے تھے۔

(۳) نوجوان نے ایک قہقہہ لگایا: "اس نے کام مار لیا استاد"

(۴) "نہین یہی مناسب ہے" نوشیروان نے دیا جواب

(۵) "اور حُسن اتفاق سے رستم جی اُس سے واقف تھا" اس کا نام رستم جی ہے۔

(۶) جب وہ دوبارہ اس کی طرف آئی تو اس کے چہرہ پر خلاف معمول اظہار نہ تھا جب اس نے کہا "آپ کے نفرہ سے مین اپنی سزا کو پہونچ گیا"

(۷) "ارے کیا سچ" تو پھر کمال کیا ہے ظالم نے۔ کاہن جی نے زور سے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور ہنستے ہنستے لوٹ گیا!

(۸) اس کی پیشانی پر بل آگئے اور وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی "آؤ مین اُسے دیکھون تو سہی"

اِس کے علاوہ عبارت ذیل قابل ملاحظہ ہے۔

"وہ اندر مکان مین آئی تو نوشیروان جی اُس کے بھائی کے ساتھ کونے مین کھڑا باتین کر رہا تھا پھر کسی نے بلیرڈ کھیلنا تجویز کیا جو بہت اچھا کھیل ہے لیکن جس مین اگر کھیل کی طرف دھیان نہ ہو تو میز کی رٹر کے کنارے پر ہاتھ رکھکر کھڑا ہونا عقلمندی سے بعید ہے۔ وہ رستم جی کا ہاتھ تھا اور پتھر جیسی سخت گیند کے پورے زور مین اس پر لگنے کا لطف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس نے خود چکھا ہو۔ چوٹ اتفاقیہ معلوم ہوتی تھی۔ اور نوشیروان جی نے جو کھیل رہا تھا کئی مرتبہ معافی طلب کی لیکن اس ہلچل کے اثنا مین جو فوراً کمرہ مین پیدا ہوگئی تارا کی آنکھ نوشیروان کی ظاہراً بے گناہ آنکھ سے ملی۔ اور وہ مُنھ کے آگے رومال رکھ کر دوسرے کمرہ مین بھاگ گئی۔ ایسی حالت مین نہ رک سکنے والی ہنسی کا اسی کمرہ مین اٹھا رکھنا اچھا نہین معلوم ہوتا"

"وہ اندر مکان مین الخ" سے لیکر "اچھا کھیل ہے الخ" تک تو خیر لیکن بعد کی سطور کے سمجھنے کیلیے کسی جینٹلمین انشا پرداز کی ضرورت پڑے گی۔ "وہ رستم جی کا ہاتھ تھا" کون سا؟ اس سے پہلے تو کسی ہاتھ کا کہین ذکر تک نہین

یا ممکن ہے کسی مہمل گو شاعر کے شعر کے مطلب کی طرح خود فسانہ نگار صاحب کے دل مین ہو۔ بہر حال مین اس چیستان کے سمجھنے سے قاصر ہون

"اور تیر جیسی سخت گیند کے پورے زور مین اُس پر لگنے کا لطف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس نے خود چکھا ہو"

بیشک ہے تو ایسا ہی لیکن مین نہین سمجھ سکتا اس جگہ اس کے اظہار کا کیا موقع تھا۔ علاوہ اس کے "پورے زور مین اُس پر لگنے الخ" کو شاید اردو مین اس طرح کہین گے (پورے زور سے اس پر لگنے")

"چوٹ اتفاقیہ معلوم ہوتی تھی"

پھر مجھے یہی عرض کرنا پڑتا ہے کہ "کون سی چوٹ" ؟ "کس کے چوٹ" ؟ "کیسی چوٹ" ؟ فعل موجود فاعل اور مفعول دونون غائب! یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟

"اور نوشیروان جی نے جو کھیل رہا تھا کئی مرتبہ معافی طلب کی"

مین بھی ہزار بار "معافی طلب" کرکے فسانہ نگار صاحب سے یہ پوچھنا چاہتا ہون کہ "نوشیروان جی نے جو کھیل رہا تھا" کس سے معافی طلب کی اور کس بات کی معافی طلب کی؟ سیاق عبارت تو اس بات کا جواب دینے کے لیے تیار نہین۔

"لیکن اس کھیل کے اثنا مین جو فوراً کمرہ مین پیدا ہو گئی"

غالباً فسانہ نگار صاحب یہ بتانا بھول گئے کہ کون سا حادثہ دلخراش وقوع پذیر ہوا جس کے باعث فوراً کمرہ مین ہلچل پڑ گئی؟

"ایسی حالت مین، رک سکنے والی ہنسی کا اُس کمرہ مین اظہار اچھا نہین معلوم ہوتا"

مہربانی فرما کر بتایا جائے کہ یہ کس نے کہا؟ ناصح کون تھا؟ اور نصیحت کس کو کی گئی؟ وعلیٰ ہذا القیاس۔ عبارت ذیل کے لیے بھی سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتا ہون؟ کہ "کس نگشود و نگشاید بحکمت این معما را"۔ ملاحظہ ہو۔

"اسی لیے تو مین یہان آیا ہون مین شبومل کی دوکان مین کام کرتا ہون۔ ہمارا رستم اپنی ہونے والی بی بی کو ایک چھوٹا سا تحفہ علی الحساب دینا چاہتا ہے۔۔۔ پھر ہنسا اور جیب کو ٹٹولنے لگا یہ لو اور ایک رسید لکھدو کہ گلوبند جو پسند کرانے کی غرض سے لے گیا تھا وہ واپس وصول ہوا۔

اُس نے آنکھ ماری۔ بھئی کیا کہیں رستم جی اپنے فن میں یکتا ہیں وہ دوسرے آدمی کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا اور اُس کی آنکھوں میں ایک خفیف سے فکر کی جھلک تھی۔ وہ لڑکی کو یہ رسید دیکر سودا پختہ کیا چاہتا ہے"

←——————→

اس کے علاوہ فقرات ذیل بھی قابل ملاحظہ ہیں۔ ممکن ہے کہ ناظرین ہمایون والناظر مجھ سے زیادہ سمجھ سکیں۔

(۱) ساتھ والے ہٹے ہیں ص۲۴

(۲) ایک سنجیدہ سی مسکراہٹ سے دیکھا ص۲۵

(۳) اُس کی پیشانی پر بل آگئے ص۲۵

(۴) توکیا آپ کے خیال میں میرے بھائی نے غلطی کھائی ص۲۶

(۵) اور میں مشکور ہوں گا ص۲۷

(۶) اگر آپ مجھے اجازت دیں کہ جتنا عرصہ وہ اس مکان میں ٹھہرے ص۲۷

(۷) شبھول صراف کے کاروبار کے کئی حصے ہیں جن میں سے ایک روپیہ قرض دینا ہے ص۲۸

(۸) اُنھوں نے اس کے عوض پانچسو روپیہ دے دیا تھا ص۲۹

(۹) بُرا دب انداز اور بے طرح سی مسکراہٹ ص۲۹

(۱۰) تو رستم جی صاحب کیا بالکل کچھ بھی نہیں ہو سکتا ص۳۰

(۱۱) اُسے صرف ایک خیال کا احساس تھا کہ اُس کے مُنھ پر تھپڑ مارے۔ ص

(۱۲) ایسی حالت میں نیند آجانا گو بُری بات ہو لیکن مزے دار ضرور ہوتا ہے ص

(۱۳) لیکن کاہن چند نے پوچھا رستم جی نے مجھے ٹیلیفون کے ذریعہ سے خود کیوں نہ کہدیا ص۳۴

(۱۴) اب آنے والے واقعات کا خیال اُس کے گلے میں اٹک گیا۔ ص۳۵

(۱۵) یہ بدمعاش لوگ بھی کس قدر دلیر ہوتے ہیں شبھول کی دوکان کے چوکیدار کے منھ میں کپڑا ٹھونس دیا اور باہر چوری بیشک قابل افسوس ہے ص۳۶

(۱۶) غمزدہ سی مسکراہٹ سے دیکھا ص۳۷

(۱۷) لیکن اسی لمحہ اُس کے ہاتھ کو ایک لوہے سے سخت ہاتھ کی ضرب لگی ۔ ۲۳

(۱۸) "ہمارا آپ سے کتنی مدت سے دوستانہ تھا ؟" ۲۶

(۱۹) "باریک بین آنکھ کے لیے تو ظاہر ہی لیکن اس معاملہ مین مجھے کچھ اندرونی علم بھی ہی"

(۲۰) "جس تارہ کو یہ لفافہ بھیجنے والے نے اس معاملہ مین ایک اور کاغذ بھی بھیجا تھا"

یہ چند فقرے بطور مثال لکھے گئے ہین، ورنہ کل افسانہ ایسے ہی جملون سے بھرا پڑا ہی،

اس کے علاوہ ایک اور بات بھی قابل لحاظ ہی وہ یہ کہ صفحہ اول کی پہلی سطر مین جمشید تارا کا بڑ بھائی معلوم ہوتا ہی اٹھائیسوین صفحہ کی آٹھوین سطر تک اس کا یہ عہدہ برابر قایم رہتا ہی، نوین سطر مین (بموجب مسئلہ ارتقا) جمشید تارا کا خاوند اور بارھوین سطر مین (بموجب مسئلہ زوال) یا آواگون بیٹا یا یا چھوٹا بھائی یا کوئی اور ـــــ ہو جاتا ہی۔

اختتام پر مین مہجر صاحب سے اس سہری گستاخی کی معافی چاہتا ہون۔ سچ عرض کرتا ہون کئی مرتبہ خیال آیا کہ قلم کو ہاتھ سے رکھدون اور اس تنقیدی خیال کو دماغ سے نکال دون۔ ممکن ہی کہ صاحب مذکور اپنے دل مین اس تنقید سے کوئی اور خیال قائم نہ کرلین۔ اس لیے کہ خطا بزرگان گرفتن خطا ست لیکن اس کے ساتھ ہی صاحب موصوف کے علم و فضل اور انصاف پر نظر جاتی تھی تو بے اختیار غالب کا یہ شعر زبان سے نکل جاتا تھا۔ اور بار بار اُکساتا تھا ؎

ہر ہر خدا نخواستہ وہ اور دشمنی     اے شوق منفعل یہ تجھے کیا خیال ہی

مین ایڈیٹر صاحب ہمایون سے بھی معافی کا طلبگار ہون اس لیے کہ جس مضمون یا افسانہ کو بموجب قاعدہ نمبر ۲ صاحب مذکور معیار پر پورے اُترنے کا سرٹیفکیٹ عطا فرما چکے اُس مین مین نے دخل در معقو کر کے یقینی طور پر صاحب مذکور کے دماغ کو منغص کیا ہو گا۔

مجھے یقین ہی کہ ایڈیٹر صاحب از راہ عنایت مجھے معاف فرمائین گے۔ اس لیے کہ

منظور ہی گذارش احوال واقعی
اپنا بیان حسن طبیعت نہین مجھے

ا۔ ق۔ ی۔ علوی

# کلامِ حسرت

شوق کہان آرزوِ شوق ہی (۱) جس سے جہان مست مئے ذوق ہی
درجہ ترے عشق فسون کار کا حسن کے رتبہ سے بھی مافوق ہی
گردنِ حسرت مین ہے امتیاز
خوب غلامی کا ترے طوق ہی

حُسن کے ہم ہلاک دید بھی ہین (۲) یعنی شاہد بھی ہین شہید بھی ہین
خانہ زادِ جفائے مختص دوست طالبِ شدتِ مزید بھی ہین
باوجود علائق کثرت عصرِ توحید کے وحید بھی ہین
ہوش گم کردۂ سبیل رشاد عقل کے پیرِ رشید بھی ہین
کامیاب مرادِ غم حسرت
شادیِ شوق کے مُرید بھی ہین

# جذباتِ ہادی

چمک اُٹھتے ہین میرے داغ دل شبہائے غربت مین یہی دو چار تارے کام آتے ہین مصیبت مین
مبارک تم کو ذوقِ کامرانی بزم عشرت مین کہ مین مانوس غم ہون جی بہلتا ہی مصیبت مین
نہ اب دل ہی نہ دلمین داغ الفت کی ضیا پاشی کبھی ایک شمع روشن تھی شبستان محبت مین
پتہ ملتا نہین کچھ دل کے اجزائے پریشان کا کہانتک کوئی ڈھونڈھے ذرہ ہای دشت غربت مین
مری مایوسیان رونق فزائے خلوتِ دل ہین یہ شمعین جلوہ آرا ہین شبستان محبت مین
رفیق رنج تنہائی ہی میری بیکسی کیا ہی خدا رکھے یہ اکثر ساتھ دیتی ہی مصیبت مین
سُن اے محوِ طرب ناآشنائے سوز ناکامی ہزارون نغمہائے درد ہین ساز مسرت مین
تمناؤن کی بربادی پہ اتنا رنج و غم ہادی
ارے نادان کبھی ایسا بھی ہوتا ہی محبت مین

# سفر حجاز کی مختصر روداد

عید کی نماز کے متعلق معلوم ہوچکا تھا کہ سویرے ہی ہو جاتی ہے اور یہ بھی خیال تھا کہ مجمع زائد ہوگا اس لیے نماز فجر سے پہلے ہی کپڑے بدل لیے گئے اور حرم شریف مین پہونچا تو اس وقت بھی کافی ہجوم تھا۔ بہرحال مجھے بغیر کسی دقت کے مقام ابراہیم کے سامنے ممبر سے قریب ہی بیٹھنے کو جگہ مل گئی۔ آفتاب نکلنے کے بعد ہی خوشنما گنگا جمنی علم جس پر زرکار پھریرے لگے ہوے تھے لاکر ممبر کے دونون جانب لگا دیے گئے، ممبر تقریباً ۳۰ گز لمبا ہے اور نشست کے مقام پر ایک برجی سی ہوئی ہے۔ اور لوگون کا بیان ہے کہ اس کے بنانے مین ایسی صنعت کی گئی ہے کہ خواہ کوئی موسم ہو کبھی خطیب کے چہرہ پر دھوپ نہین پڑتی۔ برجی سے نیچے زینا ہے جس پر پوشش پڑی ہوئی تھی۔ ممبر کا دروازہ عموماً بند رہتا ہے صرف جمعہ کے دن یا عید کے موقع پر کھلتا ہے۔ دروازہ کے قریب ہی چند خوجے کھڑے ہوے تھے۔ تھوڑی دیر مین مجمع مین کسی قدر حرکت پیدا ہوئی۔ اور بعض لوگ کھڑے ہوگئے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ شریف مکہ اپنے مصاحبین و مقربین خاص کے ساتھ آئے۔ اس کے بعد نماز ہوئی۔ اور نماز کے ختم ہوتے ہی چارون مصلون کے امام ممبر پر گئے اور حنفی خطیب نے خطبہ پڑھا۔ خطیب صاحب کی آواز اگرچہ بہت بلند نہین تھی لیکن اُن کا انداز تقریر ایسا تھا کہ ایک ایک لفظ سنائی دیتا تھا۔ کم سے کم اُن لوگون کو جو بہت دور نہ ہون۔ خطبۂ اولیٰ کے بعد جب خطبۂ ثانی پڑھا جا رہا تھا تو حضرات خلفاے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ کے نام نامی لینے کے بعد خطیب صاحب نے نہایت اہتمام کے ساتھ شریف صاحب کا نام لیا اور اس موقع پر سب حاضرین کھڑے ہوگئے۔ غالباً شریف کے اشارہ سے ایسا ہوتا ہوگا۔ ورنہ تعظیم کے زیادہ مستحق اُن اصحاب کے اسماے گرامی تھے جو شریف کے نام سے پہلے لیے گئے تھے۔ مین اپنی جگہ پر بیٹھا رہا غنیمت ہے کسی نے مجھے ٹوکا نہین خطیب صاحب کے خطبہ کا پورا اثر تو عربی دان اشخاص ہی پر پڑ سکتا ہے مگر عربی زبان کی دلکشی اور خطیب صاحب کا موثر انداز ہر شخص پر کچھ نہ کچھ اثر انداز ضرور رہتا ہوگا۔ نماز کے بعد ہندوستان کی طرح عام طور پر بغلگیر ہونے کا دستور نہین ہے البتہ اکثر لوگ باہم معانقہ کرتے ہین اور خطیبون کی دست بوسی کے لیے بھی بہت لوگ منتظر رہتے ہین۔ میرے قریب چونکہ شناساؤن مین سے کوئی نہ تھا اس لیے مین جلدی سے اُس دروازہ کی طرف گیا جدھر

شریف کی نشستگاہ ہے مگر میرے وہان تک پہونچنے مین اتنی دیر لگی کہ شریف کی واپسی ہو چکی تھی۔ البتہ سڑک پر شرطون (پولس) کی جمعیت صف آرا تھی، جو تھوڑی دیر کے بعد ضابطہ فوجی کے مطابق منتشر ہو گئی۔

حرم شریف سے باہر نکلا تو دیکھا کہ بازار بند ہے۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ تین روز تک عموماً بازار بند رہینگے صرف کہین کہین اشیاے خوردنی فروخت ہو رہی تھین۔ مین تھوڑی دیر پولیس کی جمعیت کے قریب کھڑا رہا اور ان کی قواعد دیکھتا رہا۔ اور صفون کے منتشر ہو جانے کے بعد گھر آیا۔ ساتھیون سے تبادلۂ تہنیت کے بعد رحمت شاد کے ساتھ اس جستجو مین روانہ ہوا کہ کہین کچھ کھانا میسر آئے۔ مگر ناکامی ہوئی۔ اور کچون۔ پکوڑیون اور چٹنی پر قناعت کرنا پڑی۔ ایک شخص سے تھوڑی آئس کریم لیکر کھائی تو اگرچہ آئس کریم خود کچھ زیادہ مزے دار نہ تھی لیکن تشنگی کے عالم اور گرمی کے موسم مین بہت بھلی معلوم ہوئی۔ پہلے مجھے کسی قدر حیرت ہوئی کہ یہان جب برف نہین ہے تو آئس کریم کیسے تیار ہوتی ہے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ چند مشینین یہان ہین جن مین شورے وغیرہ کی امداد سے آئس کریم تیار ہوتی ہے۔ شام کو ایک مرشد زادہ سے جو مکہ معظمہ مین مقیم ہین اور طبابت کرتے ہین ملا۔ بڑے اخلاق و محبت سے ملے اور ہر قسم کی امداد کا وعدہ کیا۔ میرے پاؤن کا درد ابھی تک نہین گیا تھا۔ اُنھون نے حال سنکر دوسرے روز دوا دینے کا وعدہ کیا۔

ایک روز عصر کے بعد حرم شریف مین ایک جگہ کچھ حضرات جمع تھے۔ اتفاق سے میرے ایک ہموطن تاجر بھی وہان بیٹھے تھے۔ مین اُدھر سے گذرا تو اُنھون نے یہ کہہ کر کہ بحث راہی ذکر ہو رہا تھا مجھے اُن اصحاب سے ملایا۔ جناب مولوی محب الدین صاحب خلیفہ جناب حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی بھی وہان تشریف فرما تھے۔ بڑی عنایت و محبت سے پیش آئے اور اپنے مصلے پر بٹھا کر دیر تک مزاج پرسی فرماتے رہے اور رخصت ہوتے وقت بہت کچھ دعائین دین۔ ایک صاحب جو وہین کے مدرسہ مین مدرس ہین اور اتفاق سے میرے ہمنام ہین بہت اخلاص سے ملے اور میرے ساتھ ہی اُٹھے اور فرمانے لگے کہ حضرت شاہ ابو سعید صاحب مجددی کے صاحبزادون کے یہان جا رہا ہون مین بھی چونکہ اسی سلسلہ کا غلام ہون اس وجہ سے اُن کے ہمراہ چلا گیا اور صاحبزادگان سے قدمبوسی حاصل کرکے بہت محظوظ ہوا۔ اُن کے یہان اُس وقت قرآن خوانی ہو رہی تھی مجھے بھی اُس مین شرکت کا موقع ملا اور صاحبزادہ صاحب سے پھر قدمبوسی حاصل کرنے کا وعدہ کرکے واپس آیا۔

عید کے دوسرے دن مرشد زادہ سے ملکر پاؤن مین لگانے کی دوا لی تو اُنھون نے کہا کہ زیادہ چلنا پھرنا

نہ چاہیے۔ اگرچہ اس کی پابندی مشکل تھی اس لیے کہ مدینہ منورہ کا قافلہ ۸ شوال کو جانے والا تھا اور مجھے اس سے پہلے پہلے تمام ضروری انتظامات سفر کرنا تھے تاہم عید کی وجہ سے چونکہ بازار بند تھے اس لیے کسی قدر سکون کا موقع ملا۔ ظہر کے بعد اتفاق سے میرے ہمنام صاحب پھر حرم شریف مین مل گئے تو اُن کے ہمراہ اُن کے مدرسہ کے مدرس اعلیٰ کے یہان حاضر ہوا۔ وہان بھی قرآن خوانی ہو رہی تھی۔ قرآت سے لذت اندوز ہونے کا چونکہ مجھے اپنے پیر و مرشد کے طفیل مین یہان اکثر موقع ملتا ہے اس وجہ سے مین ایسے مواقع کا مشتاق رہتا ہون اور عربون کی قرآت تو ہے بھی حد درجہ وجد آور۔ حرم محترم مین متعدد مقامات پر چھوٹے چھوٹے لڑکے اور بعض نابینا قاری قرآت سنایا کرتے ہین اور اگرچہ یہ امر مجھے پسندیدہ نہین معلوم ہوا کہ وہ قرآت سنانے کو حصول خیرات کا ذریعہ بنائے ہوئے ہین تاہم مین اکثر اُن کی قرآت سنا کرتا تھا۔

عید کے دنون مین چونکہ تین دن تک برابر لوگ اپنے احباب و اعزہ سے ملتے رہتے ہین اس وجہ سے اپنے ہمنام کے ساتھ جن مدرس صاحب کے یہان گیا تھا اُن کے یہان بہت سے اصحاب سے ملاقات ہوئی اور یہین پہلی بار یہ بات دیکھنے مین آئی کہ مہمانون کے سامنے علاوہ چائے کے ایک خوشنما شیشے کے ظرف مین انگریزی مٹھائی پیش کی گئی جس مین سے ہر شخص نے ایک دو ڈلیان لے لین۔ یہ مٹھائی چونکہ ابتداءً شام کی طرف سے آتی تھی اور غالباً وہان بنتی بھی ہوگی اس لیے شامی مٹھائی کہی جاتی تھی حالانکہ اب عام طور پر یورپ سے آتی ہے اور مارٹن کے مشہور انگریزی کارخانہ کی بنی ہوتی ہے۔

اُسی روز اُن کرم فرما سے بھی پہلی بار ملاقات ہوئی جن کے پتہ پر مین نے اپنی ڈاک منگائی تھی اور اپنے خطوط وغیرہ پاکر بہت خوش ہوا۔ یہین ضیاء الاسلام صاحب سے ملاقات ہوئی جو علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ ضلع مظفرنگر کے رئیس اور خلافت کمیٹی کے ممتاز عہدہ دار ہین اور دونون صاحبون سے ہندوستان کے حالات پر گفتگو ہوتی رہی۔

دوسرے روز صبح کو بازار کی طرف گیا تو اگرچہ بازار بند تھا مگر صفا اور مروہ کے درمیان جہان سعی کرتے ہین ایک جگہ جلسہ کا ساز و سامان دیکھ کر کچھ دیر اس خیال مین ٹہلتا رہا کہ جلسہ کی کارروائی دیکھ سکون لیکن زیادہ دیر ہونے کی وجہ سے پاؤن مین درد محسوس ہوا اس لیے چلا آیا۔

عید کے ایام مسرت ختم ہوگئے اور بازار کھل گئے تو سامان سفر کی خریداری پر متوجہ ہوا چونکہ مین یہ سُن چکا تھا کہ مدینہ منورہ مین قافلہ کا قیام بہت مختصر ہوتا ہے حتیٰ کہ چالیس نمازین بھی حرم نبوی مین آسکین

پڑھنے کا موقع ملتا اور مین تو آستانۂ رسالت پناہی پر زیادہ دنون تک جبہہ سائی کا آرزومند تھا اور متمنی تھا کہ حتی الامکان پورے چالیس روز کی حاضری کا موقع ملے اس لیے مین نے یہ تہیہ کرلیا تھا کہ مین جاؤن گا پہلے قافلہ کے ساتھ اور واپس آؤن گا سب سے آخری قافلہ کے ہمراہ لہذا اس امر کی کوشش کی گئی کہ یک طرفہ اونٹ کا انتظام ہوجائے۔ مگر جتنے اصحاب سے دریافت کیا سب نے مایوس کن جواب دیا۔ اور ہمارے مطوف صاحب کے کارکن یوسف نے وعدہ بھی کیا تو بالآخر اس کا ایفا نہ کرسکے بلکہ اُن کا بیان تھا کہ اونٹ والا اس شرط سے راضی تھا کہ نصف کرایہ سے ایک اشرفی زائد دی جائے مگر جب شیخ المطوفین کے سامنے معاملہ پیش ہوا تو اُنھون نے اجازت نہ دی، بہرحال مین مجبور ہوگیا۔

اب دشواری پیش آئی کہ مین تنہا تھا۔ ساتھیون مین سے کسی کے اونٹ پر جگہ نہ تھی۔ اور رحمت شاہ خرچ کی قلت کے باعث مدینہ منورہ کی حاضری کا ارادہ نہ رکھتے تھے۔ وہ تو اس خیال سے آئے تھے کہ ہین مکہ معظمہ مین نوکری کرکے رہ پڑین گے۔ مگر ایک ہفتہ کے اندر ہی زبان نہ سمجھنے کی وجہ سے نوکری سے مایوس ہوگئے۔ اس لیے اُن کا خیال ہوا تھا کہ حج کرکے ہندوستان واپس جائین گے۔ ہمارے جہاز کے ساتھی میان نظام دین کو جب یہ معلوم ہوا تو اُنھون نے ازراہ فیاضی اُن سے کہا کہ جو زر تمھارے پاس ہے اُس سے مدینہ منورہ کی زیارت تو کر آؤ۔ واپسی کے مصارف کا انتظام وہ کردین گے۔

پس رحمت شاہ اس سفر مین بھی میرے ہمراہ رہے۔ اور ہم دونون کے لیے ایک اونٹ کرلیا گیا۔

اگرچہ اس ملک کا عام سکہ چاندی کی مجیدی (ترکی روپیہ) اور رانگہ کے قرش ہین لیکن حکومت کی طرف سے اونٹون کا کرایہ ۱۴ گنی ۲ مجیدی مقرر کیا گیا تھا چنانچہ عہ ۱۲/ کے حساب سے گنیان اور ۲عہ/ مجیدی لیکر مین نے کرایہ ادا کیا اور اِس رقم کے علاوہ ۱۲ فی کس شغدف کا کرایہ للعہ/ فی کس حق ترجمانی اور ۱۲ منازل مین مشعل جلانے کی اجرت یعنی مجموعۂ ما ۱۰عہ/ دینا پڑے۔ رحمت شاہ نے چونکہ گنیان بعد مین لین اس وجہ سے اُنھین معہ/ کے حساب سے لین۔ مگر اتفاق سے حق ترجمانی اور اُجرت مشعل کی رقم سے وہ بچ گئے۔ ترجمان کی اُجرت کی یہ بنا ہے کہ ہر علم کی طرف سے ایک شخص حاجیون کے ساتھ جاتا ہے جو راستہ مین حجاج اور بدوؤن کے درمیان ترجمانی بھی کرتا ہے اور عام طور پر حجاج کی راحت رسانی کا معین رہتا ہے۔

ہم لوگون نے اپنا کل روپیہ علی جان کی کوٹھی مین جمع کرا دیا تھا۔ چلنے سے قبل اُن کے یہان سے ایک ایک حوالہ مدینہ منورہ مین اُن کے نمائندے کے نام لے لیا اور راستہ کے مصارف کے لیے کافی روپیہ مجیدیان اور قرش سب طرح کے سکے رکھ لیے۔ سامان سفر کچھ بہت زیادہ درکار نہ تھا اس لیے کہ ہم میں سے ہر شخص مسافر ہی تھا۔ مگر اپنا کل سامان ساتھ لے جانا منظور نہ تھا۔ دوسرے شغدف کے لیے بعض اشیا کی ضرورت تھی اور مدینہ منورہ تک کے لیے جنس بھی ساتھ لینا تھی۔ مشفقی میر عبدالعزیز صاحب تو ہندوستان ہی سے جنس ساتھ لائے تھے۔ ہم لوگون کو جنس خریدنا پڑی۔ جو چند روپیہ مین فراہم ہوگئی۔ خیال تھا کہ اشیاے خوردنی بہت گران ملین گی اور اگرچہ اکثر چیزون کا نرخ ہندوستان کے مقابلہ مین دگنا تھا تاہم جب اس امر پر نظر کی جاے کہ یہ اجناس بالعموم ہندوستان، مصر، عراق جیسے دور دراز مقامات سے آتی ہین تو ہرگز گران نہ معلوم ہونگی۔ اجناس کی خریداری مین ایک صاحب کی وجہ سے بہت آسانی ہوئی جو دفتر الناظر کے ایک کارکن مولوی جعفر علی صاحب کے دور کے رشتہ دار ہین اور جن کے والدین عرصہ ہوا ہندوستان سے ہجرت کر گئے ہین۔ شغدف کے لیے تین اشیا ذیل درکار تھین صراحیان، چٹائیان، زنبیل اور شکیزے۔ ان چیزون کے لیے مرشد زادہ صاحب سے عرض کیا کہ کسی واقف کار شخص سے منگوا دین اُنھون نے ازراہ محبت انتظام تو کر دیا مگر جو شخص چیزین خرید کر لایا اُس نے شرارت سے یا ممکن ہے کہ نادانی سے تقریباً دوگنے دام صرف کرا دیے۔

لکھنؤ سے روانگی کے وقت بعض اصحاب نے کچھ رقوم خیرات میرے حوالے کر دی تھین۔ جو رقوم مخصوص لوگون کے لیے تھین اُن کے متعلق تو مجھے صرف اسی قدر اہتمام کرنا پڑا کہ جلد سے جلد اُن لوگون سے مل کر دیدون البتہ جو رقوم یہ کہکر دی گئی تھین کہ مستحق لوگون مین تقسیم کر دی جائین۔ اُن کو مستحق لوگون تک پہونچانے مین بہت تگ و دو کرنا پڑی۔ چنانچہ مکہ معظمہ مین جسقدر رقم تقسیم کرنے کی تھی اُس کا بڑا حصہ مرشد زادہ کے ساتھ ایک ایک گھر پر جا کر دیا گیا اور بقیہ حصہ ایک دوسرے بزرگ کی معرفت اُسی طریقہ پر صرف کیا گیا۔ مرشد زادہ ہی کی معیت مین جناب شیخ حسام الدین بخاری کی خدمت مین حاضر ہوا آپ کا عرف شیخ سینی ہے۔ اور طریقہ نقشبندیہ کے بزرگ ہین۔ آپ کا دولت خانہ حرم محترم سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ہے اور جتنے لوگون سے ذکر آیا سب نے بالاتفاق آپ کی بزرگی و عظمت کا اقرار کیا۔ آپ کی عمر بہت زیادہ ہے۔ اندازاً سو برس سے اوپر۔ مگر ضعیفی کے باوجود روزانہ نماز فجر اول وقت جماعت شافعی کے

ساتھ حرم شریف مین ادا کرتے اور اُس وقت سے لیکر طلوع آفتاب تک وہین حلقہ فرماتے ہین۔

اہل عرب کی مہمان نوازی اس قدر مشہور ہے کہ یہان اس کا تذکرہ فضول ہوگا۔ مکہ معظمہ مین کسی کے یہان جائیے تو چائے کی ضیافت ضروری ہے حقہ سگریٹ بھی اکثر لوگ پلاتے ہین۔ اور سوکھے پانون کی گلوریان بھی کہین کہین ملتی ہین۔ شیخ کے یہان بھی جب کبھی حاضری کا اتفاق ہوتا تو کثر ایسا ہوتا کہ چائے، فواکہات یا کھانے کے بغیر وہ رخصت ہونے دیتے نہ وقت۔ اوقات مین بھی وہ اکثر اصرار فرماتے اور مجھے مجبور ہونا پڑتا۔

حرم شریف مین تو جسقدر ممکن ہوتا۔ آب زمزم پیا جاتا ہے۔ چاہ زمزم پر ہر وقت سقے موجود رہتے ہین جو صبح سے لیکر عشا کے وقت تک پانی پلاتے رہتے ہین۔ اس کے علاوہ صحن حرم مین جابجا لوگ صراحیان لیے ہوے پھرتے اور پانی پلاتے رہتے ہین اور بہت سے حجرون مین مختلف سبیلون کے مہتممین کی طرف سے پانی جمع رہتا ہے اور حجاج کے زمزمیون کی طرف سے بھی حرم شریف مین شام کے وقت پانی پلایا جاتا ہے اور گھرون پر بھی آب زمزم کی صراحیان بھیجی جاتی ہین۔ آب زمزم اگرچہ ذائقہ کے لحاظ سے شیرین نہین اور عموماً ٹھنڈا پینے کو نہین ملتا لیکن اس مین عجیب عجیب برکتین ہین اس لیے جسقدر ملتا پیا جاتا۔ شہر مین نہر زبیدہ کا پانی عام طور سے ملتا ہے جو نہایت شیرین اور لطیف ہے۔ عام صرف کیلیے اکثر لوگ کنوئین کا کھاری پانی بھی لیتے ہین۔ مین پانی عادتاً زیادہ نہین پیتا مگر مکہ معظمہ مین کچھ تو موسمی حرارت و خشکی کی وجہ سے اور کچھ اس سبب سے کہ پانی زیادہ پڑتا تھا بکثرت پانی پیتا تھا اور بجاے اسکے کہ نقصان پہونچتا صحت کے لیے وہان کے پانی سے زیادہ کوئی چیز مفید معلوم نہین ہوئی۔ کیونکہ جسقدر غذا ناموافق ملتی تھی اُسی قدر قوت ہاضمہ اُس سے کم متاثر تھی۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ ایسی ناموافق غذا یہان رہ کر ہضم ہی نہین ہوسکتی۔

مرشدزادہ کی معیت مین جنت المعلیٰ کی حاضری بھی دے آیا۔ میر عبدالعزیز صاحب تو دیگر زیارتگاہون پر بھی ایک صاحب کے ساتھ حاضری دے آئے تھے۔ مگر مین نے مدینہ منورہ سے واپسی پر زیارتگاہون پر حاضری ملتوی رکھی۔

٩ شوال (۵ مئی) ہماری روانگی کا دن متعین تھا۔ مگر جب عصر کے وقت تک اونٹ نہ آئے تو ہم لوگ مطمئن ہوگئے کہ آج روانگی نہ ہوسکے گی۔ شام کے قریب دفعتاً اونٹون کے آجانے کی اطلاع ملی اور جلدی جلدی شغدفون پر سامان رکھا گیا۔ سامان رکھکر ہم لوگ حرم شریف چلے گئے جہان نماز مغرب کے بعد

طواف وداع کیا اور باب الوداع کی طرف سے رخصت ہوے۔ ہمارے اونٹ حرم شریف کے باہر ہی کھڑے تھے اِس لیے فوراً سوار ہوکر ایک گھنٹہ مین شہدا پہونچ گئے۔ یہ مقام مکہ معظمہ کے نواح مین تقریباً دو کوس کے فاصلہ پر مسجد تنعیم سے قریب ہی۔ شہر سے تمام قوافل یہان آکر جمع ہوتے ہین اور ایک دو دن کے بعد جب قافلہ پورا اکٹھا ہوجاتا ہی تو روانہ ہوتا ہی۔ قوافل کا یہ اجتماع "تبریزا" کی اصطلاح سے موسوم ہی۔ شغدف پر پہلی بار سوار ہونے کا اتفاق ہوا تھا، اِس لیے یہ مختصر سفر بجاے تکلیف دہ ہونے کے بہت فرحت کا موجب ہوا میرے شریک شغدف رحمت شاہ ماشاءاللہ بہت تندرست و توانا تھے لہذا شغدف کا وزن برابر کرنے کے لیے جنس کا بڑا حصہ میرے شغدف پر رکھ دیا گیا تھا جسکی وجہ سے مجھے جنبش تک کا موقع نہ تھا۔ شہدا پہونچ کر سب سے پہلے پانی کی فکر ہوئی۔ تلاش سے ایک کنوان ملا جہان پانی بھر کر وضو کیا گیا اور نماز کے بعد شغدف کے سامنے زمین پر بچھونا بچھا کر پڑ رہے۔ صبح کو مین اور دو ساتھی مکہ معظمہ واپس آئے۔ بعض ضروری چیزین رہ گئین تھین اُن کو گھر اور بازار سے لیکر ساتھیون کو تو مین نے دوپہر ہی کو رخصت کر دیا اور مین نماز کے بعد اپنے مہتمم ڈاک کی خدمت مین حاضر ہوا۔ اتفاق سے گھر کے خطوط اور اخبارات آگئے تھے۔ عجلت مین خطوط کے جواب تو لکھدیے مگر اخبارات لینا بھول گیا اور ایک گدھا کر کے سہ پہر تک قافلہ مین آکر ملگیا۔ یہان میدان مین دھوپ کی تمازت سے لوگ بدحواس ہو رہے تھے اور پانی کی قلت مزید ستم ڈھا رہی تھی۔ عصر کا وقت قریب تھا اور وضو کے لیے ساتھیون کے پاس ایک قطرہ پانی کا نہ تھا۔ قریب ہی اگرچہ بازار لگا ہوا تھا۔ جہان ضروری اشیاے خوردنی ملتی تھین مگر پانی کہین بھی نہین ملتا تھا۔ البتہ کنوئین پر سقے بھر رہے تھے مگر وہ بات بھی نہین سنتے تھے۔ آخر بعد تلاش بسیار ایک کنوان ملا جہان کوئی سقہ نہ تھا اور مین نے اور رحمت شاہ نے مل کر پانی بھرا وضو کیے اور ایک ایک ٹین بھر کر اپنے مقام تک لائے۔ اس قسم کی جسمانی محنت کا مین بالکل نا اہل ہون اس وجہ سے پانی کا ٹین لانا گویا ایک عظیم الشان مہم تھی۔ اور اگرچہ بالآخر مین اس مہم کو سر کر سکا مگر پانی کا ایک معقول حصہ ضایع ہوگیا اور میرے کپڑے شرابور ہوگئے۔ گرمی کی شدت کی وجہ سے اگرچہ فی الجملہ اس کی کوئی تکلیف نہین ہوئی لیکن بہت پست ہوگیا۔ نماز عصر سے فارغ ہونے کے بعد روانگی کی تیاری شروع ہوئی۔ عین اُسی وقت دیکھا کہ شریف کی سواری آرہی ہی۔ سبزہ گھوڑے پر شریف سوار تھے اور ان کے پیچھے ایک دو آدمی اور گھوڑون پر سوار اور جلو مین مختصر سی جماعت خدام اور محافظین کی تھی۔ شریف ایک پہاڑی کے دامن مین

گھوڑے سے اُترے پہاڑی کے ایک حصہ پر جو زیادہ بلند نہ تھا ایک جگہ کسی قدر ہموار تھی یہاں چند اونی دریان بچھا دی گئین اور شریف معہ دو ایک ساتھیون کے وہین جاکر بیٹھ گئے اور بقیہ ہمراہیون مین سے کچھ تو نیچے گھوڑون کے پاس کھڑے رہے یا بیٹھ گئے اور کچھ شریف کے عقب مین پتھرون کی آڑ مین ہوگئے۔ ایک کرسی شریف کے قریب شاید اُن کے بیٹھنے کے لیے رکھی گئی تھی مگر وہ دری پر بیٹھے۔ ایک دوربین اُن کے پاس تھی اُس کے ذریعہ سے کبھی وہ قافلہ کا نظارہ کرتے اور کبھی اُس کو کرسی پر رکھ کر ساتھیون سے بات چیت کرتے۔ مین نے اِس سے قبل شریف کو نہین دیکھا تھا اِس لیے مین غور سے دیکھتا رہا اور اگرچہ فاصلہ زیادہ تھا اور میری نگاہ بھی کمزور رہی تاہم مین ان کی حرکات وسکنات کو بخوبی دیکھ سکا۔ اب قافلہ روانہ ہونے لگا اور مختلف جوانب مین شغدف اونٹون پر کسے جانے لگے جسکی وجہ سے ایک اچھا خاصا ہنگامہ بپا ہوگیا۔ ادھر ہمارے بدوؤن نے آکر شغدفون پر سامان رکھنے کا تقاضا کیا۔ ہمارے ترجمان صاحب ہمارے ساتھ نہین آئے تھے بلکہ عصر کے قریب ہمارے مطوف کے وکیل عبدالرحمٰن قشناس کے ساتھ آئے۔ یہ صاحب تنہا ہمارے قافلہ کے ترجمان نہ تھے بلکہ ایک اور مختصر قافلہ دوسرے مطوف کے حاجیون کا بھی ان کے تحت مین تھا۔ وکیل صاحب نے ہر اونٹ کے کرایہ مین سے دو دو گنیان ہمارے پاس اِس غرض سے جمع کین کہ یہ رقم مدینہ منورہ پہونچ کر اپنے بدوؤن کو دیدین۔ یہ کل رقم میر عبدالعزیز صاحب کے پاس جمع کرا دی گئی کہ ہمارے مختصر قافلہ کے سردار وہی تھے۔ دوسرے شغدفون کے مقابلہ مین میرے ہیان سامان زیادہ تھا۔ اِس پر ہمارا بدو عبدالرحمٰن بہت جز بز ہوا۔ دیر تک حجت ہوتی رہی۔ مین کہتا تھا کہ راستہ مین ناقص جنس خریدنا مجھے منظور نہین اِس لیے مین نے مدینہ منورہ تک کے لیے سامان یہین سے ساتھ لے لیا ہے۔ البتہ اگر بدو اِس پر رضامند ہو کہ اُس کو راہ مین کھانا نہ دیا جائے تو مجھے کچھ عذر نہوگا اگر نصف جنس یہین چھوڑ دی جائے۔ بدو پہلے تو بہت ناراض ہوتا رہا اور جیسا کہ غصہ ور لوگون کا قاعدہ ہے بہت قسمین بھی کھاتا رہا۔ لیکن بالآخر وکیل صاحب نے جب یہ تصفیہ کر دیا کہ مین ایک روپیہ اُس کو دیدون تو وہ راضی ہوگیا۔ نماز مغرب پڑھ کر جب ہم اونٹون پر سوار ہوئے اور ہمارا قافلہ چلا تو عبدالرحمٰن کے بجائے ایک دوسرا بدو میرے اونٹ کے ساتھ تھا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ وہ عبدالرحمٰن کا بھائی ہے اور اُس کا نام عمار ہے۔ (مکہ معظمہ کے حالات مین اِس وجہ سے بہت اختصار کرنا پڑا ہے کہ مدینہ منورہ سے واپسی کے بعد زیادہ دنون وہان حاضر رہنے کا موقع ملا اور اُس کا مفصل ذکر انشاءاللہ آئندہ کیا جائے گا)۔

ظفر الملک

# نظرے خوش گذرے

جناب محمد حنیف صدیقی نے اپنے گرامی نامہ مین توجہ دلائی ہو کہ سفر حجاز کی روداد کے گذشتہ نمبر مین یہ عبارت درج ہو:-

"در زمزم پر دعا پڑھ کے دروازہ کے اندر داخل ہوا۔ آب زمزم پیا اور ہاتھون پیرون اور جسم کے دیگر حصون پر ملا"

حالانکہ بعد کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہو کہ "نماز ظہر سے قبل کا وقت اور آپ کا روزہ تھا جو آپ نے آب زمزم پیا"

صاحب مذکور کی اس عنایت کا شکریہ۔ دراصل "پیا" کے بجاے "لیا" کا لفظ ہونا چاہیے کیونکہ مین نے روزہ کی وجہ سے افطار تک آب زمزم نہین پیا۔ یقیناً کاتب نے یا خود مین نے سہواً لکھدیا۔

---

مکہ معظمہ سے ایک محترم کرمفرما اپنے تازہ گرامی نامہ مین تحریر فرماتے ہین:-

"نومبر دسمبر کے الناظر مین سید مقبول احمد صاحب آبادی نے "اہل مکہ کے اخلاق" کے عنوان سے جو ریمارک فرماتے ہین اس مین انھون نے حسن شیبی (کلید بردار خانۂ کعبہ کے فرزند) کو اپنا آشنا اور دوست ہی نہین ظاہر فرمایا بلکہ اپنا مہمان بھی لکھا جس سے ناظرین الناظر کو یہ شبہ ہوسکتا ہو کہ حسن شیبی الہ آباد مین ہو اور سید صاحب کا مہمان ہو مگر جب ناظرین الناظر یہ سنین گے کہ حسن شیبی اس وقت مکہ معظمہ مین موجود ہو تو سید صاحب کی نسبت کیا خیال کرین گے۔ اور خود حسن شیبی سے اس واقعہ کا ذکر کیا گیا کہ الہ آباد مین کوئی عرب صاحب حسن شیبی بن کر سید صاحب ایسے باخبر مہمان نواز بزرگ کی پُرلطف میزبانی کا لطف اُٹھا رہا ہو تو وہ بیحد ہنسا اور سید صاحب کی باخبری اور وسعت معلومات کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ معلوم نہین جب خود سید صاحب اپنے عزیز مہمان کی اس مکاری سے واقف ہون گے تو اپنے عزیز مہمان کو جو ان کا آشنا اور دوست ہو کس نظر سے دیکھین گے۔"

مکہ معظمہ کے ایک تاجر جن سے جدہ مین ایک صاحب کے یہان ملاقات ہوئی تھی اور جہاز مین میرے

ہمراہ ہندوستان آئے ہین ابھی دو مہینہ کے قریب لکھنؤ مین رہ کر گئے ہین، انھون نے بھی سید مقبول احمد صاحب کی تحریر کو پڑھ کر فرمایا تھا کہ حسن شیبی ہندوستان نہین آئے۔ سید صاحب اپنے ماموں کی شخصیت کے متعلق مزید تحقیق کرلین تو بہتر ہوگا۔

---

ہمارے ایک محترم شفیق نے اپنے کم عمر سہ ماہی رسالہ مین اُس زمانہ مین جبکہ ایڈیٹر الناظر زیارت حرمین شریفین کے لیے گیا ہوا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الناظر پر ہمارا ساتھ فرماتے ہوے اپنے ناقابل تقلید انداز تحریر مین میری شوخ نگاری پر ملامت کی اور اِس بات پر افسوس ظاہر کیا تھا کہ لکھنؤ مین کوئی علمی رسالہ نہین ہے۔ مین سنجیدگی و متانت کا ادعا نہین رکھتا اور نہ اس خام خیالی مین مبتلا ہون کہ الناظر اُس معیار کے مطابق نکل رہا ہے جو خود میرے خیال مین ایک علمی رسالہ کا ہے جس کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ مین خود اپنے شفیق مکرم کی طرح عالم و فاضل نہین کہ تمام تر ارباب علم کو رسالہ کی قلمی اعانت پر متوجہ کرسکون۔ جو لوگ ذاتی سرمایہ رکھتے یا کسی مجلس قومی کے منتظم ہین اُن کو جو آسانیان حاصل ہین میرے لیے موجودہ بے سروسامانی مین وہ بھی مفقود ہین۔ لیکن موقر معاصر کی تازہ اشاعت دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی کہ وہ اپنی سنجیدہ و علمی رفعت سے رفتہ رفتہ اُتر کر اُسی سطح پر آرہا ہے جو الناظر جیسے بھکاریون ہی کے لیے موزون ہو سکتی ہے۔

سب سے پہلے تو "کھسیانی بلی کھمبا نوچے" کا شوخ عنوان پڑھ کر حیرت ہوئی اُسکے بعد یہ پڑھ کر افسوس ہوا کہ مشہور علمی پرچہ "معارف" کے فاضل ایڈیٹر کے رکیک اور عامیانہ زبان مین حملہ کا ترکی بہ ترکی جواب دینے کی کوشش مین یہ شوخی انداز نمودار ہوا ہے حالانکہ معارف کے جس نوٹ پر یہ نمائش بیزاری ہے اُسے بار بار پڑھنے پر بھی کوئی رکیک اور عامیانہ زبان مین حملہ نظر نہ آیا اور اس اندیشہ سے کہ میری کوتاہ نظری کا قصور ہو۔ مین اُس نوٹ کو یہان بجنسہ نقل کرتا ہون۔ وھو ہذا

"رسالہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مین ایک صاحب شعر العجم پر مسلسل تنقید لکھ رہے ہین اس تنقید کی آخری قسط اکتوبر کی اشاعت مین شایع ہوئی ہے اغلاط کا بیشتر حصہ نامون اور سنون کے اُلٹ پھیر اور اختلافات پر مبنی ہے، اِس آخری قسط کے آخر مین شعر العجم مین عمر خیام کے متعلق جو کچھ ہے اُس پر تنقید کی گئی ہے، مضمون نگار صاحب نے اِس تنقید کی تحریر کی نسبت ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا،

پروفیسر ادبیات فارسی اورنٹیل کالج لاہور، شاگرد پروفیسر براون کی طرف کی ہی، مرحوم مصنف نے تو سیکڑون برس کے مردہ اشخاص کے نامون مین غلطیان کی ہین، مگر ہمارے زندہ تنقید نگار کی صحیح البیانی یہ ہی کہ وہ زندہ اور معاصر اشخاص کے نامون مین بھی التباس اور تشابہ سے محفوظ نہین پھر مردون کی داد و فریاد کون سنتا ہی، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا (مشہور شاعر) اور ڈاکٹر محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی (ماہر ادبیات ایران) شاگرد پروفیسر براون پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور دو مستقل ہستیون کے علٰحدہ علٰحدہ نام ہین، حضرت مسیح نے سچ کہا ہی "تم کو دوسرون کی آنکھ کا تنکا نظر آتا ہی مگر اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہین آتا"

یک زندہ دل نہ رفت سلامت ز عیب جو  کاین ماجرا بہ خضر علیہ السلام رفت "

ناظرین الناظر مین سے جو اہل علم اسے ملاحظہ فرمائین انھین اگر تلاش و تجسس سے وہ رکیک اور عامیانہ زبان مین حملہ نظر آجائے تو مجھے بھی بتائین مین شکر گذار ہون گا۔ حدیث دیگران کے سلسلہ مین اوپر عرض کر چکا ہون کہ ہر نکتہ چین و معترض کا انداز تحریر درشت معلوم ہوتا ہی اور کہین یہ انداز پسندیدہ قرار قرار پاجاتا ہی اور کہین قابل گرفت" مرزا غالب نے ایسے ہی موقع کے لیے کہا ہی ؎

ہم جو چُپ ہون تو ہنین سودائی  شیخ چپ ہو تو توکل ٹھہرے

اور حضرت مسیح کا یہ قول جس کی تصدیق اسی مضمون مین ہمارے محترم اور عالم و فاضل دوست نے بھی فرمائی ہی بے شبہ بالکل سچ ہی کہ

"تم کو دوسرون کی آنکھون کا تنکا نظر آتا ہی مگر اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہین آتا"

میرے شفیق مکرم کو میدان صحافت مین تشریف لائے ہوے ابھی زیادہ زمانہ نہین گذرا ہی اس لیے اگر مرزا داغ کے الفاظ مین یہ عرض کیا جائے کہ ؎

ابھی سن ہی کیا ہی جو بیباکیان ہون  اُنھین آئین گی شوخیان آتے آتے

تو غالباً رکیک اور عامیانہ حملہ نہ قرار پائے گا۔ اور اگر یہ دخل در معقولات طبع عالی پر گران گذرے تو مجھے عادی مجرم جان کر میرے شفیق محترم معاف فرمائین۔ ان کی عظمت و منزلت میرے دل مین جس قدر ہی اُس کے اعادہ کی یہان حاجت نہین لیکن فطرت انسانی کی کمزوریون سے مجبوری ہی۔

اسی رسالہ مین صاحب مطبع کا ایک معذرت نامہ ہی جسمین اُنھون نے محترم ایڈیٹر کی خواہ مخواہ نقل کی ہی جسکے متعلق صرف اتنا عرض کرنا کافی ہی کہ ع ایاز قدر خود بشناس۔ ایڈیٹر صاحب کو اپنی ذمہ داری بھی فراموش نہ کرنا چاہیے۔

# خریداران الناظر سے خاص رعایت

الناظر بک ایجنسی کے کاروبار کو بفضلہ تعالیٰ جو کامیابی نصیب ہوئی ہے چونکہ ناظرین الناظر کا اس سے گہرا تعلق ہے اس لیے آئندہ کے لیے یہ تجویز کیا گیا ہے کہ خریداران رسالہ کے ساتھ مطبوعات ذاتی کی قیمت مین خاص رعایت کی جائے۔ مگر یہ رعایت صرف خریداران رسالہ کے لیے ہوگی اور لازمی ہوگا کہ الناظر بک ایجنسی کو فرمائش بھیجتے وقت اپنا نمبر خریداری تحریر فرما دیا کرین۔

ظفر الملک

## مسلمانون کی تہذیب

یعنی مسلمانون کی تمدنی ترقی کے متعلق نواب محسن الملک مرحوم کا ایک فاضلانہ لکچر۔ قیمت ۶/

(خریداران رسالہ سے ۵/)

## میلاد النبی ؐ

مشہور محدث حضرت ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کے اصل عربی متن کے مقابل اس کا نہایت فصیح اردو ترجمہ۔ قیمت ۴/

(خریداران رسالہ کے لیے ۳/)

## الاحسان

مصنفہ مولوی احسان الدین علوی مرحوم جسمین لفظ صوفی کی تحقیق تصوف کی ابتدا اور اس کی درجہ بدرجہ ترقیون کا ذکر ہی اور آخر مین تصوف کے تمام شعبون کو اسلام سی تطبیق دی گئی ہی قیمت ۸/ (خریداران رسالہ کے لیے ۵/)

## مجموعہ کلام شبلی

مولانا شبلی مرحوم کا اردو دیوان جس کا ایک ایک شعر ان کی قادر الکلامی اور اعلیٰ ذوق شاعری کا نمونہ ہی

قیمت ۱۲/

(خریداران رسالہ کے لیے ۱۰/)

## وکرم اروسی

ترجمہ مولوی عزیز مرزا بی اے مرحوم

یہ کالی داس کے مشہور و معروف ڈرامے کا اردو ترجمہ ہی جسمین لائق مترجم نے ایک بسیط مقدمہ بھی لکھا ہی۔ اور ہندو ڈرامہ کی تاریخ اور نوعیت پر مفصل بحث کی اور کالی داس کا موازنہ شیکسپیر اور میر انیس وغیرہ سے کیا ہی قیمت ۱۲/

(ناظرین رسالہ کے لیے ۸/)

## مثنوی امید و بیم

لکھنؤ کے مشہور شاعر و انشاپرداز و مرد فلسفی مرزا محمد ہادی رسوا بی اے کی لاجواب نظم جسے اردو مین اعلیٰ درجہ کے فلسفیانہ خیالات کی پہلی نظم کہنا بجا ہوگا

قیمت ۴/

(خریداران رسالہ کے لیے ۳/)

## ارض نہرین

میسوپوٹیمیا یا عراق عرب کے آثار تاریخ

مولفہ مسٹر عنایت اسد بی اے رجسٹرار عثمانیہ یونیورسٹی۔ قیمت ۴/

(خریداران رسالہ کے لیے ۳/)

## دلچسپ مختصر افسانے

ایک نادان خدا پرست اور دنیا دار کی کہانی ۱/

مساوات۔ از مسٹر سلطان حیدر جوش ۱/

اتفاقات زمانہ ۱/

(خریداران رسالہ کے لیے نصف قیمت)

## افراد کا سبب

جسٹس مولانا سید کرامت حسین مرحوم کا ایک قابل قدر مضمون قیمت ۴/

(خریداران رسالہ کے لیے ۳/)

| کلام اقبال | مسلمانان اُندلس | کلام حالی |
|---|---|---|
| ڈاکٹر اقبال کی مقبول عام نظمیں:- شکوہ ۲/ جواب شکوہ ۴/ بلبل ۱/ شمع و شاعر ۲/ فریاد امت ۳/ تصویر درد ۴/ ۲/ (خریداران رسالہ کو تین چوتھائی قیمت پر) | نامور مورخ اسٹینلی لین پول کی کتاب مورس ان اسپین کا اردو ترجمہ از مولوی سید عبد الغنی وارثی قیمت عہ (خریداران رسالہ کے لیے ۲ عہ) | مولانا حالی کی متفرق نظمیں جو بیحد مقبول ہیں:- شکوہ ہند بیوہ کی مناجات عرض حال حب وطن ۲/ مسدس ۱/ حب وطن خدمت ۲/ مناظرہ رحم و انصاف ۱/ بحث اور اُس کا مناظرہ ۱/ (خریداران رسالہ کے لیے تین چوتھائی قیمت پر) |

## خوان دعوت

لڑکیوں کو کھانا پکانا سکھانے کے لیے

مرتبہ صاحبہ لکھنوی

فن افسانہ کے دلکش پیرایہ میں یہ کتاب مرتب کی ہے

جس میں باورچی خانہ کے ضروری انتظامات اور عمدہ لذیذ کھانوں کی مجرب ترکیبیں ذاتی تجربہ کی بنا پر تحریر ہیں قیمت عہ

(خریداران رسالہ کے لیے ۱۲/)

## سفرنامہ مصر و روم و شام

مولانا شبلی کا مشہور سفرنامہ جو ان ممالک کے متعلق بہترین تاریخی، علمی، معاشرتی واقفیت فراہم کرتا ہے

قیمت ۶/

(خریداران الناظر کے لیے عہ)

## عورتوں کی انشا

خواتین اور اُن کی صاحبزادیوں کو خطوط نویسی سکھانے والی کتاب

مصنفہ بیگم صفدر علی صاحبہ

قیمت عہ

(خریداران رسالہ کے لیے ۱۲/)

## تسخیر فرانس

انگلستان کے لاجواب ڈرامہ ہنری ی فتح ... کا اردو ترجمہ از منشی تفضل حسین صاحب

قیمت ۸/

(خریداران الناظر کے لیے ۶/)

[illegible]

ملنے کا پتہ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر ا ۔ ۸۷۸

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قیمت سالانہ للعہ

# الناظر

قیمت ششماہی ۲ر

ایڈیٹر ظفر الملک علوی

| | | |
|---|---|---|
| نمبر ۱۵۳ | ماہ مارچ ۱۹۲۴ء | جلد ۲۶ |


فہرست مضامین




قیمت فی پرچہ ۸ر

الناظر پریس لکھنؤ مین چھپا

[illegible]

پرنٹر و پبلشر: اسحاق علی علوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# مطبوعات جدیدہ

## تاریخ عرب

مصنفہ موسیو سدیو فرانسیسی

جو موسیو لی بان کی تمدن عرب سے بھی قبل کی تصنیف ہے اور عربون کے تمام مذہبی واخلاقی، معاشرتی وسیاسی، علمی وعملی کارنامون کو ایک ہی مرقع مین نمایان کرکے دکھاتی ہے۔ ان مباحث پر اُردو کیا معنی انگریزی فارسی وغیرہ زبانون مین بھی

## ایسی بلند پایہ کتاب

موجود نہین ہے۔ فرانسیسی کتاب بہت ضخیم ہے۔ یہ اُس کا ضروری خلاصہ ہے جسکا حجم ۵۰۰ صفحے سے زائد ہے کتاب خاص اہتمام اور نہایت صحت وصفائی سے چھپی ہے اور جلد نہایت عمدہ بنوائی گئی ہے۔

قیمت قسم اول عـــہ ر قسم دوم عـــہ ر

## الفہرست

پروفیسر سجاد مرزا بیگ دہلوی نے بیس سال کی مسلسل کوشش کے بعد یہ کتاب مرتب کی ہے جسکے مطالعہ سے واضح ہوجاتا ہے کہ ہماری زبان نے اپنی تھوڑی عمر مین علمی حیثیت سے کتنی ترقی کی ہے۔ اِس فہرست مین علوم وفنون کی تقریباً آٹھ ہزار کتابون کے نام معہ اسمائے مصنف، سنہ اشاعت، تعداد صفحات، نام مطبع، ملنے کے پتے وغیرہ کی ضروری کیفیات کے درج ہین۔

تمام کتب خانون اور کتب خانے جمع کرنے والون اور اُردو زبان کی تاریخ سے واقفیت پیدا کرنے والون کو اس کتاب کا ایک نسخہ منگا لینا چاہیے۔ قیمت دس روپیہ عـــہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# الناظر

نمبر ۳ جلد ۱۵ — ماہ مارچ ۱۹۲۴ء

## فیہ مافیہ

(اثر: چلبی)

جنوری کے الناظر میں ان اوراق میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (علی گڑھ) کے جلسہ سالانہ دنمائش سے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا تھا اُس مین ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ "تماشائیون کی تعداد انگلیون پر گنے جانے کے قابل تھی"۔ مسلم یونیورسٹی گزٹ، اس کی تردید کرتا ہے، اور لکھتا ہے کہ حاضرین کی معقول تعداد موجود تھی۔ راقم سطور نہایت مسرت سے اس تردید کو قبول کرتا ہے، اور بلا تامل اپنے فقرہ مذکورہ بالا کو واپس لیتا ہے۔ پچھلے معلومات کی بنیاد ہمدم کے نامہ نگار خاص کا بیان تھا۔ لیکن گزٹ کا سرکاری بیان یقیناً اُس سے زیادہ قابل وقعت ہے۔ "چلبی" کو انشاء اللہ آئندہ بھی کبھی اپنی غلطی کے احساس کے بعد اس کے اعتراف مین تامل نہوگا۔ وما توفیقی الا باللہ

---

الناظر کی اسی اشاعت مین، صدر صاحب تعلیمی کانفرنس کے خطبۂ صدارت پر تبصرہ کی ضمن مین ایک مقام پر یہ فقرہ بھی سپرد قلم ہوا تھا، کہ

"سنتے ہین کہ مسلم یونیورسٹی کے بعض روشن خیال اساتذہ نے صدر صاحب سے پُر زور مطالبہ کیا ہے کہ ایڈریس کے اس جزو کو محو کر دیا جائے"

---

اسکے متعلق مسلم یونیورسٹی گزٹ ایک انداز خاص کے ساتھ، جسمین سادگی کے بہ نسبت شاید دلربائی زیادہ ہی، ہم سے "ثبوت" کا مطالبہ کرتا ہی! اس مطالبہ کا بہترین جواب آج سے کئی صدی پیشتر صائب اپنے مشہور فقرہ مین دے گئے ہین۔ یعنی

"شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد"!

غریب رشید صدیقی کے فلسفۂ ازدواج، پر اس "دار العلم" کی چار دیواری کے اندر جیسی کچھ لے دے ہوئی، اُس نے یہ تو ثابت ہی کر دیا تھا، کہ ادب لطیف وشوخ نگاری کے داخلہ کی روک تھام کے لیے خدایان یونیورسٹی نے بڑے زبردست بھاٹک تیار کر رکھے ہین، مگر اب یہ روایت بھی حد تواتر تک پہونچ چکی ہی کہ عنقریب اُردو شاعرون کی ساری آبادی کو قانونی نوٹس دیا جانے والا ہی کہ وہ "طول شب فراق" کو "ناقابل پیمایش" قرار دے کر کالج کے مشہور پروفیسر ریاضیات کی کھلی ہوئی اور ناقابل برداشت توہین کر رہے ہین! ایک دوسری روایت یہ بھی سننے مین آئی ہی کہ بہت بڑی تیاریون کے ساتھ ایک اور استغاثہ بھی دائر ہونے والا ہی، جسمین "مستغیث" کارکنان مسلم یونیورسٹی کا "پرزانِ مسلم یونیورسٹی گزٹ" ہونگے، اور ملزم کا اسم گرامی حضرت "ہاتف غیبی" ہی!

---

رسالہ اُردو کو معارف سے گلہ ہی کہ اس کی زبان "رکیک وعامیانہ" ہو گئی ہی، قدرت کی ستم ظریفی یہ ہی کہ جس تحریر مین یہ گلہ درج ہی، اس کا نہایت ہی شایستہ وسنجیدہ عنوان حسب ذیل ہی:-

"کھسیانی بلی کھمبا نوچے"

کہتے ہین، کہ معارف والون نے اس "شتر گربہ" کی داد دینے سے قبل جب ایک اُردو دیوان سے تفاول کیا تو پہلا شعر یہ برآمد ہوا ؂

سامنے غیر کے تم فتنہ نہ مجھے کہتے ہوا
چھائی جاتی ہے یہ دیکھو تو سر اپا کس پر

---

کانفرنس کی جماعت عاملہ کے ایک سربرآوردہ رکن، مولوی طفیل احمد صاحب سب رجسٹرار ہین جن کی ایک عمر سود کی دستاویزون کی تحریر مین صرف ہو چکی ہی، اور اس نے اس معاملہ مین اُنھین اتنا دلیر بنا دیا ہی کہ وہ علانیہ "جواز سود" کی تبلیغ فرمانے لگے ہین۔ چنانچہ متعدد رسایل ومضامین کی اشاعت کے علاوہ پچھلی کانفرنس مین بھی

(اُس کانفرنس مین جسکے نام کا جزو اول "مسلم" ہے) اسی قسم کی تحریک موصوف کے ایما سے پیش ہوئی۔ اُن کا فرمانا یہ ہے کہ جس سود کی ممانعت اسلام نے کی ہے وہ مہاجنی سود (یوزری) ہے تجارتی سود (انٹرسٹ) ممنوع نہین لیکن اُن کا خود اپنے مشغلۂ ملازمت، سب رجسٹراری کے عہدہ سے متعلق کیا فتویٰ ہے جہان عموماً تمامتر سود کی اسی صنف سے متعلق دستاویزون کی کتابت ہوتی رہتی ہے جو خود اُن کے نزدیک بھی ممنوع ہے؟ انھین شاید سرور کائنات صلعم کے اس قول مبارک کا خیال نہین رہا جسمین سود لینے والے

| | |
|---|---|
| عن جابر رضی الله عنه قال لعن رسول الله صلی الله علیه وسلم آکل الربوا وموکله وکاتبه وشاهدیه وقال هم سواء (مسلم) | سود دینے والے، سودی دستاویز لکھنے والے، معاملہ سود کی گواہی دینے والے سب کو مساوی درجہ کا مستحق لعنت قرار دیا گیا ہے۔ |

---

طفیل احمد صاحب نے اس بحث مین پڑ کر عجیب عجیب اجتہادات فرمائے ہین، جن مین سب سے زیادہ دلچسپ و پُرلطف اُن کے اجتہادات لغت و زبان سے متعلق ہین فرماتے ہین کہ ربوٰ اور ربح دو بالکل مختلف مفہوم رکھتے ہین، اسلام نے اول الذکر کو حرام قرار دیا ہے اور آخر الذکر کو جائز۔ ربوٰ اور ربح کا یہ فرق ممکن ہے جناب ممدوح کی نظر سے کسی ایسے لغت مین گذرا ہو جس تک صرف کانفرنس آفس والون کا دسترس ہو سکتا ہے ورنہ جو کتب لغت متداول ہین ان مین تو ربح کے معنی ہی سود کے درج ہین۔

ربح و ربَح۔ (بالکسر و بفتحتین) سود۔ (صراح)
تجارۃٌ رابحۃٌ۔ خرید و فروخت یا سود۔ (ایضاً)
ربح۔ بالفتح سود کردن و بالکسر سود۔ (منتخب)
ربح۔ بالکسر نفع و سود۔ (غیاث)

علیٰ ہذا موصوف کو اپنے اس اجتہاد پر بھی ناز ہے کہ "ربوٰ کے معنی عام مسلمان جو مطلق اضافہ زر یا بڑھوتری کے سمجھ رہے ہین، یہ غلط ہے، بلکہ اس کے مفہوم مین صرف مہاجنی سود (یوزری) داخل ہے"۔ ربوٰ کے یہ محدود معنی قرار دینا، تمامتر جناب موصوف ہی کا اجتہاد ہے، ورنہ ارباب لغت کا بالکل واضح و غیر مشتبہ حکم موجود ہے کہ ربوٰ کے معنی مطلق بڑھوتری یا زیادتی کے ہین۔

رَبَا۔ زادَ و نَمَا (قاموس)

ربا۔ ربوٰ۔ فزونی و فزودن شدن۔ (صراح)
الربوٰ۔ آن زیادتی گرفتن است در دام و بیع۔ (ایضاً)
ربوٰ۔ بالیدن و افزودن شدن۔ (منتخب)
ربا۔ زیادہ شدن و نشو و نما کردن و زیادہ گرفتن در دام و بیع (غیاث)

---

اجتہاد فی اللغت سے بھی زیادہ پرلطف حضرت کا اجتہاد فی المنطق ہی۔ ارشاد ہوتا ہی، کہ قرآن مجید مین چونکہ حرم الربوٰ آیا ہی، حرم السود نہین آیا ہی، اس لیے سود کی ممانعت بالکل ثابت نہین ہوتی۔ سبحان اللہ! اگر اجتہادات استدلالی مین اسی رفتار سے ترقی ہوتی رہی تو صبح شام مین اس فتوی کو بھی شایع شدہ سمجھنا چاہیے، کہ چونکہ کلام مجید مین ہر جگہ اقیموا الصلوٰۃ وارد ہوا ہی، اقیموا النماز کہین بھی وارد نہین ہوا ہی، اس لیے "نماز" کو اپنے اوپر فرض کر لینا نہ صرف ناجائز بلکہ کھلی ہوئی بدعت اور احداث فی الدین کی معصیت ہی۔ علیٰ ہذا خدا کی خدائی و یکتائی، محمدؐ کی پیغمبری، فرشتون کا وجود، نیکی و بدی کی پرسش، روزہ کا وجوب، شراب کی حرمت، چوری اور حرام کاری کی ممانعت غرض وہ تمام مسایل جن کے مجموعہ سے ہندوستان مین اسلام و ایمان عبارت ہی، سب کا لعدم و باطل ثابت ہون گے، اس لیے کہ ان کے متعلق ٹھیک انھین الفاظ مین کوئی بھی نص وارد نہین ہوئی ہی!

---

جناب طفیل احمد صاحب کو حضرت فاروق اعظمؓ کے اس قول گرامی سے گویا اپنی تائید مین ایک بڑی قیمتی دستاویز ہاتھ آگئی ہی، کہ "رسول خدا صلعم دنیا سے تشریف لے گئے اور ہم نے آپ سے سود کے بارہ مین کچھ دریافت نہین کیا" اور اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہین کہ سود کی تفصیلات (معاذ اللہ) سیدنا فاروق اعظمؓ کے نزدیک بھی مشتبہ تھین، لیکن اگر تحقیق و دیانت سے کام لیا جاتا، تو انھین حضرت فاروقؓ کا یہ صریح و مشتبہ قول بھی کتب حدیث مین مل جاتا کہ سب سے آخر مین آیت ربوٰ اتری،

| | |
|---|---|
| عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ان آخر | رسول خدا صلعم دنیا سے تشریف لے گئے اور ہمارے |
| ما نزلت آیۃ الربوٰ وان رسول اللہ صلعم قبض | لیے آیت ربوٰ کی تفسیر نہین کی تو سود اور جس مین |
| ولم یفسرھا لنا فدعوا الربوٰ والریبۃ | سود کا شبہ ہو سب کو چھوڑ دو، |

اللہ اللہ! حضرت خلیفۃ الرسول کو تو یہ احتیاط، کہ جس شے کا سود ہونا مشتبہ بھی ہوا اس کو ترک کر دیا اور ہمارے سب رجسٹرار صاحب کی یہ بیباکی، کہ اسی مقدس شخص کو [illegible] کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتے ہیں! راقم سطور کا ان کی خدمت میں [illegible] مشورہ ہے کہ اپنی اس جسارت پر فوراً توبہ کریں، اور غیرت فاروقی کو ناقابل التفات نہ سمجھیں، ورنہ ضرور وہ وقت آ کر رہے گا، جب حسرت و ندامت سب لاحاصل ہوگی۔

---

تجارتی ہو اور مہاجنی سود کی جو قطعاً تفریق تام کی ہو بالفرض درست ہو، تو اسلام کی تعلیمات نے مشکوک و مشتبہ مواقع کے لیے کیا ہے؟ حضرت فاروق اعظمؓ جیسے جلیل القدر صحابی کا ارشاد ابھی گزر چکا، اب سرکار رسالتؐ کا فرمان بھی سن لینا چاہیے:-

دع ما یریبک الی ما لا یریبک | چھوڑ دو اس چیز کو جو مشتبہ ہو اور اختیار کرو اس کو جو غیر مشتبہ ہو۔

یہ علم دوجہان کا ارشاد اقدس تھا، اور صحابہ کرامؓ کی زندگیاں تمام تر اسی سانچہ میں ڈھلی ہوئی تھیں۔ جس شے میں ذرا بھی شبہ محسوس ہوتا تھا، اس کو بے تامل ترک فرما دیتے تھے، خواہ اس ترک سے انہیں کتنی ہی تکلیف لازم آئے۔ آثار و احوال صحابہ کی کتابیں اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہوئی ہیں۔ ذیل میں اردو کی ایک مستند کتاب سے ایک عبارت (کسی قدر اختصار کے ساتھ) مخصوص اسی باب سے متعلق نقل کی جاتی ہے:-

"سود خواری سے اجتناب

اسلام نے سود خواری کی ممانعت ایسے سخت قیود کی پابندی کے ساتھ کی ہے کہ اگر ذرا سی غفلت و بے پروائی کی جائے تو معمولی معاملات، داد و ستد و بیع و شراء بھی سود کی صورت میں داخل ہو جائیں۔ صحابہ کرام ان تمام قیود کا لحاظ رکھتے تھے، اور ان سے نہایت احتیاط کے ساتھ بچتے تھے۔ ایک بار حضرت مالک بن اوسؓ نے حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ سے بیع صرف کرنا چاہی (یعنی اشرفی کے بدلہ روپیہ لینا چاہا) اور سو اشرفیاں ان کے سامنے رکھ دیں۔ انہوں نے ان کو اٹھا لیا اور کہا کہ خزانچی آ جائے تو روپیہ دلا دوں۔ حضرت عمرؓ سن رہے تھے۔ بولے "بغیر لیے ہوئے ہرگز واپس نہ جانا، رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ سونے کے بدلے میں چاندی اگر دست بدست لی جائے تو سود ہے۔

حضرت سعد رضؓ بن عبد اللہؓ نے اپنے غلام کو ایک صاع گیہون دیا کہ اِسکے بدلے مین جُو لے آئے - وہ لایا تو ایک صاع سے کچھ زیادہ تھا، آپ کو خبر ہوئی تو بولے، "اِس کو فوراً جاکر واپس کرو، مین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہو کہ غلہ کو مثلاً بمثلٍ خریدنا چاہیے"۔ لوگون نے کہا کہ بازار مین صرف جَو کا رواج ہو، گیہون نہین مِلسکتا - بولے، مجھے خوف ہو کہین یہ سود کے مشابہ نہو جائے

(اسوۂ صحابہ، جلد اول صفحہ ۱۱۲-۱۱۳ مولفہ مولانا عبد السلام ندوی)

یہ ایک آدھ واقعہ نمونہ کے طور پر درج کر دیا گیا، ورنہ تلاش وجستجو سے اِس قسم کے واقعات کا پورا دفتر پیش نظر ہو سکتا ہو -

---

ابن ماجہ مین ایک طویل حدیث آتی ہو، جس کا خلاصہ یہ ہو کہ حضرت عبادہ بن صامتؓ جب امیر معاویہؓ کی معیت مین مُلک روم مین پہونچے، تو دیکھا، کہ وہان سونے کی اشرفیون اور چاندی کے درہمون کی باہمی داد وستد کا کاروبار جاری ہو - آپ نے فرمایا کہ لوگو تم سود کھاتے ہو - مین نے رسول خدا صلعم کو

یا ایہا الناس انکم تاکلون الربٰو اسمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لا تبتاعوا الذہب بالذہب الا مثلاً بمثلٍ لا زیادۃ بینہما ولا نظرۃ

یہ فرماتے ہوے سنا کہ سونے کی خرید و فروخت سونے کے ساتھ نہ کرو، مگر بالکل برابر یعنی نہ اُن مین کمی بیشی ہو، نہ اُدھار ہو، نہ وعدہ ہو،

امیر معاویہؓ کو اس بنا پر اس رائے سے اختلاف ہوا، کہ اس مین نہ اُدھار تھا نہ وعدہ - مگر حضرت عبادہؓ کو یہ اختلاف سخت ناگوار گزرا، اور برہمی کے ساتھ کہا کہ مین تم سے رسول خدا صلعم کا قول بیان کرتا ہون،

أحدثك عن رسول اللہ صلعم وتحدثني عن رأيك لئن اخرجني اللہ لا اساكنك بارض لك علی فيها امرۃ

اور تم اپنی رائے دیکر اس کو دخل دیتے ہو - اگر خدا مجھے یہان سے بخیریت واپس لے گیا تو بخدا مین اُس سرزمین مین تمھارے ساتھ نہین رہنے کا جسمین تمھاری حکومت ہو گی -

چنانچہ روم سے واپسی کے بعد حضرت عبادہ بجائے اپنے وطن کے جہان امیرؓ موصوف کی حکومت تھی، سیدھے مدینہ منورہ پہونچے - خلیفۃ الرسول فاروق اعظمؓ نے حال دریافت کیا - اُنھون نے پوری سرگذشت کہہ سنائی - ارشاد ہوا، کہ بلا تامل اپنے وطن کو واپس جاؤ اور امیر معاویہؓ کے نام دربار خلافت سے یہ فرمان پہونچا کہ

لا امرۃ لک علیہ واحمل الناس

عبادہ پر تمھاری حکومت نہ چلنے پائے گی - لوگون کو اسی پر

| آمادہ کردے، جو کچھ انھون نے کہا، اس لیے کہ وہی امرِ حق ہے۔ | علیٰ ما قال فانہ ھو الاصل |
|---|---|

---

ایک لطیفہ اور سننے کے قابل ہے۔ مولوی طفیل احمد صاحب اپنی تحریرون مین جابجا مولانا شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے فتوی کا بھی (بغیر اُس کے الفاظ کو نقل کیے ہوے) اپنی تائید مین حوالہ دیتے ہین، اور شاید عوام کے مرعوب کرنے کے لیے اس قدر کافی سمجھتے ہین۔ لیکن انھین عوام مین اُنھین اُن اشخاص کے وجود کو بالکل نظر انداز نہ کرنا چاہیے تھا، جو اصل فتوی کی جانب رجوع کر چکے ہین یا کر سکتے ہین۔ طفیل احمد صاحب کا سارا زور "سود لینے" پر ہے نہ کہ سود دینے پر، وہ اپنی تحریرون مین بارہا اسی کی اہمیت کو نمایان کرتے رہے ہین، بلکہ محض سود دینے کو قطعاً مضر بھی فرما چکے ہین، مگر لطف یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ کا فتوی محض "سود دینے" سے متعلق ہے، اور سود لینے کی بابت استفتا مین سرے سے کوئی سوال ہی نہین۔ استفتا کی عبارت صرف اس قدر ہے:۔

"سود دادن بحربیان درست است یا نہ؟"

سود لینے کا ذکر ہی نہین، صرف سود دینے کی بابت سوال ہے، وہ بھی صرف حربیون کے ساتھ مخصوص ومقید، نہ یہ کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ باہم سود کا کاروبار کرے! خدا طفیل احمد صاحبؒ کی اس جسارت کو معاف کرے کہ وہ خواہ مخواہ جواز سواز سود کی تائید مین ایک ایسے برگزیدہ بزرگ کے نام نیک کو بدنام کرتے ہین، جسے اُن کے پیش کردہ دلائل ومقدمات کے کسی جزو سے بھی ہمدردی نہین ہو سکتی تھی۔ شاہ صاحبؒ کے فتوے کے آخری الفاظ بھی قابلِ غور ہین:۔

| سود لینے اور دینے مین بڑا فرق ہے، اگرچہ اصل گناہ مین دونون برابر ہین۔ | در گرفتن و دادن فرق بسیار گو در اصل وزر ہر دو شریک اند |
|---|---|

---

ربوا سے متعلق کلام مجید واحادیث نبوی مین جو وعیدین وارد ہوئی ہین، وہ اسے دیگر معاصی کبیرہ، چوری، زناکاری، شراب خواری، قماربازی وغیرہ سے کہین زیادہ اہم وشدید تر بتا رہی ہین، ایسی حالت مین یہ کس آئین دانش کا اقتضا ہے، کہ تاویلات باردہ واحتمالات بعیدہ کی بنا پر اس کی پہلے ایک خاص صورت ربح کے نام سے فرض کی جائے، اور پھر اُس کے جواز پر اصرار کیا جائے؟ صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب

قلب، انگریزیت سے مرعوب ہونے کے باوجود بھی الحمد للہ کہ نورِ اسلام سے بیگانہ نہیں، اور مولانا حبیب الرحمن خان شروانی (صدر یار جنگ بہادر) تو شیخ الاسلام دکن ہونے کے علاوہ اپنے صوبہ میں بھی ماشاء اللہ ایک ممتاز عالم دین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حیرت، اور حیرت سے زیادہ عبرت کا مقام ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے "مسلم" کانفرنس کے پلیٹ فارم سے ترویج سودخواری کی تحریک کو جائز رکھا! اللھم اھد قومی انھم لا یعلمون۔

---

یہ ساری گفتگو مذہبی حیثیت سے تھی۔ اگر تمدنی و معاشری حیثیت سے دیکھا جائے تو طفیل احمد صاحب کے کل دلائل، مغالطات مادی و صوری سے لبریز نظر آئیں گے۔ ان کا یہ دعویٰ جو اُن کے استدلال کا مقدمۂ بنیادی ہے، کہ سودخوار قومیں مطمئن و مرفہ الحال ہیں، سرے سے غلط مشاہدات اور ناقص معلومات پر مبنی ہے۔ اول تو کثرتِ زر اطمینان و مسرت کے مرادف ہونا کیا معنی اکثر صورتوں میں اُن کے منافی ہوتی ہے۔ پھر اس کثرتِ زر کی بے ثباتی اور ناپائداری کا ان سودخوار قوموں میں یہ عالم ہے کہ آج ایک کمپنی بڑے بڑے دعووں کے اعلان کے ساتھ قائم ہوتی ہے اور کل ٹوٹ جاتی ہے۔ صبح تک الائنس بنک (شملہ) کی ساکھ لندن سے لیکر سیلون تک قائم تھی، شام کو تار آتا ہے کہ بینک دیوالیہ ہوگیا۔ جو لوگ انگلستان کے روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات کا بہ نگاہ غائر مطالعہ کرتے رہتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ دولت کا یہ فوری اُتار چڑھاؤ متمدن سودخوار قوموں میں کس کثرت سے مختلف جرائم و حوادث کے وقوع کا باعث ہوتا رہتا ہے۔ قتل، خودکشی، جعلسازی، دیوانگی، وغیرہ کے بہ کثرت واقعات کی ذمہ داری محض "ربوٰ و ربح" کا رواج ہے۔ خدا ان "برکات" ربوٰ و ربح سے اسلامی ممالک کو ہمیشہ محفوظ رکھے۔ کیا طفیل احمد صاحب نے عرب کی تاریخ میں یہ نہیں پڑھا ہے کہ مسلمان ایک زمانہ میں تجارت میں بھی بہت ممتاز رہ چکے ہیں، اور چونکہ سودخواری سے محترز تھے اس لیے صدیوں تک اُن کی تجارتیں چلتی تھیں، آج کل کے سودخوار تجار مبئی کا سا حال نہ تھا، کہ آج اگر لاکھوں روپیہ کی کاغذی دولت کے مالک ہیں، تو کل گھر میں کھانے کا بھی ٹھکانا نہیں۔ بہ فرضِ محال کوئی نصِ قطعی اس خاص جزئیہ (ربح) سے متعلق نہ بھی موجود ہو تو اُس کا اس قدر بے ثبات و متلون ہونا بجائے خود اسلام کی پسندیدہ اسپرٹ کے قطعاً منافی ہے۔ اسلام ہر قسم کی قماربازی کا دشمن ہے، اور سود کی یہ صورت سیم و زر کی کھلی ہوئی قماربازی ہے۔

"سرمایہ دارون کی غلامی سے نجات پانے کا یہ عجیب و غریب طریقہ تجویز کیا گیا ہے کہ خود غلامون کو "سرمایہ دار" بنا دیا جائے۔ خیریت اتنی ہے کہ طفیل احمد صاحب نے اس وقت تک اُس مسائل طب پر اپنے ذہن کو متوجہ نہیں کیا ہے، ورنہ یقیناً یہ ہدایت شایع ہو گئی ہوتی کہ جس شخص کو دیوانہ کتا کاٹے، اُس کا بہترین علاج یہ ہے کہ وہ بھی پلٹ کر کتے کو کاٹ کھائے!

سرمایہ داری تمدن جدید کی بدترین لعنت ہے، اسکے اثرات سے اگر محفوظ رہنا مقصود ہے تو اس کی صرف یہی تدبیر ہو سکتی ہے کہ تا بامکان اس نظام سے علیحدگی اور بے تعلقی برتی جائے اور طرز معاشرت اس قدر سادہ اختیار کی جائے کہ سرمایہ دارون کے آستانہ ناز پر سر نیاز خم کرنے کا موقع ہی نہ پیش آئے۔ کفایت، قناعت، سادگی، متمدن زندگی سے حتی الامکان علیحدگی، دنیا سے بے لوثی، سیم و زر کی عدم محبت، دولت کی بے قیمتی، توکل، اعتماد علی اللہ، یا ایک جامع لفظ مین "اسلامی زندگی" ہی وہ سپر وحید ہے، جس سے زر پرستی و شیطان پرستی کے تمام موجودہ و ماضی، جدید و قدیم حربون کو کامیابی کے ساتھ رد کیا جا سکتا ہے۔ خداوند کریم اس حقیقت کے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق طفیل احمد صاحب، راقم سطور، اہل کانفرنس اور ہر کلمہ گو کو عطا کرے۔

---

## تصحیح

(۱) جنوری کے الناظر مین "ابر شبنم" کے عنوان سے جو مضمون صفحات ۱۳-۱۹ پر شایع ہوا تھا اُس کے آخر مین راقم مضمون کا نام طالب اکبرآبادی چھپا ہے حالانکہ صاحب موصوف کا وطن "الہ آباد" میں ہے۔

(۲) اسی مضمون کے صفحہ ۱۴ سطر ۲ مین "بادلون" کی جگہ "ادلون" چھپا ہے اور سطر ۲۲ مین "کائنات الجز" کی جگہ "کائنات الجو" چھپا ہے۔

ایڈیٹر

# رہروِ منزلِ حق

جو کبھی ویران نہ ہو، ہر وہ سرائے دل یہی — چرخ سے جو غم ہو نازل سب کی ہر منزل یہی
گھُٹ کے آخر رہ گئی طولِ شبِ غم سے اُمید — ہجر میں رکھتی تھی زندہ حق ہو یا باطل، یہی
ہائے آنکھوں نے نہ دیکھا برگ و بار کشتِ سعی! — ایک حسرت لہلہا دل میں ترا بسمل یہی
پینے والو ایک میں گر اُٹھ گیا تو اُٹھ گیا — مے یہی ہو گی، یہی دورِ قدح، محفل یہی
ہو گئی جان صرف صحرائے محبت، مرحبا! — رہ نوردِ شوق کا جادہ یہی منزل یہی
خوفِ گردابِ فنا کیا آشنائے عشق کو — ہے یہی موجِ بلا مقصود کا ساحل یہی
کر دیے آباد خرمن تخم نے ہو کر فنا — مزرعِ خونِ شہیداں کا بھی ہر حاصل یہی
منزلِ حق سب کو ہے معلوم رہبر ناپدید — خود نکال اے اہرِ رامیں کہ ہر مشکل یہی
دستِ ہمت کو خجل کرتی ہے استمداد غیر — خضر سے پوچھو تھی یا لغزِ سکندر گل یہی
کارواں کو بھول کر ہے محوِ فکرِ ذات تو — ہے ترا رہزن یہی، غولِ رہِ منزل یہی
توڑ دے دستِ یقیں سے تار و پودِ وہم کو — حاجبِ لیلیٰ یہی ہے، پردۂ محمل یہی

نذرِ جانِ خستۂ مسلم ترے قابل نہیں
شرم مارے ڈالتی ہے خنجرِ قاتل یہی

مسلم

# پیام امن

"انسانیت ایک زندہ وجود ہر وہ نابینا ہین جو اسے محض ایک لفظ سمجھتے ہین"

"جو تعلق فرد کو خاندان سے ہوتا ہی، خاندان کو شہر سے، شہر کو صوبہ سے اور صوبہ کو ملک سے وہی تعلق اب ملک کو مجموعہ ممالک (دنیا) سے ہونا چاہیے۔ ملک کو صرف ذریعۂ زندگی ہی نہین بلکہ اس سے زیادہ کی بھی پروا ہونا چاہیے افراد و اقوام دونون کے لیے یہی اخلاق کا صحیح قانون اور یہی فلاح و نجات کا سیدھا راستہ ہی"

"جو تعلق فرد کو قوم سے ہی وہی قوم کو عالم انسانی سے ہی اس بنا پر جسطرح فرد کے لیے قوم کے فرائض ہین اسی طرح اُس کے حقوق بھی ہین۔ وقت آگیا ہی کہ جن حقوق کے مطالبہ کی عزت فرد کی جانب سے سب سے پہلے فرانس کو حاصل ہوئی، انھین حقوق کا مطالبہ اب اقوام سے متعلق بھی کیا جائے اور فرد سے متعلق جن حقوق ثلثہ کو فرانس کی حریت سیاست نے موجودہ تمدن کے دروازہ پر کندہ کر دیا ہے وقت آگیا ہی حقوق اقوام کا خلاصہ بھی انھین تین لفظون مین مستقبل کا آمیزہ کر دیا جائے۔ . . . . . (۱) حریت (۲) مساوات (۳) اخوت"

"کوئی قوم کسی حصہ دنیا مین آباد ہو سب کو ایک ہی منزل تک پہونچنا ہی کیون نہ موت سے پیشتر زندگی ہی مین ایک دوسرے کو متحد سمجھین"

"امن کوئی ایسی شے نہین جو من و سلویٰ کی طرح آسمان سے نزول کرے بلکہ انسان کے احساس انسانیت کا نتیجہ ہی . . . . ."

"امن کا جنگ سے اور نرمی کا سختی سے پیدا ہونا محال ہی . . . . . اگر علاج بالمثل کے اس مہمل اصول مین کچھ بھی صداقت ہوتی، تو مدت ہوئی دنیا سے جنگ رخصت ہو چکی ہوتی"

"دنیا کی صلح وہ صلح نہین جس کے شرائط فاتح یا قوی ترین فریق مرتب کرے . . . . . بلکہ . . . جس کے شرائط خود انسانیت کے ایما سے مساویانہ تمام اقوام کو املا کیے جائین گے"

"امن کا مولد و منبع قلب انسانی ہی، جنگ کا منبع بھی قلب انسانی ہی۔ انسان کا قلب ہی وہ سرچشمہ ہے جہان سے سیلاب خون نکلکر تمام کرۂ ارض پر جوش زن ہوتا ہی۔ اسی سرچشمہ کو خشک کر دینے سے دنیا سے جنگ کا وجود رخصت ہو سکتا ہی۔ تاوقتیکہ انسان کے باطن مین، انسان کے نفس مین اصلاح نہو گی تمام خارجی تدابیر تمام بیرونی

کوششیں لاحاصل رہیں گی اور امن و صلح کے ظاہری قالب کے اندر جنگ و بدامنی کی روح حرکت کرتی رہیگی"

"آہ جنگ کے شدائد و مصائب! ..... کیا شکل انسانی کے عقب میں کوئی اژدر پوشیدہ ہے..... یہ واقعات ممکن کیوں ہیں؟ محض اس لیے کہ دنیائے متمدن کے ہر شہر ہر قصبہ ہر گانوں میں مدارس موجود ہیں... وہاں استاد یہ درس دیتا ہے کہ انسان کا اہم ترین فرض یہ ہے کہ قومی اغراض کی پاسداری کرے اور اگر قومی اغراض اسی کے مقتضی ہوں تو اپنے ہمجنسوں کا گلا کاٹنا اُسکے لیے کار ثواب ہو جاتا ہے"

"جسوقت تک قانون نفس بشری کی عظمت اور حیات انسانی کا احترام مجرموں تک میں نہ تسلیم کریگا، جسوقت تک تعزیرات کا نفاذ خود جرائم کی شکل میں ہوتا رہیگا، جسوقت تک کسی خونی کے پوشیدہ جرم کے جواب میں دوسرا خون علانیہ اور بکمال بیدردی کیا جاتا رہیگا، اُسوقت تک اُس خون کی چھینٹیں جسے جلاد کی جنبش شمشیر نے بہایا ہے بارش کے قطرات بنکر تمام عالم پر برستی رہیں گی اور خونی کو جو قتل کی سزا دی جاتی ہے اُس سزا کی سزا میں جنگ کا دیوتا لاکھوں بے گناہوں کی جان لیتا رہیگا"

پال رچرڈ

اقتباسات بالا، زیر تعارف رسالہ "پیام امن" کے جستہ جستہ مقامات ہیں۔ "پیام امن" ملک کے مشہور مترجم مولوی عبدالماجد کے رشحات قلم کا ایک ثمرتازہ ہے۔ یہ رسالہ فرانس کے مشہور اہل قلم پال رچرڈ کی مشہور عالم کتاب کا ترجمہ ہے جو عین دوران جنگ میں اقوام محاربہ کو مخاطب کرکے لکھی گئی تھی، اور اسی رعایت سے اس کا انگریزی نام "ٹو دی نیشنس" ہے، جسکا لفظی ترجمہ "الی الاقوام" ہوتا۔ مترجم کے مذاق سلیم نے موضوع سخن کی مناسبت سے "پیام امن" نام رکھکر گویا کتاب کو اپنا لیا۔ بجائے الفاظ کے مفاہیم کے ترجمہ کا اصول جو "پیام امن" کے دو لفظی ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے، تمام کتاب کے صفحات و ابواب کو حاوی ہے اور اسی لیے بقول مترجم "اس مجموعۂ اوراق کو محض ترجمہ کے بجائے تالیف سمجھا جائے تو شاید واقعیت کے زیادہ خلاف نہو"

"پیام امن" ۱۰۱ صفحات کو محیط ہے۔ اصل کتاب کا ترجمہ ۶ صفحات پر ختم ہو جاتا ہے۔ باقی ۹۵ صفحوں پر مترجم کا "تبصرہ" اور حواشی پھیلے ہوے ہیں اور اس طرح امن کی پیام رسانی میں مترجم بھی مصنف کے، کہنا چاہیے، شریک غالب ہیں۔

اصل کتاب کا پیرایہ بیان جیسا کہ اقتباسات بالا سے ظاہر ہوتا ہے، تمام تر خطیبانہ ہے۔ عنوانات ابواب

مثلاً نشۂ شب، خمارِ صبح، آہِ مظلومان، شامِ حسرت، صبحِ سعادت وغیرہ سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے ذیل مین کیا ہوگا۔ مترجم موصوف کی رنگین بیانی کا شائبہ حذف کر دینے کے بعد بھی ساری کتاب مین نثر کی شاعری ہی باقی بچتی ہے کہتے ہین، دعوت و تبلیغ کا یہ قدرتی قالب ہے ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　بنتی نہین ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

لیکن اس ستانہ خطبہ مین، منطقی استدلال، ترتیب مضامین اور تسلسل خیال کی جو کمی تھی وہ مترجم نہین اب کہنا چاہیے مولف کی کاوشِ فکر نے تبصرہ مین پوری کر دی اور اب "پیام امن" سنجیدہ طبقۂ مخاطبین کے لیے بھی بے اثر نہ رہیگی۔ اس تبصرہ کے اضافہ نے پیامِ امن کو جامع و کامل بنا دیا۔

پال رچرڈ کی وسیع المشربی اُن کے دعویٰ کی بنا پر بلندی سے اُس نقطہ پر نظر آتی ہے جہان پہونچکر امتیازات مرزبوم آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہین اور ملتین مٹ کر اجزاے ایمان ہو جاتی ہین اُن کے صلح کل، امن پرستی کے کیش مین خونریزی سے بڑھکر (خواہ تعزیراً ہی کیون نہ ہو!) کوئی گناہ نہین انھین خیالات کو مصنف نے مختلف خطابات کے ساتھ بار بار ادا کیا ہے اور عصر جدید کی غفلت کیشی کا جا بجا رونا رویا ہے۔ غرضکہ ساری کتاب ؏ یک کاش کہ بود "کہ صد جا نوشتہ ام" کی مصداق ہے۔

اس کے برعکس مولف کا تبصرہ مدلل ہے مرتب ہے مسلسل ہے غیر ضروری تکرار و اعادہ کے عیوب سے پاک ہے۔ مولف کی نظر کے سامنے امن کا مسئلہ ذیل کی تنقیحات مین ٹوٹ کر آتا ہے:۔

(۱) امن کیا ہے؟
(۲) نقضِ امن کے اسباب کیا ہین؟
(۳) امن اب تک قائم کیون نہوا؟
(۴) کیا اب کسی عنوان ممکن ہے؟

ان تنقیحات پر مولف نے جدا جدا باب باندھے ہین اور بحث کی داد دی ہے۔ تنقیح اول کے متعلق مولف کا فیصلہ امن کی حسب ذیل تعریف ہے:۔

"امن نام ہے اُس حالت کا جس مین داخلی حیثیت سے انسان سکون خاطر محسوس کرتا ہے اور خارجی حیثیت سے جس مین قانون و آئین کی عملداری ہوتی ہے"

یعنی مفہوم امن کے دو پہلو ہین (۱) سکون خاطر (داخلاً) (۲) آئین داری (خارجاً)

یہان ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا قانون کی عملداری" اور سکون خاطر مین رابطہ علت ہے یا نہین، اگر نہین ہے تو کیا کسی دوسرے مشترک سبب کے ماتحت، نتیجہ کی حیثیت سے ان دونون کا ساتھ ساتھ پایا جانا ضرور ہے یا نہین، اگر ایسا ہے تو آخر وہ سبب مشترک کیا ہے؟ تاریخ عالم پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے ہم کو اکثر ملک ایسے ملتے ہین، جہان قانون و آئین کی بڑی دھوم دھام ہے، عدالتون کی گرم بازاری ہے، قانونی کتابون کا نمبر سیکڑون سے ہزارون اور ہزارون قانونی دفعات کا نمبر لاکھون سے لیکر کرورون تک پہونچ گیا ہے، مگر ملک مین سکون خاطر کی جگہ مفقود ہے۔ اس کے برخلاف ہر ملک اور ہر زمانہ مین ایسی ہستیان بھی ملتی ہین جو باوجود قانون وقت کے ناقص ہونے باوجود ملکی بدعملی و بدامنی کے کمال طمانیت و سکون خاطر کے ساتھ شگفتہ اس دار فانی کو خیر باد کہکر چلی جاتی ہین یہ کیون؟

اصل یہ ہے کہ ماہیت امن کا مایہ خمیر عدل ہے اور قیام امن اسی کا نتیجہ، عدل ہی دامن سے وابستہ ہے حیات اجتماعی کی شیرازہ بندی، اگر عدل سے خالی ہے تو نفس قانون و آئین کی نمائش لاحاصل ہے، ایسے قوانین و آئین کی عملداری "تعین امن ہونے کی جگہ ذراسی بھی امن ہوتی ہے، امن کی بنیاد عدل ہے نہ کہ قانون، جسکے بغیر امن کا وجود حیات اجتماعی مین ناممکن ہے، قانون بے عدل نقش بر آب ہے، حیات اجتماعی کا امن، شخصی زندگی کے سکون خاطر کا سبب نہین ہے، مگر اگر سبب غیر مخل ہو تو فی الجملہ معین ضرور ہوتا ہے، شخصی زندگی کے سکون خاطر کا سبب ہے تو پھر یہی عدل ہے، جو ہستیان اپنے دنیاوی معاملات مین عدل سے کام لیتی ہین، دوسرون اور نیز اپنے نفس کے ساتھ عدل کا برتاؤ کرتی ہین، وہ ہمیشہ آفات زندگی سے محفوظ رہتی ہین اور قابل رشک مرنج و مرنجان زندگی بسر کرتی ہین۔ الغرض عدل ہی وہ سبب مشترک معلوم ہوتا ہے جو سکون خاطر اور آئین داری پر کیا پھیلا ہوا ہے، سکون خاطر اور امن و آئین دونون ایک ہی چیز ہین، اصل شے عدل ہے۔ اگر کسی کو عدل پر عمل کیے بغیر نام نہاد سکون خاطر حاصل ہے تو وہ معیار انسانیت سے گرا ہوا ایک لذت پرست حیوان ناطق ہے اور یا فاتر العقل ہے اور اس لیے نتائج کا بحث ہے، یا پھر اگر کسی ملک کے آئین و قوانین کے پردہ مین عدل کا جلوہ نہین تو وہ باندار حکومت نہین بلکہ مردار شئے ہے، جسکو خود خبر نہین کہ کیا کرتی ہے اور کیا۔۔۔۔ پس امن کی تعریف مین ابتدا ہی سے عدل کے ضروری جوہر سے غض بصر کرنا، آئندہ چلکر بہت سی غلط فہمیون کا باعث ہوگا۔ لہذا آغاز بحث ہی مین اس کی جانب اعتنا ضروری ہے۔

دوسرے باب میں مولف موصوف نے نقص امن کے اسباب گنائے ہیں جو معروف عام [illegible] زمین کی [illegible] سے لیکر بعد انتقام، خواہش ناموری، توسیع مملکت، ہوس زر اور تعصب وغیرہ پر منتہی ہو گئے ہیں۔ ان محرکات کی ترتیب چونکہ بنیاد واحد کے اصول پر مبنی نہیں ہے اس لیے تقسیم تام حاصل نہیں ہوتی ہے اور [illegible] کی مسوحات میں تفریق کے بجائے اشتراک پایا جاتا ہے جو منطقی نقطہ نظر سے تقسیم کا نقص جلی تصور کیا جاتا ہے مگر مولف کا منشا یہ منشا بھی نہیں ہے، ان کا مقصد تمثیلاً چند محرکات [illegible] معلوم ہوتا ہے نہ کہ منطقی حیثیت سے اُن کا استقصا کرنا۔

لیکن [illegible] دیکھ آسکے ہیں کہ اس تمام [illegible] عدل گستری میں مضمر ہے، اور نقص امن کی علت بھی نقص عدل میں ملتی ہے۔ جس طرح عدل امن کا سبب ہے اسی طرح ظلم بدامنی کا سبب ہے۔ واقعات شاہد ہیں اور قیاس گواہ ہے کہ بدامنی کی علت قریب در نتیجہ ظلم ہے نہ کہ جذبۂ انتقام و ہوس زر وغیرہ۔ اگر ظلم کی تحلیل کی جائے تو اس میں بدامنی کی تسبیب کا سامان سرتاسر پایا جاتا ہے برخلاف اس کے جذبۂ انتقام و ہوس زر وغیرہ اگر ظلم سے خالی ہوں تو بدامنی پیدا کرنے سے قاصر ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ [illegible] ترتیب و بنیاد امن و بدامنی کے عام فہم فلسفہ کے متعارض ہے، ظلم و عدل [illegible] فہم عام سے بھی معاً تصدیق کا اقرار لیتا ہے۔

تیسرے باب میں مولف [illegible] امن اور بدامنی کے سدباب کے بارہ میں "اہل تدبیر کی دانائیاں" دکھائی ہیں اور پھر چوتھے باب میں منطق کے قلم اور معقول کی روشنائی سے "نسخہ شفا" لکھا ہے۔ [illegible] نقطہ خیال کچھ مختلف ہے لہذا تشخیص اور نسخہ دونوں سے اتفاق [illegible] خودی امن کی علت صحیح ہے۔ انسان کا دوست خود اُس کی ذات سے زیادہ کون ہے، وہ سب سے لڑتا ہے مگر نہیں لڑتا تو آپ سے۔ ازاں بعد یہ خودی جس شے سے متعلق ہو جائے مثلاً اولاد، قوم، ملک، مذہب، وہ سب امن کے دامن میں آجاتے ہیں۔ لہذا امن عامہ کی علت، اسی خودی کی تعمیم ہے۔ یہاں تک کہ خودی (بیخود ہو کر) "ہمہ اوست" ہو جاتی ہے اور ہر شے کے پردہ میں خودی ہی کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے!!

افسوس ہے کہ ہمارا عقیدہ اس تلقین پر نہیں جمتا۔ ہمارے اعتقاد میں نفرت، عداوت، خصومت، مناقشت، بدامنی، خونریزی کی جڑ ہے تو یہی خودی، انانیت اور "ہم چو من دیگرے نیست" کا جذبہ گاڑھے

دوستون مین جب چلتی ہو تو اُس کا سبب ۹۹ فی صدی اسی خودی تعلی یا انانیت کا باہمی تصادم ہوتا ہو۔ حکومتون کے درمیان جب جنگ چھڑتی ہو تو اس کو طول اور شہ دینے والی چیز بھی عزت نفس اور خودداری کا تقاضا ہوتا ہو۔ خودی کی تعمیر مین سرتاپا خرابی کی صورت مضمر ہو۔ پھر اس سے کس طرح امن پیدا ہوسکتا ہو۔ خودی کے تصور مین اس کی چھوٹی مقدار سے لیکر بڑی مقدار تک "اپنے پرائے" کا تخیل داخل ہو۔ مولف موصوف "خودی" کو عالم کائنات سے متعلق کر کے اُس کی کمیت کو ترقی دے سکتے ہین لیکن اسکی کیفیت جو اس کے مفہوم و ماہیت کا مایہ خمیر ہو، (اگر "خودی" کو عام ہو کر بھی خودی ہی رہنا ہو) تو اپنے اُسی حال پر برقرار رہیگی، جو حال اس کا اسوقت تھا جبکہ وہ ذات واحد سے وابستہ و متعلق تھی۔ مقیاس الحرارت مین کسی شے کی کمیت کی تبدیلی اسکی کیفیت کی تبدیلی کو مستلزم نہین۔ برف کا سیر بھر کا ٹکڑا اور سو من کی سل ایک ہی نقطہ حرارت یعنی نقطہ انجماد دکھائے گی، اس کی ذاتی برودت مین کچھ اضافہ نہوگا یعنی اگر اپنی ذات مین خود پرستی قابل نفرین ہو تو ذات عالم مین بھی مستحق آفرین نہین ہوسکتی اور جسطرح انفرادی خودپرستی مین نفرت وعداوت کا بیج موجود ہو اسی طرح اجتماعی خودپرستی بھی بدامنی کے اسباب سے تہی دامن نہین ہو۔ نپولین کی خودی نے بھی تمام عالم کو اپنا کہا تھا اور قیصر جرمنی کی خودی بھی بڑے پیار سے سارے عالم کو اپنا بتاتی تھی لیکن نتیجہ کیا ہوا؟ جنگ و جنگ عظیم۔

اور کیون صاحب، اگر آپ کی خودی نے غیریت کے پردہ کے ساتھ غیرت کا نقاب بھی اُلٹ دیا تو پھر اس سلطان خودی کے ساتھ شیشۂ ننگ و ناموس کا خدا ہی حافظ ہی۔

لیکن خودی اور امن کے درمیان رابطہ علت ثابت کرنے مین مولف موصوف نے منطق استقراء کے ایک چھوٹ مین تین طریقون کا زور لگایا ہو۔ موصوف فرماتے ہین:

(۱) خودی کا تعلق جب تک اپنی ذات سے رہا اپنی ذات سے محبت رہی،

(۲) خودی کا تعلق جب اولاد سے ہوگیا، اولاد سے محبت پیدا ہوگئی،

(۳) خودی کا تعلق جب اپنے اعزہ سے ہوگیا تو اُن سے محبت پیدا ہوگئی،

(۴) خودی کا تعلق جب اپنے احباب سے ہوگیا تو اُن سے محبت پیدا ہوگئی،

(۵) خودی کا تعلق اپنی قوم، مذہب، وطن، جماعت، جس کسی سے ہوا اُس سے محبت پیدا ہوگئی (صفحہ ۱۲۵) غور کیجیے تعلقات خودی کی مذکورہ بالا فہرست کی ہر شق کے ساتھ "امن و تو" کا سوال وابستہ ہی

یا نہین اور اُس کے پہلو بہ پہلو ہمین حسب ذیل مثالین ملتی ہین یا نہین ؟

(۱) جب خودی کا تعلق اپنی ذات سے رہا سوائے لذات سے جنگ تہی

(۲) جب خودی کا تعلق اولاد سے ہوگیا تو دوسرون کی اولاد کو دیکھ کر جلنے لگے۔

(۳) جب خودی کا تعلق اپنے اعزہ سے ہوگیا تو "غیر" بہ "غیر ہی" کا احساس پیدا ہوگیا

(۴) جب خودی کا تعلق احباب سے ہوگیا، تو دوست کے دشمنون کا بھی اپنے دشمنون کی فہرست مین اضافہ ہوگیا۔

(۵) جب خودی کا تعلق اپنی قوم مذہب وطن جماعت سے ہوگیا، تو ساتھ ہی اس کے مذہبی تعصب اور اپنی پارٹی کی پچ کی داغ بیل پڑ گئی۔

مولف موصوف نے تصویر کا ایک رُخ دیکھا، اس امر کو قطعی نظر انداز کیا کہ جذبہ خودی محبت آفرین کے ساتھ نفرت آفرین بھی ہی بلکہ بسا اوقات خودی کا پیار اور محبت سے جو لگاؤ ہی اُس کی مثال ویسی ہی ہی جیسے کہ ایک فوج مین اتحاد و اُلفت کا پایا جانا جس کا منشا غنیم کی فوج کے ہر متنفس کو تلوار کے گھاٹ اتارنا ہوتا ہی۔

منطق استقرا کی اصطلاح مین اس قبیل کی لغزش کو "مغالطہ قصور مشاہدہ"[1] کہتے ہین یعنی جب کہ علل و معلولات کے استقصا مین محقق کی نظر چوک جاتی ہی۔ مولف کی فکر رسا نے ہمارے خیال مین یہان بھی خطاء اجتہادی کی ہی۔

علاوہ برین غور کیجیے خودی نے پیدا کیا کیا ؟ محبت۔ کس کے دل مین ؟ خود صاحب خودی کے دل مین تو محبت کا مستقر پانچون حالتون مین صاحب خودی کا نفس ہوا نتائج مین خود، کے تعلق سے نہ محبت کا وجود ہوا نہ امن کا ورود۔ زید کے اپنی زوجہ سے محبت کرنے سے یہ کب لازم آتا ہی کہ اُس کے گھر مین صلح و آشتی اور امن و آسودگی کے جذبات بھی پائے جاتے ہین منطقی حیثیت سے بس آپ یہ حکم لگا سکتے ہین کہ وہ خود گرفتار محبت ہی۔ اس کے آگے قدم رکھنا خود مغالطہ مین پڑنا اور دوسرون کو مغالطہ مین ڈالنا ہی۔

خودی کے اندر اگر اپنون کے ساتھ پیام امن ہی تو اُسی کے ساتھ غیرون کے ساتھ پیام جنگ بھی ہی

[1] Fallacy of Non-observation

اس کے مقابلہ میں ہم عدل کے مفہوم تمام ترس کو لیتے ہین اور اس کو امثال بالا پر لگا کر دیکھتے ہین بطریق طرد کے مطابق حسب ذیل تشکل قائم ہوتی ہو

(۱) جب عدل کا برتاؤ اپنے نفس خواہشات نفس کے ساتھ رہا سکون خاطر حاصل رہا۔ امن رہا۔

(۲) جب عدل کا برتاؤ دولا یتوں ...یا گونا نہ جنگیون سے محفوظ رہا امن رہا۔

(۳) جب عدل کا برتاؤ اشخاص سے رہا الفت و یگانگت قائم رہی۔ امن رہا

(۴) جب عدل کا برتاؤ اہل ... رہا دوستی قائم رہی۔ امن رہا۔

(۵) جب عدل کا برتاؤ اپنی قوم ... جماعت سے رہا سب خوش رہے امن رہا۔

(۶) حتی کہ جب عدل کا برتاؤ غیر افراد و اقوام سے رہا تعلقات خوشگوار رہے امن رہا۔

دیکھیے خود ہم کا رشتہ غیر ... سے قائم نہین ہوسکتا لیکن عدل کا تعلق ہمہ گیر ہو۔ ملاحظہ ہو شق ششم

تائید کے لیے طریق عکس کو بھی عدل و امن کے ... رابطہ علت پر لگا کر دیکھو تو اس کا فتوی بھی عدل کے حق میں ہو

(۱) امن و صلح کی جتنی مثالین ملین سب مین عدل کا وجود مشترک پایا۔

(۲) عدم امن و صلح کی جتنی مثالین ملین اس مین سے کسی مین عدل موجود نہ پایا۔

اصل یہ ہو کہ سودی کو جتنا مٹا جائے، انسان اسی قدر امن و صلح کے قریب ہوتا ہو ع

یہ کھویا مجھے ہونے نے نہ ہوتا مین تو کیا ہوتا

امن و بدامنی کے اسباب کی سراغرسانی کی بحث مین اس قدر کفایت کرتا ہو۔ رہا یہ کہ باوجود اسباب امن دریافت ہوجانے کے، جنگ کا خاتمہ کیون نہین ہوگیا۔ تو یہ حضرت انسان کے مان کی بات نہین۔

---

سلہ Method of Agreement جب واقعہ زیر تحقیق کی چند مثالون مین ایک ہی جزئیہ مشترک ہو تو یہ جزئیہ واقعہ مذکور کا سبب ہوگا یا نتیجہ یا پھر رابطہ علت "

سلہ Method of Difference اگر ایک مثال مین ایک واقعہ موجود ہو اور دوسری مثال مین نہ ہو اور ان دونون مثالون مین کل عوارض مشترک ہون بجز ایک کے جو پہلی مین موجود ہو اور دوسری مین نہین تو وہی واقعہ مذکور کی علت یا معلول یا رابطہ علت ہوگا۔

فلسفہ اخلاق کی یہ ایک حقیقت ہی کہ خیر مطلق اور شر مطلق الفاظ بے معنی اور اسماے بے مسمّیٰ ہیں خیر بے شائبہ شر اور شر بے شائبہ خیر عالم اخلاق کا عنقا ہی یہ اس عالم شہود کی ترکیب کا اقتضا ہی چنانچہ جنگ بھی خاصتاً شر ہی شر نہیں بلکہ اس کے عیبوں کی طویل فہرست میں متعدد ہنر بھی نظر آتے ہیں ع

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

حیاتیات[1] کے اسرار شناسوں سے پوشیدہ نہیں کہ جنگ لازمۂ حیات ہی کشاکش حیات[2] کیا ہی کسی جسم[3] کی اپنے ماحول[4] سے آویزش جو حیات کے ساتھ شروع ہوتی ہی، حیات تک قائم رہتی ہی اور حیات ہی کے ساتھ ختم ہوتی ہی۔

مولف نے جنگ کا سد باب کرنے میں یورپ کو بے بس خیال کیا ہی لیکن ہم تمام عالم کو اس معاملہ میں عاجز یقین کرتے ہیں اصل میں عقدہ اس سوال کا ایک اور گرہ میں بند ہی اس خاندان ارضی کا نام عالم کون و فساد ہی اس کے قوام و نظام کے لیے فنا بھی اسی قدر ضروری ہی جس قدر کہ "کون"۔

حکماے سلف، عوام سے حکمت کے اسرار شاید اس مصلحت سے مخفی رکھتے تھے کہ حقائق اشیا معلوم کرکے اُن کی ہمتیں پست نہ ہو جائیں اور ولولے سرد نہ پڑ جائیں۔ میں ایک راز کی بات کہتا ہوں، کیا انسان یہ سن کر اور بیان کر کہ وہ مجبور محض ایک بے اختیار وجود ہی، پھر کچھ کرنے کا حوصلہ کرے گا؟

المختصر تمام مقتضیات فطرت ہیت جو انسان کی قدرت سے باہر اور اُس کے علم سے ماورا ہیں انسان فطرت کے کسی شعبہ خاص پر تسلط جما سکتا ہی لیکن کنہ کائنات کا فلسفہ مرتب کرنے سے قاصر ہی اور ہمیشہ قاصر رہے گا۔ الٰہیات، کونیات[5] مابعد الطبیعات، یہ بس ایع

خواب ندیدہ را همہ تعبیر مى کنند

اگر نظر کو وسعت دیجیے تو جنگ جسد عالم کے لیے فصد کی مثال ہی جو خون فاسد کے اخراج اور مزاج عالم کے اعتدال کے لیے از بس ضروری ہی اور اُس کا نتیجہ آخر عالم و عالمیان کے حق میں مفید ہی ثابت ہوتا ہی۔

---

[1] Biology
[2] Struggle for existence
[3] Organism
[4] Environment
[5] Cosmology

دور کیوں جائیے موجودہ جنگ کو لیجیے جنگ سے قبل ممالک متحاربہ میں آبادی کا سوال پیدا ہو چلا تھا۔ علمائے عمرانیات کے نزدیک جنگ کی ایک بہت بڑی برکت آبادی کے مسئلہ کو قدرتی طور پر بہ آسانی حل کر دینا ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ اسی قبیل کے دشوار و پیچیدہ مسائل کے متعلق جنگ کا فیصلہ ہمیشہ ناطق رہتا ہے۔ علاوہ بریں دنیا کے موجودہ زاویہ نگاہ کے مطابق کسی ملک کے لیے سب سے بڑی برکت جمہوریت اور سب سے بڑی نحوست استبداد اور غلامی خیال کی جاتی ہے۔ اب دیکھیے کہ موجودہ جنگ نے طبقۂ اولیٰ کو اوپر اچھالنے میں کس قدر مدد دی۔ روس میں لینن[1] جنگ سے پہلے بھی تھا۔ مسولنی[2] بھی اٹالیہ میں جنگ سے پہلے وجود رکھتا تھا۔ مصطفیٰ کمال پاشا ٹرکی میں اور مسٹر رامسے میکڈانلڈ انگلستان میں تھے لیکن روس میں سوویٹ سسٹم (اشتراکیت) اٹلی میں فیشزم[3] ٹرکی میں دستوریت اور انگلستان میں عمالی حکومت جنگ سے پہلے نہ تھی بلکہ جنگ کے بعد ہوئی۔ کیا یہ اس جنگ عظیم کی سنہری برکات نہیں ہیں اور کیا اس آزادی و جمہوریت سے نسل انسانی کی موجودہ و آئندہ نسلیں جو استفادہ کریں گی اس سے خون کے ان چند قطروں کی جو بالکل تقاضائے فطرت و حکمت سے بہے تلافی نہیں ہو جاتی ہے؟ ان مقاصد گرامی و مرام عظیمہ کے مقابلہ میں جو حکیم مطلق مستقبل کی انسانیت کے متعلق پیش نظر رکھتا ہے، چند جانوں کا ضائع ہو جانا کیا مالی ہے۔ رہا اتلاف زر و مال تو وسیع النظری اس کو اتلاف کب کہے گی جب مال دنیا کا دنیا میں اور انسان کا انسانوں ہی کے پاس رہا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہیے کہ نقل مکان و ملکیت ہوا۔ اتلاف کیا؟

یورپ میں جنگ کو روکنے کی سب سے پہلی باقاعدہ کوشش ہیگ کانفرنس تھی۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ جس شہنشاہ[4] نے اس کے قیام و نظام میں سب سے زیادہ دلچسپی لی تھی وہی اس کے بعد جنگ میں سب سے بڑا حصہ لینے والا ثابت ہوا۔ ہیگ کانفرنس نے فنا ہو کر لیگ آف نیشنز کی شکل [illegible] لیکن ابھی کل کی بات ہے کہ اٹلی نے باوجود اس کا عضو خاص ہونے کے مسولنی کے ایما سے اس کے اقتدار کو ٹھکرا دیا۔ غرضکہ

---

[1] روس کا قائد اعظم۔ اشتراکیت کا بانی۔ **Lenin**

[2] **Mousoolini**

[3] **Fascim** فیشزم یا سینڈیکالزم اٹلی کا موجودہ نظام حکومت ہے ہر طبقہ طبقیت کی جداگانہ باضابطہ انجمنیں ہیں اور پھر مرکزی انجمن میں ان کے باضابطہ نائب حتیٰ کہ ملازمین سرکار کی بھی ایک باضابطہ انجمن ہے اور وہ اپنی تجاویز پر مرکزی انجمن میں اپنے نائبین کے ذریعہ سے مباحثہ کرا سکتے ہیں

[4] شاہ آسٹریا

جنگ ہو یا لیگ ہو یا کسی اور مرکزی مجلس کا خواب ع

این خیال ہست و محال ہست جنون

جنگ بالکل ایک مقتضائے فطرت اور لابدی چیز ہو جس کا روکنا انسان کے حیطۂ امکان سے بالکل باہر ہو اور باہر رہیگا۔

چونکہ امن کو عدل سے وابستگی خاص حاصل ہو یعنی اس کا قیام عدل پر مبنی ہو اس لیے بیجا نہو گا اگر چند کلمات حقیقت عدل کے متعلق عرض کیے جائین۔

اس قبیل کے تصورات کلیہ کا مفہوم متعین کرنے کے متعلق سقراط کا دستور تھا کہ وہ کلیہ زیربحث کو اسکے جزئیات محسوسہ پر لگا کر دیکھتا تھا کہ وہ اپنی متعدد مثالون مین کیا معنی دیتا ہو پھر وہ اُن جداگانہ مخصوص مفاہیم کا قدر مشترک نکال لیتا تھا اور یہی اُس کے نزدیک کلیہ کا مفہوم ہوتا تھا۔ مل نے اپنے "رسالہ افادیت" مین عدل پر بحث کی ہو اور اُس کے مفاہیم مختلفہ پر غور کیا ہو۔ ذیل مین ہم اُن پر نظر کرین گے اور انہی امثال کا گویا ذو اضعاف اقل مشترک ماہیت عدل کو مشتمل ہو گا۔

اولاً، کسی شخص کو اس کی ذاتی آزادی، اس کے مملوکات، یا کسی چیز سے جسکا وہ قانوناً مالک ہو محروم کرنا، عدل کے خلاف سمجھا جاتا ہو یعنی کسی شخص کے قانونی حقوق کا پاس کرنا عدل اور انکا نظرانداز کرنا خلاف عدل یا ظلم ہو۔

ثانیاً، اگر یہ قانونی حقوق کسی ناقص قانون سے اخذ کیے گئے ہین تو اُن کے احترام و عدم احترام کے متعلق، محققین مقننین کے درمیان اختلاف خیال ہو۔ بعض کہتے ہین کہ قانون کی خلاف ورزی خواہ وہ قانون کیسا ہی بُرا ہو کسی حال مناسب نہین، اس لیے کہ اس مثال عملی سے جہلا کے دل سے قانون کی عظمت اُٹھ جانے کا اندیشہ ہو اور اُس کو رفاہ عام کے حق مین ایک نقصہ عظیم سمجھنا چاہیے۔ اگر آپ کو کسی قانون سے اختلاف ہو تو قانونی طور پر اُس کی اصلاح کی کوشش کیجیے۔ دوسرا فریق اس کے علی الرغم کہتا ہو کہ نہین ایک ناقص و مضر قانون کی علانیہ خلاف ورزی کرنا چاہیے۔ ہر قانون انسان کے واسطے ایک پابندی عائد کرتا ہو، پس وہ تقید جس کا مقصد بہبودی انسان نہین ہو، ناجائز ہو اور اُس کا توڑنا جائز۔

کسی قانون کے خلاف عدل ہونے کے وہی معنی ہین جو کسی فعل کے خلاف عدل ہونے کے ہوتے ہین۔

ہم کسی فعل کو خلاف عدل اُس وقت کہتے ہین جب کہ اُس سے کسی کی حق تلفی ہوتی ہو؛

اسی طرح اگر کسی قانون سے رعایا کی حقوق کی پامالی متصور ہو تو وہ بھی خلاف عدل ہو اگرچہ آخر الذکر صورت مین قانونی حقوق پامال نہون گے بلکہ اخلاقی حقوق۔

چنانچہ عدل کی دوسری شکل انصاف ہے کہ اخلاقی حقوق کا احترام ہو اور اُن کو نظر انداز کرنا شرط انصاف نہین ہو۔

ثالثاً عدل کا ایک عام مفہوم مکافات عمل کا تخیل ہو۔ ہر شخص کو اُس کے عمل کا بدل ملنا چاہیے ہر قصور سزا پر ختم ہونا چاہیے اگر جزا یا سزا [illegible] کسی کے ساتھ برائی کی گئی تو یہ عدل کے خلاف ہوگا بلکہ اس تقدیر پر برائی کے عوض بھلائی کرنا بھی عدل کے خلاف ہو [illegible] اسوقت ہوتا ہو جب جذبہ عدل پرستی دیگر محرکات عالیہ سے مغلوب و متاثر ہو جاتا ہو اور اسے [illegible] شخص [illegible] پایا جاتا ہو

رابعاً معاہدہ شکنی یا اُن توقعات کا توڑنا جو ہم نے لوگون کے دلون مین اپنے قول و فعل سے قائم کیے تھے انصاف کے خلاف تصور کیا جاتا ہو۔

خامساً عدل بسا اوقات غیر جانبداری کے مفہوم مین مستعمل ہوتا ہو۔ بالفرض آپ کو کسی سرکاری ملازمت کے لیے ایک امیدوار انتخاب کرنا ہو اگر آپ بلحاظ قابلیت و استحقاق اپنے آوردہ کو منتخب کر لیتے ہین تو یہ ضرور عدل کے خلاف ہوگا لیکن [illegible] اپنے احباب و [illegible] کے ساتھ جانب داری برتنا ہر حال مین مذموم نہین بلکہ یہ اکثر حالات محمود ہو گا۔ لیبنے کسی [illegible] دوست کا انتخاب کسی فرض خاص سے متعارض نہین ہو یا جس سے کسی کی حق تلفی نہین ہوتی ہو تو ایسی صورت [illegible] اخلاقاً اپنون پر پرایون کو ترجیح دینا قابل ملامت سمجھا جائے گا نہ کہ قابل ستایش

سادساً غیر جانب داری کے تخیل کے ساتھ عدل کا ایک عام متبادر مفہوم "مساوات" ہو جو عدل کا جزو لاینفک تصور کیا جاتا ہو اور بعض کے نزدیک عدل [illegible] اصول مساوات ہو جس کی رو سے جو حقوق کے اندر عدم مساوات کی مدعی ہین آقا و غلام، شاہ و گدا، امیر و غریب کے درمیان ادنیٰ و اعلیٰ حقوق کی تفریق کرتی ہین وہ بھی اس کی قائل ہین کہ تمام کے حقوق کا احترام خواہ یہ حقوق کتنے ہی پست و ادنیٰ کیون نہ ہون اتنا ہی واجب و لازم ہو جتنا کہ آقا کے حقوق اعلیٰ کا کسی کی ہو حق تلفی ہمیشہ عدل کے خلاف ہو گی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ عدل اور واجبات عدل اکثر اُن امور سے متعلق ہوتے ہیں جو لغو ہر قانون کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ کوئی شخص اپنی خانگی زندگی میں قانون کا احاطہ پسند نہیں کر سکتا، تاہم روزمرہ، ہر موقع محل پر انصاف کے نقطۂ خیال سے چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی اعمال پر بحث [illegible] کیا جاتا ہے اور ادنیٰ درجہ کے معاملات میں بھی انصاف کے خون کا احساس اس تخیل کو پیدا کرتا [illegible] رہتا ہے کہ کاش اس باب میں بھی کوئی قانون ہوتا۔ ہم فطرتاً چاہتے ہیں کہ انصاف کے خلاف کرنے [illegible] کچھ سزا ملے اگر قانوناً نا مناسب ہے تو رائے عامہ کی سہی، اگر یہ بھی ممکن نہیں تو ملامت ضمیر ہی کی سہی۔ یعنی عدل کے اندر قانونی تعزیر کا تخیل داخل ہے، مگر یہ کچھ واجبات عدل پر موقوف نہیں [illegible] اخلاق کا یہی حال ہے۔ فرض گویا ایک قرض ہے جو بہرحال ہمیں ادا کرنا ہے۔ یہاں تک عدل اور دیگر [illegible] اخلاق مشترک ہیں۔ لیکن آگے چلکر مقننین نے فرائض کی دو قسمیں کر دی ہیں ایک فرائض ناقصہ اور دوسرے فرائض کاملہ۔

فرائض ناقصہ وہ ہیں جن کی ادائی، مطلقاً، ہر حال اور ہر موقع پر واجب تصور نہیں کی جاتی ہے بلکہ اس میں ہماری مرضی کو دخل عظیم حاصل ہے مثلاً سخاوت ہمارا فرض ہے مگر یہ فرض نہیں کہ کسی خاص وقت یا کسی خاص شخص کے ساتھ بالضرور اُسے برتا جائے اور نہ برتیں تو مستوجب ملامت ٹھہریں۔ فرائض ناقصہ کا مضاف الیہ حقوق نہیں ہوتے ہیں۔ یعنی کوئی شخص بربنائے حق ہم سے سخاوت کا طلبگار نہیں ہو سکتا۔

برخلاف اسکے، فرائض کاملہ اپنے مقابل حقوق کو مستلزم ہیں اور یہی امر خاص اخلاق عامہ اور عدل کے درمیان ما بہ الامتیاز ہے۔ پچھلی تمام مثالوں پر غور کیجیے عدل کے ساتھ ہر جگہ حق کا تخیل موجود ہے جو کسی فرد یا افراد کو دوسرے فرد یا افراد پر حاصل ہے۔ جو باختلاف مدارج "مثال اول کے "قانونی حق" کے مشابہ ہے۔ جب ہم کسی کا مال غصب کرتے ہیں، یا جب ہم معاہدہ خلافی کرتے ہیں یا یہ کہ نیکی کا بدلہ بدی سے دیتے ہیں یا یہ کہ مساوات کی جگہ "ترجیح بلا مرجح" کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ان میں سے فرداً فرداً ہر صورت میں ہم کوئی نہ کوئی حق تلفی کرتے ہیں۔ کسی کا مال چھیننا، اُس کی حق تلفی کی، کسی سے معاہدہ کرکے ہم نے اُس کے ایفاء کی توقع کا اُسے حق دیدیا تھا، وعدہ خلافی کی حق تلفی کی، زید نے ہمارے ساتھ نیکی کرکے ہمارے اوپر یہ حق حاصل کر لیا تھا کہ ہم بھی اُس کے ساتھ نیکی کریں اگر ہم نے نیکی کے عوض میں بدی کی۔ ہم نے زید کی

حق تلفی کی۔ اگر ہم نے کسی نا اہل کو کسی سرکاری عہدہ کے لیے انتخاب کر لیا تو ہم نے دوسرے قابل امیدواروں کی صریح حق تلفی کی۔ اگر ہم نے اپنی اولاد ذکور مین سے ایک کو بلا وجہ جائداد کا ایک ثلث اور دوسرے کو دو ثلث تقسیم کیا تو اس عدم مساوات کے پردہ مین ہم نے اول الذکر فرزند کی حق تلفی کی۔

غرضکہ عدل کے جتنے مظاہر و شئون ملین گے ان مین ہمیشہ ایک شے یعنی حق کی پاسداری و احترام کو مشترک پائے گا اور ظلم کی جملہ امثال و مصداقات مین بلا استثنا حق تلفی پائی جائے گی۔

اگر کوئی یہ اشکال وارد کرے کہ مثلاً سخاوت طلبی اگرچہ کسی خاص فرد کا حق نہیں لیکن نوع انسانی بہ حیثیت مجموعی سخاوت کی حقدار تصور کی جا سکتی ہے، تو اس تقدیر پر ہم کہین گے کہ سخاوت عدل کا جزو بن گئی۔ فضیلت عامہ اور عدل کے درمیان سے حق کی تمیز رفع کر دینا، اخلاق کو عدل کے اندر جذب کر دینا ہے۔ چنانچہ کلینٹ کا نظریہ اخلاق یہی تھا، وہ کہتا ہے تمھارے اعمال ایسے ہونا چاہیے کہ اگر تمھارے دستور العمل کی تعمیم کی جائے تو وہ جمیع بنی نوع انسان کے لیے قانون کا مرتبہ اختیار کر سکے۔ اسکے نزدیک اعمال حسنہ اور اعمال سیئہ مین باہم ما بہ الامتیاز یہی امر ہے کہ اول الذکر اگر ایک عالمگیر قانون کی شکل اختیار کر لین تو کوئی استحالہ لازم نہین آتا، برخلاف اُن کے دنیا کو اعمال سیئہ کی عملاے عام تمدن و معاشرت کے لیے ایک فتنہ ثابت ہوگی۔

الغرض، عدل اور امن کے درمیان رابطہ علت اسقدر عیان ہے کہ اس کی مزید توضیح تحصیل حاصل معلوم ہوتی ہے۔ انصاف کا فیصلہ اگر جذبات کے خلاف ہوتا ہے تو بھی حق پسندی کے اثر اور انصاف پذیر راے عامہ کے دباؤ سے چون و چرا کی گنجائش اور نقض امن کا امکان باقی نہین رہتا۔

بہر طور مسطورہ بالا اختلاف خیال کے ساتھ شرط انصاف ہے کہ مولف موصوف کے اجتہاد فکر، ذوقِ توجیہ و تعلیل، جدت خیال، ندرت ادا، تسلسل بیان، قدرت کلام اور صفائی زبان کی داد دیجائے۔ مولوی عبد الماجد صاحب، ملک کے اُن ہونہار فرزندون مین سے ہین، جنھون نے تھوڑی عمر مین ملک کی سب سے زیادہ علمی خدمت کی ہے، خدا ان کی عمر مین برکت دے ملک کی بہت سی امیدین انکی ذات سے وابستہ ہین، دیگر مستقل تصنیفات کے علاوہ آپ کے تراجم، "تاریخ اخلاق یورپ" اور "تاریخ تمدن" قابل ذکر ہین۔ اصل یہ ہے کہ لیکی اور بکل اُردو مین ان مباحث پر لکھتے تو مترجم موصوف ہی کی زبان اختیار کرتے۔ ترجمہ مین، کہین ترجمہ پن نہین معلوم ہوتا۔ بیان مین وہی روانی اور خیالات مین وہی قدرتی ترتیب،

جو کسی بلند پایہ مصنف کی مادری زبان کی تصنیف مین ہونا چاہئیے یہی خوبی "پیام امن" کا طرۂ امتیاز ہے۔

ناظرین کرام ہمین معاف کرین گے، اگر ہم اُن کی توقع کے خلاف، اصل کتاب پر عرض خیال کرنے سے باز رہے، اِس لیے کہ اہل نظر سے یہ امر پوشیدہ نہین کہ پیام امن کے ۱۰ صفحون کی ضخامت مین جو کچھ تھا وہ یہی مولف کا تبصرہ تھا، جو کہ موضوع تنقید رہا۔ ارباب نظر خود دیکھ لین گے کہ ارباب تدین کے مقلد و اتباع، مثل پال رچرڈ، جو سرے سے تعزیر کے لغت ہی کو قانون کی ڈکشنری سے نکال دینا چاہتے ہین، کہان تک قابل اعتنا ہوسکتے ہیں۔

عدم تعزیر کا غیر سنجیدہ تخیل فلسفہ کے ... اور یہ معلوم ہوتا ہے اتنا ہی شاعری کی زبان سے کس قدر بھلا لگتا ہے۔ پال رچرڈ کے فلسفہ و ہمارے ملک کے فلسفی شاعر غالب کی زبان سے سنئے، سچ ہے ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد۔ کیا خوب کہا گیا ہے ؎

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یان سزا کے بعد

ظفر حسن خان

له انگلستان کا معروف ... انتراکی مفکر، جو فرقہ ... کا ہم خیال تھا اس کے انوکھے خیالات مین سے ایک عقیدہ تعزیر کا تھا۔ ... مین پیدا ہوا، اور ۱۸۵۰ء مین کثیر تعداد مین اپنے معتقد چھوڑ کر مر گیا۔ پال رچرڈ اسی ... اب مین اون ہی کے خوشہ چینون مین سے ہے۔

---

# انقلاب سیرت

مین نے پوچھا یہ ایک عارف سے — آج عالم مین کیا قیامت ہے
جس کو دیکھو ہے دور مذہب سے — بولے، ناواقف طریقت ہے
جس کو دیکھو ہے خلق سے عاری — جو ہے محروم آدمیت ہے
آگے تھی آدمی مین جو خو، بو — اب وہ خو ہے، نہ اب وہ خصلت ہے

نہ تو چھوٹوں میں ہے بڑوں کا ادب — نہ بڑوں میں، بڑوں کی سیرت ہے
آج لفظِ وفا ہے بے معنی — ایک فقرہ، خلوصِ نیت ہے
فلسفی کی بنائے خُلق ہے "غرض" — خود غرض کی، یہ فلسفیت ہے
صوف پیکر ہے، صوفیِ صافی — صوفیت آج وضع و ہیئت ہے
خوب ہے زاہدِ فرشتہ خصال — یعنی محرومِ آدمیت ہے
عالمِ بے عمل ہیں مولانا — آپ کا دم بڑا غنیمت ہے
ہم تو ہیں پھر عوام کالانعام — خاص لوگوں کی جب یہ حالت ہے
آخر اس کا کوئی سبب ہے حضور! — یہ تو مانا، خدا کی قدرت ہے
ہے یہ دُنیا تو عالمِ اسباب — "عالم اس پر دلیل و حُجّت ہے"
سُن کے عارف نے یہ کہا، "سُن لے — شکوۂ دہر اک حماقت ہے"
آج بھی ہے وہی نظامِ عمل — اور وہی کائناتِ فطرت ہے
آج کہتا ہے تو جسے محشر — یہ تو خود خواستہ مصیبت ہے
اس کا باعث ہے مغربی تعلیم — مادّہ جس کا، مادّیت ہے
کر دیا ہے خدا سے دور تجھے — مادّۂ پردۂ حقیقت ہے
تعد یہ ہر وبا کا خاصہ ہے — یوں ہمہ گیر مادّیت ہے
یہی تعلیم، ہاں یہی تعلیم، — باعثِ انقلابِ سیرت ہے

تو نے جو چاہا وہ ملا گویا
"کامیابی، بقدرِ ہمت ہے"

سیّد ضامن حسین گویا جہان آبادی

# ذات بحت۔ روح۔ تقدیر

حقائق معرفت کے متعلق ذات باری تعالی، روح اور تقدیر کی حقیقتون کا علم تمام مذہبی مباحث علمی کی اصل ہی۔

ذات باری تعالی کا علم جاننے والے کی ذاتی استعداد پر منحصر ہی۔ حضرت موسیٰ اور گڈریے کی حکایت جو مثنوی مولانا روم مین ہی بہت مشہور ہی۔ یہ قول فیصل ہی کہ خدا کو بجمیع صفات خالق مطلق اور قرآن کو برحق جاننا ایمان اجمالی کے لیے کافی ہی۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت خواجہ خضرؑ کی گفتگو جو قرآن مین مذکور ہی وہ اس امر پر شاہد ہی کہ خدا کے تمام معارف پر عبور حاصل کرنا غیر ممکن، محال یا مشکل ہی۔ مین خدا کو اس طرح سمجھتا رہا کہ ہر ایک کی پندار کا ایک دائرہ ہوتا ہی کسی کا چھوٹا اور کسی کا بڑا۔ خدا مسبب اسباب ہی۔ اور یہ دائرے معلومات کے لحاظ مقدار علم اسباب کے ہین۔ اور انکی وسعت ہر شخص کی ذاتی معاملات کے اعتبار سے کم اور بیش ہی۔ ہر شخص کے ذاتی پندار کے دائرے جہان ختم ہوتے ہین، وہین سے اُس کے لیے دائرۂ الوہیت شروع ہوجاتا ہی۔ بوجہ اپنی بے بضاعتی علمی کے ان خیالات کے اظہار کی مین جرأت نہ کرتا تھا۔ لیکن الحمدللہ کہ حضرت مجددؒ کے تصانیف سے میری تشفی ہوئی اور معلوم ہوا کہ اصطلاح تصوف مین ان چھوٹے بڑے دائرون کی سیر قلب۔ روح۔ سر خفی اور اخفی کے محیط وسیع محاط بیان کی گئی ہی۔ اور ان کے بعد یا ورا الورا ذات بحت۔ بیچون وبیچگون و بےکیف وبے مکان وبے زمان ہی اور مقام خداشناسی مین جہل ہی جہل اور حیرت ہی حیرت عین معرفت ہی۔

روح کے متعلق میرے خیالات تھے کہ اُس کی حقیقت کما حقہ معلوم نہین ہوسکتی۔ عقلا، حکما اور فلاسفہ کے اقوال جتنے ہین سب ظنیات پر مبنی ہین اور باہم متضاد ہین اور اُن کا عجز اور اُن کے عجز کی حقیقت اُن کے کلام سے ظاہر ہی۔ اس عجز معرفت روح کا بیان قرآن مجید مین قل الروح من امر ربی سے جس بلاغت سے کیا گیا ہی اس کی مثال کہین اور نہین ملتی۔ میرا خیال تھا کہ پیغمبر خدا نے کچھ علوم باطن شریعت ظاہری کے خلاف اپنے ان اصحاب کو بتلا دیے تھے جنھین سمجھنے کی استعداد

تھی اور ممکن ہو کہ معارف روح بھی اس تعلیم باطنی مین شامل ہون۔ لیکن تصانیف حضرت مجددؒ سے یہ معرفت مجھے حاصل ہوئی کہ حقیقت شریعت کے متعلق ایسے معارف شاید نہین ہین جو قرآن اور حدیث مین مذکور نہین ہوئے۔ ہان یہ ضرور ہو کہ حقیقت شریعت کا سمجھنا استعداد سامعین پر منحصر ہو۔ اور صحبت نبوی کو اس کے سمجھانے مین بڑا دخل تھا۔ اسی لیے طبقۂ اولی کے مسلمان طبقات مابعد کے مسلمانون سے افضل سمجھے جاتے ہین۔ اور اس نعمت کے حصول کے لیے علما صلحا اور مشایخ کی صحبتین بھی جو صحبت نبیؐ کا پرتو رکھتی ہین اکتساب علوم دین کے بعد از بس ضروری ہین۔ مرید ہونا حصول صحبت کے لیے کافی نہین ہو۔ بلکہ صحبت سے فیضیاب ہونا ضروری ہو۔ اب مجھے شبہہ پیدا ہوتا ہو کہ شاید ماہیت روح کی تعلیم صحبت نبوی مین بھی نہین ہوئی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مجھے اس کا جہل ہو۔ اور ایک کا کشف دوسرے کے لیے سند نہین ہو لیکن مجھے اس مین شبہہ نہین ہو کہ صفات وکیفیات روح کے متعلق اصحابؓ رسولؐ فیض صحبت نبیؐ سے بےانتہا معارف حاصل کرکے الامال ہوگئے تھے۔ اور اُن کے ذریعہ سے مشایخ مابعد تک مسلسل یہ معارف پہونچتے رہے۔ صوفیا انھین معارف کے ذریعہ سے روح اور روحانیت سے بحث کرتے ہین۔ اور شریعت کے علاوہ شریعت کی حقیقت بیان کرتے ہین اور اس حقیقت کے دریافت کرنے کے راستہ کا نام اُنھون نے طریقت حقیقت رکھا ہو۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ شریعت، حقیقت اور طریقت ان تینون کی اہمیت تکمیل اسلام مین تسلیم کرتے ہین لیکن حقیقت اور طریقت مین اتنا غلو کہ دامن شریعت چھوٹ جائے وہ پسند نہین کرتے۔ طریقت کے راستون مین دیگر مشایخ سے کچھ کچھ فروعی اختلاف بھی وہ کرتے ہین۔ اور اپنے خاص انکشافات کو بھی کچھ دخل دیتے ہین۔ لیکن ان باتون سے دیگر سلسلہ کے بعض مشایخ گو شروع مین مخالف تھے۔ مگر اصل حقیقت کے جاننے کے بعد مخالف نہین رہے۔

تقدیر الٰہی اور لوح محفوظ (مظہر تقدیر الٰہی) کا جیسا مین پہلے قائل تھا اب بھی قائل ہون۔ شروع سے میرا خیال تھا اور اب بھی ہو کہ قرآن مجید مین اس کے متعلق متضاد احکام جو ہین وہ بظاہر تقدیر الٰہی کی حقیقت سمجھانے کے لیے نہین ہین بلکہ اس لیے ہین کہ انسان کو وہ مقام رضا وتسلیم تک پہونچائین اور اس سطح انسان کو دونون جہان کی مسرت عطا کرین اور باعث اس کے اطمینان قلب کے ہون۔ نفس مطمینہ کا حاصل ہونا بڑی نعمت ہو۔ بعض تمام علماے شریعت اور صوفیون نے حقیقت قضا وقدر

بیان کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ماحصل سب کا یہی سمجھا کہ مقام رضا و تسلیم تک پہونچانے کے لیے یہ اقوال مختلف استعداد والون کے لیے مختلف ذرایع ہین۔ مجدد صاحبؒ نے لکھا ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہین ہوتا تو کوئی اُس قادر مطلق سے یہ نہین پوچھ سکتا کہ تونے یہ کیون کیا؟ ایسا سوال کرنا شان بندگی سے ازبس بعید ہے۔ دیگر اکابر کی تحریرون کا بھی یہی ماحصل ہے لیکن حضرت مجددؒ کی تحریر نے مجھ پر ایک خاص اثر ڈالا۔ شریعت اور طریقت دو جدا جدا چیزین نہین ہین لیکن ان کے اصطلاحات جدا جدا ہین۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی دونون علوم کے ماہر مشترکہ زبان بولتے ہین شریعت والون کے لیے حقیقت اور طریقت کا سمجھنا آسان ہو جائے اس لیے مین قاضی صاحبؒ کی ارشاد الطالبین سے کچھ اقتباس کرتا ہون:-

ایک اجنبی نے آنحضرتؐ سے پوچھا کہ احسان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ خدا کی عبادت تو اس طرح کرے کہ گویا تو خدا کو دیکھتا ہے۔ اور اگر نہین دیکھتا تو یہ جان کہ وہ تجھے دیکھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عقاید اور اعمال کے سوا ایک کمال احسان بھی ہے اور اسی کمال کو اصطلاح صوفیہ مین ولایت کہتے ہین۔ صوفیون پر جب محبت الٰہی غالب ہوتی ہے تو اُسے وہ اپنی اصطلاح مین فنائے قلب کہتے ہین اور اُس وقت اُن کے دل اللہ کے سوا دوسری چیز کی طرف متوجہ نہین ہوتے۔ خدا کو دیکھنا عادۃً محال ہے لیکن صوفی پر ایسی حالت طاری ہوتی ہے کہ گویا وہ خدا کو دیکھتا ہے۔ حدیثون کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص اللہ کی محبت کرتا ہے اللہ اُس کی محبت کرتا ہے۔ اللہ جس کی محبت کرتا ہے اُس کا درجہ ولایت خاصہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اولیا بعد فنا کے معارف ذات بحت مین ترقی کرتے ہین اور پھر وہ عروج سے نیچے اُترتے ہین۔ لیکن اُن کی جو حالت فنا کے قبل تھی اُس تک یہ اُتر کر پھر واپس نہین آتے ورنہ محبت رائیگان ہو جائے۔

اولیا سے خرق عادات بھی ظہور مین آتے ہین۔ خرق عادت کی ایک قسم کشف بھی ہے۔ ایک کشف کشف کونی ہوتا ہے اس کی مثال مین کتب سیر سے حضرت عمرؓ کا وہ کشف پیش کیا جاتا ہے جو حالت خطبہ مین بمقام مدینہ ایک موقع پر ایک جنگ کے افسر حضرت ساریہؓ سے آپ نے کہا "کہ پہاڑ کی طرف سے ہوشیار رہو" حالانکہ وہ مقام مدینہ سے بہت دور تھا۔ کشفی نظر سے عالم مثال مین دیکھنا کشف کی دوسری قسم ہے۔ اسی کو الہام بھی کہتے ہین۔ الہام اور وسوسے مین یہ فرق ہے کہ الہام سے صوفی کا قلب سلیم

اطمینان حاصل کرتا ہے اور وسوسہ نا قابل اعتبار ہوتا ہے۔ اولیا کا کشف یا الہام پھر بھی ظنی ہے۔ دو شخصون کا کوئی کشف باہم متفق ہو جائے تو ظن غالب مین اس کا شمار ہوتا ہے۔ اولیاء کے کشف مین خطا بھی ہوتی ہے۔ وہی کشف لایق قبولیت ہے جو شرع کے مخالف نہو۔ صاحب صحو کا کشف صاحب سُکر کے کشف سے اولیٰ ہے۔ خرق عادت ولایت کے لوازم سے نہین ہے۔ بہت سے صحابہؓ ہین۔ جن سے خرق عادات مروی نہین ہے۔ لیکن ادنیٰ اصحابؓ بھی اُن اولیاؒ سے افضل ہین جن سے خوارق بہت سے مروی ہین۔ ثواب کا تعلق صرف عبادت اور قرب الٰہی سے ہے۔ اسی لیے محدثین نے اصحابؓ رسولﷺ کے کرامات مناقب مین درج نہین کیے ہین بلکہ کرامات کا ذکر معجزات کے بعد رکھا ہے۔

ولی کی علامت یہ ہے کہ ظاہراً شرع شریف کا پورا پابند ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے " ان اولیاءہ الا المتقون " یعنی نہین ہین خدا کے اولیا مگر متقی لوگ۔ حدیث مین آیا ہے کہ اولیاء اللہ کی علامت یہ ہے کہ اُن کی زیارت سے خدا یاد آے۔

مقام قرب تقویٰ سے قرب الٰہی حاصل ہوتا ہے۔ تقویٰ یہ ہے کہ کوئی امر عقائد و اخلاق سے متعلق خدا تعالیٰ کی مرضی کے خلاف واقع نہو۔ کمال تقویٰ بغیر ولایت کے ممکن نہین ہے۔ اس لیے طلب طریقت اور حصول کمال باطنی کے لیے کوشش کرنا واجب ہے اور علم باطن مین اضافہ چاہنا فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے " وقل رب زدنی علما " یعنی کہہ اے محمدؐ کہ اے پروردگار میرا علم بڑھا دے۔ " معلوم ہوا کہ مراتب قرب سے قناعت کرنا جسطرح ناقصون پر حرام ہے کاملون پر بھی حرام ہے۔

جب کمالات باطن کا طلب کرنا واجبات سے ہے۔ تو ایسے پیر کا تلاش کرنا ضروری ہوا جو کامل بھی ہو اور کامل بنا دینے والا بھی ہو۔ اگر کوئی شخص شیخ کی خدمت مین مدت تک حسن اعتقاد سے رہا۔ اور اُس کی صحبت مین تاثیر نہین پائی تو اُس پر واجب ہے کہ اُسے چھوڑ کر دوسرے شیخ کو تلاش کرے۔

اولیا کو علم غیب نہین ہوتا۔ ہان بعض غائب چیزون کے متعلق خرق عادات کے طور پر کشف یا الہام سے انھین کچھ علم دیا جاتا ہے۔ یہ کہنا کفر ہے کہ اولیا کو غیب کا علم ہے۔

اولیا معدوم کو پیدا کرنے یا موجود کو نابود کرنے پر قادر نہین ہین۔ پیدا کرنے۔ نابود کرنے۔

رزق پہونچانے۔ اولاد دینے۔ بلا دور کرنے مرض سے شفا بخشنے وغیرہ کے لیے مدد طلب کرنا کفر ہی۔
دعا ایک عبادت ہی۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا "الدعا ھوالعبادۃ" مثلاً یہ کہنا "یا شیخ عبدالقادر جیلانی! شیئاً للّٰہ" جائز نہین ہی بلکہ شرک وکفر ہی۔ ہان یہ کہنا جائز ہی کہ اے اللہ بحرمت شیخ عبدالقادر جیلانی میری حاجت روا کر۔
کسی ولی یا آنحضرت محمدؐ کا بھی ذکر خلاف شرع کرنا جائز نہین ہی۔ مثلاً بجائے لاالٰہ الااللہ محمد رسول اللہ کے یا محمد یا محمد کہنا جائز نہین ہی۔
شرعی پابندی سے کوئی ولی یا نبی مستثنیٰ نہین ہی۔ مگر وہ مجذوب جو بالکل عقل نہین رکھتا اُس پر شرعی پابندیان ساقط ہین۔
عصمت یعنی تقصیر سے پاک ہونا انبیا کا خاصہ ہی۔ عصمت سے مراد ہی صغیرہ وکبیرہ گناہ کا عمداً یا سہواً سرزد ہونا۔ انبیا مین فتور عقل ہونا غفلت کا ہونا بھکی بھکی باتین کرنا یا نشہ مین ہونا ممکن نہین ہی۔ لیکن انبیا کے سوا کسی اور سے عصمت کو منسوب کرنا خلاف اجماع ہی۔
صحابہؓ اولیاے اُمت سے افضل ہین۔
اولیا کی قبرون کا بلند کرنا اُن پر گنبد تعمیر کرنا عرس وغیرہ رسوم کا کرنا اور چراغان کرنا یہ سب بدعت ہین۔ ان مین سے بعض حرام ہین اور بعض مکروہ ہین۔ حدیث مین آیا ہی کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہی کہ میری قبر کو عید اور مسجد نہ بنانا۔
قبرون کے پاس جا کر یہ کہنا سنت ہی "السلام علیکم اے قبرون مین رہنے والے مومنو اور مسلمو! انشاء اللہ ہم بھی تمھارے پاس آنے والے ہین۔ ہم اللہ سے اپنے لیے اور تمھارے لیے عافیت چاہتے ہین"
پیغمبر خدا صلعم اور اولیاے کرام کے مقابر کی زیارت کرنے کا مستحب طریقہ یہ ہی کہ طہارت کاملہ کے ساتھ درود شریف پڑھے اور اپنے کسی عمل صالح کا جو خالص نیت سے کیا گیا ہو ثواب بخشے۔ صاحب نسبت کو صاحب قبر سے فیض حاصل کرنے کے لیے مراقبہ کرنا جائز ہی۔ اگر کوئی کامل کسی دوسرے کو اپنے آپ سے زیادہ کامل دیکھے تو چاہیے کہ اُس سے فیض حاصل کرے۔ بلکہ کم درجہ والے مین بھی کوئی خصوصیت یا خوبی دیکھے تو اُسے بھی حاصل کرے جیسا کہ حضرت موسیٰؑ نے حضرت خضرؑ سے حاصل کیا تھا۔
اولیا کو جائز ہی کہ جو انعامات اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن پر قرب الٰہی کے متعلق ہون اُنھین ظاہر

کرین۔ حدیث مین کہ ہی خدا کی دی ہوئی نعمت کا ذکر کرنا بھی شکر ہی۔ غوث الثقلین کے قصائد، مجدد الف ثانی کے مکتوبات اور شیخ اکبر کے تصانیف ان شکرون سے بہرہ ہین۔

قرب الٰہی کا موجب جذب یعنی خدا کا اپنے بندے کو اپنی طرف کھینچنا ہی۔ یہ جذب کبھی بےواسطہ ہوتا ہی تو اُسے اجتبا کہتے ہین اور اگر باواسطہ ہو تو عبادت یا کسی کامل کی صحبت واسطہ ہوتی ہی۔ جو جذب عبادت کے ذریعہ سے ہو اُسے ثمرۂ عبادت کہتے ہین۔ جو بذریعہ صحبت ہو اُسے تاثیر شیخ کہتے ہین۔ غرضکہ ناقصون کو کسب یعنی عبادات و ریاضات اور جذب کے لیے شیخ کامل یعنی صحبت شیخ کامل کی ضرورت ہی۔ جذب کے قبل سلوک شروع ہوتا ہی اسی لیے سلوک کو جذب پر اکثر اولیا مقدم جانتے ہین۔

سالک مجذوب کی ابتدائی سیر، سیر آفاقی کہلاتی ہی۔ اس سیر کے لطائف مین انوار ظاہر ہوتے ہین۔ قلب کو نور زرد، روح کو نور سرخ، سر کو نور سیاہ، خفی کو نور سپید اور اخفی کو نور سبز کہتے ہین۔ یہ سیر دور و دراز ہوتی ہی۔ انتہائے سیر کے قبل اگر صوفی مر گیا تو ناکام رہا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے خواجہ نقشبند کو سلوک پر جذب کے مقدم کرنے کا الہام فرمایا۔ اس سلسلے کے مشائخ مرید کو اول توجہ کے ذریعہ سے لطائف عالم امر مین ذکر کا القا کرتے ہین یہانتک کہ قلب، روح، سر، خفی اور اخفی اپنے اصول مین فانی ہو جاتے ہین۔ اس سیر کو سیر انفسی کہتے ہین۔ اور اُسی سیر انفسی کے ضمن مین سیر آفاقی بھی حاصل ہو جاتی ہی۔ اس سالک کو مجذوب سالک اور سیر کو اندراج النہایت فی البدایت کہتے ہین۔

بعض اکابر یہ فرماتے ہین کہ جس عبادت مین محنت اور مشقت ہو وہ عبادت رذائل نفس کے دور کرنے مین پوری تاثیر رکھتی ہی۔ اسی لیے ذکر جہر، چلے اور خلوت وغیرہ دیگر امور نکالے گئے ہین اور برخلاف اسکے حضرت خواجہ نقشبندؒ فرماتے ہین کہ جو عبادت سنت کے موافق ہی وہی نفس کی برائیون کو دور اور تصفیہ عناصر اور حصول قرب الٰہی کے لیے زیادہ مفید ہی اور اسی لیے وہ بدعت حسنہ سے بھی بدعت سیئہ کی طرح بچتے ہین۔

جذب مطلق جسے اجتبا کہتے ہین عوام کے حق مین متصور نہین ہی۔ مگر ایسے شخص کے توسط سے یہ درجہ حاصل ہو سکتا ہی جو باطن مین خدا سے اور ظاہر مین بندون سے مناسبت رکھتا ہی۔ یہ درجہ رسول کا تھا۔ اب نائب رسول کا ہی۔ علمائے ظاہر و باطن انبیا کے وارث ہین۔

بعض قوی استعداد والے بھی پیغمبر یا کسی ولی کی روح سے فیض حاصل کر کے درجۂ ولایت تک

پہونچ جاتے ہیں۔ اُن کو اویسی کہتے ہیں۔ کیونکہ حضرت اویس قرنی نے بغیر شرف صحبت حاصل کیے ہوے آنحضرت سے فیض حاصل کیا تھا۔

جذب مطلق یعنی اجتبا جیسا کہ انبیا کو مبدء فیاض کے ساتھ مناسبت رکھنے کے باعث حاصل ہے ویسا ہی اولیا کو بھی درجہ اخیر میں حاصل ہو سکتا ہے۔ دل جب رسول کی متابعت سے مقام محبوبیت تک پہونچکر محبوب خدا ہوجاتا ہے تو اسکے بعد جو ترقیاں ہوتی ہیں انھیں سیر رادی کہتے ہیں۔

کبھی اس جذب مطلق یعنی درجہ اجتبا کے حاصل ہونے کے بعد پیر سے مرید افضل ہوجاتا ہے لیکن شیخ کا حق تربیت اسکی گردن پر برابر رہتا ہے۔

جاننا چاہیے کہ برکات عبادات سے قوت وسعت اور تربیت حاصل ہوتی ہے لیکن اس طرح سے ایک مقام سے دوسرے مقام تک یعنی ولایت صغریٰ سے ولایت کبریٰ پھر ولایت علیا اور پھر کمالات نبوت تک درجہ بدرجہ ترقی نہیں ہوتی۔

ابو الفضل محمد احسان اللہ عباسی گورکھپور

# کاش ربّ اپنے مالک کا میں یوں پہچانتا

غوث اعظم نے یہ فرمایا کہ تھا اک وقت پند
نکتہ آموز دین سراپا خیر و برکت دلپسند

ایک دولتمند مالک نے خریدا اک غلام
باتمیز و بردبار و پاکباز و نیک نام

دیکھکر مالک اُسے دل میں نہایت خوش ہوا
اسکو پھر عزت سے گھر لاکر کیا شکر خدا

اور پوچھا اے غلام نیک تو کیا کھائیگا
عرض کی اُس نے کہ تو جو کچھ مجھے کھلوائے گا

اُس نے پوچھا کون سا پانی تجھے مطلوب ہے
عرض کی جو تو پلائے مجھکو وہ مرغوب ہے

اُس نے پھر پوچھا تجھے درکار ہے کیسا لباس
عرض کی اُس نے پنھائے تو مجھے جیسا لباس

اُس نے پوچھا اور کیا سامان ہو تیرے لیے
عرض کی اُس نے تری مرضی جو ہو میرے لیے

اُس نے پوچھا کس جگہ گھر میں کریگا تو قیام
عرض کی اس نے جہاں تو حکم دے اے نیکنام

اُس کی باتیں سن کے مالک رو کے یہ کہنے لگا
"کاش ربّ اپنے مالک کا میں یوں پہچانتا"

حکیم جگر صدیقی زمیندار سیوان

# حضرت مخدوم الملک

شمس العلما نواب سید امداد امام صاحب نے بہار ریسرچ سوسائٹی جرنل میں یہ مضمون شایع کرایا تھا جسکا ترجمہ اردو دان اصحاب کی ضیافت طبع کے لیے نذر الناظر ہی

مترجم

آپ کا نام احمد تھا۔ آپ کی پیدائش چھ سو باسٹھ ۶۶۲ ہجری مین ہوئی تھی اور آپ کی جاے پیدائش منیر ہی۔ یہ آپ کے والد کی خاندانی جگہ تھی۔ جسوقت آپ پیدا ہوے تھے اُس وقت دہلی کے تخت پر شہنشاہ نصیرالدین ولد سلطان شمس الدین التمش تخت نشین تھے اور بغداد مین حاکم خلافت کرتے تھے۔ یہ سب بادشاہ گذر گئے لیکن آج اُن کا نام کسی کی زبان پر نہین ہی اور مخدوم الملک آج بھی زندہ ہین اور اُسوقت تک زندہ رہین گے جب تک اسلام کے ماننے والے صوبہ بہار مین موجود ہین۔ آپ کا نام صرف بہار ہی مین محدود نہین ہی بلکہ ہندوستان کے بعید ترین گوشون مین جہان کہین بھی مسلمان رہتے ہون آپ کا نام لیا جاتا ہی۔

آپ کے آبا واجداد مخدوم الملک اپنے والد کی طرف سے شیخ تھے۔ آپ کے والد اپنے خاندانی سلسلہ کو حضرت عبدالمطلب سے ملاتے ہین۔ آپ کی والدہ ایک سیدانی تھین اور اُن کا نام بی بی رضیہ تھا حضرت کے آبا واجدا د مین پہلے شخص جو ہندوستان مین آئے اُن کا نام تاج فقیہہ تھا۔ یہ بہت بڑے فقیہہ گذرے ہین۔ آپ ہی نے منیر مین قیام فرمایا۔ اور اسی وجہ سے یہ جگہ بہت مشہور ہوگئی۔ اور یہان علم اور ریاضت کی پیاس بجھانے کے لیے دور دور سے شائقین فن آنے لگے۔ آپ ہی کی اولاد مین مخدوم شیخ پیدا ہوے جن کی شادی پیر جگ جوت کی لڑکی سے ہوئی۔ اُن سے چار بیٹے ہوے۔ حضرت مخدوم الملک بہاری انھین کے صاحبزادے تھے۔

آپ کی تعلیم آپ کی ابتدائی تعلیم منیر ہی مین ہوئی تھی اور آپ کے اُستاد شیخ شرف الدین ابوتوامہ ہین۔ اتفاقاً شیخ مخدوم کسی سیاسی پیچیدگی کی وجہ سے دہلی چھوڑ کر بنگال جا رہے تھے اور اثناے سفر مین آپ کا قیام مخدوم الملک کے والد کے یہان ہوگیا تھا۔ اُسی دوران قیام مین مخدوم الملک کو اُن سے شناسائی

ہوگئی اور جب شیخ شرف الدین منیر سے سونرگاؤں کی طرف چلے تو مخدوم الملک بھی ساتھ ہو لیے۔
آپنے طالبعلی کے بارہ برس سونرگانوں مین بسر کئے اور یہین عربی کی پوری تعلیم کی تکمیل ہوگئی۔

**آپ کی شادی اور منیر کی طرف مراجعت** آپ نے اپنے دوران قیام مین شیخ شرف الدین ابوتوامہ کی صاحبزادی سے شادی کرلی تھی۔ اس شادی سے آپ کے تین لڑکے ہوئے۔ زندہ صرف ایک ذکی الدین رہے۔ جب مخدوم الملک کو معلوم ہوا کہ اُن کے والد کا انتقال ہوگیا ہے تو اُنھوں نے فوراً منیر کی طرف مراجعت کی۔ آپ کی اہلیہ کا بھی انتقال ہوچکا تھا اس لیے حضرت ذکی الدین کو ساتھ لے لیا۔ آپ نے منیر مین پہونچکر چند مہینوں تک اپنی والدہ کی خدمت کی اُس کے بعد والدہ کی اجازت سے پیر کی تلاش مین روانہ ہوئے۔

**بیعت** مخدوم الملک دہلی روانہ ہوئے اور وہان اپنے تلین نظام الدین اولیا کی خدمت مین پیش کیا لیکن حضرت نے مخدوم الملک کو بیعت مین لینے سے انکار کردیا اسکے بعد مخدوم الملک شاہ شرف الدین کے یہان پانی پت گئے لیکن وہان بھی ناکامیابی ہوئی۔ اس دوسری ناکامیابی نے آپ کو نہایت دل شکستہ کردیا تھا۔ آپ اسی حالت مین تھے کہ آپ کے بڑے بھائی نے آپ کو دہلی جانے کی ہدایت کی تاکہ حضرت نجیب الدین فردوسی سے بیعت حاصل کرنے کے لیے کوشش کریں۔ یہان آپ کو کامیابی ہوئی اور آپ حضرت فردوسی کے مرید ہوگئے۔

**آپ کی ریاضت** حضرت مخدوم الملک نے دہلی سے واپس آکر اپنے صوبہ مین اقامت اختیار کرنا چاہی لیکن آپ مین تصوف کا ولولہ اسقدر موجزن تھا کہ جب آپ بہیا کے جنگل مین جو ضلع شاہ آباد مین ہے پہونچے تو آپ پر ایک زبردست بیخودی طاری ہوئی اور اپنے بھائی جلال الدین سے علیحدہ ہوکر آپ نے جنگل کی راہ لی۔ کہاجاتا ہے کہ بہیا کے جنگل مین آپ پر یہ کیفیت مسلسل طاری رہی۔ اُسکے بعد آپ راجگیر کے پہاڑون پر گئے اور جنگلون مین گھوما کیے۔ اس زمانہ کے بہت سے کرامات کے قصے زبان زد خلایق ہورہے ہین۔ جب یہ دور ختم ہوا تو آپ نے راجگیر پہاڑ پر جانا کم کردیا۔

**بہار کی اقامت اور وعظ وپند کا سلسلہ** بہار شریف مین آپ اٹھائیس برس مقیم رہے اور روزانہ آپ کا معمول یہ تھا کہ عربی علوم وفنون مین درس وتدریس کیا کرتے۔ علم کی پیاس خود آپ کی کبھی کم نہ ہوئی۔ تصوف آپ کا اصل میدان تھا۔ اور اُسی علم مین آپ سارے عالم اسلامی مین نہایت عزت کی نگاہون سے دیکھے

جانتے تھے۔ آپ کا علم آپ کی پاکیزگی، آپ کا اخلاق حمیدہ اور تمام دنیا سے رکشی ایسی تھی جس نے حق کے متلاشیوں کو تمام عالمِ اسلامی میں آپ کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ آپ کے مریدوں کی تعداد بہت تھی۔ حضرت چولائی اور مولانا مظفر بلخی آج تک نہایت عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔

آپ کا تصوف باوجود صوفی ہونے کے آپ خدا کو خدا اور انسان کو انسان بتاتے رہے[1] اور اخیر زندگی تک آپ وحدانیت کے اصل الاصول سے علیحدہ نہیں ہوئے۔

آپ کا علم و فضل: مخدوم الملک اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم تھے۔ چنانچہ ان کی کتابیں آج بھی شہادت دیتی ہیں اور علاوہ دیگر علوم کے فلسفہ کے بھی ماہر تھے۔ ارسطو کے فلسفہ سے آپ کو پوری واقفیت تھی۔ مذہبی عقاید میں آپ پر ابن سینا کے فلسفہ کا کوئی اثر نہ تھا۔ آپ اسلام کی وحدانیت کے سب سے بڑے حامی گذرے ہیں۔

انتقال: آپ کا وصال ۷۸۲ھ ہجری میں ہوا۔ اور اس وقت آپ کا سن شریف ایک سو اکیس سال ماہ قمری کے حساب سے ہو چکا تھا۔

سید محمود شیرازی ایم اے

لہ کوئی صوفی خدا کو انسان اور انسان کو خدا نہیں مانتا۔ اور جو مانتا ہو وہ صوفی نہیں بلکہ مجذوب کہا جائے گا۔ اڈیٹر

---

بس اک اشکِ دمِ آخر میں [illegible] — اسی اک لفظ میں دل نے کتابِ داستاں رکھدی

سکونِ یاس میں [illegible] — کسی نے دل کے ہر ذرے میں [illegible] تپاں رکھدی

ہمیں تو بیخودی عشق میں مقصود تھا [illegible] — یہاں یہ ہوش تھا کس کو کہ پیشانی کہاں رکھدی

فسانہ ہو چکا تھا عہدِ وحشت میں تو نے اے صیاد — نظر کے سامنے کیوں لا کے خاکِ آشیاں رکھدی

مری اس لغزشِ مستانہ پر شیدا [illegible] — جبینِ شوق ہر سجدہ [illegible] رکھدی

بہار آتے ہی آتے اس جنونِ فتنہ ساماں نے — ہر اک گوشے دل میں دستِ گلکاراں رکھدی

رہِ الفت میں ثاقب بختہ کاری کا یہ عالم تھا
نہ اٹھی عمر بھر اس در سے پیشانی جہاں رکھدی

سید ابو محمد ثاقب (ناظم بزم ادب کانپور)

# بشاشت

مین ہمیشہ خوشی پر بشاشت کو ترجیح دیتا ہون۔ مین اول الذکر کو ایک فعل اور موخر الذکر کو خصلت طبعی خیال کرتا ہون۔ خوشی ایک فعل ہوتا ہی اور بشاشت مستقل اور دائمی ہوتی ہی۔ جن لوگون کو اکثر انتہائی خوشی ہوتی ہی انھین لوگون کو اُسی نسبت سے غم مین بھی مبتلا ہونا پڑتا ہی۔ برخلاف اسکے بشاش رہنے سے گو ہم کو وہ لذت نصیب نہین ہوتی جو خوشی سے حاصل ہوتی ہی مگر ایک بڑا فائدہ یہ ہی کہ ہم غم کے گڑھے مین گرنے سے بچ جاتے ہین۔ خوشی بجلی کی چمک کے مانند ہوتی ہی جو ذرا سی دیر کے لیے بادلون مین چمک کر غائب ہو جاتی ہی۔ بشاش رہنے سے دماغ مین ایک قسم کی پائدار روشنی قائم رہتی ہی اور ہم مستعد اور ہمیشہ متین رہتے ہین۔

وہ لوگ جو اُصولون کی سختی سے پابندی کرتے ہین خوشی کو آزمائش کی حالت کا سخت ترین موقع سمجھتے ہین کیونکہ ہر ایسی خوشی کے وقت انسان کے دل مین ایک قسم کا جوش اور ایک خاص قسم کی شوخی پیدا ہو جاتی ہی اور اس لیے یہ حالت زندگی کی اُس حالت سے مختلف ہوتی ہی جسمین ہر لحظہ بڑے سے بڑے خطرہ مین مبتلا ہو جانے کا خدشہ لگا رہتا ہی۔

بشاش رہنے کے لیے ان اقسام کی ذمہ داریون مین سے کوئی استثنا نہین ہی۔ یہ سنجیدگی اور اطمینان کی قسمون مین سے ایک قسم ہی۔ یہ طبیعت کو انسانیت کی موجودہ اطمینانی حالت سے نامناسب حالت کی طرف بھٹکنے نہین دیتی اور اُن لوگون کے کیرکٹرون مین یہ ایک ضروری چیز سمجھی جاتی ہے جو بُت پرستون مین فیلسوف مانے جاتے ہین اور اُن لوگون کے لیے بھی یہ ایک معروف چیز ہی جنھون نے عیسائیت مین بزرگی اور پارسائی کا رتبہ پایا ہی۔

اگر ہم بشاش رہنے کے مسئلہ پر تین نسبتون سے غور کرین یعنی اپنی نسبت، دوسرون کی نسبت جن سے ہم بات چیت کرتے ہین اور اللہ عزوجل کی نسبت تو یہ مسئلہ ان تینون نسبتون مین سے ہر ایک پر پورا اُترتا ہی۔ ایک شخص جسکو اعلیٰ درجہ کی طبیعت عطا ہوئی ہی اُس کے خیالات صرف اعلیٰ ہی نہین ہوتے بلکہ اُس کو اپنی روح کے تمام شعبون کی قوتون پر کامل قدرت حاصل ہوتی ہے،

اس کا تخیل سلجھا ہوا ہوتا ہی اور اُس کا فیصلہ ناقابل تنسیخ۔ اُس کے مزاج مین یکسانیت اور توازان پایا جاتا ہی یہ سب باتین اُس مین ہر وقت پائی جاتی ہین خواہ وہ مصروف ہو یا تنہا۔ قدرت نے جو نیک کام اُس کے لیے بنائے ہین وہ اُن کو ضرور کرتا ہی ہر حال خوشی سے فائدہ اُٹھاتا ہی اور اُن غمون سے جنمین اتفاقی طور پر وہ مبتلا ہو جائے اپنے آپ کو زیادہ متاثر نہین ہونے دیتا

اگر ہم اُس شخص کو اُن لوگون کے زمرہ مین شمار کرین جلسے وہ بات چیت کرتا ہی معلوم ہو گا کہ اُس سے لوگون کو قدرتی محبت پیدا ہو جاتی ہی اور لوگ اُس کی نسبت اچھی رائے قائم کرتے ہین۔ بشاش رہنے والا شخص صرف صاحب مروت اور ممنون ہونے والا ہی نہین ہوتا بلکہ جن لوگون سے وہ گفتگو کرتا ہی اُن کو بھی اپنا ہی جیسا بنا لیتا ہی۔ ایک شخص اپنے آپ کو بہت خوش پاتا ہی اُسے یہ نہین معلوم ہوتا کہ اس کا سبب کیا ہی مگر اس کا سبب اس کے ساتھی کا بشاش رہنا ہی۔ بشاشت ایک قسم کی اچانک سی روشنی ہوتی ہی جو طبیعت مین پوشیدہ خوشی کو نامعلوم طریقے سے پیدا کر دیتی ہی۔ دل خود بخود خوشی سے لبریز ہو جاتا ہی اور قدرتی طور سے دوستی اور خیر خواہی کے لیے اُن لوگون کی طرف بڑھتا ہی جنھون نے اُس پر ایسا اثر ڈالا ہو۔

جب مین بشاش رہنے کے مسئلہ کی تہہ کی نسبت پر غور کرتا ہون تو دل یہ چاہتا ہی کہ مین قدرت کی مسلسل شکر گذاری مین جیسا کہ کرنا چاہیے مصروف رہون۔ اندرونی طور سے بشاش رہنا ہی قدرت کی مکمل عبادت اور شکر گذاری مین داخل ہی ہم کسی حالت مین بھی ہون گا اس سے ایک قسم کی تسلیم و رضا ظاہر ہوتی ہی اور اس طریقے سے گویا انسان پوشیدہ طور سے قدرت کی رضا جوئی کرتا رہتا ہی۔

میری رائے مین صرف دو چیزین ایسی ہین جو یقیناً ہم کو بشاش رہنے سے محروم کر دیتی ہین ایک ان مین سے ایک گناہ کی طرف مائل ہونا ہی وہ شخص جسکا میلان بدی کی طرف ہوتا ہی اُس کو سکون اور اطمینان قلب نصیب نہین ہوتا جسپر روح کی صحت کا انحصار ہی اور جو نیکی اور معصومیت کا قدرتی وسیلہ ہی بدکار آدمی سے بشاشت کوسون دور رہتی ہی اگر بدکار آدمی کے لیے بشاشت کے مرادف کوئی لفظ زبان مین ڈھونڈھا جائے تو نہین مل سکتا بلکہ ایسا لفظ تلاش کرنا چاہیے جو سیکڑون درجہ حماقت یا دیوانگی سے بڑھا چڑھا ہو۔

دہریت یعنی خدا کی ہستی سے انکار کرنا۔ یہ بات بھی ایسی ہی جس سے انسان بشاش رہنے سے بالکل محروم ہو جاتا ہی۔ خدا کی ہستی کو نہ ماننا فطرت انسانی کے لیے ایک ایسا خاص قسم کا سخت ترین جرم ہی

جس کی تشریح ناممکن ہو بلکہ حیرت ہوتی ہی کہ بظاہر بڑے بڑے سمجھدار لوگون کے دل مین اس قسم کے خیالات کیونکر پیدا ہو جاتے ہین یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہی کہ خدا کی ہستی ایک ایسی ہستی ہی جس کے متعلق ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش نہین ہی اور صرف یہ ہی ایک ایسی برحق ہستی ہی جس پر ہم کو یقین واثق رکھنا چاہیے۔ یہ ہی حقیقت مین وہ ہستی ہی جسکا پرتو ہم ہر چیز مین ہر واقعہ مین اور ہر خیال مین پاتے ہین ہان اگر ہم خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے گروہ کے ہر فرد کے کیرکٹر کو غور بین نگاہون سے دیکھین تو ہم کو معلوم ہو جائیگا کہ ہر شخص خود غرضی، غصہ اور بات بات پر نکتہ چینی کے خمیر سے بنا ہوا ہی دراصل یہ تعجب کی بات نہین ہی اگر لوگ کسی قسم کی اندرونی خوبی نہ رکھتے ہون تو ایسا دل ان کے ساتھ کیون ہو اور ایسے شخص کے لیے جس کی ہستی ہر وقت خطرہ مین رہتی ہی یہ کب ممکن ہی کہ وہ خود اسقدر رنجیدہ نہ ہو ایسے شخص سے کسی کو کوئی نفع بھی نہین پہنچتا۔

بدکار اور خدا کی ہستی کے منکر اگر بشاش رہنے کے لیے نامعقول جد و جہد بھی کرین تو یقین مانیے کہ ان کو اس کا شائبہ تک نصیب نہین ہو سکتا۔ وہ لوگ جو اسی سبب سے عذاب بربادی اور بدبختی مین مبتلا رہتے ہین ان کے لیے یہ ناممکن ہی کہ وہ کسی حالت مین خوش رہ سکین اور دنیا کی لذتون سے فائدہ اٹھا سکین۔

وہ بڑے اصول جو بیان کیے گئے ہین یہ فطرتاً اور اصولاً بشاش رہنے کے منافی ہین ان کے بعد مین کسی اور دوسری چیز کو ان کے مماثل نہین سمجھتا جو بدکار آدمی کے دل سے ان عیب وغیرہ چیز کو نکال سکین۔ دکھ درد، شرم، ملامت، افلاس اور ضعیفی یہ ہی نہین بلکہ خود موت کا بھی اگر خیال کیا جائے اور ان سب چیزون کے قیام کے انحصار پر غور کیا جائے اور ان سے جو نفع یا نقصان پیدا ہوتا ہی پر بھی ایک نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ یہ سب چیزین بھی برائی کے نام سے موسوم کیے جانے کی مستحق نہین ہو سکتین۔ اچھی سمجھ رکھنے والا آدمی ان سب باتون کو صبر و شکر حلم و بردباری اور بشاش بشاش رہ کر برداشت کرے گا۔ سمندر کا خطرناک سے خطرناک طوفان بھی اس کو مایوس نہین کر سکتا اس وجہ سے کہ وہ جہاز مین اطمینان سے بیٹھا ہوا ایک خوشگوار بندرگاہ پر پہنچنے کی امید سے لو لگائے ہوئے ہی اور اسکے ساتھ یقین کامل بھی رکھتا ہی۔

ایک شخص جو قدرت کی مشیت پر صحیح اصولون پر کاربند رہ کر چلتا ہی اس کے لیے بشاش رہنے کے

دوامی ذرایع اپنی آغوش کھولے رہتے ہین۔ ایک یہ ہی کہ وہ اپنی ناچیز ہستی پر غور و خوض کرتا رہے اور دوسرے یہ کہ اللہ عز و جل کی عبودیت کا ہر حالت مین اقرار کرتا رہے۔ اگر اپنی ہستی پر غور کیا جائے تو ہمکو اس بات سے حقیقی مسرت ہوگی کہ جو ہستی قدرت نے ہم کو عطا کی ہی وہ لاتعداد ہستیون کے گذر جانے کے بعد بھی ایک نئی ہستی ہی۔ جب اس کی ابتدا اور انتہا پر غور کیا جاتا ہی اور دوسرے شعبون پر نظر غائر ڈالی جاتی ہی کہ اپنی ابتدا سے چند ہی سال مین اُنھون نے کسی قدر حیرت انگیز ترقی کی ہی اور یہ ترقی اُن شعبون کی تکمیل کا باعث ہوگی اور اس تکمیل سے خوشیون مین اضافہ ہوگا تو خدا کی شکرگذاری اور اپنے لیے مبارکباد کے بے انتہا جذبات دل مین خود بخود پیدا ہو جاتے ہین۔ مسرت باز آدمی کو اس قسم کی آمد ہی سے دائمی روحی مسرت ہوتی ہی اور یہ باتین اُس کو ہر لمحہ خوش و خرم رکھتی ہین مگر اُس کو یہ علم ہونے نہین پاتا کہ وہ کیون اس قدر خوش و خرم رہتا ہی۔

سمجھدار آدمی کے لیے بشاش رہنے کا دوسرا ذریعہ یہ ہی کہ اللہ عز و جل کا خیال دل مین رکھے۔ وہ بزرگ و برتر ہستی ہی جسکی صرف ادنی سی جھلک کا کل دنیا و مافیہا ایک کرشمہ ہی اور یہ اُس کے نزدیک بالکل معمولی بات ہی مگر ہم کو یہ سب باتین کسقدر شاندار و پرشوکت اور دلفریب معلوم ہوتی ہین۔ خالق اکبر ہم کو ہر جگہ اپنی عنایتون سے سرفراز کرتا رہتا ہی اور یہی چاہتا ہی کہ ہم کو اپنے لیے خوش و خرم رکھے اور اُسکی برتری سچائی اور مشیت یہ ہی چاہتی رہتی ہی کہ اُن لوگون کو جو اُس سے نیکی کی توفیق چاہتے ہین ہمیشہ شادان و فرحان رکھے۔

یہانتک جو بیان ہوا ہی اس مین بشاشت کے متعلق انسان کی طبعی خصلت پر غور کیا گیا ہی اور ساتھ ہی اس کے ایسے اسباب بیان کیے گئے ہین جن پر انسان اگر کاربند رہے تو ہشاش بشاش رہ کر اپنی روح کو تر و تازہ اور زندہ رکھ سکتا ہی۔ اچھا! آؤ اب بشاشت کی ظاہری حالت پر غور کرین اور ان اسباب پر روشنی ڈالین جن کا اچھائی بُرائی سے کوئی تعلق نہین ہی۔

بشاشت کا سب سے پہلا کام یہ ہی کہ انسان کی صحت کو ترقی دیتی ہی۔ برخلاف اس کے کراہت اور اندرونی رنج و غم دل و دماغ کے اعضائے رئیسہ کے ریشون کو نامعلوم طریقے سے صدمہ پہونچاتے رہتے ہین اور اس صدمہ سے جسم کی مشین کو بتدریج نقصان پہونچتا رہتا ہی۔ اسکے علاوہ ان چیزون سے خون مین ایک قسم کا تیز تلاطم اور حیوانی جذبات مین جوش کا طوفان پیدا ہوتی رہتی ہین اُن کا تو ذکر کرنا ہی فضول ہی۔

میری نظر سے شاذونادر ہی کوئی ایسا بڈھا آدمی گذرا ہوگا جسکے چہرہ پر بشاشت ہو اور طبیعت میں کسی حدتک لاپروائی سی نہ ہو یعنی اگر اسمین بشاشت نہو گی تو کم از کم اُس کی طبیعت مین لاپروائی تو ضرور ہو گی۔ واقعہ یہ ہی کہ صحت اور بشاشت اِس فرق کے ساتھ ایک دوسرے سے پیدا ہوتے رہتے ہین اگر ہم بشاش نہ رہتے ہون تو ہم کو اچھی صحت کا درجہ شاذ ہی نصیب ہو سکتا ہی لیکن ہم بیشتر یہ دیکھتے ہین کہ جن لوگون کی صحت اچھے حال مین نہین ہوتی وہ بھی اکثر ہشاش بشاش رہتے ہین۔

بشاشت کا جیسا گہرا تعلق جسم سے ہی ویسا ہی طبیعت سے بھی ہی یہ تمام تفکرات اور پریشانیون کو رفع کرتی ہی غصے کے جذبات کو ٹھنڈا کرتی ہی اور روح کو دائمی حالت سکون مین رکھتی ہی مَین اِس آخری خیال کے متعلق کہنے سے پہلے مین یہ کہون گا کہ جس دنیا مین ہم پیدا کیے گئے ہین اُس مین ایسی چیزین بیشمار موجود ہین جن سے ہم اپنی طبیعت کو خوش و خرم رکھ سکتے ہین۔

اگر ہم خیال کرین کہ دنیا انسان کے قبضہ مین ہی تو یقینی یہ خیال ہو گا کہ دنیا ہمارے ہی واسطے بنائی گئی ہی۔ اگر ہم اس کی قدرتی خوبصورتی اور دلچسپیون کے متعلق خیال کرین تو اِس سے یہی نتیجہ نکلے گا کہ دنیا ہمارے عیش و آرام کے لیے بنائی گئی ہی۔ سورج جو دنیا کی سب سے بڑی جاندار شے ہی ہماری زندگی کے لیے ہر قسم کی ضروری چیز مہیا کرتا ہی اور یہ انسان کی طبیعت کو بشاش رکھنے اور دل کو خوش رکھنے کا ایک خاص ذریعہ ہی۔

وہ خوشنما جانور جو دنیا مین پیدا کیے گئے ہین جن سے ہماری پرورش بھی ہوتی ہی اور ساتھ ہی اسکے اُن کے خوش کن نغمون سے جنگل گونجتے رہتے ہین۔ اِن نغمون سے ہمارے دلمین ایک قسم کی خوشی پیدا ہو جاتی ہی اور اُن کو دیکھ کر ہماری طبیعت بیحد مسرور بھی ہوتی ہی۔ چشمے، دریا اور جھیلون کے منظر سے طبیعت مین ایک قسم کی ایسی تازگی پیدا ہو جاتی ہے جیسی زمین کے اُن حصون کو دیکھنے سے جن پر وہ بہتے ہین۔

بڑے بڑے مبصرون نے دلائل سے ثابت کیا ہی کہ تمام دنیا بہ نسبت اور رنگون کے سبز رنگ سے بھری ہوئی ہی اور سبز رنگ روشنی اور سایہ کا ایک ایسا صحیح مرکب ہی جس سے بصارت کو کسی قسم کا نقصان یا کمزوری پہونچنے کے بجائے اُس کو آرام اور تقویت پہونچتی ہی۔ اسی وجہ سے بہت سے مصور اپنی آنکھون کے سامنے سبز کپڑا لٹکائے رہتے ہین جس سے اُن کی بینائی کو خواہ وہ اپنے فن مین کتنی ہی

نفت کیون نہ کرین کوئی نقصان نہین پہونچتا - سر ازاک نیوٹن نے اِس کے وجوہ جو بیان کیے ہین وہ حسب ذیل ہین :-

"تمام رنگ جو زیادہ شوخ ہوتے ہین اُن حیوانی جذبات کو جن کا تعلق بصارت سے ہوتا ہی مغلوب اور پریشان کرتے رہتے ہین برخلاف اسکے وہ رنگ جو زیادہ دُھندلے ہوتے ہین اُن سے حیوانی جذبات کافی طور پر متاثر نہین ہوتے جب کرنون کے دیکھنے سے ہمارے تخیل مین سبز رنگ کا خیال پیدا ہوجاتے تو اس صورت مین کرنین بصارت پر ایسی مناسب نسبت سے گرتی ہین کہ جذبات حیوانی یکسان حالت مین کام کرتے رہتے ہین اور کرنون اور جذبات حیوانی مین برابری کی حیثیت سے کشمکش ہوتی رہتی ہی جس سے طبیعت مین خوشی اور خرمی کے احساسات پیدا ہوجاتے ہین"

اِس کے اسباب خواہ کچھ ہی ہون مگر اِس کا نتیجہ یقینی ہی اسی وجہ سے شعرا سبز رنگ مین خاص طور سے طبیعت کو خوش کرنے والی صفت بیان کرتے ہین -

قدرت کے کامون مین ان دونون اغراض پر نظر کرنے کے لیے کہ وہ کیسے مفید ہوتے ہین اور اپنی خوبصورتی کی وجہ سے اُن کو اپنے دل کی طرف کیسا کھینچتے ہین ہم کو نباتی دنیا پر غور کرنا چاہیے - اِن کے نہایت ضروری حصے بہت ہی لطیف اور خوبصورت ہوتے ہین اور وہ تخم ہوتے ہین جن سے پودون کی نسل چلتی اور بڑھتی ہی اور اسی وجہ سے وہ پھولون یا کلیون مین رہتے ہین معلوم ہوتا ہی کہ قدرت نے اس مین اپنے اس ارادہ کو پوشیدہ رکھا ہی کہ ظاہر مین اُن کی سرسبزی اور شادابی مین سرور رہے اور ساتھ ہی اسکے اپنی بقا کا راز بھی اسی مین مضمر رکھے - اسی طرح ایک کسان یا باغبان یہی چاہتا ہی کہ ملک کو باغ بنا دے اور اسکے باغ کا ہر درخت پھلتا پھولتا رہے مگر اس کے دل مین صرف یہ ہی خیال ہوتا ہی کہ فصل اچھی ہو اور اسکے نفع مین اضافہ ہو -

یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہی کہ وہ معمولی چیزین مثلاً پہاڑون کی قدرتی سرسبزی اور شادابی آبشار، صحرا اور اسی قسم کے قدرتی مناظر جن کی نسبت ہمین معلوم ہوتا ہی کہ ان چیزون سے کوئی فائدہ نہین پہونچ سکتا مگر قدرت نے ان ہی چیزون مین ایک قسم کی ایسی دلربایانہ کشش پیدا کر دی ہی اور اس خصوص مین اِس احتیاط سے کام لیا ہی کہ یہی چیزین انسان کی طبیعت مین بشاشت اور خرمی پیدا کر دیتی ہین - وہ لوگ جنھین فلسفہ مین دخل ہی جب وہ یہ دیکھتے ہین کہ اگر کوئی چیز اپنے

اصلی خواص مین نظر آتی ہی تو اُس سے کوئی خوشی حاصل نہین ہوتی مگر جب وہ اس بات پر غور کرتے ہین تو اس خیال کو بہت بلند کر سکتے ہین مگر قدرت نے ان چیزون کو اپنی قوت کی دی ہوئی ہر چیز با مسة دل مین اُن کے ذائقہ، رنگ، آواز، خوشبو، سردی اور گرمی سے تخیلی ذوق پیدا ہو جاتا ہی اس سے قدرت کا سوا اس کے اور کیا مقصد ہو سکتا ہی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ حیثیت رکھنے والے آدمی کی طبیعت مین بھی ان چیزون کی خیالی صفات سے خوشگوار جذبات پیدا ہون۔ البتہ تمام دنیا اس قسم کی چیزون سے بھری پڑی ہی جن کے دیکھنے سے یا اُن کے تصور سے انسان کے دل مین خوشی خرمی اور شادابی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہین۔

دن اور رات کے تغیرات، موسمون کی تبدیلی اور اُس تبدیلی سے جو قدرتی انقلاب واقع ہوا کرتے ہین، انسان اپنے ذاتی خیالات سے ان پر توجہ کرکے اس نتیجہ پر پہونچ سکتا ہی کہ یہ سب باتین انسان کی طبیعت مین نئے بعد دیگرے کیسے کیسے مسرت کے خیالات پیدا کرتی رہتی ہین۔

مین یہان دلچسپی کے مصنوعی سامانون کا جو دلچسپی سے ملتا ہون سے، گفتگو سے اور زندگی کے اتفاقی مشاغل سے حاصل ہوتے رہتے ہین ذکر نہین کرون گا اس وجہ سے کہ مین یہان خوشی پیدا کرنے والے انھین اسباب کا ذکر کرنا چاہتا ہون جو ہر مرتبہ کے شخص کو میسر آ سکتے ہین تا کہ مین ان سے کافی وضاحت کے ساتھ ثابت کر سکون کہ قدرت نے دنیا مین انسان کو اس لیے پیدا نہین کیا ہی کہ وہ اپنی طبیعت مین اندرونی تپش دبائے ہوئے تشویش اور رنج مین رکھے یا اُس کی طبیعت ملول اور رنجیدہ رہے۔

ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنی طبیعت کو بُرائی کی طرف نہ جھکنے دے اور ساتھ ہی اُسکے دل مین پاکیزہ خیالات رکھے جن سے طبیعت مین اطمینان اور سکون پیدا ہو اور اُس کو اس قابل کر دے کہ اگر کسی مصیبت یا آفت مین بھی وہ اتفاقاً مبتلا ہو جائے تو اُس کو ہنسا ہنس بشاش رہ کر برداشت کر سکے۔ ان خیالات کی اصولی ترقی سے انسان کی طبیعت مین آسودگی، خرمی اور لازوال خوشی پیدا ہو جائیگی۔

پیشتر اسکے کہ مین ناظرین کو دنیا کی انتہائی خوبیون کی طرف متوجہ کرون مجھے اس بات کا اقرار ہی کہ دنیا مین بُرائیان بھی بہت سی ہین جو انھین اچھائیون سے جو ہمین میسر ہین قدرتی طور پر پیدا ہوتی رہتی ہین۔ اطمینان اور آسودگی سے زندگی بسر کرنے کے جن طریقون کو بیان کیا گیا ہی اگر انسان اُن پر اصول کا پابند ہو کر چلے تو یہ بُرائیان انسان کی طبیعت کو متاثر نہین کر سکتین۔ قدرت کے کامون مین

بھلائی اور برائی خوشی اور غم کے متعلق مسٹر لوک نے اپنے ایک مضمون مین جو قدرتی وجہ بیان کیے ہین وہ حسب ذیل ہین :-

"قطع نظر اور سب باتون کے ہم کو ایک دوسرا سبب یہ بھی ملتا ہو کہ خدا نے ان تمام چیزون مین جن کا ہمارے خیالات اور احساسات سے تعلق ہو خوشی اور غم کے نشیب و فراز کیون پیدا کر دیے ہین اور اُن کو ایک دوسرے مین کیون مخلوط کر دیا ہو؛ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہو کہ ہم ان تمام خوشیون کو جو ہمین دنیا مین حاصل ہوتی ہین؛ ناکافی، غیر تشفی بخش اور سچی خوشی سے معرا سمجھکر اللہ عز و جل سے لو لگائین جسکے پاس لازوال خوشیون کا انمول خزانہ ہو"

(ترجمہ) **محمد نجم الغنی قریشی** دار الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی

---

# مسلم لیگ

لیگ را گفتم کہ اے لیلاے اقلیم عدم
شہر خاموشان ز شور عشق تو بیدار باد
سر برآر از گنبد مدفن بپا کن فتنہ
گنبد گردان بعنبر بر پاے تو ہموار باد
باز می خواہی سر اسیدن بہ گلزار وجود
اے کہ تشریف تو از زان برگل در برخار باد
گفت بعث و نشر من موقوف روز حشر است
صبر بر فرقت نصیب عاشقان زار باد
تا قیامت بر مزار ما مراقب بودہ باش
ذاکر و شاغل بہ تکرار مناقب بودہ باش

**تپش** خورجوی

# روح نے بچا لیا

## تیسرا باب
## مارٹینز کے کمپ مین

اب دلسیون نے گھوڑون سے سامان اُتارنا اور اُنھین چرنے کے لیے ہنکانا شروع کر دیا۔ اور رسیون کے ساتھ ساتھ اُنھون نے وہ رسی بھی کھول ڈالی جس سے مین اپنے سامنے کی گٹھری کے ساتھ بندھا ہوا تھا اور وہ بھی جس سے میرے ٹخنے گھوڑے کے پیٹ سے کسے ہوے تھے۔ لیکن اُنھون نے وہ رسی نہین کھولی جس سے میری کلائیان بندھی ہوئی تھین۔ اُنھون نے مجھے دوسرے گٹھڑون مین معمولی طور سے ڈال دیا اور پھر میری طرف بہت ہی کم توجہ کی۔ شاید یہ میرے لیے اچھا تھا کیونکہ مین خیال کرتا ہون مین مشکل ہی سے اپنے پیرون پر کھڑا ہو سکتا تھا اور مین کچھ دیر وہین زمین پر بیٹھا رہنا پسند کرتا تھا۔ تاکہ مین اپنے چکراتے ہوے سر کو ذرا سنبھا لون اور اپنے کسے اور بھنچے ہوے پٹھون کو پھیلا لون۔

میرے والد اور جیرلڈ بھی اسی بے تیزی سے گھوڑون سے اُتار دیے گئے تھے لیکن میرے والد کے جو زمین پر بیٹھے ہوے تھے دونون طرف ایک ایک آدمی کھڑا تھا۔ اگرچہ ہماری کلائیان بندھی رکھنے کے علاوہ اُنھون نے اور کسی طرح ہمین جکڑ بند کرنے کی فکر نہین کی لیکن یہ ظاہر تھا کہ ہماری بڑی احتیاط سے نگرانی کی جا رہی تھی اور دلسیون کا ہماری طرف سے غافل ہونے یا ہمین اُنکے پاس سے کھسک جانے کا موقع دینے کا مطلق ارادہ نہ تھا۔ بایں ہمہ اُنھون نے میرے والد کو میرے پاس آنے سے نہین روکا۔ وہ میرے پاس آ کے میرے برابر بیٹھ گئے لیکن ان کے پہرہ دار بھی ان کے ساتھ ساتھ لگے چلے آئے۔ میرے والد نے اُن دلسیون سے جو سربرآوردہ نظر آتے تھے اپنی بہترین ہسپانوی زبان مین (جو مین مانتا ہون مشکل سے ہی سمجھ مین آتی ہو) پوچھا کہ ہمین اسطرح پکڑنے نے اور اس ہتک آمیز طریقہ پر ہم سے سلوک کرنے سے اُن کا کیا منشا ہے؟ دلسیون نے مطلق توجہ نہین کی۔ شاید یہ وجہ ہو کہ دراصل اُنھون نے کچھ نہ سمجھا۔ گو وہ معمولی طور سے یہ سمجھ گئے تھے کہ وہ کیا کہہ رہے تھے کیونکہ اُنھون نے

تھوڑی ہی دیر مین میلے کچیلے پونچوؤن کا ایک جوڑا ہم پر ڈال دیا۔ دنیا کے اس حصہ مین، دیسیون کا پونچو ایک کمبل ہوتا تھا جسکے بیچ مین ایک سوراخ ہوتا تھا جسمین سے مغرور پہننے والا اپنا سر باہر نکال لیتا تھا۔ لباس کے لحاظ سے یہ چیزین بالکل ناکافی تھین تاہم وہ نہونے کے مقابلہ مین بہت غنیمت تھین گو اس مین شک نہین کہ ہم نے ان کپڑون کی غلاظت پر ناک بھوئین بہتیری چڑھائین۔

میرے والد نے نزدیک ترین خیمہ مین جانے کا ارادہ ظاہر کیا تاکہ کسی مہذب شخص سے بات چیت کر سکین۔ لیکن دیسیون نے اس کی مطلق اجازت نہین دی اور انھون نے اپنا ارادہ کھلم کھلا ظاہر کر دیا کہ جس جگہ ہم بیٹھے تھے ہمین وہین رکھنے کے لیے وہ جبر و تشدد اختیار کرنے پر آمادہ تھے۔ اس لیے ہم یہ بات مان گئے کہ ہم اپنی جگہ پر ہی بیٹھے رہین اور واقعات کا انتظار کرین کیونکہ یہ بات روز روشن کی طرح عیان تھی کہ اُن کا ارادہ ہمین جان سے مار ڈالنے یا اور زیادہ دق کرنے کا نہ تھا اور یہ بھی ظاہر تھا کہ ابھی تک پڑاؤ بیدار نہ ہوا تھا کیونکہ سوائے چند سنتریون کے کوئی چہل پہل نہین رہا تھا۔

ہمارے نزدیک ترین خیمہ بڑا سا تھا جو اوروں سے الگ لگا ہوا تھا اور جنگل کے کنارہ پر زیادہ اونچائی پر تھا۔ مجھے یاد ہے کہ مجھے خیال آیا کہ ہمارے سامنے کا نظارہ اس جنگل کے چھوٹے تماشہ سے بہت کچھ مشابہ تھا جسمین ہماری جھونپڑی پڑی تھی۔ فرق یہ تھا کہ یہ بہت بڑا تھا۔ جنگل ہمارے پشت پر تھا اور جس بڑے خیمہ کا مین ذکر کر رہا ہون اُس کی طرف اُس کی پشت تھی بالکل اسی طرح جیسے ہماری جھونپڑی تھی۔ اُسکے سامنے نیچے کی طرف ایک چوڑا میدان تھا جسمین سپاہیون کے خیمے نصب تھے۔ اور دور تر مین مجھے ایک چشمہ کا چھلکتا ہوا پانی نظر آرہا تھا۔ یہ نتیجہ نکالنا کچھ مشکل نہ تھا کہ یہ خیمہ سپہ سالار یا جو کچھ بھی اُس فوج کے کمان والے کا عہدہ ہو اُس کا تھا کیونکہ ایک خاص سنتری اُس کے سامنے تھوڑی سی زمین پر گشت کر رہا تھا۔

چند لحظہ مین ایک لمبا دیسی پروں کا ایک شاندار گچھا لگائے نمودار ہوا جس کو مین نے فوراً پہچان لیا کہ گذشتہ رات یہ ہم پر حملہ کرنے والون مین شامل تھا جیسے ہی وہ نزدیک آتا گیا اور مین اُسے بغور دیکھ سکا، مجھے یہ محسوس ہوا کہ مین نے اُسے پہلے بھی دیکھا ہے گو اسوقت وہ معمولی دیسی لباس مین تھا مین نے اُسے جنگی نقش و نگار اور پرون مین گذشتہ رات نہ پہچانا تھا۔ شہر کی گلیون مین مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ شخص بڑے زور کا ہے لیکن اُس کی شہرت نہایت خراب ہے۔ یہ اُس ملک کے تمام دیسیون کا سردار

ہونے کا دعویٰ کرتا ہے وہ اپنے آپ کو انتی ناہول کہلاتا ہے جس کے معنی مجھے "سورج کا شیر" بتائے گئے ہین اور وہ اپنے آپ کو پیرو کے قدیم انکاس کی اولاد بتاتا تھا۔ میری معلومات کا یہ نتیجہ ہے کہ اُس کے دعوے کی کوئی بنیاد نہ تھی اور نہ پیرو کے دیسی اس بات کو مانتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مین نے پیرو مین اُس شخص کو دیکھا تھا جسے لوگ اسکی جایز اولاد مانتے تھے۔ اگرچہ میرے پاس اُن دونون حریفون کے دعاوی کا فیصلہ کرنے کا کوئی مسالحہ نہین ہے۔ مین کم از کم یہ کہہ سکتا ہون کہ وہ شخص شریف، شاندار اور شاہانہ معلوم ہوتا تھا اور اِس شخص کا چہرہ گو قوت کا اظہار کرتا تھا لیکن ظالمانہ بیرحمی اُس مین کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی تھی۔

مجھے انتی ناہول کے شناخت کرنے کا پورا پورا اطمینان نہین ہوا کیونکہ جو کچھ مین نے اُسکی بیرحمی کے متعلق سُنا اگر وہ اُس کا آدھا ہی ہوتا تو مجھے حیرت تھی کہ اُس کے ہاتھ مین پھنس جانے پر بھی ہم زندہ تھے۔ کچھ بھی ہو ہم تھے زندہ اور خیمے اِس بات کی شہادت دیتے تھے کہ اس بے رحم وحشی کے علاوہ ہمین کسی اور سے بھی بھگتنا ہے اِس لیے ہم حتی الامکان صبر و تحمل سے انتظار کرنے لگے۔ ہمارے محافظون اور دوسرے لوگون کے بار بار اس بڑے خیمہ پر نظر ڈالنے سے یہ قرین قیاس معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے لیے کسی کے برآمد ہونے کا انتظار ہے۔ شاید اِس فوج کے جرنیل کے جاگنے کا انتظار ہو۔

تھوڑی دیر مین آہستہ آہستہ پڑاؤ اپنی نیند سے بیدار ہوا۔ ہم نے درشت منظر سپاہیون کو مختلف خیمون سے باہر نکلتے اور باہم باتین کرتے دیکھا۔ ہمین یہ اُسی وقت نظر آ گیا کہ جس نظام تربیت کی توقع ہونی چاہیے تھی وہ اِس جگہ مفقود تھی۔ آدمیون کو کسی ڈھول یا بگل سے ایک دفعہ ہی نہ جگایا جاتا تھا بلکہ وہ جس وقت چاہتے اُٹھتے تھے۔ اُن مین سے کسی نے ہماری طرف نظر نہین کی اور نہ پہاڑی پر ہمین دیکھنے کوئی آدمی آیا جس سے ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ دیسیون کو اُن کے جنگی نقش و نگار مین دیکھنے کے پورے پورے عادی ہون گے ورنہ اس کا نظارہ دوغلے یا ہسپانوی باشندون کو معمولاً بہت زیادہ متوحش بنا دے۔

تھوڑی دیر مین ہم نے دیکھا کہ کچھ آدمی افسرون کے لباس مین ان مین شامل ہین اور کچھ ترتیب سی اُن مین ظاہر ہونے لگی۔ کچھ آدمی دریا کی طرف لدو لدون سمیت قطار مین جاتے نظر آئے۔ کچھ دیر بعد ایک شخص جو دیسیون کا سرگروہ معلوم ہوتا تھا ڈیرون مین گیا اور ہم نے اُسے ایک بڑے سردار سے

باتین کرتے دیکھا۔ کچھ دیر باتین کرنے کے بعد وہ پہاڑی پر اکٹھے چڑھنے لگے اور وہ اس خیمہ کے پاس پہونچ گئے جسے ہم نے سپہ سالار کا خیمہ تصور کیا تھا۔ سنتری سے جس نے اُنھین سلام کیا کچھ بہرے سے خفیہ لفظ ادا کرکے وہ سردار خیمہ کا پردہ اُٹھا کے اندر گیا۔

کچھ دیر بعد وہ ایک سبزی مائل زرد رنگت کے گٹے آدمی کے ہمراہ باہر نکلا۔ بظاہر وہ ابھی جگایا گیا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اُسے یہ بُرا معلوم ہورہا تھا وہ کرنیل کے لباس مین تھا جسے وہ نہایت بے پروائی اور بھوہڑپن سے پہنے تھا۔ باہر نکلتے ہوے وہ تلوار کرکے ارد گرد باندھ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ نمودار ہوا انتی ناہول جو میرے خیال مین اس عرصہ مین کمین پیچھے کی طرف تھا آگے بڑھا اور اُسکو ایک شاندار طریقہ سے سلام کیا جسکا اُس نے اُسی طرح جواب دیا۔

ہم نے دونون کو باتین کرتے دیکھا۔ اُن کے ہماری طرف بار بار دیکھنے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ہمارا ذکر کررہے ہین۔ ہمارے نزدیک ترین خیمہ کے اس حصہ مین اسوقت تک سپاہیون کا ہجوم اکٹھا ہوگیا تھا یہ ظاہر تھا کہ اُنھون نے یہ خیال کیا تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے والا ہے۔ لیکن اُن مین سے کوئی اُس خیمہ کے یا اُس گروہ کے جو اُس خیمہ کے آگے باتین کررہا تھا بہت قریب پہونچنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ جو سردار دیسی افسر کے ہمراہ بڑاؤ سے آگے تھا اُس نے اُن کی طرف مُڑ کے چلاکے کوئی حکم دیا جسکے سنتے ہی اُسکے آدمیون مین سے چار نکل کے اُس کی طرف لپکے اور چند ہدایتی الفاظ سن کے جلدی سے وہ ہماری طرف آئے اور اُنھون نے ہمین اُٹھنے اور اُن کے ہمراہ چلنے کا اشارہ کیا اُنھون نے کسی طرح درشتی سے ہمین ہاتھ نہین لگایا۔ لیکن اُن مین سے دو میرے والد کے ایک ایک طرف ہولیے تیسرے نے مجھے حراست مین لے لیا اور چوتھے نے ننھے جیرلڈ کو سنبھالا۔ اس طرح وہ ہمین اُس گٹے آدمی کے سامنے جو صریحاً اُس عجیب الہیئت بے نظام فوج کا سپہ سالار تھا چڑھاتے لے گئے۔

ہم یقیناً کچھ اچھی ہیئت مین نہ تھے۔ اپنے گندے پونچھون کے علاوہ ہم بالکل ننگے تھے اور کچھ صاف بھی نہ تھے کیونکہ اُن درختون کی شاخون نے جب ہم اُن کے بیچ مین سے بھاگم بھاگ سوار چلے آرہے تھے چوٹین اور رگڑین لگا لگاکے ہمین کھرونچون اور کھرنڈون سے ڈھک دیا تھا اُس لیے ہم نہایت کریہ المنظر ہورہے تھے۔ بایںہمہ جیسے ہی ہم سپہ سالار کے سامنے کھڑے کیے گئے میرے والد نے اس پر نہایت حقارت آمیز شکایات کی بوچھاڑ شروع کردی کہ کس طرح ہمارے ساتھ سلوک کیا گیا تھا اُنھون نے

دیسیون کو اپنے مزدوروں کے قتل کا ملزم قرار دیتے ہوے ان سب حصہ لینے والون کو برطانوی حکومت کیطرف سے انتقام سے ڈرایا۔

اُن کی ہسپانوی زبان جیسا کہ مین کہہ چکا ہون، صریحاً ناقص تھی۔ اُن کے غیظ و غضب کا اثر اس بات سے بہت کچھ گھٹ گیا کہ جس جس مقام پر وہ بہت زیادہ آپے سے باہر ہوجاتے تھے وہ لفظ کے لقمہ کے لیے عموماً میری طرف مُڑکے دیکھنے لگتے تھے۔ کیونکہ واقعہ یہ ہی کہ حبشیون اور دیسی ملازمون مین برابر بھاگ دوڑ کرتے رہنے سے مین اُن کے مقابلہ مین ملک کی زبان کو زیادہ جانتا تھا۔ اِس پستہ قد سپہ سالار نے اس لعنت ملامت کو آخر تک سُنا اور اُس نے مین مانتا ہون قابل تعریف لحاظ و احترام سے جواب دینا شروع کیا۔ اُس نے اُس حادثہ پر جو ہمین پیش آیا سخت افسوس کا اظہار کرکے یقین دلایا کہ یہ محض غلطی کا نتیجہ تھا۔

میرے والد نے گرج کے کہا غلطی! تو یہ ایسی غلطی ہی جسکے لیے کسی نہ کسی کو سخت خمیازہ اُٹھانا پڑیگا۔ شاید تمنے یہ محسوس نہین کیا کہ آدمیون کی ایک بڑی تعداد قتل ہوگئی ہی جو ستر اسی آدمی ہونگے۔

چھوٹے سپہ سالار نے اپنے کندھے چڑھاے اور اپنے ہاتھ آگے کو پھیلاے اور ہمین یقین دلایا کہ اپنے دیسی دوستون کے اِس وحشیانہ جوش پر اُس سے زیادہ اور کسی کو رنج نہ ہوگا۔ لیکن لڑائی مین ایسی چھوٹی غلطیان وقتاً فوقتاً ہوا ہی کرتی ہین۔ اور کچھ بھی ہو یہ سب کچھ ہوچکا اور وہ اب پلٹ نہین سکتا۔

میرے والد زیادہ متنفر ہوجاتے تھے۔ لیکن اُنھون نے دیکھا کہ یہ معاوضہ یا بدلہ کے سوال کا موقع نہین ہی اِس لیے اُنھون نے اُن سے مطالبہ کرنا شروع کیا کہ ہمین فوراً آزاد کردیا جاے اور ہمارے کپڑے واپس کردیے جائین کیونکہ مین برطانوی رعایا ہون اور اسطرح سلوک کیا جانا پسند نہین کرتا۔

چھوٹے سپہ سالار نے صبر و تحمل سے جو واقعی اُس کے لیے جس قسم کا وہ آدمی تھا حیرت انگیز تھا جواب دیا کہ یہی کیا جاے گا۔ لیکن ایک چھوٹی سی رسم ہی جو دیسے کچھ بھی نہین ہی۔ ہمین پہلے وہ ادا کرنی ہوگی۔ اُس نے کہا کہ مین نے اکثر انگریزون کا ذکر سُنا ہی اور اُن کی حیرت انگیز بہادری کی عجیب و غریب کہانیان سنی ہین۔ جہان مجھے اس بات کا سخت غم و قلق ہی کہ میرے دیسی رفیقون نے تمھین ہسپانوی سمجھنے کی حماقت آمیز غلطی کی اور تمھین اِس تاسف انگیز تکلیف مین مبتلا کیا وہان یہ میری خوش قسمتی ہی جو تم لوگون کو میرے پاس لے آئی تاکہ تم میری تدابیر عمل مین لانے مین میرے مددگار رہو۔

اُس نے سنجیدگی سے میرے والد کو اپنی چار پلٹنون مین سے ایک کی سپہ سالاری اس شرط پر پیش کی کہ ہم اُس سے ملجائین اور اُسکے ساتھ وفادار رہنے کا حلف اُٹھالین۔ اُس نے ہمین بتایا کہ مین جنرل مارٹینز ہون اور جس ناقابل برداشت بیرحمی اور ہسپانوی میرے اور میری قوم کے ساتھ سلوک

کر رہے ہین اُس نے مجھے اُٹھنے اور ان کا جوا کندھے سے اُتار پھینکنے پر مجبور کر دیا ہو۔ اور جب واقعی ہم آزاد ہو جائین گے تو مین خود اُس جنگی جمہوریت کا جو مین قائم کرون گا صدر یا حاکم ہون گا۔ لیکن آپ یقین کیجیے کہ اس مدد کے عوض جو آپ مجھے دین گے مین آپ کو اپنی اس آیندہ سلطنت مین بڑا عہدہ دون گا۔

اس کے اس سکون آمیز تیقن نے ہمین اپنے ان حالات مین بڑا لطف دیا لیکن اس بات نے میرے والد کو اور بھڑکا دیا۔ اُنھون نے اپنی ٹوٹی پھوٹی ہسپانوی کے باوجود اپنے جواب کا لب لباب نہایت واضح طور پر پیش کر دیا۔ اُنھون نے ظاہر کیا کہ ایک غیر ملکی ہونے کی وجہ سے ملک کی مقامی پیچیدگیوں سے اُن کا کچھ تعلق نہین اور اُنھون نے کسی طرف سے کسی کے شریک کار ہونے سے قطعی انکار کر دیا اور نہ وہ اُس شخص کی وفاداری کا حلف کسی حالت مین اُٹھا سکتے ہین جو اس ملک کی جائز حکومت کا باغی ہو۔ مجھے نظر آیا کہ چھوٹا سپہ سالار قطعی بگڑتا جا رہا ہو۔ اُس کا ہاتھ اندیشہ ناک طور سے بار بار تلوار کے قبضہ پر پڑتا تھا۔ بایں ہمہ اُس نے اپنی طبیعت پر حیرت انگیز طور پر جبر کیا۔ اُس نے میرے والد کو سمجھایا کہ اسمین تمھین پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا کوئی اختیار نہین ہو۔ اُس نے کہا کہ اس اصرار کرنے پر مجھے خود افسوس ہوتا ہو لیکن کیا کرون۔ مین اپنے دشمنون پر پیچھے سے جا پڑنا چاہتا ہون۔ مین اُن کے تعاقب سے کترا کے اُن کو بے معلوم اس سے کہین شمال مین جہان اُنھین میری فوجون کا گمان ہو اپنی فوجین لے آیا ہون اور اب میرا ارادہ اس شہر پر جو تمھاری ریل کا آخری اسٹیشن ہو ایک اچانک ضرب لگانے کا ہو۔ مین اندرون ملک سے اس سمت مین حملہ آور ہونا چاہتا ہون جہان کسی قسم کا کوئی استحکام نہین ہو۔ مین ان پر بالکل اچانک جا پڑون گا۔ اب چونکہ اتفاق وقت سے جسکا مجھ سے زیادہ کسی اور کو افسوس نہو گا تم لوگون کو میری خفیہ تدابیر معلوم ہو گئی ہین جو دنیا مین کسی زندہ آدمی کو معلوم نہ ہونی چاہییے تھین۔ اس لیے (اس نے پھر اپنے کندھون کو چڑھایا اور اپنے ہاتھ پھیلاسے) گو مین آپ کی آزادی مین اس بظاہر خلل پڑنے سے سخت افسردہ اور رنجیدہ و غمگین ہون، مین آپ لوگون کو اگر آپ میرے ساتھ ملجانے سے انکار کرین فوراً قتل کر دینے پر مجبور ہون۔

اس وقت تک میرے والد حقارت سے انکار کرتے رہے اور بار بار یہ کہتے رہے کہ بحیثیت ایک انگریز ہونے کے ان معاملات مین مجھے حصہ لینے سے انکار ہو۔ چھوٹے سپہ سالار کا صبر و تحمل اب جواب دیتا جا رہا تھا۔ آخر وہ بہت تیزی سے فیصلہ کن آواز مین بولا حضرت! اب مین زیادہ وقت

ضائع نہیں کر سکتا۔ تم ایک بات پسند کر لو۔ یا تو تم مجھ سے وفاداری کا حلف ہمارے انداز و قاعدہ سے اُٹھاؤ یا تم ایک گھنٹے کے اندر اندر مرنا پسند کرو۔

پھر وہ اپنے افسر کی طرف مڑا اور اُسے اُسکے خیمے سے حلف اُٹھانے کا ضروری سامان لانے کا حکم دیا۔ وہ ویسا ہی فوراً وہاں سے ایک چھوٹی سی میز، ایک بڑی کتاب، ایک دوات اور ایک قلم لے آئے اور اُسی وقت وہ افسر ایک بڑی منقش چوبی صلیب جو صریحاً کسی گرجا سے چُرائی ہوئی تھی لے آیا اور اُسے ہمارے آگے زمین پر پٹک دیا۔

اس چھوٹی سی چیز کی موجودگی کی وجہ موجبہ بیان کرنے کی غرض سے مجھے اس خوفناک پستہ قد شخص کی عجیب و غریب خصلتوں میں سے ایک بتانی پڑے گی۔ اپنے آدمیوں کے آگے اُس نے جو کچھ بھی مانا عقلمندی خیال کی ہو وہ اس بات کو بخوبی جانتا تھا کہ سفید چمڑے کے آدمیوں کو سمندر میں ڈھکیل دینے کا کام کوئی معمولی بات نہ تھی اور وہ اس مقصد کے حاصل کرنے کی امید اس صورت میں کر سکتا تھا کہ وہ اپنے پیرووں کی محدود تعداد میں سے ہر ایک کی نہایت گرم جوش وفاداری قائم رکھے۔ علاوہ ازیں وہ اپنے پیرووں کو بخوبی جانتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ توہم پرستی اُنکی گھٹی میں پڑی ہے۔ وہ رومن کیتھلک عقیدہ کے کاہنوں کی اس زبردست گرفت سے بھی کامل طور سے واقف تھا جو انھیں اس نیم مہذب ملک میں اپنے گلّہ کے افراد پر حاصل تھی۔

عیسائیت جس شکل میں جنوبی امریکہ میں اندنوں پھیلی ہوئی تھی اتنی مکروہ اور ذلیل تھی کہ اس کی مثال روئے زمین پر اور کہیں نہیں مل سکتی تھی۔ لیکن اس سے اس معاملہ میں کوئی فرق نہ آتا تھا کہ درحقیقت ملک پر ان کاہنوں کی حکومت تھی۔ اور اُن کا الو کسی نہ کسی طرح ہمیشہ سیدھا ہو جاتا تھا۔ اُسے اس کا بھی کافی علم تھا کہ گرجے کا رسوخ اُس کے خلاف تھا۔ اتنا اس وجہ سے نہیں کہ وہ مشہور بدمعاش تھا جتنا اس وجہ سے تھا کہ کاہن لوگ صورت حالات سے نہایت مطمئن تھے اور وہ اُس حکومت میں کسی قسم کا خلل پسند نہ کرتے تھے جو تمام و کمال اُن کی مٹھی میں تھی۔

اس مذہبی رسوخ کو توڑنے کے لیے اُس نے ایک تدبیر سوچی تھی جسمیں کوئی خوبی تو نہ تھی لیکن دلیرانہ اور عیارانہ ضرور تھی۔ اُس نے حیرت انگیز کفر و لامذہبی سے بادشاہ بنوکدنضر کے مشہور اعلان کی نقل کی تھی اور وہ اپنے ہر ایک ساتھی سے پختہ قسم لیتا تھا کہ جب تک لڑائی ختم ہو اور ملک اُن کے ہاتھ میں آجائے وہ کسی

پادری سے بات نہ کریں گے، کسی عبادت گاہ میں داخل نہوں گے اور سوائے اس کے خدا یا انسان سے کوئی درخواست نہ کریں گے۔ ہر شخص کو یہ حلف خود مارٹینز کی موجودگی میں اُٹھانا پڑتا تھا اور اُس کے آبائی مذہب کے عارضی ترک کرنے کی علامت کے طور پر ہر ایک سے صلیب پر پاؤں رکھوایا جاتا تھا۔ اس مخلوط گروہ کے ہر ایک فرد نے یہ رسم ادا کی تھی اور اب مارٹینز یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ ہم بھی ایسا ہی کریں۔

مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس قسم کی کوئی حرکت کرنے کا ہمارا مطلق ارادہ نہ تھا۔ ہم انگریزی کلیسا کے پیرو تھے۔ پاپائے روم کے مقلد نہ تھے۔ باین ہمہ میری والدہ ڈاکٹر پوسی کی پکی مرید تھیں جن سے وہ بخوبی واقف تھیں۔ میں بھی عادۃً ایک چھوٹی سی آبنوسی نقرئی صلیب اپنے گلے میں کپڑوں کے نیچے ڈالے رہتا تھا۔ یہی ایک چیز تھی جو ڈاکوؤں نے میرے جسم پر چھوڑی تھی کیونکہ میرے خیال میں انھوں نے اُسے عیسائیوں کا ساحرانہ نشان سمجھا اور شاید اس کی طاقت سے ڈر گئے۔ اس لیے آپ خیال کر سکتے ہیں کہ ہم نے اس جرنیل کی اس ناپاک تجویز کو کس خوف و دہشت سے دیکھا ہوگا۔ گو میرے خیال میں اسمیں کسی شک کی گنجائش نہ تھی کہ اگر اس معاملہ میں صلیب کا بھی واسطہ نہوتا تو بھی ہم زبردستی ایسے کام میں شریک ہونے پر مجبور نہیں کیے جا سکتے تھے جس سے ہمیں کسی قسم کی ہمدردی نہ تھی۔

مارٹینز نے میرے والد کے حقارت آمیز گو خلاف قواعد زبان انکاروں اور حجتوں کی ذرا پروا نہ کی بلکہ خشک مزاجی سے صلیب پر پاؤں رکھنے اور مقررہ قسم کھانے کا حکم دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ خیال میرے دل میں گذر رہا تھا کہ دیکھیے اب میرے والد کیا کرتے ہیں؟ کیونکہ اس بات کا امکان خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ وہ ایسے باجیانہ مطالبہ کی تعمیل کرنے پر آمادہ ہو جائینگے۔ لیکن اُنھوں نے جو کچھ کیا اُس کے لیے بھی میں ایسا ہی نا طیار تھا جیسے وہ لوگ جو وہاں موجود تھے۔ یہ یاد رکھیے کہ اس تمام قیل و قال میں اُنھوں نے ان رسیوں کو ذرا بھی ڈھیلا نہ کیا تھا جن سے ہماری مشکیں بندھی ہوئی تھیں اس لیے آپ میری اُس پُر دہشت حیرت کا اندازہ لگا سکتے ہیں جس سے میں نے اپنے والد کو دیکھا کہ وہ ایک قدم آگے بڑھے۔ گویا وہ صلیب پر پاؤں رکھنے والے ہیں اچانک گویا ایک جادو تھا اُنھوں نے اپنے ہاتھ چھڑا اے اور اس گٹے سپہ سالار کے منہ پر اس زور سے گھونسہ مارا کہ وہ فوراً چاروں شانوں چت گر پڑا۔ پھر وہ اُس کے پچھڑے ہوئے جسم کے اوپر سے پھلانگ کے اُس کے بیٹھ پیچھے کے جنگل میں غائب ہو گئے۔

یہ سارا معاملہ ایسا اچانک ایسا چونکا دینے والا اور ایسا مزے دار رہا کہ اُس وقت سکے خوف و خطر

کے باوجود مین زور وشور سے قہقہہ لگانے لگا اور ننھے جیرلڈ نے اس مین میرا ساتھ دیا۔ چند لمحون کے لیے ایک ابتری سی پھیل گئی۔ افسر لوگ اپنے نیم بیہوش سپہ سالار کو اُٹھانے کے لیے لپکے اور اُس کے بیٹھنے کے لیے ایک تپائی اُٹھا لائے۔ پیچھے پڑاؤ کے آدمی حیرت سے چیخ اُٹھے اور گو مین یہ یقین سے نہین کہہ سکتا لیکن مجھے اس کا بہت بڑا شک ہے کہ میرے قہقہہ کا ان مین سے بعض نے ساتھ دیا تھا۔

چند لمحے جو مارٹینز کے ہوش آنے مین لگے۔ کسی کو بھی اتنا خیال نہ آیا کہ وہ کرے تو کیا کرے۔ غالباً اس سپہ سالار کا نائب موجود نہ تھا۔ کچھ بھی ہو اس وقت ہوا کچھ نہین مین سمجھتا ہون کہ سپہ سالار کے خوب پانی پینے اور اُلٹے ہوے سانس کو قائم کرنے اور بیدمی کی حالت مین بُرا بھلا کہنے کے بعد کوئی پانچ منٹ اور بیتے ہون گے جب وہ اس قابل ہوا کہ کچھ بول سکے۔

جب اُس مین طاقت گویائی آئی تو اس کی زبان کچھ شائستہ نہ تھی۔ اُس کا چہرہ قرمزی ہو گیا اور غصہ کے مارے اُس کا سانس پھولا جاتا تھا۔ وہ کھنچتا ان کے کھڑا ہوا گو شروع مین وہ میز پر اپنا ہاتھ ٹیک کے کھڑا ہوا تھا۔ اُس نے اپنی تلوار سونت لی جیسے اُس نے ہوا مین جھکایا اور جو نظرین اُس نے اپنے افسرون پر ڈالین اُن سے ایسی وحشت برستی تھی کہ واقعی یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس تلوار کو استعمال کرے گا۔

اُس نے چلا کے کہا۔ وہ بدمعاش کہان گیا؟

افسرون نے دم بخود ایک دوسرے کا منہ تکنا شروع کیا کیونکہ مین سچ کہتا ہون اُس وقت تک کسی کو بھی اس مفرور کے تعاقب کرنے کا خیال نہ آیا تھا۔ مارٹینز بالکل ہی آپے سے باہر ہو گیا۔ وہ دہاڑ کے بولا این! کیا تم نے اُسے جانے دیا۔ نامردو! نالائقو! فوراً اس کا پیچھا کرو۔ . . فوراً مین کہتا ہون! میری ہتک کی گئی ہے! مین ضرور اُس کا خون لون گا۔ جلد جلد تعاقب کے کچھ انتظام کیے گئے۔ سپاہیون کے ایک یا دو گروہ جلدی سے درست کر کے جنگل کی خاک چھاننے کے لیے بھیج دیے گئے۔ اُن کے جاتے ہی مارٹینز نے اپنا غصہ مجھ پر اُتارنا شروع کیا۔ اُسکے منھ مین کف بھرے ہوے معلوم ہوتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس پر کوئی بھوت سوار ہو گیا ہے۔ اُسکے الفاظ اُس کے دانتون کے بیچ مین سنسناتے تھے گویا وہ جسمانی طور سے ابھی پھٹ جائے گا۔ اُس نے کہا۔ بدمعاش کے بچے! ایک گھنٹہ کے اندر تو اپنے بدذات باپ کو اس درخت پر لٹکا دیکھے گا!

مین نے ہنس کے کہا — مین مانتا ہون میری یہ ہنسی عقل کی بات نہ تھی۔ کہ تم پہلے اُنھین پکڑ تو لو۔ لیکن مین اپنے والد کے بچ نکلنے پر اس قدر خوش تھا کہ مجھے ہنسی کے جا و بیجا ہونے کا مطلق خیال نہین آیا۔ مجھے اس کا بھی کچھ خیال نہین آیا کہ اگر وہ بچ نکلے ہین تو مین یقیناً نہین نکل سکا۔

اُس نے کف اُڑاتے ہوے کہا او بیحیا مُنھ زور کتے کے بچے! (حقیقت یہ ہے کہ جو محاورہ اُس نے استعمال کیا مین اُس کا ترجمہ نہین کر سکتا۔ وہ اس سے بھی بُرا تھا) کم از کم تجھے تو حلف اُٹھانا ہی پڑے گا بہتر ہے کہ ایسا ابھی کر ورنہ سمجھ لے کہ مین تیری جیتے کی کھال کھینچ لون گا۔

مجھے پھر ہنسی آ گئی۔ یہ میری بے تمیزی تھی۔ لیکن بات یہ ہے کہ وہ اپنے بے بسی کے غصہ مین کچھ بہت ہی مضحکہ انگیز نظر آتا تھا۔ ایسی حالت مین کہ جہان آنکھون کے بیچ مین میرے والد نے اُسکے تان کے مکہ رسید کیا تھا وہان ایک گومڑا اُبھرتا آ رہا تھا

مین نے کہا۔ مین ایسا کام بالکل نہین کرون گا۔ اگر تم نے مجھے ہاتھ بھی لگایا تو یاد رکھو میرے والد آ کے تم کو اس کا مزا چکھا دین گے۔

اُس نے اپنی تلوار کو آدھا اُٹھایا ایک لمحہ کے لیے بہت قریب معلوم ہوتا تھا کہ میری زندگی، بس ختم ہوا چاہتی ہے۔ لیکن کسی طرح اُس نے اپنی طبیعت پر جبر کیا اور اُس کی ایک قابل کار آنکھ مین (دوسری مکہ کے اثر سے بند ہوتی چلی جا رہی تھی) یاجیانہ چمک پیدا ہوئی۔ اُس نے مُڑ کے انتی ناہول کو پکارا۔

اُس نے کہا شائد تمھارے آدمی اس اُلّو کے پٹھے کو ہموار کر سکین۔ کیون ایسا ہو سکے گا؟

حقارت آمیز سی مسکراہٹ انتی ناہول کے چہرہ پر گذر گئی کہ شائد وہ ایسا کر سکین۔ اُس نے اپنے آدمیون کو اشارہ کیا جنھون نے آ کے مجھے گھسیٹنا شروع کیا۔ مارٹنیز نے اُس سے اور کچھ نہین کہا بلکہ وہ میرے ننھے بھائی جیرلڈ کی طرف متوجہ ہوا۔

اے شیطان کے بچے! تو تو کم از کم اپنا پانون اس صلیب پر رکھ کے جو کچھ مین تجھے کہون کہتا رہے گا۔ جیسے لوگ مجھے کھینچے لیے جا رہے تھے مین نے جیرلڈ سے چلا کے کہا۔ جیرلڈ۔ ایسا ہرگز نہ کرنا۔ اگنیس ولی کو یاد رکھنا۔

گھر سے روانہ ہونے سے کچھ عرصہ پہلے ہماری والدہ نے ہمین ایک رومی تیرہ سالہ کنواری کنیز لاکا

قصہ سنایا تھا جو اپنے ضمیر کے خلاف قربانی کی کوئی رسم ادا کرنے کے مقابلہ مین اپنے مذہب پر خود قربان ہوگئی۔ یا شاید اُس نے ایک ایسے شخص سے جسے وہ بُت پرست کہتی تھی منسوب ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اتنے زمانہ کے بعد مین ٹھیک نہین بتا سکتا کہ کیا بات تھی۔ لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ قصہ ہم نے تازہ سُنا تھا اور ہم دونون نے اس چھوٹی لڑکی کی دلیری کی بڑی تعریف کی تھی۔

مین نے زور لگا کے اپنے آپ کو اتنا ڈھیلا کر لیا تھا کہ مُڑ کے دیکھ سکون کہ اس ننھے بچے نے کیا کیا۔ اُس نے مارٹینز کے تند چہرہ پر بہادری سے نظرین گاڑ کے اپنے صاف طفلانہ تیز لہجے مین کہا مین ایسا نہین کر سکتا۔ تو بڑا بدمعاش ہے۔

اِس کے بعد کیا ہوا مین کہنا نہین چاہتا۔ گو اب مین حقیقت تہ دل سے یہی یقین کرتا ہون کہ یہ جنون کا نتیجہ تھا۔ مارٹینز نے اُس کے سر پہ تلوار گھمائی اور جیسے وہ کھڑا اُس کی طرف دیکھ رہا تھا اُس کو کاٹ کے زمین پر گرا دیا۔ جب اُس نے اس ننھے جسم کو اپنے سامنے پڑا دیکھا میرا خیال ہے کہ وہ بھی نادم ہوا۔ کیونکہ اُس نے اپنی تلوار پھینک دی اور ایک طرف کو کچھ بڑبڑاتا ہوا گویا اُس کا ارادہ ایسا کرنے کا نہ تھا مڑ گیا۔ اُسکے افسرون کے جو قسی القلب بدمعاش تھے چہرون پر بھی کچھ نفرت سی ظاہر ہوئی جیسے ہی مارٹینز لپک کے اپنے خیمہ مین گیا وہ بھی سب وہان سے ہٹ گئے۔

اُس کا مرنا میرے لیے جو اُس چھوٹے بھائی کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا کیا چیز تھا میرے لیے اس کا بتانا محال ہے۔ جو کچھ مجھ سے ظاہر ہوا اُس کو مین جائز نہین قرار دے سکتا۔ مین آپ کو اتنا بتا سکتا ہون کہ غم و غصہ سے مین بھی نیم دیوانہ ہوگیا۔ گو مین ان بیرحم وحشیون کے ہاتھون مین اسیر تھا اور بظاہر حالات مجھے اگلا روز بھی دیکھنا ممکن نہ تھا۔ لیکن مین نے بھڑکتی ہوئی نفرت کے زبردست جوش و خروش مین سنجیدہ قسم کھائی کہ جب تک مین اپنے بھائی کی موت کے انتقام مین مارٹینز کو نہ مار لون گا اُس کا پیچھا نہ چھوڑون گا۔ فی الواقع مین غلطی پر تھا لیکن مین نادان لڑکا تھا اور طیش بہت زبردست تھا۔

اِس اثنا مین مجھے اپنی ہی فکر دامن گیر ہوگئی۔ دیسی مجھے دھکیلکا کشتی سے جنگل کے کنارہ پر لے گئے اور تھوڑی سی جستجو کے بعد اُنھین جس جزیرہ کی تلاش تھی دستیاب ہوگئی ——— دو نوعمر اور جھکدار درخت جو ایک دوسرے سے چند ہی گز کے فاصلہ پر اُگے ہوے تھے چار یا پانچ نے اپنے آپ کو

ہر ایک درخت پر ڈال کے اپنے مجموعی بوجھ اور طاقت سے اُن کی چوٹیون کو جھکا ڈالا حتی کہ وہ تقریباً باہم مل گئین۔ اس کے بعد اُنھون نے مجھے ان دونون چوٹیون کے بیچ مین باندھنا شروع کیا۔ سیدھی بانہہ اور ٹانگ ایک سے اور اُلٹی بانہہ اور ٹانگ دوسرے سے۔ جب وہ اپنے اطمینان کے مطابق باندھ چکے اُنھون نے درختون کو چھوڑ دیا جو جہان تک اُن سے ہوسکا فوراً اوپر کو اُٹھ گئے اور مجھے اپنے درمیان مین لٹکا لیا۔ زمانۂ وسطیٰ کے محکمۂ احتساب کے شکنجہ کا یہ کیا خوب البیلانہ جدت آمیز جنگلی قائم مقام تھا۔

اس حالت مین ایسی اعضا شکن کھینچا تانی مین گھنٹون لٹکے رہنا ایسا ماجرا ہی جسکے بیان کرنے کی مین کوشش کرنا بھی پسند نہین کرتا۔ نہ مجھے اس کی تفصیل بتلانے کی ضرورت ہی کہ جب مین ہوا مین معلق کسی نادیدنی صلیب پر لٹک رہا تھا وہ کس طرح پیچ کھڑے مُنھ پر آوازے کس رہے تھے؛ وہ مُنھ چڑا رہے تھے اور میرے دکھتے جسم پر کس طرح ٹوٹی ہوئی ہانڈیون کے ٹکڑے مار رہے تھے یا گھٹے بیلدار درختون کی لمبی لمبی ٹہنیون سے جو اُنھون نے پاس کے درختون سے توڑ لی تھین شپے سے کس طرح زد و کوب کر رہے تھے۔ مین آپ کے جذبات کو ان نامعلوم الاسم اور ناقابل بیان عذابون کے ذکر سے جو اُنھون نے اس تمام اُجاٹ دن مین مجھ پر توڑے ٹھیس پہونچانا نہین چاہتا۔ لیکن مین اتنا تو بتا سکتا ہون کہ سارے دن جو کچھ بھی سخت سے سخت مصیبتین اُنھون نے مجھے پہونچائین سب سے غالب ایک جذبہ میرے دل و دماغ مین لحظہ لحظہ زیادہ سوزش پیدا کر رہا تھا۔ یعنی مارٹیمر سے سخت ترین نفرت اور اپنے بھائی کی موت کا اُس سے انتقام لینے کا ارادہ۔ مین اس ادھیڑبن مین اسقدر محو تھا کہ مجھے یقین ہی کہ مین نے زیادہ تر اُن کے ان متواتر سوالات کا کہ کیا اب بھی مین مطلوبہ قسم کھانے کو تیار ہون۔ کچھ جواب نہین دیا لیکن یہ جانتا ہون کہ بعض اوقات مین اُن کا جواب اُن کی جانون پر لعنت بھیجنے اور اُن کو سخت ترین پاداش مین مبتلا ہونے سے ڈرانے کی صورت مین دیتا تھا۔ اس پر پردہ ڈال دینا ہی بہتر ہی۔ اتنا مین ضرور کہون گا کہ اُن کی جدت طرازی البیلانہ تھی اور اُن کے وسائل غیر محدود معلوم ہوتے تھے۔

مین سمجھتا ہون کہ وہ آخرکار مجھ سے تنگ آگئے کیونکہ مین نے اُن کا کہا ماننے کی کوئی علامت ظاہر نہین کی اور اب اُنھون نے محسوس کیا کہ اُن کو معاملہ رو براہ لانے کے لیے انجام پر پہونچانے کی کوئی تدبیر کرنی چاہیے۔ چنانچہ اُنھون نے ایک رسی کو میرے کندھون کے نیچے سے نکال کے مجھے ایک درخت کے تنے سے لٹکا دیا اور میرے پانؤن کے نیچے آگ جلانا شروع کر دی۔ تھوڑی ہی دیر مین میرے

پانوں بُری طرح جل گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی گرم ہوا اور دھوئیں نے مجھے ادھ موا کر دیا اور ظاہر ہے کہ میں بیہوش ہوگیا ہوں گا۔ میرا خیال ہے کہ اس سے وہ گھبرا گئے کیونکہ اُن کو میرے مار ڈالنے کا حکم نہ تھا اس لیے اس رات وہ اپنے بیرحم کام سے باز رہے۔ لیکن اس کا حال مجھے بالکل معلوم نہیں۔

## چوتھا باب

### فرار

مجھے آہستہ آہستہ اور پراگندہ طور سے ہوش آیا۔ مجھے ہمہ گیر درد و کرب کا عجیب اور خوفناک احساس آنا شروع ہوا۔ معلوم ہوتا تھا کہ تمام دنیا اس سے لبریز ہے۔ رفتہ رفتہ سخت تکلیف کی دنیا گھٹنے لگی اور ٹھیک اور مستقل صورت پر آگئی یہاں تک کہ بالآخر مجھے اپنے متعلق محسوس ہونے لگا کہ میں عالم اجسام میں جیتا جاگتا چھوٹا سا لڑکا ہوں اور شدید تکلیف میں مبتلا ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو جنگل کے عین کنارہ پر جو مارٹینر کے خیمہ سے کچھ دور نہ تھا ایک درخت کے ساتھ ایک رسی سے جسکے میرے اور درخت کے گرد کئی بل پڑے ہوئے تھے بندھا ہوا پایا جو بطور خود میرے لیے ایک سہارے کا کام دے رہی تھی جسکے بغیر میں ضرور گر پڑتا کیونکہ میرے پانوں کے تلوے اس بُری طرح جلے تھے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی میرا اُن پر کھڑا ہونا قطعی ناممکن تھا۔

اُس وقت رات تھی اور پڑاؤ میرے سامنے بالکل سنسان پڑا تھا۔ البتہ ادھر اُدھر گشت کرنیوالے سنتریوں کی آہٹ آتی تھی۔ ان میں سے دو مجھ سے کچھ دور نہ تھے۔ ایک تو سپہ سالار کے خیمہ کے آگے ٹہل رہا تھا اور دوسرا خیموں کی قریب ترین قطار کے ذرا باہر ایک خاص حصہ پر ذرا لمبی گشت لگا رہا تھا۔ خاص طور سے میری کوئی نگرانی نہیں کر رہا تھا۔ حقیقت میں یہ بالکل غیر ضروری بات تھی کیونکہ میں سخت خوب کسا ہوا تھا۔ بلکہ اگر میں کھلا بھی ہوتا تو ایک گز بھی ہل نہیں سکتا تھا۔

جیسا کہ آسانی سے خیال کیا جا سکتا ہے میرے خیالات نہایت غمگیں تھے۔ میرا بھائی میری آنکھوں کے سامنے قتل ہوا تھا۔ میرے والد ایک ایسے لق و دق جنگل میں مفرور تھے جس کی نسبت میں جانتا تھا کہ وحشی حیوانوں سے بھرا ہوا ہے اور اسکے علاوہ اُن کا تعاقب جان توڑ کے ایسے لوگ کر رہے ہیں جو رحم کا نام بھی نہیں جانتے۔ یعنی موت کے سوا اور کوئی توقع ہو ہی نہیں سکتی تھی اور موت بھی وہ جو نہایت وحشت انگیز اور دردناک ہو۔ اس لیے شاید مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں کہ

کچھ عرصہ کے لیے مین بالکل مایوس ہوگیا اور رہ رہ کے ایک تمنا ستانے لگی کہ اسی وقت موت آکے میری مصیبتون کا خاتمہ کر دے۔ حالات ہر طرح ایسے خراب تھے کہ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ ان سے زیادہ اور خراب نہین ہو سکتے مین درحقیقت موت کی دعا مانگ رہا تھا کہ اب مجھ مین مزید برداشت کی تاب نہین۔

لیکن مین اُس سخت کمزوری اور مایوسی کے وقت مجھے کچھ چیز نظر آئی جس نے اُس لحظہ کے لیے وہ جانکنی کی کیفیت بھی میرے دل سے بھلا دی۔ کیونکہ وہان ٹھیک میرے آگے میرا بھائی جیرلڈ کھڑا تھا جسے مین نے چند ہی گھنٹے پہلے مارٹینز کی تلوار سے قتل ہوتے دیکھا تھا! حقیقتہً اس بے رحم وار کا نشان اب بھی اسکے سر پر آر پار موجود تھا —— ایک بڑا کریہہ زخم تھا جس نے کھوپری کو چیر کے الگ کر دیا تھا اس پر بھی وہ کچھ دہشت ناک نہ معلوم ہوتا تھا کیونکہ چہرہ کا بشرہ اسقدر خوشگوار تھا کہ زخم کے پیدا کردہ اثر پر وہ بالکل غالب آگیا تھا۔ وہ میرے سامنے اُسی طرح کھڑا تھا جیسے زندگی مین۔ پڑاؤ کی دور کی روشنیون کی ٹمٹماتی چمک پوری طرح اُس پر پڑ رہی تھی۔ علاوہ ازین اُس کی شکل بھی اپنی علحدہ ہلکی روشنی سے گھری معلوم ہوتی تھی۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت مین ڈالنے والی چیز چہرہ کا بشرہ تھا۔ یہ وہی طفلانہ چہرہ تھا جس سے مین بخوبی واقف تھا جسمین کوئی تبدیلی نہ آئی تھی لیکن پھر بھی وہ کچھ ظاہر کر رہی تھی جو پہلے کبھی ظاہر نہین کیا تھا۔ یہ کہ وہ بذاتہ خوش تھا —— نہایت ہی خوش اور بالکل آرام وسکون مین تھا —— ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی شک نہین کر سکتا تھا۔ پھر بھی آنکھون مین حسرت (لیکن یہ حسرت صرف میرے لیے تھی، اپنے لیے بالکل نہین) اور میری حوصلہ افزائی اور ہمت آفرینی کی خواہش بھری ہوئی تھی۔

مین نے بولنا چاہا مگر نہ بول سکا۔ لیکن اُس نے ایک قدم آگے بڑھایا اُس کا چہرہ محبت کی مُسکراہٹ سے چمک اُٹھا اور اُس نے اپنا ہاتھ میرے سینہ پر پیار سے رکھا۔ اور پھر، ایک لحظہ مین، پیشتر اس کے کہ سنتری جو اپنی گشت کے سرے پر پہونچ گیا تھا پھر اپنا چہرہ ہماری طرف کرے، وہ غائب تھا!

میرے لیے اس اثر کا جو اِس خوبصورت ننھی روح نے مجھ مین پیدا کیا بیان کرنا مشکل ہے۔ میری تمام گوناگون تکالیف اب بھی اسیطرح قائم تھین —— میرا تمام جسم جانکنی کے ایک لوتھڑے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ لیکن میری دماغی حالت اس لمحہ مین پہلے سے بالکل برعکس ہوگئی تھی۔ یاد رکھیے کہ اس وقت مین عالم ملکوت سے بالکل ناواقف تھا۔ نہ مجھے موت کے بعد زندگی کے امکانات کا حال معلوم تھا۔ اس لیے یہ میرے نزدیک ایک خاص غیبی ہدایت تھی، خدا کی جانب سے ایک خاص اشارہ تھا جس نے میرے بھائی

کی روح کو نہ نظر آنے والی دنیا سے واپس آنے کی اجازت دے تھی تاکہ وہ مجھے میری تکلیف میں تسلی دے اور دل بڑھائے۔

اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مجھے یہ یقین آنے لگا کہ حالات کیسے ہی مایوسانہ ہوں کسی نہ کسی طرح انجام بخیر ہوگا۔ یا تو گو یہ ناممکن نظر آتا تھا میں کسی طرح بچ نکلوں گا اور اچھا ہو جاؤں گا یا اگر مجھے مرنا ہی ہے تو مجھے اطمینان تھا کہ میں جلد اور بلا تکلیف مر جاؤں گا اور پھر اپنے بھائی سے جا ملوں گا۔ چونکہ ظاہر حالات بالکل غیر تبدیل شدہ تھے۔ یہ سمجھنا شاید مشکل ہے کہ میری مایوسی ایسی اُڑ گئی تھی گویا تھی ہی نہیں اور اب میں پُرشوق انتظار کی حالت میں تھا — یہ انتظار کہ اب کچھ واقع ہونے والا ہے یا تو موت یا کسی قسم کی رہائی۔ موخر الذکر کیا صورت اختیار کرے گی میں بالکل اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ صورت حالات پر میں نے غور کیا اور کوئی ایک معقول تدبیر بھی ذہن میں نہ آئی۔

اگر میری یاد درست ہے تو میں خیال کرتا ہوں میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر کسی قسم کی مدد آ سکتی ہے تو ممکن صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کسی غیر متوقع طریقہ پر حکومت کو اسکی مجبورانہ نقل وحرکت کا حال معلوم ہو گیا ہو جسکے متعلق مارٹینز کو گمان تھا کہ اُسے خبر نہیں ہے۔ اور اُس نے بجائے خود ایک فوج اُس کو روکنے اور گھیرنے کے لیے بھیجدی ہو۔ میں جانتا تھا کہ یہ قطعی ناممکن ہے لیکن اور خیالات اس سے بھی زیادہ ناممکن نظر آتے تھے تو یا یہ بات ہو کہ ملائکہ براہ راست میری کچھ مدد کریں۔ میں یہ جانتا تھا کہ اس زمانہ میں یہ بات نایاب ہے لیکن مجھے یقین تھا کہ ضرور کچھ نہ کچھ واقع ہونے والا ہے یا تو میں مارا جاؤں گا یا میں رہا ہو جاؤں گا۔ اور جب کچھ واقعہ ہوا اگرچہ ایسے طریقہ سے ہوا جس کی مجھے ایک لحظہ کے لیے بھی توقع نہیں ہو سکتی تھی تو میں کم از کم اس وقت اچنبھے میں رہ گیا۔

میں نے ایک ہاتھ کی مس محسوس کی جو صریحاً درخت کے پیچھے سے بڑھا تھا اور فوراً بعد میں مجھے معلوم ہونے لگا کہ جس رسی سے میں اس تکلیف دہ سختی سے کسا ہوا تھا ڈھیلی ہونے لگی۔ مجھے یاد ہے کہ میرے دل میں یہ خیال گذرا کہ میرا درخت کے پیچھے والا نامعلوم دوست غالباً بیخبر ہے کہ میں کھڑے ہونے کے بالکل ناقابل ہوں اور جیسے ہی رسی نکل جائے گی میں دھم سے زمین پر جا پڑوں گا۔ اس طرح اس کے خیر خواہانہ ارادے پورے نہوں گے کیونکہ سنتری کی توجہ اس طرف ہو جائے گی۔ لیکن اس کا صحیح پہلے اندازہ کر لیا گیا تھا۔ میرے نجات دہندہ نے انتظار کیا حتیٰ کہ قریب ترین سنتری کی پشت ہماری طرف

ہوگئی اور پھر جیسے ہی رسّی ڈھیلی ہوئی ایک بانہہ بڑھی جس نے مجھے پکڑ کے جلدی سے کھینچا اور جھپکے سے درخت کے پیچھے کر لیا۔ مجھے اتنا وقت مِل گیا کہ مین نے دور کی روشنی کے دُھندلکے مین پہچان لیا کہ میرے بچانے والے میرے والد دہ حبشی نوکر ٹیٹو ہین۔ ٹیٹو نے مجھے اپنی گود مین اُٹھا لیا اور ہم جلد جلد جنگل مین خاموشی سے بھاگنے لگے۔

جب ہم تقریباً دو سو گز جنگل مین گھُس لیے ٹیٹو نے مجھے زمین پر ڈال دیا اور اپنا بڑا بند ہونے والا چاقو نکال کے وہ رسیان کاٹ ڈالین جن سے اب تک میری کلائیان بندھی ہوئی تھین، لیکن میرے بازو کھُل جانے کے باوجود بیکار محض تھے۔ کیونکہ وہ کئی گھنٹے کسے رہنے سے بُری طرح دب اور چھِل گئے تھے ہم نے جلد جلد چند کلمے ایک دوسرے سے کہے۔ والد میری تکلیفون پر کُڑھے۔ مین نے اُن کی بات کاٹ کے اُن سے پوچھا کیا آپ کو معلوم ہے کہ جیرلڈ کا کیا حشر ہوا اور ساتھ ہی ساتھ مین نے اُن کو یقین دلایا کہ مرنے کے بعد وہ مجھے نظر بھی آ چکا ہے۔ میرے والد کی سمجھ مین یہ بات نہین آئی شائد اُنھون نے مجھے ہذیان مین سمجھا ہو اور واقعی جو کچھ مجھ پر گذر رہی تھی اُس کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی عجیب بات بھی نہ تھی خیر، اُنھون نے کہا کہ مجھے جیرلڈ کی موت کا حال معلوم ہے لیکن ہمین باتون مین دیر نہ لگانی چاہیے۔ بلکہ ہمارے بھاگنے کا حال معلوم ہونے سے پہلے پڑاؤ سے جتنی دور ہم سے نکلا جا سکے نکل جانا چاہیے۔ مین اُن کے لیے ایک فضول بارِ گران تھا کیونکہ ایک قدم بھی نہین چل سکتا تھا۔ اور اگرچہ ٹیٹو مجھے سنبھالے ہوئے احتیاط سے لیے جا رہا تھا لیکن مجھے لیے چلنے کی حرکت سے اُس حالت مین بھی سخت تکلیف ہو رہی تھی۔

اِس گھنے جنگل مین گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا اور یہ ضروری بات تھی کہ حتی الامکان ہم خاموش اور دبے پاؤن چلین۔ اِس لیے ہماری پیش قدمی لازمی طور سے نہایت سُست تھی۔ لحظہ لحظہ ہمین ڈر تھا کہ خبر ہو کے غُل مچ جائے گا اور ہمین تعاقب شروع ہو جانے کی آواز آنے لگے گی۔ لیکن مجھ امید تھی کہ سنتری کو میرے غائب ہو جانے کا علم نہ ہو سکے گا کیونکہ جس درخت سے مین بندھا تھا وہ اُس سے کچھ فاصلہ پر تھا اور جنگل کے کنارہ پر ذرا سایہ مین تھا اور پڑاؤ کی روشنیان جو اُس جگہ پر ایک دو گھنٹہ پیشتر اُجالا ڈال رہی تھین اُس وقت گل ہوتی جا رہی تھین۔ وقت گذرتا گیا اور کوئی بات واقع نہین ہوئی اور جتنا ہم بڑھ سکے بڑھتے چلے گئے۔ اگرچہ ہماری انتہائی رفتار بھی ناخوشگوار نہ نہایت سُست تھی مجھے مطلق خبر نہ تھی کہ ہم کدھر کو جا رہے ہین کہ محض یہ خیال ہمارے پیش نظر تھا کہ ہمارے اور پڑاؤ کے

درمیان جتنا فاصلہ بھی ڈالا جا سکے ڈال دینا چاہیے۔ تھوڑی دیر میں ہمیں زمین اُٹھتی ہوئی معلوم ہوئی جو بعض مقامات پر بہت کچھ ڈھلاؤ کے ساتھ تھی۔

ہمارے مقصد کے خلاف دن جلد نکل آیا اور زمین نے تاریک رات سے اس تیزی سے جو قطبوں کی خصوصیت ہے روز روشن میں جست کی۔ جنگل کا ذب کے نظر آتے ہی ٹیٹو نے مجھے آہستگی سے نیچے اُتارا اور میرے والد سے کہا کہ وہ میرے پاس ٹھہر جائیں اس اثنا میں وہ خود کوئی چھُپ رہنے کی جگہ ڈھونڈے گا کیونکہ یہ بالکل ظاہر تھا کہ ہم ڈیرے سے اتنے نزدیک تھے کہ اگر ہم کوئی چھپنے کی جگہ نہ ڈھونڈیں ہم گرفتار ہو سکتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میں تکان سے بیہوش اور غافل ہوا جا رہا تھا اور ٹیٹو نے جو دوا دوسرے کے ساتھ جس صورت میں کہ وہ جبشیوں میں رائج تھی کچھ واقفیت رکھتا تھا۔ میرے لیے اب آگے بڑھنا خطرناک سمجھا۔

تھوڑی تلاش کے بعد اُسے ایک جگہ مل گئی جو ہمارے لیے خوب موزون تھی۔ وہ مجھے وہان لے جانے کے لیے پلٹ آیا۔ ایک نامعلوم زمانہ کا ایک پُرانا بڑا درخت تھا جو اندر سے بتدریج کوکھا ہو گیا تھا اور اسمیں ایک کمرہ سا بن گیا تھا جس کی تہ میں گلی ہوئی لکڑی کا ملائم بُورا یعنی ایک قسم کا قدرتی بُرادہ اکٹھا ہو کے گدگدے فرش کا کام دے رہا تھا۔ ویسے دیکھنے میں یہ درخت اپنے آس پاس کے درختوں کی طرح مضبوط اور درست نظر آتا تھا۔ اس شجری کمرہ میں داخل ہونے کا صرف ایک ہی راستہ تھا کہ اس پرانا ازاً پندرہ فٹ چڑھ کے ایک گڑھے میں جہان سے ایک گڑھا ایک دو ہی ہیں بیشتر فٹ گہرا تھا اتر پڑیں۔ اب سوال یہ تھا کہ مجھے اس میں کس طرح پہنچائیں لیکن یہ کام ضرورت کا تھا۔ اس لیے آخرکار یہ پورا ہو گیا۔

میرے والد نے پوستین جو انھیں ایک روز پیشتر دیا گیا تھا اُتار ڈالا مجھے اسپر لٹا دیا گیا۔ اور اسکے کونے باہم باندھ کے اسکو ایک قسم کا بنگوڑا بنا دیا گیا۔ ٹیٹو نے اسمیں۔ اُس رسی کا پھندا ڈالا جس سے میں درخت کے ساتھ بندھا ہوا تھا اور جسکو وہ اپنی مآل اندیشی سے اپنے ساتھ لیتا آیا تھا کہ ایسے سخت وقت میں تنکے کا بھی سہارا ممکن ہو۔ اسکے بعد وہ اُس درخت پر کچھ اونچائی تک چڑھ گیا۔ والد نے اُس رسی کا سرا اس کی طرف اُوپر کو پھینکا۔ اُس نے آہستہ آہستہ اور نہایت احتیاط سے مجھے زمین سے کھینچنا شروع کیا حتی کہ مجھے تنے اور بڑے پل نما درخت کے ٹہنے کے بیچ میں جما دیا۔ پھر اُس نے اتر کے والد کو چڑھایا اور اُن کو اندیشہ ناک

صورت مین ٹہنے کو پکڑے ہوے اور مجھے سنبھالے ہوے چھوڑ کے خود ذرا اوپر اُنچا چڑھ گیا اور گڑھے کے برابر پانون جمانے کی جگہ کر کے رسی کے ذریعہ مجھے اوپر کھینچا اور اپنے برابر کر لیا۔ پھر وہ آہستگی سے اِس چبوترے پر کودا جس نے اندر کا فرش زمین کی سطح سے بہت بلند کر رکھا تھا اُس کے بعد والد بقیہ نٹ اوپر چڑھے اور اُنھون نے مجھے احتیاط سے جھکا کے ٹیٹو کی گود مین دیدیا۔ اُس کے بعد جلدی سے اُنھون نے مجھے فرش پر لٹا دیا۔ اتنی دیر تک تکلیفین جھیلنے اور مصیبتین اُٹھانے کے بعد اِس ہموار جگہ پر لیٹنے مین مجھے بڑا آرام معلوم ہوا۔

مین سونا چاہتا تھا لیکن مجھے بخار چڑھ آیا تھا۔ مجھے یقین ہو کہ دن مین زیادہ تر مجھے شاید ہی ہوش رہا ہو۔ بلکہ کبھی کبھی مجھپر ہذیان طاری ہو جاتا تھا۔ مجھے حالات گرد و پیش کا مطلق ہوش نہین رہا۔ لیکن والد نے مجھے بعد مین بتایا کہ جیسے ہی ہمنے وہان دم لیا باہر دن کی طرف سے بڑے شور و غل کی آواز سنائی دی اور کچھ چیخ پکار رہی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ کھلبلی مچ گئی ہے۔ وفادار ٹیٹو نے اپنے اس درخت کی چوٹی پر چڑھ کے یہ سب کچھ دیکھا کیونکہ اُٹھی ہوئی زمین کی وجہ سے اُسے پڑاؤ کا بہت سا حصہ نظر آتا تھا۔ اُس نے بتایا کہ بڑی گڑبڑ اور ہڑبونگ مچ رہی ہو اور سپاہیون کے بڑے بڑے دستے جنگل کے مختلف اطراف مین صرتحاً ہماری تلاش مین بھیجے جا رہے ہین۔

واضح رہے کہ ہماری گرفتاری مارٹینز کی تدابیر کے لیے نہایت ضروری تھی۔ جو فوجین حکومت نے اُس کے تعاقب مین بھیجی تھین اُن سے وہ کامیابی کے ساتھ کترا کے نکل آیا تھا۔ چند روز کی ناقابل یقین مجبورانہ نقل و حرکت کے بعد وہ اپنے آدمیون کو ایسی جگہ لے آیا تھا جہان سے وہ آسانی سے کسی بڑے اہم قصبہ پر حملہ کر سکتے تھے۔ اس کی نقل و حرکت کا حکومت کو شان و گمان بھی نہو سکتا تھا۔ جو اِس حلمہ مین آگئی تھی کہ وہ اس کے برعکس سمت مین بڑھ گیا ہو۔ اصل مین حکومت اس چھوٹے دستہ کو مغلوب کرنے مین مصروف تھی جسکو اُس نے وہان اُسے دھوکہ دینے کے لیے چھوڑ دیا تھا کیونکہ اُسے یہ خیال گذرنے لگتا تھا کہ بس یہی اُس کی کل جمعیت ہو۔ اُس نے اپنے آدمیون کو اس مقام پر ٹھہرا رکھا تھا جہان ہماری اُس سے ملاقات ہوئی۔ اس جگہ وہ اُن کو اِس مجبورانہ نقل و حرکت کے بعد اِس شہر پر حملہ کرنے سے پہلے چند روز آرام دینا چاہتا تھا۔ اِس بیابانی علاقہ مین قرین عقل تھا کہ وہ کسی کو نظر نہ آئے اور نہ اُس کی وہان موجودگی کی کسی کو خبر ہو۔

لیکن اگر میں اور میرے والد یا ہم میں کوئی ایک بھی بچ نکلے اور کسی ناقابل یقین طریقہ سے قریب ترین مکان یا گاؤں میں پہونچ کے ساحلی شہر میں یہ خبر پہونچا دے تو مارٹینز کی یہ تمام برتری و فوقیت خاک میں ملجائے۔ اور چونکہ اُس نے اِس دلیرانہ چال پر اپنی ساری بازی لگا رکھی تھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ نہ صرف میدان اُس کے ہاتھ سے نکل جائے بلکہ اُس کی جان بھی بلاشبہ جاتی رہے۔ اِس لیے ہم لوگوں کا کسی طرح بھی ہو گرفتار کر لیا جانا اس کے لیے نہایت ضروری تھا اِس لیے اُس نے اپنے آدمیوں کو بجائے آرام لینے کے بجائے ہماری تلاش میں جنگل کا چپّہ چپّہ ڈھونڈھنے پر لگا دیا۔ اور یہ بھی معلوم تھا کہ ہم کچھ دور نہ گئے ہوں گے کیونکہ اُسے اسکا علم تھا کہ کم از کم میں بُری طرح زخمی تھا۔ اور میرے والد کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔ نہ اُسے اِس کا وہم و گمان ہو سکتا تھا کہ ہم اُن لاکھوں کروڑوں خطروں سے جن میں ہم اِس جنگل میں گھرے ہوئے تھے ایک دِن کے لیے بھی بچ سکتے ہیں۔ اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ ہمارے ساتھ ٹیٹو کی بیش قیمت امداد تھی جو اِن سب باتوں کو جانتا تھا اور جنگل میں اپنی حفاظت کرنے اور اس میں سے خوراک حاصل کرنے کے طریقوں سے واقف تھا۔

اُنھوں نے مجھے بتایا کہ سپاہیوں کے گروہ باربار اِس درخت کے پاس سے جسمیں ہم چھپے ہوئے تھے گذرے اُن کو اُن کی گفتگو کا کچھ کچھ حصہ بھی سنائی دیا۔ اور ٹیٹو نے جو ان کی زبان بخوبی جانتا تھا بتایا کہ وہ زیادہ تر جادو اور امداد غیبی کا ذکر کرتے تھے۔ اُن کی گفتگو سے یہ عیاں تھا کہ مارٹینز کے دل میں بھی توہمات پیدا ہو رہے تھے اور وہ سخت خوف و ہراس میں تھا۔ وہ سوچتا تھا معلوم ہوتا ہو اُس سے کسی افسر نے یہ بات اُس سے کہی تھی، کہ جیرلڈ کو مار ڈالنے سے اُس نے اپنے آپ کو نحوست اور شامت اعمال کا نشانہ بنا دیا ہو۔ اُس کی سمجھ میں اور اصل میں اسکے سب ساتھ والوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ میرے والد جبکہ وہ صاف طور پر ایسی مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے کس طرح اچانک کھل کے بچ نکلے اور وہ میرے غائب ہو جانے کو جبکہ میں حقیقت میں قریب المرگ تھا مافوق العادة تصرف تصور کرتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ میرے والد نے کہا کہ ایک دفعہ کچھ سپاہی ہمارے درخت کے میں پاس دم لینے کے لیے بیٹھ گئے۔ ٹیٹو نے اُن کی گفتگو کو بڑے شوق سے کان لگا کے سنا کیونکہ اُس کو یہ خیال تھی کہ شاید کوئی مطلب کی بات ہاتھ آجائے جس سے ہمیں فائدہ پہونچے۔ اور میرے والد کو یہ خوف مارے

ڈالتا تھا کہ مین اپنے ہذیان کی ہلکی بڑبڑ سے اپنی جائے پناہ کو ظاہر کر دون۔ خدا کا شکر ہے کہ ایسا نہوا اور تیسرے پہر کے عمل مین مین گہری پرسکون نیند مین سو گیا۔ جس سے اُنھون نے مجھے اس وقت جگایا جب اندھیرا چھا گیا تھا اور وہان سے روانہ ہونے کا موقع تھا۔

اِس اثنا مین ٹیٹو نے کئی دفعہ اپنی جائے پناہ سے باہر نکل کے اپنی جان خطرہ مین ڈالی تاکہ میرے لیے پانی لائے اور ایسے پتے تلاش کرے جن کو وہ پہچانتا تھا۔ ان پتون کو اُس نے چبا کے لئی سا بنایا اور اسے میرے جلے ہوے بازوون اور چند گہرے زخمون پر لگایا۔ مجھے معلوم نہین کہ کیا دوا تھی لیکن درد کے دور کرنے مین اُس نے جادو ہی کیا کیونکہ جب مجھے شام کو جگایا گیا تو اگرچہ مین اس وقت بھی کمزور اور حالتِ کرب مین تھا لیکن مین صبح کے مقابلہ مین بہت اچھا تھا اور اس وقت بخار کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ سپاہی رات پڑنے سے پہلے ہی اپنے ڈیرون کو چلے گئے تھے لیکن جو کچھ ہم ان کی گفتگو سن پائے تھے اِس سے بلاشبہ مترشح تھا کہ جستجو اگلے روز بھی جاری رکھی جائے گی۔ مجھے اپنے ملائم بستر کے چھوڑنے کا بڑا قلق ہوا اور سچ یہ ہے کہ وہان سے سرکنے کو ایسی صورت مین کہ ہمین ایسی عمدہ جائے پناہ میسر آ گئی تھی قرین مصلحت سمجھنے مین مجھے تامل تھا۔ لیکن ٹیٹو اور میرے الدکے دلون کو یہ لگی ہوئی تھی کہ جب تک وہ پڑاؤ سے بہت دور نہ نکل جائین وہ چین نہ لین۔

انھون نے اپنی اس جائے پناہ سے مجھے زیادہ تر اُسی طریقہ سے نکالا جس طرح وہ مجھے اندر لے گئے ۔۔۔ ہم پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ زمین کی افتاد بلندی ہی کی طرف معلوم ہوتی تھی اور چند مرتبہ ہم رات ۔۔۔ مین چھوٹی چھوٹی کھلی جگہون مین آئے جہان سے ہم اپنے دشمنون کے پڑاؤ کی روشنیون کو دیکھ سکتے تھے جو ہم سے بہت نشیب مین تھین۔ جو جو ہم اُوپر کو چڑھتے گئے درخت کسی قدر کم گنجان ہوتے گئے اور ہماری رفتارِ ترقی کچھ بھی ہو خاصی تیز تھی۔ یا یون کہنا بہتر ہوگا کہ پہلے سے کم آہستہ تھی۔ پھر تو پھٹی اور ٹیٹو چھپنے کی جگہ ڈھونڈھنے لگا۔ لیکن اس دفعہ کوئی معقول کھوکھلا درخت نہ مل سکا۔ ہم جنگل کے عظیم الشان درختون کے خطہ مین تھے بن کے بیچ مین اکثر چوڑے چوڑے میدان تھے۔ لیکن وہ اتنے بڑے بڑے تھے کہ اگرچہ اُن کے تنے ایک دوسرے سے سو سو دو دو سو گز کے فاصلہ پر تھے لیکن اُن کی شاخین ہمارے سرون پر بہت اونچائی پر باہم مل گئی تھین۔ اِن دیو ہیکل درختون پر چڑھنا غیر ممکن ہوتا لیکن تقریباً ہر درخت کے ساتھ بڑے بڑے بید مجنون کی قسم کے درخت جن کے تنے ان سرد شمالی سرزمینون کے بہت سے درختون کے تنون جتنے

بڑے ہوں گے ان کے شاندار تنوں کے گرد لپٹتے ہوئے چلے گئے تھے۔ جن کی وجہ سے ان پر چڑھنا کسی پھرتیلے آدمی کے لیے مقابلۃً آسان ہو گیا تھا۔

جب ٹیٹو چھپنے کی جگہ ڈھونڈھتا پھر رہا تھا اُسے خیال آیا کہ ان بڑے درختوں میں سے کسی پر چڑھ کے دیکھے کہ ہمارے دشمن کیا کر رہے ہیں۔ بعیہ کچھ ایسی وقت کہ اُسے ایسی جگہ مل گئی جہاں سے پڑاؤ اب بھی صاف نظر آتا تھا گو بعد فاصلہ کی وجہ سے اب چھوٹا سا معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے پہلی سی بھاگ دوڑ اور تیاری اور نوجوں کی روانگی دیکھی۔ لیکن اگرچہ اُسے کوئی نئی بات نہیں نظر آئی تاہم اُسی وقت اس نے کوئی آواز سنی جس سے تیر کی طرح نیچے اُتر پڑا اور ہمارے پاس دوڑتا ہوا آیا۔ اُس کے چہرہ کا رنگ عجیب طرح کا سیسہ جیسا ہو رہا تھا جو قریب قریب وہ رنگ ہے جب حبشی خوف کے مارے سفید ہو جاتا ہے۔

اُس نے کہا۔ میرے آقا! کتے! اُنھوں نے ہم پر غلاموں کے کتے چھوڑے ہیں سنیئے! جب ہمنے کان دھر کے سنا تو واقعی دور سے ایک کھوجی کتے کے زور سے بھونکنے کی آواز سنی۔ ہمیں معلوم تھا کہ ان جیسے کتوں کو ان دنوں ملک میں بعض غلاموں کے مالکوں نے مفرور غلاموں کا کھوج لگانے کے لیے پال رکھا ہے لیکن یہ مارٹینز کے کیسے ہاتھ لگے کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ میں تو یہی قیاس کر سکا ہوں کہ اُسکے آدمیوں میں کوئی ایسا شخص ہوگا جسے کسی اندرونی آبادی میں اس نسل کی موجودگی کا حال معلوم ہوگا۔ اور اُس نے اس کی خبر اپنے افسر کو کی ہو گی اور جب مارٹینز کو ان کا حال معلوم ہوا ہوگا اُس نے کچھ آدمی ان کتوں کو مانگنے کے لیے بھیجے ہوں گے گو ایسا کرنے سے اس بستی کے کم از کم چند آدمیوں کو اس جگہ اس کی موجودگی کا حال معلوم ہو گیا ہوگا۔ اصل میں مجھے اس کی خصلت معلوم ہونے کی وجہ سے اندیشہ ہے اس نے شاید ہر فرد و بشر کو خاموش کر دینے کا خوفناک مؤثر طریقہ اختیار کیا ہو شاید قتل عام کیا گیا ہو۔

کچھ بھی ہوا ہو کتے آ رہے تھے اور اُن کے ہمارا کھوج نکال لینے میں کس کو شبہ ہو سکتا تھا۔ اُنھیں نہ صرف ہماری پہلی چھپنے کی جگہ معلوم ہو جائے گی بلکہ وہ جگہ بھی جہاں اب ہم کھڑے تھے ہمارا اُن سے بچ نکلنے کا بہت ہی کم موقع نظر آتا تھا۔ میں نے اس نسل کی غیر مانوس و ناقابل رام تندی اور کھوج کو آخر تک پہونچا دینے کی ہٹ دھرمی کی کہانیاں سنی تھیں۔ ہم نے چھپنے کی جگہ ڈھونڈھنی چھوڑ دی بلکہ بے تحاشا مایوسانہ پہاڑ کی چوٹی کی طرف چڑھتے چلے گئے لیکن ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ ہمارے تعاقب کرنے والے کتے

رفتار ہمت کہیں زیادہ تیز ہو گی اور اب ہم گرفتار ہونے سے کسی طرح نہیں بچ سکتے۔

ٹیٹو کو کسی جبتیا نہ وہم و باطل پرستی کی وجہ سے ایک خیال آیا کہ خون کی بو کتون کی سونگھنے کی تیزی کو ضائع کر دیتی ہے۔ اس لیے اُس نے اپنا بڑا چاقو نکالا اور اُس سے اپنے بازو میں ایک چھوٹا سا گھاؤ کیا۔ خون جو کثرت سے نکلا اُس نے اُس جگہ جہان ہم کھڑے تھے چارون طرف چھڑک دیا۔ اِس طریقہ پر اُس کا اعتقاد تھا گو اُس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ بعض کتون پر یہ عمل بے اثر رہا ہے۔ اس لیے یہ ہماری امیدون کی عمارت کو سنبھالنے کیلئے ایک کمزور سینک معلوم ہوئی۔ ہم اسوقت ایک قسم کی چوٹی کے سرے پر تھے۔ ہمارے آگے زمین پھر ڈھلاؤ ہو گئی تھی اور ایک قسم کا غار بن گیا تھا جس کی تہ میں ایک پایاب چشمہ بہ رہا تھا۔ چشمہ کے دوسری طرف زمین پھر اونچی ہو گئی تھی اور پہاڑی کا دامن ہمارے سامنے پھیلا چلا گیا تھا جیسے میرے والد مجھے اپنی باہون مین سنبھالے ہوئے تھے میرے دل پر ایک قسم کا القا ہوا۔ مین نے جوش کی حالت مین کہا۔ ابا! کیا آپ کو اسکاٹلینڈ کی تاریخ یاد نہین رہی؟ آپکو یاد ہوگا کہ رابرٹ بروس کا کس طرح ایک مرتبہ کھوجی کتون نے تعاقب کیا اور وہ کس طرح پانی مین چل کے اپنا کھوج گم کر کے اُن سے بچ کے نکل گیا۔

امید کی ایک جھلک میرے والد کی آنکھ مین نظر آئی۔ اُنھون نے کہا۔ کیون نہین۔ مین نے وہ قصہ سُنا ہے۔ اس کو عرصہ ہوا جب مین مدرسہ مین تھا۔ ہم اُس کی کم از کم آزمائش کر سکتے ہین۔

اُنھون نے جلدی جلدی ٹیٹو کو یہ طریقہ سمجھایا جس کی شروع مین کچھ سمجھ مین نہین آیا۔ لیکن جب یہ خیال اُسکے ذہن نشین ہو گیا اُس نے کہا۔ یہ ٹھیک ہے۔ واقعی بو پانی مین نہ رہے گی۔ لیکن پھر کیا ہے ہم دریا مین تو نہین پڑے رہ سکتے۔ اور جب ہم پھر باہر نکلین گے کتے ہماری پھر بو لے لین گے۔

مین نے کہا نہین ٹیٹو یہ بات نہین ہے تم دریا مین چلے چلو یہانتک کہ تمھین اُس پر لٹکتی ہوئی کوئی بڑی شاخ نظر آئے پھر تم زمین چھوئے بغیر شاخ کے ذریعہ باہر آجاؤ۔

والد نے کہا۔ یہ بات ہے! آؤ اسے کر کے دیکھین۔ شاید اس سے کام نکل جائے اور اس کے سوا اور کوئی صورت بھی تو نہیں ہے۔

میرے خیال میں ٹیٹو کو اس مین تامل تھا کیونکہ اُس کے دل مین ان خونناک کتون کی بابت دہشت تھی۔ لیکن ہم غار مین اُترتے چلے گئے۔ پھر پایاب چشمہ مین پڑ کے سنبھل سنبھل کے چلنے لگے۔

اُن کو تھوڑی دور چلنا پڑا۔ (میں نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں اس تمام وقت بے حس و حرکت پڑا رہا) میں دل ہی دل تاسف سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ میری وجہ سے اس جماعت کا خطرہ کتنا بڑھا ہوا تھا۔ قبل اسکے کہ ہم کو موقع کی کوئی شاخ ملے جسے ٹیٹو حصول مقصد کے لیے ممکن تھے۔ لیکن اس پر بھی وہ دو تین شاخیں جو ہمارے لیے موزوں ہوسکتی تھیں چھوڑتا جاتا تھا کیونکہ وہ ایسے بڑے بڑے درختوں کی تھیں جو الگ تھلگ کھڑے تھے اور وہ ایسی چاہتا تھا جس سے بچ نکلنے کے لیے ایک سلسلہ درختوں کا ہاتھ آجائے۔

اس اثنا میں کتوں کی بھونکنے کی آواز یا تو پاؤں پھیلانے کے لیے نزدیک آتی گئی لیکن ہم کا ہم ایک ایسی شاخ کے پاس پہونچ گئے جو ٹیٹو کی باریک بینی اور روح کی طبیعت کے مطابق تھی کیونکہ وہ ایسے درخت کی تھی جسکی شاخیں دوسرے درختوں کی شاخوں سے گتھی ہوئی تھیں اس طرح کہ ہمارے لیے (بندروں کی طرح) اس جگہ پر جو جنگل کی دوسری منزل کہلاتی ہو راستہ بنانا ممکن تھا۔ شاخ موٹی اور مضبوط تھی لیکن کودنے سے بھی ہاتھ نہ آسکتی تھی اور پھر ایک اور مشکل پیش آئی چشمہ گھٹنے گھٹنے گہرا تھا اور اُس میں چلنا ہمارے لیے آسان تھا۔ لیکن اگر میرے والد اسکے کنارہ پر مجھے لٹا دیں تو ان بیرحم حیوانوں کو جو ہمارا تعاقب کر رہے تھے ہمارا کھوج معلوم ہوتا تھا۔

**محمد ظفر**

میں اس کو دیکھتا ہوں وہ ہو جلوہ گر کہیں　　زاہد مری نگاہ ہو تیری نظر کہیں
عیار بھی ہو شوخ بھی ہو خود نما بھی ہو　　تم دیکھتے کہیں ہو نظر ہے کدھر کہیں
پروانے کی طرح نہ کلیجا جلائیے　　بجھ جائے دل نہ صورت شمعِ سحر کہیں
دل کو طریقِ عشق میں سمجھا ہے میں نے خضر　　گمراہ کر نہ دے مجھے یہ راہبر کہیں
وہ دل کو دیکھتے ہیں ہم اُن کی نگاہ کو　　اُن کی نظر کہیں ہے ہماری نظر کہیں
آگے بڑھے نہ راہِ محبت میں مجھ سے دل　　پیچھے نہ چھوڑ جائے مرا ہمسفر کہیں
وہ جلوہ گر قریب سے ہونگے کہ دور سے　　یہ فیصلہ بھی اُٹھ نہ رہے تا بہ حشر کہیں
تاثیر اسپہ وحشتِ دل کی ہے پڑ رہی　　دیوانہ ہو نہ جائے مرا یار گر کہیں
پیمان شکن کے قول پہ اترا رہے ہو تم　　اور آج بھی نہ آئے وہ آ کر کہیں

# نظرے خوش گذرے

۹ مارچ کو علی گڑھ مین جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سالانہ جلسہ تقسیم اسناد تھا۔ اس قومی درس گاہ کے شوق زیارت سے بیتاب ہوکر خاکسار ایڈیٹر بھی چلا گیا۔ یہان سے ایک دوسری زیارت گاہ پر جبین سائی کرتا ہوا ایک ہفتہ کے بعد لکھنؤ واپس آیا۔ علی گڑھ ہی مین سرما کھا گیا تھا۔ سلسل بے نظمی اوقات اور بدعنوانی غذا کے باعث طبیعت زیادہ خراب ہوگئی اور اس وقت تک باوجود علاج باقاعدہ کے ابتک صحت نہین حاصل ہوسکی ہو۔ الناظر پر صرف اس کا یہی اثر نہین ہے کہ کچھ دیر سے شائع ہو گا بلکہ سفر حجاز کی روداد بھی اس دفعہ تیار نہوسکی۔ انشاء اللہ آئندہ نمبر مین اس کی تلافی کر دی جاے گی۔

---

"استبداد ادبی کا ایک جدید شکنجہ" مطبوعہ الناظر ماہ جنوری کے جواب مین مسلم یونیورسٹی گزٹ نے صاحبزادہ آفتاب احمدخان صاحب وائس چینسلر مسلم یونیورسٹی کا سرکاری جواب ۲۰ فروری کی اشاعت مین چھاپا ہو اُس مین مضمون "فلسفہ ازدواج" کے اقتباسات دیکر اعتراض کیا گیا ہو کہ

"جسوقت میگزین کا یہ نمبر (جو مضمون فلسفہ ازدواج کی وجہ سے بحق یونیورسٹی ضبط کیا گیا تھا) طبع ہوا اور اس کی چند کاپیان یونیورسٹی مین تقسیم ہوئین تو چند مسلمان پروفیسرون کو۔ جو انگلستان کے تعلیم یافتہ ہین اور جن کے خیالات اور طرز عمل پر مذکورہ بالا فقرون کے مضمون کا اطلاق ہوسکتا تھا سخت شکایت ہوئی اس سبب سے باقی ماندہ نمبرون کی اشاعت روک دی گئی۔"

جسکے صاف وصریح معنی یہ ہین کہ اساتذۂ یونیورسٹی کو خود ذمہ دار منتظمین کی طرف سے رخصت نہین بلکہ ترغیب و تحریص دلائی جاتی ہو کہ وہ علی الاعلان شعائر اسلامیہ اور شریعت محمدیہ سے انحراف کرین۔

اس اعتراض سے مسلم یونیورسٹی کی شرع کا یہ کلیہ بھی منکشف ہوتا ہو کہ کالج کی چار دیواری مین کسی امر واقعہ کا بیان کرنا جرم ہو۔ کیون نہو جس حکومت کے ظل عاطفت مین یونیورسٹی ہو جب حق گوئی کے صلہ مین وہ مہاتما گاندھی جیسے بے نفس اور برگزیدہ شخص کو مجرم قرار دیدیتی ہو تو یونیورسٹی کیا اتنا بھی حق نمک ادا نہ کرے کہ سچی باتون کی اشاعت کو روکدے اور سچ کہنے والے کو مجرمین شرع اسلامیہ سے معافی مانگنے پر مجبور کرے۔ فتدبرو۔

# جامعہ

جامعۂ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ

کا

ماہوار رسالہ

## جس میں علمی، ادبی، سیاسی مضامین

نظم ونثر کے علاوہ ملک کے نامور لیڈر اور مشاہیر اہل قلم مضامین لکھتے ہیں اور

جو اپنی یک سالہ زندگی میں تمام ملک ہندوستان میں مقبول ہو چکا ہے

اڈیٹر مولوی نور الرحمن بی۔ اے

**منیجر۔ جامعہ علیگڑھ سے طلب کیجئے۔ قیمت سالانہ للعہ**

---

# پیمانہ

دار السلطنت اکبرآباد کا واحد علمی و ادبی ماہوار رسالہ

جو

## نسیم الکلام حضرت ساغر نظامی (علیگ)

کی اڈیٹری میں اگست ۱۹۲۳ء سے برابر وقت پر شائع ہو رہا ہے

جس کے نگراں

## ابو الفخر مولانا سیماب صدیقی الوارثی اکبرآبادی

ہیں۔ ہندوستان کا مقبول ترین میگزین۔ نثر و نظم کا اعلیٰ صحیفہ۔ معلومات کا قیمتی خزانہ۔ علمی مضامین کا بہترین خطیب، ادبی جواہر ریزوں کا حسین مرقع

قیمت سالانہ صرف عہ ۔ نمونہ ۳؍

**فروری اور مارچ کا "پیمانہ" باتصویر شائع ہوا ہے**

منیجر رسالہ "پیمانہ" منڈی حجام آگرہ سے طلب فرمائیے

# خریداران الناظر سے خاص رعایت

الناظر بک ایجنسی کے کاروبار کو بفضلہ تعالیٰ جو کامیابی نصیب ہوئی ہے چونکہ ناظرین الناظر کا اس سے گہرا تعلق ہے اس لیے آئندہ کے لیے یہ تجویز کیا گیا ہے کہ خریداران رسالہ کے ساتھ مطبوعاتِ ذاتی کی قیمت مین خاص رعایت کی جائے۔ مگر یہ رعایت صرف خریداران رسالہ کے لیے ہوگی اور لازمی ہوگا کہ الناظر بک ایجنسی کو فرمائش بھیجتے وقت اپنا نمبر خریداری تحریر فرمادیا کرین۔

ظفر الملک

## مسلمانون کی تہذیب

یعنی مسلمانون کی تمدنی ترقی کے متعلق نواب محسن الملک مرحوم کا ایک فاضلانہ لکچر۔ قیمت ۶ر

(خریداران رسالہ سے ۵ر)

## میلاد النبی

مشہور محدث حضرت ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کے اصل عربی متن کے مقابل اس کا نہایت فصیح اردو ترجمہ۔ قیمت ۴ر

(خریداران رسالہ کے لیے ۳ر)

## الاحسان

مصنفہ مولوی احسان الدین علوی مرحوم جسمین لفظ صوفی کی تحقیق، تصوف کی ابتدا اور اس کی درجہ بدرجہ ترقیون کا ذکر ہے اور آخر مین تصوف کے تمام شعبون کو اسلام سے تطبیق دی گئی ہے قیمت ۸ر (خریداران رسالہ کے لیے ۵ر)

## مجموعہ کلام شبلی

مولانا شبلی مرحوم کا اردو دیوان جس کا ایک ایک شعر ان کی قادر الکلامی اور اعلیٰ درجہ کی شاعری کا نمونہ ہے

قیمت ۱۲ر

(خریداران رسالہ کے لیے ۱۰ر)

## وکرم اروسی

ترجمہ مولوی عزیز مرزا بی اے مرحوم

یہ کالی داس کے مشہور و معروف ڈرامے کا اردو ترجمہ ہے جسمین لائق مترجم نے ایک بسیط مقدمہ اضافہ کیا ہے اور ہندو ڈرامہ کی تاریخ اور نوعیت پر مفصل بحث کی اور کالی داس کا موازنہ شیکسپیر اور میر انیس وغیرہ سے کیا ہے قیمت عہ

(ناظرین رسالہ کے لیے ۱۲)

## مثنوی امید و بیم

لکھنؤ کے مشہور شاعر و انشا پرداز و فلسفی مرزا محمد ہادی رسوا بی اے کی لاجواب نظم جسے اردو مین اعلیٰ درجہ کے فلسفیانہ خیالات کی پہلی نظم کہنا بجا ہوگا

قیمت ۴ر

(خریداران رسالہ کے لیے ۳ر)

## ارض نہرین

میسوپوٹیمیا یا عراق عرب کے آثار تاریخ

مولفہ مسٹر عنایت اللہ بی اے رجسٹرار عثمانیہ یونیورسٹی۔ قیمت ۴ر

(خریداران رسالہ کے لیے ۳ر)

## دلچسپ مختصر افسانے

ایک نادان خدا پرست اور دنیا دار کی کہانی ۱ر

مساوات۔ از مسٹر سلطان حیدر جوش ۱ر

اتفاقات زمانہ ۱ر

(خریداران رسالہ کے لیے نصف قیمت)

## افراد کا سبب

جسٹس مولانا سید کرامت حسین مرحوم کا ایک قابل قدر مضمون قیمت ۳ر

(خریداران رسالہ کے لیے ۲ر)

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۸۷۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# الناظر

قیمت سالانہ للعہ
قیمت فی پرچہ عہ

ایڈیٹر ظفر الملک علوی

| نمبر ۱۵۴ | ماہ اپریل سنہ ۱۹۲۴ء | جلد ۲۶ |
| --- | --- | --- |

فہرست مضامین



قیمت فی پرچہ ۸؍

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر و پبلشر اسحاق علی علوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# ضروری اعلان

جون سنہ ۲ء کے الناظر مین جو کئی ماہ بعد یعنی اگست کے مہینہ مین شایع ہو سکا تھا ظفر الملک صاحب نے "ترک تعلق" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا اور اُس مین اعلان کیا تھا کہ

"مین نے الناظر۔ الناظر پریس اور الناظر بک ایجنسی کے مالکانہ حقوق اپنی اہلیہ کے نام منتقل کر دیے ہین"

اُس وقت سے قانونی طور پر کاروبار کے متعلق تمام ذمہ داری مجھپر عائد ہو گئی تھی۔ اور اگرچہ وہ تقریباً دو سال سے کاروبار کو مثل سابق چلاتے رہے ہین مگر مین اِس وقت تک اُس ذمہ داری سے سبکدوش نہین ہوئی تھی۔

لیکن کاروبار کی توسیع کے لیئے جو فکرین اب کی جا رہی ہین اُن کے لحاظ سے ضروری معلوم ہوتا ہی کہ عملی ذمہ داریون کے ساتھ ساتھ قانونی ذمہ داری بھی ظفر الملک صاحب ہی پر عائد ہو اس بنا پر اعلان ہذا کے ذریعہ سے ناظرین الناظر و دیگر اصحاب متعلقہ کو اطلاع دیجاتی ہی کہ الناظر۔ الناظر پریس اور الناظر بک ایجنسی کے مالکانہ حقوق مین نے ظفر الملک صاحب کی طرف منتقل کر دیے ہین اور آیندہ سے وہی اس کل کاروبار اور اُسکے اثاثہ کے مالک واحد متصور ہون گے۔

انجمن النساء

(اہلیہ ظفر الملک)

# مطبوعات جدیدہ

## لغت آزاد

مولوی محمد حسین آزاد مرحوم نے اس لغت مین اردو الفاظ کے معنی فارسی مین لکھے ہین اگرچہ عام ضرورت کی چیز نہین مگر حضرت آزاد کا تبرک ہونے کی حیثیت سے قابل قدر ہے قیمت عہ

## مراۃ الغالب

مرزا غالب کے اردو دیوان کی یہ جدید شرح جناب سید وحید الدین صاحب بیخود دہلوی کی لکھی ہوئی ہے حجم ۵۰۳ صفحے طباعت دیدہ زیب اور جلد نہایت خوشنما ہے قیمت سے

## خطوط سرسید

مرتبہ سید راس مسعود صاحب بی۔اے ناظم تعلیمات حیدرآباد دکن جن کے مطالعے سے سید صاحب کے زمانہ کے معاشرتی، مذہبی اور تعلیمی مسائل پر کافی روشنی پڑتی ہے اور سید صاحب کی ذاتی سیرۃ اور دلی خیالات و رجحانات کا اندازہ معلوم ہوتا ہے قیمت قسم اول سے قسم دوم عا

## مکاتیب محسن الملک و وقار الملک

(مرتبہ منشی محمد امین زبیری ایڈیٹر ظل سلطان) نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے خطوط کا مجموعہ بھی خاص طور پر دلچسپ ہے۔ ان کے ملاحظے سے قومی معاملات کے علاوہ ریاست حیدرآباد دکن کے حالات کا بھی علم ہوگا قیمت عہ

## دیوان حسرت موہانی حصہ ششم

یہ دیوان حال ہی مین چھپا ہے جس کے شروع مین مولانا حسرت نے ایک عجیب انداز مین خاص خاص لوگون کے نام ہدیۂ شوق و عقیدت تحریر فرمایا ہے قیمت فی جلد ۸ر

## ابن رشد

حضرت مولانا عبد الحیٔ صاحب مرحوم و مغفور کے نواسے مولانا محمد یونس فرنگی محلی نے مشہور مسلمان فلسفی، علامہ ابن رشد اندلسی کے حالات مین یہ قابل قدر کتاب لکھی ہے جس مین علامہ موصوف کے سوانحی تذکرے کے ساتھ ساتھ ان کے نظریات اور ان کے فلسفہ پر نہایت تفصیل سے تبصرہ کیا گیا ہے اسی کے ذیل مین اندلس کے اسلامی عہد کی علمی موشگافیون کا بھی بیان ہے قیمت سے

## تاریخ عرب

مصنفہ موسیو سیدیو جس کی اشاعت کا اعلان دو ماہ سے کیا جا رہا ہے۔ بالآخر شایع ہوگئی ہے بوجوہ اس کی سابقہ قیمت مین تخفیف کردی گئی ہے۔ چونکہ پہلا ایڈیشن بہت بڑی تعداد مین نہین چھاپا جا سکا ہے اس لیے شایقین جلد طلب کرین ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا ہوگا۔

قوم عرب کے عظیم الشان کارنامون پر اس سے بہتر اور جامع و مانع کوئی کتاب نہین ہے۔ عربون کے متعلق ہر قسم کی معلومات کا یہ کتاب مخزن ہے اور عام یورپین مصنفون نے اپنے تعصب یا ناواقفیت سے جن باتون کا انکار کیا ہے موسیو سیدیو نے جرأت سے ان کا پردہ فاش کیا ہے قیمت قسم اول عمہ قسم دوم ص

## اخبار الدولتین

جامعہ ملیہ کی طرف سے یہ کتاب حضرت نیاز فتحپوری نے مرتب کی ہے جس مین عہد بنی امیہ و بنی عباس کی نہایت دلکش تاریخ جرجی زیدان مصری کی مشہور عالم تاریخ اسلامی کی بنیاد پر مرتب کی گئی ہے قیمت عہ ۸ر

ملنے کا پتہ:۔ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# الناظر

نمبر ۴ جلد ۲۶

اپریل ۱۹۲۴ء

## فیہ مافیہ

(اثر: چیپی)

فطرت کی نیرنگیاں اکثر آنسوؤن کے دامن مین مسکراہٹون کو چھپائے رہتی ہین۔ بڑے سے بڑا پُردرد واقعہ عموماً اپنے پہلو مین بعض پرلطف و دلچسپ مناظر رکھتا ہے چنانچہ عزل خلیفہ و شکست خلافت کا حادثہ عظمیٰ بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہین۔

اس سلسلہ مین ایک خاص طور پر پرلطف تماشہ فرنگی محل کی "محلسرا" مین کچھ عنوان سے ہو رہا ہے۔ شریف مکہ کے اعلان خلافت کرتے ہی فرنگی محل کے نامور عالم گاندہی جی کے مشہور "پس رو" نے اپنی پیش روی کے ثبوت مین اُن کے نام تہنیت کا تار روانہ کیا اور اس کی نقل اخبارات مین بھی شایع فرمائی۔ اکولہ (برار) کے ایک کارکن خلافت، اور روزنامۂ خلافت (بمبئی) کی جانب سے اعتراض شایع ہوا، کہ ایک غدار و باغی کو جامع الشروط خلیفہ تسلیم کر لینا کیا معنی؟ جواب نکلا کہ تار کا مضمون انگریزی مترجم کی غلطی سے مسخ ہو گیا لیکن نفس تہنیت و مبارکباد کی تردید اب بھی نہ ہوئی۔ اتنا جزو تصحیح کے بعد بھی بدستور موت کا قوت رہا۔

یہان تک بھی غنیمت تھا، اصل پُرلطف شے وہ پُرغضب سلسلۂ مضامین ہے، جو

مضمون نگارون کے مختلف اسماء گرامی، لیکن طرز انشا و ضعف استدلال کی یکسانی کے ساتھ، ان بدبخت معترضین کے خلاف شایع ہو رہا ہے، اور پھر بھی جذبات غیظ و غضب کی تسکین نہین ہوتی۔ ان مضامین مین قہر و خشم ہے، اور طنز و تعریض، ڈراوے ہین اور دہمکیان۔ تاویلات ہین اور ادعاآت، معترضین کی تجہیل ہے اور تفسیق، اور یہ سب کچھ صرف اس معصیت کبیرہ کی بنا پر، کہ ان شامت زدون نے اُس ہستی پر تنقید کی جسارت کی، جو تنقید سے ماورا، اعتراض کی زد سے برتر، اور بشری کمزوریون سے پاک و منزہ ہے!

---

ان خوش ظرف عقیدتمندون سے تو نہین، البتہ خود جناب مولانا کی خدمت مین بہ صد خلوص و نیاز التماس ہے، کہ پبلک زندگی صرف اُن لوگون کے لئے ہے، جو ہر قسم کے اعتراضات سُننے کا تحمل، اور نکتہ چینی کی برداشت کی قوت رکھتے ہون۔ نہ یہ کہ ادہر کسی بے ادب کی زبان چون وچرا پر کھلی، اور اُدھر اُس پر مریدون و معتقدون کی جماعت نے یورش کردی، کہ بدنیتی کا پردہ فاش کردیا جایگا، "ریشہ دوانیون" کی "پردہ دری" کرکے رکھدی جائیگی، وقس علیٰ ہذا۔ ہر شے کی ایک حد ہوتی ہے، ممکن ہے، کسی وقت اُس غریب کو بھی یہ شعر یاد آجائے ؎

اتنی نہ بڑہا پاکیٔ دامن کی حکایت،
دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بند قبا دیکھ!

اُسوقت تک تو، پیسانہ اور بڑے گاؤن کے خوش عقیدہ لیکن نومشق مضمون نگارون کے لئے جنبش قلم شاید اسقدر آسان و خوشگوار نہ رہجائے۔ خدائے تعالیٰ سے دعا ہے کہ کہ وہ جناب مولانا کو اپنے نادان دوستون سے محفوظ رہنے اور اپنے حقیقی مخلصین اور خیر اندیشون کی شناخت کی توفیق عطا کرے۔

---

عزل خلیفہ ہی کے سلسلہ مین ایک دوسری دلچسپ خبر یہ ہے کہ مسلمانان ہند کو

ہیجان غم و ہجوم بلا مین محصور دیکھکر ان کے دیرینہ کرمفرما و غمخوار، صوبہٗ متحدہ کے سابق خداوند حکومت، لارڈ مسٹن بہادر، بالقابہ العظیمہ، سے بالاخر ضبط نہ ہوسکا اور لارڈ موصوف نے اپنے قلم کو حرکت دے ہی دی۔ ارشاد ہوتا ہے، کہ آیندہ بجائے بیرون ہند کے منصب خلافت کو اندرون ہند، زیر سایۂ عاطفت مملکت برطانیہ منتقل کر دیا جائے، اور اس عہدہ کے لئے اسلامی ہند کے سب سے بڑے مسلمان رئیس کا نام بھی پیش فرمایا گیا ہے۔ خداوند قدوس و تعالیٰ کی خلافت کے مسئلہ مین ظاہر ہے کہ "خداوند مجازی" کے "خلیفہ برحق" سے بڑھکر کس کا فتویٰ مستند ہو سکتا ہے، اس مین تو چون وچرا کی گنجایش ہی نہین ہو سکتی، البتہ بعض "دانایان راز" کا قول ہے، کہ کسی دوسرے کا نام پیش کرنا محض مسٹن کے خلقی انکسار کا تقاضا، اور طبعی ایثار کا ثمرہ ہے، ورنہ درحقیقت، اس بارِ عظیم کے تحمل کی صلاحیت، اگر کسی فرد بشر مین ہو سکتی ہے، تو وہ خود لارڈ مسٹن ہی کی ذات ستودہ صفات ہے، جس نے واقعہ مسجد کانپور مین ثابت کر دیا تھا، کہ فقہ اسلامی مین اگر کوئی شخص مرتبۂ اجتہاد رکھتا ہے، تو وہ اُسکی، اور صرف اسی کی ذات گرامی ہے ؎

کب مد مقابل آئینہ تھا،
تم نے اپنی طرف نظر کی!

---

نیویارک سے خبر آئی ہے، کہ شکاگو (امریکہ) کے شفاخانہ ہاے مجانین مین اب ہر ہفتہ ڈیڑھ سو نئے داخلے ہونے لگے ہین۔ ڈاکٹر جیمس ہال، صدر انجمن تحقیقات جنون، کی تحقیق مین دیوانون کی تعداد مین یہ خوفناک اضافہ نتیجہ ہے مے نوشی کا۔ ڈاکٹر موصوف فرماتے ہین کہ شراب کے زہریلے اجزا، نظام بشری مین رفتہ رفتہ سرایت کر کے جسم و دماغ دونون کو مسخ کر دیتے ہین، اور اچھے بھلے انسانون کو چور، نقب زن، آبرو باختہ، بے حیا، اور خطرناک دیوانہ بنا دیتے ہین۔

یہ مغربی تمدن کی ایک برکت خود ایک "مغربی محقق" کی زبان سے ظاہر ہو رہی ہے، "مشرقی مقلد" کا اس پر حاشیہ و تبصرہ دونون بے محل ہوگا۔

اسی خبر کے پہلو بہ پہلو فرانس سے آئی ہوئی اس تازہ اطلاع کو بھی سُن لینا چاہیے، کہ وہان کے ایک ماہر کیمائیات مارسل رابرٹ نے الکحل کا سفوف تیار کر دینے کا اعلان کیا ہے۔ یعنی کسی کیمیاوی ترکیب سے شراب کو خشک کر کے سفوف کی صورت مین تبدیل کر دیا جائیگا، پُڑیہ جیب مین پڑی رہیگی اور گرم پانی کے گلاس مین ڈالتے ہی چھلکتا ہوا جام مے تیار ہو جائیگا، جو رنگ، بو، ذائقہ، غرض جملہ خصوصیات، اصل شراب کے رکھیگا اور جن ممالک مین علانیہ مے نوشی کے لیے قوانین امتناعی جاری ہو رہے ہین، وہان یہ جوہر لطیف شیدایانِ دخت رز کے لیے حرز جان کا کام دیگا۔

"غیر دن" کی اس ترقی پر "اپنون" کو زیادہ رشک کا موقع نہین۔ ہندوستان مین علوم جدیدہ کی توسیع اشاعت کے ساتھ عنقریب یہان بھی وہ ساعت سعید آنے والی ہے، جب اسی دل و دماغ، اسی دانائی و زیرکی، اسی ذہانت و ذکاوت کے موجدین، مکتشفین و مخترعین پیدا ہونے لگین گے۔ وہ نسل اب تقریباً مٹ چکی ہے، جو اَهْلُ الْجَنَّةِ بُلْهٌ پر ایمان رکھتی تھی۔ موسیٰؑ کے صدق و صفا، زہد و تقویٰ کا زمانہ گذر چکا، اب سامری کے ذہن و ذکا، ایجاد و اختراع کا دور دورہ ہے اور ہر اُس فتنہ کا ظہور لازمی ہو گیا ہے جو عقل و نفس سے پیدا ہو سکتا ہے۔ ع

زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم ست

---

تنہا مے نوشی پر انحصار نہین، اخلاق کے جسقدر بھی شعبے اب تک مشرق کو عزیز تھے، چشم بد دور، ہر شعبہ مین عقلیت و روشن خیالی کے ہی جلوے نظر آ رہے ہین۔ مرکز تمدن 'امریکہ' کے صرف ایک شہر شکاگو مین، صرف ایک سہ ماہی کی مدت (یعنی ۱۹۲۳ء کی اول سہ ماہی) مین طلاقون کی تعداد ۱۵۸۸ تک پہونچی ہے! اور یہ معلوم ہے کہ متمدن عدالتون مین طلاق صرف بدچلنی کا جرم ثابت ہو جانے پر ملتی ہے!

---

یہان تک پہونچ چکے ہین، تو آیئے انگلستان کی شریفانہ معاشرت سے بھی کیون بیگانہ رہ جائین۔ پچھلی ششماہی مین انگلستان و ویلس کے رجسٹرار جنرل کے دفتر نے جو اعداد شایع

گئے ہیں وہ اب اگرچہ کسی قدر پرانے ہو چکے ہیں، تاہم حالت کا اندازہ لگانے کے لئے کافی ہونگے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں افتراق ازدواجی کی مجموعی تعداد، جو ہر پچھلے سال سے زائد تھی، ۴۰۹۰ تک پہنچی تھی۔ سال مابعد، سنہ ۱۹۲۱ء میں مزید ترقی ہو کر ۳۵۲۲ ہو گئے!

طلاق وافتراق کی اس ترقی کے ساتھ، شرح پیدائش میں ترقی معکوس ہوئی، یعنی پیدا ہونے والے بچوں کی شرح گھٹتے گھٹتے ۴ء۲۲ فی ہزار رہ گئی۔ اتنی گھٹی ہوئی شرح سنہ ۱۸۳۶ء کے بعد سے (باستثنائے سنین جنگ عظیم) اور کبھی نہیں رہی تھی۔ ان پیدا ہونے والوں میں "جائز" (ہمارے تنگ وتاریک معیار کے بموجب نہیں، بلکہ ان کے وسیع وروشن معیار کے مطابق ولدالحرام) ولادتوں کی شرح ۵۴ فی ہزار رہی!

اعداد خاموش کی اس زبان کو کسی تبصرہ مزید کی حاجت باقی رہجاتی ہے۔؟

---

برکات تمدن کے ان مبارک مناظر سے اگر طبیعت ابھی نہ آسودہ ہوئی ہو، تو ایک اچٹتی ہوئی نظر اپنے ملک کے متمدن ترین شہر بمبئی پر بھی کرتے چلیں۔ جسکے نصیب میں قدرت نے علمبرداران تہذیب وشائستگی کے اولین خیر مقدم پیش کرنے کا شرف رکھا ہے۔ سرکاری رپورٹ کا بیان ہے کہ سنہ ۱۹۲۱ء میں صیغہ پولیس پر، جسکا مقصد وحید نظم وامن کا قیام اور جرائم کا انسداد ہے، ایک کروڑ ۳۹ لاکھ صرف ہوا، جو سال ماسبق (سنہ ۱۹۲۰ء) کے مقابلہ میں بقدر ۱۵ لاکھ کے زائد تھا۔ یہ صرف کس حد تک حق بجانب تھا، اس کے جواب میں اعداد ذیل ملاحظہ ہوں:-

| سال | تعداد جرائم |
|---|---|
| سنہ ۱۹۱۷ء | ۳۳۶۶۸ |
| سنہ ۱۹۱۸ء | ۳۹۳۱۱ |
| سنہ ۱۹۱۹ء | ۴۰۰۶۹ |
| سنہ ۱۹۲۰ء | ۴۱۴۰۶ |
| سنہ ۱۹۲۱ء | ۴۳۰۱۷ |

لیکن یہ تمام واقعات واعداد، دلائل وشواہد، حقائق وبصائر، ایک طرف اور فطرت کا قانون دوسری طرف - جو لوگ سالہا سال کی بداعمالیون اور بدکرداریون سے اپنے قلوب کو سیاہ، اور اپنی فطرت سلیم کو مسخ کر چکے ہین، اُن کے نزدیک پند وموعظت، عبرت وبصیرت کا یہ سارا دفتر، غرق مئے ناب اولی -

وَإِنْ يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَا يُؤْمِنُوا بِهَا (انعام ۳)

یہ لوگ ساری کی ساری نشانیان دیکھ لین، تو بھی ایمان لانے والے نہین -

بدیہی سے بدیہی آیات وشواہد پر بھی ان کی مسخ شدہ فطرت کوئی نہ کوئی عذر

كَذَٰلِكَ نَسْلُكُهُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ ٥ (حجر ۱)

یقیناً تلاش کر ہی لیتی ہے اور ہر آیت کے جواب مین قوت اعظم ان مجرمون کے دلون مین کوئی شرارت ڈال ہی دیتی ہے اور یہ کچھ نئی بات نہ ہوگی اگلون پر بھی یہی چلا آیا ہے

---

مشیت الٰہی نے ملکوتیت وقدوسیت کی طرح بہیمیت ومادیت، ضلالت وخباثت کی قوتون کو بھی پورے نشو ونما کا موقع دے رکھا ہے - ان قوتون کو جس شخصیت مین جمع کر دیا ہے اسکا نام قرآنی اصطلاح مین ابلیس ہے، اور اس کی زیرکی ودانائی، فرزانگی وہمہ دانی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے، کہ مذہبی لٹریچر مین اس کا لقب ابتک "معلم الملکوت" چلا آتا ہے - اس سب سے بڑی ذہین، زیرک ہستی نے روز ازل ہی صاف صاف کہدیا تھا،

قَالَ أَنْظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ٥ قَالَ إِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ ٥ قَالَ فَبِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ ثُمَّ لَآتِيَنَّهُمْ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ ٥ (اعراف، ع ۲)

کہ مین خلقت کو گمراہ کرنے مین کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھون گا - ان کے پاس سامنے سے بھی آؤنگا، اور پیچھے سے بھی، داہنے سے بھی اور بائین سے بھی، اور ان مین سے اکثرون کو گمراہ کر کے رہون گا -

حکومتون کے ایوانات شاہی اور وزارت خانے، کونسلین اور سیاسی مجلسین، دار العلوم

ودارالفنون، یونیورسٹیاں اور سائنس کی لیبوریٹریاں (تجربہ گاہیں) سب کی سب الا ماشاء اللہ اسی قوت شیطانی کے [illegible] مظاہر ہیں۔

---

آج سے ٹھیک ایک سال قبل ان اوراق میں جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڈھ کے سالانہ جلسہ کا ذکر آیا تھا، اور اس سلسلہ میں ڈاکٹر پی سی رے کے خطبہ پر سختی کے ساتھ نکتہ چینی کی گئی تھی۔ آج پھر وہی موقع ہے۔ ابکی مرتبہ جلسہ سالانہ کی صدارت مولانا مارماڈیوک محمد پکتھال ایڈیٹر بمبئی کرانیکل نے کی، جو ایک انگریز مسلم ہیں۔ مولانا موصوف نے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا، وہ ہر طرح اُن توقعات کے مطابق تھا، جو کرانیکل کے فاضل ایڈیٹر سے کی جاسکتی تھیں۔ پسال گذشتہ جامعہ نے جو شدید غلطی ڈاکٹر رے سے ایڈرس پڑھوا کر کی تھی، الحمد للہ کہ اس معصیت کا کفارہ ایک بڑی حد تک مولانا پکتھال کے ایڈرس سے ہوگیا۔

---

پکتھال کو اسلام کی حلقہ بگوشی میں آئے ہوئے ابھی بہت زیادہ عرصہ نہیں گذرا، لیکن اس قلیل مدت میں اس نے اسلام سے جسقدر صحیح واقفیت حاصل کرلی ہے، وہ مسلمان عوام کے لئے، صدہا مسلمان علماء کے لئے باعث رشک ہو۔ وہ صدرا و شمس بازغہ کے چکر میں نہیں، نہ قدوری و درمختار میں الجھ کر رہگیا ہے، اور نہ جلالین وکمالین کا مطالعہ اپنے لئے معراج کمال سمجھتا ہے۔ اس کی نظر قرآن اور صرف قرآن پر ہے۔ اور اسی کی برکت ہے کہ جتنی بصیرت اسے حاصل ہوگئی ہے، اس کی عشر عشیر بھی ہمارے اکثر خاندانی علماء کو نصیب نہیں۔ چند جزئیات میں یقیناً گفتگو کی گنجایش ہے، مثلاً بعض احادیث نبوی جن الفاظ میں نقل کی ہیں، ان صورتوں کے ساتھ ان کی صحت کم از کم مشتبہ ضرور ہے تاہم بہ حیثیت مجموعی جس خوبی و وقت نظر کے ساتھ تعلیمات اسلامی کی توضیح و تشریح کی گئی ہے، اس کے اعتبار سے ایڈرس ہر طرح قابل دید و قابل داد ہے، اور داد یہی ہے، کہ اس پر عمل کیا جائے۔ جامعہ کے کارکنان اس مرتبہ کے انتخاب صدارت پر ساری دنیائے اسلام کی جانب سے یقیناً مخلصانہ تہنیت کے مستحق ہیں۔

# نغمۂ نعت

(از سید محمد علی عرش ملیح آبادی مرحوم)

پھیلی ہوئی وہ شمع مدینہ کی ضیا ہے
جس نخل کو دیکھو شجرِ طور بنا ہے

یہ دل ہوس دیدِ پیمبر میں مٹا ہے
اس سر میں بھری رشت مدینہ کی ہوا ہے

سر تن جو سر زلف سخن عقدکشا ہے
نالہ بھی رسا ہے مری قسمت بھی رسا ہے

جاتا ہے مدینہ کی طرف قافلۂ عمر
میرا نفس سرد نہیں بانگِ درا ہے

تسکین ہوئی عرش کی جس سے شب اسریٰ
مسجود ملائک وہی نقش کفِ پا ہے

گر ناخن حضرت کا اڑا یا نہیں حنا کا
پھر کیوں مہِ نو آج تک انگشت نما ہے

آتا ہے اگر حشر تو پروا نہیں کوئی
دیوانۂ احمد کی سزا ہے نہ جزا ہے

موت آئی یہاں جس کو وہ ہے زندۂ جاوید
صحرائے مدینہ بھی عجب روح فزا ہے

اس رحمتِ عالم کی شفاعت کے مقابل
اے عرش خطاؤں کا نہ ہونا بھی خطا ہے

جلیل قدوائی آنادی

# عربی شاعری کی خصوصیات

## (۱)

ادبیات عجم کا لذت آشنا رنگا رنگ جواہرات مضامین کی تلاش مین جب کلام عرب کے دریا مین غوطہ لگاتا ہے تو جو کچھ اُسے ہاتھ آتا ہے اُس کو عجیب نگاہ سے دیکھتا ہے۔ زبان عربی کی مالداری اور قدامت و شہرت، اسلام کی تہذیب و تمدن اور جاہ و جلال اور سب سے بڑھکر اس کا مذہبی تقدس و احترام اُسے اس شبہہ مین ڈال دیتا ہے کہ یہ موتی اگرچہ ہماری آنکھون مین خوش آب نہین دکھائی دیتے لیکن ہون گے گران بہا۔ ان کی قیمت کا اندازہ لگانے مین وہ اپنے آپ کو نالائق سمجھتا اور اپنے ندیدہ پن کو قدر ناشناسی کا ملزم قرار دے لیتا ہے۔ لیکن میرے خیال مین کلام عرب مین (جس سے میری مراد کلام جاہلیت ہے) شستگی زبان اور عجمی تخیلات کی باریکیان ڈھونڈھنا یا ثابت کرنا ویسا ہی ہے جیسے شکسپیر اور ملٹن کے کلام سے کمر اور دہن کی نفی اور زلف کے دل عاشق کا دھوان ہونے کا اثبات۔ ایک غیر مہذب، جاہل، مفلس، صحرانشین قوم کو نہ وہ باریک خیالات میسر آ سکتے ہین نہ اُن کی تشکیل کے لیے الفاظ مل سکتے ہین جو شائستہ، متمدن، تعلیم یافتہ، دولتمند اقوام کی قدرتی خصوصیات ہین۔ بادیہ نشین اقوام کی شاعری کا طرۂ امتیاز اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے تو اُس کی سادگی و بے تکلفی، اصلیت اور سچائی جیسے ہندوستان کے کسی گاؤن مین چرواہے کا گیت، جس مین دہقانی لڑکی کی محبت کا صاف صاف تذکرہ ہوتا ہے۔ چشمے یا تالاب پہ اُس کے کپڑے دھونے کی تصویر، بھینس کا دودھ دہنے کی ادا، اُپلے تھاپنے کی شان اور مکھن نکالنے کا بیان ہو۔ عاشق چرواہے سے اس کی ہیلوتی، ارہر کے کھیت مین جھینکا جھوری (ہاتھا پائی) لاکھ کی موٹی موٹی سرخ چوڑیون اور کنگنون کا ٹوٹ جانا، اور مرگ (دہرن) کی طرح طرارے بھرتے ہوئے اُس کا نکل جانا وغیرہ روستائی زندگی ہمین اس لئے پسند آتی ہے کہ وہ ہماری معاشرت سے جداگانہ، سادہ، بے تکلف اور قدرتی

ہوتی ہے - اب کوئی اجنبی قوم اس قسم کے گیت ہماری ادبیات میں کہیں دیکھ پاسے اور اُن سے وہ نکات ولطائف پیدا کرے جو مہذب و اعلیٰ ادبیات کی خصوصیات ہوں تو آپ اس کی سخن فہمی کے متعلق کیا رائے قائم کرینگے؟

چھٹی صدی عیسوی کے اوائل کے شعراء کے کلام کو کلام عرب کا نمونہ قرار دیں تو جو چیز ہم سے خراج تحسین وصول کرتی ہے وہ اس کی سادگی اور بے ساختہ پن و جو بے تکلفی کے درجے تک ہے - جو خیال شاعر کے ذہن میں آتا ہے اُسے بے دھڑک بیان کردیتا ہے - ہماری طرح عامیانہ رکیک یا مبتذل قبایح یا فحش تک کی پروا نہیں کرتا - وہ اس کے چال چلن کا اصلی رنگ اور صحیح واقعہ ہوتا ہے - ہم اس کی داد اس لیے دیتے ہیں کہ شاعر پر جو کچھ گذرتی ہے بلا پردہ اسے بلا کم و کاست صاف کہدیتا ہے اور اس طرح ہم اس کے کلام میں اس کی زندگی شائستگی اور جذبات کی صحیح تصویر دیکھ لیتے ہیں - ہم دیکھتے ہیں کہ ایک عرب اپنے عشق اور اس کے اظہار میں بے باک ہوتا ہے اور کامیابی کے لیے سر ہتھیلی پر رکھ لیتا ہے - اس کا عشق نفسانی ہے - عجمی عشق مجازی (جس کا برعکس نام ”حقیقی“ رکھا گیا ہے) یا عشق ناکام کبھی عرب کے دماغ میں داخل نہیں - وہ ایک طرف شرابخواری وعیاشی کا پتلا ہے، دوسری طرف ایثار کا مجسمہ - وہ جان کو کوئی چیز نہیں سمجھتا، مال کی پروا نہیں کرتا، آن پر جان دیتا اور مہمان پر گھر کی دولت نثار کردیتا ہے - ان مردانہ بدوی خصائل سے ماوراء کوئی لطیف جذبہ نہ وہ رکھتے تھے نہ ہمیں مل سکتا ہے - اگر یہ خصائص دریافت کرنا ہوں تو کلام عرب ان سے معمور اور بھرپور ملیگا - نمونہ کے طور پر ہم جابجا سے دلچسپ اقتباسات پیش کرتے ہیں -

**امرءالقیس** شعراء معلقات میں سب سے زیادہ مشہور ومقبول شاعر امرءالقیس ۵۴۰ء کے قریب انقرہ (انگورہ) میں اپنی دلیرانہ عشقبازی کی بدولت زہر سے ہلاک ہوا اور بقول ابن قتیبہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے چالیس سال پہلے گذرا - اس نے ان اشعار میں اپنی عشقبازی کی کتنی جیتی جاگتی اور مردانہ وار تصویر کھینچی ہے:-

أَلَا رُبَّ يَوْمٍ كَانَ مِنْهُنَّ صَالِحٍ — وَلَا سِيَّمَا يَوْمٌ بِدَارَةِ جُلْجُلِ

| | |
|---|---|
| وَيَوْمَ عَقَرْتُ لِلْعَذَارَى مَطِيَّتِي | (فَيَا عَجَبًا مِنْ كُورِهِ الْمُتَحَمَّلِ) |
| فَظَلَّ الْعَذَارَى يَرْتَمِينَ بِلَحْمِهَا | وَشَحْمٍ كَهُدَّابِ الدِّمَقْسِ الْمُفَتَّلِ |
| وَيَوْمَ دَخَلْتُ الْخِدْرَ خِدْرَ عُنَيْزَةٍ | فَقَالَتْ لَكَ الْوَيْلَاتُ إِنَّكَ مُرْجِلِي" |
| تَقُولُ (وَقَدْ مَالَ الْغَبِيطُ بِنَا مَعًا) | "عَقَرْتَ بَعِيرِي يَا امْرَأَ الْقَيْسِ فَانْزِلِ |
| فَقُلْتُ لَهَا سِيرِي وَأَرْخِي زِمَامَهُ | وَلَا تُبْعِدِينِي مِنْ جَنَاكِ الْمُعَلَّلِ |

خلاصہ کلام یہ ہے کہ شاعر محبوبہ کے ترک کئے ہوئے خیمہ گاہ کے نشان[1] پر کھڑا ہوا ایام وصل کی لذتون کو یاد کرتا ہے۔ ہاے وہ بھی کیا دن تھے کہ تالاب دارۃ الجلجل پر میرا گذر ہوا جہان دوشیزہ لڑکیان نہا دھو رہی تھین! ان کی ضیافت کے لیئے مینے اپنی سواری کا اونٹ قربان کر دیا جس کا کجاوہ وغیرہ انھین سے اونٹون پر لادا گیا۔ وہ شوخ لڑکیان گوشت اور چربی کھاتی بھی جاتی تھین اور ایک دوسری پر پھینک پھینک کر کھیلتی اور بربادبھی کرتی جاتی تھین۔ جب چلنے کی نوبت آئی تو مین عنیزہ کے ساتھ اس کے کجاوے مین جا بیٹھا۔ وہ بولی تیرا ناس ہو تو مجھے پاپیادہ چلائیگا؟ (یعنی میرا اونٹ بوجھ سے مرجائیگا اور پیدل چلنا ہوگا) جب ہمارے بار سے ہودج ایک طرف کو جھکنے لگا تو وہ دلربا بولی اونٹ کی پیٹھ تو تو نے زخمی کر دی۔ تو اُتر جا۔ مینے کہا اُونٹ کی نکیل ڈھیلی کردو اور چپ چاپ چلی چلو اور مجھے ایک فوارا پنے پھل چننے (بوسون) سے محروم نہ رکھو۔

اپنی ایک محبوبہ کا سراپا جو امراء القیس کھینچتا ہے کس قدر قدرتی اور دلکش ہے! کوئی استعارہ بعید نہین۔ ہر تشبیہ اپنے دیس کی اور آس پاس سے ہے تصنع کا نشان نہین۔

[1] ملک ویران بیابان ہونے کے باعث بدوی عرب پانی اور سبزی کی جستجو مین تمام صحرا کی خاک چھانتے پھرتے تھے جہان پانی مل گیا ڈیرے ڈال دیے۔ جبتک پانی رہا مقیم رہے۔ جب خشک ہوگیا ڈنڈے خیمے اُٹھا کر دوسری طرف نکل گئے۔ اسی لئے ان کی زندگی ہمیشہ سے خانہ بدوش رہی جہان اوترپڑے وہی وطن ہے۔ ابھی ایک خطہ ایک قبیلہ سے آباد ہے ابھی اس کے رخصت ہوتے ہی ویران پھر چولھے کی اینٹون یا خیمہ کی گرداگرد نالی کے سوا کوئی نشان نہین رہجاتا۔ شاعر عموماً انہین نشانات سے منزل جانان کو پہچان اپنے عیش گذشتہ کا نوحہ پڑھتا ہے جو اُس کے قصیدہ کی تشبیب ہوتا ہے۔

هَصَرْتُ بِفَوْدَيْ رَأْسِهَا فَتَمَايَلَتْ ⁽¹⁾ عَلَيَّ هَضِيمَ الْكَشْحِ رَيَّا الْمُخَلْخَلِ
مُهَفْهَفَةٌ بَيْضَاءُ غَيْرُ مُفَاضَةٍ تَرَائِبُهَا مَصْقُولَةٌ كَالسَّجَنْجَلِ
كَبِكْرِ الْمُقَانَاةِ الْبَيَاضِ بِصُفْرَةٍ غَذَاهَا نَمِيرُ الْمَاءِ غَيْرُ مُحَلَّلِ
تَصُدُّ وَتُبْدِي عَنْ أَسِيلٍ وَتَتَّقِي بِنَاظِرَةٍ مِنْ وَحْشِ وَجْرَةَ مُطْفِلِ
وَجِيدٍ كَجِيدِ الرِّئْمِ لَيْسَ بِفَاحِشٍ إِذَا هِيَ نَصَّتْهُ وَلَا بِمُعَطَّلِ
وَفَرْعٍ يَزِينُ الْمَتْنَ أَسْوَدَ فَاحِمٍ أَثِيثٍ كَقِنْوِ النَّخْلَةِ الْمُتَعَثْكِلِ
غَدَائِرُهَا مُسْتَشْزِرَاتٌ إِلَى الْعُلَى تَضِلُّ الْعِقَاصُ فِي مُثَنًّى وَمُرْسَلِ
وَكَشْحٍ لَطِيفٍ كَالْجَدِيلِ مُخَصَّرٍ وَسَاقٍ كَأُنْبُوبِ السَّقِيِّ الْمُذَلَّلِ
وَتَعْطُو بِرَخْصٍ غَيْرِ شَثْنٍ كَأَنَّهُ أَسَارِيعُ ظَبْيٍ أَوْ مَسَاوِيكُ إِسْحِلِ
تُضِيءُ الظَّلَامَ بِالْعِشَاءِ كَأَنَّهَا مَنَارَةُ مُمْسَى رَاهِبٍ مُتَبَتِّلِ
إِذَا قَامَتَا تَضَوَّعَ الْمِسْكُ مِنْهُمَا نَسِيمَ الصَّبَا جَاءَتْ بِرَيَّا الْقَرَنْفُلِ
إِلَى مِثْلِهَا يَرْنُو الْحَلِيمُ صَبَابَةً إِذَا مَا اسْبَكَرَّتْ بَيْنَ دِرْعٍ وَمِجْوَلِ

میں نے اس کی زلفیں پکڑ کر اپنی طرف جھکائیں تو وہ میری طرف جھک گئی۔ اس کی کمر پتلی اور پنڈلی پُرگوشت تھی، پتلی کمر، گورا چٹا جسم، پیٹ برابر (کشمیری توند نہیں) سینے آئینہ کی طرح چمکدار۔ اس کا رنگ سیب کی طرح زردی مائل، یا اس موتی کی طرح جس نے صاف شفاف پانی میں پرورش پائی ہو۔ منھ پھیرتی ہے تو بھی اسکے نرم نرم گال دکھائی دیتے ہیں (یعنی پھولے پھولے اُبھرے اُبھرے ہیں) اور صحرائے وجرہ کی بچہ والی ہرنی کی سی آنکھ سے آڑ کر لیتی ہے۔ (ہرنی اپنے بچے کو جس آنکھ سے دیکھتی ہے اس کی دلربائی صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے) مقام کی تعیین نے اصلیت کا لطف بڑھا دیا)۔ اس کی گردن سپید براق ہرنی کی سی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ گردن اُٹھانے کے وقت ویسی لمبی بے ڈول نہیں ہو جاتی نہ ویسی زیوروں سے ننگی ہے۔ اس کے بال اس کی پیٹھ پر

(1) یہ بیت اسی قصیدہ کے ایک درمقام سے ماخوذ ہے جہاں شاعر اپنی محبوبوں کی صفت بیان کر رہا ہے۔

پڑے بہار دکھاتے تھے، کوئلے کی طرح سیاہ، کھجور کے خوشہ کی طرح گھنے گھونگر والے، لٹین اوپر کو گندھی ہوئی تھین اور جوڑا گندھے اور بے گندھے بالون مین غائب تھا۔ اس کی کمر اونٹ کی نکیل کی طرح پتلی اور پنڈلی نے کی طرح نرم۔ جب کوئی چیز پکڑتی ہو تو اس کی نرم و نازک انگلیان ایسی معلوم ہوتی ہین جیسی وادی ظبی کے کیڑے (جن کے جسم سفید اور سرخ ہوتے ہین) یا درخت اسحل کی پتلی پتلی سڈول مسواکین۔ وہ اپنے حسن و جمال سے رات کی تاریکی کو یون روشن کر دیتی ہے جیسے کوہ نشین راہب کا بلند چراغ۔ وہ نازنین جب کھڑی ہوتی ہین تو اُن کے جسم سے مشک کی ایسی لپٹ آتی ہے، جیسے صبا کے ہلکے جھونکے لونگ کی خوشبو لاتے ہین۔ جب وہ محرم کسکر اور کرتی پہنکر سیدھی تنکر کھڑی ہو جاتی ہے تو متین سے متین اور متحمل مرد اسے پیار کی نظر سے تکتا رہجاتا ہے۔

امرؤالقیس اپنے معلقہ سے اگر ایک طرف بزم عیش کا کنہیا جی نظر آتا ہے تو دوسری طرف عرصۂ رزم کا رستم۔ اپنے گھوڑے کی تعریف مین وہ شاعری کی ہے کہ اسے بھی ایک ہیرو بنا چھوڑا ہے۔ ہر صفت اصلیت کا پتہ دیتی ہے۔ اور ایک تیز بے چین بہری گھوڑے کی تصویر سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔

وقد اغتدي والطير في وكناتها　　بمنجرد قيد الاوابد هيكل
مكر مفر مقبل مدبر معا　　كجلمود صخر حطه السيل من عل
كميت يزل اللبد عن حال متنه　　كما زلت الصفواء بالمتنزل
على الذبل جياش كان اهتزامه　　اذا جاش فيه حميه غلي مرجل
درير كخذروف الوليد امره　　تتابع كفيه بخيط موصل
له ايطلا ظبي وساقا نعامة　　وارخاء سرحان وتقريب تتفل

صبح سویرے جب چڑیان اپنے گھونسلون مین ہوتی ہین مین ایک بلند قامت چھوٹے بالون والے گھوڑے پر سوار ہو کر نکل جاتا ہون، جو جنگلی جانورون کا شکار کیا کرتا ہے۔ پھرتی سے حملہ کرنے والا، جھٹ مڑ جانے والا، ایک دم مین آگے بڑھ جانے اور پیچھے

ہٹ جانے والا۔ گویا ایک عظیم الشان چٹان ہے جسے سیلاب نے بلندی سے نیچے لڑھکا دیا ہو۔ رنگ کمیت ہے۔ اس کا زین اس کی پیٹھ سے پھسل پھسل جاتا ہے جیسے چکنے سنگ مرمر سے بارش کے قطرے پھسل جاتے ہیں۔ لاغری کے باوجود رفتار کے وقت یہ جوش دکھاتا ہے کہ اس سے اُبلتی ہوئی ہانڈی کی آواز نکلتی ہے۔ ایسا تیز رو ہے جیسے لڑکوں کی پھرکی کہ ایک تاگے کے بیچ سے ڈورا ڈالکر اسے باری باری دونوں ہاتھوں سے بٹتے اور گھماتے ہیں۔ اس کی کمر ہرن کی، پنڈلی شترمرغ کی، جھپٹ بھیڑیے کی اور رفتار لومڑی کی ہے۔

## عمرو بن کلثوم تغلبی

عمرو بن کلثوم کا معلقہ داستان عشق کی دل آویزی میں امرؤالقیس تک تو نہیں پہونچتا مگر بہادری شجاعت وحریت کے جذبات دکھانے کی زیادہ کامل اور جاندار تصویر ہے۔ کہتے ہیں کہ عمرو بن ہند فرمانروائے حیرہ (۵۵۴ء تا ۵۶۹ء) نے ایک روز اپنے مصاحبوں سے پوچھا "تم کسی عرب کو بتا سکتے ہو جسکی ماں میری ماں کی خدمت سے انکار کی جرأت کرے؟" انھوں نے کہا "ہاں ایک عرب۔ عمرو بن کلثوم تغلبی کی ماں"۔ بادشاہ نے اس دعوے کی تصدیق کے لئے عمرو تغلبی اور اُس کی ماں کی دعوت کی۔ عمرو بادشاہ کے حضور میں بٹھایا گیا اور اس کی ماں حرم سرا میں بادشاہ کی ماں کے پاس۔ لونڈیاں کنارے کردی گئی تھیں۔ بادشاہ کی ماں لیلیٰ نے دسترخوان پر کسی برتن کی طرف اشارہ کرکے کہا "ذرا ادھر بڑھا دینا"۔ بڑھیا نے جواب دیا لتقم صاحب الحاجۃ الی حاجتھا "حاجتمند اپنی حاجت آپ اٹھکر پوری کرلے"۔ لیلیٰ نے باربار مانگا۔ اس پر بڑھیا پکار اٹھی "دوڑیو بنی تغلب!" عمرو بن کلثوم ماں کی آواز پر اٹھ کھڑا ہوا، تلوار نکال کر وہیں بادشاہ کا سر اوڑا دیا۔[1] پھر تو دونوں طرف سے خوب معرکہ آرائی ہوئی۔ عمرو بن کلثوم کے معلقہ میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ اس کی یاد میں شاعر اس طرح بپھر جاتا ہے کہ معرکہ کارزار از سر نو پیش نظر ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ عمرو بن ہند کو مخاطب کرکے للکارتا ہے یہی اشعار

[1] کتاب الاغانی ج ۹ صفحہ ۱۸۲

اس معلقہ کا مایۂ ناز ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حصۂ قصیدہ عمرو بن ہند کی زندگی میں نظم ہو چکا، باقی حصہ شاعر نے بعد کو پورا کیا ہے۔

أَبَا هِنْدٍ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْنَا ... وَأَنْظِرْنَا نُخَبِّرْكَ الْيَقِينَا
بِأَنَّا نُورِدُ الرَّايَاتِ بِيضًا ... وَنُصْدِرُهُنَّ حُمْرًا قَدْ رَوِينَا
وَأَيَّامٍ لَنَا غُرٍّ طِوَالٍ ... عَصَيْنَا الْمَلْكَ فِيهَا أَنْ نَدِينَا
وَسَيِّدِ مَعْشَرٍ قَدْ تَوَّجُوهُ ... بِتَاجِ الْمُلْكِ يَحْمِي الْمُحْجَرِينَا
تَرَكْنَا الْخَيْلَ عَاكِفَةً عَلَيْهِ ... مُقَلَّدَةً أَعِنَّتَهَا صُفُونَا
أَلَا لَا يَعْلَمِ الْأَقْوَامُ أَنَّا ... تَضَعْضَعْنَا وَأَنَّا قَدْ وَنِينَا
أَلَا لَا يَجْهَلَنْ أَحَدٌ عَلَيْنَا ... فَنَجْهَلَ فَوْقَ جَهْلِ الْجَاهِلِينَا
بِأَيِّ مَشِيئَةٍ عَمْرَو بْنَ هِنْدٍ ... نَكُونُ لِقَيْلِكُمْ فِينَا قَطِينَا
تُهَدِّدُنَا وَتُوعِدُنَا رُوَيْدًا ... مَتَى كُنَّا لِأُمِّكَ مَقْتَوِينَا
فَإِنَّ قَنَاتَنَا يَا عَمْرُو أَعْيَتْ ... عَلَى الْأَعْدَاءِ قَبْلَكَ أَنْ تَلِينَا
وَنُوجَدُ نَحْنُ أَمْنَعَهُمْ ذِمَارًا ... وَأَوْفَاهُمْ إِذَا عَقَدُوا يَمِينَا
وَنَحْنُ غَدَاةَ أُوقِدَ فِي خَزَازٍ ... رَفَدْنَا فَوْقَ رَفْدِ الرَّافِدِينَا
عَلَى آثَارِنَا بِيضٌ حِسَانٌ ... نُحَاذِرُ أَنْ تُقَسَّمَ أَوْ تَهُونَا
أَخَذْنَ عَلَى بُعُولَتِهِنَّ عَهْدًا ... إِذَا لَاقَوْا الْكَتَائِبَ مُعْلَمِينَا
لِكَيْ يَسْلُبْنَ أَفْرَاسًا وَبِيضًا ... وَأَسْرَى فِي الْحِبَالِ مُقَرَّنِينَا
يَقُتْنَ جِيَادَنَا وَيَقُلْنَ لَسْتُمْ ... بُعُولَتَنَا إِذَا لَمْ تَمْنَعُونَا
إِذَا مَا الْمَلْكُ سَامَ النَّاسَ خَسْفًا ... أَبَيْنَا أَنْ نُقِرَّ الذُّلَّ فِينَا

اے عمرو بن ہند ہمارے معاملے میں جلدی نہ کر۔ ذرا صبر کر کہ ہم تجھے کچھ سچی باتیں سنا دیں۔ ہم وہ ہیں کہ اپنے نیزے دشمنوں کے سینوں میں سفید براق اتارتے ہیں اور ان سے خون سے سرخ و تر کھینچتے ہیں۔ ہمارے بڑے بڑے مشہور دن ہیں جن میں ہم نے بادشاہ کی اطاعت کے عوض سرکشی کی ہے۔ بڑے بڑے زبردست صاحب تاج و تخت سرداروں پر جن کی

حمایت و پناہ ڈھونڈھی جاتی تھی ہم نے تاخت کرکے اپنے گھوڑے اُن مین لاکھڑے کردیے اور اُن کی باگین اُن کے گلون مین ڈالدین (یعنی قید کرلیا)۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اب ہم ذلیل وکمزور ہوگئے ہین۔ ہان کوئی ہم سے اجڈپن نہ کرے ورنہ ہم سوا جڈون کے ایک اجڈپن اور اُجڈپن دکھادین گے۔ اے عمرو بن ہند بتادے کہ تونے ہم مین کون سا ضعف دیکھا ہے کہ ہم پر اپنا گورنر متعین کرکے ہمین اسکا غلام بنانا چاہتا ہے؟ تو ہمین دھمکاتا اور ڈراتا ہے بھلا ہم نے کب تیری مان کی غلامی کی ہے؟ اے عمرو بن ہند ہمارے نیزے ایسے نہین کہ تجھ سے پہلے کبھی کسی دشمن کے مقابلے مین نرم پڑے ہون۔ پس اب بھی ان سے کوئی نرمی کی توقع نہ رکھے۔ ذمہ اور حقوق کے ادا کرنے اور وعدے وفا کرنے مین ہم سب سے سخت ہین۔ جس دن اعلان جنگ کے طور پر کوہ خزار پر آگ روشن کی گئی تھی تو ہم نے سارے مددگارون سے زیادہ مدد کی تھی۔ میدان کارزار مین ہمارے پیچھے ہماری خوبصورت عورتین ہوتی ہین جن کے قید ہونے لونڈی بنائے جانے اور ذلیل ہونے کا ہمین بڑا خیال رہتا ہے جب ان کے شوہر نشان لگا لگا کر مقابلے کو نکلتے ہین تو یہ اُن سے عہد لیتی ہین کہ دشمنون کے گھوڑے اور ہتھیار چھین لائین، اور قیدیون کو رسیون مین باندھ لائین یہ ہمارے اصیل گھوڑون کی خدمت کرتی ہین اور یہ بھی کہتی ہین کہ اگر تم نے ہم کو دشمنون سے نہ بچایا تو تم ہمارے شوہر نہین۔ جب بادشاہ خلق کو ذلت پر مجبور کرے تو ہم اسے قبول نہین کرتے۔

## طرفۃ بن العبد

طرفۃ بن العبد اپنے معلقہ مین زنانہ رنگین ہودون والی قطار شتر کو کتنی اچھوتی تشبیہ دیتا ہے۔

كَأَنَّ حُدُوجَ الْمَالِكِيَّةِ غُدْوَةً ... خَلَايَا سَفِينٍ بِالنَّوَاصِفِ مِنْ دَدِ

عُدَوْلِيَّةٌ أَوْ مِنْ سَفِينِ ابْنِ يَامِنٍ ... يَجُورُ بِهَا الْمَلَّاحُ طَوْرًا وَيَهْتَدِي

يَشُقُّ حَبَابَ الْمَاءِ حَيْزُومُهَا بِهَا ... كَمَا قَسَمَ التُّرْبَ الْمُفَايِلُ بِالْيَدِ

صبح وداع کو قبیلہ مالکیہ کے کجاوے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے وادی دد کے دھارے مین ابن یامن کی عدولی کشتیان چلی جارہی ہون کہ ملاح کبھی انھین

سیدھا چلا جاتا ہے کبھی ٹیڑھا۔ یہ کشتیاں موجوں کو اسطرح چیرتی چلی جاتی ہیں جیسے لڑکے کوڑی چھپوا کھیلنے میں مٹی کے دو حصے کر دیتے ہیں۔ اسی سلسلہ ہودج کی تشبیہ لبید نے بھی خوب پیدا کی ہے۔ کہتا ہے:۔

حُفِزَتْ وَزَايَلَهَا السَّرَابُ كَأَنَّهَا　　أَجْزَاعُ بِيشَةَ أَثْلُهَا وَرِضَامُهَا

یہ اونٹ روانہ ہوگئے۔ سراب درمیان میں حائل تھا، اس لئے دور سے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے وادی بیشہ کی جھاڑی کی چٹانوں یا جھاؤ کے درختوں کی قطار۔ اسی مضمون کو زہیر بن ابی سلمیٰ نے بھی کیسی پیاری تشبیہ سے رونق دی ہے!

كَأَنَّ فُتَاتَ الْعِهْنِ فِي كُلِّ مَنْزِلٍ　　نَزَلْنَ بِهِ حَبُّ الْفَنَا لَمْ يُحَطَّمِ

جہاں جہاں یہ ہودج نشین لڑکیاں مقام کرتی تھیں ان کے ہودج کے تڑ (یا لالی جالی) کے سرخ سرخ اونی ٹکڑے رس بھری معلوم ہوتے تھے۔

طرفہ اپنے معلقہ میں تین تمناؤں کا پرجوش اظہار کرتا ہے جو بدوی جذبات کا خلاصہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قصیدہ اُس نے سزائے موت بھگتنے وقت کہا تھا۔ اگر یہ صحیح ہے تو ان کے سچے اور مخلصانہ ہونے میں کوئی شک نہیں رہتا:۔

فَلَوْلَا ثَلَاثٌ هُنَّ مِنْ كَدَّةِ الْفَتَى　　وَجَدِّكَ لَمْ أَحْفِلْ مَتَى قَامَ عُوَّدِي
فَمِنْهُنَّ سَبْقِي الْعَاذِلَاتِ بِشَرْبَةٍ　　كُمَيْتٍ مَتَى مَا تُعْلَ بِالْمَاءِ تُزْبِدِ
وَكَرِّي إِذَا نَادَى الْمُضَافُ مُحَنَّبًا　　كَسِيدِ الْغَضَا نَبَّهْتَهُ الْمُتَوَرِّدِ
وَتَقْصِيرُ يَوْمِ الدَّجْنِ (وَالدَّجْنُ مُعْجِبٌ)　　بِبَهْكَنَةٍ تَحْتَ الْخِبَاءِ الْمُعَمَّدِ

اگر زندگانی کی تین لذتیں نہ ہوتیں تو تیرے دادا کی قسم میں موت کی پروا نہ کرتا۔ ان میں سے ایک (۱) شراب ناب ہو کہ پانی ملانے سے جھاگ لائے اور حضرت ناصح کی ملامت سے پہلے اُسے اوڑا جائے (۲) جب کوئی لڑائی میں گھر جائے اور مجھکو حالت اضطرار میں پکارے تو بپھرے ہوئے پیاسے بھیڑیے کی طرح اُس کے دشمن پر ٹوٹ پڑوں (۳) ابر و باران کے دن کہ نہایت خوشگوار سماں ہوتا ہے کسی گداز بدن حسینہ کے ساتھ خیمہ میں بیٹھکر یوں وقت گذار دوں کہ خبر نہ ہو کب صبح ہوئی کب شام۔

**زہیر بن ابی سلمیٰ** اصحاب معلقات میں سے ایک زہیر بن ابی سلمیٰ ہمارے کلیہ سے مستثنیٰ ہے۔ اس کے معلقہ میں اس اعلیٰ لطیف تخیل کا پتہ ملتا ہے جو اس کے معاصرین کے کلام میں ناپید ہے اس کی وجہ یہہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ شخص توریت و انجیل وغیرہ کے مطالعہ اور اہل کتاب کی صحبت سے دیندارانہ میلان رکھتا تھا۔ چنانچہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کا منتظر تھا اور اپنے بیٹون کو وصیت کر گیا تھا کہ نبی موعود جس کے دیدار مسعود سے مین محروم رہا اگر تمھارے زمانہ مین ظاہر ہو تو فوراً اس پر ایمان لانا۔ مشہور مادح نبوی کعب بن زہیر جن کے قصیدہ بانت سعاد کو حضور رضہ نے شرف قبول بخشا اسی زہیر کے بیٹے تھے۔ اس شعر سے زہیر کے ایمان بالغیب و قیامت پر استدلال کیا جاتا ہے۔

فَلَا تَكْتُمُنَّ اللهَ مَا فِي صُدُوْرِكُمْ ۔۔۔ لِيَخْفٰى وَمَهْمَا يُكْتَمِ اللهُ يَعْلَمِ
يُؤَخَّرْ فَيُوضَعْ فِي كِتَابٍ فَيُدَّخَرْ ۔۔۔ لِيَوْمِ الْحِسَابِ اَوْ يُعَجَّلْ فَيُنْقَمِ

جو کچھ تمھارے دلون مین ہے اسے اللہ سے نہ چھپاؤ کہ اللہ سے کوئی بات چھپائی جائے تو وہ جان لیتا ہے۔ وہی سوتین ہین یا انتقام مین جلدی کی جاسے یا دیر اگر دیر کی جاتی ہے تو قیامت کے لیئے نامۂ اعمال مین لکھ رکھا جاتا ہے اور اگر جلدی کی جاتی ہے تو فوراً بدلہ لے لیا جاتا ہے۔

غرض اس شاعر کا مذاق جاہلین عرب سے بالکل مختلف نظر آتا ہے وہ صلح کی مدحت اور حرب کی مذمت مین کہتا ہے۔

وَمَا الْحَرْبُ اِلَّا مَا عَلِمْتُمْ وَذُقْتُمُوْا ۔۔۔ وَمَا هُوَ عَنْهَا بِالْحَدِيْثِ الْمُرَجَّمِ
مَتٰى تَبْعَثُوْهَا تَبْعَثُوْهَا ذَمِيْمَةً ۔۔۔ وَتَضْرِ اِذَا ضَرَّيْتُمُوْهَا فَتَضْرَمِ
فَتَعْرُكُكُمْ عَرْكَ الرَّحٰى بِثِفَالِهَا ۔۔۔ وَتَلْقَحْ كِشَافًا ثُمَّ تُنْتَجْ فَتُتْئِمِ
رَاَيْتُ الْمَنَايَا خَبْطَ عَشْوَاءَ مَنْ تُصِبْ ۔۔۔ تُمِتْهُ وَمَنْ تُخْطِئْ يُعَمَّرْ فَيَهْرَمِ
وَمَنْ يُوْفِ لَا يُذْمَمْ وَمَنْ يُهْدَ قَلْبُهُ ۔۔۔ اِلٰى مُطْمَئِنِّ الْبِرِّ لَا يَتَجَمْجَمِ
وَمَنْ يَجْعَلِ الْمَعْرُوْفَ فِي غَيْرِ اَهْلِهِ ۔۔۔ يَكُنْ حَمْدُهُ ذَمًّا عَلَيْهِ وَيَنْدَمِ

وَمَنْ يَعْصِ أَطْرَافَ الزِّجَاجِ فَإِنَّهُ ... يُطِيعُ الْعَوَالِي رُكِّبَتْ كُلَّ لَهْذَمِ

وَمَنْ لَا يَذُدْ عَنْ حَوْضِهِ بِسِلَاحِهِ ... يُهَدَّمْ وَمَنْ لَا يَظْلِمِ النَّاسَ يُظْلَمِ

لِسَانُ الْفَتَى نِصْفٌ وَنِصْفٌ فُؤَادُهُ ... فَلَمْ يَبْقَ إِلَّا صُورَةُ اللَّحْمِ وَالدَّمِ

جنگ کو تم سمجھ چکے اور اس کا مزا چکھ چکے ہو یہ کوئی ظنی و قیاسی بات نہین کہتا اگر تم اسے چھیڑوگے تو بُرا ہوگا۔ جب اسے اُکسا دُگے تو سخت مشتعل ہوگی تمھین چکی کے آٹے کی طرح پیس ڈالے گی۔ اُس اونٹنی کی طرح جو پے درپے حاملہ ہو بارور ہوتی ہے اور ایک بار دو دو بچے جنتی ہے۔ اور جو بچے جنتی ہے وہ سارے کے سارے قوم عاد کے احمر (ناقہ صالح کے قاتل) کی طرح بدبخت ہونگے پھر انھین دودھ پلا پلا کر پالیگی یعنی نتائج جنگ کا نشو و نما ہوگا۔ جب جنگ طول کھینچے گی تو اُس سے اتنی کثیر پیداوار ہوگی کہ عراق کے گاؤن مین بھی میسر نہین یعنی بے شمار مضرتین لاحق ہونگی۔ موت شب کور اُونٹنی کی طرح ہاتھ پاؤن مارتی ہے جو اسکی زد مین آگیا مرگیا جو بچ گیا بڑھاپے تک جیا۔ جو عہد کو پورا کرتا ہے کوئی اُسے بُرا نہین کہتا اور جس کے دل کو اللہ خالص نیکی کی ہدایت کرتا ہے وہ دبکر بات نہین کرتا۔ جو کوئی نااہل کے ساتھ احسان کرے گا اُس کی نیکی اُس کے حق مین بُرائی بن جائیگی اور نادم ہوگا۔ جو شخص نیزے کی جڑ (صلح) سے راضی نہ ہوگا اُسے نیزے کی انی کی اطاعت کرنا پڑیگی یعنی جو بات سے راضی نہ ہوگا وہ لات کھائیگا۔ جو دشمن کو اپنے حوض سے ہتھیار لیکر مار نہ ہٹائیگا اُس کا حوض ڈھا دیا جائیگا۔ اور جو دوسرون پر ظلم نہ کرے گا اُس پر دوسرے ظلم کرین گے۔ آدمی دو چیزون کے مجموعے سے عبارت ہے، زبان اور دل۔ باقی گوشت اور خون کے سوا کچھ بھی نہین۔

## عنترہ بن شداد العبسی

تمام شعراے جاہلیین مین عنترہ کا کلام عربی فطرت مردانہ کی کامل ترین تصویر ہے۔ عنترہ کے دیوان سے ایک منتخب تائیہ قصیدہ جو اس کے کلام کا ایک عمدہ نمونہ کہا جا سکتا ہے اور اردو مین اس کا منظوم ترجمہ جس مین مین نے اصل متن کی کیفیت اور زور پیدا کرنے کی کوشش

کی ہے درج ذیل ہیں :-

إِذَا قَنِعَ الْفَتَى بِذَمِيمِ عَيْشٍ ... وَكَانَ وَرَاءَ سَجْفٍ كَالْبَنَاتِ
وَلَمْ يَهْجُمْ عَلَى أُسْدِ الْمَنَايَا ... وَلَمْ يَطْعَنْ صُدُورَ الصَّافِنَاتِ
وَلَمْ يَقْرِ الضُّيُوفَ إِذَا أَتَوْهُ ... وَلَمْ يُرْوِ السُّيُوفَ مِنَ الْكُمَاةِ
وَلَمْ يَبْلُغْ بِضَرْبِ الْهَامِ مَجْدًا ... وَلَمْ يَكُ صَابِرًا فِي النَّائِبَاتِ
فَقُلْ لِلنَّائِعَاتِ إِذَا بَكَتْهُ ... أَلَا فَاقْصِرْنَ نَدْبَ النَّادِبَاتِ
وَلَا تَنْدُبْنَ إِلَّا لَيْثَ غَابٍ ... شُجَاعًا فِي الْحُرُوبِ الثَّائِرَاتِ
دَعُونِي فِي الْقِتَالِ أَمُوتُ عِزًّا ... فَمَوْتُ الْعِزِّ خَيْرٌ مِنْ حَيَاتِي
لَعَمْرِي مَا الْفَخَارُ بِكَسْبِ مَالٍ ... وَلَا يُدْعَى الْغَنِيُّ مِنَ السَّرَاةِ
سَتَذْكُرُنِي الْمَعَامِعُ كُلَّ وَقْتٍ ... عَلَى طُولِ الْحَيَاةِ إِلَى الْمَمَاتِ
فَذَاكَ الذِّكْرُ يَبْقَى لَيْسَ يَفْنَى ... مَدَى الْأَيَّامِ فِي مَاضٍ وَآتِ
وَإِنِّي الْيَوْمَ أَحْمِي عِرْضَ قَوْمِي ... وَأَنْصُرُ آلَ عَبْسٍ عَلَى الْعُدَاةِ
وَآخُذُ مَالَنَا مِنْهُمْ بِحَرْبٍ ... تَخِرُّ لَهَا مُتُونُ الرَّاسِيَاتِ
وَأَتْرُكُ كُلَّ نَائِحَةٍ تُنَادِي ... عَلَيْهِمْ بِالتَّفَرُّقِ وَالشَّتَاتِ

## ترجمہ

کسی بدبخت کو گر خستہ حالی پر قناعت ہو ... عفیفہ کی طرح محتاج امن و حفاظ و راحت ہو
پلنگِ گ کی صورت سے اس کے دل کو دہشت ہو ... سنانِ تشنہ کو خونِ جوانمرداں کی حسرت ہو
کوئی مہمان آجائے تو اُس پر اک مصیبت ہو ... نہ خوگر ہو بلاؤں کا، نہ غم سہنے کی عادت ہو
نہ سینوں میں اسے برچھی چبھونے کی مہارت ہو ... عدو کے کاسۂ سر کا نہ سر پر تاج عزت ہو
اگر کرتی ہو کوئی نیکبخت اُس کے لئے ماتم ... کہو اُس سے "لٹائے" مفت کیوں یہ اشک غم
بہائے اُس پہ آنسو جس نے بزم جنگ جھیلی ہیں ... سدا جس شیر نے شمشیر و خوں کے کھیل کھیلے ہیں"

---

مجھے تو چھوڑ دو لڑنے کو رن میں جاں نثاری سے ... ہے مرگ آبرو بہتر حیاتِ عجز و خواری سے

ستم ہے جان کی عزت نہیں کچھ مال داری ہے
غنی کہلا نہیں سکتا کوئی سکہ شماری ہے
نفیر غزوہ جب جب بجے گی مرگ عام کی دعوت
ستم دیدہ کرین گے یاد مجھکو بے قراری ہے
نہین چلتا فنا کا زور اپنے کارنامون پر
یہی اک شے ہے ایسی دہر کی بنیاد تجاری ہے
مین وہ ہون عزت اپنی قوم کی محفوظ رکھتا ہون
بچاتا ہون اسے دشمن کے آگے شرمساری ہے
ہمارے پاس جو دولت ہے حرب کی بدولت ہے
ہمارے پاس جو کچھ مال ہے مال غنیمت ہے
عدو کی فوج کو میدان مین چھوڑ آتے ہین یون ہم
کہ رونے والیان کرتی ہین انکے حال پر ماتم

عنترہ کے چند متفرق اشعار ملاحظہ ہون :-

مَاءُ الحَیٰوۃِ بِذِلَّۃٍ کَجَھَنَّمِ　　وَجَھَنَّمُ بِالعِزِّ اَطْیَبُ مَنْزِلٖ

ذلت کے ساتھ اگر آب حیات بھی ملے تو جہنم کے برابر ہے اور عزت کے ساتھ جہنم بھی ہو تو سب سے اچھی جگہ ہے -

اراعی نجوم اللیل وَھِیَ کَاَنَّھَا　　قَوَارِیرُ فِیھَا زِیبَقٌ یَتَرَجْرَجُ

رات کے تارون پر نظر جماتا ہون تو وہ شیشے معلوم ہوتے ہین جن مین پارہ پڑا تھرتھرا رہا ہو -

**متفرق شعرا** حماسہ مین ایک قطعہ منقول ہے -

وَمَا اَنَا بِالسَّاعِیْ اِلٰی اُمِّ عَاصِمٍ　　لِاَضْرِبَھَا اِنِّیْ اِذًا لَجَھُوْلُ
لَکِ البَیْتُ اِلَّا کُنْتَۃً تُحْسِنِیْھَا　　اِذَا کَانَ مِنْ ضَیْفٍ عَلَیَّ نُزُوْلُ

مین اپنی بیوی ) ام عاصم کو زد و کوب کرنا نہین چاہتا - اگر ایسا کرون تو میری نادانی ہے " بیوی - سن لو یہ گھر تمھارا ہے جو چاہو کرو لیکن جس وقت کوئی مہمان آجاے تو اسے میرے حوالہ کردو - پھر تمھارا کچھ دخل نہین "

امیہ بن الصلت نے اپنے ممدوح کی مدح مین کتنا نازک خیال ادا کیا ہے !

اَاَذْکُرُ حَاجَتِیْ اَمْ قَدْ کَفَانِیْ　　حَیَاؤُکَ اِنَّ شِیْمَتَکَ الحَیَاءُ

مین اپنی حاجت بیان کرون یا تیری حیا میرے لیے کافی ہے ؟ کیونکہ حیا تیری خو ہے -

عمرو بن الاطنابۃ من بنی الخزرج (الجاھلی) کہتا ہے -

إِنِّي مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ إِذَا انْتَدَوْا ... بَدَؤُوا بِحَقِّ اللهِ ثُمَّ النَّائِلِ
الْمَانِعِيْنَ مِنَ الْخَنَا جَارَاتِهِمْ ... وَالْحَاشِدِيْنَ عَلَى طَعَامِ النَّازِلِ
وَالْخَالِطِيْنَ نَقِيْرَهُمْ بِغَنِيِّهِمْ ... وَالْبَاذِلِيْنَ عَطَاءَهُمْ لِلسَّائِلِ
وَالْقَاتِلِيْنَ لَدَى الْوَغَى أَقْرَانَهُمْ ... إِنَّ الْمَنِيَّةَ مِنْ وَرَاءِ الْوَائِلِ
وَالْقَائِلِيْنَ فَلَا يُعَابُ كَلَامُهُمْ ... يَوْمَ الْمَقَامَةِ مِنْ قَضَاءِ الْفَاصِلِ
لَيْسُوْا بِأَنْكَاسٍ وَلَا مِيْلٍ إِذَا ... مَا الْحَرْبُ شُبَّتْ أَشْعَلُوْا بِالشَّاعِلِ

میں اس قوم سے ہوں جو مجلس میں بیٹھتی ہے تو واجب حقوق سے ابتدا کرتی ہے پھر نفل حقوق ادا کرتی ہے۔ اپنی ہمسایہ عورتوں کو فحش سے باز رکھتی ہے اور دسترخوان پر مہمانوں کو جمع رکھتی ہے۔ اس کے مخرج دولتمند ان کے ساتھ ملے جلے ہوتے ہیں۔ سائلوں کو خیرات دیتی ہے۔ رزم میں اپنے برابر کے مقابلوں کو مارتی ہے اور موت بھاگنے والوں ہی کا پیچھا کرتی ہے۔ ایسے سخنگو ہیں جن کے کلام میں بزم سخن میں کوئی ناقد عیب نہیں نکالتا۔ نہ وہ کنجوس ہیں نہ ضعیف و ناتوان۔ جب آتش جنگ گرم ہوتی ہے تو پرجوش جنگ آوروں کے ساتھ یہ بھی شعلہ افگن ہوتے ہیں۔

عروہ بن الورد العبسی (الجاھلی) کہتا ہے:-

إِنِّي امْرُؤٌ عَافِي إِنَائِيَ شِرْكَةٌ ... وَأَنْتَ امْرُؤٌ عَافِي إِنَائِكَ وَاحِدُ
أَتَهْزَأُ مِنِّي أَنْ سَمِنْتَ وَأَنْ تَرَى ... بِوَجْهِي شُحُوْبَ الْحَقِّ وَالْحَقُّ جَاهِدُ
أُقَسِّمُ جِسْمِي فِي جُسُوْمٍ كَثِيْرَةٍ ... وَأَحْسُو قَرَاحَ الْمَاءِ وَالْمَاءُ بَارِدُ

میں وہ شخص ہوں کہ میرے دسترخوان سے شریک بہرہ ور ہوتے ہیں اور تو اپنے دسترخوان کا اکیلا حصہ دار ہوتا ہے پھر کیا تو میرا مذاق اڑاتا ہے کہ تو موٹا ہے اور حق خدمت گذاری کے شدائد سے میرے چہرہ کا رنگ متغیر دیکھتا ہے؟ بات یہ ہے کہ میں اپنے جسم کو بہت سے جسموں میں تقسیم کرتا ہوں اور ٹھنڈے پانی پر اکتفا کرتا ہوں۔

(۲)

# آثار زوال

ان اقتباسات سے ہم نے عربی شاعری کی خصوصیات امتیازی پیش کرنے کی کوشش کی ہے موجودہ متمدن اقوام کی شاعری کے مقابلہ مین اس کی سادگی اور اصلیت کس قدر اچھوتی اور دلکش نظر آتی ہے! مگر ساتھ ہی یہ حقیقت بھی روشن کر دینا ضروری ہے کہ آج ہمارے تمدن و تکلف کی نسبت سے یہ کلام خواہ کیسے ہی سادہ اور موثر معلوم ہون لیکن حقیقۃً جس عہد کی شاعری کے نمونے ہم نے دکھائے ہین اس مین کلام عرب کی حقیقی سادگی اور بے تکلفی باقی نہ رہی تھی - ظہور اسلام اور نزول قرآن مجید نے اس شاعری مین جو انقلاب پیدا کیا وہ تو بہت بعد کی بات ہے - آغاز اسلام سے پہلے ہی چھٹی صدی عیسوی کے شروع مین جب یہ متداول قصائد نظم ہوے ہین عربی شاعری مین اصلیت کی کمی اور نقالی کی زیادتی شروع ہو گئی تھی - شجاعت، سخاوت، غیرت، تعشق وغیرہ مضامین پامال ہوتے ہوتے ایسے عامیانہ بن گئے تھے کہ اپنی تازگی و شگفتگی اور تاثیر بہت کچھ کھو چکے تھے - موجودہ فارسی اُردو تغزل کی طرح یہ صرف نظم سخن کا ایک ڈھرا بن گئے تھے - حماسہ کو اٹھا کر دیکھئے ایک ہی سے مضامین متعدد شعرا کے کلام مین بکثرت نظر آئینگے - مثلاً - باب الاضیاف والمدیح مین پہلی نظم جو عتیبہ بن بجیر المازنی کی ہے وہی باب کے تمام شعرا کا مضمون ہے -

ومستنبح تهوی مساقط راسه　　الی کل شخص فهو للسمع اصور
تصفقه الفٌ من الریح باردٌ　　ونبکاءُ لیلٍ من جمادی وصَرَّ
حصنأ دت له ناری فابصر ضوءها　　وما کاد (لولا حضأة النار) یبصر
فلما اضاءت شخصه قلت مرحبا　　هلموا "وللصالین بالنار ابشروا"
وقمت بنصل السیف والبرکُ هاجدٌ　　بها زرّة والموت فی السیف ینظر
فباتت رُحابٌ جَونة (من لحامها)　　وفوها بما فی جوفها یتغرغر

یعنی اکثر شب زدہ مسافر جو آبادی کی تلاش مین گوش بر آواز رہتا ہے اور جاڑون کی سرد اور تند ہواؤن کے جھونکے اسے طمانچے لگاتے ہین ایسے وقتون مین مینے اپنے

ہان آگ روشن کی ہے جس نے اِس مسافر کی رہنمائی کی ہے اور اس کے بغیر اسکی رہنمائی کی کوئی تدبیر نہ تھی۔ جب روشنی مین اس کی شکل نظر آئی تو مین نے اسے اور آگ تاپنے والون کو خوش آمدید کہا۔ مین تلوار لیکر اُٹھ کھڑا ہوا اور سوتے ہوئے اونٹون کے گلے مین گھسکر خونریزی شروع کردی اور ایک بڑا سا دیگ گوشت سے بھرکر چولھے پر چڑھا دیا جو جوش کھانے لگا۔ ازین قبیل مضامین شعرار جاہلیین سے لیکر اسلامیین تک نظم کرتے چلے آئے ہین اور صرف مضامین نہین ڈھلے ڈھلائے الفاظ اور بندش تک قریب قریب علی حالہ نقل ہوتی چلی آئی ہے جیسے دیکھئے مہان نوازی کے مضمون مین لفظ مُستنبح یا نابح سے ابتدا کرتا ہے جس کے معنی کتے کی آواز پر کان لگانے یا کتے کی طرح بھونکنے والے کے ہین۔ ایسے مضامین کی مشابہت و مماثلت کے اظہار کے لئے طویل اقتباسات درکار ہون گے۔ ذیل کے منتخب ابیات سے دونون کا موازنہ ہو سکتا ہے اور اسی پر دوسرے شعرا کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ ان مین تشابہ لفظی اس قدر نمایان ہے کہ ترجمہ کی ضرورت بھی نہین معلوم ہوتی۔

عتیبہ بن بجیر المازنی کہتا ہے:-

وَمُستَنبِحٍ (بات الصَّدیٰ یستتیهه الی کل صوتٍ) فهو فی الرحل جانح
فَقُمتُ وَلم اَحجِم مکانی ولم تَقُم مع النفس علاتُ البخیلُ لعوا ضح

دوسرا شاعر کہتا ہے:-

وَمُستَنبِحٍ (قال الصدی مثلَ قوله) حضأتُ له نارًا لها حطبٌ جزل
فقُمتُ الیه مسرعًا فغنِمتُهُ مخافةَ قومی اَن یَفوزُوا به قبل

ایک اور شاعر کہتا ہے:-

وَمُستَنبِحٍ بَعدَ الهُدُوءِ دَعَوتُه بشقراء مِثلِ الفجرِ ذاكٍ وَقُودُها
فَقُلتُ لَهُ اَهلًا وَسَهلًا وَمَرحَبًا بموقِدِ نارٍ مُحمِدٍ مَن یَرُودُها

نمری کہتا ہے:-

وداعٍ دعا بعد الهُدُوءِ کانّما یقاتِلُ اَهوالَ السُّرىٰ وتُقاتِلُه

فقلتُ له اهلاً وسهلاً ومرحباً — رشدتَ ولم اقعد اليه اسائله

وقمتُ الى برك هجانٍ اعدّهُ — لوجبةِ حقٍّ نازلٍ انا فاعله

حماس بن ثامل کہتا ہے۔

ومستنبحٍ في لجّ ليلٍ دعوته — بمشبوبةٍ في راس صمدٍ مقابلِ

وقلتُ له اقبل فانّك راشدٌ — وانّ على النّار النّدى وابن ثاملِ

اسی سلسلہ میں ایک اور مضمون آتا ہے۔ شاعر کی بیوی میاں کو اس کے اسراف اور فاقہ مستی پر ملامت کرتی اور اپنی اور بچوں کی حالت زار کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ میاں اپنی سخاوت کے زعم میں بیوی کو جھڑک دیتا ہے۔ یہ بھی مضمون مذکورہ بالا کی طرح تختۂ مشق شعرا بن گیا۔

سوادۃ الیربوعی کہتا ہے:۔

الا بكرت ميٌّ عليّ تلومني — تقول الا اهلكت من انت عائله

ذريني فانّ البخل لا يخلد الفتى — ولا يهلك المعروف من هو فاعله

میری بیوی مَیّ یا میّہ صبح کو میرے پاس یوں ملامت کرتی آئی "ہائے تو نے اپنے گھر والوں کو ہلاک کر ڈالا!" میں نے کہا "چل دور ہو۔ بخل سے انسان کو زندگی جاوید نہیں ملا کرتی اور نیکی نیکوکار کو ہلاک نہیں کرتی۔"

اس مضمون کے لیے بھی الفاظ کا میں ڈھانچا ہے۔ مثلاً الا بكرت امّ فلان ..... یا ..... وعاذلة ........ تلومني ........ ذريني وغیرہ کلمات ضرور استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً بنی سعد کا ایک شاعر کہتا ہے:۔

الا بكرت امّ الكلاب تلومني — تقول الا قد ابكا الدّرّ حالبه

تقول الا اهلكت مالك ضلّةً؟ — "وهل ضلّةٌ ان ينفق المال كاسبه"

عبداللہ بن حشرج الجعدی کہتا ہے۔

الا بكرت تلومك امّ سلمٍ — وغير اللوم ادنى للسداد

وما بذلي تلادي دون عرضي — باسرافٍ (اميم) ولا فساد

حاتم (الجاہلی) کہتا ہے۔

وَعَاذِلَۃٍ قَامَتْ عَلَیَّ تَلُوْمُنِیْ　　کَاَنِّیْ اِذَا اَعْطَیْتُ مَالِیْ اُضِیْمُہَا
اَعَاذِلَ اِنَّ الجُوْدَ لَیْسَ بِمُھْلِکِیْ　　وَلَا مُخْلِدًا النَّفْسِ الشَّحِیْحَۃِ لَوْمُھَا

قصائد میں عموماً شاعر کے کسی ویران مقام پر کھڑے ہو کر جہاں کبھی اس کی محبوبہ کے خاندان کا پڑاؤ تھا اس کی یاد میں گریہ وزاری سے ابتدا ہوتی ہے۔ پھر اس زمانہ کا تذکرہ ہوتا ہے جب وہاں پر محبوبہ کا قیام تھا اور عشق بازی کی پینگیں دونوں طرف سے چلا کرتی تھیں۔ اس سلسلہ میں ایام وصل کے سارے کوائف کا پوست کندہ بیان، بیوفائی کا شکوہ پھر وداع کا سماں مذکور ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک نہایت تیز ناقہ کی تلاش ہوتی ہے جو اسے چشم زدن میں منزل جانان تک اڑا لے جائے۔ اس جانور کی تعریف و توصیف پر بیسیوں شعر وقف ہوتے ہیں۔ اس سے گریز کر کے اپنی شہسواری، جفاکشی، دلیری، مہمان نوازی، شرافت نسلی کے فخر پر قصیدہ تمام ہوتا ہے اور اصل مقصود سخن یہی تفاخر ہوتا ہے۔ یہی مضامین ہر پھر کر اس طرح ان کے کلام میں آتے ہیں کہ ساری سادگی تکلف و تصنع بن جاتی ہے اور غلامانہ پابندی رسم سے سامع کے دل میں ویسی ہی کراہت پیدا ہو جاتی ہے جیسے اردو کی عام عاشقانہ غزلوں سے سبعہ معلقہ میں بھی یہی غلامانہ طرز نمایاں ہے۔ زہیر اور عنترہ نے کسی قدر علحدہ روش نکالی ہے۔ باقی سب ایک ہی راگ الاپتے ہیں بعض اوقات تو صرف تکرار مضامین ہی نہیں بلکہ ادنیٰ تصرف سے الفاظ بھی ایک سے ہی استعمال کئے گئے ہیں۔ طرفہ کہتا ہے۔

وُقُوْفًا بِہَا صَحْبِیْ عَلَیَّ مَطِیَّھُمْ　　یَقُوْلُوْنَ لَا تَھْلِکْ اَسًی وَّتَجَلَّدِ

امرؤ القیس اس سے پہلے کہہ چکا ہے۔

وُقُوْفًا بِہَا صَحْبِیْ عَلَیَّ مَطِیَّھُمْ　　یَقُوْلُوْنَ لَا تَھْلِکْ اَسًی وَّتَجَمَّلِ

صرف قافیہ کے اختلاف کے سبب ایک لفظ کا فرق ہے۔

ایسا تو اکثر ہوتا ہے کہ ایک شاعر اپنے پیش رو کی تشبیہ بعینہ نقل کر لیتا ہے لبید رضی کہتا ہے۔

اَوْ رَجْعُ وَاشِمَۃٍ اُسِفَّ نَؤُوْرُھَا　　کِفَفًا تَعَرَّضَ فَوْقَھُنَّ وِشَامُھَا

منزل محبوبہ کے مٹے مٹائے نشانات سیلاب سے اس طرح نمایان ہو گئے ہین جیسے کسی عورت کا گودنا جس کے حلقون مین نیل چھڑکا ہوتا ہے اور امتداد زمانہ سے ہلکا پڑجانے کے بعد دوبارہ سیاہی بھر کر نمایان کردیا جاتا ہے۔ زہیر ابن ابی سلمیٰ بھی یہ تشبیہ لا چکا ہے۔

وَدَارٌ لَهَا بِالرَّقْمَتَيْنِ كَأَنَّهَا　　مَرَاجِيعُ وَشْمٍ فِي نَوَاشِرِ مِعْصَمِ

رقمتین مین منزل محبوبہ کا بچا کھچا نشان ایسا ہے جیسے پہونچے پر گودنے کا مکرر نشان

زہیر کہتا ہے :-

أَمِنْ أُمِّ أَوْفَى دِمْنَةٌ لَمْ تَكَلَّمِ　　بِحَوْمَانَةِ الدَّرَّاجِ فَالْمُتَثَلَّمِ

وَقَفْتُ بِهَا مِنْ بَعْدِ عِشْرِينَ حِجَّةً　　فَلَأْيًا عَرَفْتُ الدَّارَ بَعْدَ تَوَهُّمِ

فَلَمَّا عَرَفْتُ الدَّارَ قُلْتُ لِرَبْعِهَا　　أَلَا انْعَمْ صَبَاحًا أَيُّهَا الرَّبْعُ وَاسْلَمِ

کیا دراج و اقع متثلم کی سرزمین مین یہ ام اوفی (محبوبہ) کے پڑاؤ کا نشان ہے جو میری بات کا جواب نہین دیتا؟ اس جگہ پر مین آج بیس برس کے بعد کھڑا ہوا ہون اور اس کھنڈر کو بڑے غور کے بعد پہچانا اور پہچان لیا تو اس سے یون مخاطب ہوا "اے نشان یار ہر آفت سے محفوظ و سلامت رہ"۔

عنترہ کہتا ہے :-

هَلْ غَادَرَ الشُّعَرَاءُ مِنْ مُتَرَدَّمِ　　أَمْ هَلْ عَرَفْتَ الدَّارَ بَعْدَ تَوَهُّمِ

يَا دَارَ عَبْلَةَ بِالْجِوَاءِ تَكَلَّمِي　　وَعِمِي صَبَاحًا دَارَ عَبْلَةَ وَاسْلَمِي

کیا شعرا نے تیرے لیے بھی کوئی مضمون چھوڑا ہے؟ کیا تو نے نشان یار کو غور و فکر کے بعد پہچانا؟ اے وادی جوا مین عبلہ (معشوقہ) کے نشان! بات کا جواب دے اور اے عبلہ کے کھنڈر ہر آفت سے محفوظ رہ۔ شاعر نے پہلے مصرعے مین اپنی تقلید و تتبع کے لیے جو دفع دخل مقدر کیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ اسے صرف یہ فکر ہے کہ مضمون تازہ ہو اور دوسرون کا پس خوردہ نہ ہو۔ اپنے حقیقی جذبات کے اظہار کی چندان فکر نہین۔ اس شعر سے یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ سارے مضامین پامال ہوچکے ہین۔ غرض ظہور اسلام سے کچھ پہلے ہی حقیقی عربی شاعری کا زوال شروع ہوچکا تھا سبعۂ معلقہ

بھی عرب کا بہترین نمونہ شاعری نہین معلوم ہوتا۔ ہان شعراے معلقات کے عہد سے پہلے کا کلام اگر میسر آسکتا تو یقین ہے کہ ہمین عربی شاعری کا حقیقی نمونہ ہاتھ آتا اور عربی زندگی و جذبات کی زیادہ صحیح تصویر دکھائی دیتی۔

عہد معلقات سے پیشتر کے نمونون کی جستجو مین کچھ اجزا ملتے بھی ہین تو وہ زیادہ تر وہ صنف ہے جسے رجز یا سجع کہتے ہین۔ کاہنون کی پیشین گوئیان اسی طرز مین ہین۔ یہ آٹھ دس شعرون کی ایک مسلسل نظم ہوتی تھی جس کے ہر مصرع مین ایک ہی قافیہ کی قید ہوتی تھی۔ ابن ہشام نے سیرۃ رسول اللہؐ مین اس قسم کے بول جا بجا نقل کئے ہین۔ یہ نمونے اپنی قدامت و بدویت پر صاف دلالت کر رہے ہین۔ صورت و معنی مین ان کو شعرائے معلقات کی رنگینی و شستگی سے کوئی نسبت نہین۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ درمیانی کڑیان غائب ہین۔ عربی شاعری کے منازل ارتقائی جن مین عرب کے زیادہ قدرتی اور صحیح جذبات، طرز معاشرت، عادات و اطوار دکھائی دیتے نظر سے پوشیدہ ہین۔ فرانسیسی مصنف موسیو ہوارٹ قسطنطنیہ کے حاکم سینٹ نیلس کا قول نقل کرتا ہے، جس کا زمانہ ۴۰۰ء کے لگ بھگ ہے۔ "صنعاء کے عرب اپنا طویل اور خطرناک سفر تمام کر کے کسی چشمہ پر پہنچتے تھے تو فرط خوشی مین وہ فی البدیہہ اشعار گاتے تھے۔ اس قسم کے کلام کا کوئی نمونہ اب باقی نہ رہا" یعنی ۴۰۰ عیسوی مین ہی معدوم ہو چکا تھا۔ اسی طرح موسیو موصوف ایک یونانی مصنف سوزومن سے جس نے پانچوین صدی عیسوی مین ایک تاریخ مذاہب لکھی تھی ناقل ہے "۳۷۲ عیسوی مین ماویہ یا مادیہ ملکۂ عرب نے فلسطین اور فونیشیا مین رومانی افواج کو شکست دی تھی جس کی یادگار مین عربون نے بہت کچھ سخن سرائی کی تھی اور مدت تک اپنے کلام مین اس واقعہ کا فخریہ تذکرہ کرتے رہے۔ اب کسی کا نشان نہین ملتا۔"

محمد مسلم (از ہزارہ باغ)

# کلام عزیز

عشق سے صرف ایک سوز دل مجھے حاصل ہوا
وہ بھی صرف گرمیٔ ہنگامۂ محفل ہوا

عشق میں طے اس طرح ہر جادۂ منزل ہوا
پیچھے پیچھے موت آگے آگے میرا دل ہوا

داستانِ زندگی کہنے کی فرصت ہے کسے
مختصر یہ ہے اب اُن کے رحم کے قابل ہوا

روح کی خلقت کا پیکر میں وہی ہنگام تھا
دل ازل میں جب نگاہ ناز سے بسمل ہوا

عکس تیرے خال رخ کا ظاہر و باطن فروز
بن گیا دل میں سویدا پتلیوں میں تل ہوا

تجھ میں اخفائے راز عشق تھا کار محال
آنکھ سے جو اشک ٹپکا ترجمانِ دل ہوا

سوز باطن کی تسلی ہو گئی آخر عذاب
دل میں دوزخ کے بھڑکتے ہی سکون حاصل ہوا

عشق نے قالب بنایا روح پھونکی درد نے
جوش بیتابی تسلی سے رُکا اور دل ہوا

اس محیط عشق میں جبکا کنارہ ہی نہ تھا
ڈوبکر ابھرا تو اور دیکھ لے ساحل ہوا

اپنی تقدیروں سے خود آراستہ اک بزم کی
دل میں کیا آئی کہ پھر برہم نظامِ محفل ہوا

اک نگاہ واپسیں اُس سے بہت کچھ کہہ گئی
پھر بھی اس حسن بلاغت کا نہ وہ قائل ہوا

بعد میرے آنیوالے مطمئن شاید رہیں
مجھکو تو اک سانس لینا بھی یہاں مشکل ہوا

تو بھی رہنا شاہد اے پچھلے پہر کی خامشی
کشتۂ ضبطِ محبت جس طرح غافل ہوا

دیکھ لو حسرت بھری آنکھوں کو سرکا کے کفن
ابتو شاید مرنے والا رحم کے قابل ہوا

میرے دل کی آیتوں سے ہی بہت کچھ اختلاف
یوں تو سب پر یہ صحیفہ عشق کا نازل ہوا

گلشن ہستی ہے میرے واسطے زندان عزیز
سرو کے مانند آزادی میں پا در گل ہوا

# خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ

کشتگان خنجر تسلیم را | ہر زمان از غیب جانے دیگرست

سلطان ارباب مشاہدہ۔ پیشوائے اصحاب مجاہدہ۔ مستغرق ذات حضرت علیم۔ شہید تیغ رضا و تسلیم۔ گذشتہ ہستی بخدا یار۔ محبوب حق خواجہ قطب الدین بختیار قدس سرہٗ العزیز کمل عرفا زمانہ۔ خاصان خدا اور مردان روزگار مین سے تھے خواجہ غریب نواز خواجہ خواجگان اجمیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے سجادہ نشین و خلیفہ برحق تھے۔ دلیل العارفین مین خود فرماتے ہین کہ ایک روز پنجشنبہ کو مسجد جامع اجمیر مین خواجہ غریب نواز نے ارشاد فرمایا کہ "مارا اینجا آوردہ اند مدفن ما اینجا خواہد بود و میان چند روز ما سفر خواہیم کرد بعد ازان شیخ علی سنجریؒ را فرمان شد کہ مثال بنویس تا قطب الدین در دہلی رود کہ خلافت سجادہ قطب الدین را دادیم۔ دہلی مقام اوست" چنانچہ آپ خلافت و تبرکات بزرگان ماسبق حاصل کرکے دہلی تشریف لائے اور وہین مقیم ہوے رشد و ارشاد فرمایا اور وہین انتقال فرمایا

آپ کے والد ماجد کا اسم مبارک سیر العارفین اور مراۃ الاسرار کے بموجب کمال الدین احمد بن موسیٰ تھا اور قصبہ اوش کے رہنے والے تھے جو دیار فرغانہ صوبہ ماوراء النہر مین واقع تھا۔ کاکی آپ کا لقب تھا جسکی وجہ تسمیہ آگے آئے گی مگر مراۃ ضیائی اور صاحب نفحات العنبریہ نے آپ کا سلسلۂ نسب یہ بیان کیا ہے :۔

خواجہ قطب الدین اوشیؒ بن سید موسیٰ۔ بن سید احمد اوشی بن سید کمال الدین بن سید محمد بن سید احمد بن سید اسحاق حسن بن سید معروف بن سید احمد چشتی بن سید رضی الدین بن سید حسام الدین بن سید رشید الدین بن سید جعفر بن حضرت امام محمد تقی الجواد تا حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہٗ ۔

سیر العارفین صاحب مراۃ الاسرار کے بیان مین اور اس مین تھوڑا فرق ہے۔ اس مین آپکے والد ماجد کا نام سید موسیٰ بیان کیا ہے۔ اور حضرت عبدالرحمن چشتی مولف مراۃ الاسرار

کمال الدین فرماتے ہین۔ نفحات عنبریہ کے شجرہ مین سید احمد اوشی رح کے والد ماجد کا نام سید کمال الدین درج ہے۔ مگران کے اجداد مین سید موسیٰ کوئی نہین گذرے جو یہ خیال ہوسکتا کہ اہل عرب کے طریقہ کے بموجب چند پیڑھیان حذف کرکے صرف ایک جد کا نام لکھدیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ سید موسیٰ کے کوئی صاحبزادے سید کمال الدین ہون اور صاحب نفحات عنبریہ کو تحقیق نہ ہوسکی ہو۔ کتاب فردوسیہ اور جواہر فریدی مین آپ کا شجرۂ نسب حسب ذیل درج ہے۔

سید قطب الدین بن سید کمال الدین بن سید محمد بن سید اسحاق۔ بن سید معروف بن سید احمد بن سید رضی الدین بن سید حسام الدین بن سید رشید الدین بن امام محمد جواد بن امام علی موسیٰ رض الخ

اس شجرہ کے مطابق بھی آپ کے والد ماجد کا نام نامی سید کمال الدین ہی اور یقیناً یہی صحیح معلوم ہوتا ہے مگر اس شجرہ مین چند پیڑھیان کم ہین جو اک معمولی سی بات ہی۔

آپ کی ولادت باسعادت قصبہ اوش مین سیدون کے ایک عالی خاندان مین شب دوشنبہ کو واقع ہوئی۔ نفحات العنبریہ مین سنہ ولادت ۵۸۳ھ لکھا ہی۔ مگر صاحب مراۃ الاسرار آپ کی عمر کے متعلق تین روایتین بیان فرماتے ہین ایک قول کی روسے آپ کی عمر شریف باون سال کی ہوتی ہے۔ دوسرے قول سے پچاس سال کی اور تیسرے قول کی رو سے ترسٹھ سال کی ہوتی ہے۔ سنہ وفات اخبار الاخیار و مراۃ الاسرار مین چھ سو تینتیس ہجری درج ہے لیکن نفحات عنبریہ مین چھ سو چھتیس ۶۳۴ھ درج ہی اور عمر باون سال لکھی ہے۔ اس لیے مراۃ الاسرار کے مطابق آپ کی ولادت ۵۸۱ھ یا ۵۸۳ھ یا ۵۶۹ھ مین ہوئی۔

مراۃ ضیائی مین ۶۳۳ھ سنہ وفات درج ہی اور غالباً یہی صحیح ہے۔ کیونکہ التمش کی اور آپ کی وفات کا سال ایک ہی ہے اور اسی سنہ مین شمس الدین التمش بادشاہ دہلی نے انتقال کیا ہے۔

سیر العارفین مین ہے کہ جب آپ کی عمر ڈیڑھ سال کی ہوئی تو آپ کے والد ماجد خواجہ کمال الدین احمد کا سایہ سر سے اٹھ گیا والدہ ماجدہ نے آپ کی پرورش فرمائی۔ جب

پانچ سال کی عمر ہوئی تو پڑوس کی ایک معلمہ کے پاس پڑھنے کو بٹھایا۔ اتفاقاً ایک روز ایک پیر مرد نورانی صورت تشریف لائے اور لڑکے کو گود میں لیکر پیار کیا اور شیخ ابوحفص اوشی کے پاس لے گئے اور فرمایا کہ اس بچے کو اچھی طرح تعلیم دیجئے۔ انشاء اللہ تعالی اپنے زمانہ کے اولیا کبار میں سے ہوگا۔ شیخ نے بدل وجان قبول فرمایا اور تعلیم شروع کی خیر المجالس میں حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی فرماتے ہیں کہ شیخ ابوحفص کی صحبت میں خواجہ قطب الدین بختیار نے اخلاق ظاہری و باطنی کی تہذیب اور شریعت طریقت کے اداب حاصل کیے اور آراستگی ظاہر و باطن نصیب ہوئی حتیٰ کہ ایک لمحہ بھی ریاضت و مجاہدہ کے بغیر آپ کو چین نہ آتا۔ رات دن میں اندازاً ڈھائی سو رکعت نماز ادا فرماتے اور ہمیشہ مشغول بحق رہتے اسی اثنا میں بغداد شریف کا سفر پیش آیا اور شیخ شہاب الدین عمر سہروردی۔ شیخ اوحد الدین کرمانی۔ شیخ برہان الدین چشتی اور شیخ محمود اصفہانی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کی صحبت نصیب ہوئی اور انہیں صاحبوں کی حضوری میں حضرت خواجہ خواجگان خواجہ بزرگ معین الحق والدین چشتی قدس سرہ سے شرف بیعت حاصل کیا اور خواجہ بزرگ کے فیض صحبت اور کمال مہربانی اور تلطف سے چند ہی روز میں سیر سلوک تمام فرماکر مقام ارشاد پر فائز اور حضرت کے شرف خرقہ و خلافت سے بہرہ مند ہوے۔ اکثر کتب میں یہی درج ہے کہ پندرہ سال کی عمر میں آپ نے شرف بیعت حاصل فرمایا اور بیس سال کی عمر میں مریدان با اخلاص کی تربیت فرمانے لگے۔

صاحب مراۃ الاسرار بحوالہ سیر الاولیا یہ نقل بیان کرتے ہیں کہ خواجہ قطب الاسلام سوتے وقت تین ہزار بار درود بھیجتے پھر سونے جاتے تھے۔ اوائل میں جب آپکی شادی ہوئی تو یہ معمول تین رات ناغہ ہوگیا۔ آپ کے مریدوں میں ایک صاحب تھے جنکا نام رئیس تھا انھوں نے جناب رسالتماب صلعم کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں "سلام من به بختیار کاکی برسان و بگو ہر شب تحفہ کہ برمن میفرستادی میرسید ہ سہ شب است کہ نمی رسد" جب وہ خواب سے بیدار ہوے تو آنحضرت صلعم کا یہ پیام خواجہ صاحب کو پہونچا دیا۔ خواجہ قطب الدین نے اسی وقت بی بی کا بلاکر مہر ادا کیا اور طلاق دیدی کہ اُن کی وجہ سے یہ غفلت ظہور میں آئی تھی۔

حضرت خواجہ بزرگ سے رخصت ہوکر آپ عازم ہندوستان ہوئے اور اول ملتان مین آکر شیخ بہاءالدین ذکریا ملتانی اور حضرت شیخ جلال تبریزی سے ملاقات کی۔ سیرالاولیا مین حضرت سلطان المشائخ کی زبانی نقل ہے کہ ایک مرتبہ خواجہ قطب الاسلام شیخ بہاءالدین ذکریا اور شیخ جلال الدین تبریزی تینون بزرگ ملتان مین تھے کہ لشکر کفار فصیل شہر کے نیچے تک پہونچ گیا۔ قباچہ بیگ والی ملتان ان بزرگوارون کی خدمت مبارک مین حاضر ہوا اور دعا و ہمت کا خواستگار ہوا۔ خواجہ قطب الاسلام نے ایک تیر قباچہ بیگ کے ہاتھ مین دیا اور فرمایا کہ اسے لشکر کفار کی طرف پھینکدو۔ اس نے حکم کی تعمیل کی چنانچہ بفضل الٰہی صبح کے وقت یہ کرشمہ دکھایا کہ محاصرین کی فوج مین سے ایک کا بھی وجود نہ تھا سب محاصرہ چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ یہین ملتان ہی مین حضرت گنج شکر پہلی مرتبہ آپ کی خدمت مین حاضر ہوئے۔

چند روز کے بعد خواجہ قطب الاسلام ملتان سے دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ جب دہلی کے قریب پہونچے سلطان شمس الدین التمش نے آپ کے قدوم میمنت لزوم کو باعث سعادت خیال کیا اور کمال اخلاص و صداقت کے ساتھ خدمت مین حاضر ہوا اور ہفتہ مین ایکبار حصول قدمبوسی اپنا معمول کرلیا۔ شیخ جمال الدین محمد نظامی اس زمانہ مین دہلی کے شیخ الاسلام تھے۔ وہ اور شیخ محمد عطا معروف بہ قاضی حمید الدین ناگوری برابر حاضر خدمت مبارک ہوا کرتے تھے۔ شیخ حمید الدین ناگوری کو بغداد ہی سے خلوص و اتحاد حاصل تھا۔ یہان آنے کے بعد اور بڑھ گیا۔ دونون کبھی کبھی ملکر سفر کیا کرتے تھے۔ سیرالاولیاء مین ایک مرتبہ کا حال مذکور ہے کہ آپ اور قاضی حمید الدین ناگوری ایک موقع پر ہم سفر تھے۔ ایک دریا کے کنارے پہونچے تو یہ حال دیکھا کہ ایک بڑا بچھو دریا کی طرف گیا اور اس مین داخل ہوا انہون نے اسکا تعاقب کیا۔ دوسرے کنارے پر یہ دیکھا کہ ایک شخص درخت کے تلے پڑا سو رہا ہے اور ایک سانپ اسے ڈسنے والا ہے کہ اتنے مین یہ بچھو پہونچا اور جست مارکر سانپ پر حملہ آور ہوا اور اسے ہلاک کر ڈالا۔ ان دونون کو شوق ہوا کہ دیکھین یہ کون سعادتمند ہے جس کی اس طرح حفاظت کی جاتی ہے

جب نزدیک پہونچے تو ایک شخص نظر آیا۔ شراب پئے ہوے۔ قے کئے بیہوش پڑا ہے
انھین تعجب ہوا کہ یہ شخص ایسی نافرمانی کرتا ہے اور حق تعالیٰ ایسی نگہبانی فرماتا ہے۔ اسی
تعجب پر ہاتف نے آواز دی کہ اے عزیز و اگر ہم صرف صالحون اور پارساؤن ہی کی
حفاظت کیا کرین تو مفسدون اور گنہگارون کی نگہبانی کون کریگا۔ یہ دونون اسی
عالم مین تھے کہ وہ شخص ہوشیار ہوا اور یہ کل حال سنکر بہت شرمندہ ہوا توبہ کی اور
واصلان حق مین سے ہوگیا ۵

غافل مرو کہ مرکب مردان مرد را　　در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند
نامید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش　　ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

اس حکایت کے بعد خواجہ قطب الاسلام فرماتے ہین کہ "اے درویش چون
وقت درآید و نسیم لطف وزیدن گیرد صد ہزار خراباتی را صاحب سجادہ گرداند۔ واگر
مبادا نسیم قہاری وزد صد ہزار سجادہ نشین را براند و بہ خرابات افگند" یَفْعَلُ مَا یَشَاءُ
وَیَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ ۵

شیخ بدرالدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کو جنھون نے آپ کے حالات بہت لکھے ہین
یہین دہلی مین آپ سے شرف بیعت و خرقہ حاصل ہوا۔ چنانچہ آپ کے حالات مین ایک
جگہ لکھتے ہین کہ خواجہ قطب الاسلام رحؒ نے غلبہ شوق ملازمت سے مجبور ہوکر ایک مرتبہ
حضرت خواجہ خواجگان رحؒ کی خدمت مین عریضہ ارسال کیا کہ اگر اجازت ہو تو اجمیر حاضر ہوکر شرف
قدمبوسی حاصل کرون حضرت خواجہ بزرگ رحؒ نے اُسیوقت جواب لکھوایا کہ المرء مع
من احب ۔ قرب جانی اگر ہو تو بعد مکانی سے کچھ نہین ہوتا۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہم خود
اس طرف آئین گے۔ چنانچہ آپ تشریف لائے۔ اس زمانہ مین شیخ نجم الدین صغرا
شیخ الاسلام دہلی تھے۔ خواجہ قطب الاسلام کی طرف لوگون کی بہت رجوعات دیکھکر
وہ حسد کرنے لگے تھے۔ حتیٰ کہ خواجہ بزرگ رحؒ سے بھی باوجود خراسان کی ملاقات کے ملنے
نہ آسکے۔ خواجہ بزرگ رحؒ نے کمال اخلاق و فروتنی سے خود ہی سبقت فرمائی اور شیخ نجم الدین
صغری سے ملنے گئے مگر وہ بے پروائی سے ملے خواجہ صاحب نے فرمایا کہ نجم الدین

کہا شیخ الاسلام نے تمھارا مزاج بدل دیا ہے - اُنھوں نے شرما کر جواب دیا کہ آپ نے ایک ایسے شخص کو یہان رکھ چھوڑا جو میری شیخ الاسلامی کو بالکل چلنے نہین دیتا۔ خواجہ بزرگ نے تبسم فرمایا اور کہا کہ اطمینان رکھو قطب الدین کو مین اپنے ہمراہ لئے جاتا ہون خواجہ بزرگ نے جب روانگی کے وقت قطب صاحب کو ہمراہ لیا تو تمام شہر اُمڈ آیا اور لوگون نے فریاد کرنی شروع کی۔ حضرت خواجہ خواجگان نے اسقدر لوگون کا دل دکھانا مناسب نہ سمجھا اور یہ کہکر قطب صاحب کو واپس کر دیا "بابا قطب الدین ہمدرین مقام باش کہ خلائق از بیرون آمدن تو در اضطراب و خراب اند - روا ندارم کہ چندین دلہا خراب وکباب باشند بروا این شہر را در پناہ تو گذاشتیم" اُدہر کچھ عرصہ بعد شیخ نجم الدین صغری حضرت جلال الدین تبریزی کو جھوٹی تہمت لگانے کی علت مین موقوف ہو گئے اور شیخ الاسلامی حضرت غوث بہاء الدین ذکریا کے خادمون مین سے کسی ایک کو ملی -

سیر العارفین مین ہے کہ آخر عمر مین قطب صاحب نے دہلی مین شادی کی اور دو صاحبزادے تولد ہوے ایک کا نام شیخ احمد تھا جن کی قبر آپ کے پہلو مین ہے - شیخ عبدالرحمن چشتی صاحب مراۃ الاسرار ان صاحبزادے صاحب کے حال مین فرماتے ہین کہ "صاحب جذبات عظیم دواردات غریبہ بود - اورا خواجہ احمد تماجی نیز گویند رحمۃ اللہ علیہ و او بعد از انتقال شیخ تا زمان سلطان المشائخ در قید حیات بود" دوسرے صاحبزادے کا نام شیخ محمد تھا لیکن ایام طفلی ہی مین آپ کا انتقال ہو گیا تھا -

خواجہ قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ تاہل کے بعد بھی بہت کم فتوح لیتے تھے چنانچہ آپ کے گھر مین ہمیشہ تنگی رہتی تھی - حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہین کہ قطب صاحب کو خواجہ بزرگ نے پان سو دینار تک قرض لینے کی اجازت دی تھی کہ اگر ضرورت لاحق ہو تو اسقدر قرض لیکر خرچ کرو - جب گھر مین دو ایک دن فاقہ گذرتا تو بی بی صاحبہ شرف الدین بقال سے جو ہمسایہ تھا کسیقدر قرض لے لیتین اور گھر بار کا خرچ چلتا - ایک روز بقال نے کہا کہ اگر مین ہمسایہ مین نہ ہوتا تو ان لوگون کا کیا حال ہوتا - بی بی صاحبہ کو یہ بات ناگوار گذری اور حضرت قطب صاحب سے معروضہ کیا آپ نے ارشاد فرمایا کہ آج سے

قرض ہرگز مت لینا - اور حجرہ مبارک مین ایک طاق تھا اس طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ اگر ضرورت پڑے تو بسم اللہ کہکر اسمین ہاتھ ڈالنا - جو چاہوگی مل جائیگا - اس روز سے بی بی صاحبہ اس طاقچہ مین سے گرم گرم کلیجے لے لیا کرتین اور اپنے اور متعلقین کے لئے کام مین لاتین - بقال کو جب آپ کی یہ بے تعلقی معلوم ہوئی تو شرمندہ ہوا اور اپنی بیوی کو دریافت حال کے لئے بھیجا - حضرت شیخ نے اس کرامت کی اطلاع اسے فرمادی - خواجہ صاحب کی اسی کرامت کی وجہ سے لوگ آپ کو کاکی (کاک بمعنی کلیچہ - روٹی کی ٹکیہ) کہنے لگے - بختیار بھی آپ کا لقب تھا جو حضرت خواجہ بزرگ رح نے عطا فرمایا تھا صاحب مرۃ الاسرار فرماتے ہین کہ "خواجہ بزرگ اورا از راہ مہربانی اکثر قطب الدین رح بختیار گفتے از انجہت او را بختیار لقب شدہ"

شیخ عبدالحق محدث دہلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہین کہ خواجہ قطب الدین رح "از اکابر اولیا واجلہ اصفیاست قبولے عظیم داشت ونہایت ترک وتجرید وتفرد وفاقہ موصوف بود ودہائے استغراق داشت در یاد مولی - چون کسے بزیارت او آمدے زمانے بایستے تا بخود باز آمدے آنگاہ بآئندہ مشغول شدے اگر از حال خود یا حال آئندہ چیزے بگفتندے بعد گفتے ... در ارید و باز بحق مشغول شدے و اگر یکے از اولاد بمردے او را ازان خبر شدے مگر بعد از زمانے - حضرت سلطان المشائخ رح کی غالباً روایت سے حضرت شیخ عبدالحق دہلوی رح نے یہ حال لکھا ہے نیز اسیطرح کی ایک اور روایت شیخ محمد نوربخش سے منقول ہے - حضرت شیخ ممدوح سلسلۃ الذہب مین قطب صاحب رح کے حالات مین تحریر فرماتے ہین کہ بختیار رح اوشی رح اولیا و سالکین ومرتاضین زمانہ مین سے تھے - مجاہدہ خلوت وعزلت کے اوصاف سے متصف - اور قلت طعام - قلت منام - قلت کلام - ذکر دوام اور چلہ کشی مین ممتاز تھے اور اہل مکاشفہ مین احوال باطن کے لحاظ سے آپ کی شان بہت بلند اور مرتبہ بہت بڑا تھا -

حضرت سلطان المشائخ رح سیر الاولیا مین نقل فرماتے ہین کہ عید کا روز تھا اور خواجہ قطب الاسلام صبح کی نماز پڑھکر واپس آ رہے تھے کہ اس مقام پر پہونچے جہان آج آپ کا روضہ بہتر کہ ہے اسوقت وہان جنگل تھا اور کسی قبر وگنبد کا نشان نہ تھا - خواجہ قطب الاسلام رح

اس مقام پر پہونچکر کھڑے ہو گئے اور کچھ دیر خاموش رہے۔ ہمراہیوں نے عرض کیا کہ آج عید کا روز ہے اور خلق اللہ ملازمت کی منتظر ہے بہتر ہوگا اگر مکان تشریف لے چلیں فرمایا کہ مارا ازین زمین بوے دلہا می آید۔ اسی وقت زمین کے مالک کو بلا کر اپنے مدفن کے لئے جگہ خرید فرمائی۔ حضرت سلطان المشائخ جب اس کلام کو بیان فرماتے تو آنکھوں میں آنسو بھر لاتے اور فرماتے کہ سبحان اللہ کون کون سے بزرگ وہاں آسودہ ہوں گے جو خواجہؒ نے فرمایا تھا کہ "ازین زمین بوے دلہا می آید"

دلیل العارفین سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر وقت میں خواجہ قطب الاسلامؒ نے خواجہ بزرگؒ کی حیات مبارک میں اجمیر شریف کا قصد فرمایا تھا اور وہاں جا کر بعد حصول اجازت دہلی تشریف لائے تھے۔ اس کے بیس روز بعد خواجہ بزرگ نے اس عالم فانی سے عالم بقا کی طرف ارادہ فرمایا اور خواجہ قطب الاسلام کچھ عرصہ تک قید حیات میں رہے پھر آپ نے بھی انتقال فرمایا۔

نفحات عنبریہ میں ہے کہ آپ کو روحانیت اقدس حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے حکم ہوا کہ نعمت و اجازت سلسلہ چشتیہ حضرت خضر رومی قلندرؒ کو جو ملک مغرب سے آئے ہیں دو تو حضرت خواجہ صاحب نے اپنا خرقہ حضرت خضر رومیؒ کے سامنے پیش کیا۔ خواجہ صاحبؒ کی عمر کم تھی اور حضرت خضر رومی قلندرؒ کی بہت زیادہ تھی...... قلندر صاحب نے فرمایا کہ یاران بہ بینید کہ این طفل با ما بازی می کند۔ پھر حضرت قطب صاحبؒ کو یہ اشارہ ہوا کہ محفل سماع گرم کر کے حالت وجد و سکر میں ان کو یہ نعمت دینا چاہیئے۔ چنانچہ مجلس برپا کی گئی اس حالت میں حضرت خواجہ صاحبؒ نے پھر فرمایا اور قلندر صاحب نے وہی جواب دیا مگر بعدہٗ روح پاک نبوی صلعم و روح جناب سیدنا علی کرم اللہ تعالی وجہہ کے اشارہ سے قلندر صاحب نے لے لیا اور اذکار چشتیہ بھی اخذ کئے اور جب ان اذکار کو اپنے یہاں کے اذکار سے ملایا تو بہت سہل پایا اور یہ ارشاد فرمایا کہ چشتیان خدا را مفت یافتند اسی مقام پر یہ بھی مذکور رہے کہ قطب صاحب کو بھی بالمبادلہ سلسلہ عالیہ قلندریہ کی اجازت حضرت خضر رومی قلندرؒ سے تھی۔

فوائد السالکین مین حضرت گنج شکرؒ بیان فرماتے ہین کہ مجھے ایک مرتبہ دولت پابوس خواجہ قطب الاسلامؒ حاصل ہوئی۔ قاضی حمید الدین ناگوریؒ۔ مولانا علاء الدین کرمانیؒ سید نورالدین مبارکؒ۔ شیخ شرف الدینؒ۔ شیخ محمودؒ موئینہ دوز اور مولانا فقیہ مداد رحؒ حاضر تھے۔ ان مین سے ہر اک ایسا بلند مرتبہ تھا کہ عرش سے ثریٰ تک اُسکے سامنے حجاب نہ تھا حج کے بارے مین گفتگو ہوئی۔ اس تقریر کے دوران مین آپ کی ایک عظیم الشان کرامت ظاہر ہوئی جو فوائد السالکین اور مراۃ الاسرار مین مفصل موجود ہے۔ اس واقعہ کے بعد حضرت گنج شکر فرماتے ہین کہ مین اٹھا اور زمین بوس ہو کر ہانسی جانے کی ..... اجازت طلب کی۔ خواجہ قطب الاسلامؒ نے جب مجھے دیکھا تو آنکھون مین آنسو بھر لائے اور قبل اس کے کہ مین کچھ زبان سے نکالون آپ نے فرمایا۔ بابا فرید کیا تم جاؤ گے؟ مین نے پھر زمین پر سر رکھا اور عرض کی کہ جو ارشاد مبارک ہو۔ فرمایا جاؤ تقدیر الٰہی یونہی ہے کہ جسطرح مین خواجہ بزرگؒ کے انتقال کے وقت موجود نہ تھا تم بھی میرے سفر آخرت کے وقت موجود نہ رہو۔ یہ فرماکر آپ کو مصلیٰ اور عصا عطا فرمایا اور دوگانہ ادا کرنے کا حکم فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ سجادہ و دستار و خرقہ و نعلین قاضی حمید الدین ناگوریؒ کے سپرد کر جاؤن گا۔ چوتھے یا پانچوین روز تمھین دیدین گے انھین احتیاط سے رکھنا اور تمھارا مقام وہی ہوگا جو میرا مقام ہے۔ حضرت گنج شکر اسی حکایت کے سلسلہ مین فرماتے ہین کہ اس کلام کو سنکر اہل مجلس مین شور پیدا ہوا۔ آپ نے پھر یہ ارشاد فرمایا کہ مرید کو اپنے پیران طریقت کی سنت پر چلنا لازمی ہے۔ ذرہ برابر اس سے تجاوز نہ کرنا چاہیئے۔ تاکہ قیامت کے روز ان کے سامنے شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔ اس کے بعد میری طرف منھ کر کے فرمایا کہ بابا فرید تم دین و دنیا مین میرے ساتھی ہو یاد رکھو کبھی غافل نہ رہنا۔ اہل سلوک فرماتے ہین کہ طریقت کا راستہ بہت پر خوف و خطر ہے جس کسی نے اس راہ مین قدم رکھا ہے وہ اسی طریق سے منزل مقصود کو پہونچا ہے جو اہل طریق نے بتایا ہے۔ یعنی جو لوگ اللہ جل شانہ کے دروازے پر آئین گے تو جب تک بلا و امتحان کے ہاتھ سے اس دروازے کو نہ کھٹکھٹائین گے یہ دروازہ نہ کھلیگا اور جب تک ندامت کے ساتھ اندوہ ایمان نہ کرین گے اور دل کو قدم

بناکر اس راہ میں نہ چلیں گے اس وقت تک منزل مقصود تک نہ پہونچیں گے۔ پھر فرمایا کہ تیس سال تک میرا یہ حال رہا کہ ہر ہر زبان سے بار پانے کی درخواست کرتا تھا۔ اور ہر ہر ہاتھ سے دروازہ کھٹکھٹاتا تھا اور ہر ہر قدم سے اس راہ میں چلتا تھا مگر منزل گاہ عزت تک رسائی نہ ہوتی تھی لیکن جب بلا کے ہاتھ سے دروازہ کھٹکھٹایا اور زبان اندوہ سے باریابی چاہی تو اجازت ملی اور اس مرتبہ تک رسائی ہوئی۔ جب خواجہ صاحب نے یہ فوائد ختم فرمائے تو تمام اصحاب زمین بوسی کرکے رخصت ہونے لگے۔ حضرت گنج شکرؒ فرماتے ہیں کہ جب مری نوبت آئی تو آپ نے بغلگیر کرکے فرمایا ھٰذا فراق بینی و بینک جاؤ خدا کے سپرد کیا۔

سیر العارفین میں حضرت سلطان المشائخ قدس سرہ العزیز سے منقول ہے کہ خانقاہ شیخ علی سنجریؒ میں مجلس سماع گرم تھی اور بہت سے درویش صاحب حال و اہل کمال تشریف فرما تھے۔ خواجہ قطب الدینؒ بھی تشریف فرما تھے کہ قوالوں نے شیخ احمد جام قدس سرہ کی ایک مشہور غزل گانی شروع کی۔ جب اس شعر پر پہونچے ؎

کشتگانِ خنجر تسلیم را — ہر زمان از غیب جانے دیگر است

تو آپ کو کیفیت شروع ہوئی اور اس حد تک کیفیت ہوئی کہ ہوش و حواس بجا نہ رہے شیخ محمد عطا عرف قاضی حمید الدین ناگوریؒ اور شیخ بدر الدین غزنویؒ آپ کو مکان پر لائے قوال بھی ساتھ ساتھ آئے۔ خواجہ صاحب تین شبانہ روز اسی حال میں مستغرق رہے اور قوال وہی شعر پڑھتے رہے۔ تیسرے روز استغراق کا غلبہ بہت ہوا۔ قاضی حمید الدین ناگوری اور شیخ بدر الدین غزنویؒ نے عرض کیا کہ اپنے خلفا میں کسے جانشین فرمایا جاتا ہے ارشاد ہوا کہ دستار و خرقہ و مصلیٰ و نعلین چوبین جو خواجہ بزرگؒ سے مجھے پہنچیں شیخ فریدالدین مسعود کو پہونچا دینا۔ وہی میرے جانشین ہیں۔ اس ارشاد کے بعد جان بحق تسلیم فرمائی ؎

گفت کسے خواجہ سنائی بمرد — مرگ چنین خواجہ نہ کاریست خورد
کاہ نبود او کہ بہ بادے پرید — آب نبود او کہ بسرما فسرد

شانہ نبود او کہ بموے شکست دانہ نبود او کہ زمینش فشرد
گنج زرے بود درین خاکدان کو دو جہان را بجوے می شمرد
قالب خاکی سوے خاکی فگند جان و خرد سوے سموت برد

شیخ بدرالدین غزنویؒ فرماتے ہین کہ جس شب خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ نے وفات فرمائی مجھپر ایک طرح کی غنودگی طاری ہوی - اس حالت مین کیا دیکھتا ہون کہ حضرت آسمان کی طرف جا رہے ہین اور فرماتے ہین کہ اے بدرالدین دوستان حق مرا نہین کرتے جب میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ خواجہ وفات فرما چکے ہین - اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؁ آپ کی وفات ۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ھ (سنہ چھ سو تینتیس ہجری) کو واقع ہوئی - اور سلطان شمس الدین التمش نے نماز جنازہ پڑھائی اور مہرولی مین دہلی کے قریب دفن کیا - آپ کا روضہ مبارک اب تک عام وخاص کا زیارت گاہ ہے -

آپ کے خلفا کے نام یہ ہین :- حضرت فرید الدین گنج شکرؒ - مولانا بدرالدین غزنویؒ شیخ برہان الدین بلخیؒ - شیخ ضیاءالدین رومیؒ - سلطان شمس الدینؒ التمش - شیخ بابا خضری بحر دریا - مولانا فخرالدینؒ حلوائی - شیخ احمد تماجیؒ - شیخ حسینؒ - شیخ فرزندؒ - شیخ بدرالدین موسے تابؒ بدایونی - حضرت سید خضر رومیؒ قلندر - شیخ سعد الدینؒ - شیخ پیرؒ - شیخ محمدؒ بہاری - مولانا احمد حاجزیؒ - سلطان نصیر الدینؒ - قاضی حمید الدین ناگوریؒ - شیخ محمدؒ شیخ برہان الدین حلوائیؒ - شیخ صوفی بدہنیؒ - مولانا خضر معینؒ - شیخ جلال الدین ابوالقاسمؒ شیخ نظام الدین ابوالموئیدؒ - شیخ تاج الدین منورؒ - شیخ جلال الدین تبریزیؒ - قدست اسرارہم (کذا فی نفحات العنبریہ من انفاس القلندریہ)

آپ کا ارشاد ہے کہ شیخ مین اسقدر قوت دل اور صحت ضمیر ہونی چاہیئے کہ اپنے مرید کے سینہ کے زنگار اور آلودگی آلایش دنیاوی کو اپنی قوت باطن سے پاک کر سکے - تاکہ کوئی کھوٹ - دغا - فریب - حسد - برائی اور کدورت دنیاوی باقی نہ رہے پھر اس کا ہاتھ پکڑکر اسرار معرفت سے واقف کرے اور اگر اتنی قوت نہ ہو تو یقین جانو کہ پیر و مرید دونون گمراہی کے جنگل مین راہ بھٹکتے پھرین گے -

آپ نے ایک درویش کے حال میں بیان فرمایا کہ اس نے چالیس سال مجاہدے پر مجاہدے کئے لیکن کوئی روشنی اپنے آپ میں نہ پائی لیکن جب سے کم خوردن وکم خفتن وکم گفتن کم آمیختن با خلق۔ ان چار چیزوں پر عمل کیا تب سے اسقدر روشنی حاصل ہوئی کہ وہ کہتا ہے کہ اگر آسمان کی طرف کسی وقت دیکھتا ہوں تو عرش عظیم تک پردہ نہیں رہتا اگر زمین کی طرف نگاہ کرتا ہوں تو تحت الثری تک صاف نظر آتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی درویش خالق کے لئے نہیں بلکہ خلق کیلئے عمدہ لباس پہنے تو وہ درویش نہیں بلکہ رہزن راہ سلوک ہے۔ اور جو درویش نفس کے لئے عمدہ کھانا کھائے تو وہ دروغ گو اور خودپرست ہے اور جو درویش دولتمندوں کی ہمنشینی کرتا ہے وہ مرتد طریقت ہے اور جو خواہش نفسانی کے مطابق خوب جی بھر کر سوتا ہے اسے یقیناً اس نعمت سے کوئی حصہ نہیں ملا ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ انسان آلائش نفسانی بھی رکھے اور بارگاہ الٰہی میں باریاب بھی ہو۔ پھر فرماتے ہیں کہ درویش کو مجرد رہنا چاہیئے۔ اور ہر روز ایک ملک سے دوسرے ملک میں سیر کرنا چاہیئے۔ حضرت کی مراد مجرد ہونے سے تجرید عن الدنیا اور ماسواے اللہ کو دل میں جگہ نہ دینا ہے۔ اور ملکوں کی سیر سے ملک جان کی سیر کی مراد ہے اس ارشاد کے بعد حضرت قطب صاحبؒ ایک درویش صاحب فکر کا حال بیان کرکے آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور فرمایا کہ ایک مرتبہ ایک درویش سے میں نے یہ مثنوی سنی تھی

ہر آن ملکے کہ واپس میگذارم دوصد ملکے دگر در پیش آرم

اسی سلسلہ میں پھر ارشاد فرمایا کہ اہل سلوک و تحیر کے نزدیک درویش کو راہ سلوک میں روزانہ ایک لاکھ ملکوں سے گذر کرنا چاہیئے اور پھر بھی قدم آگے بڑھتا رہے

اسی موقعہ پر آپ نے فرمایا کہ جو اولیا اسرار کو ظاہر کرتے ہیں وہ غلبات شوق سے مجبور ہوتے ہیں مگر بعض ایسے کامل وپختہ احوال ہوتے ہیں کہ کسی حال میں کوئی بھید ظاہر نہیں کرتے پس سالک راہ کا حوصلہ وسیع ہونا چاہیئے تاکہ اسرار الٰہی کو پوشیدہ رکھ سکے آپکا ارشاد ہے کہ اگر شیخ منصور حلاج کامل ہوتے تو ہرگز دوست کا بھید ظاہر نہ کرتے۔

اس راہ مین ایسے ایسے لوگ بھی ہین کہ اسرار کے لاکھون دریا پی جاتے ہین اور معلوم بھی نہین ہوتا بلکہ ہل من مزید کی فریاد کرتے ہین

آپ کا ارشاد ہے کہ جب تک درویش سب سے بیگانہ نہ ہو جائے اور ہر وقت مجرد نہ رہے اور آلائش دنیاوی سے ذرا سا بھی اس مین باقی رہے اُس وقت تک قرب کے مقام کو نہین پہونچتا۔ راہ درویشی چلنا اور بات ہے اور ذخیرہ جمع کرنا اور بات ہے۔ یا درویش بن یا ذخیرہ ہی جمع کر۔ اے برادر اس راہ مین بے غم نہ رہنا۔ جن لوگون نے سلوک کے تمام درجے طے کر لئے اور کمال کو پہونچ گئے ہین وہ بھی ہر وقت فراق کے ڈر اور خوف سے محزون وحیران رہتے ہین کیونکہ کسیکو نہین معلوم کہ انجام کیونکر ہونے والا ہے۔

آپ کا ارشاد ہے کہ سالک وہ ہین جو سرتاپا دریائے محبت مین غرق رہین۔ اور کوئی لحظ وساعت ایسی نہ ہو کہ باران عشق اُن پر نہ برستا رہے اور عارف وہ شخص ہے کہ ہر لحظہ اس مین عالم اسرار سے ہزارہا اسرار پیدا ہوتے رہین اور وہ عالم سکر مین رہے اور اگر اس حالت مین اٹھارہ ہزار عالم اسکے سینہ مین ڈالدیئے جائین تب بھی اُسے خبر نہ ہو۔

آپ فرماتے ہین کہ جو شخص محبت کا دعوی کرے اور مصیبت کے وقت فریاد کرے وہ جھوٹا ہے۔ دوستی اس بات کا نام ہے کہ جو کچھ دوست کی طرف سے آئے اسپر راضی رہے اور لاکھون شکر بجالائے کہ اِسی بہانہ خیر یاد تو ہوئی۔ اہل معرفت کے نزدیک۔ بلائے دوست رضائے دوست ہے۔ جس روز بلائے دوست ہمپر نہین نازل ہوتی ہم سمجھتے ہین کہ کوئی نعمت ہم سے چھین لی گئی ہے

آپ کا ارشاد ہے کہ اگر راہ گیر ایک سمت خاص پر چلتا رہے اور یقین کامل سے امید حصول کمال رکھے تو یقیناً وہ درجۂ کمال کو پہونچ جائے گا۔

آپنے فرمایا کہ بزرگون کی مجلس مین جو کوئی آئے جہان جگہ خالی پائے وہین بیٹھ جائے۔

آپ نے فرمایا کہ دعا دو قسم کی ہوتی ہے نیک و بد کسی کے حق مین بد دعا نکرنی

چاہیئے مگر نیک دعا بہت اچھی ہوتی ہے خصوصًا وہ جو بزرگون کی زبان سے نکلی۔ پھر شمس الدین التمش کا یہ قصہ بیان فرمایا کہ ایک دفعہ شیخ معین الدین سنجری شیخ اوحد الدین کرمانی رح اور شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ اور دعاگو (یعنی خود قطب صاحب) ایک جگہ بیٹھے ہوے تھے اور انبیا کا تذکرہ ہو رہا تھا شمس الدین التمش جو ابھی بارہ سال کا تھا ہاتھ مین پیالہ لئے ہوے جا رہا تھا کہ بزرگون کی نگاہ اسپر پڑی فوراً خواجہ معین الدین سنجریؒ کی زبان مبارک سے نکلا کہ یہ لڑکا جب تک دہلی کا بادشاہ نہ ہو جاے گا خدا اسے دنیا سے نہ اُٹھاے گا۔ چنانچہ خداے کریم نے اپنے فضل و کرم سے ایسا ہی کیا۔

آپ نے فرمایا کہ بیعت دوبارہ ہو سکتی ہے یعنی اگر کوئی بیعت سے پھر جاے یا اُس کی تو بہ مین شک پڑ جاے تو از سرِ نو بیعت کر لینی چاہیئے اور اگر پیر نہ ہو تو شیخ کا پاجامہ ہی سامنے رکھ لے اور بیعت کرے۔ شیخ معین الدینؒ بھی اسی طرح بیعت کیا کرتے تھے اور مین بھی اسیطرح کرتا ہون۔ مرید کو اپنے پیر کی موجودگی مین یکسان خدمت کرنی چاہیئے جس طرح اس کی زندگی مین خدمت کرتا تھا اسی طرح انتقال کے بعد بھی خدمت کرتا رہے بلکہ مناسب ہی کہ اس سے زیادہ کرے۔

آپ نے فرمایا کہ میرے نزدیک سماع مین کچھ ایسا ذوق ہی کہ اور کسی چیز مین اتنا نہین ہے۔ جو لوگ صاحب طریقت و مشتاق حقیقت ہین اُنھین سماع سے گویا بدن مین آگ لگ اُٹھتی ہے اور اگر یہ نہ ہوتا تو لقا کہان ہوتا اور لقا کا لطف ہی کیا حاصل ہوتا

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ جو اولیاء اللہ کہ مرتبہ کے شروع ہی مین کشف حال کر دیتے ہین اُنھین کامل نہین کہا جا سکتا۔ کامل وہ لوگ ہین جو تمام مدارج طے کرنے تک کشف و کرامت کی ایک بات بھی ظاہر نہین ہونے دیتے اور جب تمام مدارج طے کرنے کے بعد کشف حال ہوتا ہی تو عین وہی ہوتا ہے جو وہ کہتے ہین اور اُن کی دعا ضائع نہین ہوتی۔ اولیاء اللہ کی دعاؤن مین فرق آجانیکی یہی وجہ ہے۔

پھر آپ نے فرمایا کہ دائرہ محمدیہ مین ایسے مرد بھی ہین جو تمام مدارج مقررہ طے کر کے لاکھون درجے اور طے کرتے جاتے ہین اور پھر بھی اپنے دوست کا بھید ذرہ برابر ظاہر نہین کرتے

انھیں خود اپنے آپ کی خبر نہین ہوتی کہ ہم کون ہین اور کیا ہین اور جب یہ حالت ہوتی ہے تو ایک مقام سے دوسرے مقام تک برابر ترقی کرتے جاتے ہین اور جون جون ترقی کرتے ہین عالم تحیر مین پڑجاتے ہین اور جب عالم تحیر مین پڑتے ہین تو ان کا فراق وصل سے بدل دیا جاتا ہے۔

آپ کا ارشاد ہے کہ اگر مرید نماز نفل پڑھ رہا ہو اور پیر بلائے تو نیت توڑکر چلا جانا چاہیے کیونکہ یہ امتثال امر پیر نفل نمازون سے افضل ہے۔

آپ کا ارشاد ہے کہ جب آدمی توبہ کرے تو پھر اُن لوگون سے میل جول نہ رکھنا چاہیے جن سے وہ پہلے رکھتا تھا مبادا پھر اسی گناہ مین مبتلا نہ ہو جائے کیونکہ انسان کے لئے بُری صحبت سے بڑھکر اور کوئی چیز بُری نہین ہے۔ اور خود بھی جس چیز سے توبہ کرے اُسے ہمیشہ اپنا دشمن خیال کرتا رہے۔ سالک کے لئے دنیا سے بڑھکر کوئی حجاب نہین۔ کوئی شخص اس وقت تک خدا رسیدہ نہین ہوتا جب تک وہ دنیا مین مشغول رہتا ہے۔ دنیا سب کی دوست ہے لیکن درویشون کی نہین کیونکہ انھون نے اسے روکر دیا ہے۔ درویشی مین بڑا آرام ہے اور دنیا دی آفتون سے درویش محفوظ ہین لیکن اس کام مین سختی بہت ہے۔ معراج الفقر فی لیلۃ الفاقہ۔

پھر آپ نے فرمایا کہ درویش کا فاقہ اُس کے اختیار مین رکھا گیا ہے۔ دنیا اُسے دی گئی ہے کہ جس طرح چاہے خرچ کرے وہ اپنے واسطے بھی خرچ کرسکتا ہے مگر ایسا نہین کرتا اور دوسرون کو دیتا ہے اور خود فاقہ کرتا ہے اور اس سے اس کے کام مین ترقی ہوتی ہے۔

آپ کا ارشاد ہے کہ چار چیزین گوہر نفس ہین (۱) درویشی جو تونگری نظر آئے۔ (۲) گرسنگی جو سیری نظر آئے (۳) اندوہگینی جو شادی نظر آئے (۴) اور باوجود دشمنی کے دوستی کا برتاؤ کرنا۔

آپ کا ارشاد ہے کہ جہان جاؤ کانٹا نہ بن جاؤ اور جہان رہو مردہ وار رہو۔

آپ کی طرف ایک دیوان بھی منسوب ہے مگر وہ آپ کا کلام نہین۔ آپ کو استغراق سے اتنی فرصت کہان تھی جو شعر و شاعری کی طرف متوجہ ہوتے۔

اے ترا با ہر دمے رازِ دگر　　ہر گدا را بر درت نازِ دگر
در ربابِ عشق بیش از تار نیست　　ہست ہر سو نغمۂ و سازِ دگر

عبد اللہ

**نوٹ** - آپ کے حالات حسب ذیل کتابوں میں ملتے ہیں :-

سیر الاقطاب - خیر المجالس - سیر الاولیا - مراۃ الاسرار - اقتباس الانوار - سیر العارفین - نفحات العنبریہ من انفاس القلندریہ - مراۃ ضیائی - سیر العارفین - کتاب فردوسیہ - جواہر فریدی - اخبار الاخیار - دلیل العارفین - فوائد السالکین -

## زمین

زندگی موت میں انسان کے لئے گھر تو ہے　　اے زمین قابلِ تعظیم ہے مادر تو ہے
تیری مٹی سے جو اس کو نہ سنوارا ہوتا　　اے زمین قالبِ خاکی نہ ہمارا ہوتا
اے زمین گھر تھا عدم چھوڑ کے آئے تجھ میں　　تیری مٹی سے بنے اور سمائے تجھ میں
جسمِ خاکی کے لئے خاک بھی تو دیتی ہے　　اور جب مرتے ہیں تو گود میں لے لیتی ہے

تیرے فرزند ہوئے مامور و پیکر اساس
گود میں تیری پلے آدمؑ و شیثؑ و الیاسؑ

انبیا اور بھی با جاہ و حشم آئے ہیں　　احمدِؐ پاک کے بھی تجھ پہ قدم آئے ہیں
عہدِ صدیقؓ نے بنیادِ ضلالت ڈھائی　　تو نے فاروقؓ کی بھی دیکھی ہے عدل آرائی
باغِ فردوس کو جاتے ہوئے جا میں دیکھیں　　عہدِ فاروقؓ میں اسلام کی شانیں دیکھیں
تاجور سیکڑوں بے سر نظر آئے تجھکو　　تیغِ اسلام کے جوہر نظر آئے تجھکو
زورِ اسلام نے بنیادِ ضلالت توڑی　　خسرو و قیصر و فغفور کی ہمت توڑی
حال اُس روز کا کیا یاد ہے کیا بھول گیا　　جنگِ یرموک کا دن یاد ہے یا بھول گیا
سیفِ حق خالدِ غازیؓ نے اٹھائی تلوار　　فتح لاکھوں پہ ہزاروں کو ہوئی آخر کار

تو نے عباسیوں کی شانِ حکومت دیکھی

[illegible] شوکت دیکھی

کام [illegible] — [illegible] چرخ برین گنبد درگاہ بنا
اے زمین [illegible] — [illegible] آئے کہ بجھتا [illegible] چراغ اسلام
اب [illegible] — [illegible] یا تھا وہ گلشن نہ رہا
قرطبہ کے جو محل [illegible] — [illegible] ہم ہسد کے ویرانے ہین

[illegible] راحت
کہین [illegible] کہین [illegible] ہین

تونے سرسبز باغات کی [illegible] — [illegible] گلستان [illegible] پائی
وادیون مین [illegible] — [illegible] گل صحرائی ہے
بستیان ہین کہین تجھ مین [illegible] — ہین آباد [illegible] کہین ویران ہی
راحت و رنج ترے دور مین [illegible] — نہ خوشی کی [illegible] تجھکو نہ غم کا غم ہے
جشن شادی [illegible] — [illegible] ترے دامن مین کہین
شور نغمے کی [illegible] کہین [illegible] — [illegible] کے لیے لوگ کہین روتے ہین

[illegible] فطرت نے
اے زمین گول بنایا [illegible] قدرت نے

دور گردش سے نہ بچتی ہو نہ تو گرتی ہے — گرد [illegible] خورشید کے [illegible] صفت پھرتی ہی
نور اس تیرے سفر کے لئے دلخواہ ملا — مشعل رہ کی ضرورت تھی تجھے ماہ ملا

اے زمین تجھ [illegible] رہنے والے
گندمی رنگ ہین [illegible] کالے

کوئی کم فہم ہے ان مین کوئی دانا ہے — ایک [illegible] سے دوسرے کی شکل جداگانہ ہی
نور کی شکل کسی نے وہ کہین پائی ہو — چشم خوبان جہان جس کی تماشائی ہی

اے زمین [illegible] دید جگر پاتے ہین
حسن کے چاند جہان ان کو نظر آتے ہین

(حکیم جگر صدیقی)

# بقاے دوام

اب سے ہزار دو ہزار برس قبل بلکہ اس وقت بھی جبکہ کا حال ہم بذریعہ تاریخ نہیں جان سکتے آفتاب کرۂ زمین کو اسی طرح گرمی و روشنی پہونچاتا تھا جیسے اس وقت ابر و باد کا وجود اُس زمانہ میں بھی ویسا ہی تھا جیسا اب دریا کہ وہ اپنی روانی و بلندی سے دنیا کو سب بھی محو حیرت بناتے تھے اور اب بھی بناتے ہیں۔ دنیا تو نیرنگ طبعی کی اُسوقت بھی ایسی ہی آماجگاہ تھی جیسی آج لیکن کیا زمانہ قبل از تاریخ اور قرون وسطیٰ میں کوئی فرق نہ تھا؟ اور کیا قرون وسطیٰ اور زمانۂ حال بالکل ایک سے ہیں؟

یہ سچ ہے کہ دنیا اپنی رفتار سے چل رہی ہے روز و شب، بہار و خزاں، موسموں کی تبدیلی اور فطرت کی صنعت عیان اب بھی ویسی ہی ہیں جیسی زمانۂ گذشتہ میں تھیں لیکن باوجود اس کے صفحہ ہستی اب ایسا سادہ نہیں رہا جیسا پہلے تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان جیسے جیسے تہذیب و تمدن کی منزلیں طے کرتا گیا اُس نے اپنی اختراعات و ایجادات سے دنیا کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا گروہ انسانی کا ہر فرد اس کا اہل تھا کہ وہ اپنی اور اپنے ہم جنسوں کی حالت درست کرتا؟ اور اپنی دماغی قوتوں سے بنی نوع انسان کو راحت پہونچاتا۔ زمانہ قبل از تاریخ سے اس وقت تک لاتعداد ہستیاں اس عالم مادی کے تماشہ گاہ پر آئیں۔ ان میں سے اکثر ایسے تھے جنھوں نے کوئی کام ایسا نہ کیا جس سے دوسرے ان کی مدح و ستایش کرتے اور اُن کے افعال کو بہ نظر تحسین دیکھتے انکی زندگی صرف کھانے پینے اور زندگی کی دیگر ضروریات مہیا کرنے ہی میں صرف ہو گئی اور آج وہ گمنامی اور خود فراموشی کی لحد میں خاموش سو رہے ہیں۔ زمانہ نہیں جانتا کہ وہ کون تھے۔ تاریخ اُن کے حالات پر روشنی نہیں ڈالتی اور ہم اگر اُن کی زندگی کے حالات معلوم کرنا چاہیں تو نہیں معلوم کر سکتے۔

لیکن انھیں میں بعض ہستیاں ایسی بھی تھیں جنھوں نے معمولی ضروریات زندگی کے حاصل کرنے کو کافی نہیں خیال کیا۔ بلکہ اس کو حیوانی زندگی سے تعبیر کیا۔ یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے زمانہ کو علم و عقل، فلسفہ، سائنس، اور مذہب وغیرہ کی مشعل دکھائی اور اپنے ہم جنسوں کو اس راستہ پر چلایا جسکی بدولت آج دنیا شاہراہ ترقی پر تیزی سے گامزن ہے۔

اِن راہنماؤن مین سے ہرایک نے اپنے سامنے ایک خاص مقصد رکھا تھا۔ اور اس مقصد کے حصول کے لیے انھون نے مال و دولت، دنیاوی آرام و آسایش نمائشی عزت وحرمت وغیرہ مین سے کسی کا پاس نہین کیا۔ ذاتی مفاد کا خیال بھی اُن کے پاس ہنین پھٹکنے پایا۔ ان بے مثال قربانیون کا نتیجہ ان کی حسب مرضی نکلا۔ وہ دنیا کو ایک خاص راستہ پر چلانا چاہتے تھے وہ بنی نوع انسان کو ایک سچے مذہب کی تعلیم دینا چاہتے تھے، وہ زمانہ کو اپنا فلسفہ سکھانا چاہتے تھے اور قدیم الایام سے چلی آتی ہوئی توہمات کا پردہ چاک کرنا چاہتے تھے۔ اس مین وہ پورے طور پر کامیاب ہوے۔ زمانہ نے ان لوگون کو انکھون پر بٹھایا۔ دنیا نے اُن کے آگے سرِ تسلیم خم کیا۔ ان کے نام صفحات تاریخ پر اب تک موجود ہین اور اسوقت تک موجود رہین گے جب تک اِس عالم اسباب کا شیرازہ قائم ہے۔

یہ سچ ہے کہ شہرت، بقائے دوام، اور دولت وغیرہ کے حصول مین انسانی کوششین صرف ایک حد تک مفید ثابت ہوسکتی ہین اور اصل مین قدرت نے ان چیزون کو بڑی حد تک اپنے قبضہ مین رکھا ہے۔ لیکن یہ کہکر کہ جب انسانی طاقت قضا و قدر کے سامنے کوئی وقعت نہین رکھتی تو انسان کے لیے جد و جہد کرنا فضول ہے، کوئی شخص بچ نہین سکتا۔ انسان کو حصول مقصد کے لیے حتی الامکان کوشش کرنا چاہیے۔ اگر کامیابی ہو تو سبحان اللہ ورنہ درصورت دیگر کم از کم دل کو یہ اطمینان تو رہتا ہے کہ ہم اپنی طاقت بھر کوشش کرچکے اب کامیابی نہین ہوتی تو ہم پر کوئی الزام نہین۔

اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ فطرتاً سے بقائے دوام کا تاج بغیر دقتون کے اُٹھائے کوئی شخص نہین حاصل کرسکتا۔ بانیان مذاہب، فلاسفہ مصلحین اور دیگر مشاہیر مین سے قریب قریب ہر ایک کو ایسی مصیبتین اُٹھانا پڑی ہین اور ایسی دقتون کا سامنا کرنا پڑا ہے کہ معمولی آدمی کسی طرح اُن کو برداشت نہین کرسکتے۔

صرف یہی نہین۔ ایک طرف تو ان لوگون کو مصائب اور سختیان برداشت کرنا پڑی ہین اور دوسری طرف اپنے عادات واطوار کو ایک سانچے مین ڈھالنا پڑا اور دنیا ان کی بزرگی پر اُس وقت تک ایمان نہین لائی جب تک وہ اُس معیار پر پورے نہین اتر لیے۔

اِن برگزیدہ ہستیون اور باکمال افراد مین سے ہر فرد کا الگ الگ ایک مقصد تھا۔ کسی نے دنیا کی اخلاقی حالت درست کی۔ کسی نے فلسفہ و حکمت کی روشنی پھیلائی۔ کسی نے مذہب کی شمع سے

لامذہبی کی تاریکی کو زائل کیا لیکن چند باتین ایسی ہین جن کا خیال اس گروہ کے ہر ہر فرد کو کرنا پڑا اور واقعہ یہ ہو کہ ان کا لحاظ کیے بغیر کامیابی ذرا مشکل سے ہو سکتی تھی، ہر وہ شخص جسکو بقاے دوام کی دولت نصیب ہوئی اپنے اصول کا پابند تھا۔ بانیان مذاہب نے اپنے زمانہ کی بُری رسمون فاسد عقیدون کو نہین مانا بلکہ ان کی جگہ اپنے خیالات کی تعلیم شروع کی، لوگون کو رائج شدہ باتون کی خرابی دکھائی اور اُن کو صحیح راستہ پرلانے کی کوشش کی فلاسفہ نے قدیم اور فرسودہ مسائل کی تکذیب کی اور اپنے نئے فلسفہ کو دنیا کے سامنے پیش کیا مصلحین نے سوسائٹی کی کمزوریون کا علاج کیا تاجدارون نے انصاف و عدل کا ڈنکا بجایا لیکن ان لوگون کو نہ تو اپنے خیالات کی اشاعت مین آسانی ہوئی۔ نہ خراب رسمون کا آسانی سے استیصال ہو سکا۔ اور نہ عدل و انصاف بغیر مشکلات کے قایم ہو سکا۔ گر مشاہیر مین سے کسی نے بھی دقتون سے گھبرا کر اور سختیون سے عاجز آکر اپنا کام کو چھوڑا نہین۔ بلکہ مستقل مزاجی سے مصائب کے طوفان کا مقابلہ کیا اور اپنے استقلال کی بدولت آخر مین کامیاب ہوے۔

دوسری بات یہ تھی کہ مشاہیر مین سے ہر ایک نے ایک خاص بات کو اپنا مقصد حیات قرار دے لیا تھا۔ اُس کے تعین کر لینے پر انھون نے دل و جان سے اُس کے حصول کی کوشش کی اور نہایت ایمانداری سے مستقل طور پر محنت و جانکاہی کرتے رہے۔ فلاسفہ جب مسائل فلسفہ کی تعلیم کو اپنا مقصد حیات قرار دے چکے تو اُس کے بعد اُنھون نے روپیہ پیسہ، دھن دولت کسی چیز کی پرواہ نہین کی اور اپنے کام سے کام رکھا۔ بانیان مذاہب نے لوگون کے طعنے سنے، جسمانی تکالیف برداشت کین لیکن اپنے مقصد سے نہ ہٹنا تھے نہ ہٹے۔ اسی محنت، جفاکشی، اولوالعزمی، ایثار اور صداقت کا اثر تھا کہ آج مشاہیر کے کارنامے صفحات تاریخ پر آب زر سے لکھے جاتے ہین۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ تاریخ صرف مشاہیر کے کارنامون اور افسانون کا مجموعہ ہے اور اگر ان لوگون کے حالات تاریخ سے الگ کر دیے جائین تو تاریخ ایک جسم بے روح، ایک لفظ بے معنی اور ایک دریے آب ہو جائیگی۔

لیکن ابھی یہ سوال باقی ہو کہ عوام اگر مشاہیر کی پیروی کرین تو کس حد تک کامیاب ہو سکتے ہین؟ سچ یہ ہو کہ مشاہیر کے حالات جمع کرنے کا مقصد یہی ہو کہ لوگ اُن کی تقلید کرین۔ انکے کارنامون کو پڑھکر معمولی آدمیون کے دلون مین ولولے پیدا ہون اور اپنی بساط کے موافق وہ بھی مشاہیر کی تابعیت کرین یہ بہت ممکن ہو کہ عوام مین سے کوئی شخص بھی اُس حد تک ترقی نہ کرے لیکن

یہ فائدہ کیا کم ہے کہ لوگون کو صحیح طریقہ پر کوشش کرنے کا خیال پیدا ہو جائے گا اور ممکن ہے کہ آیندہ اس کی کوششین بارآور ہون اور وہ کوئی ممتاز حیثیت پیدا کر کے اور آگے بڑھ سکے۔

عالی لکھنوی

---

# غزل

دشت پُرخار کبھی روضۂ رضوان ہوگا
بندہ کا بان کبھی آنکہ رو زنگلستان ہوگا

عوض حور جو اے بُت ترا خواہان ہوگا
سارے محشر مین وہی ایک مسلمان ہوگا

غضب دیکھی ہے یہ انداز لگاوٹ وائے
وہ پھلسے گا تری باتون مین جو نادان ہوگا

پارساؤن کے سوا رند نہ پائین گے شراب
شیخ میخانے مین جب سے نگہبان ہوگا

ہان ذرا ایک نظر دیکھ لے ہنس کر مجھکو
پیارے دیکھنے والے ترا احسان ہوگا

وہ یہ سمجھین گے شکایت یہ مری کرتا ہے
آسمان کے جو ستم سے کوئی نالان ہوگا

میری تربت کو وہ ٹھکرا کے بڑھے گا آگے
گذر اُس کا جو سوے گور غریبان ہوگا

ہان مرا پیر خرابات اسی قابل ہے
کون پھر بادہ کو ثر کا نگہبان ہوگا

پھول کا دور صراحی کے گلے مین گجرے
رند میخانہ سمجین گے چمنستان ہوگا

پرسش حشر کے طوفان سے بچانے والا
اپنی امت کا محمد ہی نگہبان ہوگا

اور رہنا ہے کہان تجھکو مرے دل کے سوا
ہوگا برباد جو دل گھر ترا ویران ہوگا

کیون رُلاتے ہو غضب ڈھائیگا رونا اپنا
اشک جو آنکھ سے نکلے گا وہ طوفان ہوگا

فکر کیون کرتا ہے اس طرح مین بیکار خلیل
اس زمین مین تو نہ آتش سا غزلخوان ہوگا

محمد خلیل الرحمن خلیل زمیندار بسوان

# سفر حجاز کی مختصر روداد

## پانچویں منزل

شہداے نکلا[illegible] تنعیم کے آگے اونٹ رک گئے۔ یہان ایک جانب حکومت کے کارکن ڈیرہ ڈالے پڑے تھے اور گیس کی تیز روشنی مین اونٹون کا شمار کر رہے تھے۔ ہمارے معلم کے کارکن یوسف نے اپنے سب اونٹ شمار کرا دیے اور ضروری مراسم تحریر ادا ہوگئے تو وہان سے رخصت ہو کر آہستہ آہستہ قافلہ روانہ ہوا۔ اور دن بھر کی ماندگی کے اثر سے ذرا نیند آگئی۔ مگر شغدف پر [illegible] سونا اور وہ بھی پہلی رات قطعاً ناممکن تھا اس [illegible] شتربان [illegible] میزان کے آواز ہ لگا کر مسافرون کو اپنے اپنے شغدفون کا توازن برقرار رکھنے کی ہدایت کرتے تھے اور چونکہ اونٹون کی دو تین قطارین پاس پاس چلتی تھین اس [illegible] کے شغدف ٹکرا جاتے تھے اور کبھی برابر برابر چلنے والے شغدف [illegible] تھے۔ نصف شب کے بعد دور سے روشنی دکھائی دی [illegible] ہے۔ چنانچہ تقریباً ۲ بجے رات کو [illegible] پڑاؤ پر پہونچے [illegible] انزل انزل کہکر اوترنے کا تقاضا شروع کیا۔ جلدی جلدی [illegible] شغدفون کو انھون نے ہم لوگون کی مدد سے بعجلت تمام اوتا پھینکا اور اونٹون کو [illegible] ہمنے امداد باہمی سے اپنے اپنے شغدفون کا سامان اوتارا۔ [illegible] بچھونے بچھائے کہ اتنے مین آواز آئی "حطب" فوراً تھوڑی لکڑی خریدی گئی اور پھر جب "مویا مویا" کی صدا لگاتے ہوے مرد عورتین اور بچے مشکیزون اور مٹی کے کنسترون مین پانی لائے تو ضرورت کے مطابق پانی لیا گیا [illegible] اتنا نہ تھا کہ سوتے لہذا تھوڑی [illegible] باتون مین گذار کر نماز فجر ادا کی مین نے اپنے ساتھیون سے طے کرلیا تھا کہ لکڑی اور پانی کی فراہمی اور بازار کے دوسرے کام میرے متعلق ہین [illegible] کھانا پکوانا اور جاے قیام پر دوسرے امور کی نگرانی

وہ کرین گے ۔ لکڑی اور پانی چونکہ بآسانی فراہم ہوگئے تھے اور دونون چیزون کے بیچنے والے مسلسل آتے رہتے تھے اس لیے نماز فجر کے بعد ہی مین نے پڑاو کا گشت لگایا اور بازار کا پتہ چلایا ۔ ہمارا قافلہ ایک بلندی کے دامن مین تھا اور دور تک شغدف ہی شغدف نظر آتے تھے ۔ ہر معلم کے حجاج کی الگ الگ ٹولی تھی اور عموماً اُن کے شغدف پاس پاس ایسے طریقہ پر رکھے گئے تھے کہ دائرہ یا نصف دائرہ کی صورت بن جائے درمیانی میدان مین لوگ اپنے بچھونے بچھاتے اور چولھے چڑھاتے ۔ جن لوگون کے ساتھ راوٹیان یا تنگیرے تھے اُنھون نے شغدفون سے کچھ فاصلہ پر ڈیرے جمائے تھے ۔ یہ سلسلہ بلندی کے اوپر تک چلا گیا تھا مین گھومتا ہوا ادھر پہونچا تو دیکھا کہ بلندی کے اُس جانب نہر رواں ہے ۔ جس کے کنارے بکثرت اونٹ اور آدمی جمع ہین ۔ یہ نہر وہی ہے جو نہر زبیدہ کے نام سے مشہور ہے اور جس کا پانی مکہ معظمہ مین پیا جاتا ہے ۔ اس کا اکثر حصہ پٹا ہوا بیان کیا جاتا ہے ۔ مگر یہان دور تک کھلی ہوئی ہے ۔ نہر کا عرض بہت ہی کم ہے کسی جگہ تین چار فٹ ہے ورنہ عموماً دو فٹ سے زیادہ نہین ۔ بڑے بڑے المونیم کے تسلے اونٹون کے سامنے رکھے ہوے تھے اور جمال چمڑے کے ڈولون سے پانی بھر بھر کر پلا رہے تھے ۔ پاس ہی سیکڑون آدمی غسل کر رہے تھے جس مین مرد و عورت کی کچھ تمیز نہ تھی ۔ یہ لوگ عموماً ملک جاوہ کے رہنے والے تھے ۔ ان لوگون مین بظاہر حیا و غیرت کا نام نہین ہے ۔ جس طرح ہندوستان مین دریاؤن کے گھاٹون پر ہندو مرد و زن ملکر اشنان کرتے ہین ، بعینہ یہی حالت جاویون کی تھی ۔ بعض لوگ نہر کے اندر نہا رہے تھے ۔ اور چونکہ نہر کا عمق بھی بہت کم ہے اسوجہ سے مرد و زن سب برہنہ یا نیم برہنہ نظر آتے تھے ۔ نہر کے کنارہ دور تک کھیتی اور نخلستان دکھائی دیتے تھے کنارہ سے ذرا ہٹکر ایک سمت کو بازار لگا ہوا تھا ۔ یہان اونٹ گائے ، بکری اور دنبہ کا گوشت ، انڈے ، روٹیان ، سبزی ، خربزے ، تربوز ، جبن ، تیل ، چاے ، شکر اور تمباکو وغیرہ ضرورت کی سب چیزین بک رہی تھین ۔ بازار جھونپڑیون کا بنا ہوا تھا اور بیلون سے منڈھے ہونے کی وجہ سے خوشنما معلوم ہوتا تھا کھانے کی دوکانین

اور قہوہ خانے متعدد تھے۔ مین چونکہ گھومتا ہوا پہونچا تھا اس وجہ سے ذرا دیر مین پہونچا ورنہ ہمارے مقام سے ایک فرلانگ سے زائد فاصلہ نہ ہوگا۔ واپس آکر ساتھیون کو چا کا ناشتہ اور کھانا کھانے کی فکر ہوئی۔ آفتاب کافی بلند ہو چکا تھا۔ تمازت بڑھ رہی تھی اور ہوا کی حدت ترقی پر تھی۔ دن اسی بے پناہ میدان مین بسر کرنا تھا لہذا لیٹنے۔ بیٹھنے اور نماز پڑھنے کے لئے کوئی جگہ بنانا ضروری تھی۔ مگر ناواقفیت اور پہلے سے اس کا خیال نہ آنے کی وجہ سے ہمارے شغدف بہت ناموزون رکھے گئے تھے۔ بہرحال موقع کے لحاظ سے پانی بھرنے کی تھیلیون اور چادر ورضائی کی مدد سے ایک جگہ ایسی بنائی گئی جہان سایہ رہ سکے اور کھانا کھا کر سو رہا۔ ظہر کے قریب اٹھا تو ایک شخص خرمے بیچنے لایا۔ یہ خرمے بہت ہی خوش ذائقہ تھے۔

صبح ہی کو ہمارے شغدفون سے قریب عراقیون کی جو جماعت خیمہ زن تھی اسمین سامان غسل وکفن ہو رہا تھا۔ شام کو ہمارے سامنے کے قافلہ مین ایک حاجی نے انتقال کیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ عصر کے وقت مین ضیاء الاسلام صاحب کے یہان بیٹھا تھا کہ دفعۃً آندھی سی چلنے لگی۔ دن بھر کی تپش اور لو کے بعد اگرچہ اس سے بہت کچھ فرحت ہوئی مگر اس خیال سے کہ کہین بارش نہ ہو جائے بعجلت اپنے مقام پر واپس آیا۔ آندھی دیر تک رہی۔ کچھ ترشح بھی ہوا باقی غنیمت ہے کہ بارش کی نوبت نہین آئی۔

ہمارے قافلہ نے یہان ایک دن مقام کیا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ بہت سے جمالون کے گھر قریب ہی ہین اس لئے وہ اپنے گھر والون سے ملنے گئے ہین شام کو ہم بعد مغرب کھانا کھا رہے تھے کہ میرا جمال عبدالرحمن آگیا۔ اور میری دعوت پر وہ بھی کھانے مین شریک ہو گیا اور کھانے سے فارغ ہو کر بخشش کا دینہ چاہا کو احتیاطاً نہین دیا گیا تھا لیکر کہین چلا گیا۔

۲۸- مئی روز دوشنبہ دوسرے دن چاشت کے وقت بھاگتا ہوا آیا اور مجھے کہا کہ ایک بورے مین تمام جنس اور بھاری سامان باندھکر مجھے دو میرے پاس کوئی فاضل بورا نہ تھا لہذا اس کے ساتھ جا کر بازار سے خرید کیا اور واپس آکر بھاری اور غیر ضروری سامان بورے مین رکھکر اس کے حوالہ کیا۔ ہمارے ساتھیون نے بھی اپنا زائد سامان اپنے جمالون کو

اور کسی قدر بلندی پر تھے کہ اُن پر سے چڑھ کر سارے پڑاؤ کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ مگر پانی وادی فاطمہ جیسا شیرین وسبک نہ تھا اور نسبتاً گران بھی ملا۔ جمالون نے شغدف اُتار رکھنے کے وقت تو میری ہدایت پر چندان توجہ نہ کی تھی لیکن وادی فاطمہ میں شغدفون کو اُتار کر رکھے ہونیکی وجہ سے جو تکلیف ساتھیون کو ہوچکی تھی اُس کی بنا پر سب لوگون نے بالاتفاق طے کر لیا تھا کہ آئندہ سے شغدف بالمقابل رکھے جائین۔ چنانچہ ہم لوگون نے خود اپنے اپنے شغدف اُٹھا کے مقابل مین کر لئے تھے اور بازار سے آکر جیسے ہی آفتاب بلند ہوا اور تمازت ناقابل تحمل ہوگئی، رضائیان نکال کر شغدفون کے درمیان باندھ دی گئین جسکے سایہ مین کھانا بھی پکا لیا گیا اور آرام سے لیٹ بیٹھ بھی سکے۔ وادی فاطمہ مین ٹھہرنا زیادہ پڑا تھا اور یہان قیام مختصر تھا اس وجہ سے کھچڑی کھا لی گئی اور شام کے لئے روٹی پکا لی گئی۔* ظہر کے قریب قافلہ روانہ ہوا۔ منزل چھوٹی تھی۔ راہ مین شربت چائے تربوز بکثرت فروخت ہو رہے تھے۔ ایک روز قبل کے تجربہ کی بنا پر مین نے طے کر لیا تھا کہ اب عصر سے قبل شغدف سے نہ اُترون گا۔ کیونکہ ہوائے گرم وتند اور آفتاب کی جھلس دینے والی تپش کے مقابلہ مین مَین بہت نحیف و زار تھا۔ ہمارے اونٹون کا رُخ اگرچہ مغرب جانب ہونے کی وجہ سے آفتاب پشت کی جانب تھا لیکن ہوائے گرم کے لوکے شغدف کے اندر بھی آرام سے نہ بیٹھنے دیتے تھے۔ اس لئے سامنے کے رُخ پر رضائی کا پردہ باندھا گیا اور پشت پر اگرچہ کہ شغدف مین چٹائی کسی ہوئی تھی لیکن دونون شغدفون کے درمیان جو حصہ کھلا رہتا تھا اُس سے دھوپ اور ہوا کے گذر کو بند کرنے کے لئے بھی ایک مختصر پردہ باندھنا پڑا۔ پھر بھی ہوا کی تیزی اور اونٹ کی بے ڈھنگی چال کے باعث جب کسی جانب کا پردہ کھل جاتا تو ہوا کا وہ تھپیڑ لگتا کہ معلوم ہوتا کسی نے آگ سے داغ دیا ہے۔ شغدف مین پردون کے باندھ دینے کی وجہ سے جہان ہوا کے تھپیڑون سے نجات مل گئی تھی وہان حبس بھی ہوگیا تھا جسکی وجہ سے دم گھٹنے لگتا پیاس کی شدت تھی۔ جو صراحیان سامنے کی طرف تھین اُن کا پانی پیتے رہے اِس لئے کہ پشت کی طرف جو صراحیان تھین اُن کا پانی تمازت آفتاب سے پک گیا تھا۔ عصر کے وقت

* [illegible]

جبکہ آفتاب بالکل شغدف کے اُس جانب آگیا جدہر چٹائی کسی ہوئی تھی اور ہوا کی تیزی دگرمی میں بھی کمی ہوئی تو پشت کا پردہ کھولا گیا۔ شام کو روٹی اور کھجور اور وطن کا پکوان کھایا۔ اور یہی بدو کو دیدیا۔ عشا پڑھکر کچھ دیر سوئے نصف شب کو منزل پر پہونچے۔ چونکہ پورا قافلہ آگے پیچھے روانہ ہوتا۔ چلتا اور منزل پر پہونچتا ہے اس لئے جو لوگ پہلے پہونچ کر آباد ہو چکتے ہیں اُن کے پڑاؤ کی مشعلوں کا نظارہ دور سے شغدف میں بیٹھکر بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اپنے پڑاؤ پر پہونچنے سے پہلے جتنی مسافت قافلہ کے گرد طے کی جاتی ہے اُس میں میلہ کی سیر کا لطف آتا اور چونکہ پانی اور لکڑی فروخت کرنے والوں کی کثیر تعداد "مویا - مویا" اور "حطب حطب" کے آوازے لگایا کرتی اس لئے ایک عجیب قسم کا ہنگامہ بپا رہتا تھا۔ شغدف سے اُترتے ہی فوراً پانی خریدا گیا۔ اور چند منٹ کے اندر بستر بچھا کے سو رہے۔

## نظرے خوش گذرے

گذشتہ پرچہ میری علالت کے باعث بتاخیر شایع ہوا تھا۔ مسلسل بدنظمی اشاعت میں چونکہ الناظر کے سابق کاتب صاحب کی کم التفاتی کو بھی دخل تھا اس لئے مارچ نمبر کی اشاعت کے بعد ہی الناظر کی کتابت دوسرے زودنویس کاتب صاحب کے سپرد کی گئی۔ چنانچہ وسط رمضان تک الناظر کی ۳/۴ کتابت ہو چکی تھی اور امید تھی کہ عید سے قبل پرچہ تیار ہو جائے گا۔ جس کے بعد ماہ بماہ رسالہ کا وقت پر شایع کرنا ممکن ہوگا مگر شہر میں آب و ہوا کی خرابی سے جو امراض پھیلے ہوئے ہیں نئے کاتب صاحب دفعتہً اُن میں مبتلا ہو گئے اور تقریبًا تین ہفتہ تک کام بند رہا۔ اس لئے یہ پرچہ مزید تاخیر کے ساتھ اور کسی قدر کم حجم کا شایع کیا جا رہا ہے۔ منشی امیر علی صاحب رقم جو برسوں تک الناظر لکھتے رہے ہیں اب پھر الناظر کی کتابت کے لئے معین کئے گئے ہیں اور مئی نمبر لکھ رہے ہیں امید ہے کہ اُن کے عہد کتابت میں مثل سابق الناظر

پوری پابندی کے ساتھ شایع ہوسکے گا۔ جدید انتظام سے توقع ہے کہ اس ششماہی کے اختتام تک پرچہ اپنے وقت پر نکلے گا۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ عذر گناہ کی بدتر معصیت سے راقم الحروف کو نجات ملجائے گی۔ السعی منی والاتمام من اللہ ۔

---

حضرت چلبی نے عزل خلافت کے سلسلہ مین جن خیالات کا اظہار فرمایا ہی رسالہ ہذا کے ناوقت شایع ہونے کی وجہ سے افسوس ہے کہ اُن کا لطف کم ہوگیا۔ مگر چونکہ اخبار حقیقت کے ذریعہ ان خیالات کی وقت پر اشاعت ہوچکی ہے اس لئے اطمینان ہو کہ چلبی صاحب کا مقصد فوت نہین ہوا۔ اور اُنھین غالبًا اس بات کے علم سے مسرت ہوگی کہ اصحاب متعلقہ نے اُن کے مشورہ کو رد نہین فرمایا۔

---

جناب سید طفیل احمد صاحب جائنٹ سکریٹری آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کی "تبلیغ سود" کے متعلق چلبی صاحب نے جو کچھ لکھا تھا اُس کے جواب مین صاحب موصوف کا ایک مراسلہ وصول ہوا تھا، جو چلبی صاحب کی تشریحات کے ساتھ انشاء اللہ مئی نمبر مین شایع ہوگا۔ مجھے افسوس ہے کہ سید صاحب موصوف کو یہ اطلاع پہنچ جانے کے باوجود کہ اُن کی تحریر شایع ہوگی۔ اُنھون نے اس مراسلہ کو متعدد اخبارات مین شایع کرایا۔ اگر چلبی صاحب کی تشریحات کا اضافہ نہ ہوا ہوتا تو ان حالات مین اس مراسلہ کو الناظر مین درج کرنا نہ گوارا کیا جاتا۔ سید صاحب کا جوش تبلیغ اس درجہ بڑھا ہوا ہی کہ اُنھون نے اس بات پر ذرا توجہ نہین فرمائی کہ الناظر جیسے ماہوار رسالہ کو جس کا موجودہ حجم اُسکے معاونین قلمی کے علمی و ادبی مضامین ہی کے لئے کافی نہین ایسے مضامین کی قطعًا حاجت نہین ہے جو اخبارات مین شایع ہوچکے ہون۔ قضیہ زمین برسر زمین پر نظر کرکے اگر الناظر مین اُن کا مضمون شایع کیا جارہا تھا تو اُن کو دوسرے اخبارات مین نقول بھیجنے سے احتراز فرمانا چاہیے تھا۔ اور اگر اس بحث مین وہ آئندہ حصہ لین تو از راہ کرم ان معروضات پر نظر رکھین۔

# خریداران الناظر سے خاص رعایت

الناظر بک ایجنسی کے کاروبار کو بفضلہ تعالیٰ جو کامیابی نصیب ہوئی ہی چونکہ ناظرین الناظر کا اس سے گہرا تعلق ہی اس لیے آئندہ کے لیے یہ تجویز کیا گیا ہی کہ خریداران رسالہ کے ساتھ مطبوعات ذاتی کی قیمت مین خاص رعایت کی جائے. مگر یہ رعایت صرف خریداران رسالہ کے لیے ہوگی اور لازمی ہوگا کہ الناظر بک ایجنسی کو فرمائش بھیجتے وقت اپنا نمبر خریداری تحریر فرما دیا کرین۔

ظفر الملک

## مسلمانون کی تہذیب

یعنی مسلمانون کی تمدنی ترقی کے متعلق نواب محسن الملک مرحوم کا ایک فاضلانہ لکچر. قیمت ۶ر (خریداران رسالہ سے ۵ر)

## میلاد النبی ؐ

مشہور محدث حضرت ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کے اصل عربی متن کے مقابل اسکا نہایت فصیح اردو ترجمہ. قیمت ۴ر (خریداران رسالہ کے لیے ۳ر)

## الاحسان

مصنفہ مولوی احسان الدین علوی مرحوم جسمین لفظ صوفی کی تحقیق تصوف کی ابتداء اور اس کی درجہ بدرجہ ترقیون کا ذکر ہی اور آخرمین تصوف کے تمام شعبون کو اسلام سے تطبیق دی گئی ہی قیمت ۸ر (خریداران رسالہ کے لیے ۵ر)

## مجموعہ کلام شبلی

مولانا شبلی مرحوم کا اردو دیوان جس کا ایک ایک شعر ان کی قادر الکلامی و اعلیٰ فن شاعری کا نمونہ ہی قیمت ۱۲ر (خریداران رسالہ کے لیے ۱۰ر)

## وکرم اروسی

ترجمہ مولوی عزیز مرزا بی اے مرحوم یہ کالی داس کے مشہور و معروف ڈرامے کا اردو ترجمہ ہی جسمین لائق مترجم نے ایک بسیط مقدمہ شامل کیا ہی اور ہندو ڈرامہ کی تاریخ اور نوعیت پر مفصل بحث کی اور کالی داس کا موازنہ شکسپیر اور میر انیس وغیرہ سے کیا ہی قیمت ۱۲ر (ناظرین رسالہ کے لیے ۱۰ر)

## مثنوی امید و بیم

لکھنؤ کے مشہور شاعر وانشاپرداز و فلسفی مرزا محمد ہادی رسوا بی اے کی لاجواب نظم جسے اردو مین اعلیٰ درجہ کے فلسفیانہ خیالات کی پہلی نظم کہنا بجا ہوگا قیمت ۴ر (خریداران رسالہ کے لیے ۳ر)

## ارض نہرین

میسوپوٹیمیا یا عراق عرب کے آثار تاریخ مؤلفہ مسٹر عنایت اللہ بی اے رجسٹرار عثمانیہ یونیورسٹی. قیمت ۴ر (خریداران رسالہ کے لیے ۳ر)

## دلچسپ مختصر افسانے

ایک نادان خداپرست اور دنیادار کی کہانی ۱ر

سادات - از مسٹر سلطان حیدر جوش ۱ر

اتفاقی زمانہ ۱ر

(خریداران رسالہ کے لیے نصف قیمت)

## افراد کا سبہ

جسٹس مولانا سید کرامت حسین مرحوم کا ایک قابل قدر مضمون قیمت ۴ر (خریداران رسالہ کے لیے ۲ر)

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۲۰۸

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# الناظر

ایڈیٹر۔ ظفر الملک علوی

| نمبر ۱۵۵ | ماہ مئی سنہ ۱۹۲۴ء | جلد ۲۶ |
|---|---|---|



الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

# مطبوعات جدیدہ

## انتخاب میر

میر تقی میر کے ضخیم کلیات کا یہ انتخاب مولوی نور الرحمن بی اے ایڈیٹر جامعہ نے کیا ہے اور ابتدا میں میر صاحب کی مختصر سیرۃ لکھی اور انکی خصوصیات شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔ حجم ۱۶۴ صفحے۔ ہلکی جلد۔ قیمت عمر

## روح نظیر

نظیر اکبرآبادی کے کلام کا انتخاب۔ جسکو زمانہ حال کے مطابق بعد تصحیح و تنقیح و باضافہ دیباچہ، مقدمہ، سیرہ، فرہنگ، حواشی و انڈکس۔ سید محمود رضوی مخمور بی اے نے مرتب کیا ہے۔ حجم ۴۰۰ صفحے قیمت ؏

## دیوان خواجہ میر درد

جو نہایت صحت و صفائی کے ساتھ چھاپا گیا ہے۔ اور جسکے شروع میں جناب مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی کا مقدمہ اضافہ کیا گیا ہے۔ قیمت ۱۲ر

## دیوان جان صاحب

لکھنؤ کے مشہور ریختی گو شاعر میر یار علی کا دیوان جو چودھویں صدی کے تہذیب یافتہ دور میں ناپید ہو گیا تھا بعض منچلے صاحبان مطبع نے حال ہی میں چھاپ دیا ہے۔ لکھنؤ کا چھپا ہوا تو بالکل معمولی ہے اور ۸ر میں ملتا ہے۔ البتہ بدایوں میں اہتمام سے چھاپا گیا ہے۔ میر یار علی کے رنگ میں شعر لکھنے والے جناب ناصر حسین صاحب دہلوی سے ٹکسالی زبان میں دیباچہ لکھوایا گیا ہے۔ قیمت ۱۲ر

## خطوط امیر مینائی

یہ مجموعہ ۔۔۔ ہوا چھپا تھا۔ اب دوبارہ اہتمام سے چھاپا گیا ہے۔ شائقین منگالیں۔ قیمت ۱۲ر

## گلزار داغ

میرزا داغ کا یہ دیوان بھی عرصے سے نہیں ملتا تھا۔ اب پھر چھپ گیا ہے۔ قیمت عہ

## فیوض یزدانی

حضرت غوث الاعظم سید عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مجموعۂ مواعظ الفتح الربانی کا ترجمہ جس میں آپ کے ۶۲ وعظ ہیں - قیمت ۱۲؍

## انوار سبحانی

حضرت غوث الاعظم کے چالیس وعظوں کی شرح معہ ترجمہ - قیمت ۸؍

## اسلام

جناب مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی مترجم قرآن شریف نے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سوانح عمری نہایت مستند اور صحیح ماخذوں سے اور آسان و سلیس عبارت میں لکھی ہے - حجم ۲۰۰ صفحے اور قیمت بالکل کم یعنی ۸؍

## زین العلم

امام ہمام محمد بن عثمان بن عمر البلخی کی لاجواب کتاب "عین العلم" کا ترجمہ ہے - جسکے مطالعے سے واضح ہو گا کہ عبادات اور معاشرت میں حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات کیا تھے اور اتباع کرنے والوں کو ہدایت پانے میں آسانی ہوگی - قیمت ۱۲؍

## تبلیغ دین

جس میں اسلامی زندگی کے ہر شعبے کے متعلق ضروری احادیث کا ترجمہ درج کیا گیا ہے تاکہ اردو داں لوگوں کو ہر معاملے کے متعلق احکام حدیث معلوم ہو جائیں - قیمت ۱۲؍

## حیات العلما

مؤلفہ مولانا سید محمد عبد الباقی صاحب سہسوانی جس میں سہسوان کے تقریباً ڈیڑھ سو علما کے حالات درج ہیں - قیمت ۸؍

**منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ**

## ایک ضروری تصحیح

اسی پرچے میں صفحہ ۱۶ پر تپش صاحب کی غزل ہے۔ چوتھے شعر میں "شغل" کا غین متحرک ہے - میں نہ شاعر ہوں نہ شعر فہمی کی اہلیت رکھتا ہوں تاہم شغل کی یہ صورت نامانوس کھٹکی - میں نے لغت کی طرف رجوع کیا مگر تشفی نہ ہوئی - پھر قرآن شریف میں دیکھا اس میں "شُغُلٍ فَاکِہُوْن" لکھا پایا۔ اس لیے خیال ہوا کہ عربی میں حرکت کے ساتھ استعمال جائز ہوگا اور شعر کو علی حالہ چھپ جانے دیا - کئی روز بعد بعض احباب کے سامنے ذکر کیا جو ماشاءاللہ سخن سنج بھی ہیں اور سخن فہم بھی - اُنھوں نے بالاتفاق اسکو غلط بتایا - لہٰذا سردست وہ مصرعہ یوں پڑھا جائے ع

کرتا ہوں تصور میں تری زلف سے میں شغل

اُمید ہے کہ تپش صاحب اپنے شعر میں خود بھی مناسب ترمیم کردیں گے - ایڈیٹر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# الناظر

نمبر ۱۵۵ جلد ۲۶ — ماہ مئی سنہ ۱۹۲۴ء

## فیہ ما فیہ

(از : چلپی)

بعض "یاران طریقت" جو کل تک "ناصح مشفق" کی حیثیت رکھتے تھے، شکست منصب خلافت کے ساتھ ہی اُس کے "ہمدرد و غمگسار" بن کر ایک بار پھر دُنیا کے سامنے رُونما ہوئے ہیں۔ ان غمگساروں میں سب سے زیادہ قابل ذکر برطانیہ کے مشہور و معروف سابق وزیر اعظم، لائڈ جارج بہادر بالقابہ ہیں، جو ایک مدت تک کروڑوں مسلمانوں کی گویا قسمت کے مالک رہے ہیں۔ آپ کا ایک مقالۂ گرامی زوال خلافت پر ڈیلی کرانیکل میں شایع ہوا ہے، جو یوں تو از سرتا پا مرصع ہے لیکن بلحاظ صحت معلومات حسب ذیل جواہر پارے خصوصیت کے ساتھ قابل قدر ہیں:۔

> "وفد خلافت ہند کے سردار ہندوستان کے ایک قابل ترین و کامیاب ترین بیرسٹر مسٹر محمد علی تھے۔ انکی وکالت کی آمدنی شاید ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ ہے"

> "یہ نامور مسلمان مقنن" (یعنی مولانا محمد علی)

> "مشرق کا یہ فاضل ترین و ممتاز قانون پیشہ شخص"

اسی خاکِ پاکِ انگلستان کے ایک نامور صحافی (جرنلسٹ) سر علی امام کے سفر انگلستان کے متعلق اظہار خیالات فرماتے ہوے، موصوف کے متعلق ...... "مندرجۂ ذیل الفاظ مین گہر افشانی فرماتے ہیں :-

"یہ بہار کے وزیر اعظم ہیں"

آگے چل کر سر علی امام کو "نظام" قرار دیا جاتا ہے، اور زبان قلم یوں نغمہ سرا ہوتی ہے :-

"نظام، لیبر پارٹی کے ارکان وزارت سے برابر ملاقاتیں کر رہے ہین، اور اس کوشش میں لگے ہوے ہیں، کہ ہندوستان اور برطانیہ کے مشاہیر کے تعلقاتِ باہمی میں ترقی ہو"

"انکی (یعنی نظام سر علی امام کی) دولت حد شمار سے فزوں ہے - اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ صرف ہیرے اس تعداد میں ہیں، کہ چھ آدمی انکے ڈھیر میں دفن ہو سکتے ہیں - مگر باوجود اس ثروت کے نظام پختہ مسلمان ہیں، اور روپئے کو سودی کاروبار میں لگانے سے مذہبًا محترز ہیں"

---

غریب مشرقی اپنی داستان طرازی و اختراع دماغی کی سب سے بڑی معراج یہ سمجھتا تھا کہ نالۂ "نارسا" کو "رسا" فرض کر لیتا، قدیار کو سرو شمشاد سمجھنے لگتا، زلفِ سیاہ پر افعی کا گمان کرنے لگتا، اور ان منازل کمال کے طے کرنے کے بعد پکار اُٹھتا کہ

غلطیہا ے مضامیں مت پوچھ!

لیکن مغرب کی متمدن و ترقی یافتہ قوت تخیل کے لیے ان حدود کے اندر مقید رہنا باعث ننگ و عار ہے - اسکے شاعروں نے نہیں، اسکے افسانہ نویسوں نے نہیں، سنجیدہ مدبّرین سلطنت اور ذمہ دار اخبار نویسوں نے، اس بابِ خاص میں بھی، ترقی و کمال کے وہ مدارج عالیہ طے کر لیے ہیں، کہ غریب مشرقی مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے - محمد علی ہندوستان کے کامیاب ترین بیرسٹر ہیں، انکی وکالت کی آمدنی سب سے بڑھی ہوئی ہے، انکی قانونی قابلیت کے شہرے تمام ملک میں ہو رہے ہین - سر علی امام صوبۂ بہار کے وزیر اعظم ہیں، نظام ہیں، خزانۂ قارون کے مالک ہیں، وقس علیٰ ہذا - یہ وہ الہامات ہیں، جو علم و عقل، تحقیق و تدقیق، ثقاہت و دیانت کے فلک الافلاک سے نازل ہوے ہیں بیسشامت بہ

اُس بدبخت مشرق کی، جو انکے قبول کرنے میں ادنیٰ تردد و تذبذب کو دخل دے! مشرق کو اپنی الف لیلہ، طلسم ہوش رُبا، و داستان امیر حمزہ پر ناز تھا، چشم فلک اس امتیاز کو بھی نہ دیکھ سکی اور بالآخر مغرب کے ذمہ دار وزراء اور ارباب قلم، اسے اس میدان میں بھی زیر کرکے رہے۔

---

الناظر کے عنوان فیہ ما فیہ کے تحت میں جو کچھ عرض خیال کیا جاتا ہے، اس پر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کا سرکاری آرگن اکثر نقد و تبصرہ کرتا رہتا ہے۔ ادھر اُس کے لب و لہجے سے کچھ ایسا مترشح ہوا کہ شاید وہ سطور ہذا کے راقم کو کارکنان مسلم یونیورسٹی کا مخالف یا دشمن سمجھتا ہے۔ اور اسکے نزدیک گویا راقم سطور کو یونیورسٹی اور منتظمین یونیورسٹی پر نکتہ چینی میں لطف آتا ہے۔ اگر فی الواقع ارباب یونیورسٹی کے ذہن میں اس قسم کا خیال ہے، تو اس سے زیادہ غلط و بے بنیاد خیال ممکن نہیں۔ علیگڈھ کالج کے بانی کی نیک نیتی و محبت اسلام یقیناً شک و شبہہ سے ارفع ہے۔ محسن الملک کا درد قوم مسلم ہے، وقار الملک کی صحیح اسلامی زندگی قرون اولیٰ کی یاد تازہ کرتی رہی۔ حاجی اسحٰق خاں کو ذاتِ رسالتؐ کے ساتھ جو والہانہ شیفتگی تھی وہ بہت سے علماء و مشائخ کے لیے باعث رشک ہے۔ اسی طرح آج بھی صاحبزادہ صاحب کی ذات بہت سے خصائل حمیدہ کی جامع، اور انکی نیت اغراض ذاتی کی آمیزش سے ماوراء ہے۔ لیکن ان تمام مناقب شخصی کے باوجود (جنکے اعتراف میں نہ کبھی پیشتر تامل ہوا ہے نہ انشاءاللہ آیندہ ہوگا) یہ ایک امر واقع ہے کہ تحریک علیگڈھ شروع سے اس راہ پر چل رہی ہے، جو یثرب و بطحا نہیں، پیرس و لندن پہونچ کر ختم ہوتی ہے۔ اسکے دردیوار، ہا اسٹریچی وسٹن، مارکولیس و مارسین کے نعرہائے استقبال سے گونج چکے ہیں، لیکن حاجی وارث علی و فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی، محمود الحسن دیوبندی اور محمد نعیم فرنگی محلی کے ورود کی سعادت ایک مرتبہ بھی اسکے نصیب میں آئی؟ اس نے اب تک صدہا بلکہ ہزارہا کامیاب اور مشہور بیرسٹر، وکیل، حکام سرکاری، ڈاکٹر، انجنیئر، ماہر ریاضیات، اہل فلسفہ وغیرہ پیدا کر دیے، لیکن کوئی ایک مفسر، کوئی ایک محدث، کوئی ایک فقیہ بھی پیدا کر سکا ہے؟ یہ بھی نہ سہی، اگر علیگڈھ نے اپنی نصف صدی کی زندگی میں اپنے اثر سے، کوئی ایک بھی پختہ مسلمان پیدا کر دیا ہو، تو خدارا اُسکی مثال پیش کی جائے۔

جب اس کی فضا میں اسلامیت کا اس قدر قحط ہو، جب اس کا ماحول ایمان و روحانیت سے اس درجہ بیگانہ ہو۔ تو اگر اُسے کبھی کبھی ان فراموش شدہ فرائض کی جانب توجہ دلا دی جایا کرے، تو کیا کوئی معصیت ہے؟ کوئی بداخلاقی ہے؟ یا پھر رنجش و برہمی کی کوئی وجہ بن سکتی ہے؟ ہر کلمہ گو اس پر مامور ہے، کہ اپنے ہر ہم عقیدہ کو حق و صدق، صبر و خلوص کی دعوت دیتا رہے، اور وتواصوا بالحق و تواصوا بالصبر سب مل کر ایک دوسرے کو نیکی پر آمادہ کرتے رہیں۔ خدا اس کی توفیق ہر پیرو اسلام کو دے، کہ اپنے بھائی کی اصلاح کے لیے، اس کی ہر برائی پر اُسے ٹوکے، اور ہر اچھائی پر اُس کی حوصلہ افزائی کرے۔ اور اس لعنت سے محفوظ رکھے، کہ کسی قومی کام کی مخالفت، اپنی نفسانیت یا کسی کی ذاتی کدورت کی بنا پر کی جائے۔ علیگڈھ پر مسلمانوں کی بیشمار دولت اب تک خرچ ہو چکی ہے، اور ہر سال لاکھوں کی رقم اب بھی اُٹھ رہی ہے۔ اسکے ارباب حل و عقد اُس گھڑی سے ڈریں، جب ایک ایک پائی کا حساب دینا ہوگا، اور بتانا پڑے گا کہ کس قدر رقم خدا کی راہ میں خرچ ہوئی، اور کس قدر نفس و شیطان کی راہ میں۔ (مذہبی اصطلاح میں ہر بُری شے کا نام شیطان ہی ہے)

---

حاشا، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں، اور نہ ہو سکتا ہے، کہ یہ وہم، محتساب صرف علیگڈھ ہی کو پیش آتا ہے۔ اس کا پیش آنا جس طرح علیگڈھ کے لیے برحق ہے، اسی طرح جامعہ ملیہ کے لیے، فرنگی محل کے لیے، ندوہ کے لیے، خلافت کمیٹی کے لیے، دارالمصنفین کے لیے، قومی اخبارات کے لیے، اور ان سطور کے تحریر کرنے والے کے لیے، سب کے لیے یقینی و قطعی ہے۔ دعا ہے، کہ وہ غفار و ستار، رحمٰن و رحیم، حلیم و کریم، ذات، بے نیاز، اُس بڑے اور کڑے امتحان کے وقت، اُس نازک گھڑی میں، اُس بے پناہ مصیبت کے موقع پر، ہم سب کا پردہ ڈھنکا ہوا رکھے، اور ہم میں سے کسی کو رسوا نہ کرے۔ آمین، یا مجیب السائلین، بحق لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

---

مارچ نمبر میں طفیل احمد صاحب، مولف رسالۂ جواز سود کی سعی تردیج "ربح" کی بابت جو کچھ عرض کیا گیا تھا، افسوس ہے کہ وہ انھیں ذرا بھی قبول خاطر نہیں ہوا، اور انھوں نے ناگواری کے ساتھ

اس کا جواب لکھ کر ارسال فرمایا ہے، جو اسی پرچے میں، راقم سطور کے توضیحی و تعلیقات کے اضافہ کے ساتھ درج ہے گا۔ ہر بحث جب چھڑ جاتی ہے، تو عموماً فریقین ضمنی بلکہ غیر متعلق مسائل پر اظہار خیال کرنے لگتے ہیں، اور اس طرح سلسلۂ بحث بجائے سمٹنے کے ہمیشہ پھیلتا ہی جاتا ہے۔ اگر اس سے احتیاط برتی جائے، تو ہر بحث کا نتیجہ چند الفاظ میں ہو سکتا ہے۔

---

مجھے جو کچھ اس عنوان پر کہنا ہے، اس کا ماحصل دفعات ذیل میں آ سکتا ہے:-

(۱) سود (ربو) اسلام میں ایک شدید ترین معصیت ہے، جس پر متعدد نصوص قرآنی و احادیث صحیحہ دال ہیں۔

(۲) جو شے نہایت درجہ قابل نفرت ہوتی ہے، انسان نہ صرف اس سے، بلکہ ان چیزوں سے بھی بچتا ہے، جو اس سے ملتی جلتی ہوتی ہیں۔ دق چونکہ مہلک مرض ہے، اس لیے ان امراض سے بھی پوری احتیاط برتی جاتی ہے، جو دق کے مماثل ہوتے ہیں۔ ہر معمولی سمجھ کا انسان، زندگی کے ہر شعبے میں اسی قانون پر عامل رہتا ہے۔

(۳) سود کے متعلق، اس عام انسانی قاعدے کے علاوہ، حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی کی تصریح موجود ہے کہ

فدعوا الربٰو والریبۃ۔ (ابن ماجہ۔ مشکوٰۃ) سود اور مشتبہات سود دونوں سے بچو۔

متعدد صحابۂ کرام کا عمل اسی کے مطابق منقول ہے۔ سرور دو عالمؐ کی ہدایت ہر مشتبہ موقع پر طریق احتیاط پر قائم رہنے کی ہے۔

(۴) طفیل احمد صاحب اسکے مدعی ہیں کہ ربح، ربو سے علیحدہ ایک مستقل شے ہے، اس لیے مسلمانوں کو بلا تامل اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ یہ دعویٰ اول تو ابتک وہ ثابت نہیں کر سکے ہیں، یعنی ربح و ربو کے امتیاز پر کوئی دلیل شرعی نہیں لا سکے ہیں۔ اور پھر اگر اس فرق کو تسلیم بھی فرما لیا جائے، تو ایسے مشتبہ موقع پر عقل و نقل دونوں کا کیا فتویٰ ہوگا؟ ظاہر ہے کہ اسکے ترک کا، نہ اسکے بجا لانے کا۔

(۵) احادیث کے مطالعہ سے ذہن اسی جانب جھکتا ہے، کہ ربح بھی ربو ہی کی ایک صورت کا نام ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں صاف ارشاد ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں ربو عالمگیر ہو کر سارے

| | |
|---|---|
| عن ابی ہریرۃ عن رسول اللہ صلعم قال لیاتین علی الناس زمان لا یبقی احد الا آکل الربو فان لم یاکلہ اصابہ من بخارہ او غبارہ | جہان پر چھا جائے گا، یہاں تک کہ جو شخص براہ راست سود نہیں لیتا، وہ بھی اس کے غبار سے محفوظ نہ رہے گا۔ |

(ابن ماجہ - ابوداؤد - مشکوۃ)

ظاہر ہے کہ ربو تو ابھی اس قدر عام نہیں، البتہ وہ تجارتی سود، جس کے جواز پر صاحب جواز سود اس قدر مصر ہیں، سارے جہان متمدن پر پوری طرح مسلط ہو چکا ہے، یہاں تک کہ اسکے اثرات سے بڑے بڑے متقیوں کی آمدنی بھی بمشکل ہی محفوظ نکلے گی۔

(۶) غرض ایسی حالت میں، ربح، اگر ربو کے حکم میں ہے (جیسا کہ اغلب ہے)، تو اس کی معصیت شدید کھلی ہوئی ہے۔ اگر نہیں ہے (جیسا کہ ایک ضعیف احتمال ہو سکتا ہے) تو بھی از روے عقل و نقل احتیاط و ترک اولیٰ ہے۔

(۷) تمدنی حیثیت سے، سرمایہ داری کا دار و مدار اسی تجارتی سود پر ہے، اور چونکہ سرمایہ داری ہی دور حاضرہ کے اکثر مفاسد کا سرچشمہ ہے، اسلیے تجارتی سود کا انسداد کرنا، ایک فتنۂ عظیم کا سد باب کرنا، اور دنیا کو ایک بہت بڑی لعنت سے نجات دلانا ہے۔

(۸) بالفرض، ربح بالکل جائز بھی ثابت ہو جائے، تو بھی اس کی حیثیت مباح سے زائد نہیں ہو سکتی۔ حیرت ہے، کہ ہزارہا فرائض، واجبات، وسنن کے ہوتے ہوے ایک ایسے امر کے پیچھے، اپنی قوت، اور اپنے وقت کا بیشتر حصہ صرف کیا جائے، جس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ایک فعل مباح کی ہو سکتی ہے۔ اسلام کے جو کھلے ہوے فرائض ہیں، نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ۔ انکی پابندی نجات اخروی ہی نہیں، فلاح دنیوی کی بھی ضامن ہے۔ انھیں چھوڑ کر ایک ایسی شے کی ترویج پر سارا زور صرف کر دینا، جو بعض کے نزدیک حرام قطعی، بعض کے نزدیک مشتبہ، اور خود مجوز صاحب کے نزدیک محض مباح ہے، خدا معلوم کس آئین دانش کے مطابق ہے۔

---

طفیل احمد صاحب بصد تاسف و تحسر دیکھ رہے ہیں، کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے تجارت نکلی جا رہی ہے، صنعت و حرفت جا چکی ہے، ملازمت کے دروازے بند ہوتے جاتے ہیں، غرض مالی

و معاشی حالت روز بروز ابتر ہوتی جا رہی ہے۔ اور اغیار انکی جائدادوں پر بیدھڑک قابض ہوتے جاتے ہیں۔ آج سے ہزاروں سال پیشتر متمول و باثروت منکرین نے (جن کے تمول وثروت کا راز غالبًا انکی سود خواری ہی ہوگا) غریب و بے ساز و سامان ایمان والوں کے مقابلے میں فخر و پندار کے ساتھ کہا تھا کہ

اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ خَیْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِیًّا

(مریم - ع ۵)

بھلا، دیکھو تو، ہم دونوں فریقوں میں لطف معاشرت و رونق محفل کے لحاظ سے کس کی حالت بہتر ہے؟

ظاہر ہے کہ آج جو برقی لمپ، برقی پنکھے، برقی قمقمے، ٹیلیفون، فرنیچر، مخملی گدّے "صاحب" کے بنگلے میں نظر آتے ہیں، غریب و فاقہ کش، بوریہ نشین و خاکسار نمازیوں کو خواب میں بھی نصیب نہیں تاہم بندوں کے فخریہ کا جواب اُس زبان سے ملتا ہے، جسکے اختیار میں "صاحب" کی بھی موت و حیات ہے۔ اور وہ جواب یہ ہے، کہ ان شامت زدوں کی تو کیا حقیقت ہے، انکے اگلے جو ساز و

وَکم اہلکنا قبلہم من قرن ہم احسن اثاثا و رئیا۔ قل من کان فی الضلالۃ فلیمدد لہ الرحمن مدًّا، حتیٰ اذا راوا ما یوعدون، اما العذاب و اما الساعۃ، فسیعلمون من ہو شر مکانًا و اضعف جندًا۔

(مریم - ع ۵)

سامان، قوت و مرتبت میں، ان سے کہیں بڑھے چڑھے ہوئے تھے، ان میں سے کتنوں کو ہم نے ہلاک کر مارا۔ تو اے پیمبر، انھیں خبر دیدو کہ جو کوئی حیات مادّی کے پھیر میں پڑکر گمراہ ہوجاتا ہے خداوند رحمٰن اُسے ڈھیل پر ڈھیل دیتا چلا جاتا ہے، یہانتک کہ عذاب الٰہی یا یوم قیامت اُسے آدبائیگا۔ اور اُسوقت اُن لوگوں سے سوال ہوگا کہ بدتر حالت کس کی اور کمزور پارٹی کس کی ہے؟

---

طفیل احمد صاحب "قوم کے لیے باعزت زندگی کی سبیل" ڈھونڈھنے نکلے ہیں۔ لیکن "باعزت زندگی" کا مفہوم انکے خیال میں وہی ہے، جو انکے مغربی اُستادوں نے اُنھیں بتا رکھا ہے۔ ورنہ ایک مسلمان کے نزدیک، بندے کی عزت کیسی؟ عزت و کبریائی تو صرف اُسی ایک ذات یکتا و بے ہمتا کو سزاوار ہے۔ عزت ساری کی ساری

مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِیْعًا۔ اِلَیْهِ

| | |
|---|---|
| تَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ | صرف اسی کی ہے - البتہ بندے بھی اگر اس منزل تک رسائی چاہتے ہیں، تو اُن کے لیے اعمال صالحہ کا راستہ مقرر کیا گیا ہے۔ |
| (فاطر - ع ۲) | |

اسلام نے "باعزت زندگی" کا جو معیار قائم کیا ہے، اُسکے لیے کواپریٹو سوسائیٹیوں (انجمن ہائے امدادی)، تجارتی کمپنیوں، مشترکہ دوکانوں، کارخانہ سازیوں، اعلیٰ شاہروں میں سے کسی ایک شے کی بھی ضرورت نہیں۔ اسکے لیے صرف اس قدر کافی ہے، کہ انسان زبان وقلب دونوں سے توحید کا قائل ہو، ہر قسم کے خود ساختہ معبودوں کا منکر ہو، اُس کے رسول برحق کو صرف کانفرنس کے اسٹیج پر نہیں بلکہ گھر کی تنہائیوں میں بھی برحق یقین کرے، قرآن کے متعلق اپنی تحریروں ہی میں نہیں، دل میں یہ عقیدہ رکھے، کہ وہ ماضی وحال واستقبال ہر ملک، ہر قوم ہر زمانہ کی ضروریات کے لیے بالکل کافی ہے۔ اور اپنے اعمال میں تقوے، طہارت، ایثار، بے نفسی، دیانت، و اتباع سنت کو تا بامکان اپنے اوپر حاوی کرلے۔

---

مولف رسالہ جواز سود کا دین وایمان تجارت ہے، وہ تجارت جس نے انگلستان کو امیر کبیر بنا دیا ہے، وہ تجارت جو ترقی تمدن کے متلازم ہے۔ وہ تجارت جس کا مظہر بڑی بڑی کوٹھیاں اور بڑے بڑے بینک ہیں۔ لیکن اسلام ایک دوسری تجارت کی جانب دعوت دے رہا ہے جس میں سیم و زر کے لین دین کے بجاے نماز وزکوٰۃ کے سکے کا چلن ہے۔

| | |
|---|---|
| إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تِجَارَةً لَّن تَبُورَ۔ | جو لوگ کلام الٰہی کی تلاوت کرتے رہتے ہیں، اور نمازیں پابندی کے ساتھ پڑھتے اور راہ خدا میں خفیہ وعلانیہ صرف کرتے رہتے ہیں، وہی ایسی تجارت میں لگے ہوے ہیں جو اس قدر مضبوط ہے کہ نہ کبھی اُس میں خسارہ ہوگا اور نہ کبھی اسکے دیوالہ نکلنے کا اندیشہ ہے۔ |
| (فاطر - ۴) | |

اسلام اور خدائے اسلام، جس تجارت کی دعوت کو دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے، وہ راک فیلرو کارنیگی والی تجارت نہیں۔ وہ فورڈ اور راشچائلڈ والا لین دین اور بیوپار نہیں۔ یہ وہ تجارت ہے،

جس کے سب سے بڑے بیوپاری ابراہیم خلیل، اور اسمٰعیل ذبیح، موسیٰ کلیم اور صاحب خُلقِ عظیم ہوئے ہیں۔ یہ وہ سودا ہے جسے حمزہ نے جنگ احد میں، اور حسینؓ نے میدان کربلا میں اپنے خون کے قطروں سے خرید کیا تھا

یا ایہا الذین آمنوا ھل ادلکم علیٰ تجارۃٍ تنجیکم من عذابٍ الیم، تؤمنون باللہ ورسولہ وتجاھدون فی سبیل اللہ باموالکم وانفسکم، ذٰلکم خیرٌ لکم ان کنتم تعلمون۔

(الصف [illegible])

اے ایمان والو! کیا تمہیں اس تجارت کی راہ بتا دوں جو عذاب الیم سے نجات دلانے والی ہے؟ اور یہ تجارت اُن دونوں کی ہمیں جو کہ سوداگر کھولتے ہیں نہ تردیج سود کی تجھیں قائم کرنے کی مراد ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول پر دل سے ایمان لاؤ اور [illegible] کی راہ میں اپنی جان و مال کو قربان کر دو۔ یہی تجارت حق میں بہتر ہے اگر تم واقعی علم و عقل رکھتے ہو۔ [illegible] تمہارے حق میں فوزِ عظیم ہے۔

# اشکِ ندامت

نہ عامل ہوں شریعت پر نہ پابندِ طریقت ہوں
کہوں کس منہ سے اظہر مستحقِ شانِ رحمت ہوں

سمجھے اے [illegible] نمائش بت سمجھو
بڑا رتبہ ہے میرا خادمِ ختمِ رسالتؐ ہوں

بتوں کے آستانے پر مرا سر جھک نہیں سکتا
عنایت سے تری ہر سنگِ محرابِ عبادت ہوں

مرا جلوہ مری صورت ہر اک شے میں نمایاں ہو
حق کی نظر ڈالو تو میں کثرت میں وحدت ہوں

مری تر دامنی تحقیر کے قابل نہیں زاہد
کہ میں اپنے عمل کا آپ ہی اشکِ ندامت ہوں

ابوبکرؓ عمرؓ عثمانؓ علیؓ اور غوثؒ و اجمیریؒ
انہیں کے دردِ فرقت کی میں اک غمگیں حکایت ہوں

نہ ہو گر قطرہ دار و رسن میں فاش یہ کر دوں
حقیقت کیا ہے میری اور میں کس کی حقیقت ہوں

تو ہی ہے لایزال و لم یزل اے خالقِ اکبر
تجھی سے ہر گھڑی میں طالبِ اکرام و رحمت ہوں

مرا سر اٹھ نہیں سکتا ہے گو عصیاں سے اے اظہر
مگر لاتقنطوا پر میں طلبگارِ شفاعت ہوں

اظہر نعمانی ردولوی

# کُہرا - پالا - برف

(خاص الناظر کے لیے ترجمہ کیا گیا)

اک شور ہوا بزمِ فطرت میں بہار آئی     محسوس ہوئی سب کو جاڑے کی مسیحائی
چشمِ نرگس نے تسکین و ضیا پائی

افتادہ زمینوں کو کہرے نے کیا زندہ     بے رنگ تھے جو بوٹے سب ہو گئے تابندہ
لینے لگے تن تن کر انگڑائی پہ انگڑائی

کیا چیز ہے تو کہرا - کیا تیری حقیقت ہے     دامن میں ترے آخر کس ملک کی دولت ہے
قوت ہے اٹل تیری طاقت میں ہے یکتائی

سیال و عیار و دوراں جز ہے اڑانے میں     دم تیرا صبا بھرتی ہے زمانے میں
پتے ترے دیوانے کلیاں تری سودائی

پورب ہو کہ پچھم ہو، چھائی ہوئی طاقت ہے     ہے رات کا سناٹا اور تیری حکومت ہے
جمنے لگی خود فطرت ٹھنڈی جو ہوا کھائی

شب بھر ترے جادو نے دکھلائے عجب نقشے     پیکر تھے خیالی سب موہوم تھے سب خاکے
ٹھنڈک ہوئی روحوں میں آنکھوں نے ضیا پائی

دنیا کو جگایا جب سورج کی ... وٹ نے     تجھ کو بھی کیا ماندہ شب بھر کی تھکاوٹ نے
انگڑائیاں لیں تو نے سو رہنے کی ٹھہرائی

ہمارے نزدیک برفستانی فصل کی دو مخصوص نعمتیں ہیں - ایک کہرا، دوسرے پالا - ان کو ہم میں ہم آپ عموماً - ان تمام نہروں کو، مہر بہ لب، انگشت بدنداں، قفل بہ دہن پائیں گے - ابھی کچھ ہی دنوں پہلے، پت جھاڑ کے موسم میں، برہنہ ڈالیوں کی دکھ بھری چھاؤں میں بہتی ہوئی طفلانہ سادگی سے - غم خیز ترنم ریزیاں کر رہی تھیں - اور خزاں خوردہ سنہری زرد پتیوں کو، اپنی چھاتی سے لگائے ہوئے بے پایاں سمندر کی طرف رواں دواں تھیں، دن کے وقت سورج کی آڑی ترچھی

کرنیں ایک ہلکے سے دُھندلکے میں لپٹی ہوئی رہتی ہیں مگر شام کے جھٹ پٹے اور رات کے سناٹے میں خوش مزاج کہرا - زمین کے ابخرات کو دُور کر دیتا ہے اسوقت بے ساختہ اقرار کرنا ہی پڑتا ہے کہ

بیاض آسمانی بن گئی اک نور کی چادر — وہ نظارہ نظر آیا کہ آنکھیں ہوگئیں ششدر
کئی سورج کئی چاند اور کئی دُنیا کئی دریا
اور اُس کو نذکر کرتی ہے پیہم گوہر افشانی — ستاروں کی چمک ہے یا کوئی سرپوش نورانی
بنا ہے اس قطب سے اس قطب تک نور کا بقعہ

بیچاری چڑیاں جنھیں کھلے ہوے بیابانوں میں ہر قسم کی عمدہ غذائیں مفت ملجاتی تھیں اب حیران ہیں پریشانی سے طوطی آئینہ بن گئی ہیں - ہر شے منجمد ہو کر جامد ہو گئی ہے انکی ہڈی والی نکیلی چونچیں، جو رس بھری، چھیر بیری اور خوشوں کے بیچ پرندوں کا پانی سے ملا کرتی تھیں - اب بے بس ہیں، بیکار ہیں، پہلی دو چیزیں جم کر پتھر ہو گئی ہیں ... تے ہوں تو ایسے لوہے کے چنے چبانے جائیں - اور تیسری غذا آسمانی برف کی سفید گھونگھٹ میں چھپی ہوئی ہے - یہی وجہ ہے کہ پرند مخلوق، بھوک کے ہاتھوں تنگ ہو کر انسانوں کی بستی میں آگئے ہیں، جہاں انگیٹھیوں کی دہک اور گرم کمروں کی لپک - برف میں تپتا جاتی ہوئی آس پاس والی سطح زمین کو نرم و گداز بنائے رکھتی ہے - اور دن میں کئی بار دسترخوان کا چورہ چار دیواری کے کوڑھیوں پر پھینک دیا جاتا ہے - وحشی بطیں اپنی اُن نہروں کو چھوڑ چلی ہیں، جن کا رقیق پانی اب سیال نہیں رہ گیا جن میں اب وہ تیر نہیں سکتیں، اور ہوا میں ایک سیدھی لکیر بنائی ہوئی ... طرف ہر یوں ہیں اس انداز سے چلی جا رہی ہیں کہ دیکھنے والے، تصویر مسرت و مجسمہ حیرت بنجاتے ہیں -

پانی ان تمام اثرات کا ذمہ دار ہے جس کی بدولت نظام فطرت میں نت نئی اُلٹ پھیر ہوا کرتی ہے - جب اس میں ایک معینہ حد کی حرارت پہونچ جاتی ہے تو سیال موجیں، جسم منجمد کی شکل میں تبدیل ہو جایا کرتی ہیں - آسمانی برف پانی کی "بھاپ" ہے جو ایکایکی جم گئی ہو، اور برف مصنوعی، آب منجمد کا دوسرا نام ہے سیال سے منجمد ہو جانے میں، پانی شان استثنا رکھتا ہے - گو اصول اسکے خلاف ہے - پانی معینہ سردی پا کر پھیلتا ہے - یہاں تک کہ تبدیل ہو کر اولے یا ژالے کی شکل اختیار کر لے - عملی ثبوت = لوہے کی ایک ٹھنڈی چھڑ کسی دھات یا پتھر کے سوراخ میں ڈال

دیجیے - اب فولادی سلاخ گرم کرنے کے بعد، اس سوراخ سے باہر نہ آسکے گی - مگر پانی جدا گانہ حیثیت رکھتا ہے، اس تشریح سے پہلے بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سردی کیا چیز ہے اور گرمی کیا بلا ہے؟ گرمی ایک خاص صفت رکھنے والی طاقت ہے، جس کا اندازہ صرف اسکے اثرات سے ہوتا ہے، جو اجسام غیر میں پیدا ہو جائیں، سردی گرمی کی نفی ہے، عدم حرارت اس کا دوسرا نام ہے - اس کا اندازہ بھی اثراتِ متبائن و معکوس سے کیا جاتا ہے -

ہم لوگ معمولی حرارت پیما آلات میں، ایک سیال مادہ، سیماب بھر دیتے ہیں جس سے ہوئے ہوے پانی یا کسی خانے کی حرارت کا پتہ ٹھیک ٹھیک چل جاتا ہے - گرمی پانے سے پارہ پھیل جاتا ہے اور گرمی علیحدہ ہو جانے پر سکڑ جاتا ہے - سیال چیزوں میں جکڑنے کی ایک حد معین ہے - مگر بادِ بسیط آزاد مطلق ہے -

کلورائن (نمک والی ہوا) ہائڈروجن (وہ لطیف مادہ جس میں پانی کا ایک جزو لاینفک شامل رہتا ہے) کاربونک ایسڈ (وہ جزو جس کی مدد سے کوئلہ سرخ کرکے تیزاب نکالا جاتا ہے) گرمی پانے سے ایک جیسے متاثر ہو جاتے ہیں مگر روح شراب (شراب کا ست) پارے سے چھ گنا زیادہ اثر پذیر ہوتی ہے - اسی طرح سیسہ لوہے کی نسبت سے تین گنا زیادہ تاثیر قبول کرتا ہے - اس بارے میں بھی پانی کی شان مخصوص ہے -

ایک جلبی بلوری شربہ لیجیے - اور قریب قریب لبریز کر لیجیے - گلے پر ٹھیک اسی جگہ لکیر کھینچ دیجیے جہاں تک پانی بھرا ہوا ہو، اب کسی گہرے ظرف میں تھوڑا سا "جمانے والا مصالحہ" جم پہونچایئے - گلے تک برف و نمک سے توپ کر شربے کو ظرف کے اندر جما دیجیے - اگر شربے کا پانی ۴۰ ڈگری سے زیادہ کا ہوگا (جیسا عموماً ہر گھر میں تھوڑی دیر رکھنے کے بعد ہو جاتا ہے) تو آپ دیکھیے گا کہ پانی جکڑنے - سکڑنے لگا ہے - یہاں تک کہ اپنی اصلی حد حرارت ۴۰ ڈگری تک آجائے - اب پھر بتدریج پھیلے گا - یہاں تک کہ خود بھی جم کر ٹھوس مادہ کی شکل اختیار کر لے - اس کا گھٹنا بڑھنا اسی لکیر سے معلوم ہو جائے گا جو شربے کے گلے پر کھینچ دی گئی ہے - تکمیل مشاہدہ کے واسطے پانی میں ایک چھوٹا سا حرارت پیما لگا دیجیے - تاکہ خفیف سی خفیف تلون مزاجیاں بھی نکتہ سنج نگاہوں سے چھپ نہ سکیں - جمانے والا مصالحہ نہ مل سکے تو خود بنا لیجیے : آسمانی یا دکانی برف دو حصے

نمک ایک حصہ جسے کیمیا والے کھارا سوڈا کہتے ہیں۔ اگر خالص برف پیسنے والوں سے نہ ملے تو گھر پر بنا لیجیے: نوسادر ۵ حصے کھار (جی مٹی ۵ حصے (پوٹیش) گندھک کا مارا ہوا سوڈا آٹھ حصے۔ پانی ۱۶ حصے۔

اسی تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴۰ ڈگری والی حرارت اصلیہ میں پانی کثیف رہتا ہے بعینہ حد کی گرمی یا سردی پاکر بڑھے یا کم ہو - مگر دونوں حالتوں میں پھیلے گا -

اگر ہم ۴۰ ڈگری والے پانی سے ایک شیشہ بھر لیں، اور اسکو اس طرح سربمہر کر دیں کہ اندر والا سیال مادہ بال بھر باہر نہ آ سکے - اب اسے گرم کر دیں یا سرد تو یقیناً تڑاق سے پھٹ جائیگا۔ اس لیے کہ دونوں چیزیں پانی کی موجودہ جسامت کو پھیلا کر زیادہ کر دیں گی - نتیجۂ لطیف یہ نکلا کہ برف ہر اس پانی سے جس کی حرارت ۴۰ ڈگری سے کم ہو ہلکی ہوتی ہے -

اسی طرح کہرے کی تحت میں مادی اجسام کا پھیلاؤ نقاش فطرت کا ایک عجیب طلسمی انتظام ہے۔ اگر پانی بھی دوسری سیال چیزوں کی طرح سردی پاکر جکڑتا جاتا اور اس کی جسامت کثیف تر ہوتی جاتی تو ہماری یہی جھیلیں جو موسم سرما میں صرف سطحی طور پر وقتی اعتبار سے جمی رہتی ہیں کلیتاً منجمد ہوکر برف کے ٹھوس تودے بن جاتیں - جھیلوں کی گرمی جاڑے کی مرطوب ہوائیں اڑا لیتیں۔ جو انکی سطح پر ہر وقت چلتی رہتی ہیں - کثیف تر اجزائے آبی وزنی ہو کر نیچے اترتے جاتے گرم اجزاء ابھرتے آتے تاکہ اپنی باری سے کہرے والی ہواؤں کا نشانہ ناز، ہدف انداز بن سکیں - نتیجہ یہ ہوتا کہ یہی سلسلہ جاری رہتا، اور تمام و کمال پانی کی حرارت طبعیہ گھٹ کر ۳۲ ڈگری کے اندر آ جاتی - اور پوری جھیلیں برف کی سخت چٹانیں بن جاتیں - چاہے اسکی اندر والی ہزارہا ذی روح ہستیاں برباد ہو جاتیں مگر اس کی روک تھام، خود فطرت میں موجود ہے - اگرچہ پانی کی اصلی حرارت سردی پاکر ۴۰ سے کم ہو جاتی ہے مگر اب اس کے سیال اجزاء میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی وہ اجزاء جو زیادہ سردی پاتے ہیں سبک ہو کر سطح آب پر دوڑتے رہتے ہیں - اور وہ حصص آبی جو مقابلتاً زیادہ گرم ہیں ویسے ہی سیال و رقیق حالت میں قائم و باقی رہتے ہیں - پانی حرارت کا غریب سرمایہ دار ہے - لہذا حرارت اصلیہ اسکے اندرونی طبق سے کبھی کسی حالت میں مفقود نہیں ہوتی خواہ سطح آب منجمد ہو کر برف کی چادر ہی کیوں نہ بن جائے - برف ایک سرے سے سرمایہ دار ہی نہیں ہے - لہذا مرطوب ہوائیں جب تک نہ تھکیں اور اسکی سطح پر دوڑتی پھریں جھیل کے اندرونی طبق والے اجزاء

اسی طرح گرم و سیال رہے گی۔ گر شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔
ایک گلدان مہیا فرمایئے۔ دہانے کا قطر ۶ - یا ۷ - انچ کا ہو۔ نچلے حصے میں ریتی سے اتنا بڑا سوراخ بنایئے کہ اُس میں دو انچ قطر والا اور پانچ انچ لمبا نلکی دار پیمانہ آ جائے۔ پیندے میں ایک چکلا پایہ ضرور ہونا چاہیے تاکہ پیمانہ اسپر ٹک سکے۔ پیمانہ کو گلدان کے نچلے حصے میں اس طرح جما دیجیے کہ اُس کی اگر گلوب ظرف سے ½ انچ باہر دکھائی دے۔ ایک گز مضبوط نواڑ اس جگہ کس کر لپیٹ دیجیے جہاں گلدان اور پیمانے کے نچلے حصے میں تھوڑا سا فصل ہے۔ نواڑ پر پیرس کے پلستر کی آٹھ دس موٹی تہیں جما دیجیے۔ انتظار کیجیے کہ پلستر سوکھ کر مضبوطی سے جم جائے۔ گلدان کے اوپری درمیانی فاصلے میں مصنوعی یا آسمانی برف جمانے والے مسالحے کی لیپ کر بھر دیجیے۔ شرط یہ ہے کہ اس کا ایک قطرہ بھی پیمانے میں نہ گرے۔ اب معمولی حرارت کا پانی پیمانے میں اُنڈیلیے۔ مگر سطح آب سے ایک انچ باہر رہے۔ خیال رہے کہ ہم اس تجربے میں پانی کو سردی پہونچا رہے ہیں جس طرح فطرت سطح آب کو مرطوب ہواؤں سے ٹھنڈک پہونچاتی ہے۔ اب آپ دیکھیے گا کہ سطح آب جم جانے کے بعد بھی پانی کی طبعی حرارت ۴۰ یا ۵۰ ڈگری سے زیادہ اونچی رہتی ہے۔ ایک باکار حرارت پیما پانی میں ڈبو دیا جائے تو صاف پتہ چل جائے گا کہ کچھ سارا پانی گھٹ کر ۴۰ ڈگری پر آ گیا۔ اب اسکی روانیاں بند ہو گئیں یا غیر محسوس ہو گئیں۔ مگر نچلے اجزاء اپنی اصلی حرارت پر قائم رہے۔ جب اس میں پوری کثافت آ جاتی ہے تو سردی کی دوڑ دھوپ ختم ہو جاتی ہے مگر ہاں صرف ان اجزا میں سلسلۂ اثر باقی رہتا ہے جو خط محاذ مخالف میں واقع ہیں۔ مشاہدۂ معکوس یوں ہے کہ گلدان کا اوپری حصہ خالی کر لیجیے۔ اور اسی شان سے نچلے حصے میں بھر دیجیے۔ تو سارا پانی منجمد ہو کر برف کا ڈھیلا بن جائے گا۔ اس لیے کہ ۴۰ ڈگری سے کم والی حرارت میں جمے ہوئے کثیر اجزا ہلکے ہو کر اوپر آتے جائیں گے۔ دوسرے گرم جزو نیچے اُترتے جائیں گے۔ اور پھر اپنی باری سے سطح آب پر تیرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر میں سب کا سب پانی جم کر برف کی قاش ہو جائے گا۔

پانی میں پھیل جانے کا خاصہ اتنا زیادہ موجود ہے کہ جاڑوں میں اسکی وجہ سے اکثر و بیشتر نلکیاں اور فولادی برتن پھٹ جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۳ - انچ قطر کا اور ۱۰ انچ دبیز توپ جسکی

نال پانی سے لبریز تھی۔ جس کے اوپری دہانے اور نچلے سوراخ میں لوہے کی کیلیں جڑی ہوئی تھیں۔ مقام کناڈا میں، اثر سردی قبول کرتے کرتے، وہ تانبے کے ساتھ پھٹ گئی۔ وجہ یہ ہوئی کہ اندر والا پانی سردی پا کر جم جانے کے لیے اتنا پھیلا کہ محدود نال تاب نہ لا سکی۔

یہی خاصہ کسانوں کے لیے مایۂ ناز ہے۔ کھیتوں کی نرم مٹی، گلابی جاڑوں میں برسا ہوا پانی اتنا جمع کر لیتی ہے کہ ہر درز، ہر دراڑ لبریز ہو جاتا ہے۔ جو سال بھر برابر کام دیتا رہتا ہے۔ جب کُہرا پڑتا ہے تو یہی آبِ محفوظ خود پھیل کر ذرات کو منتشر کر دیتا ہے۔ سختی جاتی رہتی ہے اور مٹی کی سخت ڈلیاں نرم پھپھوندیاں بن جاتی ہیں۔ اسی طرح وہ پانی بھی جو نظر سے پوشیدہ کھوہ میں چھپا رہتا ہے یکایک سردی سے پھیل کر پہلے سے زیادہ طاقتور ہو جاتا ہے۔ اور بڑی بڑی پتھریلی چٹانوں کو لڑھکا کر گہری وادیوں میں ڈال دیتا ہے۔ اسی طلسمی اثر سے ہمارے گھروں کا مضبوط گارا اور دبیز قلعی بھی جاڑوں میں بہت جلد چٹک جایا کرتی ہے۔

برف میں حفاظت کا ایک عجیب خاصہ ودیعت ہے۔ جس کی بدولت اس کے اندر کی تمام چیزیں بربادی سے محفوظ رہتی ہیں۔ ۱۸۰۲ء میں ایک عظیم الجثہ جانور کی لاش، ملک سوئٹزرلینڈ میں ایک برف کی ڈھلی ہوئی پہاڑی سے آہستہ آہستہ اُبھرتی ہوئی دکھائی دی۔ اس زمانے کے "عالمِ حیوانات" اُس کا نام بھی نہیں جانتے۔ گوشت پوست بالکل اپنی اصلی حالت میں تھا جسے بھیڑیوں نے مزے سے چکھ لیا۔

جنوبی روس میں اسی فصل میں تازہ گوشت برف بھرے ہوئے برتنوں میں رکھ کر غیر ممالک کو تجارتاً تازہ طور پر بھیجا جاتا ہے۔ یوں ہی اسکاٹ لینڈ کی سلمن مچھلی کی تجارت بھی ہوتی ہے جو شمالی امریکہ کی مخصوص مچھلیوں کا نایاب تحفہ سمجھی جاتی ہے۔

آسمانی برف کی تہیں آسمان سے اسی موسم میں گرتی ہیں۔ آئیے ذرا سیر بین سنبھالیے اور دیکھیے تو اس کی اُجلی تہیں کتنی پیاری اور سہانی ہیں۔

برسیں جو آسماں سے اُجلی بھلی پھواریں — پہلے تو تھیں تہیں وہ اب بن گئی ہیں پرتیں
پیہم زمیں کے اوپر پرتیں برس رہی ہیں — دن ہو چکا ہے دھندلا آنکھیں ترس رہی ہیں
مٹی میں جان آئی۔ کھیتوں نے شاد ہو کر — اوڑھی ہے سرد اُونی خالص سفید چادر

آسمانی برف! پانی کی وہ بھاپ ہے جو یکایک جم گئی ہو - اگر یہ دیکھنا مدنظر ہے کہ برف کی یہ چادریں فطرت کی نازک کل میں کس طرح بنتی ہیں تو آیئے ایک خوشگوار سفر کر کے لیپ لینڈ چلے چلیں - وہاں کی یہ حالت ہے کہ جب کبھی کمرے کا دروازہ جس کے اندر لوگ بیٹھے ہوں یکایک کھل جاتا ہے تو اندرونی ہوائیں بھی مرطوب ابخرات کے تھپیڑے کھاتے ہی برف کی ہلکی نرم تہوں میں بدل جاتی ہیں -

آسمانی برف بھی حرارت کی غریب ترین سرمایہ والی ہے اسی لیے مصور فطرت نے اسکو نرم و نازک نباتات کی حفاظت کے لیے طلسمی محمودی چادر قرار دے دیا ہے -

گیہوں کے نازک پودے پھلنے ہوئے پودے - اسی چادر میں لپٹے لپٹائے اُگتے اور بڑھتے رہتے ہیں - ورنہ انکی معصوم لچیلی ڈنڈیاں نہرس کی بید و مرطوب کنیٹھیاں کھاتے ہی کٹ کر الگ ہو جائیں -

طالب - الہ آبادی

---

رعنائی پہ تیری جسے ایماں نہیں ہوتا
وہ منکر اعجاز مسلماں نہیں ہوتا

قرباں نہ ہوس جاں سے جو ہر آن پہ تیری
جو کچھ بھی کہو اسکو وہ انساں نہیں ہوتا

شعلہ بھڑک اٹھتا ہے کوئی آتش گل کا
تو صحن گلستان میں خراماں نہیں ہوتا

کرتا ہوں تصور میں شغل زلف سے تیری
جنگل میں مرے سیرا گریباں نہیں ہوتا

بربادیٔ پیہم سے مجھے ہو چکی تسکیں
جب تک کہ غبار رہ جاناں نہیں ہوتا

زنداں میں بھی رہ آئے بیاباں کو بھی دیکھا
شوریدہ سری کا کہیں درماں نہیں ہوتا

چلتا ہے دن رات گلے پر مرے خنجر
بے حکم خدا کچھ بھی مری جاں نہیں ہوتا

تا خیر ہے شاید ابھی کچھ موسم گل میں
گلرنگ لہو سے مرا داماں نہیں ہوتا

کیا دیر میں دیکھا ہے نہ اجانے تپش نے
کمبخت کسی طرح مسلماں نہیں ہوتا

عبداللہ خاں تپش
خورجوی

# روح نے بچا لیا

(بسلسلۂ الناظر ماہ فروری ۲۴ء)

اُنکی مرضی مجھے پانی میں بٹھانے کی نہ تھی ——— وہ ایسا سہولت سے کر سکتے تھے۔ کیونکہ میں اپنا سر اس کی سطح سے اونچا کیے اس میں بیٹھ سکتا تھا ——— اس وجہ سے کہ پتوں کی لئی جو ٹیٹو نے بنائی تھی اب تک میرے زخمی پاؤں پر لپٹی ہوئی تھی۔ اور اُس نے خیال کیا کہ اگر اسے ہٹایا گیا تو سوزش شروع ہو جائے گی۔ اس لیے میرے والد بیچارے کو میرا بھاری بوجھ اپنے بازوؤں پر سنبھالے کھڑا رہنا پڑا۔ اس عرصے میں ٹیٹو احتیاط سے اُنکے اوپر چڑھ کے اُنکے کندھوں پر کھڑا ہو لیا۔ اسکے بعد اُس نے یونہی ذرا اُچک کے شاخ پکڑ لی اور اوپر کو سکڑ کے وہ اُس پہ چڑھ گیا۔ پھر اُس نے رسی جو کمر کے گرد لپیٹ لی تھی کھول کے اُسکے ذریعہ مجھے اپنے پہلو میں کھینچ لیا اور سبتے تھوڑی دُور ایک دوشاخہ مل گیا جس میں وہ مجھے بحفاظت بٹھا سکتا تھا۔ پھر اُس نے واپس جا کے اُسی رسی کے ذریعے والد کو اوپر کھینچ لیا۔ ہم نے اپنے آپ کو ایسے ٹہنے پر پایا جو کئی درختوں کے تنوں کے برابر بڑا تھا۔ اور ہم اس کے اوپر سے بآسانی دیو ہیکل تنے کی طرف بہت سی چھوٹی چھوٹی شاخوں پر جو اس میں اُگی ہوئی تھیں اور پیچیدہ بیلدار درختوں پر جو ہمارے چاروں طرف لٹک رہے تھے اپنے آپ کو سہارا دیتے ہوئے جا سکتے تھے۔ چنانچہ ہم جلد اس تنے پر پہونچ گئے اور اس سے چمٹ کے رینگتے ہوئے دوسرے کنارے کی طرف ٹہنے پر جا پہونچے۔ پھر اُس سے ہٹ کے دوسرے درخت کے اتنے ہی بڑے ٹہنے پر جو اس پہلے درخت سے گتھا ہوا تھا پہونچ گئے۔ اس طرح ہم چشمے سے اب خاصے فاصلہ پر اور پہاڑی سے بہت کچھ بلندی پر پہونچ گئے تھے۔

اس تیسرے درخت پر کچھ دُور چڑھ کے ٹیٹو کو ایسی جگہ مل گئی جہاں دو ٹہنے تنے سے برابر برابر نکلے چلے گئے تھے اور ایک آرام دہ چبوترہ بن گیا تھا جس پر ہم سب کے بیٹھنے کے لائق کافی جگہ تھی جس پر میں لٹایا جا سکتا تھا گو اتنی نرمی و ملائمت سے تو نہیں جتنی پٹ دن کے درخت

کے تنے میں میسر آئی تھی لیکن تھوڑا بہت آرام یہاں بھی تھا۔ ہم عین وقت پر اس جگہ پہونچے تھے۔ ہم درخت پر اتنی اُونچائی پر تھے کہ ہم پہاڑی کے اوپر نظر ڈال سکتے تھے۔ فوراً ہی سپاہیوں کی ایک جماعت نظر آئی جن کے آگے آگے کھوجی کُتے تھے جو ایک ایک زنجیر میں بندھے ہوئے تھے۔ اور سرگرمی سے آگے کو کھینچے لئے جاتے تھے۔ وہ اس جگہ پہونچ گئے جہاں غریب میوٹ نے فضول اپنا خون بہایا تھا لیکن اس نے انھیں روکنے میں کچھ بھی اثر نہ دکھایا۔ وہ ایک لحظے تک سونگھتے رہے اور پھر تُندی سے بھونکنے لگے۔ میرے خیال میں اس خون کی بُو سے۔ لیکن انھوں نے فوراً کھوج پر چلنا شروع کر دیا۔ اور بولیتے ہوے پہاڑی کے اوپر سے ہوتے ہوے نیچے چشمے تک آ گئے۔ اس جگہ وہ ٹھہر گئے لیکن سپاہی پانی میں گھُس کے اُنھیں پار آنے پر آمادہ کرنے لگے۔ جب وہ دوسرے کنارے پر پہونچے تو رُک گئے اور بے پتہ اور کھوئے کھوئے معلوم ہونے لگے۔ سپاہیوں نے کہا "وہ اوپر یا نیچے کی طرف مُڑ گئے ہیں۔"

جماعت فوراً منقسم ہو گئی۔ ہر ایک گروہ نے اپنے ساتھ کُتا لیا۔ ایک دریا کے اوپر شمال کی جانب گیا اور دوسرا نیچے جنوب کی جانب۔ جو اوپر کی طرف چلے وہ فی الفور اُس درخت کے پاس سے گذرے جہاں سے ہم پانی میں سے اوپر چڑھے تھے۔ لیکن کُتے نے کوئی علامت ظاہر نہیں کی اور سپاہی نکلے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد وہ چشمے کے دوسرے کنارے پر واپس آئے۔ بظاہر اُن کو یہ خیال گذرنے لگا کہ ہم نے شاید اسے عبور ہی نہ کیا ہو۔ اسکے بعد وہ کھوج پر واپس آ کے اُن دوسروں کو پکارنے لگے جو نیچے کی طرف گئے تھے۔ اور پھر اُنکے پیچھے اُنھوں نے آدمی دوڑایا۔ فوراً ہی ہم نے اس ٹولی کو چشمے کے دوسرے کنارے پر واپس آتا دیکھا۔ پھر مشورہ کیا گیا۔ اور یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اُنکی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔

اسکے بعد ہی افسر مہم نے کچھ حکم دیا اور آدمی پراگندہ ہو گئے۔ بظاہر آس پاس جستجو کرنے کے لیے۔ لیکن مجھے وہ بہت آہستہ اور بیدلی سے جاتے معلوم ہوے۔ اُن میں سے بعض ہمارے درخت کے نیچے سے گذرے اور ہم نے پھر اُنھیں جادو کا ذکر کرتے اور یہ کہتے سُنا کہ ہمیں تلاش کرنا بےفائدہ ہے کیونکہ شیطان ہمیں بظاہر اُڑا لے گیا ہے۔ اس وجہ سے کہ ہم کافر تھے۔ یہ بات اُن لوگوں کی زبان سے مجھے پر لطف معلوم ہوئی جنھوں نے کم از کم اس وقت کے لیے

عیسائی مذہب کھلم کھلا خود ہی چھوڑ دیا تھا اور عملی طور سے اپنے آپ کو اس جھٹنے مارٹینز کی پرستش کرنے کا پابند کر لیا تھا۔ اُنھوں نے مارٹینز کی خفگی اور اسکے وحشت آمیز قسمیہ عہد و پیمان کا بھی ذکر کیا کہ جس طرح بنے ہمکو گرفتار کر لیا جائے۔ اُنھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ دہشت سے پاگل ہو گیا ہے۔ اور دراصل میرا بھی یہ خیال ہے کہ وہ پاگل ہو گیا ہوگا۔

یہ ناممکن بات معلوم ہوتی تھی کہ اُنکو یہ خیال ہی نہ آئے کہ ہم شاید کسی درخت میں چھپے ہوئے ہوں۔ لیکن صریحًا اُنھیں یہ خیال ہی نہیں آیا۔ میرا یقین یہ ہے کہ اگر اُن میں اتنی عقل ہوتی کہ اپنے ساتھ چند دیسی لے آتے تو ہمارا یہ معمولی سا عقدہ کھل گیا ہوتا۔ لیکن ہماری خوش قسمتی سے ان اتحادیوں میں رقابت و بدظنی کے جذبات خوب بھڑکے ہوئے تھے۔ اور اس وجہ سے مارٹینز صریحًا اس کام کے اپنے ہی آدمیوں سے سرانجام پائے جانے پر تُلا ہوا تھا۔ سارا دن تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سپاہی ادھر اُدھر گھومتے پھرتے رہے۔ یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے افسرون کے حکم سے مجبور ہوکے چل پھر رہے ہیں لیکن اُنکے دل کہہ رہے تھے کہ ہمارا یہ کام بے نتیجہ اور فضول ہے۔ اور صرف یہ کہنے کے لیے بیدلی سے اسکو کیے جا رہے تھے کہ ہم نے کچھ نہ کچھ کام کیا ہے۔ وقتًا فوقتًا ہمیں اُنکی گفتگو کہیں کہیں سے سنائی دے جاتی تھی لیکن اس کا مضمون وہی ایک تھا۔ یعنی مارٹینز کی خفگی کا خوف، یہ خیال آرائی کہ وہ اب کیا کرے گا؟ اور ما فوق العادۃ باتوں کے گمان اور تذکرے۔

دن آہستہ آہستہ گذر رہا تھا۔ اس دفعہ ٹیوٹے ایک لحظے کے لیے بھی اپنی جگہ سے ہلنے کی جرأت نہیں کی۔ کیونکہ پتوں کی ذرا سی حرکت سے ان کی توجہ کا اس طرف ہو جانا ممکن تھا۔ اس حالت میں کہ اتنے تلاش کرنے والے اس انعام لینے کے شوق میں گھوم رہے تھے جسکے متعلق ہمنے اُن کو کہتے سنا کہ مارٹینز نے اُس شخص کو دینے کا وعدہ کیا ہے جو ہمیں ڈھونڈھ نکالے۔ پہلے روز وہ دو جنگلی پھلوں کے ایک دو گچھے لے آیا تھا لیکن آج ہمیں کچھ بھی نصیب نہ ہوا۔ اور وہ اور میرے والد دونوں بھوک کے مارے بیتاب تھے کیونکہ آج تقریبًا تیسرا دن تھا کہ انکو کوئی قابل ذکر کھانے کی چیز ملی ہو۔ میرے لیے اپنی اس کمزوری کی حالت میں کچھ عرصہ بلا خوراک رہنا غالبًا اچھا تھا لیکن اب اسوقت کہ بخار سے مجھے کچھ آرام تھا مجھے بھی کچھ بھوک لگنی شروع ہو گئی تھی۔ مجھے پانی نہ ملنے کی ضرور تکلیف تھی۔ کیونکہ دن میں پھر خفیف بخار ہو گیا تھا۔ لیکن خاموش رہنے اور اپنے آپ کو ظاہر ہونے

سے بچانے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔

جب سورج اُفق کے قریب ہونے لگا تو افسر نے اپنی جماعت کو جمع کیا اور وہ کتوں سمیت پہاڑی کے نیچے اُترنے لگے۔ لیکن بددلی بخوبی سے ترشح ہو رہی تھی۔ کیونکہ وہ واپس جانا اور ناکام لوٹنے پر مارگمیٹر کی خفگی کا سامنا کرنا نہ چاہتے تھے۔ کسی چال کے امکان کے خوف سے ہم اپنے چھپنے کی جگہ سے نکلنے سے پہلے انکو دُور تک چلے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ اسوقت ٹیٹو جلدی سے نیچے اُترا تاکہ اس جگہ کا جائزہ لے اور اندھیرا چھا جانے سے قبل کھانے کی چیز تلاش کرے۔ خوش قسمتی سے اسے کچھ امرود اور جنگلی کیلے اور کچھ دیر بعد روٹی پھل (جنوبی جزائر میں ایک پھل ہوتا ہے جو بھوننے سے روٹی کا معمولی کام دیتا ہے) مل گئے۔ اور اُسی وقت اُس نے کھود کے ہمارے لیے گانٹھ دار جڑیں نکالیں جن کا ہلکا میٹھا ذائقہ تھا۔

میں ان میں سے بہت تھوڑا کھا سکا لیکن میرے والد اور ٹیٹو نے خوب مزے سے کھایا۔ اگرچہ یہ کھانا کچھ دلپسند نہ تھا لیکن پہلے روز کے قلیل کھانے سے کہیں بہتر تھا۔

میں احتیاط سے درخت سے نیچے اُتارا گیا۔ اور ہم نے پھر راہ فرار اختیار کی۔ جب پھر صبح ہوئی ہم پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے تھے۔ ٹیٹو پھر سب سے اونچے درخت پر جو وہاں نظر پڑا سپاہیوں کی نقل و حرکت دریافت کرنے کے خیال سے چڑھ گیا۔ اب اُسے پڑاؤ نظر نہ آتا تھا لیکن خوب کان لگا کے سننے سے وہ یہ اطمینان کر کے اُتر آیا کہ ہمیں فی الحال کسی طرح کا خدشہ نہیں ہے۔ خاصکر کتوں کا مطلق خوف نہیں ورنہ انکی آوازیں اس وقت صبح کی پُرسکون ہوا میں دُور سے سنائی دیتیں۔ ان حالات میں ٹیٹو نے کچھ دیر دن میں بھی ہمیں اپنی فرار جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اب بھی ہم درختوں کے سائے کے نیچے نیچے نشیب کی سمت میں بڑھے چلے جا رہے تھے۔ حتیٰ کہ تقریباً گیارہ بجے پانی کے ایک چھوٹے چشمے کے کنارے پر ہم نے ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ میرے والد اور میں لیٹ کے سو گئے اور ٹیٹو پہرہ دیتا رہا۔ جب اُسے کوئی بات اندیشہ ناک معلوم ہوئی تو وہ بھی اپنی باری سے جبکہ میرے والد ایک گھنٹہ بعد جاگ کے اُٹھ بیٹھے لیٹ کے سو گیا۔

اسوقت ٹیٹو نے ہمت کر کے پتوں کی پٹی ہولے ہولے دھو ڈالی اور میرے زخموں کو دیکھنے لگا

کیونکہ اب اُسے اسی قسم کے اور بچے مل سکتے تھے جن کو وہ دوبارہ لگا سکتا تھا۔ اُس نے بتایا کہ زخموں کی حالت اچھی ہے یعنی اتنے اچھے تھے جتنی توقع ہو سکتی تھی۔ اور پاؤں کو بھی آرام بتایا اگرچہ میں نے اسے والد سے یہ شبہہ ظاہر کرتے سن لیا۔ حالانکہ وہ اپنے خیال میں میری حدودِ سماعت سے دور تھا کہ شاید میں پھر پاؤں سے چل پھر نہ سکوں۔ اُس دن ہم پہلی مرتبہ اطمینان سے بات چیت کرنے کے قابل ہوئے اور مجھے اپنے والد کی روئداد سننے کا موقع ملا۔ ان کے بچ نکلنے کے ظاہرہ معجزہ کی توجیہ اصل میں نہایت آسان تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیسیوں نے اسکے ہاتھ گیلی کچی کھال کی رسی سے باندھنے کی غلطی کی تھی۔ اور رات کے وقت جنگل میں سواری کے لمبے سفر میں اُنھوں نے متواتر زور ڈال ڈال کے اُسکو حتی الامکان کھینچ تان لیا تھا حتی کہ وہ اس میں سے اپنا ہاتھ نکال سکتے تھے۔ لیکن اُنھوں نے عقلمندی سے اپنے گرفتار کنندوں کو اس سے مطلع نہ ہونے دیا۔ اور اُس پر معمولی دباؤ ڈالے رہنے سے اُن کا یہ خیال قائم رکھا کہ وہ مضبوطی سے کسے ہوئے ہیں۔

لیکن وہ اس تمام عرصے میں اپنا موقع تکتے رہے اور جب اُنھوں نے ہائینز کے خیمے کی ترتیب دیکھی اور جنگل کو اس کے پیچھے اس قدر قریب دیکھا اُنکو خیال گذرا کہ یہ موقع بچ نکلنے کا تھا جس سے ایک دلیر آدمی بجلی کی سی تیزی سے چلنے کا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ اُنھیں یہ نظر آتا تھا کہ اسوقت اُنھیں اپنے بچوں کو چھوڑنا پڑے گا۔ اس لیے اُنھوں نے اس معاملے میں قدم نہیں اُٹھایا حتی کہ یہ بالکل ظاہر ہو گیا کہ ہائینز اپنی ضد نہیں چھوڑ سکتا۔ اُنھوں نے کہا کہ مجھے مطلق یہ توقع نہ تھی کہ مجھے ایک منٹ کی بھی مہلت مل جائے گی۔ قبل اسکے کہ میرا تعاقب کیا جائے اور مجھے یہ کُل معاملہ پُریاس و حرمان اور جان پر کھیلنے کا معلوم دیا۔ لیکن اور کچھ کرنے دھرنے کی کوئی صورت بھی نہ تھی۔ اور چونکہ یہی ایک صورت تھی اس لیے میں نے اسی کو اختیار کیا۔

جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں یہ تمام واقعہ کچھ ایسا خلاف توقع تھا اور اسپر کچھ ایسی بدحواسی اور ابتری پھیلی کہ اُنھیں واقعی پانچ منٹ کی مہلت مل گئی اور اُنھوں نے اس غنیمت کو رائیگاں نہ کیا۔ اُنھیں معلوم تھا کہ دوڑ کے اُن آدمیوں کو جن کے پاس گھوڑے تھے تھکا دینے کا ارادہ ایک خیال خام تھا۔ اس لیے شروع ہی سے اُنھوں نے دوڑتے ہوئے چھپنے کی جگہ تلاش کی۔

تعاقب اکثر اسکے قریب تر پہونچ پہونچ گیا اور کچھ مرتبہ اُن کا پتہ قریب قریب چل گیا تھا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح اپنا پیچھا کرنے والوں کی آنکھوں میں خاک ڈال کر بچ نکلے۔ اور کچھ دیر بعد درخت پر چڑھنے کا خیال اُنھیں اس طرح آیا کہ انکے ایک جگہ سے دوسری جگہ چلنے سے چند بندر چونک کے فوراً درخت پر چڑھ چڑھ کے آن واحد میں بالکل غائب ہو جاتے تھے۔ حالانکہ وہ ان سے صرف چند ہی گز کے فاصلے پر ہوتے تھے۔

انھوں نے خیال کیا کہ اگر یہ ایسا کرسکتے ہیں تو یقیناً آدمی بھی اسی طرح کرسکتا ہے۔ چنانچہ متجسس سپاہیوں کے دوبارہ آنے سے پہلے ایک بڑے درخت میں اُنھیں نشیمن مل گیا۔ جب سپاہی دوسری مرتبہ گذرے چلے گئے اور انکو خیال گذرا کہ وہ اسوقت تو محفوظ ہیں انھیں ایک حبشی نظر آنے سے بڑا وہم ہوا جو جنگل میں دبے پاؤں صریحاً کسی چیز کی تلاش میں پھر رہا تھا۔ اُنھیں بڑا دڑھکا ان ہی کی تلاش میں تہ ہو۔

دراصل یہی معاملہ تھا کیونکہ یہ وفادار ٹمٹو تھا جسے جھونپڑی پر حملہ کی خبر مل گئی تھی لیکن محاصرہ کرنے والے دیسیوں کے گھیرے نے اسے اس تک پہونچنے سے روکے رکھا۔ وہ نواح میں اس امید سے چھپا کھڑا رہا کہ شاید کوئی پہلو اپنے آقا کو مدد دینے کا نکل آئے۔ اُس نے اُسے گرفتار ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اور ساری رات اس گروہ کے نقش قدم پر دوڑا چلا آیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو جنگل کے کنارے میں پوشیدہ کرلیا۔ اس نے اپنے آقا کو بچ نکلتے اور جیرلڈ کو مرتے دیکھ لیا تھا۔ اور جو کچھ مجھ پر بیتی کچھ تماشا اس کا بھی وہ دیکھ چکا تھا۔ وہ اس حالت میں کہ سپاہی ابھی جنگل ہی میں تھے اپنے آقا کے پاس پہونچنے میں خطرہ محسوس کرتا تھا۔ کیونکہ انھوں نے ایک قسم کی وسطی جائے اجتماع اُس درخت سے بالکل قریب جو والد نے اپنے چھپنے کے لیے منتخب کیا تھا معین کرلی تھی جہاں انکی مختلف ٹولیاں آ آ کے جستجو کے نتیجے سے مطلع کرتی تھیں۔

سپاہیوں کے بالآخر ہٹ جانے کے بعد وہ اُترا اور جنگل کے اس حصے میں اپنے آقا کی تلاش میں ادھر اُدھر پھرنے لگا اور اگرچہ اُن کا اسے مطلق پتہ نہ چلا وہ خود انھیں نظر آگیا۔ اور جیسے ہی میرے والد کو اسکی صورت کا بخوبی اطمینان ہوگیا اُنھوں نے اسے پکارا۔ اسکے ملنے کی خوشی جیرلڈ کی دردناک موت کی خبر نے جو ٹمٹو نے اُنھیں پہونچائی مکدر کردی۔ پھر انھوں نے مشورہ

کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے ۔ اور فیصلہ کیا کہ اگرچہ اس بات سے دل پاش پاش ہوا جاتا تھا کہ وہ دن کے وقت کچھ بھی نہیں کرسکتے لیکن اگر میں شام تک زندہ رہ گیا تو اُنھیں رات کو بچا لینے کی اُمید کی جھلک نظر آئی جیسا کہ حقیقت میں اُنھوں نے کیا بھی ۔

میں نے بھی اپنے بھائی کی روح کا واقعہ سنایا اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ ٹیٹو کو اس کا بالکل یقین آ گیا ۔ کیونکہ اُس نے کہا " بچہ جیرلڈ دنیا میں ایک فرشتہ تھا اور اب بھی یقیناً وہ فرشتہ ہی ہے ۔ اور خدائے برتر اپنے فرشتوں کو مصیبت زدوں کی امداد کے لیے بھیجتا رہتا ہے "

میرے والد کو اس قسم کا کوئی عقیدہ نہ تھا ۔ اُن کا دل صرف اسی قدر قبول کر سکا: "بیٹے! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کہوں ۔ لوگ یہ ضرور کہتے ہیں کہ خدا اپنے نیک اغراض کے لیے بعض اوقات مُردوں کو دُنیا میں آنے کی اجازت دیتا ہے ۔ چنانچہ سیموئیل اور عین[1] دور جادوگرنی کی حکایت موجود بھی ہے ۔ اور ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ بعض اولیا دوبارہ زندہ نمودار ہوئے ہیں ۔ کچھ بھی ہو ۔ خواہ جیرلڈ وہاں آیا ہو یا نہ آیا ہو ۔ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ خدا ہی نے تمھاری تسلی کے لیے یہ خوابِ بیداری تمھیں دکھایا کیونکہ یہ عین وقت پر تمھیں نظر آیا اور اس سے تم میں جب تک ہم تمھیں بچانے کے لیے پہونچیں برداشت کی قوت آ گئی ۔

اپنے فرار کا باقی ماجرا بالتفصیل مجھے سنانے کی ضرورت نہیں ۔ اسوقت کے بعد سے ہم دن میں سفر کرتے اور رات کو آرام کرتے ۔ میرے والد اور ٹیٹو باری باری پہرہ دیتے ۔ رفتہ رفتہ اپنے اس پہاڑ کے دوسری طرف اس کی تلہٹی کے گرد ہوتے ہوئے ہم نیچے آ گئے تھے ۔ اسوقت ہم نہایت حزم و احتیاط سے قدم اُٹھاتے تھے ۔ مبادا ہماری مارٹنیز اور اُسکے لشکر سے مڈبھیڑ ہو جائے لیکن خوش قسمتی سے ہم کو اُن میں سے کوئی نظر نہیں آیا ۔ ہم روزانہ خوراک کے طور پر کچھ نہ کچھ ڈھونڈھ نکالتے ۔ اگرچہ یہ میوہ اور جڑوں ہی پر مشتمل ہوتا تھا ۔

---

[1] جب فلسطینیوں اور اسرائیلیوں کی لڑائی ہوئی تو ساؤل فلسطینیوں کی جیت دیکھ کر گھبرا گیا ۔ اُس نے اپنے اُمرا سے کہا کہ کوئی عورت ایسی تلاش کرو جس کا یار دیو ہو ۔ درباریوں نے بتایا کہ عین دور میں ایسی عورت موجود ہے ۔ چنانچہ ساؤل اسکے پاس گیا ۔ اس عورت نے ساؤل کی حسب خواہش سموئیل کی روح کو بلایا جس نے ساؤل کو بتایا کہ خدا تجھسے ناراض ہے اور تو فلسطینیوں کے مقابلے میں پامال ہوگا ۔ چنانچہ بعد میں ایسا ہی ہوا ۔ محمد ظفر ۔

مجھے سب سے بڑا غم یہ تھا کہ اس تمام عرصہ میں میں دوسروں کے لیے بارگردن بنا ہوا تھا کیونکہ میں ایک قدم بھی چل نہ سکتا تھا۔ اسی وجہ سے ہماری رفتار اس قدر سست تھی۔ شاید یہ وجہ ہو کہ کم خوراک اور کھلے میدان کی زندگی میرے زخموں کے اندمال کی واقعی بہترین صورت بن گئی ہو۔ ٹیٹو بڑے مزے میں تھا لیکن میرے والد کو جنھیں انگلستان میں دق کی کسک ہو گئی تھی تبدیل آب ہوا و لباس کی جس کے وہ عادی تھے کس نے بڑا نقصان پہونچایا۔ کیونکہ اُنکے جسم پر گندے پرانے پونچو کے سوا جو اُنھیں دیا گیا تھا اور کچھ نہ تھا۔ گو یہ پونچو اب گندہ نہ رہا تھا کیونکہ ٹیٹو نے اسے ایک چشمے میں خوب دھو دیا تھا۔ ٹیٹو اس لحاظ سے کچھ بہتر تھا۔ کیونکہ اُسکے جسم پر قمیص اور لٹھے کا پاجامہ تھا جو وہ حملے کے وقت پہنے تھا۔ اور میں تو سراسر بری حالت میں تھا کیونکہ میرے جسم پر کچھ بھی نہ تھا!

میرا خیال ہے کہ گیارہویں دن کچھ اُٹھتی جگہ سے ہمیں ایک مکان کی چھت نظر پڑی۔ فوراً ہم اُسی طرف چل کھڑے ہوئے۔ پھر میں اور والد چھپ گئے اور ٹیٹو جانچتا جائزہ لینا آگے چلا۔ وہ گھر ایک دہقانی کا مکان نکلا۔ اور جیسے ہی وہ مالکِ مکان کے سامنے پہونچا اور اپنی رام کہانی سنائی اس نیکدل شخص نے بڑے تاسف کا اظہار کیا۔ اور وہ ٹیٹو کے ساتھ یہ دیکھنے کے لیے دوڑا ہوا چلا آیا کہ ہماری کیا مدد کی جا سکتی ہے؟

اس لمحے سے ہماری تکالیف کا زمانہ ختم ہو گیا۔ ہمارے قابل دوست اور اُسکی نہایت مہربان بیوی نے ہمارے ساتھ نہایت خاطر و مدارات کا برتاؤ کیا۔ یہ نیکدل بی بی میری حالت پر بڑی کڑھتی تھی۔ گو اب میں قدرے روبصحت تھا اور میں نے بستر پر جانے اور اپنے پاؤں کو نسبتاً کم دقیانوسی طریقے سے دُھلوانے اور بندھوانے پر اصرار کیا۔ جب میری سرگذشت مفصل طور سے انکے سامنے بیان کی گئی تو مارٹینیز کے وحشیانہ سلوک پر وہ بڑے زور و شور سے نفرین کرنے لگے۔ ہمارا میزبان جو بہت سے دیگر دیہاتی کوٹھی والوں کی طرح سال کا بڑا حصہ اپنی ملک پر گوشہ نشینی کی حالت میں بسر کرتا تھا۔ مارٹینیز کی اس نواح میں موجودگی سے بالکل بے خبر تھا۔ دو یا زیادہ مہینے میں وہ عموماً اپنا ملازم یا بیشتر دو یا تین ملازموں کی ٹولی نیچے بندرگاہی قصبے میں اگر اسکے خطوط ہوتے انکو لانے اور اُن چیزوں کے ذخیرے کے خریدنے کے لیے جو اسکی جائداد میں میسر نہ آتی تھیں بھیجا کرتا تھا۔

ہمیں یہ خیال کہنے کا کہاں ہوش تھا کہ ہمارے، فرار کے ایام میں کیا واقعات رونما ہو رہے ہوں گے۔ ہمیں تو یہ اندیشہ تھا کہ مارٹینیز نے بجڑی میں شہر جا لیا ہوگا۔ اس لیے ہمارے میزبان نے اپنے ملازموں کو جمع کیا اور جو خبر ہم لائے تھے اُنھیں سُنائی اور رضاکاروں کی ضرورت ظاہر کی جو ساحل پر جا کے صورتِ حالات معلوم کریں۔ اسکے بعض آدمیوں نے فوراً اپنی خدمات پیش کیں۔ جن میں سے اُس نے دو نوجوانوں کو منتخب کیا جسکی وجہ اُس نے یہ بتائی کہ یہ کہنا ناممکن ہے کہ انکی غیر حاضری میں اس کوٹھی پر کوئی حملہ نہ ہوگا۔ اور وہ جہاں تک ممکن تھا بڑے سے بڑا محافظ دستہ وہاں رکھنا چاہتا تھا۔ پھر یہ دونوں جوان نہایت حزم و احتیاط برتنے کی بہت سی ہدایات کے ساتھ روانہ کیے گئے۔ اور اُنھیں یہ بھی بتایا گیا کہ وہاں پہونچ کے وہ حسب عادت سیدھے شہر میں گھسے نہ چلے جائیں مبادا وہ باغیوں کے قبضے میں ہو۔

ہمارے میزبان نے ہمیں بتایا کہ اگر اُنھیں کوئی حادثہ پیش نہ آیا تو وہ ایک ہفتے میں بخوبی واپس آجائیں گے۔ اور اب ہمارے لیے سوا اسکے اور کوئی چارہ کار نہ رہا تھا کہ اپنا وقت اسکے ساتھ بسر کریں۔ اگرچہ اس نے یہ توقع ظاہر کی کہ اگر ہمیں نیک خبر ملی تو ہم اسکے مکان کو اپنے زیادہ قیام سے زینت بخشیں۔ ہم نے اُسکے مہماں نوازانہ ارادے کا دلی شکریہ ادا کیا۔ لیکن ہم نے اُسے بتایا کہ میری والدہ کے پاس حتی الامکان جلد ہم سب پہونچ جانا چاہتے ہیں تاکہ اُنھیں معلوم ہو جائے کہ کچھ بھی ہوا ہو وہ اپنے دونوں بیٹوں اور شوہر سے محروم نہیں ہوگئیں۔ دراصل میرے والد نے ایک خط اُنکے نام لکھ کے اُن دو قاصدوں کے حوالے کر دیا تھا۔ جس میں اپنی سرگذشت کا ایک معمولی خاکہ کھینچ دیا تھا۔ اور یہ کہ اب ہم صحیح سالم ہیں اور عمدہ ترین لوگوں میں ہیں۔ ہمارے میزبان نے بھی اُنکو اپنے ایک دوست کے نام چٹھی دی تھی۔ جو اُس شہر میں ایک معزز عہدہ دار تھا۔ جس میں اُسے مارٹینیز کی موجودگی کی خبر دی تھی اور اُسے مشورہ دیا تھا کہ اگر پانی سر سے نہیں گذر گیا تو شہر کی فوراً حفاظت کا سامان شروع کر دے۔

اس خوشگوار ہفتے میں ہماری حالت پہلے سے بہتر ہوگئی۔ میرے والد کی کھانسی جو اُنھیں تکلیف دے رہی تھی اب پہلے سے کچھ کم تھی۔ یہ کمبخت دراصل پورے طور سے ان سے نہیں گئی اور آخر چند سال بعد انگلستان میں دق بن کے اُنکی جان لے کے ٹلی۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ

اگر مارٹینیز ابیس سے ہمیں سابقہ نہ پڑا ہوتا اور اسکی حرکات سے میرے والد کو ان تکالیف کا سامنا نہ ہوتا تو وہ کئی برس زندہ رہتے۔ رہا میں۔ اُسوقت تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ میری نوجوانی رخصت ہوئی۔ میں چلنے پھرنے کی طرف مائل نہ تھا۔ میں صرف لیٹا ہی رہنا چاہتا تھا۔ میں بیشتر وقت بستر پر ہی صرف کرتا گو ہر روز کچھ دیر کے لیے وہ مجھے بڑی بیٹھک میں اُٹھا لیجاتے جہاں۔ مجھے ایک قسم کی تکیہ دار چوکی پر بٹھا دیا جاتا یا بعض اوقات مجھے باغ میں لیجاتے اور درختوں کے نیچے ایک لمبی جعفری کی کرسی میں لٹا دیتے۔

آخر کار جب قاصد واپس آکے یہ اطمینان بخش خبر لائے کہ شہر کو مارٹینیز اور اُس کی نقل و حرکت سے ذرا بھی واسطہ نہیں پڑا۔ میں حیران تھا کہ اس خبر سے خوش ہوں یا رنجیدہ۔ ہمارے میزبان کے سرکاری دوست نے اسکے پاس بیس سپاہیوں کا ایک دستہ اُسکی کوٹھی پر حملے کی صورت میں حفاظت کرنے کے لیے بھیجدیا۔ اور اسی سلسلے میں اس نے اس اطلاع پر دلی شکریہ ادا کیا اور مطلع کیا کہ شہر کی مدافعانہ طاقت بعجلت درست کر دی گئی ہے اور اندرون ملک میں مارٹینیز اور اُس کی تھوڑی سی سپاہ کا پتہ لگانے کی کوشش کے لیے مخبر روانہ کر دیے گئے ہیں۔

ہمارے میزبان اور میزبانہ نے جب تک حملہ ختم ہو اور مارٹینیز شکست کھائے ہمارے اُنکے ہی پاس ٹھہرے رہنے پر اصرار کیا۔ کیونکہ اُنھیں یقین تھا کہ اس کشمکش کا نتیجہ مارٹینیز کی شکست کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن میرے والد نے محسوس کیا کہ اُنکی بیوی کے پاس اُن کا موجود رہنا اُن کا فرض ہے اسلیے بہت سے دلی شکریوں کے ساتھ اُنھوں نے اُنکی یہ لطف آمیز درخواست نامنظور کر دی۔ ہمارے دوست نے میرے لیے ایک پالکی بنوائی اور تجویز کی کہ ہمارے ساتھ ساتھ ساحل تک وہی دونوں قاصد جائیں جو پہلے وہاں ہو آئے تھے۔ بعد ازاں اس نے ہمیں سپاہیوں کا نصف دستہ اپنے ہمراہ بطور محافظ رکھنے پر مجبور کیا۔ میرے والد کسی طرح یہ بات نہ مانتے تھے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اس حالت میں کہ ہمیں مارٹینیز کی حالت کا مطلق حال معلوم نہیں کوٹھی پر حملے کا اندیشہ تھا۔ اور ایک ایک آدمی اس کی حفاظت کے لیے درکار تھا۔ لیکن اُنھوں نے خوشی سے اُن دونوں جوان نوکروں کے پالکی اُٹھا لے چلنے کی تجویز کو قبول کر لیا اور ساحل پر صحیح سالم پہونچنے کی صورت میں انھیں معقول انعام دینے کا وعدہ کیا۔

ہمارے میزبان نے سپاہیوں کے متعلق اصرار کیا اور آخرکار یہ فیصلہ ٹھہرا کہ ہمارے ساتھ صرف اُن میں سے تین چلیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو خوشدل ہمراہی اور کارآمد رفیق ثابت کیا۔ جب نوکر پالکی لیکر چلتے چلتے تھک جاتے وہ خود اُسے اُٹھاکے چلتے اور انکو دم لینے کا موقع دیتے۔ اس طرح انکی وجہ سے آدھا وقت آرام لینے کی بجاے جو کیفیت بصورت دیگر ضرور پیش آتی برابر خاصی رفتار سے ہم چلتے رہے۔ ان میں سے ایک بڑا چابکدست آدمی تھا۔ اُس نے ایک تدبیر نکالی جس کی وجہ سے پالکی دو گھوڑوں کے بیچ میں لٹکتی چلتی۔ اس حالت میں جب ہم ہموار زمین کے لمبے قطعے میں آتے تو بہت آسانی اور تیزی سے ہم قدم بڑھائے چلتے۔ اس طرح ہم سفر کرتے رہے اور کوئی واقعہ ہمیں پیش نہیں آیا۔ اور آخرکار ہم کوٹھی سے روانہ ہونے کے چھٹے دن اپنے گھر پہونچ گئے۔

والدہ ہم سے ملیں۔ اُنھیں اپنے مرنے والے بچے کا واقعی بڑا غم ہوا لیکن اتنے دہشت انگیز واقعات کے بعد اپنے باقیماندہ بچے اور اپنے شوہر کا جو گو بالکل تندرست تو نہ تھا لیکن سلامت تو تھا خیر مقدم کرنے پر وہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہی تھیں۔ مارٹنیز کے پنجے سے بچ نکلنے کے چھ ہفتے بعد میں زمین پر پاؤں دھرنے کے قابل ہوا۔ اسپر بھی مدت تک مجھے بڑی احتیاط سے اور ایک وقت میں بہت تھوڑا چلنا پڑتا تھا۔

مارٹنیز اور اُس کی تدابیر کا کیا حشر ہوا ہمیں صاف صاف کچھ نہ معلوم ہوا۔ میری والدہ کا برابر یہ اعتقاد تھا کہ میرے بھائی کے پاجیانہ قتل سے ایک طرح کا خدائی قہر اُسپر مسلط ہوگیا ہے اس لیے وہ کوئی قطعی فیصلہ کرنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ میرے والد کا زیادہ ترمیلانِ خیال یہ تھا کہ ہمارے بچ نکلنے سے اُس کا دل ٹوٹ گیا۔ کیونکہ اُس کی رائے میں ہم ضرور اُسکی موجودگی کا حال ساحلی شہر تک پہونچا سکیں گے۔ اور اس طرح اُس کی تدبیر خاک میں ملادیں گے۔ بہت بعد مبہم سی افواہیں سُنیں کہ اُسکی جماعت میں بدظنی پھیل گئی ہے۔ اُسکی بیرحمی کے خلاف بغاوتیں ہونے لگی ہیں اور اُسکے آدمیوں میں عام طور سے یہ رائے پھیلی ہوئی ہے کہ اُسکی جرأت اور اقبالمندی اُس سے رخصت ہوگئی ہے۔ یہ سب کچھ سہی لیکن واقعہ یہ ہے کہ بندرگاہی شہر پر کوئی حملہ نہیں کیا گیا۔ اسکی بجاے مارٹنیز اپنے ساتھیوں سمیت اندرون ملک میں غائب ہوگیا اور تقریباً

تین مہینے تک اسکے متعلق کوئی تحقیق خبر نہ معلوم ہو سکی۔

پھر یہ خبر آئی کہ اُس نے ملک کے اندر ایک چھوٹے شہر پر حملہ کیا اور اُن تمام باشندوں کو جنھوں نے اسکی اطاعت کا حلف نہیں اُٹھایا تھا قتل کرکے اُسپر قبضہ کرلیا۔ اور اُسکی قلعہ بندی کردی۔ اس خبر کی تصدیق ہوتے ہی فوجی حلقوں میں ہرطرف چہل پہل نظر آنے لگی۔ جو رسالے موجود تھے اُنکو فراہم کرکے انھیں جنگی حلیہ میں کیا گیا اور شہر کی مجلس نے رضاکاروں کے لیے ایک اعلان شایع کیا۔ چونکہ سپاہیوں کی تعداد بہت کم تھی اس لیے وہ نہایت متفکر تھی کہ تارمینز کو کچلنے کے لایق کافی جمعیت فراہم ہونے میں ذرا بھی تذبذب نظر نہ آئے۔

میرے والد اپنی ریل کی تکمیل میں دیر ہو جانے سے بہت چیں بجبیں تھے لیکن انھوں نے مزدوروں کی کوئی جماعت مہیا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کہتے تھے کہ جب تک تارمینز اور اُسکے دیسی اتحادی قطعی طور پر کسی نہ کسی طرح نیست نہ لیے جائیں وہ کسی شخص کی زندگی وہاں جنگل میں خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتے۔ جیسے ہی رضاکاروں کا دستہ تیار ہونے کی بھنک اُنکے کان میں پڑی اُنھوں نے میری والدہ کی مرضی کے سخت خلاف فوراً اپنے آپ کو پیش کیا۔ انکی خدمات قبول کرلی گئیں۔ اور انھیں ایک رسالے کی جو تیار ہوگیا تھا میرے خیال میں بالخصوص انکے انگریز ہونے اور انکے بچے کی موت کے دردناک قصے کی وجہ سے کمان دیدی گئی۔ اس عہدے کو انھوں نے بڑے شوق سے قبول کیا کیونکہ رضاکار زیادہ تر شریف لوگ تھے جن میں سے بعض پہلے سے اُن کے واقف تھے۔ میں بھی اگرچہ پوری طرح تندرست نہ ہوا تھا اپنی خدمات پیش کرنے میں پیش پیش تھا اور گو میری والدہ میرے سپاہی بھرتی ہونے کی اجازت نہیں دیتی تھیں لیکن والد کے ساتھ ساتھ سوار چلنے کی اجازت دینے سے وہ انکار نہ کرسکیں۔

آخری باب میں میں آپ کو یہ بتاکے کہ اس کا کیا نتیجہ نکلا اور ہمیں اس اندرون ملک کی اس مہم میں کیا پیش آیا اپنے قصے کو ختم کرسکوں گا۔

## پانچواں باب

### انتقام

اب تک جو کچھ پیش آتا رہا میں اُسکے دوران میں ایک لحظے کے لیے بھی اپنے مقصد اپنے بھائی

کی موت کے انتقام میں مارٹنیز کو قتل کرنے کے مصمم ارادے کو نہ بھولا تھا۔ میں نے اس کے متعلق والد اور والدہ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ میں نے اسکو ایک قسم کی مذہبی رنگ دی ہوئی بات کی طرح اپنے دل کے مکنون خانوں میں رہنے دیا تھا۔ میں حیران تھا کہ اس کو سرانجام دینا میرے لیے کیسے ممکن ہوگا اور میرے لیے کب کوئی راستہ نکلے گا۔ لیکن اسکے متعلق کہ کوئی راستہ ضرور نکلے گا اور میں اس کام کو ضرور انجام دوں گا مجھے ذرا بھی شبہ نہیں ہوا۔ اور جب میں نے اس رضاکاروں کے رسالے کی ترتیب کا حال سُنا تو مجھے فوراً محسوس ہوا کہ میرے لیے یہ طریقہ ہے اور قدرت مجھے راستہ دکھا رہی ہے۔ یہ وجہ تھی کہ میں فوراً اس میں شامل ہونے پر آمادہ ہوگیا اور اپنے بھرتی ہونے کے متعلق والدہ کی نارضامندی نے مجھے ذرا بھی پریشان نہیں کیا۔ بلا شبہ میں نے اُنکی خواہش پوری کی کہ بھرتی نہ ہوا لیکن میں زبردست یقین سے جانتا تھا کہ یا اینہمہ کوئی نہ کوئی صورت ایسی نکل آئےگی کہ میں اس دستے کے ہمراہ چلا جاؤں گا۔ اور جب چلتے وقت میری والدہ نے مجھے گلے لگایا اور ہر طرح کے خطرے سے بچنے کی احتیاط برتنے کی قسم دلائی تو میں نے اُن سے سکون آمیز یقین کے ساتھ جس سے وہ بھی متاثر ہوئی ہونگی کہا "اماں! آپ ڈریں نہیں۔ میں آپ کے پاس صحیح و سالم واپس آؤں گا"۔

میرا خیال ہے کہ میں نے اپنے آپ کو خدائی انتقام کا ایک آلہ یقین کر لیا ہوگا۔ ان تمام دہشت انگیز موقعوں پر میری نقل و حرکت ایسی تھی جیسے کوئی شخص عالم خواب میں ہوتا ہے۔ اس وقت مجھ پر ایک خواب کی سی کیفیت طاری تھی جو اُس دس دن کی دوڑ دھوپ میں تھی جب کبھی میرے والد اور کبھی ٹیٹو مجھے اُٹھائے لیے چلے جاتے تھے۔ سُدھ کی خبر تھی نہ بُدھ کی، نہ کسی چیز کا کوئی فکر تھا۔ ہر بات برداشت کر رہا تھا کیونکہ میں اس تمام عرصے میں اپنے آنے والے وقت کا منتظر تھا۔ اُس لمحے کا مجھے انتظار تھا جب میرا انتقام عالم وجود میں آجائےگا۔ دل کی یہ کیفیت کچھ عجیب تھی۔ میں مانتا ہوں کہ سقیم حالت تھی۔ میں اپنی صفائی کر رہا ہوں۔ میں تو اپنے دل کی اسوقت کی کیفیت حتی الامکان من وعن بیان کرنا چاہتا ہوں۔

جب فوجیں باغیوں کی تلاش میں بادیہ پیمائی میں مصروف تھیں میں روزانہ اسی دلی کیفیت کے ساتھ اپنے ٹٹو پر اپنے والد کے برابر چڑھا چلا جاتا تھا۔ کوچ کے ان ایام کی تفصیلوں نے مجھ پر

مطلق اثر نہیں کیا۔ میرا ذہنی تصور صرف ایک صورت پر جو آرٹینیز کی تھی جما ہوا تھا اور روز افزوں غیر متبدل نفرت سے اُس کا خیال کرتا تھا۔ پھر بھی اتنی نفرت نہ تھی جتنا تقدیر کا پُرسکون تیقن —— یہ علم کہ میں قسمت کا لکھا پورا کروں گا اور وہ نوشتۂ تقدیر اس ظالم کو قتل کرنا تھا۔

آخرکار وہ دن آگیا جب ہمارے رہنماؤں نے ہمیں بتایا کہ ہم اُس شہر کے قریب ہوتے جا رہے ہیں جس پر آرٹینیز نے قبضہ کر لیا ہے اور ہمیں شام تک اسکے نظر آنے کی اُمید ہے۔ بہرحال آرٹینیز ہمارے لیے تیار رکھا تھا۔ وہ ہمارے مقابلے کے لیے باہر بھی نکل آیا تھا اور ہمارے لیے ایک گھات لگا رکھی تھی جس میں ہم فوراً پھنس گئے۔ کیونکہ اس نے ہمارے سلسلۂ راہ کے جنگل میں اپنی سپاہ رکھی تھی اور اُس نے ہم پر جبکہ ہمیں اس کی بہت ہی کم توقع تھی شدید ترین آتشباری شروع کر دی۔

یہ میہا نوی امریکی فوجیں آتشباری کی زد میں عمدہ سے عمدہ موقعوں پر بھی بہت مضبوط اور مستقل نہیں رہتیں۔ اُسوقت تو اور بھی پتلا حال ہوتا ہے جب آتشباری حادثۂ ناگہانی کے طور پر پیش آئے۔ ہماری فوج کا اگلا حصہ اسکی زد میں متزلزل ہو کے تتر بتر ہونے لگا۔ اسوقت رضاکار فوج کا فائدہ ظاہر ہوا۔ جسکے افراد جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں زیادہ تر ہسپانیشی شریف لوگ تھے۔ بندوقوں کی آواز سن کے اور اگلے حصے کی بوکھلاہٹ دیکھ کے میرے والد نے اپنے دستے کو للکارا۔ اور ایک لحظے میں ہم استقلال اور تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگے۔ باقی رضاکار رسالہ ہمارے ساتھ لگا چلا آیا۔ اس چھوٹے کھلے میدان میں جہاں ہمارے آدمیوں کی اگلی صفیں گولیوں کا نشانہ بن رہی تھیں یا جہاں سے وہ درہم برہم ہو کے بھاگ رہی تھیں گھُسے چلے جانے کے بجائے ہم فوراً دونوں پہلوؤں پر بکھر گئے۔ اور خود جنگل میں لپک کے آرٹینیز کے چھپے ہوئے سپاہیوں پر جا پڑے۔ جن کو اس طرح بغل میں پڑ جانے سے مُڑ کے اپنے آپ کو بچانا پڑا۔

رضاکاروں کے اس حملے نے باقاعدہ فوجیوں کے قدم بھی جما دیے۔ اور وہ بھی چند ہی لمحوں میں اس مقابلے میں شریک ہونے لگے۔ لیکن یہ کوئی باقاعدہ جنگ نہ تھی اور ہمیں صفیں مرتب اور یکجا کر کے لڑنے کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ یہ دست بدست مقابلوں کے سلسلوں پر مشتمل تھی جو درختوں کے بیچ میں جاری تھے۔ دوست اور دشمن اس بُری طرح گڈمڈ ہو رہے تھے کہ باہم تمیز کرنا عموماً آسان کام نہ تھا کیونکہ اگرچہ رضاکار خوش پوش اور صاف ستھرے نظر آتے تھے لیکن

اکثر سرکاری سپاہی تارٹینیز کے پھٹے حال اور غیر منظم بھاڑے کے ٹٹو سپاہیوں سے دیکھنے میں کچھ ایسے اچھے نہ تھے۔

باغی بہادری سے لڑے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ اپنی جانوں کے لیے اور نیز اُن تمام لوٹ مار اور خیالی انعاموں کے لیے جن کا تارٹینیز نے اُن سے وعدہ کیا تھا لڑ رہے تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ... بقیاس دولت اور قدرت کی جو اُنکی منتظر تھیں داستانوں پر کس حد تک یقین کرتے تھے شاید وہ اپنے کامل طور سے ایمان لے آئے تھے۔ کیونکہ اُن میں سے اکثر تو ایسے جاہل تھے کہ کسی بات پر یقین کرنے کی بھی تمیز نہ رکھتے تھے۔ لیکن ہر حال اُنھیں معلوم تھا کہ شہر پر قبضہ کرنے کے بعد جو قتل و غارت اُنھوں نے کی حکومت اسکی وجہ سے اب جو اُسکے ہاتھ آجائیں ذرا بھی رحم نہ کریگی۔ سرکاری ... سالار کو اپنی تعداد کے کثیر ہونے کی اُمید تھی۔ دیسیوں اور باغی رسالوں کو شمار کرتے ہوے کسی طرح یقین نہیں آتا کہ اُسے تعداد میں کوئی تفوق حاصل تھا۔ لیکن ایسی جنگ میں جو اس بیقاعدہ طریقے اور ... حالات میں جاری تھی کسی قسم کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔

جنگل میں کئی کھلے میدان تھے۔ اس بیقاعدہ کشمکش میں میں دو مرتبہ حملہ میں شامل ہوا جسنے ہر دفعہ میدان کو باغیوں سے خالی کر دیا۔ ایک ایسے شخص کے لیے جو لڑائی کا عادی نہ ہو یہ عجیب و غریب تجربہ تھا کہ وہ آدمیوں کے ایک ایسے دستے میں اپنے آپ کو شریک دیکھے جن کا صرف ایک ہی خیال ہو، جو اپنے آس پاس جس چہرے کو دیکھے اُسے مہیب عزم بالجزم سے تنا ہوا دیکھے جن کو سوائے اسکے اور سب ارادے بھولے ہوے ہوں کہ بس دشمن پر ٹوٹ پڑیں اور اُسے پامال کر دیں یا بھگا دیں اور پھر چونک کے حیرت میں ہو کہ کہیں اُسکے چہرے کا بھی تو یہی رنگ نہیں ہے۔ اس کے بعد للکار کی آواز آتی ہے اور جوش میں ترتیب سے حملہ ہوتا ہے اور پھر بندوقوں کی گڑگڑاہٹ یا یا فولاد کی جھنکار آتی ہے۔ دشمن و دوست برابر مُردوں پر سے پھاندتے چلے جاتے ہیں اور یہ بھی خیال نہیں آتا کہ وہ کون ہیں۔ اور صرف ایک خیال ہوتا ہے کہ بڑھے چلو، بڑھے چلو۔ اور پھر میدان جیت لیا جاتا ہے اور ہم ٹھہر کے ایک لحظہ کشتوں کے پشتوں کو دیکھتے ہیں۔ تمام سبزہ گھاس پامال اور خوف آلودہ نظر آتی ہے۔ پھر بھی خوف و گھبراہٹ کا وقت ہے نہ کسی اور بات کا لیکن اب بھی صرف ایک ہی خیال، وہ کہاں ہیں جن کو ہمیں مغلوب کرنا ہے؟ بڑھے چلو، بڑھے چلو۔

کم از کم میرا تو یہی حال تھا۔ اس لڑائی کے ابتدائی حصے میں میں اپنے والد کے پہلو میں رہا شروع میں ہی میرا ٹٹو گولی کھا کے میرے نیچے گر پڑا۔ لیکن میں کود کے الگ کھڑا رہا اور ایک بے سوار کے گھوڑے کی جیسے ہی وہ میرے پاس سے گزرا لگام میں نے پکڑ لی اور فوراً اچھل کے اسکی کمر پہ جا بیٹھا (وہ میرے لیے بہت اونچا تھا) اور پھر اس جدال و قتال کی طرف اسلو پھیر دیا۔ لیکن ایسا کرنے سے میں ایک لحظے کے لیے اپنے والد سے الگ ہوگیا اور فوراً اُن کے پہلو میں نہ پہونچ سکا۔ چنانچہ میں لڑائی میں گھس گیا اور ہر جگہ اُس آدمی کو تلاش کرنے لگا جسکو میں جانتا تھا کہ مجھے ضرور ملے گا۔ میں سمجھتا ہوں میں نے اپنا بہرہ فرض ادا کیا۔ مجھے معلوم ہے کہ جہاں کہیں مجھے کوئی باغی یا دیسی ملتا میں اُس پر گولی چلا دیتا اور میرا خیال ہے کہ میری کوئی ہی گولی خالی گئی ہوگی۔

لیکن تھوڑی ہی دیر میں میرا بڑا گھوڑا بھی ٹٹو کی طرح گر پڑا (میرے خیال میں جب میں اُسپر چڑھا وہ زخمی ہو رہا تھا) اور اس مرتبہ میں زمین پر دھم سے جا پڑا۔ اور مجھے حواس ٹھیک کرنے میں چند لحظے لگے۔ میری بندوق گرنے سے بگڑ گئی۔ اُس کا کوئی جوڑ مڑ گیا۔ چنانچہ جب میں نے اُسے چلانا چاہا تو نہ چل سکی۔ میں نے اُسے پرے پھینک دیا۔ اور اسکی بجائے قریب ترین پڑے ہوے ہتھیار کو اُٹھا لیا۔ یہ ایک لمبی برہنہ تلوار تھی جو میرے سامنے زمین پر پڑی تھی۔ میرا خیال ہے کسی افسر کے ہاتھ سے گر پڑی تھی جو گر کے مرگیا تھا یا محض زخمی ہو کے جنگل میں رینگ کے چلا گیا تھا۔ میں نے اسکے متعلق سوچنے کے لیے ذرا توقف نہیں کیا۔ میں نے اس بڑی تلوار کو اُٹھا لیا۔ جو میرے جُثّے کے مقابلے میں چلانے میں بہت بھاری تھی۔ اور میں پیدل اُس شخص کو ڈھونڈتا ہوا جسے میں جانتا تھا کہ مجھے ضرور ملے گا پھر چل کھڑا ہوا۔

اب اس وقت لڑائی کا نتیجہ روز روشن کی طرح نظر آنے لگا تھا۔ ہر جگہ سرکاری فوجیں باغیوں کو برابر پیچھے ڈھکیل رہی تھیں۔ جن میں سے بہت سے روبفرار تھے۔ اس کا بعد میں تذکرہ ہوا اور میں اس پر پورا یقین کرتا ہوں کہ یہ کامیابی بڑی حد تک میرے والد کی شعلہ صفت دلیری کا نتیجہ تھی۔ رضاکاروں کے دستے کی کمان والا کرنیل لڑائی کے شروع میں بُری طرح زخمی ہو کے گر پڑا۔ میرے والد نے فوراً کمان خود لے لی اور پلٹن کو فتح و نصرت کی منزل پر بڑھاتے لیے چلے گئے۔ اس دستے میں انکی طرح اور بھی ایسے ہی معمولی درجے کے لوگ تھے لیکن کسی نے انکی کمان لینے پر

ایک لحظے کے لیے بھی قیل و قال نہیں کی ۔ ان مقامات میں انگریزوں کی بہادری اور جنگی قابلیتوں کی بڑی منزلت کی جاتی ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ انکے لیے ایک انگریز کا اقتدا کرنا مقتضا ئے فطرت تھا ۔ کچھ بھی ہو اُنھوں نے انکی پیروی کی اور گو میرے والد ایک مدنی آدمی تھے اور انکو فوجی معاملات کا کوئی تجربہ بھی نہ تھا لیکن انھوں نے غیر متزلزل جرأت و تہور سے سپہ سالاری کی اور وہ اُنھیں فتح و نصرت تک اُنکی رہنمائی کرتے لے گئے ۔ اگر انھیں جنگی چالوں کا علم نہ تھا اور واقعی اُنکو ہوگا بھی نہیں تو مضائقہ نہیں ۔ جنگل کی اس عجیب و غریب دست بدست لڑائی میں مقابلتہً اس کی کچھ چنداں ضرورت بھی نہ تھی ۔ اس جگہ ذاتی دلیری اور تہور کا کام تھا ۔ اور یہ دونوں اُن میں بدرجۂ اتم موجود تھیں ۔

میری توانائی میں ابھی بہت کچھ کسر تھی اور میں لڑائی میں چند گھنٹوں سے بھاگ دوڑ کر رہا تھا ——— اور لڑائی دنیا کی سب سے زیادہ تھکا دینے والی چیز ہے تاہم مجھے تھکنے کا مطلق خیال نہ تھا اور نہ تھکن محسوس کرنے کی فرصت تھی ——— کیونکہ کوئی احساس کوئی خیال ایک لحظے کے لیے بھی میری توجہ اس تیقن سے متزلزل نہیں کرسکتا تھا کہ خدا میرے لیے کوئی انتقام کی صورت پیدا کردے گا ۔ میں دیر تک آرٹمنیز کو ہر جگہ ڈھونڈھتا رہا اور محض اسی باطنی تشفی کی وجہ سے میں نے ہمت نہیں ہاری ۔ لیکن مجھے کامل طور سے معلوم تھا کہ وہ مجھے ضرور ملے گا اور یہ تمام مہم جنگ محض پیش خیمہ ہے ۔ میں نے ایک لحظے کے لیے بھی تامل نہیں کیا نہ ایک لمحے کے لیے مجھے کچھ شک ہوا ۔ اور آخر کار وہ مجھے نظر آگیا ۔

وہ ایک بڑے درخت کے نیچے اُس سے اپنی کمر لگائے کھڑا تھا اور دو سرکاری سپاہی اسپر حملہ کر رہے تھے ۔ اس وقت تک یہ چھوٹی سی جماعت سب سے الگ معلوم ہوتی تھی ۔ شاید مجھے ہی وہ الگ نظر آتے تھے کیونکہ میں صرف ایک ہی صورت کو دیکھا کیا ۔ بایں ہمہ میرے خیال میں یہ صحیح ہے کہ اردگرد چند گز تک مُردے ہی مردے پڑے تھے ۔ دونوں سپاہی اُسپر دلیری سے ٹوٹے پڑتے تھے اور وہ اُسی تلوار سے مقابلہ کر رہا تھا ——— وہی تلوار میں نے نفرت و حقارت سے جس کا میرے جسم میں اُبال اُٹھ رہا تھا خیال کیا وہی تلوار جس نے میرے بھائی کو قتل کیا تھا ۔ لیکن وہ ابتدائی زمانے میں فوج میں بہترین شمشیر زن مشہور تھا ۔ بعض کہتے تھے

کہ جنوبی امریکہ بھر میں وہ بہترین شمشیر زن تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے حملہ آور سپاہیوں میں سے ایک اُس کے قدموں میں جا رہا اور اُس کے بعد فوراً ہی دوسرا۔ اور وہ اکیلا کھڑا رہ گیا۔ اُسکی آنکھوں سے لڑائی کی روشنی جھلک رہی تھی۔

اور پھر ——— اس نے جیسے ہی میں اُس کی طرف لپکا مجھے دیکھ لیا۔ اُس کا چہرہ متغیر ہو گیا اور اُس پر البیانہ نفرت کی جھلک چھا گئی۔ اور مجھے یقین ہے کہ اسکے ساتھ ہی خوف بھی جھلکنے لگا۔

وہ دونکا "ایں! کیا تو بھی یہاں ہے؟ تیری ہی وجہ سے میری شامت آئی۔ تیری۔ تیرے لعنتی باپ اور بھائی کی بدولت!"

میں نے جواب دیا۔ "ہاں، میں بھی آ گیا ہوں اور میں تجھ کو قتل کروں گا۔"

میں سیدھا اُس پر پل پڑا۔ میں اُسکو دُور سے گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا لیکن میں اسکو تلوار سے مارنا چاہتا تھا جس طرح اُس نے جیرلڈ کو مارا تھا۔ میں نے اسکی آنکھوں سے خوف بھانپ لیا تھا۔ مجھے اس کا قطعی یقین ہے۔ لیکن اب وہ یہ دیکھ کے کہ میں صرف ایک بھدی پُرانی تلوار سے مسلح ہوں اور وہ خود ایک زبردست تلوار لیئے ہے حقارت کی ہنسی سے میری طرف متوجہ ہوا۔ آنِ واحد میں ہم گتھ گئے۔ میں نے مدرسے میں کچھ پہلوانی سیکھی تھی لیکن اس نازک وقت پر اُسکے کچھ کارآمد ہونے میں سخت کلام تھا۔ میں عقل و طبیعت سے لڑ رہا تھا، علم و تجربے سے نہیں۔ باہمہ میں واقفیت سے بڑھ چڑھ کے لڑا ہوں گا کیونکہ جوں جوں ہماری تلواریں بار بار ٹکراتی تھیں وہ وہ میں اُس کی آنکھوں میں ایک تغیر دیکھتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ فاخرانہ خبث باطنی جاتی رہی ہے اور مبہم خوف مترشح ہونے لگا۔ کیونکہ شاید کسی عجیب غیر متوقع طریقے سے وہ فوراً مجھے مار کے گرا نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ اُس نے مجھے اپنی توقع کے خلاف قریب قریب اپنا مد مقابل پایا۔

میرے خیال میں وہ مجھ سے کچھ لمبا نہ تھا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں وہ ٹھنگنا آدمی تھا۔ لیکن اُسکی دسترس طویل تھی اور ہتھیار سے اس کی کامل واقفیت کا مقابلہ ہی کیا ہو سکتا تھا۔ میری ہمت پہلے کی طرح غیر مغلوب تھی لیکن میرا بازو شل ہوتا جا رہا تھا اور اُسکے بجلی کے سے تابڑ توڑ واروں اور چوٹوں کو رد کرنے کے لیے اس بھاری تلوار کے عین وقت پر اُٹھانے میں مجھے نہایت شدید زحمت اور مشقت اُٹھانی پڑتی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ رفتہ رفتہ بھروسے کے ساتھ میری تلوار کے قبضے پر

چوٹ لگا کے توڑ رہا تھا اور اگر واقعی قبضہ ٹوٹ گیا تو بس میرا خاتمہ تھا۔ آخر کار زبردست واروں کی بوچھاڑ کے بعد اُس نے میرے دل پر ایک بجلی کی سی اچانک ضرب لگائی۔ میں نے وار خالی دینا چاہا لیکن میرا تھکا ہوا بازو جتنی جلد اُس کو اُٹھنا چاہیے تھا اُس سے ایک ثانیہ کے خفیف ترین حصے کی دیر سے اُٹھا۔ میں نے تلوار کے پھل کو نیچے کی طرف جھٹک دیا لیکن کافی فاصلہ پیدا نہ کر سکا دل سے جسکو اُس نے نشانہ بنایا تھا ہٹ کے یہ ران کے گوشت دار حصے میں جا لگا۔ پہلوان کی طرح ضرب لگا کے پیچھے لی طرف اُچھلنے میں آرٹمینز کا پاؤں درخت کی جڑ میں پھنس گیا اور وہ چاروں شانوں چت جا پڑا۔ اور اُس کی تلوار اُسکے ہاتھ سے گر پڑی۔ طرفۃ العین میں میں کود کے اُسپر جا چڑھا۔ اپنا پاؤں اُس کے سینے پر رکھ کے اپنی تلوار کی نوک اُسکے گلے پر رکھدی۔ وہ رحم کے لیے چلاّیا۔ شاید میں نے ہانک اُٹھ کے کیونکہ لڑائی کی زبردست کشمکش سے میرا سانس پھول رہا تھا، کہا "رحم! تو نے کونسا رحم میرے بھائی پر کیا؟" اور میں نے تلوار کی نوک اُس کے گلے میں گڑونی۔ پھر بھی وہ رحم کے لیے چلاّتا رہا۔ کشمکش کے کسی ابتدائی مرحلے میں کسی طرح میری قمیص کا آگا پھٹ گیا تھا۔ اور ننھی نقرئی اور آبنوسی صلیب جو میری والدہ نے میرے گلے میں باندھ دی تھی میرے اُسکے اوپر جھکنے کی حالت میں باہر نکل کے لٹکنے لگی۔ اُس نے کہا "رحم! اس مسیح کا واسطہ جسکی صورت تم لگائے ہوئے ہو!"

اس مرتد کی زبان سے جس نے چاہا تھا کہ میں صلیب کو اپنے پاؤں سے روندوں اس بات کو سُن کے مجھے ادھوری سی ہنسی آگئی کہ جس مسیح کی صورت کی یہ توہین کیا کرتا تھا اب اُسی کے واسطے سے اپنی جاں بخشی چاہتا ہے۔ لیکن میں اس بات سے بھی اپنے ارادے سے نہیں ہٹ سکتا تھا۔

اس وقت تک میرا سانس قائم ہو چکا تھا اور میں نے قطعی طور پر بھونکنے کے لیے اپنا بازو پیچھے ہٹایا کہ اچانک میرا ہاتھ روک لیا گیا۔ ایک مرتبہ پھر میرے پہلو میں میرا بھائی کھڑا ہوا میرے منہ کو التجا کی نظروں سے تک رہا تھا اور ہاتھ کو جو اُس کا انتقام لے چکا ہوتا اپنے ننھے ہاتھ سے پیچھے کی طرف ہٹا رہا تھا۔ کم ازکم اس دفعہ یہ کوئی دھوکا نہ تھا کیونکہ آرٹمینز نے بھی اُسے دیکھا۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں وحشت بھری گھبراہٹ دیکھی۔ میں نے اُسکے چہرے کو جب وہ

ڈر کے مارے بڑبڑایا خوف سے پسینے پسینے ہوتے دیکھا۔ لیکن میں نے مرے ہوئے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا۔ میرے بھائی کا ہاتھ میرے بازو پر تھا۔ اور وہ سنجیدگی سے منت و لجاجت سے سفارش کے طور پر میرے منہ کو تک رہا تھا۔ اب میں اُسکے قاتل کو نہیں مار سکتا تھا۔ جیسے ہی میں نے اپنی تلوار پھینکی اور دل کے عجیب خالی خالی احساس کے ساتھ پیچھے کو ہٹا تو نہایت پیاری اور محبت بھری مسکراہٹ میرے چہرے پر نمایاں ہوئی اور پھر وہ پہلے کی طرح غائب ہو گیا۔ جوں ہی میں بچھڑے ہوئے پارٹنرز سے الگ ہوا اُس نے اپنے لمبے چرمی بوٹ کی ٹانگ میں سے چاقو نکال کے مجھ پر ہٹتے ہوئے بھی چلایا۔ میں خود بخود جُھک کے ایک طرف کو ہو گیا اور قبل اسکے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سرکاری سپاہیوں کا ایک چھوٹا سا گروہ دوڑتا ہوا آیا اور اُس کی طرف لپکا۔ اُس کے ہاتھ سے چاقو چھین لیا اور اُسے گرفتار کر لیا۔

میں اپنے اس عجیب خالی احساس کی ہی حالت میں مڑا اور خدا جانے کدھر جانے کو تھا کہ اپٹی ناہول کا مکروہ چہرہ جھاڑی کے اوپر سے ایک بندوق سے مجھ پر نشانہ لگانے کی حالت میں نظر آیا۔ میری نقل و حرکت علت و غایت کے بجائے عقل و طبیعت کی پابند تھی۔ دیرینہ مشق کی سی تیزی کے ساتھ میں نے اپنی پیٹی میں سے طمنچہ نکالا اور سر ہونے کی دو آوازیں آئیں۔ مجھے اپنے دائیں بازو میں ایک سُن کر دینے والا جھٹکا لگا اور طمنچہ اُس سے چھوٹ کے زمین پر گر پڑا۔ قبل اس کے کہ میں بھی اُسکے برابر زمین پر گر پڑوں مجھے اپٹی ناہول کی پیشانی میں جیسے ہی وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑا کے گرا ایک بھیانک نیلا، لمحہ بھر نیلا قبل اسکے کہ اُس میں سے خون نکلے، سوراخ دیکھنے کا موقع مل گیا۔ میں بھی گر پڑا کیونکہ میری ران کے زخم سے خون بہہ رہا تھا اور بندوق کی گولی کا دھچکا اس پر مستزاد ہو گیا تھا۔ اس طرح کچھ دیر کے لیے دنیا و مافیہا سے میں بالکل بے خبر ہو گیا۔

جب میں ہوش میں آیا تیرہ و تار رات تھی اور میں کچھ دیر پڑا پڑا تاروں کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے اب بھی مشکل سے ہوش تھا۔ اپنی موجودہ حالت کے سوچنے کی مشکل سے طاقت تھی۔ نہ مجھے آئندہ کا کچھ خیال تھا۔ صرف ایک چیز کا مجھے خاص طور پر احساس تھا۔ وہ شدت کی پیاس تھی جو جسم سے بہت سا خون نکل جانے کی وجہ سے لگ رہی تھی۔ میں نے اپنی داستان

کی مختلف منزلوں میں بڑی تکلیفیں برداشت کی تھیں جیسا کہ آپ نے اب تک اندازہ کیا ہوگا لیکن میرے خیال میں اب تک جو کچھ مجھ پر بیتی اس سے زیادہ اس میں جانکنی نہ تھی جتنی اب اس پیاس میں مجھے معلوم ہو رہی تھی جبکہ میں تاروں کے نیچے بے یار و مددگار پڑا ہوا تھا۔ رات مجھے طوالت میں برسوں بڑی معلوم ہوتی تھی۔ کبھی کبھی میں چند لمحوں کے لیے بیہوش ہو جاتا تھا اور پھر میں اس یقین کے ساتھ جاگ اُٹھتا کہ میں ایک سالم دن سوتا رہا اور اب دوسری رات آگئی ہے اور پھر جب میں تاروں کو دیکھتا تو وہ جہاں کے تہاں نظر آتے تھے۔

مجھے وقت کا مطلق پتا نہ رہا لیکن اس اثنا میں جو مجھ پر صدیوں کی طرح گذر رہی تھی مجھے مبہم طور سے محسوس ہوا کہ چند لالٹینیں قریب آ رہی ہیں اور تھوڑی ہی دیر میں خوشی سے چونک کے میں نے اپنے والد کی آواز سنی اور ان کا چہرہ اپنے اوپر جھکا ہوا دیکھا۔ میں نے چلا کے ان سے پانی مانگا اور آن واحد میں کسی نے میرے لبوں سے ایک بوتل لگا دی۔ اور پھر میرا خیال ہے کہ پیاس بجھ جانے کی سچی خوشی میں میں دوبارہ بیہوش ہوگیا۔ فوراً ہی میرے زخم باندھ دیے گئے۔ اور مجھے نہایت آہستگی سے میدان سے اٹھا لے گئے۔

اس جگہ من کل الوجوہ میری داستان ختم ہو جاتی ہے۔ اس تمام ذکر سے کیا فائدہ کہ میں کس طرح آہستہ آہستہ تندرست ہوا اور مجھ میں توانائی آئی۔ ملک کی حکومت نے میرا اور میرے والد کا کس قدر شکریہ ادا کیا اور اس تحیالی پر جو حکومت نے لجاجت آمیز پیرائے میں زیادہ تر ہماری دلیری کا نتیجہ قرار دی ہمیں کیا کیا اعزاز ملے۔ مجھے ایک ماہ بعد ایک روز کا ذکر کرنے کی البتہ ضرورت ہے جبکہ میں نے ایک انبوہ کثیر میں جو لعنت ملامت کی بوچھاڑ کرتا آ رہا تھا کھڑے کھڑے خاموشی سے دیکھا کہ پایۂ تخت کے بیچ بیچ میں آرمینز گولی سے مار دیا گیا۔ نفرت مرنے والے کے چھوتے ہی میرے دل و جان سے نکل جاتی رہی تھی، قطعی مٹ گئی تھی۔ نہیں، مرنے والے کی نہیں بلکہ زندہ کی۔ کیونکہ میں نے اپنے بھائی کی آنکھیں دیکھی تھیں اور مجھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ اور مجھ سے اب بھی محبت کرتا ہے۔ اور اس طرح مجھے صبر و سکون آگیا تھا۔ اگرچہ مجھے اس مسرت خیز نوشتۂ تقدیر کا مطلق حال نہ معلوم تھا جس کی بدولت پندرہ برس بعد ایک دور دراز ملک میں میرا بھائی عالم وجود میں آ جائے گا جو مجھے میری زندگی ہی میں دوبارہ ایک نئے جسم میں جنم

دیگی، جو ہم دونوں کو باہم پہچان لینے اور یہ محسوس کرنے کے قابل بنانے گی کہ موت اُن روحوں کو جو سچی محبت کرتی ہوں کبھی جدا نہیں کر سکتی۔

محمد ظفر

# حلم وضبط

اور

## خیرخواہیِ اسلام کی قابل تقلید مثال

فتنۂ مصر تھا اسلام میں پہلا رخنہ
کھل گئیں جس سے فسادات کی راہیں اکبار

آہ وہ دن تھا مسلمانوں میں اور آج کا دن
جب سے اُٹھی ہے میاں میں نہیں آئی تلوار

مصر کی خاک سے شورش کا وہ اُٹھا طوفاں
کہ ہوا کاخِ امارت کا سنبھلنا دشوار

باغی اس طرح ہوے خانہ برانداز چمن
نظر آنے لگے گلشن میں خزاں کے آثار

خانۂ پاک میں محبوس ہوے ذوالنورینؓ
تیرہ بختوں نے لیا قصرِ خلافت کا حصار

کر دیا جس نے کنواں وقف مسلمانوں پر
اُس کو اک بوند بھی پانی کی تھی ملنی دشوار

جیشِ عسرت کا کیا تھا سر و ساماں جس نے
عسرت اُسکی تھی مُنیں۔ بے سر و سامانی یار

کی تھی جس نے حرمِ مصطفوی کی توسیع
تھا نہ اُس بُقعۂ پُر نور میں ممکن اُسے بار

جب یہ عقدہ نہ ہوا ناخنِ تدبیر سے وا
در پہ حاضر ہوے اصحابِ نبیؐ آخر کار

عرض کی سب نے کہ اے گلبنِ باغِ اسلام
تیرے جلوے پہ بہارِ چمنِ دہر نثار

خیریت کی نظر آتی نہیں صورت کوئی
شر پہ بے طرح کمر باندھے ہوے ہیں اشرار

دوستوں کو ہے اگر فکر تو بس اتنی ہے
دشمنوں کو نہ پہونچ جائے اچانک آزار

تین باتوں میں سے اک بات گوارا کیجے
ہے یہی مصلحتِ وقت۔ یہی چارۂ کار

یا تو میداں میں رفیقوں کی جماعت لے کر
چلیے اعدا کے مقابل میں برائے پیکار

ورنہ پھر شام میں رہیے کہ ہے جائے محفوظ
میرِ شام آپ کا ہے بندۂ فرماں بردار

یہ نہ منظور ہو تو لیجیے کعبے میں پناہ
کہ وہی ہے حرمِ امن - وہی دارِ قرار

کر چکے عرض جو یہ مشورہ اصحابِ رسولؐ
بہرِ پاسخ ہوئے وا لعلِ لبِ گوہر بار

کہ دل اپنا کسی تجویز پہ آمادہ نہیں
گرچہ ہمدردیِ احباب کا ہوں شکرگذار

جنگ ان اہلِ ستم سے نہیں منظور مجھے
کہ ہے خوں ریزیِ مسلم سے طبیعت بیزار

شام کو جا نہیں سکتا کہ سوادِ طیبہ
ہے مرے غنچۂ خاطر کے لیے صبحِ بہار

داخلِ کعبہ بھی ہو جاؤں تو یہ اہلِ خروج
حرمتِ کعبہ نہ برباد کریں آخرِ کار

ہو گئے خاموش اُدھر چل دیئے اصحابِ کرامؓ
ختمِ حجت کو ادھر بام پہ آئے سرکار

اپنے احسان جو تھے عالمِ اسلامی پر
کر دیا آپ نے ایک ایک کا ان پر اظہار

جادۂ حق پہ مگر آئے نہ باطل والے
گرچہ تھا آپ کی عظمت کا برابر اقرار

ہو گئے مایوس اُتر آئے جنابِ عثمانؓ
تھا مگر حرفِ شکایت نہ زباں پر زنہار

گھر میں اک روز تھے مصروفِ تلاوت حضرت
پشتِ کاشانہ سے ناگاہ گھس آئے غدار

چار جانب سے کیا پھول پہ کانٹوں نے ہجوم
چار جانب سے کیا نور کا ظلمت نے حصار

فَسَیَکْفِیکَهُمُ اللّٰهُ تھا وردِ لبِ پاک
اسی آیت پہ گرے خون کے قطرے کئی بار

حرمِ خاص بچانے کو بڑھی تھیں لیکن
اُنگلیاں کٹ کے گریں اور ہوئے ہاتھ فگار

مچ گئی دھوم ہوئے قتل امیرِ اسلام
پڑ گیا شور ہوئے ذبح امامِ ابرار

اس قدر ظلم اُٹھائے مگر اللہ رے حلم
لب پر آیا نہ کبھی شکوۂ ظلمِ اشرار

رَحِمَ اللّٰهُ عَلَى الشَّیْخِ اَمِیرِ الْاِسْلَامْ
رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الشَّیْخِ اِمَامِ الْاَخْیَارْ

لَقَدْ اَمْسٰی مَثَلًا بَیْنَ کِرَامِ الْعَصْرِ
فِی تُقًی وَّسَخَاءٍ وَّحَیَاءٍ وَّوَقَارْ

جَمَعَ الرُّتَبَ لَهُمْ حُسْنُ ثَوَابِ الدَّارَیْنِ
فَلَهُمْ زَهْرَةُ الْاُوْلٰی وَلَهُمْ عُقْبَی الدَّارْ

ضیاء احمد ضیا بی اے - بدایونی

# مکاتیب اکبر

بنام

## عبدالسلام رفیق

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب!

سلام مسنون! اس زمانے میں جبکہ ہزاروں سال کے مُردے قبروں سے نکالے جاتے ہیں - اگر میں دس بارہ سال کی مُردگی کے بعد پھر زندہ ہو جاؤں تو جائے تعجب نہیں - بہت کم اصحاب کو اس امر کا علم ہوگا کہ مجھے اُردو میں حضرت اکبر سے تلمذ تھا - چنانچہ اس آوارہ گردی کی حالت میں اُستاد مرحوم کے خطوط میری دلجمعی کا سبب ہوتے رہے لیکن آپ کو میری ایک دوسری تحریر سے معلوم ہوگیا ہوگا - کہ کس طرح اُن خطوط کا مجموعہ میرے ہاتھ سے جاتا رہا - یہ صرف ۱۹۱۴ء کے تین خطوط باقی رہ گئے ہیں، جن کی نقول مع شان نزول ارسال خدمت کرتا ہوں - امید کہ الناظر میں درج فرمائیں گے -

عبدالسلام رفیق

(۱)

جب مرحوم کی کلیات تازہ طبع ہوئی تو میں نے ایک خط میں عرض کیا تھا کہ فلاں جگہ میرے للعہ۹ باقی ہیں - وصول کرکے ایک جلد روانہ فرمائیے - جواب میں ذیل کا خط ملا:

الہ آباد - عشرت منزل
۲۱ - جنوری ۱۹۱۴ء

مکرمی!

میں نے ایک یتیم لڑکے کو متعین کیا - وہ للعہ۹ وصول کرلایا - عہ وضع کرکے باقی اُسکو دیدیا - اُس کی طرف سے دعا اور جزاک اللہ اور میری طرف سے سبحان اللہ - سبحان اللہ آپکے

لٹریری مذاق اور قدردانی پر۔ خدا خوش رکھے کاموں میں برکت دے۔ رسید لکھیے اور اپنی خیریت۔ آپ کی اُردو بہت کھری[1] ہے داد دیتا ہوں۔ ایک پیکٹ ہر دو جلد کلیات کا رجسٹری کرا کے روانہ کرتا ہوں۔

اکبر حسین

[1] یہ یہ کی اثیرت کے لحاظ سے۔ رفیقی۔

(۳)

عرض کیا۔ کہ بعض میرے اُردو ... مضمون پر بھی نظر اصلاح ڈالی جائے وغیرہ۔ جواب آیا:۔

الہ آباد۔ ۱۵۔ مارچ ۱۹۱۴ء

نازنی! آپ اللہ کے نیک بندوں میں ہیں۔ مذاق بھی نہایت بلند۔ اور ارادے بھی بہت نیک۔ اس کی جزا آخرت میں پائیے گا۔ یہ دُنیا تو کچھ نہیں۔ مجھ پر جو حوادث گذرے اُنھوں نے بالکل دل شکستہ کر دیا۔ دُنیا سے بالکل بے تعلق ہو گیا ہوں۔ خدا کی یاد ہے انتظار اجل ہے اور میں ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو فراغ خاطر عطا فرمائے۔ یہ بڑی نعمت ہے۔ لیکن کم ملتی ہے۔ اسلامی درسگاہوں میں تو اس وقت ہندوستان میں میری نظر میں مدرسہ دیوبند ضلع سہارنپور سے بہتر کوئی مدرسہ نہیں ہے۔ وہ لوگ خدا پرست۔ باادب۔ قانع اور طاعت گزار ہیں

. . . . . . . . . . . . . . .

مجھ کو تو دکیا آتا ہے۔ لیکن کبھی کوئی مضمون آئے گا تو دیکھ لوں گا۔ زندگی شرط ہے۔ آپ کو شرافت ہی کیا ہے۔ اللہ پر بھروسا رکھیے۔ اُس کو یاد کر لیا کیجیے۔ دنیا کی زندگی فانی ہے۔ بات کی بات میں گذر گئی۔ اور گذر جائے گی۔

خاکسار دعاگو سید اکبر حسین

(۳)

۱۹۱۴ء کا ابتدائی زمانہ تھا۔ میں دنیا کے ایک مشہور شہر کے ایک دلکشا باغ میں بیٹھا ہوا ایام بہار کی آمد آمد کے دن گن رہا تھا۔ کہ خیال مسلمانوں کی حالت کی طرف گذرا۔ اس باغ میں سوائے میرے اس موقع پر تمام حاضرین یوروپین یا امریکن تھے۔ ان لوگوں کے حالات ترقی اور مسلمانوں کے تنزل کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا بعد غور اس نتیجے

یہ ہوئی کہ اگر ہم میں بجائے قول کے عمل ہوتا تو یہ درگت نہ ہوتی سب کچھ ہمارے ہی قامت ناساز کا قصور ہے۔ بے اختیار غالب کا مصرعہ زبان پر آگیا کہ

"دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر"

چند منٹ میں مندرجہ ذیل قطعہ موزوں ہوگیا:۔

میں نے کہا یہ اُس مس یورپ ایکٹن سے تو لہ زندہ کرتی ہے مُردوں کو دیکھ کر
اعجاز عیسوی ہے تری بات میں نہاں ہے سامری کا فن تری آنکھوں سے جلوہ گر
الطاف تیرے عام نوازش تری وسیع مسلم پہ بھی کبھی تو عنایت کی ہو نظر
کہنے لگی وہ ہنس کے کہ غالب ہیں کہہ گئے
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

سب سے پہلے میں یہ نظم میں نے استاذ مرحوم کی خدمت میں روانہ کی۔ جسکے جواب میں مندرجہ ذیل عنایت نامہ موصول ہوا۔

الہ آباد۔ ۲۱ مئی ۱۹۱۴ء

مکرمی! آپ کی رائے نہایت صحیح ہے۔ اور آپ کی نظم ایسی اچھی اور دلکش ہے کہ بہت خوش ہوا۔ میرا مطلب قناعت اور آخرت و عبادت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ دنیا کی حکومت اور عیش کی طلب میں عمر کو کھونا اچھا نہیں۔ غافلوں اور متکبروں اور خدا کے نہ ماننے والوں سے بیزاری ہے اور تقلید اور نقل فضول سے احتراز۔ اگرچہ شاعرانہ رنگ ایشیائی بھی کچھ ہے۔ اور کہیں ظرافت بھی ہے۔ لیکن اصل مقصود وہی ہے جو عرض کیا۔ آپ کل کتاب کو تھوڑا تھوڑا بغور دیکھیں۔ بالخصوص اول حصہ اور آخر کے نتیجے تو آپ کو کچھ معلوم ہوگا کہ میرا میلان خیال کیا ہے۔ ایک غزل ہے چنگیز ہے تو پھر کیا، انگریز ہے تو پھر لیا۔ اسکے جملہ اشعار کو بغور ملاحظہ فرمائیے گا۔

موجودہ گروہ مسلم بلحاظ اپنے مذاق طبیعت اور اعمال کے بلاشبہ کسی طرح دربار فطرت میں قابل انتخاب نہیں ہے۔ آپ کی رائے بہت صحیح ہے۔ لیکن میں آپ کو داد اسی بات کی دیتا ہوں کہ وہ رائے کیا عاشقانہ اور لطیف پیرائے میں ظاہر کی گئی ہے۔

آپ کا خوب مشرب ہے۔ جو اللہ کا وہ میرا۔ خدا آپ کو ترقیات ظاہر و باطن عطا فرمائے۔

میں اب دُنیا سے سیر ہو گیا ہوں۔ خدا عاقبت بخیر کرے۔

میں تو مساکین اور یتامیٰ اور بیواؤں کو بہت قابل رحم و امداد قرار دیتا ہوں اور وہ ہر جگہ ہیں۔ البتہ ذوی القربیٰ یعنی خاص رشتہ داروں کو ترجیح ہے۔

اکبر حسین

---

جو اپنی عمر کی گھڑیوں کا اعتبار کرے — تمھارے وعدۂ فردا کا انتظار کرے

شگفتہ دل کو الٰہی نگاہِ یار کرے — مری خزانِ تمنا کو نوبہار کرے

نفس کی آمد و شد ایک دم کا قصہ ہے — کوئی شمار کرے بھی تو کیا شمار کرے

ترے خیال کو آنکھوں سے کیا عداوت ہے — کہ ایک دم کو بھی آئے تو اشکبار کرے

وہ نشہ ہی نہیں جس میں نہ کیفِ غفلت ہو — وہ درد ہی نہیں جو دل کو بیقرار کرے

ہے میری زندگی مستعار ہی کتنی — جفا سے یار کو لازم ہے اختصار کرے

نہاں ہے اُنکے تبسم میں ریشخندِ خزاں — گلوں پہ فخر نہ اس درجہ نوبہار کرے

رہے گی پھر وہی سوزش اگرچہ دیدۂ تر — جگر کی آگ کو ٹھنڈا ہزار بار کرے

تمھاری آنکھ کو جب تحمل اک نظر سے بھی ہو — تو کیوں کسی کو وہ ناحق امیدوار کرے

ہماری سوزشِ پنہاں بھی کیا تماشا ہے — دلِ حزیں سے جو نکلے تو اشکبار کرے

نہ دیکھی جائے گی دولت یہ غیر کی مجھ سے — میں ترکِ شوق کروں اور وہ اختیار کرے

جسے تڑپتے ہوئے ایک عمر گذری ہو — وہ خو سکون کی اب خاک اختیار کرے

تمھارے وعدۂ فردا سے کب توقع ہے — کہ میرے شوق کو مصروفِ انتظار کرے

مجھے تو ذکرِ مصیبت سے کام ہے ہادی
وہ اعتبار کرے یا نہ اعتبار کرے

ہادی مچھلی شہری

# نقد و تبصرہ

(از "ناظر")

## (الف) مذہب

(۱) **فلاح الدارین**، مرتبہ مولانا عبد الماجد بدایونی، ضخامت ۱۳۲ صفحہ، تقطیع ۸ + ۲۲۰ ناشر: عثمانی پریس بدایون۔

مولانا عبد الماجد بدایونی کا نام تحریک خلافت و فتنۂ ارتداد کے سلسلے میں ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل چکا ہے، لیکن کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ موصوف نہ صرف ایک اعلیٰ خطیب ہی نہیں، بلکہ سنجیدہ مصنف بھی ہیں۔ اور صاحب زبان ہونے کے ساتھ ہی صاحب قلم بھی ہیں۔ "فلاح الدارین باتباع سید الکونین" اُنکے افادات قلم کا تازہ ترین ثمرہ ہے جس میں اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر کہ مسلمانوں کی ہر قسم کی دینی و دنیوی فلاح تمامتر اتباع حضرت سرور کونین صلعم سے وابستہ ہے، اعتقادات، عبادات، اخلاق، وغیرہ سے متعلق احادیث نبوی کو مع ترجمہ اردو یکجا کر دیا ہے، کل احادیث کی تعداد ڈھائی سو سے اوپر ہے۔

ترجمے کی زبان صاف و سلیس ہے۔ جس قدر احادیث نقل کی ہیں، وہ سب بجائے خود مفید و ضروری ہیں۔ البتہ ترتیب ابواب تھوڑی سی توجہ سے بہتر و جامع تر بنائی جا سکتی ہے۔ دوسری بات یہ بھی قابل گزارش ہے کہ احادیث نبوی کے جو ماخذ پیش کیے گئے ہیں، وہ ہر موقع پر یکساں مرتبۂ استناد نہیں رکھتے۔ مثلاً جہاں بہت سی حدیثیں بخاری و مسلم سے نقل ہیں، وہاں بہت سی ایسی بھی ہیں جن کی سند احیاء العلوم سے آگے نہیں بڑھتی، و بعض تو سرے سے بے سند ہیں۔ امید ہے کہ طبع ثانی میں ان فروگذاشتوں کی اصلاح پر توجہ فرمائی جائیگی، کہ حدیث نبوی کی خدمت جس قدر باعث اجر ہے، اُسی قدر احتیاط کی [illegible] ہے۔

(۲) **عورت اور قرآن** - مولفہ مولانا عبد الماجد بدایونی۔ ضخامت ۱۰۸ + ۱۸ صفحات تقطیع ۸ + ۲۲۔ قیمت ۴؍ ناشر: عثمانی پریس، بدایوں۔

یہ بھی مولانا بدایونی کا ایک تازہ افادۂ قلم ہے۔ موضوع کی تشریح خود کتاب کے نام سے ہو رہی

عورت کی اخلاقی، مذہبی، معاشرتی، زندگی سے متعلق جو کچھ کلام مجید میں وارد ہوا ہے، ان تمام آیات کو مع ترجمہ اُردو یکجا کر دیا ہے۔ جابجا حواشی و تبصرہ کا بھی اضافہ کیا ہے۔

عورت کی پیدایش، امہات المومنین، عورتوں پر مردوں کے حقوق۔ مردوں پر عورتوں کے حقوق، مرد و عورت کے تعلقات، نکاح و متعلقاتِ نکاح، محرمات، مہر، طلاق، عدت، خلع، ایلاء، ظہار، قذف، زنا، پردہ، وراثت، ان عنوانات سے کتاب کی جامعیت کا اندازہ ہوگا۔ پردہ سے متعلق، علاوہ آیاتِ قرآنی کے متعدد احادیث و اقوال انبیاء و اولیاء بھی نقل کیے ہیں۔

جو لوگ عورت کے بارے میں اسلام کی صحیح تعلیمات سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں، انکے لیے کتاب کا مطالعہ لازمی ہے۔ دَورِ جدید کی خواتین اس کے مطالعہ سے خاص طور پر فائدہ اُٹھا سکتی ہیں بلکہ فائدہ اُٹھانا چاہیں۔

زنا کاری کے سلسلے میں ایک مختصر آیۂ کریمہ ولا تقربوا الزنا (بنی اسرائیل ع ۴) فاضل مؤلف سے نظر انداز ہوگئی ہے، جس کے مفہوم پر اگر غور کیا جائے، تو تمام اُن حالات کے سدِ باب کا حکم جو براہِ راست یا بالواسطہ بدکاری و بے عصمتی میں معاون ہو سکتے ہیں، قرآن ہی سے مل جاتا ہے۔

(۳) **صحابیات**۔ مولفہ نیاز فتحپوری۔ ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ تقطیع ۲۰×۲۶۔ ناشر: صوفی پرنٹنگ پریس، پنڈی بہاء الدین۔ پنجاب۔

جناب نیاز فتحپوری اُردو کی دنیائے ادب میں ایک خاص قسم کی شہرت رکھتے ہیں۔ اُن کی یہ تازہ تالیف عین اسی شہرت کے مطابق ہے۔ کتاب فی الجملہ مفید و دلچسپ ہے۔ حواشی ذیلی (فٹ نوٹس) میں مستند کتب حدیث و تاریخ کے حوالے بکثرت درج ہیں۔ شروع میں ۱۵، ۱۶ صفحے کا ایک مفصل مقدمہ ہے جسکے جزوِ غالب کو "صحابیات" کے موضوع سے مطلق کوئی تعلق نہیں۔

اُردو میں صحابیات سے متعلق اس سے پیشتر بھی متعدد تالیفات شایع ہو چکی ہیں، مثلاً اُسوۂ صحابیات (مولانا عبدالسلام ندوی) سیر الصحابیات (مولوی محمد سعید انصاری) وغیرہ۔ اور بعض ازواجِ رسول صلعم کی مستقل سوانح عمریاں بھی چھپ چکی ہیں، مثلاً سیرت عائشہ (مولانا سید سلیمان ندوی) لیکن نیاز صاحب شاید اپنے کسی معاصر کی سعی و محنت کا اعتراف اپنے قلم کے لیے باعث عار خیال فرماتے ہیں۔ کم از کم قلبِ "نیاز" سے اس شانِ "ناز" کی توقع نہ تھی۔ دوسری کتابیں تو اُنکے نزدیک

سرے سے ناقابل اعتنا ہیں اب دیکھئے کہ وہ ہر ایک موقع پر حضرت عائشہ کا ذکر فرماتے ہیں، وہ بھی اُس وقت جب انھیں ایک اعتراض و اہانت کا موقع ہاتھ آجاتا ہے!

ٹائیٹل خوشنما ہے۔ طباعت، کتابت، کاغذ درجۂ اوسط۔ بہ حیثیتِ مجموعی صحابیات کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے، کہ گویا سیر الصحابیات کا "نقش ثانی" پیش نظر ہے۔ خدا کرے محض بدگمانی ہو، اور اسکے عقب میں کوئی ناقابل انشاء حقیقت مستور نہ ہو۔

(۲) **سوامی دیانند جی کی لائف پر مکمل ریویو**۔ مولفہ مولوی قاضی غلام امیر صاحب رئیس و مختار۔ بدایوں۔ ضخامت ۱۰۷ صفحے۔ قیمت ۶ [illegible]

فتنۂ ارتداد کے سلسلے میں آریہ سماج اور اسکی کارروائیوں کے چرچے اکثر مسلمانوں میں رہنے لگے ہیں، لیکن بہت کم مسلمان ایسے نکلیں گے جو آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند، اُنکی معاشرت، اور اُنکے اصول و تعلیمات سے صحیح واقفیت رکھتے ہوں۔ قاضی غلام امیر صاحب بدایونی یقیناً تمام قوم کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں، کہ اُنھوں نے اس فرض کو نہایت خوش اسلوبی سے ادا کردیا۔ پیش نظر رسالے میں اُنھوں نے عموماً آریوں ہی کی مسلّم و معتبر کتب سے ضروری معلومات اخذ کرکے سوامی دیانند کے حالات، سوانح و تعلیمات کا ایک قابل دید مرقع تیار کردیا ہے۔ جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ہی بہ نہایت سنجیدہ [illegible]۔ شروع سے آخر تک کوئی فقرہ ایسا نہیں، جو فریق مخالف کے لیے دلآزار کہا جاسکے۔ اس کتاب نے اردو خواں جماعت کی ایک بڑی ضرورت کو بوجہ احسن پورا کردیا ہے، اور ان کی یہ خدمت ہر پہلو سے ہمت افزائی، [illegible] و ستایش کی مستحق ہے۔ کتاب کی معنوی خوبیوں نیز ضخامت پر نظر کرتے ہوئے قیمت بہت ہی ہلکی ہے۔

(ب) ادب

(۱) **کرشمۂ عشق المسمٰی بہ تنویر الخیال**۔ "از تصنیف لطیف عوارف و معارف دستگاہ طریقت و شریعت پناہ فاتح [illegible] الفوز [illegible] محمد [illegible] صاحب عاجز صدیقی چشتی نظامی ادام اللہ فیوضہٗ" ضخامت ۱۲۰ صفحات۔ تقطیع ۱۸×۲۲۔ قیمت ۸ مصنف سے گھاگھرہ خرد، ڈاکخانہ جلال آباد ضلع فیروزپور کے پتہ پر ملے گا

پنجاب کی زعفران زار سرزمین اکثر ارباب ذوق کے ضیافت ادبی کا سامان کرتی رہتی ہے۔

اس سامانِ لطف کی تازہ قسط دیوان کرشمۂ عشق کی صورت میں موصول ہوئی ہے، جس کے مصنف، بقول خود "شاعرِ نازک‌خیال مصورِ فطرت حضرت شاہ ..... ہیں۔ اور جسکے سرورق پر انھیں "عوارف و معارف دستگاہ" "طریقت و شریعت پناہ" اور سب سے بڑھ کر "فائض الفوائز" کے القاب مجیبہ سے ملقب فرمایا گیا ہے۔

ریویو نگار کے تنقید و تبصرہ سے کہیں بہتر ہوگا، کہ کلام کا کچھ نمونہ، بجنسہ "فائض الفوائز" صاحب کے الفاظ میں نقل کردیا جائے۔ زیر خط الفاظ خصوصیت کے ساتھ داد طلب ہیں:۔

تصویر تری نور کے سانچے میں ڈھلی ہے　　ایسا تو نہ ہوگا کوئی جانانہ کسی کا
رکھا تھا مرے پاس بھلا اسکے سوا کیا　　دل دیدیا پہلے ہی سے نذرانہ کسی کا
جب اُٹھا بنیاد سے سرِ حسن کی دیوار کا　　جھک کے پہلا دن گرنے قدم معمار کا
تیری فرقت میں ہوا میں ایسے بری پروانہ وار　　دل ہوا وحشت نما ہر کوہ و دشت ادبار کا
یہاں کا بھائی ہو دشمن یار کی ہمشکلِ غیر　　واقعتاً ہی بس یہی اس وقتِ ناہنجار کا
فرہاد شیفتہ ہیں مرے نونہال پہ　　کیا کیا بزرگ مرتے ہیں اس خوردسال پہ
سیکڑوں بلکہ ہزاروں ہوگئے عاشق شہید　　اس گلِ رعنا کی جب نکلی سواری رات کو
صدمۂ فرقت سے ہم تو مرگئے جانِ جہاں　　آہ دل نے کھینچدی سندیہ آرہی رات کو
تم عدو کے گھر پڑے اور ہم ہوئے پامالِ غم　　ہو سوالِ وصل پورا ایک باری رات کو
شاد کرنا عاشقِ بیتاب کا کیسے محال　　دیکھ لو بستر پہ آکر ایک باری رات کو
جاں بلب ہوں ہجر میں ہوتے ہو صاحب فراش　　ہے ثواب آکر کرو تیمارداری رات کو

ایک شعر جو صفحہ ۴۱ پر درج ہے، بہتر ہوتا کہ اسے ٹائیٹل پر جلی قلم سے لکھ دیا جاتا ؎

جمع ہیں اس میں خیالات پریشاں عاجز
نام دیوان کا ہے اپنے پریشاں آباد

"عاجز" کا تخلص، بہت ممکن ہے، اس مناسبت سے اختیار کیا گیا ہو، کہ جناب فائض الفوائز صاحب اُردو زبان کے قواعد کی پابندیوں سے عاجز آچکے ہیں۔

(۲) مکاتیب نواب محسن الملک مہدی علی خاں مع نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین مرتبہ

مولوی محمد امین زبیری مارہروی۔ ضخامت ۱۴۰ صفحہ۔ تقطیع ۲۰ × ۲۶۔ قیمت عمر

ہر وہ شخص جو تحریکِ علیگڈھ کی بابت کچھ بھی جانتا ہے یقیناً محسن الملک و وقار الملک سے بھی واقفیت رکھتا ہے، جن کے اسماء گرامی سرسید کے رفقاء و انصار میں ایک نمایاں و ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ محسن الملک مہدی علی خان کی وفات ۱۹۰۶ء میں ہوئی اور وقار الملک مولوی مشتاق حسین کی ۱۹۱۶ء میں۔ اور دونوں انیسویں صدی کے ربع آخر سے لے کر اپنے وقت وفات تک اپنی زبردست شخصیتوں کے لحاظ سے اسلامی ہند کے، ایک بڑی حد تک "تاریخ گر" رہے۔ پیش نظر رسالہ ان دونوں حضرات کے بعض اہم و دلچسپ مکاتیب کا مجموعہ ہے۔ محسن الملک بہادر کے خطوط ص۶۸ تک آئے ہیں۔ باقی نصف حصے میں، وقار الملک بہادر کی تحریریں ہیں جو لوگ دونوں بزرگان قوم کی سیرت یا ان کی زندگی سے دلچسپی رکھتے ہیں، یا علیگڈھ کی قدیم تاریخ سے باخبر رہنا چاہتے ہیں، انکو یہ رسالہ یقیناً ملاحظہ کرنا چاہیے۔

عام ناظرین کے لیے رسالہ کی دلکشی اور حیثیت افادی بہت بڑھ جاتی، اگر مکاتیب کی ترتیب و تہذیب میں زیادہ سلیقہ مندی سے کام لیا جاتا، مثلاً شروع میں ایک فہرست دینا تھی، ہر خط کے مکتوب الیہ کے نام کی پوری وضاحت کرنا تھی، مختلف تفصیل طلب واقعات کی مختصر توضیح حاشیے پر کرنا تھی، و قس علیٰ ہذا۔ ادبی حیثیت سے رسالہ اب بھی عام ناظرین و طلبہ کے مطالعہ کے قابل ہے۔ وقار الملک مرحوم کے خطوط سے جس اسلامی درد اور سیرت میں عناصر خلوص و صداقت کے غلبے کا اظہار ہوتا ہے، وہ نوجوانان قوم کے لیے اسوۂ حسنہ کا کام دے سکتا ہے۔

(۳) **نگارستان** - مولفہ نیاز فتحپوری - ضخامت ۲۷۲ - تقطیع ۱۸ + ۲۲ - قیمت عہ ناشر: دفتر نگار، بھوپال۔

جناب نیاز فتحپوری کے "مخصوص ادبی رنگ کے مضامین کا مجموعہ" - ۲۱ مضامین پر مشتمل ہے۔ جو مختلف اوقات میں نقاد، کہکشاں، و نگار میں شایع ہو چکے ہیں۔

حضرت نیاز جس "مخصوص رنگ" میں زبان و ادب کی خدمت فرما رہے ہیں، اس کے انداز کے لیے ذیل کے فقرے، ترکیبیں، اور عبارتیں کافی ہیں:-

ایک نور پاش، خراماں پیکر آتش، ... ایک گلابی رنگ میں ڈوبی ہوئی برق متحرک، مجھ میں اپنے

اشارۂ مبہم سے ایک انجذاب مضطر پیدا کر رہی ہے۔ اور میں ہوں کہ اُس قوت مجہول کی طرف کھنچا جا رہا ہوں"

"روشنی کی تیز کرنیں اک مؤدب فاصلہ پر رکے ہوئے تڑپ رہی ہیں" "یہ نزہت بارہستی بہ مصفا ترکیب عناصر، میرے وجود کو، میری روح لرزاں کو مسحور کر رہا ہے، اپنی آنکھوں کے خندۂ سیال سے، اپنے بالوں کی بوئے شگفتگی سے، اپنے خرام وقار سے"

"فی الحقیقت وہ آئینہ سیما لڑکی، اپنی عفت وشرم میں وہ محافظ رکھتی تھی"

"تھوڑا سا وقوف یقیناً عقل و فراست کا ایک جزو مدہے جو ایک ستارہ سے دوسرے ..... ستارہ تک اپنا کام کر رہا ہے۔ یہ خمیر تمام اشیاء میں شامل ہے۔ بیوقوفی کی خاطر عقل تمام چیزوں میں ملی ہوئی ہے"

"اے اوپر والے آسمان۔ اب میرے لیے مصروفیت یہی ہے کہ یہاں کوئی تار و پود فراست نہیں ہے، اور یہ کہ تو ہی آلہانہ امکانات کے لیے میرا صحن رقص ہے، اور تیری فضا آلہانہ قمار خانے کی کھلی ہوئی بساط"

جو لوگ اس عجیب و غریب طرز انشاء کو زبان اُردو کا بہترین نمونہ سمجھتے ہیں، توقع ہے کہ وہ اس مجموعہ کی خاطر خواہ سرپرستی فرمائیں گے۔

## (ج) مسائل حاضرہ

(۱) **کنایات**۔ موسوم بہ اسم تاریخی، خیالات جدید مولوی سبحان اللہ۔ مولفہ مولوی سبحان اللہ گورکھپوری۔ مطبوعہ مطبع حکیم برہم، گورکھپور۔ ضخامت ۳۲ صفحہ۔ تقطیع ۱۸ + ۱۲۔ غالباً مفت۔

ڈیڑھ جزو کے اس عجیب و غریب رسالہ کے مؤلف کا اسم گرامی، سرورق پر پوری پانچ سطروں کی عبارت میں مندرج ہے، جس میں سے القاب ذیل خصوصیت کے ساتھ پُر لطف ہیں:-

"از قلم دو رقم" (گویا مصنف صاحب کاپی نویس ہیں!)

"زمانہ شناس"

"ادا نواز سیاست حاضرہ"

"منجملہ منتخب لیڈران ملک و قوم"

"رئیس ابن رئیس اعظم"
رسالہ کے مضامین وعنوانات، بیشک انھیں توقعات کے مطابق ہیں، جو ایک "رئیس ابن رئیس اعظم" کے "قلم زودرقم" سے قائم ہو سکتی ہیں۔ بہترین وجامع ترین ریویو جو اس رسالہ پر ہو سکتا ہے، وہ اتفاق سے، جناب مولف کا اسم گرامی ہی ہے، یعنی "سبحان اللہ"!!

## (د) فلسفہ

(۱) **ابن رشد**۔ مولفہ مولانا محمد یونس مرحوم فرنگی محلی۔ ضخامت تقریباً ۴۰۰ صفحہ۔ تقطیع ۲۰ + ۲۶۔ طابع وناشر:۔ دار المصنفین، اعظم گڈھ۔ قیمت [illegible]

اُردو زبان میں ہر سال ایک ہی آدھ کتاب ایسی نکلتی ہے، جسے دوسری علمی زبانوں کی بہترین مطبوعات کے مقابلے میں پیش کیا جاسکے۔ سال رواں کی مطبوعات اُردو میں تالیف پیش نظر اسی درجے اور مرتبے کی ہے۔

مولانا محمد یونس فرنگی محلی، ملک کے ممتاز عالم، ایک ہونہار مصنف، اور ایک نکتہ رس محقق تھے۔ مختلف رسائل، خصوصاً معارف (اعظم گڈھ) میں انکے متعدد بیش بہا مضامین فلسفیانہ عنوانات پر شایع ہوتے رہے۔ روح الاجتماع کے نام سے ایک فلسفیانہ کتاب کا عربی وانگریزی سے ترجمہ کرکے شایع کیا، عثمانیہ یونیورسٹی دکن میں تفسیر قرآن کے اُستاد ہوکر گئے تھے، کہ پیام اجل آپہونچا، اور ۲۶ سال کی عمر میں مرحوم اپنے بدنصیب معاصرین واحباب کو داغ مفارقت دے کر گلگشت جناں میں مصروف ہوگئے۔ ابن رشد اسی نوعمر فاضل کی تحقیق وکاوش کی آخری یادگار ہے۔

ابن رشد کا شمار دنیا کے مشاہیر فلسفہ میں ہے، اور کم از کم مسلمانوں کا ایک گروہ تو اسے اپنے ہاں کا سب سے بڑا فلسفی تسلیم کرتا ہے۔ یورپ میں مدتوں اس کی پرستش، بحیثیت شارح ارسطو کے، ہوتی رہی۔ اُردو کی بدنصیبی ہے، اب تک اس میں اس جلیل القدر حکیم سے متعلق (بجز مولانا شبلی کے ایک مضمون کے) تقریباً کچھ بھی موجود نہ تھا۔ مولوی محمد یونس مرحوم نے اس بڑی ضرورت کو پورا کردیا اور اس خوبی سے پورا کیا، کہ بظاہر اب اس پر اضافہ دشوار ہے۔

کتاب تین حصوں میں تقسیم ہے: ابن رشد کا تذکرہ، ابن رشد کے نظریات، فلسفہ ابن رشد کی تاریخ۔

اول، ابواب ذیل پر مشتمل ہے۔ اندلس کی علمی ترقی کی تاریخ، ابن رشد کے سوانح زندگی، ابن رشد
رت پر تبصرہ - حصۂ دوم، ابواب ذیل کا جامع ہے، ابن رشد اور علم فقہ، ابن رشد اور
لام، ابن رشد اور فلسفہ، فلسفۂ ابن رشد پر نقد و تبصرہ - حصۂ سوم میں مباحث ذیل ملتے ہیں،
ابن رشد یہودیوں میں۔ یورپ میں فلسفۂ ابن رشد کی ترویج، یورپ پر فلسفۂ ابن رشد کا اثر۔
تصنیف کی ابواب و فصص میں اس قدر صحیح، جامع اور منطقی تقسیم بجائے خود مؤلف مرحوم
بابت فکر و نکتہ سنجی کی دلیل واضح ہے - اب چند تحتانی مباحث کے عنوانات ملاحظہ ہوں:-
ن میں مسلمانوں کی حالتِ علمی - ابن رشد کی تباہی کے اسباب، ابن رشد کی تصنیفات، فقہ سے
شد کا تعلق، ابن رشد کے علم کلام پر تنقیدی نظر، ابن رشد اور امام غزالی، ماہیت مادہ و تخلیقِ
ابن رشد کا علم النفس، ابن رشد کا علم الاخلاق و علم السیاستہ، ابن رشد کے فلسفہ کی غلطیاں،
رشد اور ابن سینا، وقس علیٰ ہذا۔

مؤلف مرحوم چونکہ انگریزی و عربی دونوں سے واقف تھے، اس لیے انکے سامنے ابن رشد
اریخ و فلسفہ سے متعلق مشرقی و مغربی دونوں مآخذ موجود تھے، اُنھوں نے دونوں سے دل
کر فائدہ اُٹھایا، اور اس نے اُنکی کتاب کو تبحر و وسعتِ نظر کا ایک زندہ نمونہ بنا دیا ہے۔ ساتھ
ہ چونکہ محض جامع واقعات یا ناقل روایات نہیں، بلکہ خود بھی فلسفی تھے، اس لیے واقعات کی
اور مسائل کے تجزیے میں، قدم قدم پر اپنی نکتہ سنجی کا ثبوت دیتے گئے ہیں۔
طرز بیان اس قدر صاف و سلیس ہے کہ کسی فلسفیانہ کتاب میں اس سے زائد کی توقع نہیں ہو سکتی۔
ں ذیل سے نمونہ ظاہر ہو گا۔ مسئلۂ جبر و قدر سے متعلق ابن رشد کے خیال کی تشریح مقصود ہے۔
تے ہیں:-

"ارادہ انسان کی ایک کیفیت نفسی ہے، جس کا اقتضا یہ ہے کہ انسان سے کچھ افعال صادر ہوں،
لیکن انسان کے ارادے کی پیدائش اُسکے اندر سے نہیں ہوتی، بلکہ اسکی پیدائش چند خارجی
اسباب پر موقوف ہوتی ہے، اور صرف یہی نہیں کہ ان بیرونی اسباب سے ہمارے ارادے میں
استحکام پیدا ہوتا ہو، بلکہ ہمارے ارادے کی تعین و تحدید بھی انھیں اسباب پر موقوف ہے.....
اس کی مثال یہ ہے، کہ جب کوئی خوشنما چیز ہماری نگاہ کے سامنے آتی ہے، تو ہمیں خواہ مخواہ اُسکی

جانب میلان ہوتا ہے، یا جب کسی بدنما یا پُر ہیبت شے پر نگاہ پڑتی ہے۔ تو طبیعت خواہ مخواہ اُسکی جانب کھنچتی ہے - یہی ہرب و انجذاب کی کیفیت ارادہ ہے - لیکن جب تک کوئی ایسی بات پیش نہیں آئی تھی، جو ہمارے ارادے کو اُکسا دے، اُسوقت تک خود ارادے کا بھی وجود نہ تھا -

لیکن یہ بیرونی اسباب بھی خود بےترتیب و قوع پذیر نہیں ہوتے، بلکہ اپنی بیرونی علتوں کے تابع ہوتے ہیں - تو اس بنا پر ہمارے اندر ارادے کی کیفیت بھی بےترتیب اور بےوقت نہیں پیدا ہو سکتی، بلکہ سلسلۂ اسباب کی طرح ارادوں کا بھی ایک مرتب سلسلہ ہوگا، جسکی ہر کڑی سلسلۂ اسباب کی طرح بیرونی کڑی سے بندھی ہوگی - اسکے علاوہ خود ہمارا نظامِ جسمانی بھی، جس پر ایک بڑی حد تک ہمارے ارادوں کا مدار ہے، ایک خاص نظام کے ماتحت ہے، اور یہ تینوں سلسلۂ اسباب و مسببات ایک دوسرے سے جکڑے ہوئے ہیں، اسی کا نام قضا و قدر ہے.....»

(۱۸۲-۱۸۳)

بلحاظِ جامعیت یہ بیان کرنا مبالغہ کی آمیزش سے خالی ہے، کہ ابن رشد، فلسفۂ ابن رشد، اور مباحثِ متعلقہ کی بابت جس قدر معلومات اس کتاب میں یکجا و فراہم ملیں گے، اتنے فارسی و عربی تو کیا، انگریزی کی بھی ایک کتاب میں میسر نہیں آسکتے - اُردو خواں طبقہ اس کتاب سے بہ اتفاق بہت کرا بنی ہی بدمذاقی و نا قدر شناسی کا ایک مزید ثبوت دنیا کے سامنے پیش کرے گا -

## رسید کتب

کتب ذیل وصول ہوئی ہیں - انشاء اللہ آیندہ ریویو کیا جائے گا -

کلام شاد - قیمت ے.و عہ (انجمن ترقی اُردو - پٹنہ)

اخبار الاولیٰین - (مصنفہ نیاز فتحپوری) قیمت عہ (مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڈھ)

اُردو شاعری پر ایک نظر - (پروفیسر رشید احمد صدیقی بی اے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ)

انتخاب میر - (مسٹر نور الرحمٰن بی اے) قیمت عمر (مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڈھ)

کتاب الحدائق حصہ اول - قیمت عہ (دہن میں نرسری سہارن پور)

# مسئلہ سود اور الناظر لکھنؤ

(ایڈیٹر کا نوٹ)

مضمون ذیل "چلپی" صاحب کی تعلیقات متعلق بہ مضمون ہذا کے ساتھ شایع کیا جاتا ہے چونکہ فقہ اسلامی کا یہ ایک اہم مسئلہ ہے اس وجہ سے اُن اصحاب کو اس بحث کی طرف متوجہ ہونا چاہئیے جو اپنی مذہبی معلومات کی بنا پر اظہار رائے کے لئے زیادہ موزون ہین - جہانتک ہمین علم ہے جواز سود کی صرف ایک ہی صورت معتمد علماے مذہب کے نزدیک ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا جاے لیکن جمہور علما کا یہ مسلک چونکہ نہین ہے اس بنا پر محض اقتصادی اور تمدنی خرابیون کے انسداد کی غرض سے راقم مضمون کا یہ اجتہاد بہت بڑی جسارت ہے -

یہ امر مسلم ہے کہ مسلمانون کا افلاس روز بروز بڑھتا جاتا ہے - لیکن اگر تشخیص مرض کے ساتھ ہی ساتھ اُن اسباب پر بھی غور کیا جاے جن کی بنا پر یہ مرض پیدا ہوا ہے تو شائد جواز سود پر اصرار کرنے کے بجاے دوسری تدابیر اختیار کرنے کی تحریک کی جاسکے -

کلکتہ بمبئی اور دوسرے تجارتی شہرون مین مسلمانون نے تجارت کے ذریعہ سے بیشمار دولت پیدا کی لیکن جنہون نے دولت پیدا کی تھی کیا خود اُن مین سے بعض نے اور زیادہ تر اُن کے ورثہ نے عیاشی، اسراف اور کاروبار سے بے توجہی کرکے ساری کمائی گنوا دی - سود کے ذریعہ سے زیادہ سے زیادہ یہی نفع پہونچ سکتا ہے کہ جن لوگون کے پاس روپیہ ہو وہ اُس کو بڑھا سکین یا جن کے پاس روپیہ نہ ہو وہ سودی قرض لیکر کاروبار کرسکیں مگر جن کے مصارف کے لیئے اپنے بزرگون کی جمع کردہ دولت اور موروثی جائدادین کافی نہ ہون اُن کے لئے یہ ذرائع آمدنی بھی چندان مفید نہین ہوسکتے -

قوم میں کتنے افراد ایسے ہیں جنھوں نے اعلیٰ تعلیم کی بدولت سابقہ عزت سے نجات پائی اور آج بڑے بڑے مشاہرون اور آمدنیوں پر متصرف ہیں۔ مگر کیا اون مین ایسے لوگ موجود نہیں ہیں جنکی کثیر آمدنیاں بھی اُن کی روز افزون ضروریات کے لیے کفایت نہیں کرتیں۔

مسلمانوں کی فلاح کے لئے خدائے بزرگ و برتر نے جو نسخۂ اکسیر تجویز کیا تھا اسکو اگر آج بھی استعمال کیا جائے تو انشاء اللہ تعالیٰ مسلمانون کو نہ صرف افلاس بلکہ تمام امراض سے نجات مل جائے گی۔ سورۂ مومنون (پارہ ۱۸) ملاحظہ ہو:-

| | |
|---|---|
| قد افلح المومنون الذین ھم | ایمان والے اپنی مراد کو پہونچ گئے (اور) |
| عن صلاتھم خاشعون ۝ | وہ (لوگ) ہیں جو اپنی نماز میں عاجزی کرتے ہیں |
| والذین ھم عن اللغو معرضون ۝ | اور وہ جو نکمی باتوں کی طرف رُخ نہیں کرتے |
| والذین ھم للزکوۃ فاعلون ۝ | اور وہ جو زکوٰۃ دیا کرتے |
| والذین ھم لفروجھم حٰفظون ۝ | اور وہ جو اپنی شرمگاہون کی حفاظت کرتے |
| والذین ھم لامٰنٰتھم وعھدھم راعون ۝ | اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس ملحوظ رکھتے۔ |
| والذین ھم علیٰ صلوٰتھم یحافظون | اور وہ جو اپنی نمازون کے پابند ہیں۔ |
| اولٰئک ھم الوارثون ۝ الذین ھم یرثون الفردوس ھم فیھا خٰلدون ۝ | یہی لوگ آدم کے اصلی وارث ہیں جو بہشت برین کی میراث پائیں گے اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ |

اور اگر کسی کو اسمین شک ہو کلام الٰہی ہونے میں نہیں بلکہ نسخۂ اکسیر ہونے مین تو اُن لوگون کے حالات زندگی کا مشاہدہ کرکے اطمینان حاصل کرلیا جائے جو قرآنی احکام پر عملاً کاربند ہون۔ ایسے لوگ موجودہ زمانہ مین کم ضرور ملیں گے مگر ابھی خدا کا شکر ہے کہ عنقا نہیں۔

کاش ہمارے مصلحین اپنے اجتہادات پر اعتماد کرنے کے بجائے اُس خدا کے

کلام برحق پر بھروسا کریں جسکی ذات پاک پر ایمان بالغیب رکھنے کے مسلمان مدعی ہیں -

میں سالہا سال سے خود اپنے اہل خاندان اور اعزاے وطن کی روز افزون حالت زبون دیکھ دیکھ کر اس مسئلہ پر غور و خوض کرتا رہا ہوں اور بالآخر اسی نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ صرف آیات الٰہی کی رہنمائی قبول کرنے ہی میں جملہ مسلمان افراد و اقوام کی فلاح و بہبود مضمر ہے ورنہ سوائے خسارہ اور بربادی کے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا -

سود خوار افراد و اقوام کی ظاہری دولت و ثروت پر نہ جائیے - انگریزی کی مثل مشہور ہے کہ "ہر چمکتی چیز تو سونا نہیں"

بلکہ اُن کے مآل کار اور عواقب پر نظر کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ نتیجۃً وہ غریب و مفلس اُن سے فائدے میں رہتے ہیں جو خدا کا خوف کرتے اور اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلتے رہتے ہیں -

اگر آپ کو مرض قومی کی تشخیص و علاج کا شوق ہے تو برائے خدا اپنے گرد و پیش کے حالات سے چشم پوشی نہ کیجئے - قریہ قریہ میں آپ کو برباد شدہ خاندان اور تباہ حال افراد ملیں گے - آپ اِن کے خاندانی و ذاتی حالات کی تفتیش کیجئے تو انشاء اللہ ہر دفعہ تحقیق ہو جائے گا کہ بربادی کا اصلی سبب سودخواری سے اجتناب نہیں بلکہ قوانین الٰہی کی خلاف ورزی ہے - غالب نے اپنے ایک شعر میں احکام الٰہی کی کیا خوب تفسیر کی ہے -

دولت بغلط نبود از سعی پشیمان شو
کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو

رسالہ الناظر کے ماہ مارچ کے اڈیٹوریل میں[۵۱] تحریر ہے کہ گذشتہ ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ کے جلسہ میں مسئلہ سود کے متعلق طفیل احمد کے ایماء سے کوئی تحریک

---

۵۱ یہ صحیح نہیں کہ مضمون مذکور "ایڈیٹوریل" میں درج ہے -

پیش ہوئی"، تعجب ہی کہ ایسی بے بنیاد خبر بغیر تحقیق کے ایسے معزز پرچہ مین کیون شایع کی گئی۔ دران حالیکہ کانفرنس کے رزولیوشن جنوری گذشتہ مین اخبارات مین تمام وکمال شایع ہو چکے ہین سود کی تحریک نہ پیش ہوئی نہ پروگرام مین درج ہوئی نہ سبجیکٹ کمیٹی

۱۹۲۴ء کانفرنس کی طرف سے جو فہرست "رزولیوشنہاے" طبع و شایع ہوئی ہی، اسکی دفعہ (۱۰) الفاظ ذیل مین درج ہے :-

"یہ کانفرنس تجویز کرتی ہی کہ ہر ضلع مین امداد باہمی کے اصول پر تعلیمی جماعتین بنائی جائین جو کواپریٹو سوسائیٹیز ایکٹ کی ماتحت رجسٹرڈ ہون ۔ ان کی ذمہ داری محدود ہو، اور ان کا سرمایہ یا منافع محض تعلیمی معاملات پر صرف ہو"۔۔۔۔۔

کیا یہ "امداد باہمی" کی جماعتین "اور ان کا سرمایہ" اور ان کا "منافع" سود سے غیر متعلق ہون گے ؟

رزولیوشن نمبر (۱۱) اس سے بھی زائد صاف طریق الناظر مین سودخواری کی تعلیم دے رہا ہے ۔ اس کے الفاظ ملاحظہ ہون :-

"اسلامی بنک تعلیمی بلکہ ہر شعبہ زندگی کا دار و مدار بہت کچھ قوم کی اقتصادی حالت پر ہی۔ اقتصادی حالت کی درستی و ترقی کے لئے ضرورت ہے کہ صوبۂ متحدہ کے لئے ایک اسلامی کواپریٹو بنک قائم کی جائے"

اس "اسلامی بنک مین شاید سود" کی کاروبار حرام ہوگا !

دو شہادتین یہ ہوئین ۔ تیسرے شہادت متعلق آپ کے ہم مشرب دہم نوا ، خان بہادر جعفر حسین ہین ۔ ۱۶ جنوری کے ہمدم مین آپ کا ایک طویل مراسلہ مولانا عبداللہ انصاری کے نام شایع ہوا ہے جس کا عنوان نہایت جلی قلم سے "بنک کے سود کا مسئلہ" لکھا ہوا ہے۔ اس مراسلہ کے ابتدائی سطور حسب ذیل ہین :-

"۳۱ - دسمبر کے اسلامی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مین جب مسلم یونیورسٹی مین طلبہ کی دکان تجارت کو کوآپریٹو سوسائیٹی کے اصول پر قائم کرنے کا مسئلہ پیش تھا" الخ

اس مراسلہ مین اس امر کی بھی تصریح ہے کہ رزولیوشن مذکور کو مولانا عبداللہ انصاری نے جواز سود پر مبنی سمجھا اور بعض امور بنا پر اس کی مخالفت مین تقریر کی اور یہ ارشاد فرمایا کہ تا وقتیکہ مولانا شروانی جواز سود کی

میں پیش ہوئی۔ تحریک پیش ہونا درکنار۔ اس کا یہ رخ ذہن میں خیال بھی نہیں گذرا۔[۱۲]

باقی رہا سود کی وجہ سے مجھے "مستحق لعنت"[۱۳] قرار دیا گیا ہے میں اُس سے بھی بدتر الفاظ کا مستوجب ہوں۔ مگر میرے کم حیثیت۔ کم علم اور گنہگار ہونے سے نفس مضمون پر کیا اثر پڑے گا؟[۱۴] انصاف تو اس امر کا مقتضی ہے کہ اُنظر الیٰ ما قال ولا تنظر الیٰ من قال پر عمل کیا جائے اور میرے ذاتی عیوب سے چشم پوشی کی جائے۔[۱۵]

---

تائید میں فتاوی بہم نہ پہونچا لیں۔ "مسلم یونیورسٹی میں سود کا کاروبار جاری کرنا مناسب اور اچھا نہیں معلوم ہوتا" ایک طرف یہ متعدد شواہد و واقعات ہیں، اور دوسری طرف جناب کا یہ ارشاد گرامی ہے، کہ کانفرنس میں سود کا مسئلہ کسی حیثیت سے پیش ہونا تو الگ رہا، اس کا خطرہ تک جناب کے قلب مبارک پر نہیں گذرا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے، کہ "بغیر تحقیق" نہیں، "بعد تحقیق" ان دونوں دعووں میں سے "بے بنیاد" کا لفظ کس کے متعلق استعمال ہو سکتا ہے۔

۱۲ کیا یہ واقعہ نہیں، کہ مسلم کانفرنس کو جناب اسوقت سے بیشتر بھی اپنے اشاعت خیالات کا آلہ بنا چکے ہیں؟ چنانچہ ترویج سود کی تائید میں جناب نے ۲۵ جون ۱۹۲۳ء کو جو طویل لکچر دیا تھا وہ کانفرنس ہال ہی میں دیا تھا، اور [illegible] اس کی اشاعت کانفرنس ہی کے ماہوار رسالہ کانفرنس گزٹ کے ذریعے سے فرمائی تھی! اور اس طرز عمل میں آپ اپنے نقطہ نظر سے بالکل حق بجانب تھے، اس لیے کہ آپ اپنے مختلف رسائل میں ترویج سود کی انجمنیں قائم کرنے، اور مسلمان طلبہ میں سود کا رواج دینے کو تو اپنا خاص مشن قرار دے چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کانفرنس سے زیادہ محفوظ اسٹیج آپ کو اور کہاں مل سکتا تھا!

۱۳ ہذا بہتانٌ عظیم۔ حاشا وکلا، یہ لفظ نہ میں نے اپنی طرف سے استعمال کیا ہے، نہ کر سکتا ہوں، بجز اس صورت کے کہ جو شخص جواز سود و ترویج سود جیسی کھلی ہوئی معصیت شدیدہ کی جسارت کریگا، وہ حسب فرمان خداوند کریم و رسول اسلام، یقیناً "مستحق لعنت" ہوگا۔

۱۴ یقیناً اسی طرح اثر پڑے گا جس طرح آپ شاہ عبدالعزیزؒ کے علم وفضل، زہد و تقویٰ سے اپنی تائید میں اثر [illegible] ڈالنا چاہتے ہیں۔

۱۵ خدائے اسلام بیشک بہت بڑا ستار ہے، لیکن ساتھ ہی پردہ در بھی ہے۔ ؎

لطف حق با تو مواساہا کند　　چونکہ از حد بگذرد رسوا کند

بہرحال ذاتیات کو چھوڑ کر مجھ سے جن امور کے متعلق جواب طلب کیا گیا ہے انھیں واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

(۱) یہ امر ظاہر ہے کہ پہلے زمانے میں ہر قسم کے سود کے لیے دنیا بھر میں صرف ایک لفظ تھا انگریزی میں یوزری اور عربی میں ربٰوا۔ اور یہ مسلّم طور پر بنی نوع انسان کے لیے مضر سمجھا جاتا تھا۔ اور جملہ مذاہب میں ممنوع تھا۔ تجارتی اور صنعتی ترقی سے یورپ میں ایک جدید چیز انٹرسٹ کے نام سے پیدا ہوئی جو تجارت کی جان ہے اور جسے جملہ دیگر مذاہب نے مفید اور جائز قرار دیا اُسکے لیے اب تک کوئی لفظ عربی یا اردو میں نہیں ہے۔ میں نے اُسکے لیے ربح تجویز کیا ہے اگر جناب مولوی صاحب کے نزدیک یہ لفظ درست نہیں ہے تو کوئی اور لفظ تجویز فرمائیں مگر انٹرسٹ کے لیے کوئی نہ کوئی لفظ ضرور تجویز کرنا پڑے گا۔[۵۷]

(۲) جبکہ یوزری اور انٹرسٹ دو جداگانہ چیزیں ہیں تو جس قدر احادیث رسول اللہ صلعم اور آثار صحابۂ کرام جناب مولوی صاحب نے نقل فرمائے ہیں اُنکی نسبت میں عرض کروں گا کہ وہ یوزری (ربٰوا) کی ممانعت میں ہیں نہ کہ انٹرسٹ (تجارتی سود) کی ممانعت میں۔[۵۸] کیونکہ

---

آپ اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ سودی دستاویزات کی رجسٹری کر کر کے، ربح نہیں، ربٰوا، انٹرسٹ نہیں یوزری، مشتبہ و زیربحث نہیں بلکہ قطعی و متفقہ صورت سود کی ترویج میں صرف فرمانے کے بعد، مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے ایک مصلح بت کا جامہ پہنکر تشریف لاتے ہیں، اور پھر جب آپ کے کارناموں کو کسی قدر بے نقاب کیا جاتا ہے تو آپ کی جبین تحمل پر شکن پڑجاتی ہے، اور آپ اسے محض "ذاتی" کمزوری قرار دے کر اسکے متعلق مسلمانوں سے چشم پوشی و سکوت کے متوقع ہوتے ہیں! قسم ہے خدائے قدوس و بے نیاز کی، کہ آپ کی یہ جسارت و دیدہ دلیری عبرت کے قابل ہے! پبلک میں آپ کا نام لقب "مولانا" کے اضافے کے ساتھ برابر پیش ہوتا رہا، آپنے اسپر کبھی بے اطمینانی نہ ظاہر فرمائی۔ لیکن جب آپکے اصلی خط و خال کی نشاندہی کیجانے لگی تو آپ اپنی مظلومیت پر فریاد برپا کرنے لگے! خدا آپ پر رحم کرے۔

۵۷ تجارت سے جو مالی فائدہ ہوتا ہے، اُس کے لیے اردو میں ہمیشہ سے "نفع" "منافع" و "منافع تجارت" کے الفاظ موجود ہیں، اور ہر اردو داں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔

۵۸ دعویٰ بلا دلیل ہے۔ سود، خواہ اجناس و اسباب پر ہو، خواہ سیم و زر پر، بہرحال ربٰو ہے، اور ربٰو حرام قطعی۔

اُس زمانے میں تجارتی سود کا وجود بھی نہ تھا[۹] - اور تجارتی سود صاف الفاظ میں بعض آیات قرآنی کی رو سے جائز ہے[۱۰] جسکو میں نے تفصیل کے ساتھ اپنی کتابوں میں ظاہر کردیا ہے[۱۱]

(۳) جناب مولوی صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ مشکوک اور مشتبہ مواقع سے بچنا مناسب ہے، اور انٹرسٹ وغیرہ چونکہ جناب کے نزدیک مشتبہ چیزیں ہیں اس لیے اُن سے بچنا چاہیے۔ اکثر فقہا اور مجتہد علما نے ضرورت کا احساس کرکے بعض صورتوں میں ربوٰ کی بھی اجازت دیدی ہے - چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لَا رِبٰوا بَیْنَ الْمُسْلِمِ وَالْحَرْبِیِّ فِیْ دَارِ الْحَرْبِ کی بناپر ہندوستان میں جوازِ ربٰوا کا فتوےٰ دے دیا - اب یہ دوسری بات ہے کہ گذشتہ ۶۰ برس میں مسلمانوں نے اُس پر عمل نہ کرکے اپنے کو تباہی اور بربادی کے درجے پر پہونچا دیا

(۴) جناب مولوی صاحب نے ارشاد فرمایا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے صرف سود دینے کا فتوےٰ دیا ہے، جسکے معنی یہ ہیں کہ صرف سود دینے کی اجازت دی ہے[۱۲] اور لینے کی اجازت نہیں دی - حالانکہ انھوں نے اس کے برعکس ارشاد فرمایا ہے اور سود دینے میں احتیاط کرنے کی

---

[۹] ہمارے آپ کے اختلاف کا اصلی و مرکزی باعث یہی ہے - ہم مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ قرآن مجید و مجموعۂ احادیث ہر حیثیت سے کامل و مکمل ہے، یعنی اسکی تعلیمات ہر ملک اور ہر زمانے کے لیے بالکل کافی ہیں۔ آپکے خیال میں یہ ہدایت نامہ صرف جہلاے عرب کے لیے تھا، اور "عقل و علم" کی "جدید ترقیوں" نے جو صورتِ حال پیدا کردی ہے، اُسکے لیے ضرور ہے کہ کانفرنس کے پنڈال یا سب رجسٹراری کے دفتر سے، جدید احکام شایع و نافذ کیے جائیں۔ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ

[۱۰] سبحان اللہ وبحمدہ ! ابھی یہ دعویٰ کہ تجارتی سود کی مخالفت سے شریعتِ اسلام خالی ہے، اس لیے کہ "اُس زمانے میں تجارتی سود کا وجود ہی نہ تھا" اور معاً یہ ارشاد بھی، کہ "تجارتی سود، صاف الفاظ میں بعض آیات قرآنی کی رُو سے جائز ہے" ! کیا منطقی اب بھی اجتماعِ نقیضین کے محال ہونے پر مُصر رہیں گے ؟

[۱۱] جناب کی تالیف لطیف کا نام "جوازِ سود" ہے، اور سود کو ہر اُردو داں ربٰوا کے معنی میں لیتا ہے۔ گویا آپ کی گردش قلم سے کم از کم ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے، کہ آپ مطلقاً جوازِ ربٰوا کے قائل ہیں، ورنہ آپ جیسے محتاط قلم کے لیے کچھ بھی دشوار نہ تھا، کہ آپ اپنے رسالہ کا نام "جوازِ ربح" یا "جوازِ نفعِ تجارت" رکھ دیتے۔

[۱۲] گذشتہ پرچے میں سرکارِ رسالت کا فرمان صریح، اور صحابہ کرام کے اقوال مبارک اس باب میں درج ہوچکے ہیں۔ انکے مقابلہ میں کسی فقیہ یا عالم کا قول پیش کرنا کسی مسلمان کا کام نہیں ہوسکتا۔

ہدایت کی ہے[۲]۔ شاہ صاحب کے فتوے کے الفاظ یہ ہیں:۔

"سوالات بشروطیکہ در دارالحرب در روایات فقہ مذکور است ملاحظہ باید نمود چنانچہ برسخے ازاں ثبت خواہد شد۔ در ایں اقلیم آں شروط را قیاس باید کرد اگر محقق شدند پس دارالحرب قرار یافت و بحکم اذا ثبت الشئی ثبت بلوازمہ ہرگاہ دارالحرب شد ربوٰا گرفتن و دادن بہ کفرہ آنجا جائز شد زیراکہ در ہدایہ مذکور است لا ربوٰا بین المسلم والحربی فی دارالحرب و قاعدہ مقرر است کہ الاطلاق فی الروایات نفی عن تعمیہ پس ہر دو صورت اخذ و اعطا در نفی داخل شد۔ لیکن مسلمان را باید کہ در دادن سود بحربی احتیاط کند بے ضرورت نہ دہد۔" (صفحہ ۳۲ فتاوی عزیزی)

یعنی یہ کہ غیر مسلموں سے سود کا لینا اور دینا دونوں جائز ہیں مگر چاہیے کہ سود دینے میں احتیاط کرے۔

(ت) جناب مولوی صاحب کا ارشاد ہے کہ سرمایہ داری دنیا کی بدترین لعنت ہے۔ اسکی نسبت یہ عرض ہے کہ جدید آلات کے ذریعے سے انسانوں کو شکار کرنا بھی بدترین لعنت ہے لیکن اگر ملک کی دوسری قومیں جدید آلات کے ذریعے سے مسلمانوں کو شکار کرنے لگیں تو کیا مسلمانوں کا سب سے بڑا فرض یہ نہ ہوگا کہ حفاظت نوع کے لیے وہ بھی جدید آلات کا استعمال کریں[۴]؟ چنانچہ اسی بنا پر دارالحرب میں جواز سود کا فتوے دیا گیا ہے[۳]۔ اسکے علاوہ خود جناب باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔ "اَن النفس بالنفس والعین بالعین والانف بالانف والاُذن بالاُذُن

۳له یہ فتوی (بشرطیکہ نقل الفاظ میں دیانت سے کام لیا گیا ہو) آپ کے حق میں کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا۔ آپ خود ہی اس امر کے شدومد سے قائل ہیں کہ ربوٰ اور بیع دو بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ نیز یہ کہ اول الذکر کی حرمت سے آخر الذکر کی حرمت کسی طرح نہیں ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو خدا معلوم منطق کے کس قانون سے آپ جواز ربوٰا کو جواز بیع کی دلیل میں پیش کرسکتے ہیں؟

۴له سرمایہ داری کو آلات شکار پر قیاس کرنا، قیاس مع الفارق ہے۔ آلات شکار شکاری کو تباہ نہیں کرتے بخلاف اسکے نظام سرمایہ داری، خود سرمایہ داروں کو تباہ و برباد کرکے رہتا ہے۔

۵له دعوئے بلا دلیل۔ دارالحرب میں جواز سود کے جو اسباب ان فقہاء کی نظر میں آئے وہ تفصیل کے ساتھ کتب فقہ و فتاویٰ میں درج ہیں۔ ان سے رجوع کرنے کے بعد آپ کے قلم سے غالباً یہ الفاظ نہ نکلتے۔

السن بالسن والجروح قصاص"

(۶) یہ ایک حقیقت ہے کہ اس زمانے کا سب سے زیادہ کاری آلہ سرمایہ ہے۔ سرمایہ سے اہل یورپ نے ہندوستان کو فتح کیا، مصر کو مغلوب کیا، طرابلس، ٹیونس، الجزائر، ایران، اور عراق کو اپنے زیر اثر بنایا۔ اب تک [illegible] غیر سلطنتوں نے مسلمانوں کو غلام بنایا تھا مگر ہندوستان میں رعایا قوموں کے سرمایہ دار بھی مسلمانوں کو غلام بنا رہے ہیں۔ اور روپے کے زور سے مسلمانوں کا اشدھی کر رہے ہیں۔ اب خود جناب مولانا صاحب تجویز فرمائیں کہ "سرمایہ داری کی زد سے بچنے کی کیا تدبیر ہے؟"[۱۰]

(۷) اس میں شبہ نہیں کہ "سرمایہ داری دنیا کی بدترین لعنت ہے" اس لیے کہ سرمایہ جب چند افراد میں جمع ہو جاتا ہے تو اس سے غرباء کو اور کاریگروں کو غلام بنانے کا کام لیا جاتا ہے۔ سرمایہ داروں کے مقابلے میں یورپ سے ایک تحریک غرباء کو ابھارنے اور سرمایہ داروں کے چنگل سے انھیں رہا کرنے کی شروع ہوئی ہے۔ وہ انجمن ہائے امداد باہمی اور کوآپریٹو اسٹور ہیں[۱۱]۔ اس کا کام بھی بغیر تجارتی سود کے نہیں چل سکتا بلکہ اس کی بنیاد ہی تجارتی سود پر ہے۔ میں اپنے مضامین [illegible] میں مسلمانوں کو توجہ دلا رہا ہوں کہ وہ اس میں شامل ہوں کیونکہ ایک طرف تو سرمایہ دار مسلمانوں کو پیس رہے ہیں، دوسری طرف غرباء کے ابھرنے کی جو تحریک اس میں پھیل رہی ہے اگر اس میں بھی مسلمان [illegible] نہ ہوئے تو پھر انھیں کبھی بھی ذلیلگی

---

۵ بھلا اس آیت کا [illegible] تھا؟ [illegible] مبارک سے یہ آیت آپ کے مسودہ میں درج فرمادی، بہتر ہوگا انھیں سے آپ اس کے معنی و مطالب اور شانِ نزول بھی دریافت فرمالیں۔

۵ مسلمانوں کو زوال صرف اس وجہ سے ہوا کہ وہ اسلام پر ثابت قدم نہ رہے۔ سرمایہ تو سب سے بڑی لعنت دو سرمایہ دار کے لیے ہے۔ یورپ نے جس قدر دوسروں کو غلام بنایا اُس سے کہیں بڑھ کر وہ خود حرص و آز، مکر و فریب، کذب و دروغ، غلام ہو کر رہ گیا ہے۔

[۱۰] تدبیر صرف یہی ہے، کہ تا بہ امکان اس سے دور رہا جائے۔

۵ یہ اسٹور وغیرہ قائم کرنا، سب آستین میں شہد لگا کر مگس رانی کرنا ہے، ہم مسلمانوں کے نزدیک یورپ کے سرمایہ داروں اور آپ جیسے ہمدرد مصلحین کے درمیان فرق صرف اسی قدر ہے، جتنا کہ اُستاد ذوق کے ایک مشہور مطلع میں "تیر قضا"

پس جو "اسباب"[۵۱۹] تجارتی سود اور اس تحریک کا بانی کو دنیا کی بدترین لعنت قرار دیتے ہیں وہ ذرا سمجھیں اور غور کریں کہ وہ قوم کو کس طرف لیے جا رہے ہیں؟

(۸) میں نے اپنی کتابوں میں یہ عرض کیا ہے کہ ابتدا میں تجارت مسلمانوں کا بہترین ذریعۂ معاش تھی۔ آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے "تم تجارت اختیار کرو کیونکہ اس میں رزق کا ۹/۱۰ حصہ ہے"[۵۲۰] اب تجارت کے طریقوں میں تبدیلی ہوئی اور اس کے لیے تجارتی سود لازمی ہو گیا۔ جس سے بچنے کی وجہ سے مسلمانوں کے ہاتھوں سے تجارت نکل رہی ہے[۵۲۱]۔ ملازمت مسلمانوں کو اس لیے نہیں ملتی کہ اول تو اُن کے پاس تعلیم کے ذرائع نہیں۔ اور اگر پاتے ہیں تو دوسرے لوگ اُنھیں پاس نہیں آنے دیتے۔ صنعت و حرفت کا دارومدار سرمایہ پر ہے جسکو جناب مولوی صاحب لعنت قرار دیتے ہیں۔ تو اب فرمائیے کہ سات کروڑ مسلمان کس طرح زندگی کے دن پورے کریں[۵۲۲]؟

(۹) ۵۰ سال سے مسلمان قومی ترقی اور قومی حیات کے لیے مختلف تدبیریں کر رہے ہیں۔ وہ تدبیریں سب اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں لیکن اگر کسی مریض کے جسم سے مسلسل خون جاری ہو تو جب تک خون بند نہ ہو گا کوئی دوا یا غذا اس کے جسم میں قوت نہیں پیدا کر سکتی۔ جینہ یہی مثال مسلمانوں کے قومی جسم پر صادق آتی ہے۔ وہ ہزار تدبیر کریں مگر جب تک کہ

---

اور "پرتیر تنفا" کے درمیان ہے۔

۵۱۹ یہ لفظ مسودے میں یوں ہی درج تھا۔ غالباً "اصحاب" مراد ہے۔ (ایڈیٹر)

۵۲۰ ظاہر ہے کہ اس مبارک تجارت سے ہر تجارت مراد نہیں ہو سکتی، ورنہ شراب کی تجارت، نیز وہ تجارت جس میں سود کا لین دین ہو، سب کی فضیلت ماننا پڑیگی۔ جس تجارت میں رزق کا ۹/۱۰ حصہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔ اس سے مراد صرف اُس تجارت سے ہے جسکا نمونہ سرور کائنات نے قبل بعثت دکھا دیا تھا، اور جسکے مطابق متعدد صحابہ کرام عمل کرتے رہے۔

۵۲۱ دعوی بلا دلیل۔ جو مسلمان معاملت کے کھرے، بات کے پکے، زیادہ حرص سے بچنے والے، اور مصارفت میں کفایت برتنے والے ہیں، وہ آج بھی بفضل خدا تجارت پر قابض ہیں۔ ضرورت صرف اسکی ہے، کہ انکی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔

۵۲۲ جس طرح محمد بن عبداللہ (روحی فداہ)، ابوبکر بن قحافہ، عمر بن الخطاب، عثمان ابن عفان، علی ابن ابی طالب اور اُنکے ہزارہا رفقا نے زندگی بسر کی تھی۔

قدم قدم پر سود دینے دیں گے وہ ہرگز نہیں پنپ سکیں گے[۳۲ھ]۔

(۱۰) اور یہ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں[۳۳ھ] اور اس کو میں تفصیل کے ساتھ اپنی کتابوں میں دکھا چکا ہوں کہ نہ کفایت شعاری سے سود دینا بند ہوگا نہ سادگی اختیار کرنے سے۔ سود صرف اُسوقت بند ہوگا جبکہ خود مسلمان آپس میں تجارتی سود کا رواج دیں گے۔

(۱۱) میں آخر میں عرض کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے تمام ذرائع معاش بند ہو رہے ہیں اُنکے لیے صرف یہ تدبیر باقی ہے کہ جس قدر روپیہ اُن کے افراد کے پاس ہے یا وہ پیدا کریں اُس میں سے بچا کر دوسرے مسلمانوں کو معین منافع یا تجارتی سود پر دیکر اُن سے دکانیں کھلوائیں۔ کارخانے قائم کرائیں۔ اُن سے دستکاریاں سیکھیں اور ان طریقوں سے زیادہ سے زیادہ روپیہ بازاروں، منڈیوں۔ اور کارخانوں میں پہونچا دیں۔ اسی طریقے سے وہ کفایت شعار بنیں گے اور اسی طریقے سے ملک میں شرح سود گھٹے گی اور ربوا اس ملک سے نیست و نابود ہوگا[۳۵ھ]۔

(۱۲) جو تدابیر میں نے عرض کی ہیں اگر وہ صحیح نہیں ہیں تو اس سے اپنے دماغ کو گرم کرنے اور پھر غصہ کرکے مجھ پر ذاتی حملہ کرنے سے قوم کا کیا فائدہ ہوگا[۳۶ھ]۔ قوم کا تو اس میں نفع ہے کہ عزت و آبرو سے زندگی بسر کرنے کی اُسے سبیل بتائی جائے[۳۷ھ]۔

(۱۳) میرے نزدیک مسلمانوں کے لیئے زندگی بسر کرنے کے جو طریقے ہیں وہ میں نے اپنے رسالوں میں درج کیے ہیں۔ جو صاحب اُنھیں دیکھنا پسند کریں وہ میرے پاس نصف آنے کا

---

۳۲ھ الحمد للہ کہ بالآخر ایک کلمۂ حق آپ کی زبان سے بھی نکلا۔ اسلام میں سود دینا اور لینا دونوں مساوی درجہ کی معصیت ہیں۔

۳۳ھ دعوے کے بجاے دلیل پیش کرنا شاید زیادہ مفید ہوتا۔

۳۵ھ دور از کار مزعومات و مفروضات کے پیش کرنے سے تو شیخ چلی کے ساتھ منصوبہ باندھتے رہنا بہتر ہے۔

۳۶ھ یہ کیا کم فائدہ ہے، کہ قوم کے ایک حصے کو تو گرگ پر پاسبان کا دھوکا نہ ہوگا۔

۳۷ھ یہ سبیل، پوری تفصیل کے ساتھ ساڑھے تیرہ سو برس اُدھر بتائی جا چکی ہے، اور جو لوگ آج اُس عقیدے پر پختہ ہیں، الحمد للہ اُنھیں کسی جدید سبیل کی تلاش نہیں۔

ٹکٹ بھیجکر یا بیرنگ بھیجنے کی اجازت دے کر مجھ سے طلب فرمالیں۔

## طفیل احمد۔ ولایت منزل۔ علی گڈھ

۵۲ ہر مسلمان کے پاس آپ کے رسائل سے کہیں بہتر، جامع تر، صحیح تر، پاکیزہ تر، ایک صحیفہ موجود ہے جس کی جانب وہ بغیر "بیرنگ" یا "صرف آنے کے ٹکٹ" کے جھگڑے کے ہر وقت اور ہر آن رجوع کرسکتا ہے۔ آپ اپنے رسائل کی جانب دعوت دیے جائیں، آپ کا یہ خادم اسی صحیفۂ کامل کی جانب۔ ایک روز آئیگا جب انشاء اللہ ہم آپ دونوں دیکھ لیں گے، کہ دونوں میں سے کس کی دعوت سچی اور کس کی دعوت اچھی ہے۔

# صلائے تپش

دیدم ببزمے نغمہ گر رقاصۂ نو خاستہ
کافر صفت در خودسری ساحر لقب دلبری
زلفِ معنبر بر رخش، تا بانیِ لعلِ لبش
ما و شما در انجمن گردِ صنم چوں برہمن

تو ہر بو آراستہ گل در گلو پیراستہ
جانہا بجبہت سوختہ دلہا بخوں اندا ختہ
از شمع دود انگیختہ از گل شرر افراختہ
گاہے بما آمیختہ گہ با شما پرداختہ

گفتم باوے دلربا! ایں حسن و ایں شرم و حیا
گفتا کہ خاموش اے تپش بگذشت دورِ سرزنش
آں مفتیِ عالی نسب داں قاضیِ والا حسب
گوید خدا لا تاکلو، فرمایہ او پرور غم او

اے دوے چوں تو مہ لقا بیمرفہ عصمت باختہ
ساغر بگیر وے لبش با دلبرے دلخواستہ
او مصلحِ سید لقب فتوائے نو بنگاشتہ
سود و قمار و مسئلہ، فی المجلہ دانستہ

انوارِ مغرب جلوہ گر مشرق بظلمت مستتر
ملت ز ملت خوب تر، رخصت بحرمت ساختہ

تپش خورجوی

# سفرِ حجاز کی مختصر روداد

(سلسلہ الناظر ماہ اپریل سنہ ۲۳ء)

۳۰ مئی روز چہارشنبہ

رات کو کسی قدر شبنم پڑی جس سے سارا بستر تر ہو گیا، اور صبح کو خفیف سی خنکی بھی محسوس ہوئی۔ حسبِ معمول وظیفہ پڑھتا ہوا بازار گیا۔ وقت کا بازار مختصر ہے۔ گو ضروری ضرورت کی سب چیزیں ملتی ہیں۔ پچھلی منزلوں میں گرمی سے پیاس کی شدت۔ ہی تھی اس لیے آج تربوز لیکر کھایا۔ میں معدہ و جگر کے ضعف کی وجہ سے وطن میں بہت تربوز شاذ و نادر کھاتا ہوں مگر یہاں کی گرم و خشک آب و ہوا میں تربوز کا کھانا مفید ہے۔ کوئیں یہاں زیادہ اور بڑے نہیں۔ پانی کسی قدر کھاری تھا اور گراں ملا۔ وادیِ فاطمہ میں دو سے لیکر چار قرش فی ٹین پانی کی قیمت دی گئی۔ اطفان میں چھ سے آٹھ قرش تک اور یہاں آٹھ سے بارہ قرش تک۔ اس قافلے میں کم و بیش چھ ہزار اونٹ تھے، جو دو ٹکڑیوں میں آگے پیچھے روانہ ہوتے تھے۔ یعنی نصف قافلہ جب ایک پڑاؤ سے گذر جاتا تو بقیہ نصف قافلہ دوسرے روز وہاں پہونچتا۔ ہم لوگ دوسرے قافلے میں تھے۔ ہر ٹکڑی میں کچھ کوتل اونٹ بھی ہوتے تھے لیکن زائرین کی مجموعی تعداد دس ہزار سے کم نہ ہوگی۔ اور جمالوں، اُن کے سرداروں اور دیگر ہمراہیان کو ملا کر یہ سارا قافلہ تقریباً پندرہ ہزار آدمیوں پر مشتمل تھا۔ اس لیے قافلے کے دو حصوں میں منقسم ہو جانے کے باوجود بھی جب ایک حصہ پڑاؤ پر مقیم ہوتا تو وہاں ایک اچھے خاصے قصبے کے برابر آبادی ہو جاتی۔ اس سارے مجمع کو سیراب کرنے کے لیے ایک دو کنوئیں کیا کافی ہو سکتے تھے۔ کنوؤں سے متصل بڑے بڑے حوض یا تھالے بنا لیئے جاتے تھے تاکہ اونٹوں کو پانی پینے میں آسانی رہے۔ ہر وقت متعدد گراریوں پر سے بڑے بڑے چرمی ڈولوں میں پانی کھینچا جاتا تھا اور سقوں، پانی بیچنے والوں، اور غریب زائرین کا جو اپنے مقام پر پانی نہیں خرید سکتے تھے ان کنوؤں کے گرد ایک ہجوم رہتا تھا۔ سقے جو عموماً سوڈانی عرب ہوتے تھے صرف ڈول کھینچتے رہتے تھے۔ پانی بیچنے والے مرد، عورتیں اور بچے اُنھیں سے اپنی

مشکیں، مشکیزے، اور ٹین بھرواتے اور دوڑ دوڑ کر پڑاؤ والوں کے ہاتھ جا کر فروخت کرتے۔ جو لوگ اپنے مقام پر پانی کی گراں قیمت نہیں دے سکتے تھے وہ اپنے اپنے ٹین یا مشکیزے لا کر انھیں سقوں سے براہِ راست بھروا لیتے تھے۔ پانی کی قلت اور گرانی اور اُسکے حصول کی دشواریاں سب بجائے خود اگرچہ ہمت شکن ہوتیں مگر جب اُس مالک کے قدرتی حالات پر نظر کیجاتی تو شکوہ و شکایت کا کوئی موقع باقی نہ رہتا تھا - اور جب اُس نعمت عظمیٰ کی لذت کا دھیان آتا جسکے حصول کی تمنا کشاں کشاں اس انبوہ کثیر کو لیے جا رہی تھی تو بے اختیار زبان سے نکل جاتا تھا کہ

نرخ بالا کُن کہ ارزانی ہنوز

چوکیداری کی فیس ۵ قرش ادا کیے گئے اور ٹھیک دوپہر کو قافلہ روانہ ہوا۔ گرمی کی شدت میں کوئی کمی نہ تھی مگر تربوز کی بدولت پیاس کم معلوم ہوئی۔ وقت میں تھوڑے لیموں خرید لیے تھے۔ شام کو شغدف پر بیٹھے بیٹھے تھوڑا شربت بنا کے پی لیا - جس سے مزید تسکین ہوئی اور راستہ بخیر و خوبی کٹ گیا۔ منزل چھوٹی تھی اس لیے جلد پہونچ گئے۔ اور نماز عشا پڑھ کے سو گئے۔

۳۱ - مئی روز پنجشنبہ | خذیمہ یا خذیفہ کا بازار جو ذرا بلندی پر واقع ہے، پختہ ہے اگرچہ کچھ زیادہ وسیع نہیں۔ اسکے ایک جانب بہت سے کچے کنوئیں بنے ہوئے تھے۔

ان کا پانی میٹھا ہوتا تو قافلے والوں کو بہت آسانی ہوتی۔ مگر میٹھے پانی کے پختہ کنوئیں ذرا فاصلے پر تھے۔ ہمارا پڑاؤ دوسری جانب تھا۔ اور نہایت سطح زمین پر تھا۔ اور چونکہ دوسرے مقامات کی طرح دور تک کسی قسم کی بلندی، ٹیلہ یا پہاڑی نہ تھی اس لیے جگہ بہت کھلی ہوئی اور پُر فضا معلوم ہوتی تھی۔ حسب معمول وظیفہ پڑھتا ہوا بازار گیا تو دیکھا کہ بازاروں میں کھانے کی دوکانیں بھی ہیں جہاں مچھلی کا گوشت بکثرت بک رہا تھا معلوم ہوا کہ سمندر یہاں سے بہت قریب ہے۔ اور تھوڑی دیر میں تازی مچھلیاں بھی بکتی نظر آئیں۔ آفتاب بلند ہو جانے کے بعد میں قافلے سے ذرا دُور رفع حاجت کے لیے گیا تو ایک طرف ایسا نظر آیا کہ سمندر موجیں ملا رہا ہے۔ اور دُھندلے سے نشانات کشتیوں کے بھی دکھائی دیے۔ یہ خیال کر کے کہ ساحل قریب ہے اور ابھی قافلے کی روانگی میں بہت دیر ہے، میں نے چاہا کہ ساحل کی سیر کر آؤں۔ پڑاؤ پر آ کر ڈنڈا اُٹھایا اور ساتھیوں سے یہ کہہ کر کہ ساحل قریب ہے میں ذرا سیر کر کے ابھی آتا ہوں، نکل کھڑا ہوا۔ اور جس طرف سمندر کی

موجیں نظر آتی تھیں اُسی طرف روانہ ہوا۔ چلتے چلتے جب سامنے نظر کرتا تو جھلملاتا ہوا پانی دکھائی دیتا۔ اور میں سمجھا کہ ساحل کے قریب پہونچ رہا ہوں۔ اور جیسے جیسے آفتاب بلند ہوتا جاتا اور روشنی تیز ہوتی جاتی کشتیاں قریب ہوتی نظر آتیں۔ دیر تک چلنے کے بعد میں نے دیکھا کہ قافلے سے بہت دور نکل آیا ہوں اور ساحل جتنے فاصلے پر پہلے تھا اب بھی اُسی قدر دُور ہے۔ میدان میں کوئی شخص ایسا نہ نظر آیا جس سے پوچھ سکتا۔ کہیں کہیں کوئی بدو عورت بکریاں یا اونٹ چراتی ہوئی نظر آجاتی اور اُس سے میں اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں دریافت کرتا تو وہ کوئی جواب نہ دیتی۔ تا آنکہ میں چلتے چلتے تھک گیا۔ اور قافلے سے اتنی دوری ہوگئی کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں کوئی بدو تنہا دیکھ کر حملہ آور نہ ہو۔ ناچار واپس ہوا۔ مگر مُڑ مُڑ کر بار بار دیکھتا جاتا تھا اور عجیب بات تھی کہ جس جگہ پہلے سمندر کی موجیں نظر آتی تھیں وہاں اب پہاڑی دکھائی دیتی تھی۔ اپنے مقام پر پہونچکر لوگوں سے ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ ساحل یہاں سے اتنا قریب نہیں کہ دکھائی دے اور جو پانی کی سی چمک دکھائی دیتی تھی وہ دراصل ریت کے ذرے تھے جو آفتاب کی کرنوں سے جگمگا اُٹھے تھے۔ اور کشتیاں جو نظر آتی تھیں وہ دراصل کشتیاں نہ تھیں بلکہ بگولے تھے کہ ہوا پہ اُڑ رہے تھے۔

بگولہ اور سراب کی ماہیت سے تو واقفیت تھی مگر اُنکے نظارے کا کبھی موقع نہ آیا تھا۔ پہلی دفعہ قدرت کے یہ کرشمے دیکھ کر تعجب بھی ہوا اور مسرت بھی۔ منزل طویل تھی لہذا چاشت ہی کے وقت روانگی ہوگئی۔ راستے میں ابر محیط رہا۔ سمندر کے کنارے کنارے قافلہ چل رہا تھا۔ اس لیے برابر ٹھنڈی ہوا چلتی رہی۔

اس منزل میں چوروں کی کثرت ہے۔ اس کی اطلاع روانگی سے پہلے ہی کر دی گئی تھی اور شام کے قریب پھر عبدالعزیز ترجمان اور ہمارے بدوؤں نے آکر کہا کہ بہت ہوشیاری سے رہنا۔ شام ہوتے ہی جمالوں نے حرامی۔ حرامی (چور۔ چور) پکار کر چلانا شروع کیا۔ ہر بدو اپنے اپنے اونٹ کے ساتھ چلتا تھا اور ذرا ذرا دیر کے بعد پکارتا جاتا تھا۔ ہم لوگوں سے بھی تاکید کی گئی تھی کہ سوئیں نہیں اور اپنے سامان سے خبردار رہیں کہ مبادا پیچھے سے کوئی چور کچھ اُڑا نہ لیجائے۔ چونکہ سب ساتھیوں کی رقوم میرے ہینڈ بیگ میں رکھی ہوئی تھیں اس لیے مجھے احتیاط و ہوشیاری کی

تاکید مزید کی گئی تھی۔ یہ بیگ ڈبل ٹین کا تھا اور اگرچہ بمبئی سے اُسکو ساتھ لے لینے کی وجہ سے مجھے بہت کچھ آرام ملا تھا مگر وزنی ہونے کی وجہ سے شغدف میں اس کا رکھنا سخت دشوار تھا۔ شروع میں تو ایک دو دن تک بہت ہی زحمت ہوئی۔ کبھی اونٹ کی پیٹھ پر ڈوری سے کسا جاتا تھا، کبھی شغدف کے کسی کونے میں باندھا جاتا تھا۔ کئی بار اُس سے چوٹ بھی کھائی اور اس بات پر افسوس کیا کہ چمڑے کا بیگ کیوں نہ لیا۔ اس منزل میں گرمی کی تکلیف نہیں ہوئی۔ اگرچہ رات کو عموماً یہ تکلیف جاتی رہتی تھی۔ لیکن یہاں ساحلی ہوا کی وجہ سے زیادہ ٹھنڈک ملی اور باوجود جمالوں کے شور اور چوری کے خطرے کے رات گہری نیند سویا۔ اگرچہ روانگی سویرے ہوئی تھی مگر منزل اتنی طولانی تھی کہ صبح کو جب آفتاب کافی بلند ہوگیا تب کہیں جا کر رابق پہونچے۔

# نظرے خوش گذرے

علی گڈھ میگزین کا وہ دور ختم ہو گیا جب خواجہ منظور حسن صاحب ایڈیٹر تھے اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کا مضمون شائع ہوا تھا۔ جدید دور کا پہلا نمبر بابت ماہ جنوری و فروری موصول ہوا تو اُس میں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ "ڈائن کا جوگ" کے عنوان سے ایک افسانہ جو سات آٹھ برس ہوئے الناظر میں چھپا تھا بغیر کسی قسم کے حوالے کے شایع کیا گیا ہے۔ اتفاق سے صاحب مضمون نے اسی فسانے کے متعلق چند ماہ ہوئے بعض خطوط لکھے تھے جن کی وجہ سے اس مضمون کی سُرخی حافظے میں محفوظ رہ گئی۔ ہم نے الناظر کی پرانی جلد نکال کر شروع کے ایک دو صفحے ملائے تو ہو بہو وہی مضمون تھا۔ صرف کہیں کہیں الفاظ بدلے گئے تھے۔

قوم میں اس وقت جہاں اور ہر قسم کے جرائم و معاصی کا رواج عام ہوتا جاتا ہے وہاں ایک یہ بھی ہے کہ ہمارے ملک کے اہل قلم جنھیں اپنی اعلیٰ مثال سے دوسروں کی رہنمائی کرنا چاہیے تھی عجیب عجیب طریقوں پر اپنی جرائم پیشگی کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ تعلّی، خودبینی و خودنمائی سے شعرائے قدیم کا دامن بھی پاک نہ تھا۔ مگر اب یہ خیال اتنا بڑھ گیا ہے کہ مرض بن کر ہمدردانہ جدید نما معلوم

---

ہونے لگا ہے۔ ہر نوجوان جو چار شعر جوڑ سکتا ہے چاہتا ہے کہ لوگ اُسے میر و غالب، آتش و ناسخ داغ و امیر، حالی و اکبر سے کم نہ جانیں۔ اور بعض حضرات تو اہل ملک کی اس بدمذاقی سے بھی شکوہ رکھتے ہیں کہ ان اساتذۂ فن کو زمانۂ حال کے باکمال شاعر سے نسبت دی جائے۔ شاعروں کی جو حالت بیان کی گئی بعینہٖ یہی کیفیت نثر لکھنے والوں کی بھی ہوتی جاتی ہے۔ اور غالباً اسی کا تقاضا ہے کہ ایک مضمون کی نقلیں ایک ہی وقت میں متعدد اخبارات و رسائل کو بھیجی جاتی ہیں یا ایکدفعہ شایع ہو چکنے کے بعد دوبارہ اس کو چھپوانے کی ضرورت خیال کی جاتی ہے۔

الناظر میں اور شاید اُردو کے ہر رسالہ میں اس قسم کے مضامین لاعلمی سے چھپ جاتے ہیں۔ اور نے اسی پر قیاس کر کے علی گڑھ میگزین کے جدید ایڈیٹر صاحب کو اس بارے میں توجہ دلائی۔ میں نہیں جانتا کہ اُنھوں نے مسٹر عابد اللہ اختر میرٹھی سے جن کا وہ مضمون تھا کیا کہا۔ بہرحال اُن کا ایک عتاب نامہ وصول ہوا ہے جس کے چند فقرات اُنکے کمال انشا پردازی کے اعتراف میں نہیں بلکہ اس غرض سے شایع کیے جاتے ہیں کہ قومی اخلاق میں جو تغیر عظیم آہستہ آہستہ ہوا اور ہو رہا ہے اُس کا کچھ اندازہ کیا جا سکے۔ وہو ہذا:۔

> "آج آپ میرے متعلق یہ تحریر فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کے رسالہ میں سے کسی اور شخص کا مضمون اپنے نام سے شایع کر دیا (حالانکہ صرف یہ لکھا گیا تھا کہ یہ مضمون الناظر میں شایع ہو چکا ہے) یہ کس قدر شرمناک بات ہے۔ اس امر کو اچھی طرح ذہن میں رکھیے کہ آپ جیسے ادیب اور ایڈیٹر اگر دس سال تک مجھ سے استفادہ کریں تو بھی طفلِ مکتب رہیں گے۔ آپ نے جہالت کی انتہا کر دی۔ آپ جانتے ہیں کہ خود آپ کے مضامین میں میرے مضامین کے الفاظ اور فقروں کی جھلک موجود ہوتی ہے۔ اس پر آپ اس قدر جسارت کیونکر کر سکے کہ مجھ پر کسی مضمون کی چوری کا الزام لگانے کی جرأت کی"

اس پر غالباً کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ اور ہو تو مجھے افسر صاحب سے درس لینے کی مہلت دی جائے۔

---

الناظر کے قلمی معاونین میں علی گڑھ کالج کے ایک لائق و طباع گریجویٹ مسٹر اعتقاد حسین تھے

جنھوں نے عید سے ایک روز قبل عین نوجوانی کے عالم میں صرف ایک ہفتے کی علالت کے بعد اپنے وطن بریلی میں انتقال کیا - انا للہ وانا الیہ راجعون - موت کا وقت ایسا معین ہے کہ کہ اُس میں لحظہ بھر کا فرق نہیں ہوسکتا اس لیے یہ کہنا تو بالکل بے ہودہ ہے کہ ان کی موت قبل از وقت ہوئی - لیکن یہ جاننے کے بعد بھی کہ یہ حادثۂ عظیم وقت معین پر واقع ہوا ہے اُنکے اعزا و اقارب احباب و شنا سا مجبور ہیں کہ اُنکی اس قدر جلد جدائی پر مغموم ہوں - کیونکہ اُنکی ذات سے بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں -

مرحوم کے والدین اور اعزائے قریب کی توقعات کا کیا ذکر ہے اُنکی ذہانت واہلیت اور اُنکے پسندیدہ اخلاق نے ہر اُس شخص کے دل میں طرح طرح کی امیدیں پیدا کردی تھیں جس سے اُن کا تھوڑا بہت میل جول تھا -

میری اسیری کے زمانے میں وہ کچھ دنوں تک اخبار مدینہ کے ایڈیٹر رہے تھے اور اگرچہ اس بارے میں ذاتی واقفیت کا مجھ کو موقع نہیں ملا لیکن بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مدینہ اُنکی وجہ سے چمک گیا تھا - جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اخبار نویسی کے لیئے اُنکی طبیعت زیادہ موزوں تھی -

خداوند کریم اُن کی روح کو اعلیٰ علیین میں جگہ دیں - اور اُنکے والدین اور نوجوان بیوہ کو توفیق صبر عطا فرمائیں - آمین -

---

عجیب اتفاق ہے کہ جس دن احفاظ حسین مرحوم کے انتقال کی خبر ملی اُسی روز ڈاک میں یہ اطلاع موصول ہوئی کہ میرے دیرینہ مکرم مولوی محمد مسلم صاحب عظیم آبادی کی اہلیہ دو ننھے ننھے بچے چھوڑکر وفات پا گئیں - انا للہ وانا الیہ راجعون -

میں مرحومہ کے لیے دعائے بخشش ونجات اور اپنے کرم فرما کی اس مصیبت میں دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں - اللہ تعالیٰ ان معصوم بچوں کی پرورش و تربیت کی اہم ذمہ داری سے جو عورت کا مخصوص حصہ ہے اُنھیں بہ احسن وجوہ سبکدوش کریں - آمین

---

# خریداران الناظر سے خاص رعایت

الناظر بک ایجنسی کے کاروبار کو بفضلہ تعالیٰ جو کامیابی نصیب ہوئی ہے چونکہ ناظرین الناظر کا اس سے گہرا تعلق ہے اس لیے آئندہ کے لیے یہ تجویز کیا گیا ہے کہ خریداران رسالہ کے ساتھ مطبوعات ذاتی کی قیمت میں خاص رعایت کی جائے مگر یہ رعایت صرف خریداران رسالہ کے لیے ہوگی اور لازمی ہوگا کہ الناظر بک ایجنسی کو فرمائش بھیجتے وقت اپنا نمبر خریداری تحریر فرما دیا کریں

ظفر الملک

## مسلمانوں کی تہذیب

یعنی مسلمانوں کی تہذیب و ترقی کے متعلق نواب محسن الملک مرحوم کا ایک فاضلانہ لکچر قیمت ۳

دخریداران رسالہ سے ۲

## میلاد النبی

مشہور محدث حضرت ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کے اس عربی متن کا بالمقابل نہایت فصیح اردو ترجمہ قیمت ۴

خریداران رسالہ سے ۳

## الاحسان

مصنفہ مولوی احسان الدین علوی مرحوم جس میں لفظ صوفی کی تحقیق تصوف کی ابتدا و اس کی تدریجی ترقیوں کا ذکر ہے اور آخر میں تصوف کے تمام شعبوں کو اسلام سے تطبیق دی گئی ہے

قیمت ۸ خریداران رسالہ کے لیے ۵

## ڈرامہ اروس

ترتیب مولوی ... بی اے مرحوم

بالی داس کے مشہور و معروف ڈرامے کا اردو ترجمہ ... لائق مترجم نے ایک نہایت ... کیا ہے اور ... کی تاریخ اور نوعیت پر ... بحث کی اور ... اس ... سے کیا ہے قیمت عہ

دناظرین رسالہ کے لیے ۶

## ارض ...

میسوپوٹیمیا یا عراق عرب کے آثار و تاریخ مولفہ مسٹر ... عثمانیہ یونیورسٹی قیمت ۳

دخریداران رسالہ سے ۲

## دلچسپ مختصر افسانے

ایک نادان خدا پرست اور دنیا دار کی کہانی ۱

مساوات از مسٹر سلطان حیدر جوش ۱

آفتاب زمانہ ۱

دخریداران رسالہ کے لیے نصف قیمت

## افراد کا ...

جسٹس مولانا سید کرامت حسین مرحوم کا ایک قابل قدر مضمون قیمت ۳

دخریداران رسالہ کے لیے ۲

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۷۸

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# الناظر

ایڈیٹر۔ ظفر الملک علوی

| نمبر ۱۵۶ | ماہ جون سنہ ۱۹۲۴ء | جلد ۲۶ |
|---|---|---|

فہرست مضامین



الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

# رسالہ ہزار داستان لاہور

کے جون نمبر میں حسب ذیل خیالات ظاہر کیے گئے ہیں :-

**تاریخ عرب** :- اس کتاب کے اصلی مصنف ایک زبردست فرانسیسی مستشرق موسیو سیدیو ہیں۔ آپ نے عربوں کے متعلق مورخین یورپ کے انتزاء کذب کے دفعیہ میں بیس برس کی محنت شاقہ کے بعد یہ تاریخ مدون کی۔ اس میں مسلمانوں کی ترقیوں اور عربوں کے محاسن پر روشنی ڈالی ہے اور اپنے زبردست دلائل و براہین سے مخالفین کے الزام کو بالکل باطل ثابت کردیا۔ اُن عدیم النظیر کارناموں کی تفصیل بیان کی جو عربوں نے پیغمبر صلعم کی پاک تعلیم سے بہرہ اندوز ہوکر دنیا میں دکھائے۔ یہ کتاب نہایت آب و تاب سے فرانس میں شایع ہوئی اور ازبس پسند کی گئی۔

علی پاشا مبارک سابق ناظم تعلیمات مصر نے اسے عربی میں ترجمہ کیا۔ اب مولوی عبد الغفور خاں رامپوری اور مولوی محمد حلیم انصاری ردولوی نے اس عربی ترجمے کو اُردو کا لباس پہنا دیا ہے۔ کتاب $\frac{26 \times 20}{8}$ کے ۳۰۸ صفحات پر ختم ہوئی ہے (مقدمہ اور فہرست مضامین کے ۳۸ صفحات اسکے علاوہ ہیں۔) یہ ضخامت اگرچہ بادی النظر میں کوئی بڑی حیثیت نہیں رکھتی مگر مطالعہ سے معلوم ہوجاتا ہے کہ مصنف نے اس میں **اُن تمام تاریخوں کا نچوڑ بھر دیا ہے جو یورپ اور ایشیا کے کتب خانوں کی زینت ہیں۔**

ہم نے اس کتاب کو بہت پسند کیا اور ہم کارپردازان الناظر بک ایجنسی لکھنؤ کو اس مفید کتاب کی اشاعت پر مبارکباد دیتے ہیں۔

تاریخ عرب کی قیمت حسب ذیل ہے :-

قسم خاص (مجلد چرمی) معہ قسم عام (مجلد پارچہ) صہ

**خاکسار- منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# الناظر

نمبر ۱۵۶ جلد ۲۶ — ۱۰ جون سنہ ۱۹۳۴ء

## فیہ ما فیہ

(از: چلپی)

جناب طفیل احمد صاحب کی تحریک جواز سود سے متعلق (الناظر بابت مارچ ۱۹۳۴ء) نیز ہمدم (مورخہ یکم جون) میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ مذہبی حیثیت سے طالبان ہدایت کے لیے بالکل کافی ہے لیکن عقلی و تمدنی حیثیت سے ابھی چند سوالات ان سے کرنا، اور ان کے طرز استدلال کی نمایاں کمزوریاں دکھانا باقی ہیں۔ ان کا اہم ترین اور مرکزی دعویٰ یہ ہے کہ مسلمان سود نہ لینے ہی کے باعث پستی و زوال میں ہیں۔ یہ دعویٰ ہے، مگر اس پر کوئی دلیل انھوں نے قائم کی ہے؟ افسوس ہے، کہ ان کا سارا تبلیغی لٹریچر پڑھ جانے کے بعد اس دعوے پر کوئی دلیل موجود نہیں ملتی۔ محض اپنے دعوے کی تشریح و توضیح، وہ مختلف صورتوں میں مختلف عبارتوں کے ساتھ کرتے چلے گئے ہیں، لیکن کسی دلیل کے پیش کرنے کی ضرورت انھیں غالباً نہیں محسوس ہوئی۔ انکے مختلف بیانات پر یکجائی نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ اگر انھیں منطقی شکل میں مرتب کیا جائے، تو غالباً انکی تائید میں استدلال حسب ذیل قائم ہو سکے گا:-

(۱) دنیا کی جو جو اقوام سود لیتی ہیں، ترقی کر رہی ہیں،

(۲) جو قوم سود نہیں لیتی (یعنی مسلمان) ترقی بھی نہیں کر رہی ہے،

(نتیجہ) اس لیے ترقی کی علت سود خواری ہے۔

اگر یہی استدلال ہے، تو کہنا پڑتا ہے، کہ اس سے زیادہ ناقص، اس سے زیادہ ضعیف، اس سے زیادہ غلط، استدلال تصور میں بھی بمشکل آسکتا ہے۔ اس میں وہ متعدد مغالطات منطقی جمع و فراہم کر دیے گئے ہیں، جو متفرق طور پر کسی ایک دلیل میں مل سکتے ہیں۔ پہلا اہم سقم تو یہ ہے، کہ استدلال کا یہ طریق ہی سرے سے غلط ہے۔ مولف رسالہ جواز سود نے یہاں صرف یہ کیا ہے، کہ دو ہمزماں واقعات کے محض اجتماع کو علّیت کے مرادف سمجھ لیا ہے۔ ایک مثال میں انھیں ترقی اور سودخواری کیجا نظر آئی، اور دوسری مثال میں تنزل و عدم سود خواری۔ محض اس کیجائی کی بنا پر انھوں نے سودخواری کو تنزل کی علت قرار دے لیا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ صورت استدلال سرتا سر مہمل ہے۔ ورنہ استدلال ذیل کی صحت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا جو بداہتہً باطل ہے: ۔

(۱) دنیا میں جو سفید رنگ کی اقوام ہیں، وہ ترقی کر رہی ہیں۔

(۲) جو سفید رنگ کی اقوام نہیں، وہ ترقی بھی نہیں کر رہی ہیں،

(نتیجہ) لہذا سفید رنگ کا ہونا، ترقی کی علت ہے۔

یا پھر یہ استدلال: ۔

(۱) کانگریس کے اجلاس جب منعقد ہوتے ہیں، کرسمس کا زمانہ ہوتا ہے،

(۲) کانگریس کے اجلاس جب منعقد نہیں ہوتے، کرسمس کا زمانہ بھی نہیں ہوتا۔

(نتیجہ) انعقاد کانگریس، آمد کرسمس کی علت ہے۔ (یا اسکے برعکس)

غرض اسی طرح کوئی سے بھی دو غیر مربوط و غیر متعلق، مگر ہمزماں واقعے لیے جا سکتے ہیں، اور سید طفیل احمد صاحب کی اتباع میں انھیں ایک دوسرے کا علت و معلول خواہ مخواہ فرض کیا جا سکتا ہے۔

---

یہ مغالطہ طریق انتاج میں تھا، اس سے قطع نظر کر کے مقدمۂ اول میں جو دعویٰ کیا گیا ہے، کیا وہ کسی لحاظ سے، اور کسی معنی میں بھی، صحیح ہے؟ کیا دنیا کی ہر سود خوار قوم خوشحال و ترقی پذیر ہے؟ جرمنی نے تو سود خواری میں کبھی احتیاط نہ کی۔ پھر آج کیوں اُس کا بال بال قرضے میں جکڑا ہوا ہے؟ آسٹریا نے تو دل کھول کر لین دین جاری کر رکھا تھا، پھر آج کیوں اُسکے خزانۂ عامرہ میں خاک اُڑ رہی ہے؟ روس نے تو سود کھانے میں کبھی ایک لمحے کے لیے تامل نہیں کیا تھا، پھر آج کہیں اُسکی دولت قارون

کا نشان باقی ہے؟ چین، بلجیم، اسپین، پرتگال، ان میں سے کون سی قوم سود سے محترز رہی، پھر کیوں ان سب کی مالی ساکھ (انکے حاکمانہ اقتدار کے زوال کے ساتھ) اُکھڑی ہوئی ہے؟ اور تو اور، فاتح جنگ عظیم مملکتِ فرانس، اور اس سے بڑھ کر ہماری "سرکار ابد قرار دولت مدار" برطانیہ کی، جسکے رگ، ریشہ میں ایک سود خوار مہاجن کے خصوصیات موجود ہیں، کیوں روز بروز قرض سے زیر بار اور دیوالیہ پن کے متصل ہوتی جا رہی ہیں؟ اگر محض سود خواری کسی قوم کو بام ترقی پر پہونچانے کے لیے کافی ہوتی، تو آج کیوں ان سود خوار قوموں کو یہ روز بد دیکھنا پڑتا؟

---

پھر، خدا معلوم، لفظ "ترقی" کا مفہوم کیا لیا گیا ہے؟ اگر اسکے مفہوم میں عزت و حکومت بھی داخل ہیں، تو یہودیوں کی بابت کیا ارشاد ہوگا، جو دنیا کی سب سے بڑی سود خوار قوم ہو کر ساتھ ہی سب سے زیادہ ذلیل و خوار بھی ہیں؟ ہندوستان کے پیشہ ور ساہوکاروں، رستوگیوں، اور مہاجنوں کی بابت کیا رائے قائم کی جائیگی، جو باینہمہ فراوانیٔ زر و افراطِ دولت، اپنے ہی ملک میں، دوسری قوموں کے مقابلے میں عزت و حکومت، و قوت و وجاہت سے یکسر محروم ہیں؟ اگر "ترقی" سے محض مالی ترقی اور آسودہ حالی مراد لی جائے، تو بھی واقعات و مشاہدات اس کی تمامتر تردید کر رہے ہیں۔ سید صاحب نے مسلمانوں کے اتلاف جائداد سے متعلق اعداد و معلومات فراہم کرنے میں کچھ وقت صرف فرمایا ہے، مگر کیا اُنھوں نے اس تحقیقات کے لیے بھی کبھی وقت نکالنا ضروری سمجھا، کہ بڑے سے بڑے سرمایہ دار اشخاص کیوں تباہ و برباد ہو جاتے ہیں؟ بڑے بڑے بنک کس طرح ٹوٹ جاتے ہیں؟ بڑی بڑی کمپنیاں اور تجارتی کوٹھیاں کس کثرت سے بیٹھ جاتی ہیں؟ بڑے بڑے مہاجن کس تعداد میں بالآخر دیوالیے ہو جاتے ہیں؟ سود خواری اگر بجاے خود فلاح مالی کی ضمانت کے لیے کافی ہوتی، تو دنیا میں اس طرح کے بکثرت واقعات، آخر شب و روز کیوں پیش آتے رہتے ہیں؟

---

"ترقی کے مفہوم پر ذرا اور غور کیجیے۔ فرض کیجیے، ایک شخص کی آنکھیں، پیشانی، لب، دہن، رخسار، اپنی اپنی ساخت میں خوبصورت و خوشنما ہیں۔ لیکن ناک بہت ہی بھدی، بد قطع اور بیڈول واقع ہوئی ہے، آپ اس چہرے کو حسین کہیں گے؟ ہرگز نہیں، اس لیے کہ مجموعہ کے بعض اجزا کا

اس قدر ناقص ہونا "حسن" کے منافی ہے۔ ایک اور شخص ہے، جس کا معدہ درست و قوی ہے، ہاتھ پیروں میں بھی قوت و توانائی ہے، لیکن قلب نہایت کمزور واقع ہوا ہے، آپ ایسے شخص کو صحیح و تندرست کہیں گے؟ قطعاً نہیں، اسلئے کہ "صحت" کے تخیل میں کل اعضاء کی فعلیت طبعی داخل ہے۔ ٹھیک اسی طرح، اب اگر کوئی قوم ایسی ہے، جسکے پاس روپئے کی فراوانی ہے، سامانِ راحت کی افراط ہے، دنیا کے بازار میں سب سے زیادہ مانگ اُسی کی مصنوعات کی ہے، بڑے بڑے بندرگاہ اُسکے قبضے میں ہیں، لیکن دوسری طرف وہ قوم شرافت کے اعلیٰ اخلاق سے محروم ہے، زیر دستوں اور کمزوروں پر رحم کرنا نہیں جانتی، اور اپنے اغراض کے سامنے حق و ناحق کے امتیاز کو نظر انداز کر دیتی ہے، تو ایسی قوم کو، یعنی جس کا مادی پہلو روشن، اور اخلاقی و روحانی پہلو تاریک ہو، ترقی یافتہ کہنا صحیح ہوگا؟ پھر، کیا آج جن "ترقی یافتہ" قوموں کی نظیر پیش کرکے ہمیں سود خواری کی ترغیب دی جا رہی ہے، اُن کا بجنسہ یہی حال نہیں؟

---

اسکو بھی جانے دیجئے۔ مخالف کہہ سکتا ہے کہ "تم نے 'ترقی' کا بہت بلند معیار رکھا۔ صرف مادی ترقی کو پیش نظر رکھنا چاہیے"۔ بہتر ہے، ہم بھی ترقی کے معیار کو گھٹا کر اس سے مراد صرف مادی ترقی لیتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے، کہ سود خوار قوموں کی دولت کے فوری اُتار چڑھاؤ اور اُسکے اثرات کا آپ نے کبھی اندازہ کیا ہے؟ نہیں کیا ہے، تو اب چند ہفتوں تک انگلستان کے کسی روزانہ اخبار کے مطالعہ کے بعد کیجیے۔ آج ایک شخص کی ساکھ سارے ساہوکارہ میں بنی ہوئی ہے، کل اُس شخص کو چند روپئے بھی قرض دینے پر کوئی آمادہ نہیں۔ صبح کو ایک شخص لاکھوں کے تجارتی حصے ٹیلیفون پر خرید رہا ہے، شام کو اس فکر میں مبتلا ہے کہ صبح کے ناشتے تک کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ ابھی ایک شخص کو ہم نے ایک بہت بڑے بنک کے منیجنگ ڈائرکٹر کی حیثیت سے دیکھا تھا، پلٹ کر جو دیکھتے ہیں، تو وہی حضرت عدالت دیوانی میں مدعا علیہ کی حیثیت سے کھڑے ہیں۔ غرض ثبات و پائداری جس شے کا نام ہے، اُسے دولت و ثروت کے سلسلے میں "ترقی" یافتہ یورپ نے بالکل اسم بے مسمیٰ کر دیا ہے۔ پھر اسی پر بس نہیں، بلکہ اس صورت حال سے لازمی طور پر قلوب میں رشک و حسد، مقابلہ و مسابقہ کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، اور طبائع میں خیانت و سرقہ، تذلیس و غبن، جعل و استحصال

بالجبر، وغیرہ جرائم کثیرہ کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ عدالتوں کی رونق، وکیلوں کی گرم بازاری، اور جیلخانوں کی آبادی میں ہر سال اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ بسا اوقات، فطرت اس سے بھی زائد سخت سزائیں، کبھی قتل، اقدام قتل، اور خودکشی کی صورت میں، اور کبھی دیوانگی، جنون، اور دق وسِل کی صورت میں نازل کرتی ہے، اور سودخوارانہ "ترقی" کے برکات سے قبرستان، شفاخانے، پاگل خانے، سب اپنی اپنی جگہ پر پوری طرح مستفید ہوتے ہیں۔

کیا یہی وہ مبارک اور خوش آیند ترقی ہے جس کی جانب امتِ اسلامیہ کو دعوت دی جا رہی ہے؟

---

اسی طرح استدلال بالا کا مقدمۂ ثانی (جسے اصطلاح منطق میں صغریٰ کہیں گے) بھی ایک غلط مشاہدے کی غمازی کر رہا ہے۔ "سود نہ لینے والے مسلمان ہر جگہ پستی و تنزل کی حالت میں ہیں" یہ دعویٰ صحیح نہیں۔ افغانستان کے مسلمان سود سے اسی قدر محترز ہیں، جتنے ہندوستان اور دوسری جگہوں کے مسلمان ہیں، باایں ہمہ وہ سید صاحب کے معیار کے مطابق اچھی خاصی رفتار سے ترقی کر رہے ہیں۔ سودخواری کے لحاظ سے ترکی جہاں آج سے دس برس پیشتر تھی وہیں آج بھی ہے، باایں ہمہ مصطفیٰ کمال کے زیرِ سیادت، ترک، حسب معیار سید صاحب، شاہراہِ ترقی پر گامزن ہیں۔ غرض مسلمانانِ عالم کے حالات کا اگر صحیح مطالعہ کیا جائے، تو صاف نظر آئے گا، کہ انکی ترقی و تنزل کو سود کے لینے نہ لینے سے مطلق واسطہ نہیں، بلکہ وہ تمامتر دوسرے ہی اسباب کے ماتحت ہے۔

---

ایک اور بڑا اہم مغالطہ جو سید صاحب کے تمام مضامین ورسائل میں پیوست کیے ہوئے ہے، یہاں ذرا اسے بھی کھول دینا ہے۔ ان کا دعویٰ جوازِ ربح کا ہے نہ کہ جوازِ ربوا کا۔ وہ جس شے کی ترویج کا مبلغ اپنے تئیں ظاہر کرتے ہیں، وہ سودِ تجارت ہے، نہ کہ سود مطلق۔ لیکن جہاں کہیں وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں کچھ بھی واقعات واعداد پیش کرنے لگتے ہیں، وہاں ربح وربوا، انٹرسٹ اور یوژری، سود تجارتی اور سود مہاجنی کی تفریق کو بالکل نظرانداز کر جاتے ہیں، اور ان خاندانوں کی مثالیں پیش کرنے لگتے ہیں، جو ربح سے نہیں، ربوا سے، سود تجارتی سے نہیں، سود مہاجنی سے محترز رہ کر (بہ قول انکے) تباہ وبرباد ہوگئے! یہ کیسا عظیم الشان ظلم ہے، کہ دعوے تو نقصاناتِ ترکِ ربح کا

کیا جائے، اور اُسکی تائید و تمثیل کے وقت ایک بالکل مختلف و جداگانہ شے یعنی نقصانات ترکِ ربوٰا سے استناد کیا جائے!

جناب سید صاحب احکام منقولی سے غالباً غیر متاثر رہتے ہیں، بہتر ہوگا، کہ دلائل معقولی کی روشنی میں وہ اپنے خیالات پر نظرثانی فرمائیں۔ امید ہے، کہ ان کا باطل ہونا ان پر روشن ہو کر رہے گا۔

---

سیر و سفر، تمدنی زندگی کا ایک اہم عنصر ہے۔ ہر سفید نام "پردیسی" جس کی جیب ریل اور جہاز کے کرایہ سے بارور ہوتی ہے، سیہ فام "دیسیوں" کے وطن کی زیارت پر حریص ہوتا ہے، اور اگر "بالفعل" ممکن نہیں، تو کم از کم "بالقوۃ" تو عجائب زار مشرق کے ایک محقق سیاح کی حیثیت بہرحال رکھتا ہے

---

اسلام بھی سفر و سیاحت کا حامی ہے۔ قرآن میں بعض گروہوں کو مخاطب کرکے سفر و سیاحت کی بار بار تاکید آئی ہے۔ البتہ اسلام Pleasure trips کا حامی نہیں۔ اس نے مقصدِ سفر یہ نہیں بتایا ہے، کہ "جنتِ نگاہ" و "فردوس گوش" کی طلب میں خدا کی دی ہوئی دولت برباد کر دی جائے پست و محکوم اقوام کے درمیان گھوم پھر کر تہذیب و شائستگی کی جنس گراں کی دلالی کی جائے، یا یہ کہ "تاریک" اقطاع عالم کو اسراف، قماربازی، مے نوشی و حرام کاری کے انوار سے منور کرکے دنیا کے سرمایۂ طغیان و عدوان، کفران و خسران میں اضافہ کیا جائے۔ بلکہ مقصد سفر یہ بتایا ہے، کہ منکروں کے انجام سے عبرت حاصل کرو، گمراہوں کی کج روی و بداعمالی کا نظارہ کرو، اور اُنکے پاداشِ عمل، کیفرِ کردار، و سوء عاقبت کو سوچو، دیکھو اور درس بصیرت حاصل کرو!

قل سیروا فی الارض ثم انظروا کیف کان عاقبۃ المکذبین (انعام - ع ۱)
قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ المجرمین (نمل - ع ۶)
نیز سورہ روم و عنکبوت وغیرہ

---

آپ اس ارشاد کی تعمیل میں غالباً سفر دہلی کا قصد فرمائیں، کہ وہاں چپے چپے پر آثار عظمت کے ڈھیر، اقبال گذشتہ کے سنسان کھنڈر، اور صحبت شب کی بجھی ہوئی شمعیں، عبرت و بصیرت کا دعظ

خاموش سناتی ہوئی ملیں گی۔ لیکن آیئے، ہم آپ کو ایسے لالہ زار عبرت کا پتہ دیں جسکے تئیں آپ دہلی کے اُجڑے ہوے ویرانے کی جانب رخ کرنا بھی گوارا نہیں فرماسکتے۔ مُردہ قوم کے اس مُردہ پایۂ تخت کو چھوڑیے، جسکی سب سے بڑی دولت، اسکے چند بوسیدہ و شکستہ قبرستان ہیں۔ زندہ اقوام کے زندہ مراکز سکوت پر توجہ فرمایئے۔ جہاں شب و روز جسم کے نہیں، روح کے مزارات تیار ہوتے رہتے ہیں، جہاں صبح و شام انسان کے اعضا و جوارح مادی کا نہیں، نیکی و شرافت، پاکیزگی و انسانیت کا جنازہ اُٹھتا رہتا ہے، اور جہاں خزاں و بہار کی ہر فصل میں، سرما و گرما کے ہر موسم میں طلوع و غروب کے ہر دو رسے میں، شمس و قمر کی ہر گردش میں، حیا و غیرت، توکل و قناعت، عصمت و عفت، کی تکفین و تدفین اہتمام خاص کے ساتھ عمل میں آتی رہتی ہے۔ آپ بزرگانِ دہلی کے مزارات پر فاتحہ پڑھنے کے لیے جا رہے ہیں، لیکن خدارا لندن کی عدالتوں میں، مجالس سیاسی میں، دفاتر سرکاری میں، حق و صداقت، ایمان و دیانت، صدق و امانت، حریت و مساوات، کی فاتحہ خوانی سے تو چلتے فرصت کرتے جایئے۔ آپ کا دل بیگمات دہلی کی بدنصیبیوں کے تصور سے بھر آتا ہے لیکن بلللہ ذرا پیرس کے ہوٹلوں، پارکوں، ناچ گھروں، تھیٹروں، تماشا گاہوں، عشرتکدوں، بلکہ اچھے اچھے شریف و معزز گھرانوں کا تو ایک سرسری جائزہ لیتے چلیے، کہ انکے اندر حد شمار و بیان سے خارج کتنی عصمتیں مدفون ہیں۔ آپ ہمایوں و شاہجہاں، دارا و ظفر پر ماتم کے لیے بیقرار ہو رہے ہیں، لیکن برلے خدا نیویارک کے ایک ایک بینک پر، ایک ایک کمپنی پر، ایک ایک دوکان پر، ایک ایک کارخانے پر۔ ایک ایک ساہوکارے پر، ایک ایک صرّاف خانے پر تو اشک بہاتے چلیے، کہ ان میں سے ہر ایک حرص و طمع، ظلم و غضب، سود خواری و رشوت ستانی، مکر و فریب، قماربازی و میخواری کی کتنی مہیب و عظیم الشان یادگار، اور پُرحسرت مزار کی حیثیت رکھتا ہے!

---

پھر کیا آپ بجائے دہلی کے مصر کا انتخاب فرمائیں گے؟ بیشک یہاں فرعون کی نعش کی زیارت ہوگی، جس نے ہزارہا سال ہوے تخت شاہنشاہی پر بیٹھ کر خدائی کا دعوی کیا تھا، اور بنی اسرائیل کو طرح طرح کے آزار پہونچائے تھے؟ لیکن ازراہ عنایت، ذرا اور ہمت کر کے سفید رنگ کی آبادی کے حدود کے اندر داخل ہو جایئے۔ ایک نہیں، ہزارہا؛ مردہ نہیں، زندہ، ڈوبی

ہوئی لاش کی صورت میں نہیں، اچھے خاصے چلتے پھرتے، اور باساماں نہیں بے ساماں، فرعون آپ کو قدم قدم پر ملیں گے۔ جنکے حلق و دہن سے نہیں، پیرہنِ موسیت صدائے اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی بلند ہو رہی ہوگی۔ جنکی فرعونیت عقلی و ذہنی، اکیلے ہارونؑ و موسیٰؑ نہیں، جملہ انبیاء و رسل، جمیع مذاہب و شرائع، سارے روحانیت و حقانیت کے خلاف جنگ و جدل، رد و قدح، مقابلہ و مقاتلہ تضحیک و استخفاف کے لیے آمادہ ملیگی، اور جو ایک قوم بنی اسرائیل ہی نہیں، بلکہ مصر و سوڈان، طرابلس و زنجبار، عراق و عرب، فلسطین و شام، ایران و ترکستان، افغانستان و بلوچستان، برما و تبت، چین و ہندوستان، غرض اپنے کو چھوڑ کر باقی ساری انسانی آبادی سے ناصیۂ آزادی کو اپنے نشان غلامی سے داغدار کرنے پر سرگرم کار، اور بجائے خدائے لاشریک لہ کی عبادت و پرستش کے ساری خدائی کے سر اپنی بارگاہِ قوت و اجلال پر خم کرانے کی دُھن میں مست و سرشار نظر آئیں گے!

---

پس درس عبرت و بصیرت کے لیے جو بہترین مدرسہ اسوقت سطح ارض پر ہو سکتا ہے، وہ عشرت آباد یورپ ہے۔ اور جو شخص قلب سلیم، دیدہ بینا، و گوش شنوا رکھے، انعامات الہی سے بہرہ مند ہو، اور پھر زادِ سفر سے بھی محروم نہ ہو، اُسپر اس گلستان فرنگ کی گلگشت ایک فریضۂ مذہبی کا حکم رکھتی ہے۔ کون گلستاں؟ وہ جس کی شان میں اسی قفس کے ایک آزاد شدہ بلبل نے کہا ہے ؎

گلستانے لالہ زارِ عبرتے چوں گُلِ کاغذ سرابِ نکہتے

---

قاضی عبد الغفار بی اے مرادآبادی (جو ایک زمانے میں مولانا محمد علی کے دست و بازو رہ چکے ہیں) یقیناً ساری قوم کی جانب سے تشکر و تہنیت کے مستحق ہیں کہ کم از کم اُنھوں نے اس فرض کفایہ کو ادا کر دیا۔ یاد ہوگا، کہ سنہ ۲۱ء میں "سرکار معدلت مدار" نے جس وفد خلافت کو لندن میں باضابطہ دعوت دی تھی، اور جو سر آغا خاں، سید حسن امام، اور سیٹھ چھوٹانی پر مشتمل تھا، اُسکے سکرٹری قاضی صاحب موصوف تھے۔ فرنگستان کا سفر صدہا مسلمان نوجوان کر چکے ہیں، متعدد اشخاص اپنے مشاہدات و تجربات سے بھی اپنے ابنائے وطن کو بہرہ اندوز فرما چکے ہیں، لیکن قاضی صاحب کا سفر سب سے نرالا، اور اپنی نوعیت میں بالکل پہلا تھا۔ اُنھوں نے وہی دیکھا، جو دیکھنا چاہیے تھا،

وہی سنا جو سننا چاہیے تھا، وہی محسوس کیا جو محسوس کرنا چاہیے تھا؛ اور بالآخر اس کا اظہار بھی ٹھیک انھیں الفاظ میں کیا، جن میں کرنا چاہیے تھا۔

"نقش فرنگ" انکے محسوسات و مشاہدات کے مجموعۂ اوراق کا نہایت صحیح و موزوں نام ہے۔ یہ خشک واقعات سفر کا روزنامچہ نہیں، جہازوں کے کرایہ، ہوٹلوں کی فہرست، مسافروں کے ٹھہرنے کے مقامات، اس قسم کے معلومات ٹامس کک کے دفتر سے بآسانی فراہم ہو سکتے ہیں، اور معلوم ہے کہ قاضی صاحب اس کمپنی کے تنخواہ دار یا اعزازی کسی قسم کے بھی ایجنٹ نہیں۔ انکی کتاب ایک آئینہ ہے، جسکے ہر ہر صفحے میں فرنگیوں کی ملکی و معاشری، دونوں زندگیوں کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتی ہے، ایک نگارخانہ ہے، جس میں ڈرائنگ روم (کمرۂ ملاقات) بیڈروم (خوابگاہ) آفس (کمرۂ دفتر) سب کے مرقعے، بہ کمال حسن و جمال اپنی اپنی جگہ پر آویزاں ملتے ہیں۔ بہ لحاظِ واقعیت، مورخین مغرب کی تمام معاصرانہ تاریخوں سے صحیح تر، بلحاظ جامعیتِ معلومات، تمام مغربی سیاحت ناموں سے مفید تر، اور پھر حسن زبان و لطف بیان کے لحاظ سے اس درجہ دلآویز، کہ کہیں سے کوئی صفحہ کھول لیجیے، بغیر کتاب ختم کیے دل بیقرار رہے گا۔ قاضی صاحب اب تک محض اخبار نویس یا مہاقی تھے، بحیثیت ادیب و مصنف کے یہ غالباً انکی سعی اول ہے، لیکن جب نقش اول کہنہ مشق لکھنے والوں کے لیے باعث رشک ہے، تو نقش ثانی و ثالث یقیناً انھیں محسود بنا کر رہے گا

ایں سعادت بزور بازو نیست - الخ

---

بارگاہ حسن و ناز کے ابتدائی حدود، بمبئی میں جہاز پر قدم رکھتے ہی شروع ہو جاتے ہیں - ذرا دیکھنا، نقش فرنگ کا یہ نقاش معانی، کس حسن و لطافت کے ساتھ ناظرین کے سامنے اس متحرک پرستان کا ایک دلفریب نظارہ پیش کرتا ہے:—

"کرشموں اور تجلیوں کا وقت ہمیشہ سے وہی ہے، جب سورج کی روشنی باقی نہ رہے۔ یوں تو جہاز مغرب کے بعد ہی بجلی کی روشنی سے بقعۂ نور بنا دیا جاتا ہے، مگر پھر بھی عرشے کے بہت سے کونے تاریک رہتے ہیں! جب بجلی کی روشنی میں باریک ریشم کے اندر سفید جسم جھلک جھلکیں،

اور کُھلے ہوئے سینوں پر جواہرات اپنی دمک دکھا چکیں، تو پھر تاریک گوشوں کا سکون کسقدر عزیز ہوتا ہے! شب کے دسترخوان پر جہاز کی ساری پونجی سفید کھال، باریک کپڑے، خوبصورت بال، درخشاں جواہرات، ان سب کی ڈھیریاں لگی ہوتی ہیں، ہر کرسی ایک چھوٹی سی دوکان ہوتی ہے، اور اُس دوکان پر ہر قسم کی جنس رکھی ہوتی ہے۔ ایک نیکبخت کو روزہ دیکھتا تھا، کہ وہ ہر وقت اپنے کُھلے ہوئے سینے کو نہایت باریک جالی کے بالشت بھر ٹکڑے سے چھپانے کی کوشش فرماتی تھیں، مگر وہ جالی کا ٹکڑا ہر دفعہ انکے شانوں سے پھسل کر نیچے گرنے پر اصرار کرتا تھا۔ بس برابر بیٹھنے والے مرد کا اخلاقی فرض ہوتا تھا، کہ وہ اس ٹکڑے کو اُٹھا لے، اور اُنکے سڈول شانوں پر ڈال دے" (ص۱۱)

---

ایک خضرِ راہ کی معیت میں آپ یورپ تک پہونچ چکے ہیں، تو آئیے، عروس البلاد پیرس کی معاشرت کی بھی ایک جھلک دیکھتے چلیں:-

"یہ مقام رسم و رواج کی آزادیوں کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے۔ ایک ایشیا نژاد جب سورج کی روشنی میں مردوں اور عورتوں کی بے تکلفیوں کو سرِ راہ دیکھتا ہے، تو ایک سرسری نظر کے بعد اُس کا دل اُس سے پوچھتا ہے، کہ اگر بداخلاقیاں اور عیش پرستیاں قوموں کی تباہی کا باعث ہوتی ہیں، تو پھر یورپ کیوں زندہ ہے؟ ..... تھیٹروں اور ناچ گھروں میں جانے کی زحمت کیوں گوارا کیجیے۔ شب کو سرِ راہ رقص کی محفلیں بھی ہوتی ہیں، ایک دو نہیں، سارے شہر میں سیکڑوں۔ ان میں رقاصہ کا ہلکا ریشم کا لباس بھی اُسکے جسم صندلیں سے بغاوت کرتا ہے۔ اور پھر گویا ملک کا کوئی قانون نہیں، جو قدرت کی ان بیٹیوں پر عائد ہو سکے۔ لباس کا ہر ٹکڑا سوئی کے ٹانکوں سے جھگڑا کرتا ہے۔ موزوں کی باریکی اور جسم کی رنگت میں تمیز کرنا ممکن نہیں۔ لباس کی تیاری میں اگر کفایت شعاری یوں ہی بڑھتی رہی، تو عجب نہیں، کہ یورپ کی صنفِ نازک پھر ایک دفعہ فطرت کے اُس لباس سے آراستہ نظر آئے، جبکا نہیں اُلٹا سیدھا" (ص۹۲)

---

یہ نمونہ "معاشرت" کا تھا۔ "سیاست" کا نظارہ اس سے کہیں زائد دلکش و سبق آموز ہے۔ اور

جس قلم نے یورپ کی خانگی زندگی کی، اس صحت و صفائی کے ساتھ نقاشی کی ہے، اُس نے اسکی ملکی زندگی کے مرقع کو کہیں زائد حیرت انگیز صورت میں پیش کیا ہے۔ اُردو میں غالباً یہ پہلی، اور نہایت کامیاب کوشش ہے، جسکے ذریعے سے طلسم زارِ فرنگ کی اندرونی اسرار کی جھلک اہلِ مشرق کو دکھائی گئی ہے۔ پورا لطف اصل کتاب ہی کے مطالعے سے آسکتا ہے۔ کتاب دارالاشاعت، پنجاب، لاہور سے عمہ میں مل جائے گی۔

---

# کلام عزیز

خودکشی غم میں کوئی بات بھی ہے		ہمت اے دل۔ اندھیری رات بھی ہے
یوں نہ ظالم مٹا کہ اس دل میں		میری اور تیری کائنات بھی ہے
میری افسردگی کے ہیں اسباب		تم خفا ہو تو کوئی بات بھی ہے
واعظوں کو خبر نہیں شاید		رندِ صد شیوہ مستِ ذات بھی ہے
نیند آجائے اے فلک دم بھر		تیری گردش میں ایسی رات بھی ہے
موت ہے گر حیات کو لازم		موت کے واسطے حیات بھی ہے

جادۂ عشق ہے عزیز عزیز
مر سکو گر تو ایک بات بھی ہے

عزیز لکھنوی

# انبیاے بنی اسرائیل

راقم الحروف نے حال میں ایک مختصر کتاب "انبیاے بنی اسرائیل کے احوال میں تالیف کی ہے اُس کا دیباچہ الناظر کی نذر کیا جاتا ہے۔

---

عربستان کی عصیاں آلود سرزمین پر کفر و سیہ مستی کی وہ دھواں دھار گھٹا چھائی تھی کہ تمام عالم تیرہ و تار ہو رہا تھا۔ ملتِ ابراہیمی کا چراغ عرصہ ہوا کہ گُل ہو چکا تھا۔ شعلۂ طُور کی تجلی زمانہ گذرا کہ تہ خاک ہو چکی تھی۔ اور اعجازِ عیسوی کا فانوس مدت سے گرد و غبار کے دامن میں روپوش تھا۔ یکایک رحمت حق کی بجلی چمکی، اور ایسا حیرت انگیز نور عالم افروز وجود میں آیا کہ شرق سے غرب اور عرش سے فرش تک سارا جہان دمکنے لگا اور حجاز کا نافرمان ریگستان سجدہ گاہ خلائق بنگیا۔

وہ نور کامل ایک کرشمۂ قدرت تھا جس کا نہ کوئی مشابہ ہے نہ مماثل۔ ایک جاہل اور غیر متمدن قوم میں پیدا ہوا اور ایک صنمکدے کے مجاروں میں پرورش پائی۔ نہ علوم و فنون کا برادران وطن میں چرچا تھا کہ اُنکے فیض صحبت سے خیالات پر صیقل ہوتی اور نہ دولت و سامان معیشت سے فراغت تھی کہ سیر و سیاحت کے مشاہدات سے دماغ میں روشنی آتی۔ اُسکے قبیلے میں نہ تو کوئی بادشاہ ہوا تھا کہ اُسکے نقش قدم پر چلنے کی آرزو دل میں ہوتی۔ لیکن ایک عجیب و غریب روحانی قوت اُسکے صدر مبارک میں ودیعت تھی جو غار حرا کی خود ساختہ درس گاہ میں چمکا اُٹھی۔ اور اُسکے پند و نصائح میں وہ برق تاثیر پیدا ہوئی کہ قیصر و کسریٰ کے ایوان لرزنے لگے اور دنیا کی تاریخ کا تاریک ورق اُلٹ گیا۔

جبکہ اُس مہر منور پر تصدق ہونے والے ستارے نان شبینہ کو محتاج تھے، نہ جانبازوں کے قبضے میں تلوار تھی اور نہ جاں نثاروں کو کفن کی آس۔ اُنکو یہ مژدۂ جاں فزا سنایا گیا: "اللہ تم کو روے زمین پر خلیفہ بنائے گا"۔ سلطنت و حکومت کا اُنھوں نے کبھی خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ مگر اپنے نفوس کو بیچکر جنت خریدنے کے لیے تیار ہوگئے۔ اُسی وقت یہ بیش بہا نکتہ بھی ذہن نشیں کیا گیا کہ "اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت نہ بدلے"۔ اور وہ سوختگان عشق تعمیل

ارشاد کے لیے اس قدر غم ہوے کہ حالت کا کیا ذکر ہے صورت بھی بدل گئی۔ تصرف حق نے حمایت کی اور وعدۂ ایزدی پورا ہوا۔ لیکن افسوس ہے کہ شمع عنبری اور خواب مخمل کے کاشانۂ صد نعمت میں یہ وعید فراموش ہوگئی کہ "اللہ مالک الملک ہے جسکو چاہتا ہے سلطنت عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے"

سرچشمۂ نور نے اپنے تشنہ دہنوں کو اُمم سابقہ کی سرگذشت بار بار سنائی تھی اور بنی اسرائیل کی عبرتناک داستان بہ تکرار بیان فرماکر تلقین کیا تھا کہ "غفلت و ناشکری تباہی کا پیش خیمہ ہے" متواتر ارشاد ہوا تھا کہ "بنی اسرائیل! اُن نعمتوں کو یاد کرو جو تمھارے حال پر تھیں" اور اس سے مقصود شمع ہدایت کے پروانوں کو سمجھانا تھا کہ کبھی بادشاہ دوجہان اولادِ یعقوب پر بھی ایسا ہی مہربان تھا جیسا کہ آج تم پر ہے۔ جس طرح تم کو خلافت ارض کی نوید سنائی جاتی ہے اُسی طرح اُن سے بھی کسی دن ارض مقدس کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اگرچہ ظاہری سامان کچھ موجود نہ تھا مگر وہ اقرار حرف بحرف پورا ہوا۔ اسی طرح جو بشارت تمکو دی جاتی ہے اُس میں بھی سرمو فرق نہ ہوگا۔ لیکن نشۂ دولت کی مستی میں تم بنی اسرائیل کی تقلید نہ کرنا ورنہ تمکو بھی وہی روز بد دیکھنا نصیب ہوگا جو تمھارے بنی اعمام کو پیش آیا۔ وہ حکومت پاکر ناشکری کی معصیت میں گرفتار ہوے۔ پہلے تو اُن کو معمولی فہمایش کی گئی جب ہوش نہ آیا تو وہ سخت مصائب میں گرفتار ہوے۔ بابل کے بادشاہ نے اُنکے وطن میں قتل عام کیا۔ اور بقیۃ السیف کو غلام بنایا۔ بڑی حسرت و عبرت کا وہ وقت تھا جب پیغمبروں کی اولاد اپنے وطن سے کوسوں دُور جابرا اور متکبر بادشاہوں اور امیروں کو شراب پلانے کی خدمت پر مامور تھی۔ چندسال کے بعد قصور معاف ہوا اور پھر سلطنت عطا فرمائی گئی۔ تو نافرمانی کا جوش اُسکے ساتھ ساتھ آیا۔ اس ہیجان کو دور کرنے کے لیے رومیوں کو انکے ملک میں تاخت و تاراج کی اجازت دی گئی کہ انھوں نے بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

تیسری بار رحمت حق نے باگ ڈھیلی کی اور اپنے عزیز بندوں کو فارغ البالی عطا فرمائی لیکن
ع یاد بالیں پہ جب آیا تو قضا بھی آئی - پھر بداطواری شروع ہوئی - اور عصیاں شعاری نے ایسا دلیر کیا کہ معصوموں کے خون سے ہاتھ رنگین کرنے کا شوق ہوا تو منتقم حقیقی کی سرکار سے آخری سزا کا فرمان صادر ہوا یعنی ہمیشہ کے لیے غلامی کا طوق پہنایا گیا اور اُنکی تسلی کا کوئی ذریعہ بجز انتظار

مسیح موعود کے باقی نہ رہا - عرب کی اقبالمندی اپنے عروج کے وقت یہود کے ساتھ ادنیٰ مشابہت کو بھی فال بد تصور کرتی ہوگی - لیکن آج تیرہ سو برس کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان دونوں قوموں نے عروج و زوال میں ایک ہی قسم کے منازل طے کیے ہیں اور دونوں قافلے ایک ہی عبرتناک وادی سے گذرے -

بنی اسمٰعیل کو بھی کفران نعمت میں چند روز تک اُسی طرح تنبیہیں کی گئیں جیسے کہ بنی اسرائیل کو ہوتی رہی تھیں - کبھی قرامطہ نے ستم کے تیر برسائے اور کبھی افرنجیوں نے ظلم و جور کا نشانہ بنایا - جب ان چھینٹوں سے خواب غفلت دُور نہ ہوا تو یہ بھی دو سخت آفتوں میں مبتلا کیے گئے - پہلے مشرق سے اُٹھ کر ہلاکو نے دجلے کو لہو کی ندی بنایا - اور

خون فرزندان عم مصطفٰے شد ریختہ　　　بر ہماں خاکے کہ سلطاناں نہادندے جبیں

دوبارہ مغرب کی بعض اقوام نے حاکم وقت کو قصر سلطانی میں محبوس کرکے دنیاے اسلام کو بیچراغ کردیا - اور اسیری بابل کی وہ دردناک تصویر پیش نظر کی کہ اُسکی تفصیل بیان کرنے کی قلم کو تاب نہیں ہے -

اب ان مراحل کے بعد تیسری منزل میں قدم ہے جسکو بنی اسرائیل کے افاقۃ الموت کا مقابل سمجھنا چاہیے - غلامی کی زنجیر کھڑک رہی ہے اور حکماے حاذق نبض پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں - ذرا اعتدال میں فرق ہوا اور طوق ذلت گردن میں ڈالدیا گیا - پھر مسیح آسمان چہارم سے اُترکر علاج کریں تو سبحان اللہ سبحان اللہ - ورنہ انا للہ !!!

المختصر امت موسوی کی ترقی و تنزل کی داستان مسلمانوں کی سرگذشت سے اس قدر مطابق ہے کہ بنی اسرائیل کی تاریخ سے ہم کو فطرتاً دلچسپی ہونا چاہیے - مگر مشکل یہ ہے کہ علماے یہود نے اپنی نافرمانیاں چھپانے کے لیے کتب آسمانی میں اس قدر تحریف کردی ہے کہ جو واقعات و سوانح ان میں اسوقت درج ہیں وہ عرب کی مقدس کتاب سے پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچتے - اور اگر صرف قرآن شریف کی آیات سے استدلال کیا جائے تو بنی اسرائیل کی مکمل تاریخ مرتب نہیں کی جا سکتی - عرب کے بعض اہل سیر کتب یہود کی قریب قریب کُل روایات کو مستند سمجھے اور بعض اہل علم اُنکی ہر ایک حکایت کو ناقابل اعتماد تصور فرماتے رہے - دونوں گھاٹیوں کے بین بین چلنے والی جماعت جس کا مسلک

"خذ ما صفا و دع ما کدر" تھا۔ بنی اسرائیل کی تاریخ سے مُنہ موڑ بیٹھی۔ اُس نے انبیاے یہود کے حالات تو بڑے زور و شور سے لکھے لیکن قوم کی داستان سے خاموشی اختیار کرلی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج عربی و فارسی میں انبیاے سلف کے احوال کا تو بیش بہا ذخیرہ موجود ہے، لیکن سارا اسلامی لٹریچر ایک مکمل اور مستند تاریخ یہود سے محروم ہے۔

اگر علم تاریخ سے کوئی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے اور گذشتہ نسلوں کے کارنامے شاہراہ ہدایت کی رہنمائی کرسکتے ہیں تو یقیناً اسوقت مسلمانوں کو تاریخ یہود کے مطالعے کی سخت ضرورت ہے۔ انگریزی میں کافی سرمایہ امت موسوی کے عروج و زوال کا موجود ہے۔ ضرورت ہے کہ تفاسیر و احادیث سے اسکی تطبیق و تلخیص کی جائے اور بنی اسرائیل کی مفصل داستان ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے مدون ہو کر اُردو زبان میں شایع ہو۔ آیندہ اوراق میں ایک خاکہ اُس تصویر کا پیش کیا جائیگا جس میں صرف وہ نقوش درج کیے گئے ہیں جو مسلمانوں کی مستند کتابوں سے ثابت ہوتے ہیں اور جن کو جمہور اہل اسلام صحیح باور کرتے ہیں۔ اُس میں رنگ بھرنے اور نقش و نگار بنانے کے لیے کتب یہود سے مدد لینے کی احتیاج ہے۔ بہتر ہے کہ کوئی برادر وطن جو السنۂ عبرانی و یونانی سے بھی آشنا ہو اس امر خطیر کا بیڑہ اُٹھائے اور بنی اسرائیل کی مکمل تاریخ مرتب کرکے اس خاکے میں جان ڈال دے۔

جو مسودہ اسوقت نذر ناظرین کیا جاتا ہے وہ صرف انبیاے بنی اسرائیل کے احوال و فضائل سے روشناس کریگا اور ضمناً قوم کے عروج و زوال کی طرف اشارہ کرتا جائے گا کیونکہ اس رسالہ کا ماخذ کلام مجید ہے۔ اور یہ پیشتر عرض کیا جاچکا ہے کہ آیات قرآنیہ سے بغیر امداد کتب یہود کے بنی اسرائیل کی تاریخ مرتب نہیں ہوسکتی۔ اس مختصر کتاب میں انبیا علیہم السلام کے معجزات اور خلاف عادات سوانح اسی طریقے سے بیان کیے جائیں گے جس طرح کہ علماے اہل اسلام اُنکو تحریر کرتے آئے ہیں۔ نہ معجزات کی تاویل کیجائے گی اور نہ عقل و نقل کی مطابقت کی کوشش۔ البتہ متناقض روایات اور متضاد حکایات میں صحیح ترین اخبار کو ترجیح دی جائیگی۔ فلسفیانہ دلائل اور مختلف فیہ مسائل سے پرہیز کیا جائیگا اور اہل کتاب کی تحریف شدہ حکایات حتی الامکان اس جزو میں شامل نہ ہونے پائیں گی۔ کتاب کی زبان نہایت سلیس اور عام فہم ہوگی تاکہ ہر طبقے کے لوگ اسکو سمجھ سکیں اور قصوں اور کہانیوں کے پیرائے میں انبیاے سلف کے حالات ہندوستان کے ہر گوشے میں پہونچ جائیں۔ اس مختصر کتاب کی ترتیب

کے لیے یوں تو بیسیوں ضخیم کتابوں کی ورق گردانی کرنا پڑی۔ لیکن شرط انصاف کے خلاف ہے اگر میں اس مقام پر صاحب[1] تفریح الاذکیا فی احوال الانبیا کا تذکرہ نہ کروں جن کی بے نظیر تالیف اُردو زبان میں اس موضوع پر بہترین مجموعہ ہے اور جس میں تمام تفاسیر و احادیث متعلقہ کا اقتباس اس خوبی سے یکجا کردیا گیا ہے کہ اسکے مطالعہ کے بعد اس مبحث پر کسی دوسری تصنیف کی طرف رجوع کرنے کی حاجت باقی نہیں رہتی۔

جامع الاوراق کی نیت صرف انبیاے بنی اسرائیل کا احوال بطور قصص و حکایات تالیف کرنے کی تھی۔ لیکن احباب نے مجبور کیا کہ دوسرے پیغمبروں مثلاً نوحؑ و صالحؑ و ہود وغیرہم کے حالات بھی اسی پیرئے میں بہ زبان اُردو آجانا بہتر ہے۔ لہذا اس رسالہ کے ساتھ ایک جزوِ ثانی انبیاء سلف کے نام سے اور بڑھانا پڑا۔ جزوِ اول جس کا تعلق انبیاے بنی اسرائیل سے تھا شایع کیا جاتا ہے۔ اور جزوِ ثانی بعد کو نذر ہوگا۔

جزو اول ایک مقدمہ اور چار باب پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں حضرت ابراہیمؑ۔ اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کے حالات ہیں جو بنی اسرائیل کے اجداد تھے۔ باب اول میں حضرت یوسفؑ کا تذکرہ ہے جو بنی اسرائیل میں پہلے نبی تھے۔ اور جن کی داستان کو بادشاہِ دوجہاں کی سرکار سے "احسن القصص" کا خطاب عطا ہوا ہے۔

باب دوئم میں حضرت موسیٰ کے حالات ہیں جو بنی اسرائیل کے نبیوں میں سب سے زیادہ عالی مرتبت تھے۔

باب سوئم۔ بنی اسرائیل کے عروج کا زمانہ ہے۔ حضرت یوشعؑ سے حضرت سلیمان تک انبیاء کا تذکرہ ہے۔

باب چہارم۔ انحطاط کا عہد ہے اور بقیہ انبیاے بنی اسرائیل کے حالات ہیں جنکا تذکرہ قرآن مجید یا احادیث صحیحہ میں موجود ہے۔

| | |
|---|---|
| ایں نامہ کہ خامہ کرد بنیاد<br>توقیع قبول روزیش باد | مشیر احمد علوی |

[1] مولوی ابو الحسن حسن علوی کاکوروی المتوفی سنہ ۱۳۰۵ھ

# شیخ بوعلی سینا

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را

مشاہیر عالم کے حالات، سوانح قلمبند کرنے سے بالعموم یہ مقصود ہوا کرتا ہے کہ بنی آدم کی [illegible] میں جوش پیدا کیا جائے اور انسان جسکو قدرت نے اشرف المخلوقات کے معزز لقب سے ممتاز فرمایا ہے بیدار ہو۔ ان علمبرداران علم وفضل میں وہ ہستیاں بھی نظر آئیں گی جنکو دنیا مسلمان کہتی ہے۔ جنہوں نے کبھی اپنے ذہنی و دماغی کمالات دکھا کر ایک عالم کو مسخر کر لیا تھا اور بلا لحاظ مذہب وملت سب سے یکساں خراج تحسین وصول کیا تھا۔ اور جنکے نمایاں کارنامے صدیوں تک متلاشیان علوم وفنون کے لیے مشعل راہ کا کام دیتے رہے۔ وہ گرامی وجود جس کا نام نامی زیب عنوان ہے، صدیوں تک اپنے چشمۂ فیض سے ایک عالم کو سیراب کرتا رہا، اور جسکی ذات مثل آفتاب عالمتاب قرون وسطی میں یورپ کی بہت سی اندھیری راہوں پر ضیا پاشی کر چکی ہے۔ دور حاضرہ کے مسلمانوں کا اپنے اسلاف کی ان قابل قدر دانایوں کا علمی تاثر رکھنا تو کجا، وہ انکے کارنامے تک وقف طاق نسیاں کر چکے ہیں۔ زمانے کا ہمیشہ یہ دستور رہا ہے کہ پرانی باتوں میں اگر کوئی جدت کا پہلو پیدا کر دے تو وہ بدعت سیئہ سے تعبیر کی جاتی ہے۔ اور موجد ہمیشہ مطعون اور آماجگاہ اعتراضات ہوا ہے۔ ہر قوم کی تاریخ اس قسم کے سیکڑوں شواہد پیش کر سکتی ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ یہ ہستی اپنے معاصرین کے طعن وتشنیع کا ہدف نہ بنتی۔ چنانچہ زمانۂ حیات میں کبھی ملحد و بددین کہلائی تو کبھی زندیق کا خطاب ملا اور اسکے روشن کارناموں پر کسی نے ٹھنڈے دل سے غور نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسکی معلومات اور تحقیقات سے فائدہ حاصل کرنے کے بجائے انکو بنظر حقارت ٹھکرا دیا اور وہ نمایاں موشگافیاں جو اس قابل احترام ہستی نے میدان عمل میں کیں جاذب نظر ثابت نہ ہوئیں۔ صفحات قرطاس جو ان نتائج وحقائق کے حامل تھے کچھ تو نذر آتش ہوئے اور کچھ نا اتفاقی کے ہاتھوں اغیار کے ہاتھ لگے۔ انکی فلسفیانہ تحقیقات اور طبی انکشافات کو غیروں نے سر آنکھوں پر لیا اور اپنے اس فیض سے

محروم رہے

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

قوم پر انحطاط و جمود کی جو ناگفتہ بہ حالت طاری ہے اُسے دیکھتے ہوئے یہ اُمید نہیں کہ اس زمانے میں بھی اُس پر کچھ توجہ کی جائے گی اور وہ اُس علامۂ زماں کے مساعی سے بہرہ اندوز ہو کر گذشتہ غفلتوں کی تلافی کرے گی۔ مادی زندگی کی دلچسپیوں اور دلفریبیوں نے عقلیات و روحانیات کو کلیۃً باہر کر دیا ہے۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دیگر ممالکِ اسلامی اسی زندگی کا شکار ہو رہے ہیں اور یہ علمی مشاغل بیکار اور فضول محض خیال کیے جاتے ہیں۔ بوعلی ہی جیسی ہستیاں تھیں جن کی طرف مولانا حالی مرحوم نے ازراہِ تفاخر اپنے مسدس میں اشارہ کیا ہے

ارسطو کے مردہ فنوں کو جلایا فلاطوں کو پھر زندہ کر کے دکھایا
ہر اک شہر و قریے کو یوناں بنایا مزا علم و حکمت کا سب کو چکھایا
کیا برطرف پردہ چشمِ جہاں سے
جگایا زمانے کو خوابِ گراں سے

لیکن کیا اس دورِ پستی میں یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ یہ درست ہے؟ اب تو یہ پُر فخر کارنامے افسانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ مگر نہیں۔ تاریخ کے صفحات اس دعوے کی صداقت پر شاہد ہیں۔ اور جب تک دنیا میں فنِ تاریخ باقی ہے انکو کوئی نہیں مٹا سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ ہماری بدمذاقی اور انحطاط علمی اسکی تصدیق میں حائل ہوں۔ افسوس مسلمانوں نے اس مقتدر ہستی کی قدر نہ کی۔ لیکن اہل مغرب نے تا بہ امکان اسکی تصانیف کو گوشۂ گمنامی سے بکوشش بلیغ تلاش کیا اور حواشی شروح سے مزین کر کے دنیا کے روبرو پیش کیا۔ کیا اس حسرتناک منظر سے شیخ کی روح نہ تڑپ گئی ہوگی اور عالم یاس میں نہ کہتی ہوگی

پڑھی نماز جنازے کی میرے غیروں نے
مرے تھے جنکے لیے وہ رہے وضو کرتے

کس قدر افسوسناک امر ہے کہ اگر شیخ کی تصنیفات ممالک اسلامی میں تلاش کی جائیں تو مشکل

سے دستیاب ہو گئی لیکن یورپ نے نہ صرف اکثر تصانیف کو حلیۂ طبع سے آراستہ کیا بلکہ بہت سے مسودات بھی جمع کیے جو انکے کتبخانوں کی زینت بڑھا رہے ہیں۔ خیر اب اس یاس انگیز داستان کو زیادہ پھیلانا طول کلام کا باعث ہوگا اس لیے اصل مقصود کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ سردست شیخ کی مختصر سوانح عمری سپرد قلم کرنا مدنظر ہے اگر وقت نے مساعدت کی تو اسکے علمی کارناموں پر تنقید و تبصرہ کسی آیندہ موقع پر کیا جائیگا۔

شیخ کا پورا نام ابو علی الحسین بن عبداللہ ابن سینا ہے۔ ۳۷۰ھ میں بمقام افشینہ واقع ولایت بخارا تولد ہوا جہاں شیخ کے والد نے بلخ سے آکر سکونت اختیار کی تھی اور ایک بخاری نژاد عورت سے شادی کرلی تھی۔ باپ فارسی نژاد اور مذہب اسماعیلی کا پیرو تھا۔ اور سامانی خاندان کے حکمراں امیر نوح پسر منصور کے یہاں محصلی کی خدمت پر متعین تھا۔ چونکہ باپ کی مالی حالت اچھی نہ تھی اس لیے سلسلۂ تعلیم خاطر خواہ جاری نہ رہ سکا ابتدا میں شیخ کی اُستادی کا فخر شیخ اسماعیل زاہد کو حاصل ہوا۔ مذہبی تعلیم اور تصوف کے رموز ان سے سیکھے۔ دس سال کی عمر میں علوم مروجہ میں کافی دستگاہ حاصل کرنے کے ساتھ ہی ساتھ قرآن مجید بھی حفظ کرلیا۔ بقول ابن خلکان اسی عمر میں قرآن مجید کے نکات و غوامض پر خاصی دسترس ہوگئی۔ ایک سبزی فروش سے حساب کے ابتدائی مسائل سیکھے۔ عبداللہ ناتلی ایک خانہ بدوش عالم سے مختلف فنون و علوم سرسری طور پر اخذ کیے۔ منطق، اقلیدس، المجسطی پر اپنی ذاتی کوشش سے قدرت حاصل کی۔ فن طب میں عیسٰی بن یحیٰی النصرانی کی شاگردی کی۔ الہٰیات میں بہت کچھ دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ شیخ کا بیان ہے کہ میں نے ارسطو کی مابعد الطبعیات کو چالیس بار پڑھا۔ اگرچہ کل کتاب ازبر ہوگئی لیکن اُس کے مفہوم و مطالب سے بیگانہ رہا۔ حُسنِ اتفاق سے ابونصر فارابی کی بوسیدہ شرح ارسطو ایک کتب فروش کے یہاں تین درہم میں مل گئی جس میں اُن مسائل دقیقہ کا حل موجود تھا۔ اور اس طرح شیخ کی یہ مشکل رفع ہوگئی۔ طب کے ابتدائی مسائل کی عیسٰی بن یحیٰی سے تکمیل کرنے کے بعد شیخ نے خود اپنے ذہن رسا سے کام لیا اور بلا امداد اُستاد وہ کمال حاصل کیا جس نے اقران و اماثل میں امتیازی حیثیت پیدا کردی۔ عنفوان شباب میں یہ یگانۂ روزگار جامع علم و فن تھا۔ ابھی عمر کی سترھویں منزل تھی کہ اسکی شہرت نے والیان ملک کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ چنانچہ نوح بن منصور والی بخارا

نے خود اپنے علاج کے واسطے طلب کیا۔ شفائے کُلّی حاصل ہوئی۔ اور شیخ موردِ الطافِ شاہی ہوکر ندمائے خاص میں شامل کیا گیا۔ اور شاہی طبیب کی خدمات تفویض ہوئیں۔ نوح علم دوست حکمراں تھا اُسکے یہاں ایک کتبخانہ تھا جس میں نوادر کا اچھا خاصہ ذخیرہ موجود تھا۔ یہ کتبخانہ خاص طور پر شیخ کی توجہ کا جاذب ہوا۔ چنانچہ امیر نے شیخ کو اسکے استعمال کے پورے پورے اختیارات دیدیے۔ اب شیخ کتبخانے کا بھی نگراں تھا۔ یہاں اُسکو وہ وہ نادرۂ روزگار نوادر نظر آئے جو اس سے پہلے کبھی نظر سے نہ گذرے تھے۔ بدقسمتی سے تھوڑے ہی عرصے کے بعد کتبخانے میں آگ لگ گئی اور وہ جل کر خاکستر ہوگیا۔ بدخواہ پہلے ہی سے موقعہ کی تاک میں تھے۔ شیخ کے سر آتشزدگی کا الزام لگا دیا کہ اس نے عمداً ایسا کیا ہے تاکہ سوائے اسکے دوسرے لوگ اُس سے مستفید نہ ہوں شیخ نہایت بددل ہوا۔ اور سامانی دربار سے یکلخت طبیعت برداشتہ ہوگئی۔ اکیس سال کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور اس حادثۂ جاں کاہ نے امورِ خانہ داری کا بار شیخ کے کندھوں پر ڈال دیا۔ اسی سال سلسلۂ تصنیف شروع کیا۔ اس اکیس سالہ زندگی کے سوانح شیخ نے خود اپنے ہاتھ سے قلمبند کیے ہیں جو علامہ ابن ابی اصیبعہ نے اپنی کتاب طبقات الاطبا میں بجنسہٖ نقل کردیے ہیں۔ اب خاندان سامانی کا سبکتگین کی چیرہ دستی اور ہوس ملک گیری نے خاتمہ کردیا تھا۔ ناچار شیخ کو بخارا چھوڑنا پڑا۔ علی بن مامون والی خیوا کے دربار میں باریابی ہوئی۔ وزیر سلطنت ابوالحسین احمد بن محمد جوہر شناس شخص تھا۔ اُس نے نہایت گرمجوشی سے خوش آمدید کہا۔ تنخواہ مقرر کردی اور اربابِ فضل وکمال کے مجمع میں شیخ کی زندگی بسر ہونے لگی۔ علاوہ دیگر علما وحکما کے پانچ شخص امتیازی درجہ رکھتے تھے۔ ابوعلی سینا۔ ابوسہل مسیحی۔ ابونصر عراقی۔ ابوالحسن خمار۔ اور ابوریحان البیرونی۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھو کہ ایک طرف اگر فضل وکمال شیخ کے ہم عناں تھے تو دوسری جانب گردشِ دوراں ہمرکاب تھی۔ بدقسمتی نے یہاں بھی وہی سامان فراہم کردیے جن سے محفوظ رہنے کی خاطر شیخ نے ترک وطن کیا تھا ؏ ہرزمیں کہ رسیدیم آسماں پیداست۔

سبکتگین کے بعد محمود غزنوی سریرآرائے تخت غزنی ہوا۔ محمود کی چیرہ دستیوں اور فتوحات نے ایک عالَم کو خوفزدہ بنا دیا تھا۔ اسکے معمولی خطوط ونامہ جات تاجداروں کو لرزہ براندام کردیتے تھے۔ ہر فرماں روا امتثالِ امر کو اپنی سلامتی کا وسیلہ تصور کرتا تھا۔ محمود میں جہاں جوعُ الارض

تھی وہاں شوق علم و ہنر پروری بھی تھا۔ اپنے دربار میں بہت سے ارباب علم و فن جمع کر رکھے تھے اور جہاں کسی اہل کمال کا پتہ ملتا فوراً طلب کرتا تھا۔ محمود کو جب معلوم ہوا کہ علی کے دربار میں یہ لوگ رہتے ہیں تو بدست خواجہ حسین علی میکائیل نامہ بدیں مضمون ارسال کیا کہ ہم نے سنا ہے کہ آپ کی مجلس میں چند یگانۂ زمانہ اہل فضل و کمال ہیں مثلاً فلاں فلاں اشخاص۔ آپ کو چاہیے کہ اُنکو ہمارے دربار میں روانہ کر کے شرفیابی کا موقع دیں۔ ہم منتظر و امیدوار ہیں کہ اظہار منت میں کوتاہی نہ کیجائیگی۔ علی بن مامون نے ہر پنج اشخاص کو تخلیے میں محمود کے منشاء سے آگاہ کیا اور ساتھ ہی اپنی مجبوری ظاہر کردی۔ ابوالحسن۔ ابوریحان۔ ابونصر تو جانے پر راضی ہوگئے لیکن شیخ اور ابوسہل نے انکار کیا۔ مگر یہ خوب جانتے تھے کہ دعوت محمود کا رد کرنا ضرور رنگ لائیگا۔ اس لیے راتوں رات دونوں وہاں سے فرار ہوئے اور صبح کو پندرہ فرسنگ دور نکل کر دم لیا۔ مصیبت تنہا نہیں آتی ہے۔ یکایک طوفان باد و باراں نے آلیا اور وہ آفت برپا ہوئی کہ الامان والحفیظ۔ آخر خدا خدا کرکے طوفان نے ذرا دم لیا۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ ابوسہل ان مصائب و صعوبات کی تاب نہ لاسکا اور اُس کا طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ اب شیخ یکہ و تنہا تھا۔ آخر بحال تباہ براہ آبِ ورد و طوس و نیشاپور جرجان پہونچا۔ جو اسوقت شمس المعالی قابوس بن وشمگیر دیلمی والی طبرستان کے زیر نگیں تھا۔ شیخ جرجان کی ایک سرائے میں اقامت گزیں ہوا۔ مطب شروع کر دیا۔ خوب ترقی ہوئی۔ آمدنی میں روزبروز اضافہ ہوتا گیا۔ اتفاق سے اُسی زمانے میں قابوس کا ایک عزیز بیمار ہوا۔ جسکے معالجے کے واسطے شیخ طلب ہوا اور بیمار نے شفا پائی[1]۔ اس حیرت انگیز طریقۂ علاج کو دیکھ کر

---

[1] اس موقعہ کے متعلق نظام الملک عروضی سمرقندی نے چہار مقالہ میں جو دلچسپ حکایت لکھی ہے اُس کا خلاصہ با دنیٰ تغیر درج ذیل ہے :—

شاہی خاندان کا ایک شہزادہ بیمار تھا۔ اطبا علاج سے عاجز ہوگئے۔ کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ ایک خادم نے قابوس سے عرض کیا کہ فلاں سرزمین سے ایک نووارد طبیب مقیم ہے اُسکے علاج سے چند لوگ شفا یاب ہو چکے ہیں اگر اُسکو دکھایا جائے تو مناسب ہوگا۔ قابوس نے طلبی کا حکم صادر کر دیا۔ شیخ آیا۔ بیمار کی نبض دیکھی، قارورے کی جانچ کی۔ کہنے لگا کہ ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو ملک کے تمام شہروں کے نام جانتا ہو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اور ایک شخص نے نام بتانا شروع کیے۔ ایک خاص شہر کا نام سنکر مریض کی (دیکھیے صفحہ ۲۲)

قابوس نہایت متعجب ہوا اور طبیب کو بہ نگاہ قدر دیکھنے لگا۔ ابھی تک یہ نہ معلوم تھا کہ یہ طبیب کون ہے، لیکن تھوڑی ہی دیر میں حقیقت بے نقاب ہوگئی۔ یہ اوپر بیان ہوچکا ہے کہ سلطان محمود نے علی بن مامون سے پانچ اشخاص طلب کیے تھے۔ تین نے دعوت سلطان قبول کرکے خواجہ حسین علی میکائیل کی رفاقت میں دارالخلافہ کا رخ کیا اور دربار سلطانی میں پہونچے۔ شیخ اور ابوسہل مسیحی نے جانے سے انکار کیا۔ اور مخفی طور پر فرار ہوگئے۔ چونکہ محمود سب سے زیادہ شیخ کا خواہاں تھا اُس نے ابونصر مصور کو حکم دیا کہ ابوعلی کی تصویر تیار کیجائے اور دربار کے دیگر نقاش اُسکی چالیس نقلیں تیار کریں۔ چنانچہ یہ تصویریں مختلف حکمرانوں کے پاس بایں حکم ارسال کی گئیں کہ اس شکل و صورت کا آدمی بوعلی نامی جہاں ملے اُسکو دربار غزنی میں روانہ کردیا جائے۔ ایک تصویر قابوس کے پاس بھی روانہ کی تھی۔ جس وقت شیخ قابوس کے سامنے آیا اُس نے فوراً تصویر کی مدد سے اُسے پہچان لیا۔ اُس وقت کے فرماں رواؤں میں قابوس کریم النفسی و ہنرپروری میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا اور علوم و فنون پر اُسے خاصی دسترس حاصل تھی۔ اس نے شیخ کو بجائے غزنی روانہ کرنے کے اپنے دربار میں جگہ دی۔ لیکن برگشتگی قسمت نے یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ کچھ مدت گذری ہوگی کہ قابوس کی معزولی عمل میں آئی۔ اور بالآخر فوج کے باغیوں نے ۱۰۱۲ء میں فاقوں سے کام تمام کردیا۔ اس سانحۂ جانگداز نے شیخ کے دل و دماغ

نبض میں حرکت پیدا ہوئی۔ شیخ نے کہا کہ اب ایسے ایک شخص کی ضرورت ہے جو اس خاص شہر کے محلّوں اور گلیوں کے نام سے واقف ہو۔ چنانچہ ایسا شخص حاضر ہوا اور اُس نے محلوں اور گلیوں کے نام شمار کرنا شروع کیے۔ ایک خاص گلی کے نام پر پھر وہی حرکت مریض کی نبض میں پیدا ہوئی۔ طبیب نے کہا اب ایسا شخص چاہیے جو اس گلی کے مکانات کا کما حقہٗ علم رکھتا ہو۔ چنانچہ اس وصف کا شخص آیا اور مکانات کے نشانات بتانا شروع کردیے۔ ایک خاص مکان کا نام سنکر مریض پر پھر وہی حالت طاری ہوئی۔ طبیب نے کہا بس علاج ہوچکا۔ اس شخص کی دوا اُس لڑکی کا روے تاباں ہے جو اُس مکان مین رہتی ہے۔ مریض نے شرم سے نظر نیچی کرلی۔ لیکن ساتھ ہی حقیقت کا اعتراف کیا اور بعد ازاں شیخ کے مشورے سے اُن دونوں کی شادی ہوگئی۔ قابوس یہ طبی کرامت سن کر متحیر ہوا۔ اور طبیب کو باریابی بخشی۔ تصویر محمودی کے ذریعے سے پہچان لیا کہ ابوعلی ہے۔ تخت سے اُتر کر استقبال کیا اور بڑے جوش سے بغلگیر ہوا۔ اور اپنے پاس سریر شاہی پر جگہ دی۔

پر نہایت گہرا اثر ڈالا - چنانچہ اُس نے مقتول قابوس کا ایک مرثیہ نہایت پُر درد لہجے میں لکھا ہے جس میں اپنے متعلق بھی اشارہ کیا ہے -

لما عظمت فلیس مصر و اسعے		لما غلا ثمنی عدمت المشتری

(جب میری عظمت بڑھی تو کسی شہر نے میرے لیے وسعت نہ پیدا کی - جب میرا نرخ بالا ہوا تو میرا خریدار ہی نہ رہا)

اسی اثنا میں شیخ خود بھی صاحب فراش ہوگیا - اور جرجان میں اپنے ایک دوست ابو محمد کی وساطت سے ایک مکان خرید کر وہاں فروکش ہوا - اسوقت وہ پورے انہاک سے درس و تدریس و تصنیف میں مشغول تھا - کتاب قانون لکھنا شروع کی اور ساتھ ہی ساتھ منطق وغیرہ فنون کی تعلیم دیتا تھا - لیکن تھوڑے ہی عرصے میں اُسکی سیماب صفت طبیعت نے پلٹا کھایا اور جرجان سے رخت سفر باندھ کر اورے و قزوین ہمدان پہونچا - اتفاق وقت کہو یا شیخ کی عارضی خوش قسمتی، شمس الدولہ والی ہمدان اُسوقت مبتلاے درد قولنج تھا - دربار میں رسائی ہونے پر شیخ نے علاج کیا - مریض کو صحت کلی حاصل ہوئی بہت کچھ اعزاز و اکرام پایا - طبیب خاص سے بتدریج وزارت تک پہونچ گیا اور اب مشاغل علمی کے پہلو بہ پہلو مہات سلطنت انجام دینے لگا - لیکن قسمت کے لکھے کو کون مٹائے ؟ انقلاب دوراں نے پھر رنگ بدلا - نوشتۂ تقدیر نے پھر وہی سامان گردش پیدا کر دیے - فوج کی بغاوت کی بدولت وزارت سے معزولی تک نوبت پہونچی اور حوالۂ زنداں ہوا - زمانے نے پھر کروٹ لی اور امیر کو درد قولنج کی شکایت پیدا ہوئی - شیخ طلب ہوا - علاج کیا - صحت یاب ہونے پر امیر نے معافی مانگی - اور شیخ پھر وزیر بنایا گیا - یہ زمانہ شیخ کی انتہائی انہاک و مشغولیت کا تھا - دن کو امور سلطنت انجام دیتا تھا اور شب کا بیشتر حصہ درس و تدریس میں بسر کرتا تھا - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کی طبیعت کو انتظام ملکی سے لگاؤ نہ تھا - پھر وزارت میں ناکامی ہوئی - بددل ہو کر تمام مناصب سے دستکش ہوا - اور اس خیال سے کہ مبادا معتوب شاہی ہو ایک عطار کے مکان میں روپوش ہو کر تصنیف میں مشغول ہوا - شیخ کو خوف تھا کہ اگر امیر کو سراغ مل گیا تو یقیناً گرفتار ہو کر سزا بھگتنا پڑیگی اسلیے امیر اصفہان ابو جعفر علاء الدولہ سے خفیہ خط و کتابت شروع کر کے اپنا عندیہ ظاہر کیا - بدقسمتی سے یہ وہ فاش ہوگیا - اور شمس الدولہ نے گرفتار کر کے سپرد زنداں کر دیا - اب کوئی چارہ کار نہ تھا - ناچار فراری کے منصوبے گانٹھے اور بصد مشکل بھاگ کر علاء الدولہ کے یہاں پناہ گزیں ہوا جہاں شاہی

طبیب اور مشیر خاص کے فرائض انجام دیتا رہا اور اپنی عمر کی آخری دس منزلیں اسی دربار میں طے کیں۔ علاء الدولہ شیخ کا نہایت گرویدہ تھا اور اسکے اعزاز و اکرام میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتا تھا۔ یہاں شیخ کو پورے طور پر طمانیت قلب حاصل تھی اور وہ بڑی سرگرمی و تن دہی سے اپنی تصنیفات میں مشغول رہتا تھا۔ امیر نے ان سرگرمیوں کی بڑی قدر کی۔ اور اکثر ان مجالس میں جو شیخ کی نگرانی میں منعقد ہوتی تھیں خود بھی حاضر ہوتا تھا۔ بالعموم یہ جلسے رات کو ہوتے تھے اور بسا اوقات ابر ہی صبح ہوا کرتا تھا۔ سنہ ۴۲۸ھ میں علاء الدولہ عازم ہمدان ہوا۔ شیخ بھی ہمرکاب تھا۔ راستے میں موت نے کام تمام کر دیا۔ ۵۸ سال کی عمر میں یہ آفتاب علوم و فنون ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ اور ہمدان ہی کے ایک نخلستان میں سپرد خاک ہوا۔ سچ ہے

بوعلی سے بھی ہزاروں آئے دنیا میں طبیب
موت کی دارو کہیں سے پر نہ لائے چل بسے

اسی اٹل بات کی نسبت شیخ نے پہلے ہی اپنی زبان سے کہدیا تھا۔

از قعرِ گلِ سیاہ تا اوجِ زحل — کردم ہمہ مشکلاتِ گیتی را حل
بیروں جستم ز قیدِ ہر مکر و حیل — ہر بند گشادہ شد مگر بندِ اجل

---

یوں تو شیخ کی ذات جامع علوم مختلفہ و فنون متنوعہ ہے لیکن فلسفہ و طب میں اس کی حیثیت فرد کامل کی تھی۔ ممالک مشرقی میں شیخ کی عظمت و شان کا مدار زیادہ تر اسکی طب یونانی میں عدیم المثال کتاب "قانون" پر ہے۔ اس فن میں الہامی کتب کی سی عظمت حاصل ہے۔ غالباً طب یونانی کا کوئی ایسا ضروری مسئلہ نہیں ہے جو اس ضخیم کتاب میں موجود نہ ہو۔ وہ امام طب ہے اور اس میدان میں امتیازی و استثنائی حیثیت کا مالک ہے۔ اسکو "الشیخ الرئیس" کے معزز لقب سے یاد کرتے ہیں۔ ممالک مغربی میں بھی فلسفی اور طبیب ہر دو حیثیت سے وہ ممتاز نظر آتا ہے۔ اسکی مبسوط کتاب قانون بارہویں صدی سے سترہویں صدی عیسوی تک یورپ کے مختلف ممالک میں زیر درس رہی اور بطور مستند کتاب کے تسلیم کی جاتی تھی۔ فلسفے میں اسکی تصنیف الشفا بڑی ضخیم ہے جو بتدریج معرض وجود میں آئی اور نہایت پریشانی کے زمانے میں تصنیف کی گئی۔ اس مبسوط کا خلاصہ خود شیخ نے "نجات" کے نام سے

لکھا ہے - مجد الدین سنائی نے جو مشہور نعتیہ قصیدہ لکھا ہے اُسکے ایک شعر میں انھیں ہردو کتب کی طرف اشارہ کیا ہے - چنانچہ فرماتے ہیں ؎

کاں نجات و کاں شفا را باب سنت جستہ اند		بوعلی سینا نیارد در "نجات" و در "شفا"

دوسری مشہور تصنیف فلسفے میں "اشارات" ہے جس کا پورا نام کتاب الاشارات والتنبیہات ہے اور جس کی شرح و تحشی نصیر الدین محقق طوسی نے کی ہے - شیخ کی تصانیف کی تعداد صحیح طور پر معلوم نہ ہوسکی - بیشتر کتب دستبرد زمانہ کی نذر ہوئیں - بہت سی کتابوں کو حسین غوری جہاں سوز کی سفاکیوں نے نذر آتش کیا - وزیر جمال الدین القفطی نے تصنیفات کی تعداد حسب ذیل بتائی ہے - اکیس ضخیم کتب اور چوبیس رسائل جو فلسفہ - طب - مذہب - اقلیدس - ہیئت والکیمیا وغیرہ پر لکھی گئی ہیں لیکن علمائے یورپ نے بڑی کد و کاوش سے ۹۹ کتابوں کا پتہ لگایا ہے - مشرقی فلاسفۂ اسلام میں سے اگر کسی کا نام شیخ کا ہم پلہ ہوسکتا ہے تو وہ الفارابی المتوفی ۳۳۹ھ و ابو یوسف یعقوب بن اسحاق الکندی ہیں - شیخ نے فلسفہ میں جو نہایت ہی مفید کام انجام دیا وہ اُسکی باقاعدہ ترتیب و تنظیم ہے -

بالعموم شیخ کی تصانیف عربی میں ہیں - البتہ بوجہ فارسی نژاد ہونے کے فارسی سے بھی لگے طبعی ذوق تھا - چنانچہ اس زبان میں بھی کچھ نہ کچھ موجود ہے - علاء الدولہ کی فرمائش سے "حکمت علائیہ" اسی زبان میں لکھی اور امیر کی نسبت سے "حکمت علائیہ" نام رکھا - کتاب البر والاثم جو فلسفۂ اخلاق پر فارسی میں ہے - چونکہ شیخ کا مذاق فلسفیانہ تھا اس لیے وہ ہمیشہ مورد لعن و طعن رہا - یہ وہ عہد تھا جبکہ فلسفہ کفر والحاد کا مرادف تھا - اور تعصب فقہا نے عوام کو برگشتہ کر رکھا تھا - بارہا شیخ کو اپنے خیالات کے باعث مصائب برداشت کرنا پڑے اور قوم کی زبان سے ملحد و زندیق کے خطاب ملے - اکثر تصنیفات سپرد آتش ہوئیں - لیکن شیخ اپنے ارادے میں راسخ تھا اور کبھی جادۂ اعتدال سے نہ ہٹا - شیخ نے ارسطو و افلاطون کے فلسفے کو تسلیم کرلیا تھا - یہ وہ جرم تھا جو اُس وقت کی مذہبی عدالت میں ناقابل عفو تھا - اگر آج اہل یورپ اُن بے بہا ذخائر کو محفوظ نہ رکھتے تو وہ ہمیشہ کے لیے دنیا کی نظر سے غائب ہو جاتے - مستشرقین مغرب نے حتی المقدور اسکی تصانیف کو گوشہ ہائے عالم سے فراہم کرکے زمانے کے تباہ کن ہاتھوں سے ایک بڑی حد تک بچا لیا - شیخ

کی اکثر کتب کو اگر مشرقی کتبخانوں میں تلاش کیا جائے تو ناکامی ہوگی لیکن مغرب کے مراکزِ علوم میں نظر آتی ہیں۔ ترجمانِ حقیقت ڈاکٹر اقبال نے بالکل سچ کہا ہے ؎

حکومت کا تو رونا کیا کہ وہ اک عارضی شے تھی — نہیں دنیا کے آئینِ مسلّم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی — جو دیکھو انکو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا
غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن — کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

اسی مغربی خوان کی زلہ ربائی کا طفیل ہے جو آج مغرب فلسفہ و حکمت میں پیش پیش نظر آرہا ہے جسکو مذہبی غلط فہمی نے بے دینی و الحاد سے تعبیر کیا وہی اغیار کے لیے سرمایۂ روشن خیالی ثابت ہوا۔ اور اس کا اہلِ مغرب کو دل سے اعتراف ہے۔

امام غزالیؒ کے زمانے تک فقہا و محدثین کے اقوال فرمودۂ الٰہی کی شان رکھتے تھے اسلیے کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ اس طرف توجہ کرے۔ امام صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے مقاصد الفلاسفہ لکھ کر علمِ اختلاف بلند کیا۔ اور اگرچہ اپنی کتاب تہافۃ الفلاسفہ فلاسفہ کے رد میں لکھی لیکن ساتھ ہی منقذ من الضلال میں اعتراف کیا کہ سوائے الٰہیات کے چند مسائل کے فلسفے کی اور کوئی شاخ منافیِ اسلام نہیں۔ نیز اُنھوں نے یہ بھی ثابت کیا کہ منطق تعلیم کا اسلام مخالف نہیں۔ بہت سے مسائل میں امام صاحب شیخ کے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ مگر ابھی تک فقیہانہ جبر و استبداد باقی تھا۔ حتیٰ کہ باایں تقدس امام صاحب کی بھی مخالفت کی گئی۔

شیخ کی اکثر تصانیف کا ترجمہ مغربی زبانوں میں ہوگیا ہے اور ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ کی اکثر درسگاہوں میں شیخ ہی کا فلسفہ رائج تھا۔ شیخ کی وفات کے کم و بیش ایک صدی کے بعد ہی ۱۱۳۰ء میں طلیطلہ (Toledo) میں محکمۂ ترجمہ قائم ہوا۔ اس محکمے کے ارکان تمامتر یہودی علما تھے۔ اور متعدد تصنیفات لاطینی میں منتقل کی گئیں۔ اور پھر یہاں سے یورپ کی دیگر زبانوں میں ترجمہ ہوئیں۔ شیخ کی کتب کا ترجمہ لاطینی میں ابن رشد کی کتابوں سے پہلے ہوا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ شیخ کے خیالات پر فلسفیانہ رنگ چڑھا ہوا ہے جسکے باعث وہ اس قدر مطعون ہوا لیکن فقہا نے کبھی یہ جرأت نہ کی کہ بالمواجہ اور براہِ راست اُسکے فلسفے کی تردید کرتے۔ البتہ اپنی کمیں گاہوں سے کفر و الحاد کے تیر چلاتے رہے۔ دنیا میں محاسن و معائب

توام چلے آتے ہیں۔ لیکن کیا یہ انصاف کہا جا سکتا ہے کہ ایک شخص کے کمال کو چند کوتاہیوں کی وجہ سے بالکل نظرانداز کر دیا جائے۔ اور اُسکے گرانبہا خدمات اور کارہائے نمایاں کو ناقابلِ التفات قرار دیا جائے۔ ع عیب او جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو۔ شیخ کی ان تھک مساعی ارباب بصیرت کے لئے سرمایۂ عبرت ہیں۔ باوجود مصائب و تکالیف اور مخالفت ابنائے زماں اُس کا پائے ثبات کبھی متزلزل نہ ہوا اور عزم راسخ کے ساتھ وہ اپنے کام میں مشغول رہا۔ زمانے کی سختیوں کا جس علو ہمتی سے اُس نے مقابلہ کیا اسکی مثالیں دنیا کم پیش کر سکتی ہے۔ با ایں فضل و کمال نہایت انکسار سے وہ اپنی لغزشوں اور کوتاہیوں کا بھی معترف ہے

دل گرچہ درین بادیہ بسیار شتافت　　یکموئے بدانست و بسے موئے شگافت
اندر دل او ہزار خورشید بتافت　　آخر بکمال ذرۂ راہ نیافت

اخلاقی پہلو سے شیخ کے حالات میں بعض نقائص بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً اُسکو میگساری کی عادت تھی۔ اور عیش پرستی سے بھی وہ نہ چوکتا تھا۔ لیکن یہ اُس کا ذاتی فعل ہے جس کی ذمہ داری اُسی پر عائد ہوتی ہے۔ جہاں تک اُس کا کمال مخصوص ہے اُس کو اس سے علحدہ کرکے دیکھنا چاہیے۔

امجد علی از رنگپور

# نعرۂ مستانہ

دل وقفِ یاس و حسرت جاں محوِ جستجو ہے　　دو دن کی زندگی بھی اک خام آرزو ہے
سمجھا تھا اُسکو اب تک اپنے حریمِ دل میں　　شرمندہ ہوں سنا ہے جب سے وہ چار سو ہے
آغازِ عشق وہ تھا جب آرزو تھی اُن کی　　انجامِ شوق یہ ہے اب اپنی جستجو ہے
ہم بیخودوں سے آ کر لے درسِ بے نیازی　　بزمِ طلب میں زاہد کیا ذکرِ ما و تو ہے
مایوسیوں نے پیہم دل سرد کر دیا ہے　　اب آرزو کے بدلے اک داغِ آرزو ہے

یہ بھی جلیل شاید نیرنگیِ جنوں ہے
ہم چپ ہیں اور ہمارا افسانہ کو بکو ہے

جلیل قدوائی (اناوی) علیگڑھ

# فلسفۂ محبت

دنیا نہیں غافل! ہے یہ الفت کا سمندر
جاذب ہے محبت کا ہر اک ذرّے کے اندر

ہر شے کی ہے کوشش کہ کشش اپنی دکھائے
جو شے ہو گریزاں اسے اپنے سے ملائے

چشمے جو پہاڑوں کی ہیں درزوں سے ابلتے
دریاؤں سے ملنے کو ہیں میداں میں اُترتے

دریا بھی سمندر کی محبت میں رواں ہیں
بیچینیاں ہر موج کے تیور سے عیاں ہیں

چلتی ہیں اگر مشرق و مغرب سے ہوائیں
یہ دُھن ہے کہ الفت سے ہم ہاتھ ملائیں

اشیا میں غرض باہمی الفت کا ہے اک جوش
غایت ہے یہی سب کی کہ ہو جائیں ہم آغوش

پھر تو ہی بتا تجھ سے رہوں دور میں کیونکر
دُکھ تیری جدائی کے یہ آخر سہوں کیونکر

وہ دیکھ۔ پہاڑوں کی جو ہیں چوٹیاں اونچی
سرگوشیاں ہیں ابرِ سیہ فام سے کرتی

دریاؤں کی موجوں پہ نظر ڈال کہ باہم
ہوتی ہیں ہم آغوش۔ یہ الفت کا ہے عالم

پھولوں کو ذرا دیکھ کہ کیا رنگ ہیں لائے
کس شوق سے کانٹوں کو بغل میں ہیں دبائے

سورج بھی نکلتا ہے اگر چرخ بریں پر
ہر ایک کرن اُس کی لپکتی ہے زمیں پر

الفت کرۂ خاک سے ہے مہرِ مبیں کو
کس شوق سے ہے چومتا وہ روئے زمیں کو

چاند اور سمندر میں بھی الفت کی لگن ہے
پانی پہ فدا چاند کی ہر ایک کرن ہے

مد کیا ہے؟ سمندر کی محبت کا ہے اک جوش
موجوں کو کیا جس نے شعاعوں سے ہم آغوش

کیا قہر ہے؟ دنیا تو مزے وصل کے لُوٹے
اور مجھ سے ترے ربط کا یوں سلسلہ ٹوٹے

کیا دل نہیں موجود مرے سینے کے اندر؟
کیا دل میں نہیں موجزن الفت کا سمندر؟

تو اور میں یکجا ہوں۔ تمنا ہے تو یہ ہے
فطرت کی اُمنگوں کا تقاضا ہے تو یہ ہے

سلیم

# سری کرشن جی

(پروفیسرٹ ۔ ال ۔ وسوانی کی کتاب "سری کرشن" سے خاص الناظر کے لیے ملخص کیا گیا)

(۱)

"میرے الفاظ دراصل آنسو ہیں !
میں اپنے وطن قدیم کے بُت کو
تباہ و برباد، شکستہ و ریختہ دیکھ رہا ہوں،
اے دیوتاؤ! آج کل نہایت خوں ریز جنگ برپا ہے،
کرشن جی خود قسمتوں سے برسرِ پرخاش ہیں،
اور اقوام عالم اس جنگ و جدل کا بغور مطالعہ کر رہی ہیں ۔
کیا اُمید، اعتقاد، اور قدیم الایام پژمردہ محبت کو فنا ہو جانا چاہیے ؟
یا ہندوستان ایک آسمانی سرزمین مقدس ہونے کا ثبوت دے سکتا ہے ؟

(۲)

پُرانی پہاڑیاں اب تک پاک اور محترم تصور کی جاتی ہیں
دریا اور سمندر اب تک پُرانے راگ گا رہے ہیں
اور وہ ستارے جو قرون اولیٰ میں درخشاں تھے اب بھی روشن ہیں ۔
وہ ستارے جو بُدھ کی ولادت کے وقت، اور
حضرت عیسیٰ کی ہندوستان میں آمد کے وقت درخشاں تھے ۔
فطرت اب بھی محیر العقول خزانوں سے مالامال ہے
لیکن اے انسان! تو نے اپنے آپ کو نہایت مفلس بنا لیا ہے
تجھ میں تیرے آبا و اجداد کی پاک آتش سرد ہو چکی ہے ۔

(۳)

کرشن جی قسمتوں کے پرسر جنگ میں

"میں اپنے دل میں ایک آواز سن رہا ہوں!
میرا خیال ہے کہ یہ صدا اس کی ہے جس نے عرصہ ہوا
صدیوں کی گرد عظیم میں گاڑی چلا دی تھی
ناقید! کیا تم میرا ساتھ دوگے؟
اور یا تم دنیا داری کو پسند کروگے؟
موت یا حیات ——— ؟ انتخاب تمہارے ہاتھ میں ہے
لیکن موت غیر فانی ہستیوں کا جہیز ہے"

---

پانچ ہزار سال کا زمانہ گذرا جب کرشن جی نے اس ارض کثیف کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے رونق بخشی تھی، اور کل عالم کو اپنی تابناک طلعت ریزیوں سے یوسف زار بنا دیا تھا، انکی ولادت مہتم بالشان انقلاب کا پیش خیمہ تھی، صفحات تاریخ دیکھو سرزمین ہند میں کیے بعد دیگرے سینکڑوں سلطنتیں قائم ہوئیں اور اپنی مدت حیات ختم کرتے ہی پارہ پارہ ہوکر نیست و نابود ہو گئیں لیکن کرشن جی کی نمایندہ ان سلطنت اب بھی قائم ہے کیونکہ اسکی بنیاد دیر مضبوط اور اسکے در و دیوار مستحکم ہیں انقلاب فرانس ایک سیاسی ہولناک واقعہ تھا، اور انقلاب انگلستان میں محض اقتصادی پہلو نمایاں تھا۔ لیکن فرانس میں آزادی نے کشت و خون اور غارت گری کی صورت اختیار کی، اور انگلستان میں اقتصادیات نے سرمایہ داروں کی فتح و ظفر کا جامہ پہنا۔ اسکے برخلاف کرشن جی ایک روحانی سلطنت کے بانی ہوے، جسکا فیض کرم ہند کے ہر گوشے میں اب تک جاری و ساری ہے، اور جسکی بدولت زمانۂ ماضی میں ہندوستان نے ایک فاتح اولوالعزم اور طاقتور قوم کی صورت اختیار کی تھی کرشن جی نے اپنی "مرلی" پر راگ گانا شروع کیے جسکے بعد سے آریہ ورت میں ایک نئے تصور ایزدی کا دور شروع ہوا۔ اس خدائے بزرگ و برتر کا جو حسین و جمیل اور ازلی و ابدی ہے۔ کرشن میں خداوندی صفات موجود تھے۔ وہ "آنند" اور آزادی کا ایک سچا عاشق زار تھا، اور وہ حسن و جمال کا پیکر لطیف تھا، اور اس محبت و الفت کا سرچشمہ جسکی نہ ابتدا ہے نہ انتہا ہے۔

ایک وہ بھی زمانہ تھا جسکو زیادہ عرصہ نہیں گذرا جب ہندوستان نے مغربی اثرات کو قبول کرنا شروع کیا تھا، اور مادیت کی تاریک گھٹائیں افق ہند پر نمودار ہونے لگی تھیں، اور تعلیمیافتہ طبقے میں کرشن جی کا نام کوئی خاص وقعت نہیں رکھتا تھا، لیکن امتداد زمانہ نے پتھر کو جوہر کر دیا، اور وہی تاریک قلوب جو مغرب کی کورانہ تقلید کو اپنا دین و ایمان تصور کرتے تھے رفتہ رفتہ راہِ راست پر آنے لگے، اور آج وہ زمانہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کے سرگرم مرد و عورتیں بھی کرشن جی کی حیات کا حسن و جمال رفتہ رفتہ دیکھنے لگے ہیں، اور یہ دستور اٹھتا جاتا ہے کہ اس حیات کو جو ایک انوکھی دلآویزی اور خوشبوئی سے معمور ہے ایک افسانہ یا داستان پارینہ سمجھیں، ایسے افراد کی اب کمی نہیں ہے جو ابتدائی زمانے میں ان پر لعن طعن کرتے تھے اب انکی عزت اور عظمت کرنے لگے ہیں، اور اس نتیجے پر پہونچ چکے ہیں کہ انکی تعلیم جو درحقیقت دلوں کو منور کرنے والی ایک آفتاب ضیا سے فیضیاب تھی دنیاوی دلبستگی سے بھی مملو تھی۔

وہی کرشن جی جو بانسری بجاتے اور میدان جنگ میں راگ گاتے تھے بار بار کہتے آئے ہیں کہ زندگی اور تنہائی دو متضاد امور ہیں، اور ان دونوں میں کوئی علاقہ نہیں ہو سکتا، دنیا سے الگ تھلگ رہنے والے بن باسی سنیاسی درحقیقت زندہ افراد کی فہرست میں شامل نہیں ہیں۔ زندگی نام ہے عمل کا، اور زندہ رہنا تعبیر ہے میدان عمل میں گوئے سبقت لے جانے کی، کوئی فرد باطنی خوبیوں کا مالک نہیں ہو سکتا جب تک وہ سوسائٹی کے ایک ممبر کی حیثیت سے حیات بیرونی کی ضروریات کو پورا نہ کرے۔ گیٹے نے بھی کہا ہے کہ ابتدائے حیات عمل سے ہوتی ہے، لیکن کرشن جی روشن الفاظ میں بتا گئے ہیں کہ ہم کو اپنے عمل کے ذریعے سے نفس کے ارذل طبقے کی نمایش نہیں کرنا چاہیے، بلکہ روح کے عمیق ترین حصے کو متحرک کرنا چاہیے جہاں محبت و عشق کا دریا موجزن ہوتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ ہمارا عمل نفس عالیہ کو ظاہر کرے نہ کہ پوشیدہ، اور اسی وجہ سے آئیڈیل اور حقیقی حیات میں ایک متمادی کشمکش موجود رہتی ہے۔

لیکن یہ کشمکش جسکو ایک دائمی جنگ کہنا غلط نہ ہوگا کبھی اس قدر مہلک نہیں ہوئی جس قدر کہ آج کل ہے کیونکہ کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا جب اقوام عالم جدال و قتال کی اس قدر خوگر ہوں جیسی حالت کہ اس دور میں ہے، زمین و آسمان ہی نہیں بلکہ زمین کے نیچے کا پانی بھی اس دور میں مسلح نظر آرہا ہے، تیغ و تفنگ نہ صرف کرۂ ارض پر بلکہ تحت الثریٰ میں بھی ایک طوفان برپا کیے

ہوے ہیں، اور سیلوں کی بلندی پر سے آتش برسائی جاتی ہے تاکہ غنیم کا متاع جنس و مال بھی جل کر خاک سیاہ ہو جائے اور ہر چہار جانب تباہی و بربادی کا محشرستان پامالی پر رونق ہو جائے، کاش ایسی روح فرسا حالت میں جب ہندوستان کا شیرازہ منتشر ہو چکا، اور چپے چپے پر عناد و بغض، کینہ پروری و جنگجوئی کا بازار گرم ہے کرشن جی کی موسیقی موجزن ہوتی، اور وہ محبت و الفت کا پیام لاتی جو کرشن جی کا مقصد حیات تھا، اور جسکی تعلیم دینے وہ دنیا میں مبعوث ہوے تھے۔

لیکن عوام کا یہ خیال خام محض بے بنیاد ہے کہ وہ دیوتا از سر نو نمودار ہوگا، اور منصۂ شہود کو اپنی جلوہ گری کا مطلع انوار بنائے گا، ہر پاک دل اور ہر امنگوں سے لبریز روح خدا سے بزرگ برتر سے روحانی سطح پر وصل حاصل کر سکتی ہے، اس لیے خداوندی شان کے منافی ہے کہ وہ اپنے مطلع نظر سے نیچے قدم ڈالیں اور پھر آکر گنہگار بندوں میں شامل ہو جائیں، آن واحد کے لیے وہ مقدس ہستیوں کو اپنے پاس تک بلا سکتی ہیں اور شراب الوہیت پلا سکتی ہیں۔ مزید براں خدا انسان کا عمیق ترین نفس ہے، اس لیے ان دونوں کا جدا ہونا ایک ناممکن الوقوع امر ہے جسکا کبھی خوف نہ ہونا چاہیے، ایک پاک و صاف دل میں اور اس اطاعت شعاری میں جو صداقت کی خاطر تکالیف برداشت کرنیکے بعد حاصل ہوتی ہے، اور اس روزانہ پرستش میں جو ہم محبت کے مندر میں ہر صبح و مسا کرتے ہیں ہم اس دلفریب آقا کی موسیقی سن سکتے ہیں۔ چرواہوں کے جھرمٹ میں وہ راگ اب بھی ہوا کے پروں پر رواں ہیں، کاش ہماری دنیا کا مختصر سا دروازہ کھلے اور ہم اس آب و ہوا میں سانس لے سکیں جہاں حسن ازلی کی درخشاں جلوہ فرمائیاں موجود ہوتی ہیں، در اصل دل کا صاف ہونا ایک بدیہی شرط ہے، اسکے بعد اعلیٰ و ادنیٰ کی کوئی تخصیص نہیں، ہر فرد پیامات الٰہی سن سکتا ہے، اور ان نورانی شعاعوں سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے جو صرف برگزیدہ ہستیوں کی باصرہ نوازی کرنے کے لیے تخلیق کی گئی ہیں۔

---

میں نے اسکو اولیں مرتبہ ایک حسین مگر خاموش و پر سکون موضع میں دیکھا تھا جہاں ایک میلہ میں قرب و جوار کے مرد، عورتیں اور بچے جمع ہوے تھے، اور چونکہ وہ کرشن جی کی ولادت کا یوم سعید تھا اس لیے کل مجمع رنگا رنگ کے ملبوسات سے مرصع و مزین تھا۔ سیاہ آنکھوں والی لڑکیاں

ایک بے خبرمستانہ پن میں مصروف قتل و غارت گری تھیں سن رسیدہ مرد اور عورتیں گھر کے ساز و سامان کی خریداری میں مصروف کار تھیں، بچے کھلونے اور مٹھائی کے حصول میں کوشاں تھے۔ لیکن اُس جم غفیر میں صرف ایک ذات ایسی تھی جس نے میری توجہ اپنی جانب منعطف کی، وہ اپنی بانسری بجا رہا تھا، اُس کے لحن داؤدی کو سُن کر میں نے اپنے دل کی کھڑکیاں کھول دیں تاکہ اُسکے دلآویز نغمے اُس میں پناہ گزیں ہوں۔

وہ ماہر موسیقی باہزاراں عشوہ گری وہاں موجود رہا، پری تمثال لڑکیاں گرداگرد آکر جمع ہوگئیں اور جام محبت پی پی کر سرشار ہونے لگیں۔ نوجوان لڑکے آتے اور اُس کی وجد آور سحر طرازی سُن سُن کر مست و بیخود ہو جاتے، لیکن وہ کسی معمولی کلاونت کی طرح انعام و اکرام کا متمنی نہ تھا، وہ لبِ راہ ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ میلے کے بعد ایک روز میں اُس سے ملنے گیا اُس کی روح ایک بچے کی طرح پاک اور بے لوث تھی گو دماغ عقل و ہوش سے معمور تھا۔ وہ اپنی بانسری بجانے میں شدت سے محو تھا جسکو وہ مکان میں کھیت میں، سڑک پر، شاہراہ پر، میلے میں، بازار میں بجاتا پھرتا تھا، میں پھر ایک روز شام کے وقت اُسکے پاس گیا اُس نے گرمجوشی سے میرا استقبال کیا۔ دوران مکالمہ میں میں نے دریافت کیا کہ اُس عظیم الشان بڑائی اور اہمیت کا راز کیا ہے جس کی جستجو میں افراد و اقوام سرگرداں ہیں؟

"بڑائی"؟ بانسری بجانے والے نے کہا "محض ایک نقاب ہے جو چھوٹے دماغوں پر آویزاں ہوتا ہے۔ برادر من! محبت کرنا سیکھو، اور بڑائی کا خیال دل سے نکال دو"

لیکن سیاسی مبصر کہتے ہیں اور بار بار زور دیتے ہیں کہ ہندوستان کو اقوام عالم کے زمرے میں بڑا ہونا چاہیے۔ اور ترقی و تمدن کے میدان میں گوے سبقت لیجانا چاہیے"

"سیاسی مبصر بسا اوقات محب وطن نہیں ہوتے، بڑائی کی جستجو دورحاضرہ کی جمہوریت پر ایک سیاہ ترین داغ ہے، اُس کی محرک ملک گیری و ہوسناکی ہے، اور اس کا ذریعہ حصول جنگ و غارت گری۔ ہندوستان کو بڑا نہ ہونے دو بلکہ بنی نوع انسان کا ایک ادنیٰ ترین خدمتگذار"

"اس خدمتگذاری کا راستہ کون سا ہے؟"

مُرلی منوہر بہت سفر کرچکا تھا، اور بہت سے عقلا و فضلا سے ہمکلام ہوا تھا، اُس نے لبابِ نظر

کا مدتوں مطالعہ کیا تھا، اور کل عالم کی مستند تاریخیں بغور پڑھی تھیں جو خدا کے باغیوں کے شکستہ خوابوں سے تعبیر ہوتی ہیں ـــــ صداقت، حُسن، اور آزادی کے خواب جن کو قوت پُر تمکنت شوکت آنِ واحد میں پریشان کر دیتی ہے ۔

بانسری بجانے والا کچھ دیر رُکا اور کہنے لگا "خدمت کا طریق افضل صرف یہ ہے کہ غلط خیالات اور لغو اعتقادات کو نیست و نابود کیا جائے، ہر زمانے میں غلط فہمیاں ہوتی چلی آتی ہیں، اور بعض اوقات دنیاوی ترقی محض ایک غلط فہمی سے دوسری غلط فہمی تک جست کا نام ہوتا ہے تہذیب و تمدن کا خواب خیال اس زمانے میں خاص طور سے اہم ہے جس نے انسان کی زندگی میں خاص حصہ لیا ہے ۔ تم سب مغرب کی تہذیب کے موافق شائستگی حاصل کر رہے ہو، تمھاری سیاست یورپ کی سیاست کی ایک صدائے بازگشت ہے ۔ کیا کوئی غیر ملکی سیاسی مشین تمھارے ملک کے جسم مردہ میں روح پھونک سکتی ہے ؟

حُسن کی دل فریبیاں بھدّی ہو جاتی ہیں اگر وہ غلط تصورات اور خیالات میں پوشیدہ رہیں اس آلائش کو دُور کرو، پھر تاریخ کی روح اور قوم کا اصلی اور واحد تخیل تمھارے سامنے ہوگا۔ روپیہ، شہرت، خطابات، قوت اُن انسانوں کا مقصد حیات ہیں جو علم سے دُور اور جہالت کی تاریک وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں ۔ کیا تم دورِ موجودہ کی نہ ختم ہونے والی جنگ آرائیوں میں حسن و جمال کا مشاہدہ کر سکتے ہو؟ اگر نہیں تو تم نے ہندوستان سے محبت کرنا نہیں سیکھا، اور خدمت گزاری کے صراطِ مستقیم سے دُور رہے "

میں اُسکو دیکھتا تھا اور فرطِ حیرت و استعجاب سے آسمان کی طرف دیکھنے لگا ۔ مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے دریافت کیا کہ تم نے کس طرح علم سیکھا، کس طرح مغنّی کی کامل مہارت حاصل کی، اور حُسن کے پُجاری بنے ؟

جسکے جواب میں وہ بیخود ہو کر مجھے ایک داستانِ درد سُنانے لگا اسوقت مجھے معلوم ہو سکا کہ کس طرح ایک المناک درد اُسکے پہلو میں جا گزیں ہوا، اور اُس درد نے رفتہ رفتہ نغمے کی صورت اختیار کی ۔ وہ فلسفۂ دوراں بچپن تھا اور چاہتا تھا کہ کسانوں، مزدوروں، اور دیہاتیوں کو راگ گا گا کر سنائے، اور اُنکے قلوب کو نازک اور لطیف تاثرات کا مدفن بنا دے ۔ اسی درد

سے اُس نے اپنے آرٹ کی تعمیل کی، اور رنج والم کے سیاہ ترین سمندر میں اُس نے حسنِ ایزدی کا حسین ترین پرتو دیکھا۔

رخصت ہونے سے قبل اُس پیکرِ ناز و انداز نے پھر ایک مرتبہ بانسری بجائی، اور ایک ایسا حیرت انگیز نغمۂ درد چھیڑا کہ میرے نظامِ عصبی میں ارتعاش پیدا ہونے لگا، اور میں مضطرب ہو کر پوچھنے لگا کہ اس جادو گری کا مفہوم کیا ہے؟ - جس کا جواب یہ تھا -

"اُس جگہ چلو جہاں یہ بانسری رہنمائی کر رہی ہے، اُس مقدس سرزمین میں جہاں ناکام تمنائیں اور نا شاد مرادیں رہا کرتی ہیں، اور جہاں ربّ اتھر یا ہزاراں جاہ و جلال جلوہ فگن ہوتا ہے صرف رنج و محن کی حسن و خوبی ہر ذی حس کی حیات کو مالا مال، قوی، اور آزاد بنا سکتی ہے"

---

میں صرف وہی کہنا چاہتا ہوں جو تم بارہا سُن چکے ہو لیکن بدقسمتی سے جو ہم نقش و نگار طاقِ نسیاں بنا چکے، تم نے اُس سرزمین کی کرشمہ سازیاں اور حیرتناکیاں مطالعہ کی ہیں جو تمھاری آرزوؤں کا گہوارہ، تمھارا ملجا و ماویٰ، یعنی تمھارا وطن ہے۔ تم نے کرشن جی کی ترنم ریزیوں کو صفحۂ دل سے حرفِ غلط کی طرح محو کر دیا، اس لیے تمھاری بیکسی و بے بسی، نقاہت و مصیبت ضرب المثل ہو چکی۔ تمھارا خیال غلط ہے کہ تمھارے پاس نہ دولت ہے اور نہ عزت ہے۔ تم ایک وسیع اور پُر شوکت میراث کے مالک ہو، تم میں لا متناہی خزانے مدفون ہیں، اور تمھارے دلوں میں ابدی الہام کا ایک وسیع سرچشمہ موجزن ہے۔ کاش تم کو اپنی اس پوشیدہ حشمت و سطوت کا پورا پورا احساس ہوتا اور تم محسوس کر سکتے کہ کائنات بھی تمھاری فتوحات کے لیے ناکافی ہے۔

دلوں کا وہ کونسا عزیز ترین راز تمھارے قلوب میں مخفی تھا جسکو کرشن جی کی مُرلی نے طشت از بام کر کے عناصر میں ہلچل ڈال دی، اور جسکے مقناطیسی اثر سے سادہ لوح گوپیاں مست الست ہو جاتیں، اور اُس آقا کی خدمت اپنا مقصد وحید تصور کرنے لگتیں۔ بیشک کرشن جی کے نازک نغموں میں سچی خوشی پوشیدہ ہوتی تھی جو مکمل آزادی کی روشن ترین دلیل ہے۔ وہ ہاتھ حریص اور خود غرض ہیں جو جبروت و سطوت کے مکانات تعمیر کرتے ہیں، اور بہ قلیل عرصے میں

قید خانے بنجاتے ہیں ۔ اور روح کو اپنی گرفت میں مقید کر لیتے ہیں - ہم قوت، رتبہ، اور سونا خریدتے ہیں، لیکن اس خرید و فروخت میں ہم اپنا متاع آزادی دے ڈالتے ہیں - یہ ہماری نہایت عبرتناک کوتاہ اندیشی اور کم بینی ہے کہ ہم سونے کی جگمگاہٹ پر فریفتہ ہو جائیں، حکومت کی ابلہ فریبیوں کو مآل زندگی تصور کرلیں، اور اُس جوہر عزیز سے دست بردار ہو جائیں جو ہماری خودداری، عزت اور جاہ و جلال کا بنیادی پتھر ہے - حیف!

آثار حیات بالعموم کیا ہیں؟ یعنی زندگی عبارت ہے کس سے؟ دراصل زندگی نام ہے تحریک حاصل کرنے اور اُس پر عمل پیرا ہونے کا - پودھا اُسوقت ضایع ہو جاتا ہے جب اُس میں روشنی، ہوا، اور پانی کے اثرات قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی - ایک مُردہ پھول موسم کے تغیرات اور آب و ہوا کی گوناگوں تبدیلیوں سے قطعًا بے نیاز ہو جاتا ہے - وہ کتا مُردہ ہے جو اپنے آقا کے کلمات محبت سے غیر متاثر رہے اور اثرات ماحول سے مستغنی ہو - پس اُس شخص کو مردہ تصور کرنا چاہیے جو اپنے اعزا و احباب کے محبت آمیز اثرات قبول کرنے کا اہل نہ ہو اور دنیا و ما فیہا کی کرشمہ سازیوں سے بالا تر ہو جائے - تمہارا جسد خاکی جسکے اندر طائر روح موجود ہے ایک عظیم الشان میراث ہے جو تمہارے آبا و اجداد سے تم تک پہونچی ہے، اور تمہارا ذہن اور دماغ اُس سوسائٹی کا مرہون احسان ہے جس میں تم شرکت کرتے ہو، اور موجود رہتے ہو -

گیتا میں کرشن جی نے دو باتوں پر خاص توجہ دلائی ہے - یعنی "تپسیہ" اور "یگین" - تم نے زندگی کا بڑا حصہ چین و آرام، آسایش و زیبایش میں بسر کیا ہے، اس لیے میں تم کو تپسیہ کے راستے پر چلانا چاہتا ہوں - قوموں کی تدریجی ترقی کے کارنامے پڑھو، ممالک کی تاریخیں دیکھو، وہ صرف تپسیہ کھینچنے والے اصحاب کے آہنی ارادے تھے جو تاریخ کو وجود میں لائے اور عالم کے کاروبار میں انقلاب عظیم پیدا کر گئے - تم دولتمند اور مالدار آدمیوں کا تعاقب کرتے ہو اس اُمید موہوم میں کہ شاید اُنکے خوان کرم سے کوئی ریزہ گر جائے، اور تم اُس سے لطف اندوز ہو سکو - یہ طرز عمل آزادی کے لیے سم قاتل ہے - اور خودداری کے منافی - کیا خود غرض روسا نے کبھی تمہارے ملک کی مدد کی، اور فاقہ کشوں کے دامان حاجت کو گوہر مراد سے بھرا؟ میں معمولی اصحاب کی چاپلوسی اور دنیا دار حکام کی خوشامد کو اپنا پیشہ بنانا نہیں چاہتا، اور اُنکی توہین بھی میرا مقصد نہیں ہے،

لیکن یہ میں جانتا ہوں اور بہ زور کہنا چاہتا ہوں، کہ ملک و ملت کا اصلی سرمایۂ فخر و نازش غربا اور بیکس فقرا ہیں جن کے صاف و شفاف دلوں پر کرشن جی حکومت کرتے تھے اور جن سے وہ بطیب خاطر متوجہ ہوتے تھے ۔ گوکل اور بندرابن کے نادار چرواہے اور مفلوک الحال گوپیاں مذہبی ہنگامہ آرائیوں میں دل و جان سے شریک ہوتی تھیں ۔ جن کے خیالات سنجیدہ، جذبات پاکیزہ اور عقائد درست ہوتے تھے ۔ تپسیہ سے ہندوستان کو بڑی قوت پہونچے گی کیونکہ اس سے منکسر المزاجی صلاحیت، خدمت کی عادت اور الفت پیدا ہوتی ہے ۔ اور یہی وہ اوصاف ہیں جن کی ہند کو شدید ضرورت ہے ۔ ایک دولتمند اور عالم شخص آرٹ اور تبحر علمی پہ زور و شور سے گفتگو کرنے لگتا ہے لیکن تمہارے دل مطلق اثر پذیر نہیں ہوتے ۔ ایک سادھو آ موجود ہوتا ہے اور چند سادے لفظ زبان سے کہکر اپنا شیدائی بنا لیتا ہے ۔ یہ کیوں؟ سادھو تپسیہ کا بندہ ہے ۔ اور اسکے فعل اور اسکے گفتار میں تپسیہ کا جوہر موجود ہوتا ہے ۔

تپسیہ میں "گیتا" کا اضافہ کردو ۔ "گیتا" کوئی علمی اور بیرونی رسم نہیں ہے ۔ "گیتا" صرف وہی شے ہے جو خدا کے حضور میں پیش کرتے ہو ۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اُس خداوند کون و مکاں کے روبرو کیا پیش کرسکتے ہیں جسکے دربان سلیمان نوازی پر قادر ہوں؟ لیکن خدائے جل شانہٗ چھوٹی سی چھوٹی اور حقیر سے حقیر شے قبول کر لیتا ہے بشرطیکہ وہ خلوص اور محبت کے ساتھ پیش کی جائے ۔ اور حضور قلب سے بصد خضوع و خشوع اُس دربار عالیہ میں گذرانی جائے جہاں محمود و ایاز ہمرتبہ نظر آتے ہیں ۔ امداد کا ایک چھوٹا سا خیال، ہمدردی کا ایک حقیر ارادہ، مہربانی کا ایک مختصر سا کام، محبت و الفت کا ایک ناچیز کرشمہ، یہ تمام امور اُس رب غفور کی نگاہ میں بہت اہم ہیں اور اس لیے خاص طور سے قابل التفات ۔

محمد عبد الشکور ۔ بریلوی (از علیگڈھ)

---

اے دل نفسے بیادِ حق نشدی　　　وز کردۂ خویشتن پشیماں نشدی
صوفی و فقیہ و عالم و دانشمند　　　این جملہ شدی مگر مسلماں نشدی

شیخ ابوسعید ابو الخیرؒ

# کلامِ حسرت

نہ ہوئے آپ آشنائے خلوص      نہ سنی میری التجائے خلوص
ہم ہیں بیزارِ کبر و عجب و ریا      کیوں نہ درکار ہو دوائے خلوص
طے کر اے دل بہ زورِ علم و عمل      راہِ بیم و رجا بپائے خلوص
زہد، حیران کارِ عشق ہوا      ہم میں پاکر نہ کچھ سوائے خلوص
بڑھ چلی اُن کی بے رُخی، گویا      تھی سزائے ہوس جزائے خلوص
تم دعا کو بھی التجا سمجھے      تھی وہ حالانکہ اک صدائے خلوص

---

زہد و تقوائے ریاضت و عزلت      بن گئے جبکہ دست و پائے خلوص
نفس و شیطان و خلقت و دنیا (ق)      سب پہ غالب ہوئی دعائے خلوص

---

دل کا تقوےٰ ہے خیر خواہیِ خلق      ہو بشرطیکہ بر بنائے خلوص

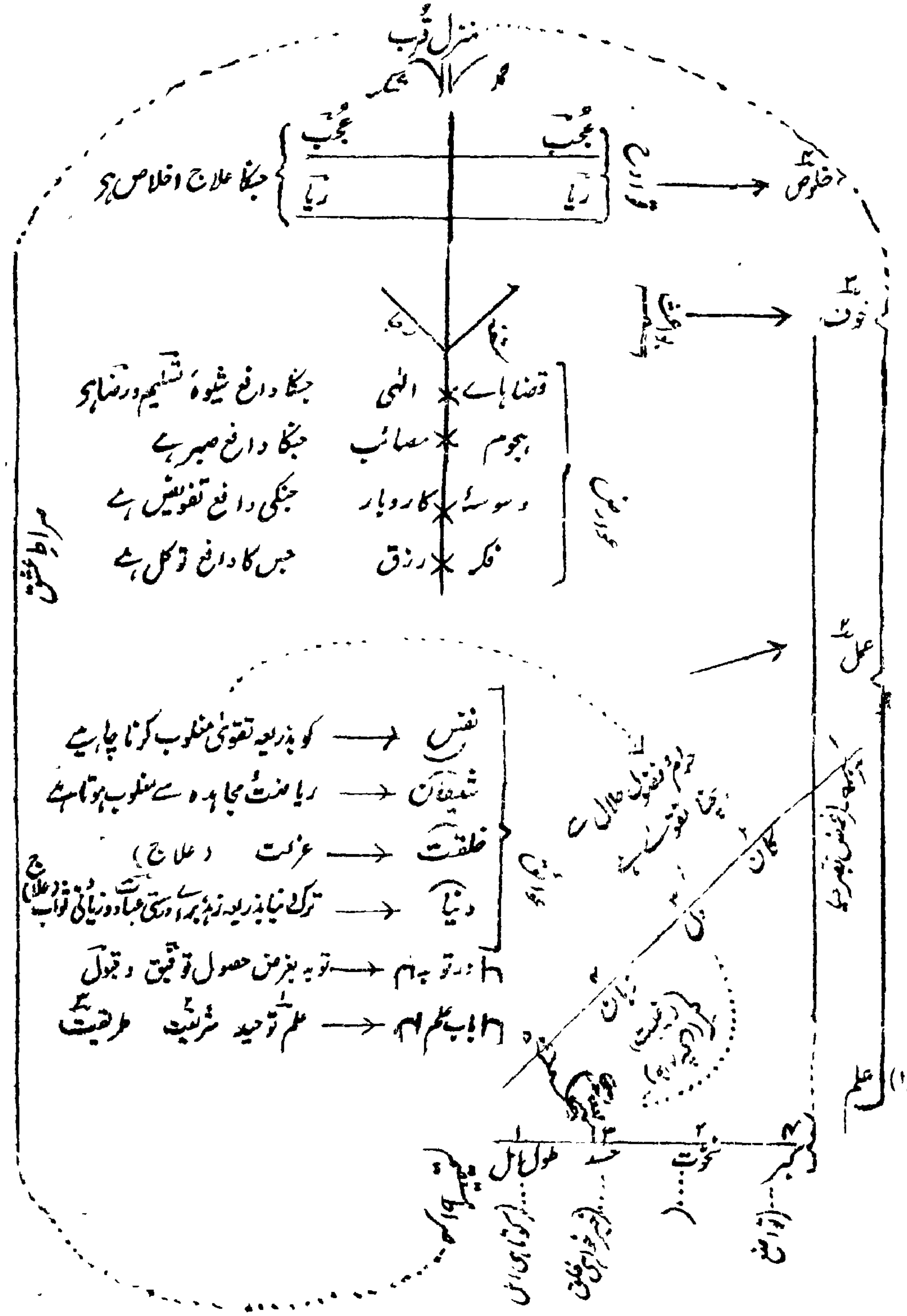
---

فکرِ رزق و مصائبِ تقدیر      عارضِ حال تھے بجائے خلوص
سو بہ صبر و توکل و تفویض (ق)      بن گئے شیوۂ رضائے خلوص

---

توبہ و علم و حمد و شکر ہیں باب      شہر ہے شہرِ پُر فضائے خلوص
ذکر و فکر و ریاض و صوم و صلوٰۃ      سارے جھگڑے ہیں اک برائے خلوص
اور حقیقت میں انکے سب کے سوا      عشق ہے اصل مدعائے خلوص

انکو اب ضد یہ ہے کہ حسرت بھی
شوق ظاہر کرے بجائے خلوص


منزل قرب
عُجب
عُجب
ریا
ریا
جنکا علاج اخلاص ہی
خلوص
خوف
قضاہاے الٰہی جنکا دافع شیوۂ تسلیم و رضا ہی
ہجوم مصائب جنکا دافع صبر ہے
وسوسۂ کاروبار جنکی دافع تفویض ہے
فکر رزق جس کا دافع توکل ہے
عمل
نفس کو بذریعہ تقویٰ مغلوب کرنا چاہیے
شیطان ریاضت مجاہدہ سے مغلوب ہوتا ہے
خلقت عزلت (علاج)
دنیا
توبہ بغرض حصول توفیق و قبول
علم توحید شریعت طریقت
علم
طول امل
حسد
نخوت
کبر

# واعظوں سے التماس

مذہبی ضرورت کے لیے تعلیم قرآن سے آغاز تعلیم ہوا۔ پھر اسکے بعد صحبت اور اقوال و افعال رسولؐ سے قرآن کا سمجھنا اور اصولی مسائل سے فروعی مسائل کی تعلیم شروع ہوئی۔ جب کوئی بات جماعت کے سمجھانے کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھی تو وہ خطبے یعنی اسپیچ کی ذریعے بیان کی جاتی تھی۔ مدینۂ منورہ میں خلافت اربعہ تک تعلیم مذہب کا یہی ڈھنگ رہا۔ مدینۂ منورہ کے باہر جو صحابہ یا تابعین جاتے تھے اُنکے گرد لوگ آنحضرت محمد صلعم کے حالات سننے کو مشتاقانہ جمع ہو جاتے تھے اور بیان کرنے والے اپنی قلت معلومات کی وجہ سے یا لوگوں کو اپنی طرف گرویدہ کرنے کے لیے کبھی کبھی بیان میں مبالغہ بھی کرتے تھے۔ اور بعض یہ بھی سوچتے تھے کہ اگر اچھی بات سکھانے میں کچھ مبالغہ بھی ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ یہیں سے وضعی حدیثوں کی ابتدا ہوئی۔ اور یہ عیب خلیفۂ دویم نے اول اول محسوس کرکے اپنے عاملوں کو تاکید کرنا شروع کی کہ غیر مقامات پر جاکر تم تعلیم قرآنی کے بجائے حدیث نبویؐ کے بیان میں غلو نہ کرنا۔ یہاں تک غنیمت تھا لیکن خلیفۂ سیوم کے آخر عہد میں جب مسلمانوں میں سیاسی جھگڑے شروع ہوئے تو وضع حدیث کی طرف لوگ بدنیتی سے رجوع ہوئے اور خطبے نے وعظ کا رنگ اختیار کیا۔ حضرت علیؓ کی نسبت مشہور ہے کہ وہ واعظوں کے جلسوں کو منتشر کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت حسن بصریؓ کا وعظ روکنے کے لیے حضرت علیؓ خود موقع پر گئے تو بیانات وعظ کو صحیح اور مناسب حال پاکر فرمایا کہ ایسے واعظ کا میں مخالف نہیں ہوں"۔

حضرت معاویہؓ اور اُنکے مابعد زمانے میں موضوع حدیثوں کی اتنی کثرت ہوئی کہ بڑی مشکل سے صحیح حدیثیں الگ کی گئیں۔ اہل سنت و جماعت کے نزدیک چھ کتابیں حدیث کی جو صحاحِ ستہ کے نام سے مشہور ہیں زائد معتبر ہیں۔ لیکن انکے اعتبار کے بھی مدارج ہیں۔ یہ مضمون حدیثوں کے متعلق نہیں ہے، اسلیے زائد لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ جو حدیثیں سیاسیات کے متعلق ہیں اُنکے متعلق ذی علم کو زائد تر غور و فکر کے ساتھ رائے قائم کرنا چاہیے۔

غرضکہ واعظین کا گروہ جو حضرت علیؓ کے وقت میں قائم ہوچکا تھا وہ روز بروز بڑھتا گیا۔ محدثین اس جماعت کو "قصاص" سے تعبیر کرتے ہیں۔ واعظ کا لفظ زمانہ مابعد میں اختیار کیا گیا ہے۔

واعظوں کی جماعت ہر قرن میں رہی اور اشاعت مذہب میں ان سے مدد ملی۔ لیکن یہ کہنا کہ ان سے کبھی نقصان نہیں پہونچا۔ صحیح نہ ہوگا۔ کیونکہ جب سیاسیات کے متعلق انکے ذریعے سے بیجا بناوٹیں پھیلیں یا بادشاہ کی نامناسب خواہشوں کی تائید انکے ذریعے سے کی گئی تو ظاہر ہے کہ یہ اچھا نہیں ہوا۔ اور تاریخیں بتاتی ہیں کہ کبھی کبھی ایسا بھی ضرور ہوا۔ اور جن وعظوں میں واعظوں کے ذاتی اغراض شامل تھے یا واعظوں کی مذہبی ناقابلیت شامل حال تھی وہ بھی اسی قبیل سے ہیں۔

اس زمانے میں بھی واعظوں کی کثرت ہے۔ بہت کم ایسے لوگ ہیں جو محض حصول ثواب کی غرض سے وعظ کہتے ہیں لیکن دنیا ان سے خالی نہیں ہے۔ انھیں میرے خیال میں مجاہدین اسلام میں شمار کرنا چاہیے۔ ان واعظین کے عقائد درست ہوں اور مذہبی معلومات کافی ان کے پاس ہوں تو یہ امام قوم ہیں۔ انکے بعد وہ واعظین ہیں جو اکتساب رزق کے لیے پیشہ واعظی اختیار کرتے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ قوم سے بذریعہ توکل وقناعت صدقہ یا ہدیہ پائیں یا کسی جماعتِ مسلمین کے تنخواہ دار ملازم ہوں۔ میں اس قسم کے پیشے کے متعلق کوئی رائے ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن میں اس کے کہنے کو تیار ہوں کہ یہ پیشہ بہت سے مروجہ پیشوں سے اچھا ہے۔

عام طور پر یہ شکایت ہے کہ واعظوں سے نفع نہیں پہونچتا۔ میرے نزدیک یہ شکایت صحیح نہیں ہے۔ نفع ضرور پہونچتا ہے لیکن نہ اتنا جتنا پہونچنا چاہیے۔ نفع نہ پہونچنے کی وجہ یہ ہے کہ واعظین کا طریقہ وعظ بگڑا ہوا ہے۔ میں اس مضمون میں اُن نقائص کا بیان کرتا ہوں جنکی اصلاح ہونا چاہیے اور کچھ وہ طریقہ لکھنا چاہتا ہوں جس پر عمل کرنا چاہیے۔

بعض واعظ ایسے اوامر بیان کرتے ہیں جن کے وہ خود پابند نہیں ہیں یا ایسی باتوں سے منع کرتے ہیں جن سے وہ خود اجتناب نہیں کرتے۔ ایسے واعظوں کا وعظ باعث ہدایت نہیں ہوتا باعث تضحیک ہوتا ہے۔ واعظوں سے یہ فرمائش کرنا کہ وہ اتباع سنت کا خود نمونہ دکھائیں بے سود ہے۔ لیکن یہ تو اُن سے کہا جا سکتا ہے کہ جن امور کے آپ خود پابند ہوں اُنھیں کی بابت

دوسروں کو ترغیب دیجیے اور جن عیوب میں آپ خود مبتلا ہیں اُن سے دوسروں کو نہ ڈرائیے۔ واعظین کے نزدیک سامعین کا ہنسانا یا رُلانا غایت وعظ گوئی ہے۔ حالانکہ یہ تھیٹر کے تماشوں کی شان یا بھانڈوں کا شیوہ ہے۔ واعظوں کی غرض تبلیغ احکام مذہب ہے۔ ہنسانا یا رولانا ان کا کام نہیں ہے۔ یہ خلافتِ انبیا کے فرائض ہیں۔ انھیں بہت سکون اور وقار سے انجام دینا چاہیے۔ شعرخوانی گو متقدمین کا شعار وعظ نہ تھا لیکن اگر اعتدال کے ساتھ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں مگر مجلس وعظ کو بزم مشاعرہ بنا دینا حلیۂ مذہبی کی توہین کرنا ہے۔ تعلیم اور تلقین احکام مذہبی کے سوا اگر کوئی اور غرض واعظوں کے مدنظر ہو تو یہ مجلس وعظ کا بدنام کرنا ہے۔ احکام قرآن اور حالات رسولؐ کے سوا مجلس وعظ میں اور باتیں بیان کرنا بیکار اور کبھی کبھی منجر بہ ضلالت ہوتا ہے۔ ہاں انبیا علیہم السلام کے قصص اور علما و مشائخ امت محمدی کے حالات جو اتباع سنت نبوی سے مناسبت رکھتے ہوں بیان کیے جائیں تو مضائقہ نہیں کیونکہ یہ سنتِ نبوی کا بیان کرنا ہے۔ معائب شرعی کی توہین مجلس وعظ میں بیان کرنا نہایت ضروری ہے۔ اگر روے سخن حضارِ مجلس کی طرف ہو تو چنداں مضائقہ نہیں۔ ایسے موقع پر مداہنت سے کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ لیکن طرز بیان اور الفاظ ایسے ہوں کہ حضار جلسہ کو بیان سے تنفر نہ پیدا ہونے پائے۔ اور اگر واعظ کو اپنی زبان پر قابو نہیں ہے تو اُسے اُس وقت تک کہ سامعین کے دلوں پر اُسکی وقعت پورے طور پر نہ جم جائے نفرت انگیز مضامین سے گریز کرنا چاہیے۔ اور جب سامعین معتقد ہو جائیں تو پھر جس طرح چاہے سمجھائے۔ یہ بڑا نازک مقام ہے۔ واعظ کو اعلاے کلمۃ الحق میں تامل نہ کرنا چاہیے۔ لیکن اُسکے ساتھ یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ سامعین منتشر نہ ہوں۔ کیونکہ وعظ تو آدمیوں کے سنانے کے لیے ہوتا ہے۔ در و دیوار کو سنانا مقصود نہیں ہوتا۔

جتنی باتیں اوپر بیان کی گئیں ان سے زائد تر اہم محل اور موقع کا پہچاننا ہے۔ ایک مرتبہ میں ایک مجلس میلاد شریف میں گیا۔ بیان کرنے کے لیے ایک مولوی صاحب منتخب ہوے تھے۔ رطب و یابس اقوال کے بجاے اُنھوں نے وعظ بیان کرنا شروع کیا۔ میں سمجھا کہ مولوی صاحب موجودہ طرز کو بدعت سمجھ کر خدا اور رسول کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

یہ جدت دیکھ کر میں ہمہ تن گوش ہوا - مولوی صاحب نے وہ آیۂ قرآنی پڑھی جو حضرت عائشہؓ کی براءت میں نازل ہوئی تھی اور سارا وقت اور ساری قابلیت اسکی تفسیر بیان کرنے میں صرف کر دی - باہر مرد اور پردے میں عورتیں تھیں - میں نہایت ہی بے کیف ہوا اور دوسرے لوگ بھی بدحظ ہوئے - خیر یہ تو انتہا سے بے عقلی تھی - لیکن درس اور وعظ میں واعظین عموماً فرق نہیں سمجھتے - درس دینے کا یہ طریقہ ہے کہ وقت و مقام معین پر احکام مذہب بیان کیے جائیں - ایک کے بعد دوسرا بیان مسلسل ہو اور جب سلسلہ ختم ہو تو پھر اس کا دور شروع ہو - بیان زبانی ہو یا کسی کتاب کے ساتھ مخصوص ہو - پچھلی صورت میں سامعین کے ہاتھوں میں کتابیں ہوں تو مضائقہ نہیں - یہ ضرور نہیں ہے کہ سامعین میں سے ایک پڑھے اور دوسرے سنیں - اور درس دینے والا مفہوم سمجھاتا جائے - بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مدرس ہی پڑھے، مدرس ہی کہے - مفہوم سمجھائے - سامعین کے ہاتھ میں کتابیں ہوں یا نہ ہوں، بیان سے وہ فائدہ اُٹھائیں - یہ طریقہ درس کا متقدمین میں تھا - اسکی مثال میں نے اپنے بچپن میں پٹنہ میں دیکھی تھی - بے انتہا میں نے پسند کیا - میں نے چاہا کہ اسکی مثالیں اور شہروں میں بھی قائم ہوں مگر نہ ہوئیں - اور قاضی رضا کے مرنے پر پٹنہ میں بھی یہ طریقۂ درس قائم نہ رہا - دوسرا طریقہ وعظ و نصیحت کا ہے - وعظ میں مقامی ضرورت اور سامعین کی حالت کا خیال رکھنا ازبس ضروری ہے - وعظ اور درس میں واعظین ذرا بھی فرق نہیں کرتے - اور اس لیے اُن کے وعظ کا وہ اثر نہیں ہوتا جو ہونا چاہیے - مثلاً انجمن اسلام گورکھپور میں برسوں سے سالانہ جلسے ہوتے ہیں اور واعظین جمع ہوتے ہیں - بڑا مجمع بڑی دھوم ہوتی ہے - تمام شہر میں ہلچل مچ جاتی ہے - اور جب سے یہ خیال ہوا کہ آریہ سماجیوں کے جلسے سے اسلامی جلسہ شان و شوکت میں بڑھا ہوا ہے تب سے تو اور بھی جلسوں کی شان بڑھ گئی ہے - لیکن ان جلسوں سے کوئی معتدبہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا - کچھ مذہبی معلومات تو ضرور حاصل ہوتے ہیں لیکن وہ ایسے نہیں ہوتے کہ مذہبی معلومات پر معتدبہ اضافہ کریں - میں اسکے بھی خلاف ہوں کہ ایک ہی جلسے میں کئی اشخاص یکے بعد دیگرے کھڑے ہو کر اپنی خوش بیانی کا نمونہ دکھائیں - مجلس وعظ کو مولویوں کی نمائش گاہ بنانا اچھا نہیں معلوم ہوتا - گو بظاہر مولویوں کے لیے مضمون علیحدہ علیحدہ

مقرر کر دیے جاتے ہیں لیکن تقریر کے وقت انھیں موضوع کا خیال نہیں رہتا۔ ہر مولوی اسی بات پر آ جاتا ہے جسے وہ بہتر جانتا ہے۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معلومات کا دائرہ بہت چھوٹا دکھائی دیتا ہے۔ ایک نقص یہ بھی ہے کہ ان واعظوں کو پہلے سے اطلاع نہیں دی جاتی کہ وہ اپنے اپنے مضامین کے لیے تیار ہو جائیں۔ کتنا ہی متبحر عالم ہو لیکن اپنا وعظ مذہبی کتابوں کے مطالعہ سے پہلے تیار نہ کرلے تو معتدبہ فائدہ سامعین کو اپنے فوری بیانات سے نہیں پہونچا تا۔

وعظ میں مقامی ضرورتوں کا لحاظ نہ رکھتے ہوے گفتگو شروع کرنا بیکار ہے۔ مثلاً جہاں نفس اسلام سے بے اعتنائی ہو وہاں نماز روزے کے احکام کا بیان کرنا بے سود ہے۔ واعظ یا مہتمم مجلس وعظ کو مقامی ضرورتوں کی یادداشت پہلے مرتب کرنا چاہیے اور پھر اسی کے متعلق وعظ ہونا چاہیے۔ اگر کسی مقام پر شرک و بدعت سیئہ کا رواج ہو تو واعظ کی کوشش پہلے انکے رفع کرنے کے لیے ہونا چاہیے۔ جہاں انگریزی صحبت یا انگریزی تعلیم کی وجہ سے وحدانیت اور رسالت میں لوگوں کو شبہات ہوں وہاں متکلمین کے طریقے پر وعظ کہنا چاہیے۔ جہاں مذہبی جہالت کی وجہ سے ارکان مذہب سے لوگ واقف نہیں ہیں۔ وہاں وضو۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج کے احکام اور انکے فوائد کا مصرح بیان ہونا چاہیے۔ جہاں عورتوں کے حقوق وراثت اور نکاح ثانی پامال ہوتے ہوں وہاں ان باتوں کے متعلق وعظ کہنا سب سے زیادہ مقدم ہے۔ جہاں شراب خواری، عیاشی اور دیگر بد اخلاقیاں ہوں وہاں سب سے زیادہ انکی بُرائیوں کے ظاہر کرنے کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ پیشہ وروں اور تاجروں کی جماعت میں وعدہ خلافی اور دروغ گوئی کا رواج ہو تو راستی کے فوائد اور دروغ کے نقصانات کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ جہاں لوگ اپنے گھروں میں اور اپنے پڑوسیوں سے لڑنا باعث فخر جانتے ہیں، وہاں اتفاق کی خوبیاں اور نفاق کی بُرائیاں جماعت میں بیان کرنا اور پھر لوگوں سے فرداً فرداً مل کر اتفاق باہمی قائم کرا دینا واعظ کے لیے بہت آسان اور بڑے ثواب کا کام ہے۔ اور واعظین سمجھیں تو یہ اُنکے لیے حصول زر میں بھی معین ہوگا۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں واعظین ادھر متوجہ نہیں ہوتے بلکہ جہاں بدقسمتی سے وہ مختلف الخیال واعظ پہونچ جاتے ہیں وہاں اور نئے مذہبی جھگڑے پیدا کرا دیتے ہیں۔

ابوالفضل محمد احسان اللہ عباسی (گورکھپور)

# اجل

قائل ہے ہر اک کافر و دیندار اجل کا    ملحد کو تہِ دل سے ہے اقرار اجل کا
خالی نہیں جاتا ہے کبھی وار اجل کا    جاں نذر میں لے لیتا ہے دیدار اجل کا
سمجھے جو کوئی زیست کو تمہید اجل کی
ہو عید سے کچھ کم نہ اُسے دید اجل کی

ممکن کسی صورت سے نہیں موت کا چارا    جیتا رہے تا حشر کسی کو نہیں یارا
دے جان خوشی سے کوئی یہ کب ہے گوارا    سچا ہے جو سچ پوچھیے یہ قول ہمارا
کچھ دم کا بھروسا نہیں۔ آ لے کہ نہ آئے
توبہ کا بھی موقع کوئی پائے کہ نہ پائے

ہو جاتے ہیں سب وقت پہ دنیا سے روانہ    چلتا ہی نہیں موت سے کچھ حیلہ۔ بہانہ
مرنے پہ ہے ہر شخص کا تربت ہی ٹھکانا    مجبور ہیں، معذور ہیں، شاہانِ زمانہ
وہ بھی نہ بچے پنجۂ صیادِ اجل سے
خاموش تہِ خاک ہیں بیدادِ اجل سے

پردیس میں بیمارِ وطن کرتا ہے نالے    اُٹھنے نہیں دیتے ہیں قدم پاؤں کے چھالے
کانٹے ہیں پڑے حلق میں ہیں جان کے لالے    ایسے میں کوئی ایسا نہیں ہے جو سنبھالے
ہمدرد کوئی۔ اہلِ وطن بھی نہیں ملتا
دو گز اُسے مرنے پہ کفن بھی نہیں ملتا

بندہ ہو کہ آقا ہو۔ گدا ہو کہ تونگر    شاعر ہو، سخن سنج۔ سخن گو کہ سخنور
زاہد ہو۔ ولی ہو۔ وہ نبی ہو کہ پیمبر    کچھ فرق نہیں۔ پیشِ اجل سب ہیں برابر
اے موت جو تو کھینچتی ہے اُن کو یہاں سے
جاتے ہیں وہیں۔ لوگ یہ آئے تھے جہاں سے

شیریں ہو۔ زلیخا ہو کہ لیلائے زمانہ — تھی حسن میں یکتا۔ کوئی خوبی میں یگانہ
اے تیر اجل تو نے کیا سب کو نشانہ — آخر کو ملا گوشۂ مرقد میں ٹھکانا
شیریں نہیں ملتی کہیں لیلا نہیں ملتی
اے خاکِ لحد اب وہ زلیخا نہیں ملتی

ہو زندۂ جاوید تو مرنے سے ضرر کیا — عاصی نہیں بندہ ہے تو پھر خوف و خطر کیا
تقدیر میں لکھا ہے جو کچھ اُس سے حذر کیا — رحمت کرے عاصی پہ بھی مولا۔ یہ خبر کیا
ممکن ہے۔ دمِ مرگ۔ کوئی کام ہو اچھا
ممکن ہے کہ آغاز سے انجام ہو اچھا

انجام سے غافل نہ ہو اے مستِ جوانی — تڑپائے گا پیری میں تجھے سوزِ نہانی
اس عالمِ فانی کی ہر اک چیز ہے فانی — ڈھونڈھے سے نہ تو زیست کی پائیگا نشانی
باسط یہی لازم ہے۔ کرے کام خدا کا
رہ جائے گا اک روز فقط نام خدا کا

باسط (بسوانی) شاگرد حکیم جگر

---

لو مل گیا صلہ مرے ذوقِ نیاز کا — پردہ وہ اُٹھ رہا ہے حریمِ مجاز کا
احساس تک رہا نہ ترے امتیاز کا — اللہ رے فریب طلسمِ مجاز کا
دیتا ہے میرے قلب کو روحانیت کا درس — ذکرِ جمیل تیرے رُخِ جلوہ ساز کا
کُل کائنات نغمۂ دردآفریں بنی — اُف رے اثر یہ تیرے غمِ جاں گداز کا
ہستی کو جب مٹا نہ سکا اپنی بیخبر — پھر کیوں خیال شاہدِ ہستی نواز کا
جلوے سے اُس نے تیرے، ہم آغوش کر دیا — ممنون ہوں میں حیرتِ بیگانہ ساز کا
ہستی و نیستی کی بھی منزل ہوئی تمام — لیکن کھلا نہ رازِ طلسمِ مجاز کا
تنہائی فراق کی راتیں بھی کٹ گئیں — ممنون ہوں میں اس دلِ افسانہ ساز کا
آئینہ دیکھتے ہی میں سجدے میں گر پڑا — بیہوشیوں میں ہوش تھا کب امتیاز کا
ثاقب اس انجمن میں جہان خراب کی — محرم تھا کون خلوتِ شبہائے راز کا

[illegible]

# مسئلہ سود

مضمون ذیل مولانا ابوالکلام صاحب کے ایک طولانی مضمون مندرجہ الہلال کلکتہ سے ابتدائی، تمہیدی حصے کو حذف کرکے نقل کیا جاتا ہے۔ منشی طفیل احمد صاحب نے مسئلہ سود کو جس حیثیت میں پیش کرکے جائز قرار دیا ہے اگرچہ اس مضمون میں اُس سے بحث نہیں ہے لیکن مولانا نے سود لینے والوں کا جو نقشہ کھینچا ہے اُس سے عبرت ہونا چاہیے۔ ہمیں امید ہے کہ آیندہ کسی وقت میں ہم تجارتی سود کے متعلق بھی مولانا کے خیالات شایع کرسکیں گے۔

ربح اور ربوا، تجارتی سود اور مہاجنی سود میں مصالح کی بنا پر خواہ کیسا ہی باریک فرق کیوں نہ پیدا کیا جائے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں صورتوں میں سود کا لین دین ہوتا ہے۔ فرق اگر ہے تو شرح سود کی کمی و بیشی کا۔ لیکن جس طرح قلیل سے قلیل مقدار میں شراب استعمال کرنے سے اگرچہ متوالا پن پیدا نہیں ہوتا، لیکن خلاف ورزی شرع کی معصیت ضرور عائد ہوگی بعینہ اسی طرح کم سے کم شرح پر سود لینا بھی علماے شریعت کے نزدیک جائز نہیں قرار پا سکتا۔

سود کے متعلق قرآن کریم میں جو سخت وعید مذکور ہے اُس کی تفسیر اس مضمون میں موجود ہے اور اُس سے عیاں ہونا چاہیے کہ حرمت سود کی علت غائی کیا ہے۔

منشی طفیل احمد صاحب کے نزدیک بھی حرمت ربوا مسلّم ہے۔ اب اگر وہ حرمت کی علت غائی پر نظر فرمائیں اور ربح یا تجارتی سود کا جن صورتوں میں لین دین دنیا میں چل رہا ہے اُن پر اُس کا انطباق کریں تو شاید وہ بھی یہی نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوں گے کہ ربح یا ربوا کی نوعیت میں اگرچہ فرق ہو مگر حقیقت و غایت جدا نہیں ہے۔ فتدبر

---

میں نے ہمیشہ اس امر پر غور کیا کہ قرآن کریم نے انسانی معاصی و جرائم کے متعلق طرح طرح کی

وعیدیں فرمائی ہیں، لیکن سود کے متعلق ایک ایسا لفظ کہ دیا ہے جس سے سخت تر وعید اور کسی سخت سے سخت جرم و معصیت کی نسبت بھی نہیں آئی - اس کا سبب کیا ہے ؟

یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربٰوا ، ان کنتم مومنین۔ فاِن لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ (۲ : ۲۷۸)

مسلمانو! اگر تم صاحب ایمان ہو تو اللہ سے ڈرو، اور تمہارے پچھلے لین دین میں جو کچھ سود باقی رہ گیا ہے اُسے چھوڑ دو۔ (پھر) اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو اللہ اور رسول کے ساتھ لڑنے کے لیے خبردار ہو جاؤ کہ یہ فی الحقیقۃ اللہ اور اُسکے رسول کے ساتھ اعلان جنگ ہے[۱]۔

قرآن کریم نے اس آیت میں سود کے لینے پر اصرار کو حرب من اللہ ورسولہ سے تعبیر کیا ہے کہ اسکے لینے والے اللہ اور اُسکے رسول سے لڑنے کے لیے مستعد رہیں ! بظاہر یہ تشدد تعجب انگیز معلوم ہوتا ہے، انسان کی وحشیت اور بہیمیت نے دنیا میں کیسی کیسی ہیبت معصیتیں کی ہیں اور وہ جب سبعیت و درندگی پر آجاتا ہے تو اُسکے اعمال کس درجہ خوفناک ہو جاتے ہیں، لیکن یہ کیوں ہے کہ قرآن کریم نے کسی انسانی معصیت کو بھی "حرب من اللہ ورسولہ" سے تعبیر نہیں کیا اور اس وعید کے لیے صرف سود ہی کو کہ محض ایک لین دین اور معاملت کی چیز ہے اور زیادہ سے زیادہ انسانی خود غرضی کا (ایک ظہور) تمام رذائل انسانیہ میں سے منتخب کیا!

## حرب من اللہ ورسولہ

یہاں اسکی تفسیر مقصود نہیں مگر اشارہ ضروری ہے۔ سود کے کاروبار کی اگر کوئی تاریخ مرتب

[۱] "فاذنوا بحرب من اللہ" مفسرین نے مختلف اقوال جمع کیے ہیں کہ اس سے مقصود کیا ہے؟ آذنوا کو بعض نے بکسر ذال و مد ہمزہ بروزن آمنوا پڑھا ہے اور بعضوں نے بفتح ذال لیکن مقصود دونوں سے یہی ہے، کہ معلوم کر لو اور خبردار ہو جاؤ۔ حرب من اللہ سے بعض مفسرین نے حقیقی معنی لیے ہیں یعنی جو سود لیں گے اُنسے اللہ اور اُسکا رسول قتال کریگا اور وہ اس سے خبردار ہو جائیں لیکن فی الحقیقت یہاں حرب سے مراد واقعی جنگ نہیں ہے بلکہ وعید و عقاب اور تہدید و ترہیب میں مبالغہ مقصود ہے - یعنی اس فعل کو باوجود نہی ترک نہ کرنا ایک ایسا جرم قرار دیا گیا ہے جو گویا اللہ اور اُس کے رسول کے مقابلے میں حریف جنگ بننے کے مماثل ہے۔ اسی لیے ترجمے میں میں نے اسکو واضح کر دیا ہے۔ (منہ)

کی جاتی تو میں سمجھتا ہوں کہ اس آیت کی بہتر سے بہتر تفسیر خود بخود ہو جاتی. جلب نفع اور خود غرضی سے اس دنیا کے عجیب ترین جانور کا (جسکو انسان کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے) کوئی فعل خالی نہیں، اور اگر خالی ہے تو صرف وہ فعل، جو اُس سے بحیثیت مخلوق حیوانی کے صادر نہیں ہوتا۔ بلکہ اُسکے اندر کی وہ روح انسانیۃ کبریٰ اور معنی خلافۃ الٰہیہ کام کرنے لگتی ہے جو مقام ملکوتیۃ سے بھی ارفع، اور دربابِ مقامِ قدوسیت اعلےٰ ہے۔ مذہب، قانون، اخلاق، سوسائٹی، اور اسی طرح کی تمام بندشیں صرف اس خود غرضی ہی کے مظاہر شدیدہ کو روکنے کے لیے ہیں۔ اور اگر اس خوفناک جانور کے پاؤں میں اتنی بوجھل بیڑیاں نہ ہوتیں، تو اغراض و استجلاب نفع کا تصادم دنیا کو شیطان کا تخت اور دوزخ کا نمونہ بنا دیتا: لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ ثم رددناہ اسفل سافلین، الا الذین آمنوا و عملوا الصالحات فلھم اجر غیر ممنون (۹۶ : ۶)

## انسانی خود غرضی کا مہیب ترین ظہور

اس خود غرضی کا ایک بدترین ظہور، جمع و حصول مال کی بھوک ہے جسکو پیاس کہنا چاہیے، اگر استسقا کی تشبیہ اس پر راس آجائے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اعمال انسانیہ میں اس مرض کا کوئی ظہور اس درجہ انسان کے ملکوتی خصائل کے لیے مہلک، اسکی بہیمیت و سبعیت کے لیے مقوی، ہیئت اجتماعیہ اور مجامع انسانیہ کی صحت مدنی کے لیے سم قاتل اور عالم مخلوقات کے اس جمیل ترین مخلوق یعنی انسان کو خوفناک درندہ بنا دینے کے لیے ایک عمل السحر نہیں ہے، جیسا کہ سود اور سودخواری کی زندگی کی مختلف شکلیں۔

اخلاق و خصائل انسانیہ کا آبگینہ تو اس قدر نازک ہے کہ تجارت اور کاروباری معیشت کی زندگی کی ٹھیس کا بھی متحمل نہیں ہوتا، اور ہمدردی و مروت کا چشمہ کچھ نہ کچھ مکدر ہو ہی جاتا ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ اسکے لیے سود (جس سے بغیر حق محنت حصول نفع کا اصول غیر طبعی قائم ہو جاتا ہے) کس درجہ مضر ہوگا؟

یقیناً تمام انسانی معاصی میں صرف یہی معصیت "حرب من اللہ و رسولہ" ہے۔ کیونکہ اور کسی معصیت میں انسان خدا کے بندوں کے لیے اس درجہ بے رحم اور خونخوار نہیں ہو جاتا، جس درجہ سود کو اپنا وسیلۂ معاش بنا لینے کے بعد از سر تا پا مجسمۂ شقاوت و قساوت و غلظت و صلابت ہو جاتا ہے۔ اور

خدا کے بندوں کے آگے بیرحمی سے مغرور ہونا، فی الحقیقت خدا کے آگے مغرور ہوکر آمادۂ جنگ و پیکار ہونا ہے۔

انسان کے اُن تمام بڑے بڑے جرائم پر، جنکو اسکی خود غرضی کا دیو اسکے اندر انجام دیتا ہے، اپنے سامنے لاؤ اور ایک ایک کرکے دیکھو! بڑے بڑے عادی مجرموں کو تم دیکھوگے کہ بارہا انسانی مظلومی اور بیکسی نے انکی آنکھوں کو اشکبار اور اُنکے دلوں کو دونیم کردیا ہے۔ سخت سے سخت بے رحم ڈاکو اور قاتل کی نسبت بھی تم سُن سکتے ہو کہ اُس نے عین اپنی بے رحمی و قساوت کے کسی عمل کو انجام دیتے وقت ایک بڑھیا عورت کی فریاد، ایک بیکس عورت کی گریۂ وزاری، اور ایک یتیم بچے کے مضطربانہ فغانِ الغیاث پر اپنی کھنچی ہوئی تلوار پھینکدی۔ اور چند لمحوں کے لیے اُسکی بھولی ہوئی معنی انسانیت اُسے یاد آگئی۔

تاریخ اور ملکی روایات نے اُن ڈاکوؤں کے حالات قلمبند کیے ہیں، جو ایک طرف تو دولتمندوں کو لوٹتے، اور مال و دولت سے بھرے ہوئے قافلوں کو تاخت و تاراج کرتے تھے، دوسری طرف صدہا بیوہ عورتیں اور بیکس و مسکین خاندان تھے جن کو ایک فیاض طبع دست کریم، اور ایک دریا بخشش بادشاہ کی طرح امداد و اعانت سے مالامال کردیتے تھے۔ انگلستان کے قرون متوسطہ اور ہندوستان کے گذشتہ زمانے کے بڑے بڑے ڈاکوؤں کی نسبت ہر شخص جانتا ہے کہ انھوں نے قصبات و دیہات کی بیکس عورتوں کے لیے باقاعدہ وظائف و مشاہرے مقرر کردیے تھے۔ اور روم کے ایک مشہور ڈاکو نے ٹیٹس سے کہا تھا "میرا مجرم ہاتھ بادشاہ کے مقدس ہاتھ سے زیادہ غریبوں اور بیکسوں کی مدد کرتا ہے، مگر وہ بادشاہ اور میں ڈاکو ہوں"

یہی حال تقریباً انسان کے بڑے بڑے جرائم کا ہے اور فضیلت انسانیت ہر بڑی سی بڑی زندگی کی تاریکی میں بھی کبھی نہ کبھی اپنی روشنی بے نقاب کردیتی ہے۔

لیکن اسکے مقابلے میں ایک سود خوار زندگی کو لاؤ۔ وہ چور نہیں ہے، وہ ایک ڈاکو کے نام سے ذلیل و حقیر نہیں کیا جاتا، لوگ اُس سے پناہ نہیں مانگتے بلکہ اُسکو ڈھونڈھتے ہیں۔ وہ پہاڑوں کے غاروں، اور گنجان جنگلوں کے گوشوں میں مجرموں کی طرح نہیں چھپتا، وہ سوسائٹی سے مردود و مطرود نہیں ہے، اُس نے بادشاہ کے قانون توڑنے اور انسانوں کے آداب و مراسم کی حقارت کا

کبھی جرم نہیں کیا۔ وہ ایک شہری ہے جو مثل ایک شریف باشندۂ شہر کے انسانوں میں رہتا اور جسم اجتماعی میں عضو صحیح کی طرح شامل ہے۔ با ایں ہمہ، اُسکے اعمال کا کیا حال ہے؟ وہ ڈاکو سے بڑھکر آبادی کو غارت کرتا، وہ قاتل سے زیادہ انسانی حیات کو موت سے تبدیل کرتا، وہ عادی مجرم سے زیادہ سوسائٹی کو تباہ کرتا، وہ ایک درندے سے بھی خوفناک تر خون آشام، اور بھیڑیے اور جنگلی سُور سے بھی بڑھ کر حیات انسانی کا دشمن ہے۔ پھر ان سب سے زیادہ یہ کہ سخت سے سخت بے رحم ڈاکو کی آنکھوں سے بھی کبھی نہ کبھی رحم کا ایک قطرۂ اشک ٹپک پڑتا ہے، پر یہ محال قطعی ہے کہ اسکی شقاوت و قساوت کبھی بھی کسی تڑپتے ہوے جسم اور کسی پکارتی ہوئی زبان پر ایک لمحے، ایک دقیقے، اور ایک عشر دقیقہ کے لیے بھی ترس کھائے!!

(شکسپیر) کے ایک (شائیلاک) کا ذکر بے سود ہے، دنیا میں اسوقت تک کتنے ہزار شائیلاک گذر چکے ہیں اور کتنے ہمارے سامنے موجود ہیں!!

## ایک اہم نکتہ

اگر ایک شخص چور ہے، ڈاکو ہے، قاتل ہے، تو قانون اُسکو قتل کرے گا، اور انسانی آبادی اُس سے پناہ مانگے گی، لیکن ایک سود خوار جو کہتا ہے کہ "انما البیع مثل الربٰو" اُسکا کیا علاج ہے؟ اس نے تجارت کی ایک دوکان کھول دی ہے۔ اور ضرورت و احتیاج انسان کے ہوش و حواس کو معطل کر دیتی ہے۔ ڈاکو سے انسان بھاگتا ہے لیکن "شائیلاک" کے پاس تو اُس کا مظلوم قصداً خود ہی دوڑ کر گیا تھا۔ پس فی الحقیقت قتل و غارت کسی قانون اور مذہب کے لیے اس درجہ حقی کے مستحق نہیں ہوسکتے، جس قدر کہ سود اور سود خواری کی مہیب زندگی۔

پھر کیا "حرب من اللہ و رسولہ" سے اسکی تعبیر صحیح نہیں؟ اور کیا تمام مذاہب عالم میں اسلام کی یہ سب سے بڑی خصوصیت نہیں کہ اس نے باوجود جاہلیت عرب کے اس میں غرق ہونے کے سود خواری کو سب سے بڑا جرم اور معصیت کبیرہ قرار دیا؟ ۔ تجارت اور لین دین کی بے رحمیوں، اور عام بے رحمیوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ انسان کے تمام مظالم اور بے رحمیاں ایسی ہیں، کہ انسان کے لیے کوئی دام اور کشش اپنے اندر نہیں رکھتیں، وہ ازسرتاپا نفرت اور مبغوضیت ہیں۔ لوگ ان سے پناہ مانگتے ہیں۔ لیکن روپے کا لین دین ایک ایسی شے ہے کہ خواہ کیسے ہی

سخت سے سخت عنوان ظلم سے ہو لیکن چونکہ احتیاج اور ضرورت کو وقتی اور فوری طور پر دور کرنے والی ہے اس لیے انسان اس سے بھاگ نہیں سکتا۔ بلکہ پناہ مانگنے کی جگہ خود ہی اسکی طرف دوڑتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ سود خوار ایک بے رحم ڈاکو اور خونخوار درندہ ہے، لیکن جنگل کے ڈاکو سے نفرت کرتا اور اس شہری ڈاکو کے آگے عاجزی سے ہاتھ جوڑتا ہے تاکہ وہ اسے اپنے دام ظلم میں پھنسانے کے لیے چن لے۔ اور اسکو مجروح تیغ قساوت و بے رحمی کرنے سے انکار نہ کرے!!

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اور تمام ہزارہا انسانی بے رحمیاں کسی آبادی کو اس طرح نقصان نہیں پہونچا سکتیں۔ جس درجہ پورے شہر میں ایک "سود خوار" کا وجود پہونچا سکتا ہے۔ یہی ہے کہ قرآن کریم اُس کو سب سے بڑی وعید الٰہی کا مستحق قرار دیتا ہے۔

## اسکی علت اصلی

اصل یہ ہے کہ کسی خود غرضی کے عمل اور بے رحمی کے کام میں اس درجہ استمرار اور مداومت نہیں ہے جیسی کسی کاروباری بے رحمی میں۔ قاتل ایک شخص کو چند لمحوں میں قتل کر ڈالیگا، ڈاکو ایک گھنٹے کے اندر ایک قافلے کو لوٹ لے گا، لیکن سود خوار کا عمل ظلم دائمی، اور انسانی عمروں، خاندانوں، اور نسلوں تک جاری رہتا ہے۔ وہ جس شکار کو پکڑتا ہے اُسکی مظلومی و بیکسی کا نظارہ برسوں تک دیکھتا رہتا ہے، اور جب تک ہمیشہ کے لیے اُسکے تڑپنے لوٹنے اور کراہنے کے نظارے کا تحمل اپنے اندر پیدا نہ کرلے، وہ سود خوار نہیں بن سکتا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اسکی قساوت و بے رحمی سب سے زیادہ سخت، اور تمام جرائم کے عادیوں سے زیادہ مستقل و محکم ہوتی ہے۔ وہ چونکہ ہمیشہ اپنی بیرحمی کے شکاروں کی مظلومی کو دیکھتا رہتا اور اُنکی بیقراریوں کے معائنے کا اپنے دماغ کو عادی بناتا رہتا ہے اس لیے رفتہ رفتہ اُسکے تمام قوائے ملکوتیہ پر ایک عالم ممات طاری ہو جاتا ہے اور رحم و ہمدردی کے جذبات اس طرح بیکار و معطل ہو جاتے ہیں کہ کوئی قوی سے قوی محرک بھی اُنکو زندہ نہیں کرسکتا۔

یہ کیا بات ہے کہ ڈاکو رحم کرتا، مگر سود خوار کی آنکھیں ہمیشہ خشک رہتی ہیں؟ اس کا

سبب یہی ہے کہ ظلم کا استمرار اور بے رحمی کی مداومت ڈاکو کو ویسی نصیب نہیں جیسی اور جس درجہ کی بے رحمی میں ایک سود خوار کی تمام زندگی بسر ہو جاتی ہے۔

## قرآن کریم کی ایک تشبیہ

کیا نہیں دیکھتے کہ اسی حالت مخصوص کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے جبکہ اُس نے سود خوار کی زندگی کا انفق فی سبیل اللہ کے بعد ذکر کیا جو اسکا ضد حقیقی ہے:

| | |
|---|---|
| الذین یاکلون الربوا لایقومون الا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطان من المس ذلک بانھم قالوا انما البیع مثل الربوٰ (۲: ۲۷۶) | جو لوگ کہ سود کھاتے ہیں، وہ کھڑے نہ ہو سکیں گے مگر اُس پاگل کی طرح، جسکو شیطان کے اثر نے مخبوط الحواس بنا دیا ہو، اور یہ اس لیے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ضرور بیع و شری بھی مثل سود ہی کے ہے۔ |

افسوس ہے کہ عام (متداول) مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں اس امر پر بالکل توجہ نہیں کی کہ سود خوار کی زندگی کو اس تمثیل کے ساتھ کیوں بیان کیا گیا؟ اور پھر اس تمثیل اور حالت کا سبب " ذٰلک " کہکر انکے اس قول کو کیوں قرار دیا کہ "بیع بھی مثل سود کے ہے"؟

اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز امر یہ ہے کہ اُن بزرگوں میں سے اکثر نے اس بیان حالت کو بعض آثار مرویہ کی بنا پر صرف قیامت کے دن ہی کے لیے مخصوص کر دیا ہے اور اسکی تفسیر یوں کی ہے کہ " لایقومون ای یوم القیامۃ من قبورہم " یعنی یہ حالت صرف قیامت کے دن ہی کی نسبت بیان کی گئی ہے۔ اور سود خوار قیامت کے دن قبروں سے اس طرح اُٹھائے جائیں گے، جیسے کوئی مصروع اور آسیب زدہ پاگل ہوا کرتا ہے۔ اور پھر اس کی مختلف توجیہات قرار دی ہیں۔

فی الحقیقت قرآن کریم کے حقائق و معارف کے متعلق آج ایک اہم بحث اُرباب نظر کے لیے یہ بھی ہے کہ اسکے اکثر ارشادات و تمثیلات و بیانات، جن میں اسی دنیا کی زندگی اور انکے اعمال و نتائج کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، صرف قیامت اور بعد الممات کی زندگی کے لیے مخصوص سمجھ لیے گئے ہیں، اور سخت ضرورت ہے کہ اس بحث پر نظر ڈالی جائے۔

میں انشاء اللہ ماہوار رسالے میں سود کے مسئلے پر ایک بسوط مضمون لکھوں گا۔ کہ اسکے متعلق بعض خاص مباحث پیش نظر ہیں، اور اس موقع کی تفصیل بھی بہتر ہے کہ اسی وقت کے لیے ملتوی کر دی جائے۔ لیکن یہاں اتنا عرض کیے دیتا ہوں کہ درحقیقت اس آیۂ کریمہ کی تفسیر وہی امور ہیں جن کو اوپر بغیر کسی ترتیب کے لکھ چکا ہوں۔

مفسرین صحابہ کی جو روایات اس بارے میں موجود ہیں وہ یقیناً مستحق قبولیت ہیں، یہ میرا عقیدہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر میں لغت عرب اور صحابہ کی تفسیر ہی دو چیزیں اصل ہیں اور اگر صرف ان ہی دو اصولوں کو پیش نظر رکھا جائے تو آج تمام مشکلات و غرائب قرآن کا خاتمہ ہے۔ لیکن تاہم آخرت کی زندگی جن دنیا کی زندگی ہی کا نتیجہ ہے، اور جو کچھ کل ہونے والا ہے اسکی مثال آج تمہارے بصیرت اور دیدۂ ہائے اعتبار رکے لیے ہمارے سامنے کر دی گئی ہے۔ پھر کیا ضرور ہے کہ ہر نتیجۂ عمل کو صرف قیامت ہی کے دن پر اٹھا رکھا جائے، اور خود دنیا میں جس شے کا سراغ لگ سکتا ہے اُسکے لیے صرف دُنیا سے باہر ہی کا نظارہ کریں؟

## ایک تفسیری اشارہ

اصل یہ ہے کہ اس آیۂ کریمہ میں ایک سود خوار کی زندگی، اُسکے عادات وخصائل، اُسکے اعمال و افعال، اور اُنکے نتائج کی جیسی جامع ومانع تشبیہ دی گئی ہے وہ گویا اس مسئلے کی ایک پوری کتاب ہے۔ اہل عرب کا خیال تھا کہ شیطان اور جن کی ضرب سے انسان مجنون ولا یعقل ہو جاتا ہے، اور صرع (مرگی) کی بیماری دراصل ایک طرح کا آسیب ہوتی ہے۔ (مس) جنون کے معنی میں بولا جاتا ہے، اور "ممسوس" پاگل کو کہتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے اس آیت میں سود خوار کی زندگی کو ایک آسیب زدہ پاگل اور ایک مصروع کے حالات وخصائص سے تشبیہ دی ہے، اور مقصود اسکے وہی حالات ہیں، جو اُسے دنیا کی زندگی میں پیش آتے ہیں۔

ایک شخص جو پاگل ہو گیا ہو، ایک مجنون جس کی عقل و دانش بالکل معطل ہو، ایک مخبوط الحواس، جسکے ہوش و حواس کا کارخانہ بگڑ گیا ہو۔ ایک "مصروع" جو مرگی کے اشتداد

سے اپنے اوپر حکومت نہ رکھتا ہو۔ غور کرکے دیکھیے کہ اُسکی حالت کیا ہوتی ہے؟ وہ عام انسانوں کی طرح ایک کامل وسالم انسان ہوتا ہے۔ اُسکے تمام اعضا وجوارح صحیح ہوتے ہیں، اُسکے تمام امیال وجذبات بالکل ایک تندرست آدمی کی طرح درست ہوتے ہیں۔ وہ بظاہر بیمار نہیں ہوتا۔ چلتا ہے، پھرتا ہے، بھوک کا اظہار کرتا ہے، اور پیاس سے ویسا ہی بیقرار ہو جاتا ہے، جیسا کہ دنیا کا ہر حیوانی مخلوق۔ تاہم وہ انسان نہیں ہوتا کیونکہ انسانوں میں ایک سب سے بڑی قیمتی چیز ہے جو اُس میں نہیں ہوتی۔

یہی حال ایک سودخوار کی زندگی کا ہے۔ بظاہر اُس میں کوئی برائی نہیں ہوتی۔ وہ سوسائٹی کا ایک جزو، اور شہر کا ایک جائز باشندہ ہے۔ عام تاجروں کی طرح اسکی بھی ایک تجارت ہوتی ہے۔ وہ مبادلۂ اشیاء کی تجارت نہیں کرتا تو کیا ہوا؟ ایک ہی جنس کو دیتا اور لیتا ہے، تو کیا نقصان لازم آگیا؟ پھر بھی ایک کاروبار اور بیع وشراء ہی ہے۔ وہ ڈاکو کی طرح لوٹتا نہیں ہے، اور چور کی طرح چھپ کر چرانے نہیں آتا۔ جائز لین دین میں پہلی شرط فریقین معاملہ کا راضی ہونا اور جبر واکراہ کا نہ ہونا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ وہ جب کبھی معاملہ کرتا ہے تو اُن ہی سے کرتا ہے جو اُسکی شرائط کو بخوشی منظور کرتے، اور اُسکے معاملے پر اپنی پوری رضا ظاہر کرتے ہیں۔ وہ تلوار لیکر لوگوں کو نہیں دھمکاتا کہ اس سے روپیہ لیں، اور اسکی شرائط کے آگے سر جھکا دیں۔ پس ایک شریف انسان، ایک باامن شہری، ایک جائز کاروباری آدمی میں جو کچھ ہونا چاہیے، اُس میں ہوتا ہے، اور کوئی بات بظاہر اسکے خلاف نظر نہیں آتی۔

لیکن ان تمام مظاہر انسانیت ومدنیت کے ساتھ، دوسری طرف دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ ہے، مگر ایک شریف انسان اور ایک کاروباری شہری میں سب سے زیادہ ضروری جو ہرجو ہونا چاہیے، اُس میں نہیں ہے۔ وہ باوجود انسان ہونے کے ایک خونخوار درندہ ہے۔ وہ باوجود شریف زندگی ہونے کے رذالت وسفاہت اور بہیمیت وبربریت کا ایک پیکر مجسم ہے۔ وہ باوجود ایک جائز باشندۂ شہر ہونے

کے درندوں کے بھٹ اور وحشیوں کے جنگل کا ایک جانور ہے۔ اس نے گو تجارت کی دوکان کھول دی ہے، مگر وہ ایک ڈاکو ہے جو خود تاجروں کو لوٹتا اور بے رحم چوروں کی طرح ان کے صندوقوں کو خالی کر دیتا ہے۔!!

ایک پاگل آدمی باوجود انسان صورت ہونے کے انسان نہیں ہوتا، کیونکہ اُس کا نظام حواس وادراک درہم برہم ہو جاتا ہے، اور یہی شے انسان کا اصلی جوہر شرف ہے۔ بالکل اسی طرح ایک سود خوار باوجود ایک جائز باشندۂ شہر اور شریف زندگی ہونے کے شریف نہیں ہوتا، کیونکہ اُسکے تمام جذبات و عواطفِ ملکوتیہ اور فضائل خصائل و اخلاق معطل ہو جاتے ہیں، اور یہی وہ چیزیں ہیں جو معطل ہو جائیں تو

فلم یبق الا صورت اللحم والدم!

اور زیادہ اس تشبیہ پر نظر ڈالیے! ایک مصروع آدمی کھاتا ہے، پیتا ہے، عقل و حواس کی باتیں کرتا ہے، بالکل ایک بھلے چنگے آدمی کی طرح آپکے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا ہوتا ہے۔ لیکن دفعتًا اسکی حالت میں ایک انقلاب عظیم ہو جاتا ہے۔ اسکے ہاتھ پاؤں کھنچنے لگتے ہیں، اعصاب میں تشنج ہونے لگتا ہے، خون کا دوران جاری وساری یکایک بند ہو جاتا ہے۔ بالکل اُس مشین کی طرح جس کا انجن یکایک پھٹ گیا ہو، اسکے ہوش و حواس کے کیل پرزے بند ہو جاتے ہیں، وہ چکرا کر زمین پر گر جاتا ہے، احتضار موت کی سختیوں کی طرح ایڑیاں رگڑتا ہے، منہ سے کف جاری ہو جاتا ہے، اور دیکھنے والے متحیر و متعجب ہو کر رہ جاتے ہیں کہ چند لمحوں کے اندر، ایک صحیح و سالم، مضبوط و توانا، ذی حس و صاحب ہوش و حواس انسان کی حالت میں یہ کیا انقلاب عظیم ہو گیا؟

بعینہٖ یہی حالت سود خوار کی بھی ہوتی ہے۔ عالم جذبات و عواطف کی دنیا بھی اجسام و جوارح انسانی کا ایک پرتو ہے۔ ٹھیک مثل ایک مصروع کے دنیا کے سامنے وہ نمودار ہوتا ہے۔ اس میں از فرق تا بہ قدم کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی، جو ایک شریف اور شہری زندگی کے مخالف ہو۔ وہ ڈاکوؤں کی طرح جنگل کے پوشیدہ

گوشوں اور پہاڑوں کے تاریک غاروں کو تلاش نہیں کرتا، بلکہ ہر مدنی وجود کی طرح شہر اور انسانی آبادی کا خواستگار ہوتا ہے۔ وہ عین آبادی کے وسط میں مکان بنا کر رہتا ہے۔ وہ کسی شریف شہری کی طرح بازاروں میں خرید و فروخت، اور گھر کے اندر ملاقات و محبت میں مصروف نظر آتا ہے۔ تم اُسکو ہر طرح ایک شریف آدمی کی طرح پاتے ہو۔ وہ تمہارے ساتھ نرمی و محبت سے باتیں کرتا، تمہارے استقبال کے لیے خوش آمدید کہتا، تم کو لطف و وداد کے ساتھ اپنے پاس بٹھاتا، تمہارے ساتھ کھاتا پیتا اور چلتا پھرتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ، جب کہ تم ان مظاہر انسانیۃ سے متاثر، ان علائم امیال و عواطف سے مطمئن، اور ان ابرازات تمدن و حضریت سے خوش وقت ہوتے ہو، تو یکایک اُس کے نظام جذبات و خصائل میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہونے لگتا ہے۔ صرع کے جن کی طرح سود خواری کا شیطان اُس میں حلول کر جاتا ہے، اُس کی طبیعت ثانیہ کے ہیجان کا اُبال اُس کے دل کے اندر جوش کھا کھا کر اُبلنے لگتا ہے۔ اُس کی صورت متغیر ہو جاتی ہے۔ رحم و انسانیت کی لینت و نرمی کی جگہ وحشیت و سبعیت کے آثار و علائم سے اُسکی پیشانی مکروہ بن جاتی ہے۔ اُس کا چہرہ جو چند لمحہ پیشتر ایک انسان کی طرح حسین تھا، دفعتہً ایک خونخوار درندے کی طرح مہیب ہو جاتا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں قسارت و بے رحمی کی سرخی پھر جاتی ہے، اُس کی ناک کے نتھنے ہیجان غیظ و غضب سے خون آشام درندوں کی طرح پھڑکنے لگتے ہیں، اُس کا دماغ معطل ہو جاتا ہے، اور تمام جذبات و عواطف انسانیۃ و ملکوتیہ اُس کے صفحۂ ذہن سے یک لخت محو ہو جاتے ہیں۔ پھر ایک مصروع اور آسیب زدہ مریض کی طرح وہ اپنے قابو میں نہیں ہوتا اور نہ اُس کے ہوش و حواس اُس کے اختیار میں ہوتے ہیں، اُس کے ساتھ صرف "سود" کا شیطان ہوتا ہے، جو اُس کو مسمریزم کے معمول کی طرح اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے۔ اُس کی آنکھ اور کان، دونوں انسانیت کی حکمرانی سے باغی ہو کر صرف شیطان کے تابع فرمان ہو جاتے ہیں۔ پھر نہ وہ "سود" کے سوا کچھ دیکھتا ہے، اور نہ سود کے سوا کچھ سنتا ہے جس طرح ایک آسیب زدہ کسی مجہول و غیر مرئی وجود کو دیکھ کر اُس کو پکارتا اور اُس کی طرف اشارہ کرتا ہے اسی طرح وہ صرف "سود" ہی کی طرف اشارہ کرتا، اور صرف "سود" ہی کی آواز کو سننا چاہتا ہے۔ اُس کا صید قہر و ظلم، اُس کے سامنے خاک پر لوٹے، زخمیوں کی طرح چیخے، یا جانکنی میں تڑپنے والوں کی

طرح تڑپے، پر اُس کو کچھ نظر نہیں آتا وہ مدہوش اور پاگل کی طرح ان سب باتوں سے بے پرواہ
بے علم، صرف "سود، سود، سود" کہہ کر پکارتا، اور اُس کے لینے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے!!

الذین یاکلون الربٰوا لا یقومون الا کما یتخبطہ الشیطان من المس !!

اس ٹکڑے کو کہاں تک طول دوں ؟ الہلال کے صفحات ان مباحث کے لیے محل موزوں نہیں جس قدر زیادہ غور کرتے جایئے گا، اور دونوں حالتوں کو اپنے سامنے لایئے گا، اتنا ہی اس تشبیہ کی جامعیت اور احاطہ کا انکشاف ہوتا جائے گا - یہ صرف سرسری اشارات ہیں جن سے ایک فکر سلیم اندازہ کر سکتی ہے، کہ امثال و تشبیہات قرآنیہ، یعنی ہر مختصر سی مختصر تشبیہ کے اندر بھی مطالب عالیہ، غوامض حکمیہ اور اسرار فطریہ کا ایک بحر بے کنار بلکہ اوقیانوس حکم و معارف بیکراں ہے۔ فہم انسانی اُس کے شرائع میں نکل سکتی ہے پر اُس کا احاطہ نہیں کر سکتی کہ :

تقاصر عنہ افہام الرجال

اور پھر یہ اس کا فضل ہے کہ جس خوش نصیب کو چاہے، اپنے کلام حکیم کے چند قطرات معارف سے سیراب کرنے کے لیے چن لے - اس کے لیے محض علم و فضل اور مطالعۂ علوم کا دعویٰ بیکار ہے: کہ بل

ھو آیات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم، وما یجحد بآیاتنا الا الظلمون (۲۹ : ۴۸)

ولو ان ما فی الارض من شجرۃ اقلام، والبحر یمدہ من بعدہ سبعۃ ابحر، ما نفدت کلمات اللہ، ان اللہ عزیز حکیم (۳۱ : ۲۶)

یہ زمین پر لاکھوں اور کروڑوں درخت جو تم دیکھ رہے ہو، اگر ان سب کی شاخوں کو قلم بنا دیا جائے، اور تمام بے کنار سمندروں سے سیاہی کا کام لیا جائے، اور وہ بھی اس طرح کہ جب سمندر ختم ہو کر خشک ہو جائیں، تو ویسے ہی سات نئے عظیم الشان سمندر ان کی جگہ آموجود ہوں، اور اس طریقے پر اللہ تعالیٰ کے کلمات و آیات کو لکھا جائے، پھر بھی یقین کرو کہ وہ کبھی تمام نہوں گے کیونکہ وہ حکیم و عزیز ہے" !!

---

ہر کس کہ بود سیم و زر و زیب و فرش | باشد پس مرگ ناگزیر از سفرش
بنگر چہ بود جامۂ زرباف کہن | سوزند در آتش از پئے سیم و زرش

(مرزا محمد افضل سرخوش)

# ایڈیٹر الناظر کی گرفتاری

شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ  اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

جیل خانہ میں اکیس ۲۱ مہینے نہایت درجہ راحت و آرام سے بسر کرنے کے بعد اگرچہ زنداں میرے لیے موجبِ دہشت نہیں ہو سکتا لیکن حق یہ ہے کہ اسیری کے سکون بے شغلی کے بعد موجودہ آزاد زندگی کی کشاکش نہایت کلفت انگیز ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ درحقیقت میری رہائی سبب گرفتاری و اسیری بن گئی ہے تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔

اپنی گرفتاریِ خاطر کے جملہ اسباب کی تشریح صرف اس بنا پر غیر ضروری اور بے موقع سمجھتا ہوں کہ ناظرین "الناظر" اس سے مکدر ہوں گے اور میری پریشانیوں میں اس سے کوئی کمی واقع نہ ہوگی لیکن کم سے کم ایک سبب ایسا ہے جس کے اظہار میں مزید تامل و تذبذب جائز نہیں۔

الناظر جولائی سنہ ۱۹۰۹ء سے جاری ہے اور اس وقت تک کہ پندرہ سال گذرے ہیں سوائے گذشتہ دو سال کے جبکہ میری اسیری کی وجہ سے مجبوراً بند رہا باقی تمام مدت میں وہ آپ کی اور زبان اُردو کی خدمت میں برابر مصروف رہا ہے۔ میں اُس کی خدمات کے متعلق ایک لفظ نہیں عرض کرنا چاہتا۔ یہ ناظرین کرام، محترم قلمی معاونین اور معزز معاصرین کا کام ہے کہ وہ الناظر کی گذشتہ زندگی پر تنقید کر کے اُس کے حُسن و قبح کے بارہ میں کوئی رائے قائم کریں۔ البتہ یہ بات از راہ تفاخر نہیں بلکہ محض بطور اظہار واقعہ عرض کرنا غالباً نامناسب نہ ہو کہ الناظر سے پہلے جس قدر علمی و ادبی رسائل مُلک میں شائع ہوتے تھے آج دلگداز اور زمانہ کے سوا اُن میں سے کوئی جاری نہیں ہے اور اُس کے بعد جو نئے رسائل جاری ہوئے اُن میں سے بھی دو چار ہی ایسے ہیں جو ان کی تعداد میں شمار کرائے جا سکتے ہیں جو کچھ دنوں یا چند سال تک آب و تاب کے ساتھ شائع ہونے کے بعد بند ہو گئے۔

الناظر کو اتنی مدت تک قائم رکھنے میں جن جن دشواریوں اور مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا ہے اُن کا اندازہ کچھ وہی اصحاب کر سکتے ہیں جن کو اس قسم کے کاموں کا عملاً تجربہ ہے بس اتنا سمجھ لیجیے کہ اس اثنا میں جو مالی نقصانات محض الناظر کی وجہ سے ہوئے ہیں اُنھیں کی مقدار سات ہزار روپیہ کے قریب ہے اور آج بھی دوسری تمام پریشانیوں اور کلفتوں سے زیادہ جو فکر و تشویش مجھے بےچین رکھتی ہے

وہ الناظر ہی سے متعلق ہے۔ کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ پریس اور بک ایجنسی کے کار بار کو جو نقصانات میری غیر حاضری میں پہنچ گئے ہیں ان کی بدولت اب یہ امر میرے حیطۂ امکان سے باہر ہو گیا ہے کہ آئندہ الناظر کے کثیر نقصانات کی کفالت کر سکوں۔

الناظر کی اشاعت کبھی بہت زیادہ نہ تھی۔ اگرچہ اشاعت کم ہونے کے باوجود اُسکی شہرت شاید اُن رسائل سے بھی کچھ زیادہ ہی ہے جو ممکن ہے کہ مالی حیثیت سے کامیاب ہوں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ شہرت اُس مالی نقصان کی تلافی نہیں کر سکتی جو ہر مہینہ اُس کی وجہ سے اُٹھایا جاتا ہے۔ نقصان کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ محض طباعت و اشاعت کی مد میں ہر ماہ پچاس روپیہ کی کمی پوری کی جا رہی ہے۔

ایڈیٹر الناظر ایک بے بضاعت شخص ہے اور اگر خدا کے فضل و کرم سے پریس اور بک ایجنسی کے کاروبار کو گذشتہ سالوں میں کافی کامیابی نہ حاصل ہوئی ہوتی تو یقیناً اب سے بہت پہلے وہ اس بارگراں سے سبکدوشی حاصل کرنے پر مجبور ہو گیا ہوتا۔ جہاں تک کہ پریس کا تعلق ہے مشین فروخت ہو جانے کے بعد اب اُس میں کوئی آمدنی باقی نہیں رہی بلکہ اگر الناظر کو کسی دوسرے پریس میں چھپوانے کا قابل اطمینان انتظام ممکن ہوتا تو پریس کو اُس وقت تک کے لیے بند ہو جانا چاہیے تھا کہ پھر اُس کے لیے مشین فراہم کی جا سکے۔

بک ایجنسی اب بھی بفضلہ نفع بخش ہے اور اُس کو جو نقصانات پہنچے تھے اُن کی تلافی گذشتہ دو سال کے اندر ہو جاتی اگر ایک بغلی گھونسے نے اُس کے تمام نظام کو مضمحل نہ کر دیا ہوتا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ میری اسیری کے زمانہ میں ایک عزیز دوست اس کاروبار کے نگران رہے اُن کے اخلاص و محبت، ہمدردی و اخوت کے مظاہرے دیکھ دیکھ کر میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر کرتا تھا کہ اس پُر آشوب زمانہ میں جب کہ ہر طرف نفسانیت اور خود غرضی کی گرم بازاری ہے مجھے ایک ایسا مخلص رفیق عطا ہوا ہے جو صحیح معنوں میں

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست
در پریشاں حالی و درماندگی

کا مصداق ہے۔

عزیز موصوف اندر میں پانچ سال سے یکجا رہتے تھے اور اس مدت میں ہمارے روابط و تعلقات

اس قدر گہرے ہو گئے تھے کہ فی زمانا دو حقیقی بھائیوں میں بھی عام طور پر اس قدر اتحاد و اتفاق نہیں ہوتا اس بے سبب میں نے گرفتاری کے وقت اپنے دفتر کی کنجیاں اُن کے حوالے کیں تو مجھے اس بات کا پورا یقین تھا کہ نہایت ہی قابل اعتماد ہاتھوں میں کاروبار چھوڑا گیا ہے مگر افسوس کہ اُنھوں نے میری تباہ حالی و زیر باری پر پوری طرح مطلع ہونے کے باوجود اس کاروبار کے تمام نظم و نسق سے واقف ہو جانے کا یہ فائدہ اُٹھایا کہ اسی نہج پر اپنا جداگانہ کاروبار قائم کر دیا اور بسبب اس کے کہ ماشاء اللہ وہ صاحب سرمایہ ہیں جس رفتار سے اُن کا کاروبار ترقی کر رہا ہے اُسی رفتار سے النّاظر ایجنسی کا کاروبار روبہ تنزل ہے۔ اور میں نقصان مایہ و شماتت ہمسایہ کے عذاب الیم میں گرفتار۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ النّاظر کی مزید کفالت کا بار ایجنسی کے ذمہ نہیں ڈالا جا سکتا۔

یہ ہے وہ کاری ضرب جس کی وجہ سے نہ صرف النّاظر ایجنسی طرح طرح کی پیچیدگیوں میں مبتلا ہے بلکہ النّاظر کا وجود بھی معرض خطر میں ہے اور اگر ایسے وقت میں النّاظر کے قدردان اور میرے احباب توجہ نہ فرمائیں تو میرے لیے چارہ نہیں کہ النّاظر کو بند کر دوں اور ہو سکے تو اس کاروبار سے بھی دستکش ہو جاؤں اس لیے کہ النّاظر کے بعد اس کاروبار میں میرے لیے کوئی دلکشی باقی نہیں رہ جاتی۔

النّاظر کے متعلق سر دست کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر قدردانانِ النّاظر اور دیگر بہی خواہانِ ملک و قوم کی رائے میں النّاظر کا وجود مفید ہے اور اسے جاری رہنا چاہیے تو اُن پر لازم ہے کہ اُس کی اشاعت کم سے کم اتنی بڑھا دیں کہ النّاظر کی آمدنی اُس کے مصارفِ طباعت و اشاعت کے لیے کافی ہو جائے۔

النّاظر کے خاص خادم اور کارکن ہونے کی حیثیت میں میرے اوپر جو ذمہ داری عاید ہے میں اُس سے غافل نہیں ہوں۔ لیکن میں جانتا ہوں اور مانتا ہوں کہ تنہا میری کوشش سے کچھ نہ ہوگا۔ البتہ مصارف میں مزید کفایت کے خیال سے بعض انتظامات تجویز کیے گئے ہیں جن پر آیندہ انشاء اللہ عمل درآمد ہو سکے گا۔

النّاظر کے آمد و صرف کو برابر کرنے کے لیے اس وقت دو سو نئے خریداروں کی ضرورت ہے اگر النّاظر کے جملہ خریداران دلی معاونین متوجہ ہو جائیں اور ہر شخص کم سے کم ایک خریدار فراہم کرے تو ایک ہفتہ کے اندر دو سو سے زائد خریدار مہیا ہو سکتے ہیں۔

لیکن تجربہ کی بنا پر میں سمجھ سکتا ہوں کہ ہر شخص اتنی زحمت نہ گوارا کرے گا۔ اسی لیے میں خریداران و قلمی معاونین میں سے اُن اصحاب سے جو الناظر کو جاری رکھنا پسند فرماتے اور اس وقت اُس کی امداد کرنا چاہتے ہوں یہ درخواست کروں گا کہ سب صاحب کم سے کم پانچ خریدار فراہم کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح جن اصحاب کی خدمت میں میں یہ استدعا پیش کر رہا ہوں اگر اُن میں سے بیس فیصدی بھی میری استدعا قبول کریں گے تو الناظر انشاء اللہ قائم رہے گا۔

گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں

آئندہ پرچہ میں ان معروضات کے نتائج سے انشاء اللہ ناظرین مطلع کیے جائیں گے اور اسی وقت میں اپنے آخری فیصلے کا اعلان کر سکوں گا۔ خاکسار ظفر الملک

## (نوٹ)

الناظر کے سرورق پر "خریداران الناظر سے خاص رعایت" کا جو اعلان شائع ہو رہا ہے ناظرین کرام کے ملاحظہ سے گذرا ہو گا ۔ الناظر بک ایجنسی کی طرف سے اس بات کی مستقل کوشش رہے گی کہ آئندہ جس قدر کتابیں ایجنسی کے زیر اہتمام شائع ہوں اُن میں سے بالالتزام خریداران رسالہ کو خاص رعایتی قیمتوں پر دی جائیں۔ پس جو اصحاب اپنے دوستوں سے خریداری رسالہ کی تحریک کریں وہ اُنھیں خاص طور پر یہ بتا سکتے ہیں کہ الناظر کی خریداری پر جس قدر سالانہ رقم صرف کی جائے گی اُس کا ایک معقول حصہ کتابوں کی رعایتی قیمتوں کی صورت میں خریداروں کو واپس مل جائے گا۔ اور اس طرح سب اگر نہیں تو بہت سے خریداروں کے لیے تو رسالہ تقریباً بالکل مفت ہو گا۔

الناظر کے ساتھ اس سے پہلے بھی بعض مستقل کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں اور اب پھر یہ سلسلہ شروع ہونیوالا ہے۔ الناظر کے ایک ممتاز قلمی معاون نے حال ہی میں یورپ کے ایک مشہور عالم رینان کی کتاب ابن رشد اور ابن رشدیت (یہ کتاب کے نام کا لفظی ترجمہ ہے) کو اُردو میں ترجمہ کیا ہے اور از راہ محبت الناظر میں اس کتاب کے شائع کرانے کا وعدہ کیا ہے۔ ایک دوسرے فاضل اہل قلم نے اغانی کے دلچسپ مباحث کا ترجمہ بالاستیعاب الناظر میں شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔

ان کے علاوہ متعدد عالمانہ مضامین بھی الناظر کے لیے فراہم کیے جا رہے ہیں جن میں سے ایک مضمون میں جرمنی کے مشہور فلسفی آئنسٹین کے اس حیرت انگیز نظریہ کی تشریح بیان کی گئی کہ نیوٹن کے وقت سے آج تک جو علما سائنس کشش ارض کے قائل ہیں اُن کے دعاوی باطل اور دلائل غلط ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رجسٹرڈ نمبر سلے ۳۷۸

رسالہ

# الناظر

لکھنؤ

ایڈیٹر- ظفر الملک علوی

قیمت سالانہ للعہ ـ مع محصول

فی پرچہ ۲ر

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر و پبلشر:- اسحاق علی علوی

بسم اللہ

# فہرست مضامین الناظر بابت ماہ جولائی ۱۹۲۴ء

نمبر ۱۵۷ — جلد ۲۷



## مطبوعات جدیدہ

**رسول عربی** ۔ مصنفہ مسٹر گوردت سنگھ دارا بیرسٹر لاہور و ایڈیٹر اخبار "انڈیا" لنڈن۔ بقول مولانا سید سلیمان ندوی کے جنھوں نے اس کتاب کا مختصر دیباچہ لکھا ہے "دارا صاحب نے پیغمبر اسلام صلعم کی سوانحعمری بڑی بےنفسی اور بےتعصبی کے رنگ میں لکھی ہے۔ کتاب کے حرف حرف سے عشق و محبت کے آب کوثر کی بوندیں ٹپکتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے کا قلم کس جوش و خروش کے دریا میں بہتا جا رہا ہے" قیمت عہ

**دیوان حسرت موہانی حصہ ہشتم** ۔ جیلخانہ کا تازہ کلام۔ حال ہی میں چھپا ہے قیمت ۶ر

**دیوان حسرت موہانی حصہ نہم** " " " " سہ

# فصلی بخار و طحال کی دوا

فصلی بخار و طحال کے لیے یہ ایک ہی دوا ہے۔ آج کل سیکڑوں اشتہار فصلی بخار و طحال کی دوا کے آپ دیکھتے ہونگے مگر ان میں عموماً کونین کی جزو رہتی ہے۔ اس لیے یہ دوائیں بخار کو کچھ وقت تک تو روک دیتی ہیں مگر جڑ سے آرام نہیں کرسکتی ہین۔ ایسے بخار کے لیے ڈاکٹر ایس کے برمن کی فصلی بخار و طحال کی دوا چند روز میں ایک دم آرام کرنے کا خاص دعوے رکھتی ہے اور عوام کے فائدہ کو مدنظر رکھکر قیمت بھی بہت کم رکھی گئی ہے۔ اس میں تین خاص صفتیں ہین (۱) ملیریا کے کیڑوں کو مار دیتی ہے، اس لیے چار یا پانچ ہی خوراک کے استعمال سے بخار کا آنا بند ہوجاتا ہے (۲) یہ خون کو گاڑھا کرتی ہے اور اس کی خرابیوں کو مٹاتی ہے (۳) یہ طحال کو گلاتی ہے۔ قیمت فی شیشی کلاں عہ؍ شیشی خورد ۱۰؍ محصول ڈاک شیشی کلاں ۸؍ اور خورد ۶؍

# پرانے ملیریا بخار کی گولیاں

لرزہ بخار پرانا ہوجانے پر باری سے نہ آکر دن رات تھوڑا بہت چڑھتا ہے۔ جسم کا خون پانی سا ہوجاتا ہے اور آدمی کا رنگ پھیکا میلا ہوجاتا ہے۔ تھوڑی محنت سے کلیجہ کانپنے لگتا ہے۔ سانس پھولتی ہے۔ کھانے کی خواہش اور قوت بہت ہی گھٹ جاتی ہے۔ تلی کے بڑھنے سے پیٹ نکل آتا ہے۔ کبھی منہ اور ہاتھ پیروں میں ورم آجاتا ہے اور زندگی وبال ہوجاتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ گولیاں فائدہ کرتی ہیں اور چار ہی پانچ خوراک میں بخار کا آنا بند ہوجاتا ہے۔ قیمت پچیس گولیوں کی ڈبیہ ۱۰؍ محصول ڈاک ایک سے دو ڈبیہ تک ۶؍

# کونین کی گولیاں

یہ چار گرین کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت ٹکیاں بنتی ہیں اور سنہری پیٹنٹ ڈبیہ میں ہوتی ہیں۔ کونین کا استعمال کرنا ہو تو یہ گولیاں پاس رکھیے۔ اس میں نہ وزن کی ضرورت ہے نہ کھانے میں تلخی ہے۔ قیمت پچیس گولیوں کی ڈبیہ عہ محصول ڈاک ۶؍

## ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ تاراچند دت اسٹریٹ۔ کلکتہ

ایجنٹ:- ڈاکٹر گنگا رام جنیلی چوک لکھنو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# الناظر

نمبر ۱۵۷ جلد ۲۷ ۱۵ جولائی ۱۹۳۴ء

## فیہ مافیہ

(اثر: چلپی)

### تحریم سود تجارت

سید طفیل احمد صاحب کے برپا کردہ فتنۂ جوازِ سود پر سب سے پیشتر انھیں اوراق میں تنقید کی گئی تھی، الحمدللہ کہ وہ کمزور آواز بے اثر نہ ثابت ہوئی۔ متعدد اہل علم حضرات نے اس مسئلے پر توجہ فرمائی، مختلف اخبارات و رسائل نے فتوائے جواز کی تنقید، نقلی و عقلی، ہر پہلو سے کی، اور اس فتنۂ عظیم کے بانی نے جس قدر مغالطہ پر درطرز استدلال اختیار کیا تھا، نقل احادیث میں جو تحریف کی تھی، استشہادِ آیاتِ قرآنی میں جس تدلیس سے کام لیا تھا، یہ ساری چیزیں منظر عام پر آ گئیں۔ سید صاحب کسی معقول گرفت کے جواب میں اپنی صفائی نہ پیش کر سکے، اور نہ انھیں اپنے جرائم کے اعتراف کی توفیق نصیب ہوئی۔ بلکہ افسوس ہے کہ بعض ادنیٰ جذبات سے متاثر ہو کر انھوں نے غیر متعلق بحث و مباحثہ کا سلسلہ قائم کر دیا، اور اپنے معترضین پر ذاتی حملہ کر کر کے انکی زبانیں بند کرنے کی کوشش کی۔ البتہ اس نقد و نظر کا ایک خوش آیند نتیجہ یہ ضرور نکلا، کہ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت اس فتنۂ عظیم میں مبتلا ہونے سے محفوظ ہو گئی۔ فالحمدللہ علیٰ ذٰلک۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل داد مولانا عبدالسلام ندوی کا وہ عالمانہ مضمون ہے جو رسالۂ معارف (اعظم گڈھ) میں نکل رہا ہے، اور جس میں تجارتی سود کے جواز کو ہر پہلو سے

باطل کیا گیا ہے۔ کاش، خدائے کریم، اب بھی قوم کے گمراہ افراد کو راہ ہدایت نصیب کرے۔

## موت کے بعد!

علیگڈھ کی قدیم "قومی" جماعت میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی ذات، اکثر حیثیات سے قابل عزت ہے۔ اُن کا حُبّ اسلام مسلّم، اور انکا خلوص غیر مشتبہ ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر صدمہ ہوتا ہے، کہ اُن کا قلب انگریزیت سے اس درجہ متاثر ہے، کہ یہی شے اُنکے نزدیک معیار حقیقت بن کر رہ گئی ہے، اور وہ دین و دنیا، علم و عمل، عقل و نقل، غرض ہر شے کو اسی انگریزی پیمانہ سے ناپنے لگے ہیں، یہاں تک کہ "انگریزی زندگی" سے گذر کر اب "انگریزی موت"، تک اُنھیں اپنی قوم کے لیے پسند آنے لگی ہے! غالب نے انتہائی کفر دوستی و اسلام بیزاری کے موقع پر، عالم تخیل میں، یہ تمنا کی تھی، کہ زندگی کافروں کی، اور موت مسلمانوں کی، نصیب ہو، ع

حیف کافر مردن، و آوخ مسلماں زیستن!

لیکن صاحبزادہ صاحب انتہائی اسلام دوستی اسکو سمجھتے ہیں، کہ مسلمان کو موت بھی "صاحب" کی طرح نصیب ہو، اور گویا قفس عنصری سے آزاد ہونے کے بعد اُسے آخری آرام گاہ بجائے جوار حرم یا جنۃ البقیع کے لنڈن کے جنوبی و مشرقی حصہ کے انگریزی گورستان میں نصیب ہو!

---

ابھی چند ہفتے کا ذکر ہے، کہ لنڈن سے اُنکا ایک مکتوب گرامی شایع ہوا ہے، جس میں وہ لنڈن کے جنوبی و مشرقی حصہ کے گورستان کے محامد و مناقب تحریر فرماتے ہیں، کہ اسکی عمارت نہایت وسیع و عالیشان ہے، دروازے پر اعلیٰ قسم کی شاندار وردیاں پہنے ہوے دربان ہیں باہر سے قبرستان پر کسی رئیس اعظم کے باغ کا دھوکا ہوتا ہے، اندر ایک صاف و آراستہ سڑک ہے، ہر طرف ایک نظر فریب چمن کھلا ہوا ہے، مقابر تمام تر سنگین ہیں، بعض سنگ سفید کے، اور اکثر اعلیٰ و نفیس سنگ مرمر کے، وقس علیٰ ہذا۔ اس نمونہ کو وہ اپنی قوم کے سامنے پیش فرماتے ہیں، اور چاہتے ہیں، کہ یہاں کے مزارات کے متولی و سجادہ نشین بھی یہی طرز اختیار کریں، کہ شاید مردہ قوم کے زندوں میں، زندہ قوم کے مُردوں کی تقلید سے کچھ آثار حیات پیدا ہو جائیں۔

---

یقینی ہے، کہ صاحبزادہ صاحب نے یہ مشورہ خالص ہمدردی کی بنا پر پیش فرمایا ہے لیکن یہ بھی یقینی ہے، کہ اگر اُنکا مذہبی مطالعہ اُسی قدر وسیع ہوتا جس قدر اُنکے تعلیمی معلومات ہیں، تو اُنکا مشورہ اس سے بالکل مختلف ہوتا۔ اسلام نے دنیا کے اس سب سے زیادہ یقینی واقعہ (موت) سے متعلق جزئی سی جزئی ہدایات اپنے پیرووں کو دے رکھی ہیں، اس لیے ایک مسلم کے لیے اس باب میں کسی بیگانہ قوم سے درس ہدایت لینے کی مطلق گنجایش نہیں۔ احکام اسلام، مسئلہ مقابر میں بالکل صاف و واضح ہیں، ضرورت صرف اسکی ہے، کہ امانت داران توحید کو اُن پر عمل کی توفیق ہو۔ اسلام پختہ مقابر، سنگین مزارات، اور بلند گنبدوں کا دشمن ہے۔

(۱) عن جابرؓ قال نہی رسول اللہ صلعم ان یجصص القبور وان یقعد علیہ وان یبنی علیہ (مسلم۔ کتاب الجنائز)

جابرؓ سے روایت ہے، کہ رسول خدا صلعم نے منع فرمایا قبروں کو پختہ کرنے سے، اُن پر بیٹھنے سے، اور اُن پر کچھ تعمیر کرنے سے۔

(۲) عن جابرؓ قال نہی رسول اللہ صلعم عن تجصیص القبور (مسلم۔ ابن ماجہ)

جابرؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے قبروں کے پختہ کرنے کی ممانعت کی۔

(۳) عن ابی سعیدؓ ان النبی صلعم نہی ان یبنی علی القبر۔ (ابن ماجہ)

ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے، کہ حضورؐ نے قبر پر عمارت بنانے سے منع فرمایا۔

عالیشان عمارات، اور سنگین مزارات الگ رہے، اسلام اس تک کا روادار نہیں، کہ قبریں سطح زمین سے زیادہ بلند ہوں۔

عن ثمامہ بن شفی حدثہ قال کنا مع فضالۃ بن عبید بارض الروم برودس فتوفی صاحب لنا فامر فضالۃ بقبرہ فسوی ثم قال سمعت رسول اللہ صلعم یامر بتسویتہا (مسلم۔ کتاب الجنائز)

ثمامہ بن شفی راوی ہیں، کہ ہم حضرت فضالہؓ کے ہمراہ ملک روم کے جزیرہ روڈس میں تھے، کہ ہمارے ایک رفیق کا انتقال ہوگیا، تو فضالہؓ نے کہا کہ انکی قبر برابر کردیجائے۔ اور انھیں نے فرمایا کہ میں نے رسول خدا صلعم کو حکم فرماتے سنا کہ قبریں برابر کردی جائیں۔

سرکار رسالتؐ کا فرمان صریح ہے، کہ بلند قبروں کو زمین کے ہم سطح کردیا جائے۔

عن ابی الہیاج الاسدی قال قال لی علیؓ الا ابعثک علی ما بعثنی علیہ رسول اللہ صلعم ان لا تدع

ابو الہیاجؓ اسدی کہتے ہیں کہ مجھ سے حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میں تم کو اُس کام پر بھیجتا ہوں جس پر مجھے رسول خدا صلعم نے بھیجا تھا۔ وہ یہ

تمثالاً (او صورۃً) إلا طمسته ولا قبراً مشرفاً إلا سویته (مسلم - کتاب الجنائز)

کہ ہر تصویر کو مٹا کر، اور ہر بلند قبر کو زمین کے برابر کرکے رہوں۔

---

اسلام، قبرستان کو محض قبرستان رکھنا چاہتا ہے۔ پارک بنا دینا نہیں چاہتا، جہاں انسان سیر و تفریح کے لیے جاتا ہے، اور سبزہ اور بنچوں پر بیٹھ کر گپ شپ کرتا ہے، اور نہ پھر مسجد کی شکل میں تبدیل کر دینا چاہتا ہے، جہاں انسان پرستش و عبادت، رکوع و سجود کی غرض سے جاتا ہے۔

(۱) عن ابی ہریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلعم لان تجلس احدکم علیٰ جمرۃٍ فتحرقه خیر له من ان تجلس علیٰ قبرٍ۔ (ابن ماجہ)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلعم نے فرمایا کہ تم میں سے اگر کوئی ایک چنگاری پر بیٹھ جائے، اور وہ اُسکو جلائے تو یہ اس سے بہتر ہے، کہ قبر پر بیٹھا جائے۔

(۲) عن ابی مرثد الغنوی قال قال رسول اللہ صلعم لا تجلسوا علی القبور ولا تصلوا الیها (مسلم - کتاب الجنائز)

ابو مرثد غنویؓ سے دو طریقوں سے یہ مروی ہے، کہ رسول خدا صلعم نے فرمایا کہ قبروں پر نہ بیٹھو اور نہ اُنکی طرف نماز پڑھو۔

(۳) وعنه قال سمعت رسول اللہ صلعم یقول لا تصلوا الی القبور ولا تجلسوا علیها۔

اسی طرح قبرستان کو مسجد بنا لینے، اور قبروں پر نماز پڑھنے کی ممانعت میں متعدد احادیث وارد ہیں۔ یہود و نصاریٰ جو اپنے بزرگان کرام کے مزاروں کو عبادت گاہ بنا لیتے تھے اُن پر رسول اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لعنت فرمائی ہے۔ (بخاری، کتاب الجنائز، مسلم، کتاب المساجد - ابن ماجہ، باب مکروہ مقامات نماز - وغیرہ)

---

ٹھیک اسی طرح، مقابر پر کتبات درج کرنے کی بھی ممانعت آچکی ہے۔

(۱) عن جابرؓ قال نہی رسول اللہ صلعم ان یکتب علی القبر شئ۔ (ابن ماجہ)

جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلعم نے منع فرمایا، قبر پر کچھ لکھنے سے۔

(۲) عن جابرؓ قال نہی رسول اللہ صلعم ان یجصص

جابرؓ سے روایت ہے، کہ رسول خدا صلعم نے منع فرمایا

القبور وان یکتب علیہا وان توطا (ترمذی) | قبروں کو پختہ کرنے سے، اُنپر کچھ لکھنے سے، اور اُنکو پامال کرنے سے۔

غرض مقابر، شریعتِ اسلامی کے مطابق، محض مقابر ہیں۔ نہ تفریح گاہیں ہیں، نہ عبادت خانے۔ بلکہ محض عبرت کے خزائن، موعظت کے دفائن، اور یادِ آخرت کے ذخائر۔ یہ ظن و قیاس نہیں، احکامِ صریح کی ترجمانی ہے۔

| | |
|---|---|
| (۱) عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلعم زوروا القبور فانہا تذکرکم الاخرۃ (ابن ماجہ - باب زیارت قبور) | ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلعم نے فرمایا کہ قبروں کی زیارت کرو، کہ یہ تمھیں آخرت کی یاد دلاتی ہے۔ |
| (۲) عن ابن مسعود ان رسول اللہ صلعم قال کنت نہیتکم عن زیارۃ القبور فزوروہا فانہا تزہد فی الدنیا وتذکر فی الاخرۃ (ایضاً) | ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ میں نے پہلے تمکو زیارت قبور سے روکا تھا، لیکن اب اجازت ہے، قبروں کی زیارت کرو، کہ اس سے دنیا کی جانب سے نفرت اور آخرت کی جانب رغبت پیدا ہوتی ہے۔ |

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کے واسطے سے ایک اور حدیث منقول ہے، جسکا آخری ٹکڑا یہ ہے، کہ

| | |
|---|---|
| فزوروا القبور فانہا تذکر الموت | قبروں کی زیارت کرو، کہ یہ شے موت کو یاد دلاتی ہے۔ |

---

ان تصریحات سے واضح ہو گیا ہوگا، کہ عالیشان عمارتیں، سنگین مزارات، بلند گنبد، خوشنما طغرے، مؤثر کتبے، ان میں سے کوئی شے بھی اسلام و شارعِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پسند کردہ آئین و دستور کے موافق نہیں۔ مومن کی قبر باہر سے نہیں، اندر سے آراستہ ہوتی ہے۔ ایک اور ارشاد کے مطابق مُردے کے ہمراہ قبر تک تین چیزیں آتی ہیں، اُسکے اعزہ، اُسکا مال، اور اُسکے اعمال۔ پہلی دونوں چیزیں واپس چلی جاتی ہیں، اور آخری شے ساتھ دیتی ہے۔ قبر کے اوپر نقش و نگار، زینت و آرایش، سبزہ و گل کا انتظام اعزہ و احباب کر سکتے ہیں، لیکن ایک تیرہ و تار، تنگ و عمیق گڑھے کو روشن و فراخ، ہوادار و آرام دہ، دلکش و نشاط انگیز، چمن و گلزار بنا دینا اعمالِ صالحہ پر منحصر ہے۔ خدائے تعالیٰ و قدوس، اپنے فضل و کرم سے ہر کلمہ گو کو آخری خوابگاہ ایسی ہی نصیب کرے! صاحبزادہ صاحب تو خیر، ایک حد تک معذور کیے جا سکتے ہیں، ان سے کہیں زائد قابلِ تاسف حالت ہمارے علما و مشائخ کی ہے جن کی تعداد کثیر نے قبر پرستی اور اُس کے مراسم متعلقہ کو اپنا مستقل ذریعۂ معاش بنا لیا ہے۔

## ہمارا قبرستان

صاحبزادہ صاحب نے اپنے وطن سے ہزارہا میل بعید، ایک قبرستان پر توجہ فرمائی لیکن تعجب ہے، کہ خود انکے قلمروِ خاص کا قبرستان اب تک انکی نگاہِ التفات سے محروم رہا۔ اتفاق سے عین اسی زمانے میں انکے "قایم مقام" صاحب نے (جنکی ایک عمر "قائم مقام" رہنے میں صرف ہوچکی ہے) مسلم یونیورسٹی کے قبرستان پر اپنی توجہ مبذول فرمائی ہے، اور اسکی "نہایت خراب" اور "نہایت افسوسناک حالت" کا نقشہ پیش کرکے، یونیورسٹی سے نہیں، بلکہ یونیورسٹی کے "بہی خواہوں عہدہ داروں، اور کارکنوں" سے فراہمی سرمایہ کی اپیل اس معقول بنا پر کی ہے، کہ

"حالت موجودہ میں یونیورسٹی پر اس کا بار ڈالنا مناسب نہیں معلوم ہوتا"

اور اپنی طرف سے "سو روپے" کی رقم، جسے وہ اپنے پچھلے چندوں اور عطیوں کے مقابلے میں "رسماً و انکساراً" نہیں، واقعۃً "ناچیز" سمجھنے پر مجبور ہیں، اس "کارخیر" میں پیش فرمادی ہے۔

---

اس "کارخیر" سے متعلق زیادہ کرید اور جستجو کا حق یقیناً ہم "اغیار" و "اجانب" کو حاصل نہیں، لیکن اگر یہ استفسار بالکل ہی سوءِ ادب میں داخل نہ ہو، تو کیا "خلوتیانِ راز" و "محرمانِ خاص" میں سے کوئی بزرگ یہ بیان فرمادیں گے، کہ جو شاہ خرچ انسٹیٹیوشن، ایک سال کے اندر تعمیرات پر ۶۲ ہزار خرچ کرسکتا ہے، ۱۵ ہزار محض مرمت پر لگا سکتا ہے، ۲۵ ہزار کی اراضی خرید سکتا ہے، ایک نہیں چار چار جدید شعبہ جاتِ تعلیم کھول سکتا ہے، جو ارکانِ اسٹاف کے اضافے اور انکے مشاہروں کی ترقی میں بیدھڑک صرف کرسکتا ہے، جو مصارفِ اسپتال کے لیے ایک گراں قدر رقم منظور کرتا ہے، جو پریس، بک ڈپو وغیرہ مختلف متعلقات یونیورسٹی کی سرپرستی کے لیے آمادہ و مستعد ہے، جو حکام و امرا کے مصارفِ استقبال میں دل کھول کر دادِ فیاضی دے سکتا ہے، اور جو خود اپنی ہی مقرر کردہ مجلس تخفیفِ مصارف کے مشوروں کو ناقابلِ قبول پاتا ہے، اُسکا خزانۂ عامرہ صرف اس ایک "کارخیر" کے جو اسلام اور یونیورسٹی دونوں کی شان کے لحاظ سے نہایت ضروری ہے "بار" اٹھانے کے کیوں ناقابل ہو جاتا ہے؟ یا یہ ساقی کا اعجاز ہے، کہ وہ "تہی ساغری" اور "لبریزی" دونوں کے کرشمے ایک ہی وقت میں دکھا سکتا ہے؟

---

## پرستارانِ فرنگ!

اودھ کے ایک نامور تعلیم یافتہ ہندو بزرگ، جو انگریزی حکومت، انگریزی تعلیم، انگریزی تمدن اور انگریزی علوم و فنون کے ساتھ موالات کو باعثِ فخر سمجھتے ہیں، اور ایک نہایت ممتاز سرکاری عہدے پر سرافراز بھی رہ چکے ہیں، کچھ روز ہوئے سیر فرنگ کی غرض سے تشریف لے گئے ہیں، اور اپنے مشاہدات و تجربات سے لکھنؤ کے ایک اُردو روزنامہ کو شرف فرماتے رہتے ہیں، حال میں "شام پیرس" سے متعلق اُنھوں نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے، وہ اس قدر صحیح، دلچسپ، وسبق آموز ہے، کہ ان اوراق میں اسکا تذکرہ ضروری ہوگیا ہے۔ فرماتے ہیں :-

"آج سے چھ سو سال قبل خواجہ حافظ نے رندانہ زندگی کا جو نقشہ کھینچا تھا، وہ آج چودھویں صدی ہجری میں حرف بحرف پیرس کا مصداق ہو رہا ہے، جہاں بادی النظر میں بجز عیش و مسرت کے کوئی کام ہی نہیں دکھائی دیتا۔۔۔۔۔۔

پیرس کے گلی کوچوں میں پھرو، یا بڑے بازاروں کی سیر کرو، خواہ سر بفلک منارہ جات کی آخری منزل پر ہوا کھاؤ، یا زمیں دوز ریلوے کے گوشے میں پناہ گزیں ہو، تمھیں چپے چپے پر حسن و عشق کے کرشمے، ناز و نیاز کی سرگوشیاں، اور مشربِ رندانہ کے ڈھول ڈھمکے کے تماشے نظر آئیں گے ۔۔۔۔۔۔ کوئی چوراہا ایسا نہ ملے گا جہاں جوڑے اپنا سودا چکانے میں مصروف نہ ہوں، کوئی لیمپ یا ستون روشنی سڑک پر ایسا نہ پاؤگے جہاں ان برق وشوں کا شعلۂ حسن نہ چمکتا ہو"

---

مغربی تہذیب و تمدن سے متنفر و بیزار نہیں، اُسکا عاشق و شیدائی، مغربی ترقیوں کا منکر نہیں، اُنکا قصیدہ خواں، مغربی حکومت کو باعثِ لعنت نہیں، باعثِ برکت قرار دینے والا، آگے چل کر اپنے تئیں الفاظ ذیل قلمبند کرنے پر مجبور پاتا ہے :-

"جشنِ انبساط اگرچہ عام طور پر ہر گلی کوچہ میں نظر آئے گا، لیکن شوارع اطالین، اپیرا، مان مارت، شانز ایلیزی، اور بوا وغیرہ میں ازدحام کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ شانہ سے شانہ چھلتا ہے۔ اسٹرنگ بینڈ یا جز بینڈ کے ترانے جابجا قہوہ خانہ سے نکل رہے ہیں۔ رعنائی و دلربائی کی مجسم صورتیں جلوہ آرا ہیں۔ برقی روشنی سے در و دیوار جگمگا رہے ہیں۔ تمام عالم

بقعۂ نور نظر آرہا ہے۔ عرش سے فرش تک جدھر نظر جاتی ہے، حُسن و ادا کے کرشمے دکھائی دیتے ہیں۔ زاہد صد سالہ بھی کنجِ تنہائی سے نکل کر اس اندر کے اکھاڑے کو دیکھتا ہے ۔۔۔۔۔۔ منارۂ آئیفل تقریباً ایک ہزار فٹ لمبا ہے ۔۔۔۔۔ دنیا میں یہ منارہ بلند ترین ہے ۔۔۔۔۔۔ فرانسیسیوں کی بوالہوسی دبنگری دیکھو کہ اس بلند ترین منارے پر جہاں جاتے ہوئے کمزور طبائع کے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، جام و سبو میں مصروف ہیں۔ شبِ ہجراں کے شکوہائے رنج و الم مشرق کے لیے مخصوص ہیں۔ عشرتکدۂ پیرس میں شبِ وصال و یومِ عید کے سوا کوئی تذکرہ جائز نہیں ۔۔۔۔۔ یہاں چکلے اور قمار خانے جائز ہیں، اور لوگوں کو کامل آزادی ہے کہ جب چاہیں سیہ روئی کو جائیں "

---

مرقع تہذیب و تمدن ناتمام رہ جائے گا، اگر ترقی و روشن خیالی کی لطیف ترین صنعتِ ما کا منظر زیرِ پردہ رہ گیا۔

"ان قہوہ خانوں کو چھوڑ کر پیرس کے اکثر حلقوں میں تعلیم گاہ رقص بھی موجود ہیں ۔۔۔۔۔ ۸ بجے شب سے ۱۰-۲ بجے تک کیک روی کا ہنر سکھایا جاتا ہے۔ ہر تعلیم گاہ میں ایک میخانہ بھی موجود ہے ۔۔۔۔۔ ۹½ بجے بینڈ بجنے لگتا ہے، اور اس کی آواز پر چاروں طرف سے پرے کے پرے ٹوٹے پڑتے ہیں، جو اپنے جوڑے کے ساتھ تھرکنے لگتے ہیں۔ مرد کا بایاں اور عورت کا دایاں ہاتھ سینہ سے زاویۂ قائمہ بناتا ہوا اوپر کو اُٹھا ہوتا ہے۔ مرد کا سیدھا ہاتھ عورت کے شانے پر اور عورت کا بایاں ہاتھ مرد کی پشت یا کمر پر ہوتا ہے۔ سینہ سے سینہ پیوست ہوتا ہے ۔۔۔۔۔ نیم برہنہ جامہ جو حریر کے باریک تاروں سے بنا گیا ہے، زیبائش ستر کے لیے ہر جگہ نظر آئے گا۔ برہنہ شانہ، نیم برہنہ سینہ، نیم برہنہ پشت پر برقی روشنی پھسلی پڑتی ہے۔ شربتی موزے ساقِ سیمیں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ گداز پنڈلی باہر نکلی ہوئی ہے۔ اونچی ایڑی کا کامدار جوتہ پیروں میں ہے۔ سر پر ایک کامدار یا مصنوعی مرصع کار رومال بالوں کو سنبھالے ہوئے ہے "

اُردو کے ظریف تام صحیح نے بغیر پیرس کی جھلک دیکھے ہوئے ایک بار کہا تھا، ع

جہاں جڑا لکھنؤ، کچھ غم نہیں، پیرس تو باقی ہے۔

اور اس طرح گویا پیرس کو لکھنؤ کا قائم مقام یا بدل قرار دیا تھا، لیکن آج وہ زندہ ہوتے، تو یقیناً اپنی غلطی کو تسلیم کرتے۔ لکھنؤ بیچارہ اپنی رونق و ترقی کے منتہائے شباب کے وقت بھی پیرس کے لئے مد مقابل بننے کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔

## ایک دوسرا پہلو

برکات تمدن جدید کا ایک پہلو تو یہ تھا، جو ابھی نظر سے گذرا۔ دوسرا پہلو وہ ہے، جسکے متعلق حال میں روس سے اطلاع آئی ہے۔ زار اعظم کی اس عظیم الشان یادگار میں نو بڑے شہر ہیں۔ ان میں سے ستر کے متعلق اطلاع یہ ہے، کہ اکتوبر ۱۹۲۳ء میں، ان میں بے روزگاروں کی تعداد ۲۰۰،۲۰۰ تھی، فروری ۱۹۲۴ء میں ان کا شمار بڑھکر ۸،۱۲۰۰۰ تک پہونچ گیا۔ باقی میں شہروں کی حالت کا بھی اندازہ کرکے، حزب العمال مغربی کا مرکزی ہفتہ وار جریدہ انڈسٹریل اینڈ لیبر انفارمیشن لکھتا ہے، کہ یکم جنوری ۱۹۲۴ء کو کل مملکت روس میں بے روزگاروں کی مجموعی تعداد کسی طرح ۱۲۳۰۰۰۰ سے کم نہیں ہو سکتی، بلکہ اغلباً اس سے زائد ہوگی!

ہماری قوم کے "طبیب حاذق" سید طفیل احمد صاحب جو مسلمانوں کے افلاس و تہی دستی کا درمان وحید سود خواری کو قرار دے رہے ہیں، کیا ازراہ غریب نوازی ملک روس میں تشریف لیجاکر اپنے تیر بہدف علاج کی آزمایش کریں گے؟ متعصب مسلمان اپنی جہالت و تاریک خیالی سے ایسے محسن قوم کی پوری قدر نہ کرسکے، روشن خیال و ترقی دوست روس، اُمید ہے کہ انکے حق میں اپنی پوری قدرشناسی کا ثبوت دیگا۔

## حق کی ناکامی

گاندھی جی کی تحریک کا بالآخر وہی حشر شروع ہوگیا ہے، جو دنیا میں اب تک تقریباً ہر تحریک حق و صداقت کا ہوتا آیا ہے۔ حضرت نوحؑ صدہا سال تک پیام حق کی منادی کرتے رہے، کسی نے نہ سنا۔ حضرت ابراہیم خلیلؑ نے صدائے توحید بلند کی، تو آگ میں ڈالے گئے۔ حضرت موسیٰؑ ایک محکوم قوم کو ظالم حکومت کے پنجے سے رہائی دلانے کے تشریف لائے، تو خود اپنی ہی قوم کی طرف سے مسلسل مخالفتوں اور نافرمانیوں کو برداشت کرنا پڑا۔ حضرت مسیحؑ نے راہ ہدایت دکھانا چاہی، تو دار و رسن کے مستوجب قرار پائے۔ حضرت صالحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت لوطؑ، جس جس نے صراط مستقیم کی دعوت دنیا کے سامنے پیش کی، تقریباً سب کو اپنی قوم کی طرف سے جواب انکار و استکبار، تمسخر و استہزا کی شکل میں ملا ہے۔ جب ان پیامبران برحق، د

وہ ادیانِ مرسل کا یہ حال رہا کیا ہے، تو گاندھی بیچارے ہیں تو ان انبیاء کرام کی عشر عشیر بھی قوت نہیں، اُسکی تبلیغ کو کامیابی کی (اُس کامیابی کی جسے دنیا 'کامیابی' کہکر پکارتی ہے) کیا توقع ہو سکتی تھی؟ نتیجہ کہ داس، و نہرو، کیلکار و پٹیل، سب ایک ایک کرکے ساتھ چھوڑ رہے ہیں، اور موسیٰ و سامری کے راستے روز بروز ایک دوسرے سے دُور اور الگ ہوتے جا رہے ہیں!

---

انبیاء اور اُنکے منکرین کی تاریخ، درحقیقت تاریخ کائنات کا عطر ہے، حق و باطل، نور و ظلمت، روح و مادہ کی جنگ ازل سے قائم ہے اور ابد تک رہیگی۔ موسیٰ کلیمؑ و فرعون، ابراہیم خلیلؑ و ختم رسلؐ و ابوجہل کی تاریخ ایک جام جم ہے، جس میں گذشتہ و آیندہ ہر واقعہ کا عکس نظر آجاتا ہے، دیدۂ بصیرت چاہیے۔ سامری حضرت موسیٰؑ ہی کا ایک لشکری تھا، کوئی بیرونی مخالف نہ تھا۔ ادھر کلیمؑ کی ذات مبارک آنکھوں سے اوجھل ہوئی، اُدھر اُس نے ایک گوسالہ بنا کر کھڑا کر دیا، اور ایک طا دنیا کلیم اللہؑ کی تعلیم کو بھول کر اُسکی پرستش میں لگ گئی۔ ہارونؑ موجود تھے، روک تھام کی کہ اے

| | |
|---|---|
| یا قوم انما فتنتم به، وان ربکم الرحمٰن فاتبعونی واطیعوا امری۔ (طٰہٰ ۱) | قوم کے لوگو! تم کیسے سخت فتنہ میں مبتلا ہوئے۔ کیا اپنے پروردگار خدائے رحمٰن کو بھول گئے۔ اسے یاد رکھو اور میری اتباع کرو۔ کہ میں اُسی کا رسول ہو |

قوم نے ایک نہ سُنی۔ اور عذر یہ پیش کیا کہ

| | |
|---|---|
| لن نبرح علیه عاکفین حتی یرجع الینا موسیٰ (ایضاً) | موسیٰؑ کی واپسی تک تو بہرصورت ہم کو نہ روکو، اور اس کی کرنے دو۔ |

بالآخر حضرت ہارونؑ بھی اس خیال سے خاموش ہو رہے، کہ یہ لوگ تو باز آنے والے نہیں

| | |
|---|---|
| انی خشیت ان تقول فرقت بین بنی اسرائیل ولم ترقب قولی (ایضاً) | ایسا نہ ہو، کہ قوم میں تفریق و انتشار پیدا کر دینے، اور حضرت موسیٰؑ کے انتظار نہ کرنے کا الزام بھی میرے سر ڈالا جائے۔ |
| رجع موسیٰ الی قومه غضبان اسفا ان الذین اتخذوا العجل سینالهم غضب من ربهم وذلة فی الحیوة الدنیا (اعراف-۱۸) | حضرت کلیمؑ نے واپس آکر یہ ماجرا دیکھا تو سخت غصہ و قلق پیدا ہوا۔ ان کا غصہ الٰہی کا مقدمہ تھا، چنانچہ ان گمراہوں کے لیے قہر الٰہی کی وعید شدید بنا اور یہ حکم ہوا کہ اسی دنیا میں انھیں ذلت نصیب رہے گی۔ |

کیا اس سارے واقعہ سے ہماری رہنمائی کے لیے کوئی درس ہدایت نہیں نکلتا؟

گاندھی جی کے جیل خانے جانے سے پیشتر داس و نہرو انکے خاص دست و بازو سمجھے جاتے تھے۔ گاندھی جی کا میدان عمل سے ہٹنا تھا، کہ ان لوگوں نے کونسلوں کا ایک گوسالہ بنا کر کھڑا کیا، اور اپنی سعی و توجہ کا سارا مرکز اسی کو ٹھہرا لیا، حالانکہ یہ خوب جانتے ہیں کہ آج تک کوئی محکوم قوم نہ کونسلوں کی مدد سے آزاد ہوئی ہے، نہ کوئی کونسل کسی قوم میں روحانی و اخلاقی قوت پیدا کر سکتی ہے۔

الم یروا انه لا یکلمهم ولا یهدیهم سبیلا۔ (اعراف - ۱۸)

دو چار مخلصین جو باقی تھے، یا جو (محمد علی کی طرح) بیمہ کو چھوٹ کر آ گئے، انھوں نے اپنی والی روک تھام کی، لیکن سوراجیوں کی طرف سے یہی عذر پیش ہوا، کہ مہاتما جی کو باہر آنے دو۔ اور پھر ان لوگوں نے بھی محض اتفاق و اتحاد قائم رکھنے، اور قوم کو تفرقہ و انتشار سے بچانے کے لیے سکوت اختیار کر لیا۔ رفتہ رفتہ یہی گوسالہ پرستی تمام قوم پر مسلط ہو گئی، اور نوبت یہ پہونچ گئی، کہ آج جب خدا کا یہ نیک بندہ، جسے خدا نے ایک غلام قوم کو آزاد کرانے کے لیے بھیجا ہے، خدا کا نام لیکر قوم کو جد و جہد، سعی و عمل کی دعوت دیتا ہے، تو ٹھیک انھی لفظوں میں جواب ملتا ہے، جو سرکش و متمرد قوم یہود نے اپنے نبی برحق کے مقابلہ میں اختیار کیا تھا، کہ

فاذہب انت وربک فقاتلا انا ہٰہنا قاعدون (مائدہ - ۱۲)

تم اور تمہارا خدا جا کر معرکہ سر کر آئیں، ہم تو یہیں بیٹھے انتظار کرتے ہیں۔

جب سب نے رفاقت چھوڑ دی، تو اُس سچے پیغمبر نے جناب باری میں عرض کی

رب انی لا املک الا نفسی واخی فافرق بیننا وبین القوم الفاسقین (مائدہ ۲)

کہ اے پروردگار، مجھے تو صرف اپنے اور اپنے بھائی پر اختیار رہا ہے، اور بس۔ اب ہم میں اور اس نافرمان قوم میں تو ہی فیصلہ کر دے۔

اس نافرمانی کی پاداش میں بالآخر سزا یہ ملی، کہ

قال فانها محرمة علیهم اربعین سنة یتیهون فی الارض (ایضاً)

چالیس برس کی مدت تک یہ گمراہ گروہ جنگل بیابان میں بھٹکتے اور ٹھوکریں کھاتا پھرا۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے، کہ باشندگان ہند کو بھی دشت غلامی و صحرائے محکومی میں کتنے برسوں بھٹکنا اور ٹھوکریں کھانا باقی ہے!

## چرخے کے فضائل سرورِ عالم کی زبان سے

کانگرس کمیٹیوں کے جو مسلمان ارکان اپنے اپنے عہدوں سے اس بنا پر استعفے دے رہے ہیں، کہ چرخہ کاتنا اور سوت نکالنا اپنے لیے ناقابل تحمل پاتے ہیں، انکی خدمت میں عرض ہے کہ سرورِ کونین صلعم

کے مندرجۂ ذیل ارشادات پر ایک نظر کریں، قبل اسکے کہ چرخہ اور سوت کے ساتھ تمسخر و استہزاء شروع کریں۔

| | | |
|---|---|---|
| (۱) | نعم لہو المومنة فی بیتہا المغزل | مومنہ کے لیے بہترین تفریح اُسکے گھر میں چرخہ ہے۔ |
| (۲) | خیر لہو المرأة المغزل | عورت کے لیے بہتر تفریح چرخہ ہے۔ |
| (۳) | نعم لہو المرأة مغزلہا | عورت کے لیے اس کا چرخہ اُسکی بہتر تفریح ہے۔ |
| (۴) | عمل الابرار من النساء الغزل | نیک بیویوں کا کام سوت کاتنا ہے۔ |
| (۵) | اعمال الابرار من النساء الغزل | نیک بیویاں سوت کاتا کرتی ہیں۔ |
| (۶) | زینوا مجالس نسائکم بالمغزل | اپنی عورتوں کی مجلسوں کو چرخہ سے آراستہ کرو۔ |
| (۷) | حدثنا زیاد بن السکن قال دخلت علی ام سلمہ وبیدہا مغزل تغزل بہ فقلت کلما اتیتک وجدتک فی یدک مغزلاً فقالت انہ یطرد الشیطان ویذہب حدیث النفس وانہ بلغنی ان رسول اللہ صلعم قال اعظمکن اجراً اطولکن طاقة۔ | زیاد بن سکن سے روایت ہے کہ میں اُم المومنین ام سلمہؓ کے پاس حاضر ہوا تو دیکھا کہ وہ چرخہ کات رہی ہیں۔ میں نے کہا، کہ میں جب آتا ہوں، آپ کے ہاتھ میں چرخہ ہی دیکھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ شیطان کو بھگاتا ہے اور وسوسہ نفسانی کو مٹاتا ہے۔ اور مجھے یہ خبر پہونچی ہے، کہ رسول خدا صلعم کا ارشاد تھا، کہ تم میں سب سے زیادہ اجر اس عورت کو ملیگا جسکی سوت کی اٹیری سب سے زیادہ بڑی ہوگی۔ |
| (۸) | علموہن المغزل و سورة النور | عورتوں کو چرخہ اور سورۂ نور کی تعلیم دو۔ |
| (۹) | عن زیاد بن عبد اللہ القرشی قال دخلت علی ہند بنت المہلب ابن ابی صفرہ وہی امرأة الحجاج بن یوسف فرأیت فی یدہا مغزلاً فقلت أتغزلین وانت امرأة امیر قالت سمعت ابی یقول قال رسول اللہ صلعم اطولکن طاقة اعظمکن اجراً وہو یطرد الشیطان ویذہب حدیث النفس۔ | زیاد بن عبد اللہ قرشی کہتے ہیں کہ میں ہند بنت مہلب بن ابی صفرہ کے پاس گیا جو حجاج بن یوسف کی بیگم تھیں۔ اور انکے ہاتھ میں میں نے چرخہ پایا۔ پس میں نے کہا کہ آپ امیر وقت کی بیوی ہوکر چرخہ کاتتی ہیں! وہ بولیں کہ میں نے اپنے والد کی زبان سے رسول اللہ صلعم کا یہ ارشاد سنا ہے، کہ جس عورت کے سُوت کی اٹیری سب سے بڑی ہوگی، وہی اجر بھی سب سے زیادہ پائیگی۔ اور چرخہ شیطان کو بھگاتا ہے، اور وسوسۂ نفس کو مٹاتا ہے۔ |

امام جلال الدین سیوطی نے چرخہ کے فضائل میں ایک مختصر رسالہ الاجر الجزل فی الغزل کے نام

مرتب کیا ہے، جس میں اسکے متعلق آثار و اخبار کو مع اسناد جمع کر دیا ہے۔ اقتباسات بالا اسی رسالہ سے ماخوذ و منقول ہیں۔

## بعض نادہند قرضدار

علیگڈھ کالج میں مدت سے ایک انجمن القرض قائم ہے، جو نادار طلبہ کو اس شرط پر امداد دیتی ہے کہ وہ لوگ جب کمانے کے قابل ہو جائیں گے، تو کل رقم بہ اقساط اس انجمن کو واپس کر دیں گے تاکہ وہ دوسرے طلبہ کے کام میں آئے۔ علیگڈھ کے بہت سے سابق طلبہ جو اسوقت ملک میں مختلف حیثیات سے ممتاز ہیں، انکی تکمیل تعلیم اسی ذریعہ سے ہوئی ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر کسقدر افسوس ہوتا ہے، کہ ان میں سے متعدد تعلیمیافتہ حضرات ایسے ہیں، جو بڑی بڑی معقول آمدنی رکھتے ہیں، اور متعدد تقاضوں کے باوجود آج تک اس قرض کی ادائی پر ذرا بھی متوجہ و ملتفت نہیں ہوے ہیں، مجبوراً انجمن مذکور کو انکے خلاف عدالتی چارہ جوئی کا فیصلہ کرنا پڑا ہے۔

علیگڈھ سے ہم کو جو اصولی اختلافات ہیں، اُن کا اظہار ان اوراق میں برابر ہوتا رہتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس غیر شریفانہ طریقے سے اُسے جو نقصان عظیم پہونچایا جا رہا ہے، اس سے کسی کو ذرہ برابر ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ ان نادہند قرضداروں کے قلوب گویا تعلیم اسلام و جذبات شرافت سے بالکل خالی ہیں، انکے خلاف جو سخت سے سخت کارروائی بھی عمل میں لائی جائے اُسکی تائید ہر معقول انسان کریگا۔

---

چلپی صاحب کی تحریر میں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں، مگر تحریک کی ناکامی کے ذکر میں کلی تمثیل و تشبیہ تشنہ رہ جائیگی اگر پنڈت موتی لال نہرو اور مسٹر سی آر داس کے اسماے گرامی کے ساتھ جناب حکیم اجمل خاں صاحب [illegible] کا نام نامی لا تشبیہ مکمل نہ کر دی جائے۔ مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بعد نہ صرف اہل ہند کو بلکہ خود مہاتما جی کو بھی اُمید اور یقین تھا کہ کانگریس کے تعمیری نظام کو مقبول بنانے اور اہل ملک کی اس بارہ میں پوری پوری رہنمائی کرنے میں [illegible] صاحب مہاتما جی کی جانشینی کا حق ادا فرمائیں گے۔ مگر ملک کی بدقسمتی اور دفتری اقتدار کی خوش قسمتی سے ہمارے مسیحا کو خود کونسلوں کا بیمار بنا دیا۔ اور یہ اُسی کا نتیجہ ہے کہ آج تحریک ترک موالات کے نیم جاں ہو جانے سے قومی امیدوں کا لہلہاتا باغ مرجھا گیا ہے اور ہندو مسلم تنازعات کی گرم بازاری نے تمام ہوا خواہان ملک کو افسردہ و پریشان اور متحدہ قومیت کا نظام پارہ پارہ کر دیا ہے۔

ایڈیٹر

# پیام امن

تقریظ، تالیف، تصنیف، قریب قریب مساوی درجے کے مشکل فن ہیں۔ مؤلف اور مصنف کو اگر اپنے پریشاں خیالات کی جمع و ترتیب میں دماغ سوزی کرنا پڑتی ہے، تو ریویو نگار کو بھی کچھ کم عرق ریزی کرنا نہیں پڑتی، بلکہ ایک حیثیت سے آخر الذکر کا کام زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ مصنف کا کام جمع و ترتیبِ خیالات ہے، ریویو نگار یہ مجتمع اجنبی خیالات منتشر کر دیتا ہے، اپنے پراگندہ خیالات ان میں مزج کرتا ہے، پھر دونوں کے مقابلہ و موازنہ کے بعد اُنھیں ذہن میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع کرتا ہے۔ اس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ مشکل موضوعِ بحث جس طرح کتاب کے مصنف اور مؤلف کے لیے موجبِ ابتلا ہوتا ہے، اُسی طرح ریویو نگار کے لیے بھی۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے آج "پیامِ امن" کے ریویو نگار کو بھی یہی دشوار گزار مرحلہ درپیش ہے، جسے اُس کا مصنف اور تبصرہ نگار تو کامیابی سے طے کر گیا ہے مگر ریویو نگار کو تمام دشواریاں ابھی طے کرنا باقی ہیں۔

"پیام امن" ایک چھوٹی سی کتاب بلکہ رسالہ ہے جو کُل ۱۸۱ صفحے میں ختم ہو گیا ہے۔ ۸ صفحے میں مشہور شاعر ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کا مقدمہ ہے۔ ۵۰ صفحے اصل کتاب کے ہیں اور ۱۲۸ صفحے میں فاضل مترجم مولوی عبدالماجد صاحب بی اے کا تبصرہ و حواشی ہیں۔ اتنی چھوٹی کتاب کی تقریظ کچھ مشکل نہ تھی، لیکن جس دقیق اور نازک موضوع پر اس میں بحث کی گئی ہے اُس نے ریویو نگار کے لیے سخت مشکلات پیدا کر دی ہیں۔

"پیام امن کا موضوع جیسا کہ نام سے ظاہر ہے "امن" ہے، جو فی نفسہ اپنے اندر ذرا بھی نزاکت یا پیچیدگی نہیں رکھتا۔ ہر شخص جانتا اور تسلیم کرتا ہے کہ امن نہایت ضروری اور پسندیدہ چیز ہے اور جنگ و خوں ریزی صد درجہ ناروا اور قبیح ہے، سب کو پُر امن رہنا چاہیے، لڑنا جھگڑنا خلاف انسانیت ہے۔ بلاشبہ اپنے اجمال میں یہ موضوع بالکل صاف، سادہ، اور آسان تو نہیں بلکہ محتاج بحث بھی نہیں ہے۔ لیکن تفصیل شروع ہوتے ہی پیچیدگیوں کا ایک سلسلہ شروع

ہوجاتا ہے، اور بحث کا جو قدم آگے بڑھتا ہے، راہ میں نئی نئی مشکلات سے دوچار ہوتا ہے، یہاں تک کہ ہوتے ہوتے انسان درماندہ اور مایوس ہوکر کہنے لگتا ہے اس مسئلہ کا کوئی حل ممکن نہیں۔

"امن" ضروری ہے، لیکن اگر کوئی مجھے بلا وجہ مارنے لگے، میری روزی چھیننے لگے، میری عزت کے درپے ہو جائے، تو؟ کیا اُس وقت بھی مجھے پُر امن رہنا چاہیے؟ اچھا تو نتیجہ کیا ہوگا شریروں کی عید ہو جائے گی، ہر طرف سے پُر امن لوگوں پر ٹوٹ پڑیں گے، جان و مال لیں گے، آبرو پر دست درازی کریں گے۔ دیکھو کیسی پیچیدہ حالت ہے! اس صورت میں قانون امن کا کیا فیصلہ ہوگا: اگر پُر امن رہتے ہیں؛ برباد ہوتے ہیں، مقابلہ کرتے ہیں؛ امن کا دامن ہاتھ سے جاتا ہے؟!

کہا جا سکتا ہے اس صورت میں بھی امن شکنی نہ کرو، شریر کا خود مقابلہ نہ کرو، حکومت تمہاری حمایت کریگی۔ لیکن یہ صورت تو امن کی نہ ہوئی، ہم شریروں سے لرزاں، شریر حکومت سے خائف، فیصلہ وہی طاقت کے ہاتھ رہا۔ فرق یہ ہوا کہ طاقت خود ہم نے استعمال نہ کی، شریر نے کی، شریر نے نہ کی، حکومت نے کی، ایک طاقت کے زور نے دوسری طاقت کے زور کو اُبھرنے سے روک دیا، گویا التوائے جنگ ہوگیا یا ایک جبری عارضی صلح ہوگئی، اندر جنگ کی چنگاریاں موجود ہیں، صرف سطح سرد ہوگئی۔ مگر امن کا جو مفہوم ہر شخص کے ذہن میں ہے، اس مخفی حالت جنگ سے کس قدر مختلف ہے!

یہ تو انفرادی حالات ہیں، لیکن جب سوالات کا رخ جماعت و قوم کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تو اُلجھنیں اور بھی زیادہ ہو جاتی ہیں۔ کوئی قوم کسی قوم کے حقوق پامال نہ کرے، جنگ نہ کرے، مسلم ہے۔ لیکن اگر کوئی کسی پر زیادتی کر بیٹھے، کیا بیگناہ قوم کو خاموش رہنا چاہیے اور ظالموں کو موقعہ دے دینا چاہیے کہ بے کھٹکے اپنا ظلم توڑیں؟ پھر اسکے بعد؟ بربادی، غلامی، شرمناک زندگی! مثلاً ہندوستان کو لے لو، انگلستان نے اس ملک پر ظالمانہ قبضہ کرلیا ہے، اب ہم کیا کریں؟ پُر امن رہیں تو موجودہ غلامی کیونکر دُور ہوگی؟

معنویات میں آؤ، ایک مذہب ہے جسے ہم حق سمجھتے ہیں، اور لوگ اُس کی مخالفت و استیصال پر کمر بستہ ہیں، یا اسکی منادی سے روکتے ہیں۔ اب ہم کیا کریں؟ حمایت حق میں تلوار اُٹھائیں یا

پُرامن رہ کر دنیا کو باطل و ضلالت ہی میں پڑا رہنے دیں؟

اخلاق میں آؤ، ایک شخص بھڑکتا ہوا شعلہ ہاتھ میں لیے جا رہا ہے کہ اُس گھر کو آگ لگا دے جس میں سو یتیم پرورش پا رہے ہیں۔ اب ہمارا اخلاقی فرض کیا ہے؟ ان سو یتیموں کی جان بچانے کے لیے اس ایک پاگل کی جان لے لینا یا دامن امن تھامے اس کے وحشیانہ فعل کی تکمیل میں اپنی خاموشی سے معین ہونا؟

غرضکہ بے شمار مسائل پیدا ہوجاتے ہیں جن میں عقل حیران رہ جاتی ہے اور کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ قانون امن کی عالمگیری و ہمہ گیری عملاً کیونکر تسلیم کریں اور کس طرح گوناگوں جزئیات پر اُسے منطبق کریں؟ اسی کا نتیجہ تھا کہ انسانی عقول اس سب سے ضروری اور صاف مسئلہ میں بھی متفق نہ ہوسکیں اور مختلف سمتوں میں چلی گئیں۔ ایک گروہ نے تو گویا قانون امن کے ماننے ہی سے انکار کردیا اور عام اجازت دیدی کہ شر کا مقابلہ شر سے کرو، تلوار کا جواب تلوار سے دو: "دانت کے بدلے دانت اور آنکھ کے بدلے آنکھ"! یہ افراد کے لیے، قوموں کے حق میں اس نے اور بھی زیادہ وسعت دی بلکہ قانون امن کے کلیۃً شکست کر دینے کا اعلان کر دیا۔ اُس نے کہا "غیر قوموں پر حملہ میں پیش قدمی کرو، مخالفوں کو انتہائی بیرحمی سے قتل کرنے میں ثواب سمجھو۔" توراۃ کی یہی تعلیم ہے، اور دنیا کے تمام خونریز فاتح کم و بیش اسی اصول کے پیرو تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ بنی اسرائیل ایک محدود اور مذہبی دائرہ کے اندر یہ سب کرتے تھے اور سفاک فاتح بے قید تھے اور ہوس مُلک گیری سے خوں ریزی کرتے تھے۔ دوسرے گروہ نے افراد کے لیے تو اکثر حالتوں میں ہر طرح پُرامن رہنا مستحسن قرار دیا ہے، لیکن قوم و جماعت کے لیے حالت تعدی میں شر کا مقابلہ شر سے کرنے کو ضروری بتایا اور بقدر ضرورت خوں ریزی کی اجازت دے دی ہے۔ لیکن ایک تیسرا فریق بھی ہے جو کہتا ہے "خوں ریزی ہر حال اور ہر شکل میں حرام ہے، بد اخلاقی ہے، خلاف انسانیت ہے؛ افراد کے لیے بھی اور قوموں کے لیے بھی۔" ہر گروہ کے دلائل ہیں، جو مذکورۂ بالا مشکلات اور خاص خاص نفسی نظریات پر مبنی ہیں۔

اس اجمالی بیان سے واضح ہوا ہوگا کہ "پیام امن" کا موضوع باوجود صاف ہونے کے کس قدر دقیق اور نازک ہے، حتیٰ کہ خود آسمانی مذاہب بھی اسکی گتھیاں سلجھانے

میں باہم سخت متخالف ہیں۔ پس اس پر تقریظ لکھنے کے معنی یہ ہیں کہ ان بے شمار خیالات اور متعدد مذاہب پر تنقیدی نظر ڈالی جائے، پھر دکھایا جائے کہ مصنف نے جو مسلک اختیار کیا ہے کس نوعیت کا ہے، صحیح ہے یا غلط؟ ظاہر ہے اس طویل و عریض بحث کے لیے نہ "الناظر" کے محدود صفحات کافی ہیں، نہ مخاطبین اُسکے سننے کے لیے طیار رہیں اور نہ خود ریویونگار کو اتنی مہلت ہے۔ تاہم ایک سرسری نظر ضروری ہے۔

اس بحث میں جتنی گتھیاں ہیں اُنکے سلجھانے کی کوئی صورت نہیں جب تک اُس بُنیادی گتھی کو نہ سُلجھا لیا جائے جو تہ میں پڑی ہوئی ہے۔ اصلی سوال یہ نہیں ہے کہ شر کا مقابلہ کس طرح کرنا چاہیے۔ بلکہ اصلی سوال خود فطرت انسانی کے متعلق ہے۔ فطرتِ انسانی اصل میں ہے کیا؟ خیر ہے یا شر؟ صرف اس ایک سوال کے حل ہو جانے سے تمام گتھیاں سُلجھ سکتی ہیں اور بحث کا کامیاب خاتمہ ہو سکتا ہے۔ جو لوگ اس طرف گئے کہ فطرتِ انسانی اصل میں شر ہے، یا شر کی آمیزش رکھتی ہے، اُنھوں نے حکم لگا دیا کہ جب شر انسان کی جبلت میں ہے یا جبلتاً اُس میں موجود ہے تو ضرور ہے کہ وہ شر اور بدی کا اظہار کرتا رہے۔ اس فیصلہ کے بعد البتہ یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ پھر اس بدی کے مقابلہ میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ ظاہر ہے یہ گروہ صرف یہی جواب دے سکتا تھا کہ شر کا مقابلہ شر سے، بدی کا توڑ بدی سے، جان کے بدلے جان، تلوار کا جواب تلوار، کیونکہ صرف یہی طریقہ شر اور بدی کے روکنے کا ہے اور صرف اسی ذریعے سے دوسروں کی جانیں بچ سکتی ہیں۔

یہ طریقہ تو اُن لوگوں کا ہے جو فطرت انسانی کو شر یا مجموعۂ خیر و شر قرار دیتے ہیں۔ لیکن ایک دوسرا گروہ بھی ہے جو فطرتِ انسانی کی طرف سے مایوس نہیں ہے۔ وہ فطرت کو خیر اور عمل انسانی میں شر کو محض عارضی بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے شر کا مقابلہ شر سے نہ کرو، کیونکہ اس سے شر دُور نہیں ہوتا اور زیادہ بڑھتا ہے، پھر ایسا کرنے سے خود تمھارے اندر بھی شر کی نشو و نما ہوتی ہے، اور بعینہ اُسی جُرم کے تم خود بھی مرتکب ہو جاتے ہو جسے بُرا سمجھ کر دور کرنا چاہتے ہو۔ شر کا مقابلہ خیر سے کرو، کیونکہ انسان کی فطرت خیر ہے۔ خیر ہی کا اُس پر اثر پڑتا ہے اور خیر ہی کے ذریعہ شر کی جڑ کٹ سکتی ہے۔ اس گروہ کا چونکہ یہ مسلک تھا، اس لیے اس نے ہر حال میں اور ہر صورت میں پُر امن رہنے کی دعوت دی، اور کہا تم صرف اسی طرح شریر کے شر کو نہ صرف اپنے سے بلکہ خود اُسکے دل سے بھی دور کر سکتے

"پیامِ امن" کا مسلک اسی آخری گروہ کا مسلک ہے - وہ فطرتِ انسانی کو خیر قرار دیتی ہے، شر کے مقابلہ میں شر کو جائز نہیں رکھتی اور بلا استثنا ہر قسم کی جنگ و خوں ریزی کو حرام قرار دیتی ہے- "پیام امن" درحقیقت خود ایک اعلان جنگ ہے جنگ کے خلاف اور اُس نے اپنے صفحات کے اندر جنگ کے مقابلے میں ایک ایسا میدان کارزار ترتیب دیا ہے جسکے مشاہدے سے نہ آنکھیں سیر ہوتی ہیں نہ دل گھبراتا ہے۔ کتاب کے پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا آسمانوں کے اوپر کوئی فرشتہ ہے جو اپنی دلکش روحانی آواز میں ہمیں مخاطب کرتا اور "قتل نہ کرنا" کے الٰہی اصول کی طرف مادی انسان کو ایسی دل آویزی کے ساتھ بلا رہا ہے کہ مسحور ہو کر اُسکی طرف دوڑنے لگتا ہے - اس "پیام" کا پیام بر اور اس دعوت کا داعی ایک فرنچ نوجوان "پال ریچرڈ" ہے جس میں "رچرڈ شیر دل" کی سی شیر دلی پوری طرح نمایاں ہے، مگر امن کے مقابلہ میں نہیں، بلکہ جنگ کے مقابلہ میں - یہ فرنچ نوجوان نپولین بوناپارٹ کی سی یلغاریں تو کرتا ہے، مگر اٹلی اور مصر کے میدانوں میں خون بہانے کے لیے نہیں، بلکہ لندن، پیرس اور روم کے خونی ایوانہائے حکومت سے ہمیشہ کے واسطے ہتھیار رکھا لینے کے لیے - یہ صدا اگرچہ نئی صدا نہیں ہے کہ امن کے متلاشی انسان کو اجنبی یا عجیب معلوم ہو، بلکہ بعینہٖ وہی صدا ہے جو ہر زمانہ میں اللہ والے محبانِ انسانیت بلند کرتے رہے ہیں، اور روس کے مشہور ربانی حکیم کونٹ ٹالسٹائے کا زمانہ تو ابھی کل کی بات ہے اور اُسکی صدائیں اب تک کانوں سے ٹکرا رہی ہیں - مگر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اِس فرنچ کی صدا جتنی موثر اور دل کی گہرائیوں میں اُتر جانے والی ہے، اُتنی شاید کبھی سننے میں نہیں آئی- ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ اس سے پہلے کسی داعیِ امن نے ایسی مہیب خوں ریزی اور خونریزی کے ایسے مہیب اور عالمگیر نتائج نہ دیکھے تھے جیسے اس فرنچ فلسفی نے دیکھے اور جن سے متاثر ہو کر اُس نے یہ صدا بلند کی جو قلب کے ساتھ دماغ کو بھی مسخر کیے لیتی ہے -

"پیامِ امن" میں جہاں اور بہت سی خصوصیات ہیں، اُس کی ایک یہ خصوصیت بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس کا مقدمہ نگار اور تبصرہ نگار، دونوں باوجود اصل موضوع یعنی ضرورتِ امن کے قائل ہونے کے، مصنف سے اصولی اختلاف رکھتے ہیں، اور وہ وہی اختلاف ہے جو فطرتِ انسانی کے خیر یا شر ہونے کے بارے میں ہم بیان کر آئے ہیں - ڈاکٹر رابندرو ناتھ ٹیگور کی شخصیت

بڑی ہے، اور اُن پر کوئی سخت تنقید شاید طبائع پر گراں گذرے، لیکن ریویو نگار کی محدود واقفیت کے مطابق ڈاکٹر صاحب کی فلسفیانہ تحریریں کامیاب نہیں ہوتیں۔ وہ مطالب اس طرح اُلجھا دیتے ہیں کہ اُنکی شخصیت سے غیر مرعوب آدمی کو شبہہ ہونے لگتا ہے کہ وہ خود اپنی تحریریں سمجھتے ہیں یا نہیں؟ پیام امن پر جو مقدمہ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے اُسکی بھی یہی حالت ہے، بے ربط باتیں جمع کر دی ہیں، جن میں بعض غیر مفہوم، اور بعض غیر مسلّم اور قابل اعتراض ہیں۔ تاہم ہمارے موضوع کے لیے اس میں کافی اشارے موجود ہیں جو ڈاکٹر صاحب کا مسلک صاف ظاہر کر رہے ہیں۔ کہ وہ فطرت انسانی اور خیر محض کے وجود دونوں سے قطعاً مایوس اور اس بارے میں مصنف سے کلی اختلاف رکھتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> "ہمیں اعتراف ہے کہ سرشت انسانی میں ذمائم ودیعت کیے گئے ہیں، اور باوجود قوانین اخلاق پر اعتماد اور ضبط نفس کی تعلیم کے یہی افراد بداخلاقیوں کے مرتکب ہوتے رہیں گے، اغیں جس قدر کامیابی ہوتی جاتی ہے اُسی قدر ہمت عصیاں بھی بڑھتی جاتی ہے ...... بدی کا خاتمہ پوری طرح کبھی بھی نہ ہو سکے گا۔ جس طرح شعلہ روشن رہتا ہے اسی طرح یہ ایک مسلسل کیفیت ہمارے تمدن میں قائم رہے گی۔ مقصد آفرینش اس سے زائد اور کچھ نہیں کہ لا زوال رفیع مقصود اور اُسکے حصول کی عملی ناکامی کے درمیان جو تناقض ہے اُسکو رفع کیا جاتا ہے"

فاضل تبصرہ نگار کو اس غلط نظریہ میں، جو باری تعالیٰ کے کمال میں شبہہ پر مبنی ہے، ڈاکٹر کا اتنا تو غلو نہیں لیکن اصرار ضرور ہے۔ فرماتے ہیں:

> "کامل نیکی کا بلا شائبہ بدی دنیا میں وجود ہر شخص محال تسلیم کرے گا تاہم ہر شارع مذہب اور ہر حکیم اخلاق دنیا کو اسی کی دعوت دیتا ہے"

لیکن "پیام امن" کا مصنف اس بارے میں بالکل مطمئن ہے، وہ فطرت انسانی کے خیر محض ہونے کا قائل ہے اور اسی لیے جنگ و خونریزی کے قطعی انسداد اور کامل امن و امان کے دائمی قیام کی دعوت دیتا ہے۔ وہ اس حقیقت میں شک کرنے والوں کو یوں مخاطب کرتا ہے:

> "انسانیت ایک زندہ وجود ہے، وہ نابینا ہیں جو اسے محض ایک لفظ سمجھتے ہیں۔ افراد و اقوام کی طرح وہ ایک حقیقی وجود رکھتی ہے اور اپنے وجود کا احساس رکھتی ہے۔ خواہ اقوام و افراد

اس کے وجود سے پیغیر ہوں۔ سب کی اصلی ماں وہی ہے جو اپنے بطن سے سب کو پیدا کرتی ہے ..... اس کا قلب زندہ ہے، مگر اسوقت افراد کے قلوب میں سو رہا ہے، اس لیے کہ ابھی ان میں عام محبت کا جذبہ پیدا نہیں ہوا ہے ..... وقت آگیا ہے کہ اس زندہ جسم کا ایک غور کرنے والا دماغ بھی پیدا کیا جائے ..... اُسوقت جبکہ انسانیت میں تنظیم پیدا ہو چکے گی، جبکہ انسانیت خود اپنی قسمت کی مالک ہو چکی ہوگی .... اُسوقت وہ "انسانِ جدید" کو پیدا کریگی، جسکی آمد کا فطرت کو انتظار ہے، اُسوقت موجودہ پر ارمان خوابوں کی تعبیر نکلے گی۔"

پھر دوسری جگہ بے اختیار ہوکر فطرت انسانی کو پکار اُٹھتا ہے :-

"اور اے روح ربانی! تو اس وقت افراد و اقوام سب کے نفوس میں حالت خواب میں ہے، تیری بیداری کا وقت آگیا، اب بیدار ہو! بیدار ہو! "

ایک اور جگہ اِس حقیقتِ منتظرہ کو کہ خیر محض و امنِ کامل ایک دن ضرور قائم ہو جائے گا، اس طرح ظاہر کرتا ہے :

"وہ مقصد جسے بڑی بڑی سلطنتیں اور بڑے بڑے مذاہب زمانۂ ماضی میں پورا نہ کر سکے جسکے انجام دینے میں زمانۂ حال کا تمدن ناکام رہا، مگر جسکی طیاریاں تمام گذشتہ صدیاں کرتی آئی ہیں وہ ایک شے اور صرف ایک شے سے ابھی انجام کو پہونچ سکتا ہے۔ وہ شے کیا ہے؟ انسان میں انسانیت کا احساس، جزو کو کُل کا شعور، اُس وقت انسان کے قلب سے امن عالم کی پیدائش ہوگی!"

ایک اور جگہ کہتا ہے :

"وہ دن آنے والا ہے جب ان چیزوں کا خاتمہ ہوگا، اس لیے کہ "ہلاک نہ کرنا" کی صدا اب کسی غیر کی، کسی باہر والے کی صدا نہیں رہی ہے، یہ صدا خلقت کے قلب سے بلند ہو رہی ہے، انسانیت کا یہ پیغام اب نفوس میں زندہ ہو رہا ہے، اور دنیا کو ایک نئی ہدایت کر رہا ہے، اسکی تعلیم ایک بلند تر فرض، فریضۂ انسانیت کی تعلیم ہے۔"

متشککین کا قیام امن اور خیر محض کے وجود کے برخلاف سب سے بڑا استدلال یہ ہے

کہ باوجود اتنی کثیر اور طویل کوششوں کے اب تک وہ ممکن نہ ہوا، دنیا میں ہمیشہ ایسے انبیاء و مصلحین پیدا ہوتے رہے جنھوں نے امن اور نیکی کے لیے دعوتیں دیں مگر کسی نے بھی اُنکی نہ سُنی۔ وہ کہتے ہیں اس امر واقع سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ جنگ اور بدی کا جذبہ انسان میں فطرتاً موجود ہے اور کسی طرح بھی کلیتہً زائل نہیں ہو سکتا۔

ہمیں اُنکے استدلال کے دونوں حصوں پر اعتراض ہے۔ اول تو اس صورت واقعہ سے اُن کا استدلال صحیح نہیں۔ جس چیز کو وہ "فطرت" کہتے ہیں، حقیقت میں "عادت" ہے۔ دونوں میں بڑا فرق ہے، فطرت بدلتی نہیں، عادت بدل جاتی ہے۔ خوں ریزی اور بدی کی عادت سے فطرتِ انسانی پر حکم لگانا خلاف انصاف ہے، کیونکہ ایک سے زیادہ ایسی انسانی عادات کا ہمیں علم ہے جو فطرت معلوم ہوتی تھیں مگر امتداد زمانہ سے بدل گئیں۔ ایک زمانہ تھا جب آدمی آدمی کا گوشت کھاتا تھا، اور اس ذوق وشوق سے کھاتا تھا کہ آدم خوری انسانی فطرت معلوم ہوتی تھی، اُس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ یہ فعل خلافِ فطرت ہے؟ صدیوں پر صدیاں گذر گئیں یہاں تک کہ اب ایک زمانہ آیا جب یہ عادت متمدن انسان سے کلیتہً زائل ہو گئی اور اب اسکا تصور بھی ہمارے لیے خلافِ فطرت ہوگیا۔ اسی طرح جنگ و خوں ریزی، بدی اور شرارت کی عادت کو قدامت کی بنا پر فطرت قرار دینا سخت غلطی ہے۔ اگر یہ فطرت ہوتی تو خدا اپنے انبیاء و مرسلین کے ذریعے اسکے خلاف کبھی بھی تعلیم نہ بھیجتا۔ مذہبی روایات کہتی ہیں کہ انسان میں خوں ریزی کی بنا اُس دن پڑی جب آدم کے ایک بیٹے نے اپنے بھائی پر اُسکی قربانی مقبول ہو جانے کی وجہ سے حسد کیا اور جوش انتقام میں اُسے قتل کر ڈالا۔ متشککین کہتے ہیں کہ اگر خوں ریزی کا جذبہ انسانی فطرت میں نہ ہوتا تو بغیر کسی کی ترغیب و تعلیم کے یہ اولین قاتل کیونکر مرتکب قتل ہوتا؟ ہمارے خیال میں اُن کا یہ استدلال بھی غلط ہے، یہ اولین قتل اور ہر قتل ایک فوری اور عارضی جوش کا نتیجہ ہوتا ہے جس کے بعد ہی مجرم، شرم و ندامت میں ڈوب جاتا ہے۔ آدم کے بیٹے کا ارتکاب قتل اُسکی فطرت کا عمل نہ تھا، ہاں وہ شرم و ندامت جو اس فعل کے بعد اُس میں پیدا ہوئی، اُس نفرت کا مظہر تھی جو باری تعالیٰ نے فطرت انسانی میں خوں ریزی کے خلاف ودیعت کردی ہے۔ اس بحث میں اتنی دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کے خود ہی فیصلہ

کر سکتا ہے۔ قتل و خونریزی، بلکہ شر اور بدی کے جتنے واقعات بھی ہوتے ہیں، ہر مرتکب محسوس کرتا ہے کہ اُسکے عارضی ہیجان طبع کا نتیجہ تھے، پھر اس انفعال و تأثر کو بھلا کون بیان کر سکتا ہے جو ہر بدی کے بعد انسان اپنے قلب میں محسوس کرتا ہے۔ ضمیر کی خاموش لعنتوں کا پتھراؤ اُسے پاش پاش کر ڈالتا ہے، نظریں زمین میں گڑ جاتی ہیں، اور اسکی زبان حال اعلان کرنے لگتی ہے کہ "میں مجرم ہوں!" یہ تأثر ہے انسانی نطرت، نہ وہ عارضی ہیجان طبع جو خارجی اسباب کا نتیجہ ہوتا ہے۔

پھر یہ کہنا کہ امن اور نیکی کی دعوتیں اب تک کامیاب نہیں ہوئیں، شدید کو ربصری ہے۔ اول تو تین چار ہزار سال کی معلوم تاریخ کو، انسانیت کی عمر کے مقابلہ میں زیادہ با کافی مدت بتانا نادانی ہے، انسانیت کی عمر کے آگے یہ مدت تین چار رات سے زیادہ نہیں۔ پھر یہ دعویٰ کہ ان دعوتوں کو کامیابی نہیں ہوئی، بالکل خلاف واقعہ ہے۔ کیونکہ اُن کے ایک حصہ کو ہم عملاً کامیاب دیکھ رہے ہیں۔ اور اگر کسی دعوت کی کامیابی ہی اُسکے حق ہونے کی دلیل ہے تو اس دعوت کے اس حصے کی کامیابی۔ جو ایک عظیم الشان کامیابی ہے، بلا تردد اُسکے حق ہونے پر بطور دلیل پیش کی جا سکتی ہے۔

ہزاروں برس انسان نے اس حالت میں گذارے ہیں کہ آدمی آدمی کا دشمن تھا، خونخواری پر فخر کرتا تھا، قتل کو ہنر سمجھتا تھا، بات بات پر تلوار کو حکم بناتا تھا اور کمزور کی جان و مال زبردست کے لیے مباح تصور کرتا تھا۔ مگر امن و نیکی کی ان دعوتوں کا یہ اثر ہوا کہ بتدریج اِن وحشیانہ خیالات و عادات میں تبدیلی پیدا ہوئی اور اب وہ زمانہ آگیا کہ بلا استثنا تمام متمدن انسانوں نے اپنی انفرادی زندگی میں امن و نیکی کی تعلیمات کو عقلاً پوری طرح تسلیم کر لیا اور عملاً بھی بڑی حد تک تسلیم کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے یہ کامیابی عظیم الشان سے عظیم الشان کامیابی ہے جو تین چار ہزار سال کی قلیل مدت میں کوئی دعوت حاصل کر سکتی تھی۔ بلا شبہ ہمیں تسلیم ہے کہ قوموں نے اپنی اجتماعی زندگی میں اب تک یہ تعلیمات عملاً قبول نہیں کی ہیں، لیکن حالات کی رفتار بشارت دے رہی ہے کہ وہ دن دور نہیں جب قومیں بھی انکے سامنے سر جھکا دیں۔ کوئی اجتماعی انقلاب پھر تمام انسانوں میں ذہنی و اجتماعی انقلاب اچانک واقع نہیں ہوا اور نہ کبھی ہو سکتا ہے۔ ہمیں

انتشار سے گھبرانا نہیں چاہیے، انقلاب افراد سے شروع ہوتا ہے اور قوموں سے گذر کر پوری نوعِ انسانی کو لپیٹ لیتا ہے۔ ہمارا یہ انقلاب بھی افراد سے گذر کے اب قوموں کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے، جسکے بعد پوری نوعِ انسانی کی باری بھی آجائیگی۔

"پیام امن" کا مصنف بھی اُنھیں لوگوں میں ہے جو اِس دعوتِ حق کی جلد یا بدیر کامیابی پر پختہ ایمان رکھتے ہیں، وہ اسے فطرت کی دعوت بتاتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ باوجود بیشمار موانع کے رفتارِ زمانہ بلکہ خود انسان کی بدی اور شرارت اس دعوت کو آگے بڑھا رہی ہے اور قوموں کو بڑی سختی کے ساتھ اسکی طرف دھکیلے لیے جا رہی ہے۔ مصنف کہتا ہے:

"اقوام کی مادی تاریخ اپنی منزل کی جانب لیے جا رہی ہے۔ وہاں تک پہونچنے کے لیے بیشک بہت زیادہ سعی و کوشش کی ضرورت ہے، لیکن جنگ و صلح کی کشمکش سے نکل کر قومیں اس منزل کے قریب آتی جاتی ہیں اور ایک دوسرے کو گلے لگاتی جاتی ہیں، وسعتِ ارض اُنکے لیے تنگ ہوتی جاتی ہے اور دنیا میں یکسانیت پیدا ہوتی جاتی ہے، اُنکے فضائل و رذائل دونوں سب میں مشترک ہوگئے ہیں … علم و فن، حکمت و ادب کسی قوم کی مخصوص ملکیت نہیں، ان سب کے عقائد، تمدن، خاندان وغیرہ صدیوں کی جنگ و صلح کے بعد آپس میں مخلوط و مدغم ہوگئے ہیں۔ اسی طرح اُنکے رذائل نے بھی ان میں اتحاد ہی پیدا کیا ہے۔ ہر میدانِ جنگ میں خواہ فاتح خواہ مفتوح کی حیثیت سے اُنھوں نے اپنی لاشیں ایک ہی جگہ چھوڑی ہیں اور ایک ناخوشگوار موافاہ کی عمارت اُنھوں نے اپنے خون سے تعمیر کی ہے۔ نفرت، محبت ہی کی شکلِ معکوس کا نام ہے اور محبت ہی کا پہلا اور دُھندلا پیغام ہے … نفرت بھی بالآخر منزلِ اتحاد ہی کی طرف لے جاتی ہے، گو اسکے راستے تاریک و پُرپیچ ہوتے ہیں۔ ایک دن وہ دن آکر ضرور رہتا ہے جب انسان خود اُس شے سے نفرت کرنے لگتا ہے جس نے اُسے ایک دوسرے سے نفرت کرنا سکھایا تھا۔"

آگے بڑھ کر لکھتا ہے:

"مستقبل کی قوت اُن سے دفعتاً یہی کام لیتی ہے جنھیں اس کی خدمتگذاری سے انکار ہوتا ہے۔ البتہ جوں ہی وہ ان سے اپنا کام لے چکتی ہے، اُنھیں ختم بھی کر دیتی ہے، ماضی کی بڑی بڑی

پُرہیبت و جلال سلطنتوں سے اُسنے اُنکی نادانستگی میں یہی کام لیا اور کام لے چکنے کے بعد اُنھیں برباد کر دیا، یہی حشر موجودہ سلطنتوں کا بھی ہونا ہے، اپنے جبر و ستم اپنی ناانصافیوں کے ذریعہ سے یہ قومیں اپنے مقصد و ارادہ کے خلاف مستقبل کا بھی مقصد پیدا کرتی رہتی ہیں کہ نوع انسانی میں باہم اتحاد قائم ہو مستقبل کی قوت اُنکے ذریعے سے یہ کام نکال کر اب خود اُن پر اپنا عمل کر رہی ہے، یعنی ان قوموں کے جو جو حالات اس مقصد اتحاد کی راہ میں حائل ہونگے اُنھیں وہ فنا کر دیگی..."

اور یہی نظریہ ہے جس کی بنا پر مصنف گذشتہ عالمگیر جنگ اور موجودہ التوائے جنگ (کیونکہ حقیقتاً التوائے جنگ ہی ہے) کو بھی حصول امن کا ایک طبعی راستہ بتاتا ہے:

"یہ جنگ نہ صرف طبعی اسباب کی بنا پر ناگزیر تھی بلکہ اخلاقی قوانین کے لحاظ سے بھی اسکا وقوع لازمی تھا، کہنا چاہیے کہ مشیت غیبی کا منشأ بغیر اسکے پورا ہی نہیں ہو سکتا تھا،..... اس جہنم کا ایک بار برپا ہونا لازمی تھا کہ جو قومیں اسکی آفرینش کا باعث ہوئی ہیں اُنھیں تزکیہ حاصل ہو۔ اس غدر و شورش کا وقوع لازمی تھا کہ جدید عمارت کے لیے سطح ہموار ہو اور ایک جدید زمین و جدید آسمان کی تخلیق ہو'... اس جنگ سے جو کچھ بھی فتوحات و کامیابیاں کسی فریق کو حاصل ہونگی وہ وہ نہیں ہونگی جو اُسکی آرزوؤں کے مطابق ہونگی بلکہ وہ ہونگی جو اُن قوموں کی مجموعی بربادی کے باعث دنیا کے لیے پُر منفعت ثابت ہوں گی'..... یہ جنگ جس طرح سب کے معاصی کا نتیجہ ہے اُسی طرح سب کی اصلاح و ترقی کا راز بھی اسی میں مضمر ہے، متحاربین مشیت غیبی کے سامنے بے بس تھے جس کا منشا ان سب کو سزا دینا تھا۔"

مصنف کا جنگ اور بدی کو امن اور نیکی کا ایک قدرتی راستہ بتانا تعجب انگیز نہیں کیونکہ وہ اس رائے کے ماننے والوں میں ہے کہ نور اور خیر کا پورا پورا ظہور و غلبہ اُسی وقت ہوتا ہے جب ظلمت اور شر کا عروج کامل ہو جاتا ہے اور یہ کہ شر اپنی فطرت میں خود اپنے آپ سے جنگ کرنے کا خاصہ رکھتا ہے، جب جب اُس کا ٹھہراؤ اور جماؤ پورا ہو جاتا ہے اور سامنے تصادم کے لیے کچھ اور باقی نہیں رہتا، تو خود اُسکے عناصر باہم ٹکرانے لگتے ہیں؛ یہاں تک کہ پاش پاش ہو کر فنا ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہی خیر کا ظہور ہوتا ہے کیونکہ شر کی بربادی ہی کا دوسرا نام خیر ہے چنانچہ گذشتہ جنگ کے متعلق کہتا ہے:

"یہ جنگ درحقیقت غیر مرئیات کی جنگ ہے، یہ وہ جنگ ہے جو نظام قدیم خود اپنے اوپر کر رہا ہے اور خوں ریزی و غداری کی طاقتوں کو ایکدوسرے سے اُلجھا کر ان سب کو فنا کر رہا ہے۔"

معترضین، جنگ و خوں ریزی کے وجود سے فطرتِ انسانی پر حکم لگاتے ہیں، مگر کبھی نہیں سوچتے کہ جنگ و خوں ریزی بند کیونکر ہو۔ جبکہ پوری سوسائٹی باوجود نفرت کے اُسکے سانپ کو دودھ پلا پلا کے پالنے اور مختلف طریقوں سے موٹا کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ جنگ و خوں ریزی کیونکر موقوف ہو جبکہ پیدایش سے موت تک ہمیں برابر اسکی تعلیم دی جاتی ہے۔ گھروں میں بزرگوں کی سفاکی کی روایات بچوں کو بطور کارناموں کے سنائی جاتی ہیں، مدرسوں میں سفاکوں کی داستانیں پڑھائی جاتی ہیں، کتب تاریخ میں خوں ریزوں کو نوعِ انسانی کا ہیرو بتایا جاتا ہے، شہروں میں مجسمے کھڑے کر کے انکی تقلید کی دعوت دی جاتی ہے،.... علما کا گروہ قتل و سفاکی کو جائز و خوشنما بنانے کے لیے طرح طرح کے اصول و نظریے قائم کرتا اور عقلی و نقلی دلائل سے اُنھیں حق ثابت کرتا ہے ... ظاہر ہے اس حالت میں اُس کا جاری رہنا کچھ بھی تعجب انگیز نہیں، البتہ بند ہو جانا ضرور تعجب انگیز تھا۔

کہا جائے گا اگر خوں ریزی کا جذبہ فطری نہ ہوتا تو اُسکی بقا کے لیے انسان یہ سب نہ کرتا، انسان کا بغیر کسی مجبوری کے ایسا کرنا اس جذبے کے فطری ہونے کی دلیل ہے۔ لیکن یہ دلیل جسقدر بنالطہ ؟ ہے محتاج بیان نہیں۔ بعینہ یہی دلیل ہر بداخلاقی کے فطری ہونے پر پیش کی جا سکتی ہے، چوری، ڈکیتی، جھوٹ، زنا، غرضکہ جملہ معائب سے انسان ہر زمانہ میں آلودہ رہا ہے اور اب تک آلودہ ہے، لیکن اُسکی یہ آلودگی کسی طرح بھی ان بداخلاقیوں کے فطری ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی۔ اگر جنگ و خوں ریزی کا جذبہ فطری ہے، اگر "تنازع للبقاء" کا وحشیانہ اصول حق ہے، تو پھر آسمانی اور دنیاوی قوانین قاتلوں اور قزاقوں کو لائقِ تعزیر کیوں قرار دیتے ہیں؟ پیام امن کا مصنف اس صورت حال کو دکھاتے ہوئے کہتا ہے:

"خود ہی تو ایک جنگلی درندے کو آزاد چھوڑ دیتے ہو اور پھر اُس سے یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ انسانیت کے حدود میں رہے گا!"

جنگ و خوں ریزی کا اب تک موجود رہنا حامیان جنگ سے زیادہ حامیانِ امن کے لیے حجت ہے۔ دونوں میں نزاع کیا ہے؟ اصلی نزاع اس میں نہیں ہے کہ جنگ موقوف ہو یا جاری رہے۔ اس

خواہش میں تو دونوں یکساں طور پر شریک ہیں کہ جنگ موقوف ہونا چاہیے، اصلی نزاع اس خواہش کے بعد شروع ہوتی ہے۔ "حامیانِ جنگ" کہتے ہیں چونکہ اتنی ہتیاروں کوششوں پر بھی جنگ نہ رُکی، اس لیے وہ فطری ہے اور باوجود ہماری نفرت کے برابر یوں ہی جاری رہیگی۔ حامیانِ امن اسکے برخلاف کہتے ہیں، وہ کہتے ہیں چونکہ تم نے اب تک جنگ کو جنگ سے اور شر کو شر سے روکنے کی کوشش کی اس لیے جنگ نہ رُکی بلکہ روز بروز زیادہ ہوتی گئی۔ شر کبھی بھی شر کے ذریعہ دور نہیں ہو سکتا، فطرتِ انسانی خیر ہے، اس لیے نیکی اور نرمی ہی مؤثر ہو سکتی ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ تشدد اور سختی نے آج تک کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچایا۔ مصنف کہتا ہے:

"بڑی بڑی سلطنتوں نے ہمت کی کہ دنیا میں امن قائم کر دیا جائے، بڑے بڑے فاتحوں نے منصوبہ باندھا کہ اپنے زور و قوت سے دنیا میں امن قائم کر کے رہیں گے، لیکن ان ہمتوں کو زمانہ آہنی کے ارادے توڑ توڑ دیا اور یہ خواب ہمیشہ کے لیے جھوٹے ہی نکلے، اس لیے کہ امن کا جنگ سے اور نرمی کا سختی سے پیدا ہونا محال ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ جنگ سے صلح پیدا ہو سکے۔"

طاقت اور تشدد کی یہ ناکامی کیوں ہوئی؟ وجہ بالکل ظاہر ہے اور اوپر بیان کی جا چکی، یعنے چونکہ فطرتِ انسانی خیر ہے اس لیے نیکی ہی اس پر مؤثر ہو سکتی ہے، شر ہمیشہ شر کو بڑھاتا ہے، ایک آگ دوسری آگ کو کبھی نہیں بجھاتی، اور زیادہ بھڑکا دیتی ہے۔ مصنف کہتا ہے:

ہر جبر ایک دوسرے جبر کی تخلیق کرتا ہے، جس طرح ایک ٹکڑا ابر کو دوسرے ٹکڑا ابر کی طرف کشش ہوتی ہے، اسی طرح ہر قوت دوسری قوت کا باعث ہوتی رہتی ہے ...."

پھر زمانۂ حال کے حوادث بطور مثال کے پیش کر کے بتاتا ہے کہ ایک خونریزی کیونکر دوسری خوں ریزی کا باعث ہوئی ہے:

"مثال کے طور پر سنہ ء کے معرکۂ مراکو کو دیکھیے۔ کیا جنگ طرابلس اس کا لازمی نتیجہ نہ تھی؟ پھر کیا جنگ طرابلس ہی ترکی کو کمزور کر کے جنگ بلقان کا پیش خیمہ نہیں ثابت ہوئی؟ اور پھر کیا جنگِ بلقان ہی روس و آسٹریا کے درمیان رقابت پیدا کر کے جنگِ جہاں سوز کا باعث نہیں ہوئی؟"

حضرت عیسیٰؑ کا ارشاد کیا ہی خوب ہے "جو تلوار اٹھاتے ہیں تلوار ہی سے کاٹے جائیں گے"! (او کما قال)

پھر قیامِ امن کا کون ذریعہ ہے؟ اگر طاقت ناکام رہی تو وہ کون چیز ہے جو اُسے قائم کر سکتی ہے؟ جواب بالکل صاف ہے:

"امن کا ذریعہ صرف امن ہے، جنگ کے خونیں میدانوں میں امن کی تلاش، شبِ دیجور میں آفتاب کی تلاش ہے۔ امن کی جستجو کے لیے کہیں دُور جانے کی ضرورت نہیں، وہ تمھارے بالکل قریب ہے، تمھارے پہلو میں موجود ہے، وہ خود تمھارا قلب ہے جسکے اندر امن کا گنجینہ مدفون ہے، اُسے نکالو، اور وہ نکل آئے گا: امن کا مولد و منبع قلب انسانی ہے....
انسان کا قلب ہی وہ سرچشمہ ہے جہاں سے سیلاب خون نکل کر تمام کرۂ ارض پر جوش زن ہوتا ہے، اسی سرچشمے کو خشک کر دینے سے دنیا سے جنگ کا وجود رخصت ہو سکتا ہے، تا وقتیکہ انسان کے باطن میں، انسان کے نفس میں اصلاح نہ ہوگی، تمام خارجی تدابیر، تمام بیرونی کوششیں لاحاصل رہیں گی اور امن و صلح کے ظاہر قالب کے اندر جنگ و بد امنی کی روح حرکت کرتی رہیگی"

باطن کی اصلاح کے کیا معنی؟

"ہر قوم کی روح کی قلب ماہیت اور سب کے قلوب میں ایک جدید نظام کائنات کا احساس پیدا ہونا لازمی ہے"

اس "احساس" سے کیا مقصود ہے؟

انسان میں انسانیت کا احساس، جزو کو کُل کا احساس! اُس وقت انسان کے قلب سے امن عالم کی پیدائش ہوگی"

ابھی سوسائٹی کے دل و دماغ میں کیا خرابیاں ہیں جن کے دور کرنے کی ضرورت ہے؟ وہ کون سی بیماریاں ہیں جو انسان کو خون پلاتی ہیں؟ چند بنیادی خرابیاں ہیں جن میں ہمارا حکیم سب سے زیادہ خطرناک "انانیت" کو قرار دیتا ہے:

"انانیت ہی وہ مخفی محرک ہے جو سب کو ایک دوسرے سے لڑاتی رہتی ہے، خود غرضی کا آخری نتیجہ ہمیشہ جنگ و جدل ہوتا ہے، امن و صلح کی لاکھ کوشش کی جائے لیکن خود غرضی کبھی بغیر مقاتلہ و خوں ریزی تک پہونچائے رہ نہیں سکتی"

لیکن ایک عجیب و غریب نسخۂ شفا جس تک مؤلف کے پاک ذہن کو رسائی ہوئی اور جس پر حقیقتاً دُنیا

کی نجات موقوف ہے اور جو ہر شخص کی سمجھ اور استعمال میں بلا کسی غلطی کے آسکتا ہے، یہ ہے کہ افراد و اقوام کے لیے ضابطۂ قانون ایک ہونا چاہیے۔ یہی وہ بڑی غلطی ہے جو ابتک سوسائٹی میں موجود ہے۔ ابھی حالت کیا ہے؟ افراد و اقوام دو جداگانہ اخلاقی ضابطوں پر عمل پیرا ہیں، بہت سی باتیں جو افراد کے حق میں جرم، معصیت اور بداخلاقی سمجھی جاتی ہیں، اقوام کے لیے مباح ہیں۔ جھوٹ، ڈکیتی، غصب، مکاری ... افراد کے لیے شرمناک اور موجب عقاب ہیں، لیکن قومیں علی الاعلان انکی مرتکب ہو رہی ہیں اور کوئی ملامت نہیں کرتا۔ دنیا کی تمام گذشتہ و موجودہ مصائب کی علت العلل یہی خرابی ہے کہ افراد و اقوام کا ضابطۂ اخلاق جداگانہ ہے۔ اگر ایک طاقتور فرد کے لیے ناجائز ہے کہ "تنازع للبقا" کے اصول پر عمل کر کے کمزور فرد کا مال چھین لے تو زبردست قوم کے حق میں یہ کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ کمزور کے ملک و دولت پر قبضہ کر لے؟ اگر فرد کو قانون اجازت نہیں دیتا کہ اپنے حقوق طاقت کے زور سے حاصل کرے تو جماعت اور قوم کو ایسا کرنے کا کیوں اختیار دیا جاتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر دنیا یہ اصول تسلیم کر لے تو اپنے تمام مصائب و آلام سے آج ہی نجات پا جائے۔ مصنف نے اس مسئلے پر خوب بحث کی ہے جو قابل دید ہے۔ کہتا ہے:-

"افراد اور اقوام کے لیے قانون اخلاق ایک ہی ہے، ہر قوم کو اپنے تئیں اسی نظام اخلاق کا پابند رکھنا چاہیے جس کی پابندی کی توقع وہ افراد سے رکھتی ہے، جو شے فرد کے جرم کا حکم رکھتی ہے وہ ملک و قوم کے لیے بھی جرم قرار پانا چاہیے۔ خود غرضی، حرص و طمع، غصب اموال، تشدد، اور قتل اگر افراد کے لیے شدید ترین معاصی ہیں تو جماعت و قوم کے لیے بھی ان افعال کو مساوی درجے کے معاصی قرار دینا چاہیے۔ آخر قومی شرافت کا معیار، شخصی شرافت سے مختلف کیوں ہو؟ اگر کوئی قوم قتل و غارت، بدی و تشدد سے علانیہ اپنی بے عزتی و پستی کا ثبوت دے چکی ہے تو کیا اسلحہ کی مدد سے وہ عزت و بلندی قائم رکھ سکتی ہے؟ ... فرد کے لیے اخلاق نے قانون یہ مقرر کیا تھا کہ اسے وہ عمل کرتے رہنا چاہیے جس کی تقلید کو سب قبول کر سکیں، یہی ضابطۂ اخلاق قوم کے لیے بھی ہونا چاہیے، گویا قوم کو ایسے ہی اعمال کرتے رہنا چاہیے جو افراد کے لیے قابل تقلید ہوں۔ اگر اس اصول کی صحت سے انکار ہے تو کس حق سے ہر قوم اپنے ہاں کے مجرموں کو قابل تعزیر قرار دیتی ہے، اور سرے سے کسی کو مجرم قرار دینے کا اُسے کیا حق ہو؟

کیونکہ یہ تمام نام نہاد "جرائم" تو وہی ہوتے ہیں جن کا ارتکاب قوم علانیہ کرتی رہتی ہے! ..... دنیا میں اسکی کوئی بھی وجہ ہوسکتی ہے کہ کوئی باشندۂ ملک اپنے ملک سے زیادہ دیانتدار ہو! پھر آخر یہ کیا ہے کہ افراد اُن جرائم کی سزا بخوشی قبول کرلیتے ہیں جن کا ارتکاب اُنکا ملک و وطن علانیہ و فخریہ کرتا رہتا ہے! ...... جو تعلق فرد کو خاندان سے ہوتا ہے، خاندان کو شہر سے، شہر کو صوبہ سے اور صوبہ کو ملک سے، وہی تعلق اب ملک کو مجموعۂ ممالک (دنیا) سے ہونا چاہیے، ملک کو صرف اپنی ہی زندگی نہیں بلکہ اس سے زائد کی بھی پروا ہونا چاہیے۔ افراد و اقوام دونوں کے لیے یہی اخلاق کا صحیح قانون ہے اور یہی فلاح و نجات کا سیدھا راستہ ہے"

اس پُر پیچ بحث کے بعد ہی ایک دوسری پُر پیچ بحث سامنے آجاتی ہے۔ اگر جنگ و خوں ریزی، غصب و تعدی حرام ہیں، اگر تمام افراد و اقوام کو پُر امن اور مل جل کر رہنا چاہیے، تو یہ بھی صاف ہوجانا چاہیے کہ افراد و اقوام کے حقوق کیا ہیں کہ جن کا لحاظ و احترام سب پر فرض ہے؟

افسوس اسوقت ہم اس بحث کو پھیلا نہیں سکتے۔ مختصر یہ کہ جب افراد و اقوام کے لیے ضابطۂ اخلاق ایک ہے، تو دونوں کے حقوق بھی ایک ہونے چاہییں۔ انقلاب فرانس نے افراد کے حقوق منضبط کرکے قائم کیے، جن میں دو حق بنیادی اور اہم ہیں: "حریت اور مساوات" ہر فرد اپنے دائرے میں آزاد ہے اور ہر فرد اپنے بنی نوع کے ساتھ زندگی اور قانون کے اندر مساوی درجہ رکھتا ہے۔ کم سے کم قوموں کو بھی اتنا حق ضرور ملنا چاہیے، ہر قوم آزاد رہے اور ہر قوم جب تک قوانین اخلاق پر قائم ہے دوسری قوم کے مساوی اور ہم رتبہ ہو۔ اگر انسانی سوسائٹی اس اصول کو تسلیم کرلے تو آج ہی امن و امان قائم ہوا جاتا ہے۔ مصنف نے اس پر بہت زور دیا ہے اور نہایت مؤثر پیرائے میں بحث کی ہے جو اصل کتاب ہی میں قابل دید ہے۔

یہ جو کچھ لکھا گیا "پیام امن" کی حیثیت سے بہت کم ہے، ایسی کتابیں نہ صرف اُردو بلکہ فرنچ اور انگریزی جیسی مالا مال زبانوں کے لیے بھی قابل صد ناز ہیں، مولوی عبدالماجد صاحب نے اسے اُردو کا جامہ پہنا کر ملک کی ایک بہت بڑی علمی، اخلاقی اور ادبی خدمت کی ہے۔ ضرورت تھی کہ اصل کتاب کے بعد فاضل مترجم کے تبصرے پر بھی (جو بجائے خود ایک تصنیف ہے) ایک نظر ڈالی جاتی، مگر اب اس صحبت میں اسکی گنجایش نہیں، اگر کبھی مہلت ملی تو اس ٹکڑے پر بھی گفتگو کی جائیگی، تاہم اتنا ظاہر کردینا ضروری ہے کہ ریویو نگار کو تبصرہ نگار سے بڑی حد تک اتفاق ہے۔

عبدالرزاق ملیح آبادی

# پارسی مذہب

دنیا کے قدیم مذاہب میں ایک پارسی مذہب بھی ہے۔ حکیم زردشت اس مذہب کے داعی اور پیغمبر تھے۔ زردشت کا زمانہ مسیح سے گیارہ سو چھتر برس قبل خیال کیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے ایران میں بت پرستی کا رواج تھا۔ معبدوں میں ستاروں کی ہیکل بنا کر انھیں پوجا جاتا تھا۔ زردشت ان میں پہلے شخص تھے جنھوں نے اہل فارس کو وحدانیت کا سبق دیا۔ انکی آسمانی کتاب کا نام اَوِستا ہے۔ ایک اور کتاب ژند بھی انکی طرف منسوب کیجاتی ہے۔ اور اسے بھی آسمانی سمجھا جاتا ہے، لیکن وہ دراصل اَوِستا کی شرح و تفسیر ہے۔ اسکو پارسی مذہب کی کتاب الاحادیث سمجھنا چاہیے۔ موبدوں نے اسکی بہت سی شرحیں بھی لکھیں، اور بعد میں شرحوں کی بھی شرحیں لکھی گئیں۔ لیکن ۳۳۲ ق م میں جب سکندر نے ایران پر قبضہ کیا تو یہ سارا دفتر برباد کر دیا۔ اَوِستا، ژند اور اسکی شرحیں یا ژند کے کچھ نسخے بچ بچا گئے۔ اور جب عہد عباسی میں ایرانی علوم و معارف کا ترجمہ شروع ہوا تو یہ چیزیں بھی ترجمہ کی گئیں۔ مسعودی اور اصفہانی نے اپنی آنکھوں سے انکے عربی ترجمے دیکھے ہیں۔ مسعودی کا بیان ہے کہ سیستان میں ایک شخص کو یہ پورا سلسلہ حرف بحرف یاد تھا۔ اصفہانی اپنی کتاب تاریخ سنی الملوک میں جگہ جگہ اَوِستا کے عربی ترجموں کے حوالے دیتا ہے۔

سکندر نے زردشتیوں کی مذہبی کتابیں ہی نہیں برباد کیں، بلکہ خود انھیں بھی بری طرح پامال کیا، انکے علما کو پھانسیاں دیں، موبدوں کو قتل کیا، اور انکے معبدوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ آتشکدہ ٹھنڈا کر دیا۔ لیکن خدا کی وحدانیت کی آگ جو دلوں میں روشن ہو چکی تھی وہ کسی طرح نہ بجھ سکی۔ لوگ گھر سے بے گھر ہو گئے، مصیبتوں کے پہاڑ سروں پر ٹوٹ پڑے، لیکن مذہب کی خاطر سب تکلیفیں برداشت کیں، اور اپنی طیاریوں میں لگے رہے۔ آخر ۲۵۲ ق م میں اُنھوں نے حملہ کیا، اور یونانیوں کو شکست دے کر اپنے ملک پر دوبارہ قبضہ لیا۔ بگڑے ہوئے گھروں کو سنوارا، ٹوٹے ہوئے معبدوں کی تعمیر کی، آتشکدوں کو روشن کیا، اور علماے مذہب کو جمع کر کے

مذہبی تنظیم کی۔ یہ مذہب اس بارے میں نہایت خوش قسمت تھا کہ اسے ابتداسے ملک و سلطنت کی حمایت و پیروی حاصل رہی، مرقیون، مزدک، اور مانی نبوت کے بڑے بڑے دعوے لیکر اُٹھے، لیکن قبول عام نے کسی کو زندگی نہ بخشی، سب وقتی زندگی پاکر رخصت ہوگئے، اور زردشتی سکہ ہمیشہ چلتا رہا۔

سنہ ۱۴۱ میں ایران کی زمام حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں آئی تو ایران پر اسی مذہب کی حکومت تھی۔ گو مسلمان فاتحوں نے اُنکے مذہب کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جو عام فاتح مفتوحوں کے ساتھ کرتے ہیں، لیکن حکومت کے مٹنے سے اُن کا سارا شیرازہ بکھر گیا۔ فاتح لاکھ مساوات برتیں، مگر وہ جو اپنی حکومت کی ایک شان و شوکت ہوتی ہے پرائی حکومت میں میسر نہیں آسکتی۔ بہت سے پارسی ہندوستان کی طرف نکل آئے اور بہت سے دوسرے ممالک میں جا بسے۔ جو تھوڑے بہت وہاں رہے وہ رفتہ رفتہ اسلام میں جذب ہوگئے، لیکن جو نکلے تھے وہ بھی غیر مذاہب کے اثر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے، بمبئی کا صوبہ ایران سے نکلنے کی تاریخ سے اب تک ان کا مرکز ہے۔ یہاں کے باشندوں سے اس طرح گھل مل گئے، کہ اب پارسی فارس کے زردشتی نہیں، ہندوستان کے زردشتی ہیں۔

ہندوستان میں جب اسلامی حکومت نے قدم جمائے تو یہ لوگ پھر ڈرے، مگر مسلمان نہایت استمالت سے پیش آئے، تیموری خاندان کے مشہور فرزند اکبر نے تو انکے موبدوں کو دربار میں بھی دعوت دی، معبدوں کے لیے روزینے مقرر کیے، اور اُنکی مذہبی کتابیں جمع کیں، اور اہل حکومت ہر خاص و عام سے یہ تواضع پیش آنے لگے۔ آذر کیوان جو اُس زمانہ میں زردشتی مذہب کا بڑا عالم اور سب سے بڑا موبد تھا، مسلمان علما و فقرا اُس سے ملتے تھے، وہ علوم عربی میں کامل دستگاہ رکھتا تھا، اور ہر قسم کے مسائل پر خوب بحثیں کرتا تھا۔ ایک مولوی صاحب نے کہا " آپ لوگ جانوروں کو مارنا حرام کیوں سمجھتے ہیں؟" بولا " آپ لوگ کعبے کا احرام باندھ کر جانوروں کو نہیں مارتے، ہم کعبۂ دل کا احرام باندھتے ہیں اس لیے جانوروں کو نہیں مارتے"۔ آذر ایسا زاہد، متورع اور صاحبدل تھا کہ بڑے بڑے صوفی اُس سے ملتے اور اُسکی باتوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اُس نے اپنی کتاب جو بھیجی تھی اُسکی نسبت مآثر الامرا میں لکھا ہے:

"نامہ از مولفات خود کہ مشعر ستایش کواکب مجردات و متضمن نصائح حکم بود فرستاد"

دبستان مذاہب میں اور موبدوں کے حالات بھی لکھے ہیں، از انجملہ ایک موبد سروش کا ذکر ہے، جو زردشت کی نسل سے تھا، عربی، فارسی، ہندی، اور ژند و پاژند میں کامل مہارت رکھتا تھا، اُس نے کئی کتابیں لکھیں، ایک کتاب صرف توحید پر ہے، جس میں ۲۶۰ دلیلوں سے خدا کے وجود کو ثابت کرکے اُسکی وحدانیت پر فلسفیانہ بحث کی ہے۔

بیچ کا زمانہ ذرا سخت گذرا۔ مذہبی احساس بہت کچھ مردہ ہو گیا تھا، رسم و رواج میں میں بالکل ہندیا گئے تھے، احکام و عبادات کے اصولی مسائل میں ایسا غلط ملط ہو گیا تھا کہ اصول نے فروع کی اور فروع نے اصول کی جگہ لے لی تھی۔ اوستا پڑھنے اور سمجھنے والے صرف چند ہی لوگ تھے۔ باقی سب طوطے کی طرح پڑھ جاتے اور مطلب ذرا نہ سمجھتے تھے۔

انگریزی حکومت قائم ہوئی تو اس نے اُنھیں اپنے اندر جذب کرنا شروع کیا، خیالی حیثیت سے بہت کچھ عیسائی اثر میں آگئے، انگریزی مدرسوں میں پڑھتے، اور انگریزی تمدن و معاشرت اختیار کرتے چلے گئے۔ اس سے اُن میں ایک نئی زندگی پیدا ہوئی، تجارت اور سیاست میں اپنے زور دکھانے لگے، لیکن اب تک مذہبی رنگ ہلکا تھا، اور اس طرف اُنھیں کچھ زیادہ توجہ بھی نہ تھی، مگر مسیحی پادریوں نے یہ بات بھی پیدا کر دی، جو لڑکے مشنری اسکولوں میں پڑھتے اُنھیں وہ اپنے مذہب کی تعلیم کرتے، اور آہستہ آہستہ زردشتیت سے برگشتہ کرتے جاتے۔ اس سے دو لڑکے عیسائی ہو گئے۔ اس واقعہ سے تمام قوم میں اک ہیجان پیدا ہو گیا، اُنھوں نے اپنی مذہبی تحقیقات کی۔ مقدس کتابوں کے انگریزی میں ترجمے کیے، علما اور پیشوایان دین کی سوانح عمریاں مرتب کیں، اور اپنے دینی و دنیوی معاملات کی تنظیم کرکے، اپنے تئیں دنیا کی مہذب اقوام کے دوش بدوش چلنے کے قابل بنا لیا۔ ہندوستان کے باشندوں میں اس وقت یہی سب سے زیادہ تیز رفتار اور متمدن ہیں۔

اس مختصر سی تاریخ کے بعد، اجمالاً اُنکے اعتقادات بھی سُن لینے چاہیئے۔ زردشت کی تعلیمات کا اصل الاصول خدائے واحد کی پرستش ہے، وہ خدا جو زمین و آسمان، شمس و قمر، آب و آتش کا ضامن ہے، جس نے دنیا کو پیدا کیا، اور جس کے ہاتھ میں سارے جہان کی موت و

زیست، رنج وخوشی ہے۔ وہی قابل عبادت ہے، التجا کرنے والوں کو اسی سے التجا کرنی چاہیے۔ اُسکے سوا نہ کوئی انسان کا مددگار ہے، نہ کسی سے اُسکو فائدہ پہونچ سکتا ہے۔

شرک کے متعلق اس مذہب کا بھی وہی فتویٰ ہے جو اسلام کا ہے۔ وہ کہتا ہے جو کسی اور خدا کو مانتا ہے وہ مشرک ہے، اسے ایک خدا کو ماننا چاہیے، اور اپنے گناہوں پر توبہ کرنی چاہیے، ورنہ اُسے بہت سخت عذاب دیا جائے گا، اُس پر ہمیشہ دوزخ کا عذاب ہوتا رہے گا۔

خدا کی جسمیت کے متعلق بھی اس کی تعلیم اسلام سے ملتی جلتی ہے۔ وہ اُس کی شکل وصورت، رنگ روپ کا منکر ہے۔ کوئی ایک جگہ بھی متعین نہیں کرتا اور ہر جگہ اُسے موجود بتاتا ہے۔ وہ ہمارے وہم وخیال سے بلند وبرتر، اور ہماری تخیلی صورت آرائیوں سے پاک ومنزہ ہے۔ وہ یکتا ہے کوئی دوسرا اس کا شریک ونظیر نہیں، ایسا پُرشوکت ہے کہ ہم اُسکی شوکتوں کا اندازہ بھی نہیں کرسکتے۔ ایسا قوی ہے کہ اُسکی قوتوں کا احاطہ کرنا ہماری قدرت سے باہر ہے۔ اسکا حال بیان کرنا انسانی قدرت سے باہر ہے۔ ہمیں بغیر سوچے سمجھے، اور بغیر اُسکی کُنہ پر غور کیے اُسکی عبادت کرنی چاہیے۔

آوستا میں خدا کے ایک ہزار نام لکھے ہیں، لیکن ایک سو ایک عام طور پر مروج ہیں۔ یہ سب ایسے نام ہیں جن سے اُسکی صفات اور قدرتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً یزداں، اور، ہرمزد، پروردگار، عادل، رزاق،

پارسیوں کے متعلق جو یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ یہ آگ کی عبادت کرتے ہیں، غلط ہے۔ در اصل سورج، چاند، آگ، پانی، اور ستارے بمنزلۂ قبلہ کے ہیں، یہ اُنھیں محترم خیال کرتے ہیں ژند وپاژند میں صاف لکھا ہے کہ خدا نے آگ اور پانی، چاند اور سورج میں اپنا جلوہ دکھایا ہے، ان چیزوں سے اُس کی شان وشوکت نمایاں ہوتی ہے، انکی طرف رخ کرکے ہمیں اس پاک وبرتر کی عبادت کرنی چاہیے۔

پارسی عقائد وعبادات کے نمایاں احکام یہ ہیں: خدائے واحد پر ایمان لاؤ، زردشت کو اس کا برگزیدہ پیغمبر، اور اُسکے نوشتوں کو آسمانی سمجھو۔ مذہبی احکام کی تمام وکمال پابندی کرو۔ دن میں پانچ وقت خدا کی عبادت کرو، عبادت کے وقت رخ کسی روشن چیز کی طرف

ہو۔ برائیوں سے بچو، نیک بننے کی کوشش کرو، موت کو برحق جانو۔ قیامت اور روز حشر
اصل ہیں، مرنے کے چوتھے روز حساب کتاب ہوگا۔

اس وجہ سے کوئی گناہ نہ کرو کہ زردشت تمہاری شفاعت کریں گے۔ ہر شخص اپنے اعمال
کا خود ذمہ دار و جواب دہ ہوگا۔ جو جیسا بیج بوئے گا ویسا ہی پھل پائے گا۔ نیکی کروگے
جنت ملیگی، بدی کروگے دوزخ میں جاؤگے۔ لیکن اگر اچانک کوئی گناہ ہو جائے تو خدا خود
اُسے معاف کر دے گا۔ وہ ظالم نہیں ہے۔ ظالم تم خود ہو۔

صدق، انکسار، تواضع، حیا، مروت، شیریں کلامی، عصمت و عفت، ہر شخص کے
ساتھ نیکی کرنا، دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا، بھیک نہ مانگنا،
حاجت مندوں کی مدد کرنا نیکی ہے۔ یہ سب کام خدا کی عبادت میں داخل ہیں۔

عداوت، دشمنی، وہم پرستی، ضدی پن، بے حیائی، ظلم و زیادتی، حرص و طمع، کاہلی،
بھکاری پن، میلا کچیلا رہنا، محنت سے جی چرانا، دوسروں کی کمائی پر نظر رکھنا، اپنے سے
بہتر کو دیکھ کر حسد کرنے لگنا، مقدرت سے بڑھ کر چلنا، اپنے ہم مذہبوں کو حقیقی دوست اور
عزیز نہ سمجھنا، لہو و لعب اور مکر و فریب میں مبتلا رہنا، بنی نوع کے ساتھ نیک سلوک نہ کرنا، یہ سب
ایسے گناہ ہیں جیسے چوری اور زنا۔ کوئی شخص اگر پانچوں وقت عبادت کرتا ہو اور ان
میں سے کسی ایک گناہ کا مرتکب ہوتا ہو، تو اُسے اپنی نجات کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ خدا
ایسے لوگوں سے بہت سخت ناراض ہوتا ہے جو اُسکے حکموں پر پوری پوری طرح نہیں چلتے،
اور اپنے ظاہر کو عوام فریب بنا کر، باطن کو غلیظ و کثیف رکھتے ہیں۔ عبادت کا پہلا مقصد
دل کی پاکی ہے۔ دل پاک نہ ہو تو عبادت مقبول نہیں ہوگی، خواہ ایسی عبادت میں کتنی ہی
مشقت کیوں نہ کی گئی ہو۔

قسمت کے متعلق ان کا خیال ہے کہ یہ ایک مقررہ چیز ہے۔ اس میں نہ اسباب کو دخل
ہے نہ تدبیر کو۔ خدا جسکو چاہتا ہے نوازتا ہے، جسکو چاہتا ہے رد کر دیتا ہے۔ اسکے لیے نہ کسی
قابلیت کی ضرورت ہے نہ استحقاق کی۔ وہ بالکل خود مختار ہے، اُسکے انتظام میں کسی کو دخل
دینے کا حق نہیں ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اُسکی طرف سے جو کچھ ہو جائے اُسی پر خوش رہے۔

کسی بات کو بُرا نہ سمجھے، کیونکہ اس عالم میں جو کچھ ہوتا ہے اُسی کی طرف سے ہوتا ہے۔ بُرا سمجھنے کے یہ معنی ہونگے کہ انسان بندہ ہوکر خدا کے حکموں کو غلط اور بُرا سمجھتا ہے۔ اعلیٰ ترین بندگی کا اولین اقتضا یہ ہے کہ انسان راضی بہ رضائے الٰہی رہے۔ مقدس زرتشت کے آخری الفاظ یہ ہیں کہ: وہ مالک ہے، سب کا مختار ہے، جو چاہتا ہے کرتا ہے، اور جو چاہے گا کرے گا۔ ہمیں اُسکے معاملوں میں دم مارنے کا خیال بھی نہیں کرنا چاہیے۔ بغیر اُسکی مرضی کے ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ سارا عالم اُسکے منشا و ارادہ پر چلتا ہے۔ اس لیے اچھائی یا بُرائی جو کچھ ہو، ہمیں ہر حال میں صابر و شاکر اور خوش و خرم رہنا چاہیے۔

ناظر۔ دہلوی

---

## غزل

(بطرز قدیم)

طاقت گھٹتی جاتی ہے اور درد دل بڑھتا جاتا ہے
پہلے غش پر غش آتا تھا، اب مشکل سے ہوش آتا ہے

میں آگ میں اپنی جلتا ہوں، میں آپ ہی اپنا شیدا ہوں
پروانے اپنے ہوش میں رہ، کیا مجھ کو عشق سکھاتا ہے

ٹھنڈی سانسیں بھرتے بھرتے، دل کی یہ حالت ہے، جیسے
غنچہ کوئی کھلتے کھلتے، ڈالی میں مرجھا جاتا ہے

کیا صرف آہوے وحشی ہی، مانوس ہیں مجھ دیوانے سے؟
میرے صحرا میں اکثر مجنوں دل بہلانے آتا ہے

اک گونہ تسکیں ہوتی ہے، دل کی آشفتہ بیتابی میں
سینہ کوٹا کرتا ہوں جب سینے میں دم گھبراتا ہے

اثر۔

---

# مہینوں کی فضائی آسمانی تقسیم

## جنوری

چھوٹے بڑے بے شمار تارے　　پوری سج دھج سے بانکپن سے
سرگرم سفر ہیں آسماں میں　　رہرو ہیں فضائے لامکاں میں

جاڑے کی ٹھنڈی، سہانی راتیں، کیسی ستھری اور بھلی ہوتی ہیں۔ اُجلی فضا میں ایک بدلی بھی نہیں دکھائی دیتی۔ دُھندلی بھاپ ہماری زمین سے نکلتی ہے۔ مگر تیز ہوا کے بیدرد جھونکے اس بیچاری دُکھیاری کو پریشان کر دیتے ہیں۔ چٹکیوں میں اُڑا دیتے ہیں۔ تاروں کی پاکیزہ چمک دمک، مہر عذار قطب کو اپنی گود میں لیے ہوئے ہے، اور چھوٹے بڑے گوناگوں تارے سمت الراس کی آفتابی چوٹی سے دامنِ افق تک بکھرے ہوئے ہیں۔ غرض جہاں تک نگاہیں جاتی ہیں، ہر کہیں تارے ہی تارے دکھائی دیتے ہیں، جن میں بعض بے انتہا چمکیلے ہیں، بعضوں میں دُھندلی چمک ہے، بعض افق کی طرف جھکے ہوئے ہیں، مگر انکی بہت بڑی تعداد اپنے بلند مکانوں سے، جھانک جھانک کر، سوتی دنیا کے اچھوتے سکون کو دیکھ رہی ہے۔ تاروں بھری خاموش رات کے سناٹے میں کہیں کہیں کچھ لوگ سنسان گلیوں میں چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں، اور بے اختیار کہہ گزرتے ہیں "آج ضرور پالا پڑیگا"۔ انکے ساتھی جواب دیتے ہیں "جی ہاں ذرا دیکھیے تو ستارے کیسے چمک رہے ہیں"۔ کچھ حضرات اپنے نرم بچھونوں پر آرام سے لیٹے ہوئے، نازک کھڑکیوں کے بلّوری شیشوں سے روشن تاروں کی دلکش سیر دیکھ رہے ہیں، انکی غلافی آنکھیں فضائے فلکی کی وسعت و بلندی پر حیران ہیں۔ دل میں امنگیں اُٹھ رہی ہیں کہ ہم ہر روشن ستارے کا نام جان لیں۔ انکے باہمی رشتہ ناتہ سے آگاہ ہو جائیں۔ ہم اُنھیں کو مخاطب کرکے کہتے ہیں۔ آنکھیں اُٹھائیے، اُدر کی طرف نگاہیں دوڑائیے۔ وہ دیکھیے سمت الراس کی چوٹی پر جدیِ اعظم جگمگا رہا ہے۔ یہی ایک ایسا روشن، مجمع النجوم یا اکاش دیا تارا منڈل ہے جو اپنے ایسے اور بہت سے ساتھیوں کی جان پہچان کا سبب بنجاتا ہے۔

یہ تارا منڈل بہت آسانی سے پہچان لیا جاتا ہے۔ اسکی انوکھی جھرمٹ فضائی ٹولیوں میں نمایاں شان رکھتی ہے۔ اس میں دوسرے درجے کی جسامت رکھنے والے سات مشہور ستارے شامل ہیں۔ ان میں سے چار اس طرح سنوارے گئے ہیں کہ انکی مجموعی حالت ہمارے سامنے ایک بے ترتیب مربع کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ اور دوسرے میں تارے اس طرح قائم ہیں کہ ان سے ایک منفرجہ مثلث بنجاتا ہے۔

اس غرض سے کہ آپ کو کافی سہولت سے ان تارا منڈلوں کا سچا حال معلوم ہوجائے جو ان مہینے میں دکھائی دیتے ہیں یا اور مہینوں میں نظر آتے ہیں آپ کے لیے لازمی ہے کہ نصف کرہ کا ایک کاشی خاکہ اپنے سامنے رکھ لیجیے، جو کم سے کم اتنا بڑا ضرور ہو کہ اُس میں پہلے اور دوسرے درجے والے ستارے صاف صاف بکھرے ہوے دکھائے جا سکیں۔

جدی اعظم والے ساتوں ستاروں کے جھرمٹ کا مقابلہ اپنے دوسرے تارا منڈلوں سے کیجیے جو آپ کے خاکے میں موجود ہیں۔ اور آپ کی آنکھیں "ج و" سے بہت جلد مانوس ہوجائینگی۔ اب آپ اسی جھرمٹ کے اردگرد والے تاروں کو غور سے دیکھیے۔ اور آپ انکے لیے بھی آسانی سے تگ و دو کر سکیں گے۔ ہم مشہور کی لفظ اس لیے کہتے ہیں کہ بعض مجمع النجوم عام طور سے دلکش ثابت ہوچکے ہیں۔ ایک بار انگلستان کے زبردست شاعر ملٹن نے اپنی روحانی کیفیت؛ وجدانی حالت میں مشتری کو ایک تیز دار مگر غمگین کھلاڑی سے تشبیہ دیکر جدی اعظم کو یوں مخاطب کیا تھا۔

جاڑے کی آدھی رات میں۔ میرے غریب سینے — برج فضا پر چین سے۔ کاش دکھائی دیں مجھے
دیکھ سکوں جدی کو میں۔ آنکھوں سے اپنی باربار — جنمیں ہیں تین سبزہ رو۔ اور جوان ستارے چار
آنکھوں کا نور ہے ہر ایک۔ دل کا سرور ہے ہر ایک
کیسے گلے لگاؤں میں۔ مجھ سے تو دور ہے ہر ایک

ہمارے سادہ دل، سادہ مزاج دیہاتی بھائیوں نے۔ اس جھرمٹ کا نام اپنی زبان میں ابیانی رکھ دیا ہے۔ اس لیے کہ چاروں بڑے تارے گاڑی کے چار پہیے معلوم ہوتے ہیں۔ اور تینوں چھوٹے ستارے عربی ٹانگن کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ الف ب کی شان اور سبھوں سے نرالی ہے۔ کوئی تارا ان کی انوکھی سج دھج کو پہونچتا ہی نہیں۔ انھیں کی مدد سے بہت سے چرواہوں نے جاڑوں کی تاروں بھری رات میں وحشی جھاڑیوں کے اندر اپنا راستہ پا لیا ہے۔ سفید و شفاف برف کی گھری ہوئی شیں

جمی رہیں مگر وہ بیچارے صحیح سلامت اپنے اپنے جھونپڑوں تک پہونچ گئے۔

اچھا اب آپ اُن دونوں تاروں کو دیکھیے جن سے اس ارباتہ کے پچھلے پہیے بنے ہوئے ہیں اور اپنی نگاہ انھیں کی سیدھ میں وہاں تک لیجائیے جہاں دوسرے درجے والا ایک اکیلا تارا اپنے دیدہ زیب مسکن میں تن تنہا چمک رہا ہے۔ اسکا نام قطب تارا ہے۔ یہ کبھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا۔ آنکھیں بھر کے دیکھیے تو آپ کو فوراً اُتر کی سمت معلوم ہو جائے گی۔ یہ مشاہدہ کہنہ و فرسودہ سہی، پھر بھی اشاروں میں بتا دینا فائدے سے خالی نہیں کہ اس حالت میں فطرتاً پورب داہنے ہاتھ اور پچھم آپ کے بائیں پہلو پر ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ہم قطب تارے کو ٹھیک اپنے داہنے شانے پر رکھ لیں تو ہمارا منہ عظیم المرتبت خانۂ کعبہ کی سچی سیدھ میں آجائے گا۔ اور ہم خلاق عالم کی حمد و ثنا، نماز و عبادت سچائی اور عمدگی سے ادا کر سکیں گے۔

پیارا ہے قطب تارا انمول شانت ہے
سنجیدہ ہے ضو اسکی پاکیزہ جسامت ہے
ان سب کا ہے محور گرد اسکے جو ہیں تارے
یہ نقطۂ مرکز ہے گردش میں ہیں سیارے
سیارے بھی وقف ہیں قانون اطاعت کے
کرتے ہیں ادا خدمت ہوش اور لیاقت سے
دن رات گزرتے ہیں لیکن وہ نہیں تھکتے
ہنس ہنس کے بتاتے ہیں سیارے اچھل رستے
رکتے ہیں یہ حیفہ میں اور ہادیٔ محور ہیں
اُجلی ہیں گذرگاہیں نقطے کی یہ رہبر ہیں
نسطھ ہے قطب تارا محور ہے قطب تارا
خادم ہیں یہ سب اسکے افسر ہے قطب تارا
اقلیم میں رہنے کی گروہ نہ اجازت دے
پھر کیا ہے مجال انکی وہ جائیں یہ بیچارے
سب اسکی رعیت ہیں وہ صاحب عزت ہے
اس حلقۂ زریں میں صرف اسکی حکومت ہے

اللہ مبارک ہو یہ راج یہ تاج اُسکو
سیارے قیامت تک دیتے رہیں باج اُسکو

جدی اکبر و جدی اصغر سے زیادہ اور کسی تارا منڈل کی یادگاریں ہماری یادداشت میں نہیں ہیں۔ یہ دونوں بہادروں کے انیس ہیں، سیاحوں کے جلیس ہیں۔ بہتیرے جہازی مسافر انھیں سے آنکھیں لڑا آنے والی مصیبتوں سے بالکل محفوظ رہ گئے ہیں۔

اب اگر آپ جدی اکبر کے سرے سے ایک سیدھی لکیر اس طرح کھینچیے جو جنوبی نصف النہار کو کاٹ

ہوئی گزر جائے اور ذرا اسی شمالی مشرقی کونے کی طرف مڑ جائے تو اُسکا دوسرا سرا ٹھیک ٹھیک ثریا والی مشہور جھرمٹ کے پاس جا کر ختم ہو جائے گا جس میں پانچ ستارے شامل ہیں۔ سب سے قریب آتش مزاج عطارد ہے، اُسکے پاؤں پر غریب زہرہ کا سر ہے۔ پہلو میں بھولی بھالی حوت دس بجے رات کو دامن افق میں محو تماشا ہوتی ہے۔ انقلاب پرست مریخ سب سے زیادہ بلندی پر ہے۔ پردار گھوڑے کے بائیں یا خوبصورت راج ہنس اُسوقت دکھائی دیتا ہے جب ہماری زمین اپنے ابخرات سے خالی ہو! ایک طرف نازک اندام پروین گوہرافشاں ہے۔ دوسری طرف مکس اور مثلث دائرۂ منطقۃ البروج کی طرف جھکے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ مجمع النجوم کی یہ منکھ جھرمٹیں قوس، عقرب، ثور، جوزا، سرطان و اسد کے لیے کفیلہ ہیں۔ یہاں تک کہ معصوم سنبلہ کے گول مول شانے اور بھرے بھرے رخسار بھی چھپے ہوئے ہیں۔

جدی اعظم اور قطب تارے کے پہلوؤں میں ترنم ریز سرود، بل کھائی ہوئی ناگن، حور منش شہزادی دلفریبیاں دکھا رہی ہیں۔ چٹاپٹی اور جھلا جھلی والی جھرمٹیں بھی پورے شباب پر ہیں۔ آس پاس مضطر صفت اور سیماب مزاج سیارے بھی موجود ہیں۔ نصف النہار کے قریب اسد اصغر اسی کے قریب ربط اور دلو کے داہنے پہلو میں شیر گاؤ جلوہ نواز ہے۔

دائرہ منطقۃ البروج کے نیچے، پورب پچھم کے درمیان ماہی شیر زا، نہنگ دریا، شاہین معروکبیر اور مار ہزار سر کھرے ہوئے ہیں۔ دکھن کی جانب بحیرۂ سماوی موجزن ہے اور وادی افق کے قریب نار خرد کھائی دیتا ہے۔

آیئے دائرۂ منطقۃ البروج کی سیر بھی ہو جائے۔ کتب سیر و تاریخ کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر، منجم، اور موسیقی داں حضرات مختلف سیاروں کو اب تک دلچسپی سے دیکھتے رہے ہیں جو اپنی اپنی باری سے حلقۂ رقص یا دور اہتزار کی تنظیم و تکمیل میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کا بلند ہونا فصل کٹ جانے کا نشان، پابند وقت پرندوں کی واپسی کا پیام، اور پھولوں کے لیے نوید مسرت ہے منطقۃ البروج کا لفظ زبان فرانسہ سے معرب کیا گیا ہے۔ جہاں اسکے معنی درندے کے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسکی ہیبت و جلالت کی وجہ سے کوئی دوسرا ثابت یا سیارہ سوا دو یا جوزا کے اسکے پاس تک پہونچ نہیں سکا ہے۔ یہ دائرہ ساری فضائے فلکی میں پھیلا ہوا ہے۔ اسکے دامن میں ایک نور افشاں نمایش

امانت ہے یہ موہوم طریق الشمس (آفتاب کی خیالی گزرگاہ) اسکو دو برابر حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ جنوبی کی خاص ملکیت ڈول ہے۔ اس ستارے کا کام محض اتنا ہے کہ اپنے نورانی ظرف میں اہتزازی کرنوں کے جزر و مد سے فائدہ اُٹھاکر بادلوں کی موتی بھری نہر سے آبِ شفاف بھرے اور اُسکو "خزینۂ نیساں" تک پہونچا دے۔

## طالب

قلبِ سوزاں دیدۂ پُرنم نہیں تو کچھ نہیں — زندگی صرفِ بلائے غم نہیں تو کچھ نہیں
اور ہی کچھ شئے ہے ظالم قدردانی کی نگاہ — تیری بزمِ ناز میں اک ہم نہیں تو کچھ نہیں
لطف ہی کیا جب دل آویزی کی صورت ہی نہیں — زلفِ جاناں میں جو پیچ و خم نہیں تو کچھ نہیں
رنج۔ غم۔ بے اختیاری۔ بیکسی۔ آشفتگی — سب اسی پر منحصر ہے دم نہیں تو کچھ نہیں
کون پوچھے گا تجھے اس عالمِ بے کیف میں — اے وفورِ بیقراری ہم نہیں تو کچھ نہیں
یوں تو ہو تجھکو مبارک نغمۂ چنگ و رباب — سازِ محفل نالۂ پُرغم نہیں تو کچھ نہیں
ہر نئی حالت میں ملتا ہے نیا دل کو مزا — رنج میں احساسِ بیش و کم نہیں تو کچھ نہیں
تیری زلفوں کی پریشانی ہے جانِ صد حیات — مرگِ حسرت پر مری برہم نہیں تو کچھ نہیں
دامنِ الفت پہ دھبہ ہے خیالِ گاہ گاہ — دل میں تیری آرزو ہر دم نہیں تو کچھ نہیں
چارہ سازِ مدعا کیونکر بنے وہ تیغِ ناز — ایک دم کا ہے سہارا دم نہیں تو کچھ نہیں
ترجمانِ دردِ دل بننے کی یہ صورت نہیں — دیدۂ حیراں مرا پُرنم نہیں تو کچھ نہیں
لوگ کہتے ہیں تسلی کو بنائے زندگی — دردِ دل کا ہے مقولہ ہم نہیں تو کچھ نہیں
کون ہوگا قدرداں بے رنگ کی تصویر کا — خونِ دل میرا شریکِ غم نہیں تو کچھ نہیں
وہ کوئی آنسو ہیں جو جذبِ تسلی ہو سکیں — دیدۂ تر چشمۂ زمزم نہیں تو کچھ نہیں
ساری دنیا ہے فقط وابستۂ تارِ نفس — دم نہیں تو ہم نہیں اور ہم نہیں تو کچھ نہیں
ایسی باتوں کے تسلسل ہی میں ہے ہادی مزا — شغلِ نالہ ہجر میں پیہم نہیں تو کچھ نہیں

ہادی۔ مچھلی شہری

# جلاوطنی

(از روسی مصنف چیخوف)

بوڑھا سیمین، عرف لال بجھکڑ، اور ایک نوجوان تاتاری جس کا نام کسی کو بھی معلوم نہ تھا، دریا کے کنارے آگ کے گرد بیٹھے تھے۔ باقی تین کشتیبان جھونپڑی میں سو رہے تھے۔ سیمین کی عمر ساٹھ سال کی ہوگی۔ وہ اگرچہ بدہیئت اور پوپلا تھا، مگر اُسکے شانے کشادہ اور چہرہ سے صحت کے آثار نمایاں تھے۔ اسوقت وہ شراب پیے ہوئے تھا۔ وہ کبھی کا سو چکا ہوتا اگر اُسے ڈر نہ ہوتا کہ وہ جھونپڑی میں گیا، تو کہیں اُسکے ساتھی بھی اُسکی شراب کی بوتل میں سے حصہ نہ طلب کریں۔ تاتاری بیمار اور تھکا ہوا تھا۔ اپنے بوسیدہ کپڑوں میں لپٹا ہوا۔ وہ سمبرسک کی شاندار زندگی اور اپنی بیوی کے حسن و رعنائی کی یاد تازہ کر رہا تھا۔

لال بجھکڑ بولا "ظاہر ہے کہ یہ بہشت تو ہے نہیں۔ ایک نظر میں تم یہاں کے پورے گرد و پیش کا جائزہ لے سکتے ہو۔ بجز پانی، دریا کے کناروں، اور کیچڑ کے یہاں دھرا کیا ہے۔ برف پڑنے کا زمانہ مدت ہوئی ختم ہو چکا۔ پھر بھی دریا جما ہوا ہے، اور آج ہی صبح برف پڑی ہے۔"

تاتاری دہشت سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا کراہ رہا تھا "آفت! آفت!"

دس قدم کے فاصلہ پر دریا، سرد و سیاہ، تیزی سے سمندر کی طرف بہتا ہوا، نیچے ریتلے کنارے سے ٹکرا رہا تھا۔ کنارے کے قریب ایک کشتی بندھی ہوئی تھی۔ دریا کے اُس پار چھوٹے چھوٹے آتشیں سانپ کبھی رینگتے، کبھی چھپتے، کبھی پھر چمکتے نظر آ رہے تھے۔ یہ پچھلے سال کی گھاس تھی جو جل رہی تھی۔ آگ کے سانپوں کے پیچھے پھر اندھیرا تھا۔

تاتاری نے آسمان کی طرف نظر اُٹھائی۔ اُسکے وطن میں بھی اتنے ہی تارے تھے، اسی قدر اندھیرا تھا۔ لیکن یہاں کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ سمبرسک میں تارے زیادہ چمکدار تھے اور آسمان بھی یہاں سے مختلف تھا:

وہ پھر کراہا، "آفت! آفت!"

لال بجھکڑ نے ہنس کر کہا "تم رفتہ رفتہ عادی ہو جاؤ گے! ابھی تم نوجوان اور کم عقل ہو۔ تمہارے

مُنہ سے ابھی ماں کے دودھ کی بو آتی ہے۔ تمھاری بیوقوفی ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ مجھ سے زیادہ بدقسمت اور
کوئی نہیں۔ ایک وقت آئیگا کہ تم کہوگے: 'خدا سب کو ایسی زندگی نصیب کرے!' مجھے دیکھو، ہفتہ بھر میں
دریا کھل جائے گا؛ کشتیاں چلنے لگیں گی، تم سب تابریا کا رستہ لوگے۔ میں یہاں اُسی طرح کشتی کھیتا
ہوا رہ جاؤں گا جس طرح بائیس سال سے آنے دن کھے رہا ہوں۔ اور یہاں پانی تلے مچھلیوں کے سوا اور زمین
پر میرے علاوہ کوئی نہ رہے گا۔ اسکے باوجود، خدا کا شکر ہے، مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ خدا سب کو
ایسی زندگی نصیب کرے"!

تاتاری نے آگ میں کچھ لکڑیاں لگائیں، اور اُسکے قریب سکڑ کر بیٹھ گیا۔ اور کہنے لگا "میرا باپ
بیمار ہے۔ جب وہ مرجائے گا، تو میری ماں اور بیوی میرے پاس آجائیں گی۔ وہ مجھ سے وعدہ کرچکی ہیں"
لال جھکڑ نے پوچھا "ماں اور بیوی کو تم کیا کروگے؟ ارے میاں، اس حماقت میں مبتلا نہ ہو، یہ
وسوسے شیطان نے تمھارے دل میں ڈال دیئے ہیں۔ اُسکی ایک نہ سنو۔ اگر وہ عورتوں کے بارے
میں گفتگو کرے، تو کہہ دو مجھے اُن کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر وہ آزادی کا ذکر چھیڑے، تب بھی یہی جواب
دو۔ تمھیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے؛ نہ ماں، نہ باپ، نہ آزادی، نہ گھر، نہ وطن۔ خدا ان سب کو
غارت کرے!۔ تمھیں ان میں سے کسی کی بھی حاجت نہیں!" لال جھکڑ نے اپنی بوتل میں سے ایک
گھونٹ پیا اور پھر بولنا شروع کیا: "بھائی، میں معمولی زمیندار نہیں ہوں۔ میرا باپ پادری تھا، اور جب
میں کرسک میں رہتا تھا، تو میں بھی نفیس کپڑے پہنتا تھا۔ مگر اب میں نے اپنا یہ حال بنا لیا ہے کہ زمین
پر ننگا سو رہتا ہوں، اور ضرورت پڑے تو گھاس پر گزارہ کرنے کو تیار رہوں۔ خدا سب کو ایسی زندگی
نصیب کرے! مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں، مجھے کسی کا ڈر نہیں، اور میں اپنے سے زیادہ مالدار
اور آزاد دنیا میں کسی کو نہیں سمجھتا۔ جوں ہی میں یہاں بھیجا گیا، میں نے پہلے دن سے ارادہ کر لیا کہ میں کسی
چیز کی ضرورت نہیں محسوس کروں گا۔ شیطان نے مجھے بھی بیوی، گھر، آزادی کے نام لے لے کر ورغلانا چاہا،
مگر میں برابر یہی جواب دیئے گیا کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اور میں اس خیال پر قائم رہا۔ نتیجہ تم خود
دیکھ لو: میں کیسی اچھی اور اطمینان کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ بس یہ سمجھ لو کہ شیطان کا ذرا سی بات میں
کہا مانا، اور تم کہیں کے نہ رہے۔ دلدل میں دھنس جاؤ گے اور پھر کبھی نہ ابھر سکوگے۔ ہم دہقان لوگ ہی
شیطان کی چالوں میں نہیں آتے، خاندانی پڑھے لکھے لوگ بھی آجاتے ہیں۔ کوئی پندرہ سال کا ذکر ہے

کہ ایک شخص جلا وطن ہو کر یہاں پہونچا - بھائیوں میں تقسیم جائداد اور جعلی وصیت کا کچھ جھگڑا تھا - بعض لوگوں نے کہا کہ یہ ضرور کوئی شہزادہ یا کسی جاگیردار کا لڑکا ہے - مگر ممکن ہے معمولی سرکاری ملازم ہو کسی کو کیا معلوم ؟ بہرحال، وہ یہاں پہونچا اور آتے ہی اُس نے اپنے لیے ایک مکان اور کچھ زمین خرید لی، اُس نے تہیہ کیا کہ میں اپنے پسینہ کی کمائی پہ گذارہ کروں گا - میں اب معزز آدمی نہیں رہا، معمولی جلا وطن ہوں ' میں نے کہا ' خدا تمھارے نیک ارادے میں برکت دے ! '

وہ اُسوقت نوجوان تھا، اور اُسکے مزاج میں دوڑ دھوپ کا ولولہ تھا - وہ خود ہل چلاتا، خود مچھلیاں پکڑتا - گھوڑے پر ساٹھ میل کی سواری اُسکے لیے معمولی بات تھی - مگر یہ زمانہ زیادہ عرصے تک نہ رہا - پھر مصیبت آئی - پہلے ہی سال سے اُس نے دستور بنا لیا تھا کہ روزانہ گھوڑے پر گرینہ کے ڈاک خانے جاتا تھا، میری کشتی پہ وہ کھڑا ہو جاتا، اور ٹھنڈا سانس بھر کر کہتا "سیمین، خبر نہیں گھر کے لوگ روپیہ بھیجنے میں دیر کیوں لگاتے ہیں ؟" میں کہتا ' وسیلی سرجی وچ، تمھیں روپے کی کوئی ضرورت نہیں - تم روپے کا کیا کرو گے ؟ پرانے زمانے کو بھول جاؤ گویا وہ کبھی تھا ہی نہیں، اور زندگی نئے سرے سے شروع کرو - شیطان کی ایک نہ سنو ! وہ تمھارے درپے ہے - اُسکے کہے میں آئے تو یاد رکھو ضرور تمھیں سولی پہ لٹکوا کے چھوڑے گا - ابھی تو تم صرف روپیہ چاہتے ہو، رفتہ رفتہ کچھ اور چاہو گے - پھر تمھیں کسی اور چیز کی ضرورت ہوگی اور پھر کسی اور چیز کی ... اگر تمھیں خوشی مطلوب ہے، تو میرا کہا مانو اور کسی چیز کی خواہش نہ کرو - اگر قسمت نے ہمارے ساتھ برا سلوک کیا ہے، تو ہم کیوں اُس کے آگے سر جھکائیں اور بھیک مانگیں ؟ ہمیں تو چاہیے کہ اُس سے نفرت کریں، اُس پہ ہنسیں - اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کچھ عرصہ میں وہ ہماری ہنسی میں شریک ہونے لگے گی ' میں اُسے اسی قسم کے مشورے دیتا ... دو ایک سال بعد مجھے پھر اُسے دریا پار کرانے کا اتفاق ہوا - وہ مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا تھا - اُس نے کہا ' میں اپنی بیوی کو لینے جا رہا ہوں - آخر اُسے میری حالت پر رحم آ ہی گیا، اور اُس نے میری التجا قبول کر لی - وہ کتنی بھلی اور مہربان ہے ! ' اُس سے اپنی خوشی ضبط نہیں ہو سکتی تھی -

ایک آدھ دن کے بعد وہ اپنی بیوی سمیت واپس ہوا - وہ ایک نوجوان حسین عورت تھی ' اور اُسکی گود میں ایک ننھی بچی تھی، وسیلی سرجی وچ اُسکے ادھر اُدھر منڈلا رہا تھا - اپنی نگاہیں

وہ اُسکے چہرے سے نہ ہٹا سکتا تھا۔ اپنی بیوی کی تعریف میں اُس کی زبان قاصر تھی۔
وہ مجھ سے کہنے لگا "بھائی سین، زندگی سائیبریا میں بھی بے لطف نہیں گذرتی!" میں نے اپنے دل میں کہا تھا کہ یہ خیال چند روزہ ہے۔ اُس روز سے وہ ہر ہفتے گرٹیو جانے لگا کہ روس سے اُس کا روپیہ تو نہیں آیا۔ روپے کی اُسے بے حد و حساب ضرورت رہتی۔ مجھ سے ایک دن اُس نے کہا "میری خاطر اُس نے اپنی جوانی اور حُسن کو سائی بیریا میں گویا دفن کر دیا ہے، اور میرے ساتھ بے آرامی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس احسان کے بدلے مجھ پر لازم ہے کہ جس قدر ہو سکے اُس کی دلچسپی کا سامان مہیا کروں"۔ زندگی کو اسکے واسطے دلچسپ بنانے کے لیے اُس نے مقامی افسر وں اور طرح طرح کے لوگوں سے راہ و رسم پیدا کی، پھر اُنکے لیے کھانے پینے کے انتظام کی ضرورت ہوئی۔ ایک پیانو خریدا گیا، اور ایک چھوٹا سا کتا۔ خدا اُسے غارت کرے! الغرض ہر طرح کے ٹھاٹھ اور فضول خرچی ہونے لگی۔ اس پر بھی وہ بیگم صاحبہ کچھ زیادہ عرصہ تک اُس کے ساتھ نہ رہیں۔ اور رہتیں بھی کس طرح؟ چاروں طرف کیچڑ اور پانی، سردی، اور جاہل، غیر مہذب، شرابی لوگوں کے علاوہ یہاں تھا کیا؟ اُنھیں تو شہری زندگی کا چسکا تھا، وہ یہاں کہاں سے آتی؟ اسکے علاوہ میاں کی حیثیت بھی اب پہلے سے گر گئی تھی: ایک جلاوطن کی اوقات ہی کیا ہوتی ہے۔

تین سال گذر گئے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن شام کے وقت پرلے کنارے سے مجھے کسی کی آواز سنائی دی۔ میں کشتی لے کر اُدھر پہونچا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ وہی بیگم صاحبہ کانوں تک لپٹی ہوئی کھڑی ہیں، اور ساتھ ایک جوان افسر ہے؛ اُنکے ساتھ ایک گاڑی بھی تھی! میں نے اُنھیں دریا پار کرا دیا؛ وہ گاڑی میں بیٹھ کر آگے روانہ ہو گئے۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی اُسوقت کوئی آدمی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اگلے دن صبح کو ویسلی سرجی وچ گھبرایا ہوا گھوڑے سے اُترا اور مجھ سے پوچھنے لگا "سیمین! میری بیوی تو کسی عینک والے آدمی کے ساتھ دریا کے پار نہیں گئی؟" میں نے جواب دیا "ہاں! اب وہ تمھارے ہاتھ آ چکی!" پانچ دن اُس نے اُنکا تعاقب کیا۔ جب وہ واپس آیا، تو بے دم ہو کر میری کشتی میں گر پڑا اور اپنا سر کشتی میں دے دے مارتا تھا۔ آخر سسکیاں لیتا ہوا بولا "میں نے یہ پھل پایا!" میں نے مسکرا کر اُسے یاد دلایا کہ "زندگی سائیبریا میں بھی کچھ بے لطف نہیں گذرتی!" وہ برابر آہ و زاری کیے گیا۔ اسکے بعد اُسے آزادی کی ضرورت ہوئی۔

اُسکی بیوی روس پہونچ چکی تھی، اور وہ اُس سے ملنے کے لیے بیتاب تھا تاکہ اُسے پھر اپنے ساتھ لا سکے۔ اُس دن سے وہ صبح و شام ڈاک خانے سے مقامی حکام کے ہاں آتا جاتا رہتا۔ روس جانے کی .... اجازت حاصل کرنے کے لیے اُس نے عرضیوں پر عرضیاں بھیجیں، صرف ایک تار پر اُسکے سو روبل خرچ ہوے۔ اپنی زمین اُس نے بیچ دی، اپنا مکان یہودیوں کے ہاتھ رہن کر دیا۔ اُسکے بال سفید ہوگئے، شانے جھک گئے، اور چہرہ زرد پڑ گیا۔ جیسے کسی دق کے مریض کا۔ بات کرتے کرتے اُسکا دل بھر آتا اور آنکھیں پُرنم ہو جاتیں۔

اس طرح اُس نے آٹھ سال بسر کیے۔ آخر ان واقعات کا صدمہ ہلکا ہوگیا، اور اُس نے گویا از سرِ نو زندگی پائی۔ اُسے ایک تسکین کا ذریعہ ہاتھ لگ گیا تھا۔ اُسکی بیٹی جو اب سمجھدار ہوگئی تھی، وہ اُس پر جان فدا کرتا تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ تھی بھی وہ خوب صورت، سیاہ آنکھوں والی اور طرحدار۔ ہر اتوار کو وہ اُسے گرینو کے گرجا میں لیجاتا۔ دونوں کشتی میں پاس پاس کھڑے ہو جاتے وہ مسکراتی ہوئی اور اُس کا متوالا باپ اُسکے چہرے پر نظریں جمائے ہوے، وہ کہتا "بیشک، سیمین، سائبیریا میں بھی زندگی کچھ بے لطف نہیں گذرتی، یہاں بھی انسان خوش رہ سکتا ہے۔ دیکھو میری لڑکی کتنی پیاری ہے! اس سے زیادہ دلکش لڑکی تمھیں ہزار میل ادھر اُدھر نظر نہیں پڑیگی" میں جواب دیتا "بیشک، تمھاری لڑکی بہت پیاری ہے"۔ اور دل میں کہتا "ذرا صبر کرو.... یہ نوجوان ہے، اس کا خون گرم ہے، اسے دلچسپ زندگی کی تلاش ہے، یہاں اسکی دلچسپی کا کیا سامان ہے؟"

بہر حال، لڑکی کی گھُلنی شروع ہوئی، اور آخر بیمار پڑگئی، اور اب بمشکل بستر سے اُٹھ سکتی ہے۔ ڈاکٹروں نے دق تشخیص کی ہے۔ یہ ہے بھائی سائبیریا کی پُرلطف زندگی! خیر تو اب ڈاکٹروں کی تلاش ہوئی جہاں کسی ڈاکٹر یا نیم حکیم کا پتہ چلا اور وسیلی سرجی وچ اُسے لینے پہونچا۔

میں نہیں بتا سکتا ڈاکٹروں پر وہ کتنا روپیہ خرچ کر چکا ہے۔ اس سے زیادہ مناسب تو یہ ہوتا کہ وہ یہ روپیہ شراب خواری میں اُڑا دیتا۔ لڑکی کا مرنا تو ہر حال میں یقینی ہے۔ اُسے اب کوئی ڈاکٹر نہیں بچا سکتا۔ اور پھر وہ بالکل بے یار و مددگار رہ جائے گا، اور یا تو ناامید ہوکر خودکشی کر لیگا یا روس بھاگنے کی کوشش کرے گا۔ اگر فرار ہوا، تو ضرور پکڑا جائے گا؛ پھر وہی مقدمہ حبس دوام، ممکن ہے سولی ...

"یہ خوب رہا" تاتاری نے مُنہ ہی مُنہ میں سردی سے کانپتے ہوے کہا۔

"کیا خوب رہا؟"

"بیوی، بیٹی ... نا امیدی یا حبسِ دوام کی کیا حقیقت ہے جب اُسے اپنی بیوی، اپنی بیٹی کی صحبت میسر ہو چکی؟ ... تم کہتے ہو انسان کو کسی چیز کی خواہش نہیں ہونی چاہیے؛ یہ بدبختی کی علامت ہے۔ اُس کی بیوی اُسکے ساتھ تین سال تک رہی، یہ خدا کی رحمت تھی، کچھ بھی نہ ہونا، بدبختی ہے۔ دو تین سال تو لطف سے گذرے، تم ذرا نہیں سمجھتے"

سردی سے لرزتے ہوے، اور اپنا مطلب ادا کرنے کے لیے صحیح روسی الفاظ تلاش کرتے ہوے، تاتاری نے کہا کہ "میں تو دعا مانگتا ہوں کہ خدا مجھے غیر ملک کی موت سے بچالے۔ میری بیوی میرے پاس آجائے، دن بھر کے لیے، گھنٹہ بھر کے لیے، اسکے عوض مجھے ہر طرح کی اذیت قبول ہے۔ خوشی کا ایک دن ہمیشہ کی محرومی سے بہتر ہے"

اور اُس نے پھر اپنی خوبصورت اور عاقل بیوی کا ذکر کرنا شروع کردیا۔ یہاں تک کہ اپنا سر اُس نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ اُس نے سیمین کو یقین دلایا کہ "میں بے قصور ہوں، میرے ساتھ ناانصافی برتی گئی۔ میرے بھائیوں اور چچا نے گھوڑے چرائے تھے اور گھوڑے والے کو ادھ موا کیا تھا، میں بےگناہ ہوں۔ ہم تینوں بھائیوں کو سائبیریا میں جلاوطن کر دیا گیا اور ہمارا مالدار چچا صاف چھُٹ گیا"

"رفتہ رفتہ تم اس زندگی کے عادی ہو جاؤ گے" سیمین نے تمکن کے لہجے میں کہا۔

تاتاری نے کچھ نہیں کہا اور اپنی اشک آلود آنکھوں سے آگ کی طرف دیکھنے لگا، اُسکے چہرے سے حیرانی اور مظلومیت ٹپک رہی تھی، گویا اُسے نہیں معلوم کہ کیوں وہ سائبیریا کی سردی و تاریکی میں پھینک دیا گیا ہے۔ لال بجیکو آگ کے قریب لیٹ رہا، اور پہلے مسکرایا، پھر آپ ہی آپ کچھ گنگنانے لگا۔

اور تھوڑی دیر کے بعد اُس نے پھر بولنا شروع کیا "لڑکی سے اُسے تسکین ضرور ہے، مگر لڑکی کو اُس سے کیا تسکین؟ اُسے بڈھے، چڑچڑے باپ کی کیا حاجت؟ اُسے تو بوسوں کی حاجت ہے، اور عطر کی، اور غازہ کی"

سیمین نے وقت کے ساتھ اُٹھتے ہوے، ایک آہ کھینچی۔

بوتل ختم ہو گئی۔ بس اب سونے کا وقت ہے۔ کیوں بھائی؟ میں تو چلا ...'

تنہائی میں تاتاری نے آگ میں کچھ اور لکڑیاں لگائیں، اور شعلوں پر ٹکٹکی باندھے، اُسکی نظروں میں اپنے گاؤں اور اپنی بیوی کا تصور بندھ گیا۔ ایک مہینے، ایک دن کے لیے وہ میرے پاس آجائے، تو مجھے ذرا ملال نہ ہوگا اگر وہ پھر چلی بھی گئی۔ خوشی ایک مہینہ، صرف ایک دن، ہمیشہ کی محرومی سے بہتر ہے۔ فرض کرو اُس نے اپنا وعدہ پورا کیا، اور وہ آبھی گئی، تو میں اُس کا خرچ کس طرح اُٹھاؤں گا، اُس کی سکونت کا یہاں کیا انتظام ہے؟ سوچتے سوچتے اُسکے منہ سے نکلا' کھانے کو نہ ہوگا تو زندگی کس طرح ہوگی؟' دن رات کشتی چلانے پر بھی اُسکی آمدنی دس بارہ آنے سے زیادہ نہ تھی۔ یہ سچ ہے کہ بخشش کے طور پر اُسے کبھی کبھار کچھ مل جاتا تھا، مگر اُسے دوسرے کشتیبان آپس میں بانٹ لیتے تھے، اور تاتاری یوں ہی رہ جاتا تھا۔ بلکہ وہ اُس کا اُلٹا مذاق اُڑاتے تھے۔ اور پھر بھوک پیاس اُس کی بیوی سے کس طرح برداشت ہوگی؟

اب کہ وہ مارے سردی کے تھرتھر کانپ رہا تھا، اور اُس کے عضو عضو میں درد تھا، چاہیے تھا کہ وہ جھونپڑی میں جاکر لیٹ رہتا، مگر وہاں باہر سے بھی زیادہ سردی ہوتی، کیونکہ اُسکے پاس اوڑھنے کو کچھ نہ تھا۔ باہر بھی اگرچہ اوڑھنے کو کچھ نہ تھا، مگر آگ تو تھی۔ ہفتہ بھر میں پانی اُتر جائے گا اور کشتیاں چلنے لگیں گی۔ اور سوائے سیمن کے دوسرے کشتیبانوں کی ضرورت نہ رہے گی۔ تب تاتاری گاؤں گاؤں نوکری ڈھونڈتا اور بھیک مانگتا پھرے گا۔ اُس کی بیوی صرف سترہ سال کی تھی، خوبصورت، نازک، اور شرمیلی۔ کیا وہ بھی بے شرمی کے ساتھ دربدر بھیک مانگتی پھرے گی؟ نہیں، نہیں، اس قسم کا خیال بھی اُسکے تصور میں نہ آسکتا تھا۔ صبح ہو چلی تھی، کشتی، درخت، دریا صاف نظر آنے لگے تھے۔ ایک طرف رتیلی ڈھلان، اُس کی تہ میں چھپر، اور اُن سے پرے گاؤں کی جھونپڑیاں دکھائی دینے لگی تھیں۔

سرخ رتیلی ڈھلان، کشتی، اجنبی، غیر متواضع لوگ، بھوک، پیاس، بیماری۔ شاید ان چیزوں کا کوئی وجود نہ ہو۔ شاید یہ سب خواب ہو' تاتاری نے خیال کیا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سو رہا ہے اور اپنے خراٹوں کی آواز اُسکے کان میں آرہی ہے۔ وہ پھر خواب میں اپنے وطن پہونچا، اِدھر اُس نے اپنی بیوی کو آواز دی، اُدھر وہ آئی ... اور اُسکی ماں پاس کے کمرے میں تھی ... لوگ کیسے

دردناک خواب دیکھتے ہیں! تاتاری نے آنکھیں کھولیں، یہ کون سا دریا ہے؟ والگا؟ برف پڑ رہی تھی دریا کے دوسرے کنارے سے کوئی شخص چلّا رہا تھا 'کشتی لاؤ، کشتی!'

تاتاری چونک کے اٹھ بیٹھا، اور اپنے ساتھیوں کے پاس پہونچا۔ پھٹے ہوئے لبادے پہن کر، اپنی کرخت، خواب آلود آواز میں بڑابڑاتے ہوئے، کشتیبان دریا کے کنارے پہونچے۔ میٹھی نیند کے بعد دریا کی تیز سرد ہوا کچھ بہت خوشگوار نہ تھی۔ فوراً سب کشتی میں سوار ہوئے۔ تاتاری اور تین دوسرے کشتیبانوں نے چپو سنبھالے جو اندھیرے میں کیکڑے کے پنجوں کے مانند نظر آتے تھے۔ سیمین پیٹ کے بل کشتی کے اگلے حصے میں لیٹ گیا۔ دوسرے کنارے سے چیخنے چلّانے کی آواز بدستور آ رہی تھی، دو مرتبہ طمنچہ چلنے کی آواز بھی سنائی دی۔ جو کوئی بھی چلّا رہا تھا، اُسے خیال ہوگا کہ شاید کشتیبان سو رہے ہیں یا گاؤں کے شراب خانے میں گئے ہوئے ہیں۔

'سن لیا، آخر ایسی کیا گھبراہٹ ہے؟' لال بھبکڑ نے ایسی آواز سے کہا جس سے ٹپکتا تھا کہ اس دنیا میں جلدی کی کوئی ضرورت نہیں اور یہ ایک بےمعنی حرکت ہے۔

لمبی چوڑی، بدقطع کشتی آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی، سوائے اسکے کہ کنارے کے درخت چلتے ہوئے نظر آئیں کشتی بالکل ساکت معلوم ہوتی تھی۔ کشتیبان اطمینان کے ساتھ بھچے تلے ہاتھوں سے چپو چلا رہے تھے۔ لال بھبکڑ الٹا ہوا، ہوا میں کمان بنا رہا تھا، کبھی اس طرف کو جھکتا تھا کبھی اُس طرف کو۔

'جلدی کرو، جلدی!' اجنبی اُس کنارے سے بیتابانہ چیخ رہا تھا۔ دس منٹ کے بعد کشتی زور سے کنارے سے جا لگی۔ سیمین برف کے گالے اپنے منہ سے پونچھتے ہوئے بڑبڑایا 'برف ہے کہ پڑے جاتی ہے، پڑے جاتی ہے۔ خدا معلوم اتنی برف کہاں سے نازل ہوتی ہے۔'

کنارے پر ایک دبلا پتلا مختصر سا آدمی لومڑی کی کھال کا چھوٹا کوٹ پہنے اور سفید اونی ٹوپی پہنے کھڑا تھا۔ غمگینی و ازخود رفتگی اُسکے چہرے سے ٹپکی پڑتی تھی گویا کوئی بھولی ہوئی بات یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اپنے ناقص حافظے پر اُسے غصہ آ رہا ہے۔

جب سیمین نے قریب پہونچ کر مسکراہٹ کے ساتھ تعظیماً اپنی ٹوپی اُتاری، تو وہ جلدی جلدی کہنے لگا 'میں انسکسو کا جا رہا ہوں، میری لڑکی کی حالت نہایت نازک ہے۔ سنا ہے وہاں کوئی نیا

ڈاکٹر مقرر ہوا ہے۔"

گاڑی کشتی میں ڈھکیلی گئی اور کشتیبانوں نے کشتی کھینی شروع کی۔ اجنبی، جسے سیمن ویسیلی سرجی وچ کہتا تھا، بالکل ساکت کھڑا ہوا اپنے بھرے بھرے ہونٹوں کو چباتا اور ناک کی سیدھ میں دیکھتا رہا۔ گاڑی بان نے اُس سے سگرٹ پینے کی اجازت مانگی، تو اُس نے کوئی جواب نہیں دیا جیسے کچھ سُنا ہی نہیں۔

سیمن تعریضاً بولا "زندگی سائبیریا میں بھی کچھ بے لطف نہیں گذرتی"۔ اُسکے چہرے پر فاتحانہ رنگ جھلک رہا تھا، گویا وہ خوش ہے کہ واقعات نے وہی صورت اختیار کی جیسی اُس نے پیشین گوئی کی تھی۔ ویسیلی سرجی وچ کی غمناک، بے بسانہ حالت پر وہ نہایت مسرور تھا۔ "اس موسم میں سفر بہت تکلیف دہ رہے گا۔ ہرطرف کیچڑ ہی کیچڑ ہے۔" جب گھوڑے جوتے جا رہے تھے تو اُس نے پھر کہا "تمھیں چاہیئے تھا کہ آٹھ دس دن ابھی اور ٹھہرتے تاکہ زمین خشک ہو جائے۔ اس سے بھی بہتر یہ تھا کہ تم سفر ہی نہ اختیار کرتے۔ آخر سفر سے حاصل؟ سال بسال لوگ اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے ہیں، اور نتیجہ دیکھو، تو۔ صِفر! تمھارا کیا خیال ہے؟" ویسیلی سرجی وچ چُپ چاپ کشتیبانوں کو انعام دے کر گاڑی میں بیٹھا اور روانہ ہوگیا۔

"پھر وہی ڈاکٹر کی تلاش!" سیمن حرارت پیدا کرنے کے لیے ہاتھ مَلتے ہوئے بولا "یہاں معقول ڈاکٹر کا دستیاب ہونا اُتنا ہی آسان ہے جتنا جنگل کی ہوا یا شیطان کی دُم کا ۔ خدا اُسے غارت کرے!۔ ہاتھ آنا۔ لوگ کتنے بے وقوف ہوتے ہیں۔ خدایا، ایک پُرانے گناہگار کو معاف کر!"

تاتاری لال بھبکڑ قریب پہونچا، اور لمحہ بھر کے لیے اُسکو نفرت اور بیزاری کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر سردی میں کانپتے ہوئے، حالتِ غیظ و غضب میں تاتاری الفاظ استعمال کرتے ہوئے، اُس نے کہنا شروع کیا: "وہ ایک نیک آدمی ہے۔ نیک۔ اور تم خبیث ہو خبیث! اُس کی روح پاک ہے، اور تمھاری پلید! وہ زندہ ہے، اور تم مُردہ! خدا نے انسان کو اس لیے بنایا ہے کہ وہ خوشی اور رنج اور ناکامی سے آشنا ہو؛ مگر تمھیں کوئی آرزو نہیں۔ تم ایک پتھر ہو، ایک مٹی کی مورت! پتھر کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ تمھیں ہے۔ خدا کو اُس سے

محبت ہے، تم سے نہیں!' سب کشتیبان ہنس پڑے، اور تاتاری نے ایک بیکبارگی حرکت کے ساتھ اپنے پھٹے ہوئے کپڑے بدن پر لپیٹ لیے اور آگ کے قریب چلا گیا، سیمین اور دوسرے کشتیبان جھونپڑی کی طرف چلے گئے۔

ایک مجرم خشک گھاس پر لیٹتے ہوئے کرخت آواز میں بولا 'کیسی سردی پڑ رہی ہے!' دوسرے نے کہا 'واقعی، غضب کی سردی ہے۔ یہ بھی تو مجرموں کی زندگی!'

سب لیٹ گئے۔ ہوا کی تیزی سے جھونپڑی کا دروازہ کھل گیا، اور برف اندر بھی پہونچنے لگی۔ کسی میں مارے سردی اور کاہلی کے اتنی ہمت نہ تھی کہ اٹھ کر دروازہ بند کر لیتا۔ سیمین غنودگی کا جھونکا آنے سے پہلے بولا 'میں تو آرام سے ہوں۔ خدا سب کو ایسی زندگی نصیب کرے!'

'تم سات دفعہ سزا پاؤ، شیطان پھر بھی تمھاری ناپاک روح کو نہ قبول کریگا!' باہر سے نفرت اور غصہ میں بھری ہوئی آواز سنائی دی۔

'کیا ہے؟ کون ہے؟'

'تاتاری! بڑبڑا رہا ہے، عجب بے وقوف ہے!'

'رفتہ رفتہ عادی ہو جائے گا' اور یہ کہکر سو گیا۔ باقی مجرم بھی تھوڑی دیر میں سو رہے، دروازہ کھلا رہا۔

(ترجمہ)

(خواجہ) منظور حسین (علیگ)

---

# "احقاد"

تیرا ایک کج فہم خادم اس کو باور کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں کہ اے جان آرزو! تونے اپنی مخصوص و دلفریب شانِ دلربائی کے باوجود رواے ہستی اُتار دی، اور ہم نیازکیشوں سے خفا ہو کر عدم آباد کی خوفناک و تاریک وادی میں پناہ لی۔ کیا درحقیقت کائنات کا گوشہ گوشہ تیری طلعت دیزیوں سے

خالی ہے، اور کیا اس عالم کا کوئی خطہ ایسا نہیں جسکی آب و ہوا تیری نغمہ سنجیوں سے مربوط مسرت و شادمانی بنی ہوئی ہو؟

وہ فرشتۂ موت کیسا شقی القلب ہو گا جس نے تجھ جیسے ہونہار یگانۂ روزگار، اور لائقِ رشک فرزند کو عین عالمِ شباب میں تیرے ضعیف والدین سے جدا کیا، اور ایک پرستارِ محبت، عاشقِ صادق، اور پیکرِ وفا کو اُسکی نئی نویلی بیوی کے آغوشِ محبت سے آن واحد میں ہمیشہ کے لیے علٰحدہ کر دیا۔

اے ملکِ عدم کو آباد کرنے والے! کیا تجھے خبر ہے کہ تیرے حلقہ بگوشانِ محبت کس درد اور اضطراب سے تیری جدائی میں آتش بجاں ہیں، اور کس بےچینی اور مایوسی کے عالم میں تیرے حرماں نصیب والدین اور تیری سوگوار بیوی دمِ بخود و سربگریباں ہیں!

سرزمینِ بریلی کو تیرے وطن ہونے کا فخر تھا، لیکن اُس قریۂ ویران کے در و دیوار سے وحشت برسنے لگی ہے جب سے اے روحِ لطافت! تو نے منہ موڑا۔ اور وہ دیارِ درد جو تیری کافراوانی سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا تیرہ و تاریک ہے جب سے اے روحِ تمنا! تیری ضیا پاش ہستی وہاں سے رخصت ہوئی!

اُف رے! ہم حاشیہ نشینانِ مسندِ احقاد! تجھے اب کہاں ڈھونڈیں، اور کہاں پائیں؟

اے خاندان کے سرمایۂ صد نشاط! اور اے احباب کے وجہِ حیات!! کیا تیری نازک کلامی اور بذلہ سنجی جو تیرا اور صرف تیرا حصہ تھی اب قصۂ پارینہ ہو چکی؟ اور کیا ہم تمام عمر چشم براہ رہیں گے، اور تو کبھی نہ آئے گا؟ صد حیف یہ کیسا جاں گسل واقعہ ہے جس کی تکذیب کے لیے میں اپنی بہترین آرزوؤں کی قربانی کر سکتا ہوں۔

ہند کے صحائف مدتوں تیرے کلکِ گہر ریز کی جنبشِ جمیل سے دیباے مشجّر بنے، ملت کی سیکڑوں مجالس تیرے جذبات آفریں کلام سے ایک عرصۂ دراز تک مسحور و بیخود رہیں، اور دربارِ اردو کے شیدائیوں نے سالہا سال تیری نغمہ سرائی گوشِ حقیقت نیوش سے سنی۔

آہ! تو اب مٹی کے تودے کے نیچے محوِ خواب ہے، اور ہم مجروح و زار، خداے بزرگ و برتر تجھے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے، اور ہم تشنہ کامانِ محبت کو صبرِ جمیل۔

تیرا ایک ادنیٰ ترین پرستار

محمد عبد الشکور

# سفر حجاز کی مختصر رُوداد

(بسلسلۂ الناظر ماہ مئی)

**یکم جون روز جمعہ**

رابغ یا رابق قرب ساحل کی وجہ سے تجارتی منڈی بنگیا ہے۔ جدہ سے کشتیوں پر سامانِ تجارت یہاں آتا ہے اور وسطِ حجاز کے بدو قبائل میں تقسیم ہوتا ہے۔ یہاں کا بازار وسیع اور پٹا ہوا ہے جس میں عام ضرورت کی ہر چیز ملتی ہے۔ مکہ معظمہ سے رخصت ہونے کے بعد اب تک جہاں جہاں قافلہ ٹھہرا تھا وہاں کسی مستقل آبادی کے نشان نہ تھے۔ مگر یہاں بازار کے علاوہ مختصر سی مستقل آبادی بھی ہے جسکے خام مکانات دونوں جانب اور نیز کچھ فاصلہ سے ایک ٹیلہ پر بنے ہوئے ہیں۔ ایک جانب ایک سنگی مگر شکستہ قلعہ ترکی عہد حکومت کی یادگار ہے۔ بازار میں داخل ہونے سے پہلے ہی ایک مسجد ملتی ہے جس میں اگرچہ بلحاظ تعمیر مسجد کی کوئی خصوصیت نہیں نظر آتی لیکن اوقات نماز میں پانچوں وقت اذان ہوتی اور نمازیوں کا اچھا خاصہ مجمع ہو جاتا ہے۔ قافلے کے لوگوں کو عام طور پر مسجد کا پتہ نہیں چلا لیکن جن لوگوں کو سراغ مل گیا وہ مسجد تک پہونچ گئے۔ بازار کے ایک سرے پر قہوہ خانے بنے ہوئے ہیں اور ہر قسم کے اجناس کے علاوہ پکا ہوا کھانا اور روٹی وغیرہ بھی یہاں مل سکتی ہے۔ قربِ ساحل کی بدولت تازہ مچھلی بھی ملجاتی ہے اور شلجم، مولی، لیموں وغیرہ بھی نظر آئے۔ دوکانوں پر زیادہ تر تو اجناس ہی فروخت ہوتی ہیں اس لیے کہ بدوی زندگی کی سادگی نے ضروریاتِ زندگی کی تعداد کو اس قدر محدود بنا دیا ہے کہ دوسری عام اشیا کی مانگ بہت کم ہے، تاہم کپڑے، بساط خانہ اور عطاروں کی دوکانیں بھی یہاں موجود ہیں۔ میرے ہمراہیوں میں سے ایک صاحب کو پیچش ہوگئی تھی لیکن راستے میں کسی مقام پر کوئی دوا نہ مل سکی۔ یہاں اسبغول خریدا گیا تو ایک روپے میں غالباً دو تین تولہ سے زائد نہیں ملا۔ پھر بھی غنیمت معلوم ہوا کہ مل تو گیا۔

بدوؤں کا لباس بہت سادہ ہے۔ ایک لمبا کرتہ ستر پوشی کے لیے۔ ایک رومال کمر میں اور ایک سر پر۔ اور بعضوں کے پاس ایک اون کی عبا بھی ہوتی ہے جو کبھی کرتے کے اوپر زیب بدن کیجاتی ہے اور کبھی اونٹ کی پیٹھ پر بستر کا کام دیتی ہے۔ پائجامہ پہننا یا تہمد باندھنا بدوی معاشرت میں

ایک شدید بدعت ہے۔ اگرچہ شہروں میں آمد و رفت کی وجہ سے بعض ایسے بدو جن کو مسلسل اونٹ یا گھوڑے پر سوار رہنا پڑتا ہے کُرتے کے نیچے جانگھیا پہن لیتے ہیں۔ اسی سبب سے کپڑے کی دوکانیں زیادہ بارونق نہیں ہیں۔

بساط خانہ کا بھی یہی حال ہے کہ صابون، تباکو، دیا سلائی وغیرہ چند اشیاء کے سوا اور کچھ نہیں نظر آتا۔ ہر بدو مسلح رہتا ہے۔ کم سے کم ایک تیز چھری ہر شخص کی کمر میں کھنسی رہتی ہے، ورنہ تلوار یا بندوق یا دونوں ہوتی ہیں۔ بازار میں ایک شخص دو بندوقیں اور ایک سات نل کا طپنچہ فروخت کر رہا تھا۔ قیمت دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بہت کم قیمت پر بک رہی ہیں۔ ایک بندوق کی قیمت تقریباً بیس روپے دینا پڑتے۔

بازار کے عین وسط میں ایک بہت بڑا پختہ کنواں بنا ہوا ہے جس کا پانی اگرچہ دیکھنے میں بہت صاف و شفاف ہے مگر ذائقے میں بالکل تلخ۔ اس لیے قافلے والوں کے پینے کے لیے اُن چھوٹے چھوٹے کچے کنوؤں کا پانی آتا ہے جو بازار کے ایک سمت قبرستان سے قریب بنے ہوئے ہیں۔ ان کا پانی عموماً گندلا تھا اور کسی کسی کا میٹھا نکلتا ورنہ کچھ نہ کچھ کھاری پن موجود ہوتا جس کی وجہ سے کھانا پکانے میں سخت دقت واقع ہوئی۔ چونکہ رابغ میں ایک شبانہ روز کا قیام تھا اس لئے خیال تھا کہ کھانا اہتمام سے تیار ہو گا۔ مگر پانی کی خرابی نے سارا انتظام برباد کر دیا۔ دن بھر نہایت تیز ہوا چلتی رہی۔ اگرچہ ہوا میں تپش کم تھی مگر گرد اس قدر اڑتی تھی کہ الامان۔ شام کو دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہاں سے ڈاک جا سکتی ہے، اس لیے رات کو دیر تک خطوط لکھتا رہا۔ بمبئی سے جو بنڈل کے بنڈل موم بتیوں کے ساتھ لایا تھا اُن کی اب تک تو کوئی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ رات کو خط لکھنے کے واسطے روشنی کی ضرورت ہوئی تو موم بتیاں کام آئیں۔ اب چونکہ مٹی کا تیل ہر پڑاؤ پر ملتا ہے اس وجہ سے حجاج کو چاہیے کہ موم بتیوں کے بجائے ایک لالٹین ساتھ رکھیں۔ اور اس خیال سے کہ شدت کی حرکت یا ٹکرے سے ٹوٹ نہ جائے چمنی کے گرد تاروں کا جال بندھوا لیں۔ جن حاجیوں یا ہندوستانیوں کے پاس لالٹین تھی اُن کو بہت آرام ملا۔

ڈاک کا اہتمام یہاں یہ ہے کہ ایک دوکان پر تمام خطوط جمع کر دیے جاتے ہیں۔ ضرورت ہو تو وہیں کا غذ، لفافہ مول لیجیے۔ محصول ڈاک نقد جمع کرنا ہوتا ہے۔ اُس دوکان کا مالک گویا ڈاکخانے کے مہتمم صاحب کا

ایجنٹ ہے جن کا مستقر قلعہ میں بتایا گیا لیکن تلاش کے باوجود اُنکی صورت نہ دکھائی دی۔ ظاہر ہے کہ ڈاک کا یہ انتظام کچھ قابلِ اطمینان نہیں مگر اس خیال سے دل کو کسی قدر تسلی ہو گئی کہ خط بھیجنے کی ذمہ داری سے سبکدوشی تو حاصل ہوئی۔ مکتوب الیہ تک نہ پہونچے تو اسکے ذمہ دار کارکنانِ قضا و قدر ہیں۔

رات کو کافی ٹھنڈک رہی اس لیے خوب نیند آئی۔ مگر وسط شب میں دفعتہً چور چور کا غل ہوا۔ ہمارے ساتھ کے قافلے کی ایک عورت کا زیور رابغ کی منزل میں راستے سے اُڑ گیا تھا جسکی وجہ سے مترجم، جمالوں اور اُس قافلے کے حجاج کے درمیان مسلسل تکرار و بحث ہوتی رہی۔ اس رات میں ہمارے ایک ساتھی کی بھی ایک گٹھری غائب ہو گئی۔ راستے میں نگہبانی کے ذمہ دار تو جمال ہیں لیکن پڑاؤ پر نگہبانی کا فریضہ اُس جماعت پر عائد ہوتا ہے جو چوکیداری وصول کرتی ہے۔ اور ہمارے مترجم صاحب نے اطمینان دلایا کہ یہ لوگ مال تلاش کرکے یا تو واپس پر آپ کو مال دیں گے ورنہ اُسکی قیمت ادا کریں گے۔ سب جانتے تھے کہ یہ باتیں محض دفع الوقتی کی ہیں۔ مگر کرتے کیا۔ دنیا بامید قائم۔ غریب ظہور جس کا یہ سامان تھا صبر کرکے بیٹھ رہا۔

میرا نیا جوتہ چند ہی روز میں جواب دے گیا۔ پُرانا پہلی ہی منزل میں رخصت ہو گیا تھا۔ اس لیے اب مجھے فکر لاحق ہوئی۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ یہاں ایک موچی بھی ہے۔ مگر باوجود کوشش بلیغ اُس سے ملاقات نہ ہوئی۔ بالآخر بدوؤں کے پہننے کا ایک چپل خرید لیا گیا۔ بدو اس چپل کو پہن کر کس آسانی سے ریتلی اور پتھریلی زمین پر چلتا ہے۔ مجھے تو اسکو پہنکر چار قدم بھی چلنا مشکل ہوتا تھا۔ تاہم ضرورت نے اسی پر قناعت کرنے کے لیے مجبور بنا دیا۔

<u>۷۔ جون۔ روزِ شنبہ</u> رابغ میں عادت کے خلاف دونوں وقت گوشت کھایا تھا اس لیے صبح اُٹھتے ہی سوءِ ہضم کی شکایت محسوس ہوئی۔ غذا ہضم کرنے کے خیال سے دیر تک ٹہلتا رہا۔ چاشت کے وقت کچھ تھوڑا سا کھانا کھا کر روانہ ہوئے۔ رابغ سے نکلے تو دُور تک نخلستان میں اونٹ چلتے رہے۔ دوپہر ہوتے ہوتے ساحل سے بہت دُور ہو گئے تو دھوپ اور لُوہ کے تھپیڑوں سے سامنا رہا۔ رات کو عشا کے وقت مستورہ پہونچے۔ شغدف سے نیچے اُترے تو دیکھا کہ ساتھیوں کے اونٹ نہیں ہیں۔ خیال ہوا کہ پیچھے آ رہے ہونگے۔ جمال تو شغدف پھینک کر الگ ہو گیا۔ میں دیر تک انتظار کرتا رہا مگر ساتھیوں کے اونٹ نہ آئے اس لیے بہت پریشان ہوا۔ ادھر اُدھر ڈھونڈھنا چاہا مگر رات کا وقت اور چاروں طرف قطار در قطار

ت رکھے ہوئے - پتہ چلانا مشکل ہوا۔ بدشواری تمام تقریباً گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے تک پھرنے کے بعد
احب وغیرہ ملے - مترجم اور مقوم پر بہت کچھ اظہار غیظ و غضب کرکے میں نے چاہا کہ اپنے شقدف
ں اُٹھوا لاؤں لیکن اب اپنا شقدف تلاش کرنے میں سخت دشواری پیش آئی - مترجم صاحب جو
تھے آخر نیچ آکر واپس چلے گئے - میں نے تنہا گھوم پھر کر اپنا شقدف تلاش کیا اور اپنے ساتھی رحمت شاہ
پھر اُسی جگہ آیا جہاں میر صاحب تھے - شقدف مع کل سامان کے جمال کے پاس چھوڑا صرف بیگ
لے لیا کہ اُس میں اپنا اور سب ساتھیوں کا زر نقد تھا -

ن روز یکشنبہ | صبح سویرے اپنا شقدف بھی اُٹھوا لیا - مگر جمال کی اس حرکت کی وجہ سے رات کو
قدر زحمت ہوئی تھی اُس کا غصہ ہنوز باقی تھا - اور اس غرض سے کہ جمال آیندہ ایسی کارروائی
ے میں نے اُسکی مقررہ بخشش کے دینے میں تامل کیا - بالآخر مترجم نے درمیان میں پڑکر صفائی کرائی
ال سے پختہ وعدہ لیا گیا کہ اب کبھی میرا اونٹ ساتھیوں کے اونٹوں سے الگ نہ کریگا مستورہ
یک بڑی پختہ باؤلی بنی ہوئی ہے مگر اس کا پانی گندلا اور کھاری ہے - کہیں فاصلے سے میٹھا پانی
تا ہے مگر ہم لوگوں کو باوجود کوشش دستیاب نہ ہوا مجبوراً اسی پانی پر قناعت کی گئی لیکن وال
رہ گئی جسکی وجہ سے غریب رحمت شاہ کو پیچش شروع ہوگئی -

مستورہ میں بازار بھی بہت مختصر تھا - اگرچہ مدینۂ منورہ کے کھجور تازہ اور عمدہ ملے - میں بات کو
یوں کی تلاش میں بہت خستہ ہوگیا تھا اس لیے خلاف عادت بازار میں زیادہ نہ ٹھہرا اور تھوڑی
یں لیکر واپس آیا - تمازت آفتاب بھی مستورہ میں زیادہ محسوس ہوئی اور دوپہر نہ ہونے پائی تھی کہ
ت تیز لوہ چلنے لگی - جسکی وجہ سے میر صاحب کی طبیعت بدمزہ ہوگئی - خدا خدا کرکے ظہر پڑھ کر
نہ ہوئے -

بون روز دوشنبہ | مستورہ سے چلے تو گرمی اور ہوا کی تیزی سے پریشان تھے - راستہ میں اگرچہ
کا وہی عالم رہا مگر ہوا کا رخ بدلا ہوا تھا اس لیے لوہ سے زیادہ تکلیف نہ ہوئی - پانی کی خرابی
علاج کیا کہ ہر دفعہ پیاس کے وقت شربت گھولا جاتا - نماز فجر کے وقت بیر شیخ پہونچے - یہاں کا
ر بھی مستورہ کی طرح مختصر ہے - اور کنواں بھی صرف ایک ہے مگر اس کا پانی شیریں اور صاف ہے -
یہ ہ ر فی ٹین کے حساب سے دام کسی قدر گراں دینا پڑے - بیر کنویں کو کہتے ہیں - دن کو یہاں بھی

تپش اور لُوہ سے سامنا رہا۔ مگر خوش ذائقہ پانی نے گرمی کی تکلیف زیادہ محسوس نہیں ہونے دی۔ عصر پڑھکر روانہ ہوے۔ راستے میں خبر ملی کہ جو قافلہ ہم سے آگے روانہ ہوا تھا اُسے اگلے پڑاؤ پر بدوؤں نے روک لیا ہے۔ نصف شب کو ہمارا قافلہ بھی بیر حسانی پہونچ گیا۔

۵۔جون سہ شنبہ | صبح کو بعد نماز فجر حسب معمول بازار کی طرف گیا تو دیکھا کہ واقعی قافلے کا وہ حصہ جو ہم سے آگے تھا یہاں پڑاؤ کیے ہوے ہے۔ اب گویا پورا قافلہ ایک جگہ ہوگیا۔ یہاں کا بازار بہت فراخ و وسیع ہے۔ کچھ حصہ پٹا ہوا ہے اور کچھ ابتدائی پڑاؤ نکے مانند جھونپڑوں کی شکل میں ہے۔ ترکاری کے سوا اور سب چیزیں ضرورت کی ملتی ہیں۔ کنوئیں متعدد ہیں اس لیے پانی بہت ارزاں ہے اور ذائقہ بھی اچھا ہے۔ وادی فاطمہ کے بعد سے جو لوگ نہیں ملے تھے اُن میں سے بعضوں سے اب ملاقات ہوئی۔ جن بدوؤں نے قافلے کو روکا تھا اُن سے گفتگو کرنے کے لیے جمالوں کے سردار گئے ہوے تھے۔ دوپہر کو مترجم نے اطلاع دی کہ دو مجیدی فی شغدف دینا طے پایا ہے۔ کل قافلہ روانہ ہوگا۔ ہمارے قافلے کے ایک افغانی کا یہاں انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یوں تو ہر منزل پر کچھ نہ کچھ لوگ مرتے تھے مگر ہمیں کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ تجہیز و تکفین و تدفین کا کیا انتظام ہوتا ہے۔ افغانی ساتھی کے متعلق سارے انتظامات آنکھوں کے سامنے ہوے تو معلوم ہوا کہ قبر کھودنے کے لیے وہی تکروری جو مشکیں بھر بھر کر پانی بیچتے ہیں بلا لئے جاتے ہیں اور چند روپیوں کے خرچ سے سب کام نکل جاتا ہے۔ مکہ معظمہ میں سنا تھا کہ امیر کابل کے پیر صاحب بھی حج کے لئے آئے ہیں۔ مجھے اُنکی زیارت کا شوق تھا مگر وہاں کہیں پتہ نہ چلا۔ اور انتظامات سفر سے فرصت ہی کب ملی۔ وادی فاطمہ پر اُن کا خیمہ دکھائی دیا تھا مگر قبل اسکے کہ میں اُنکی خدمت میں حاضر ہوں وہ روانہ ہوگئے۔ یہاں اُن کا خیمہ نظر پڑا تو مغرب کے قریب میں بھی حاضر خدمت ہوا۔ آپ کا اسم گرامی حضرت شمس المشائخ بتایا گیا۔ جوان آدمی ہیں اور صورت سے عابد و مرتاض معلوم ہوتے ہیں۔ نقشبندی ہیں۔ کچھ دیر اُن سے گفتگو رہی۔ معلوم ہوا کہ اُنھوں نے اپنے بدوؤں سے طے کرلیا ہے کہ مدینہ منورہ میں دس روز قیام کریں گے۔ ............

............ اُنکے ہمراہ سترہ اٹھارہ اونٹ تھے اور داعیوں کی ایک جماعت ہر وقت اُنکو گھیرے رہتی تھی۔ ایک سفری پلنگ بچھا ہوا تھا اور خیمے میں دریوں اور قالین کا فرش تھا۔ جنکو دیکھکر یہ خیال بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ عالتِ سفر میں ہیں۔ مغرب کے

وقت جماعت کے ساتھ نماز پڑھی۔ امامت ایک دوسرے صاحب نے کی جو مقرب خاص معلوم ہوتے تھے۔ جب ہمارے افغانی ساتھی کے دفن کا وقت آیا تو اُنکو اطلاع دی گئی۔ اُنکی جماعت کے اکثر لوگ آکر نماز جنازہ میں شریک ہوے اور اپنے افغانی بھائی کو اخیر منزل تک پہونچا آئے۔

۶۔ جون روز چہارشنبہ | ہمارے قافلہ کا کچھ حصہ بیر شیخ میں یہ سنکر ٹھہر گیا تھا کہ بیر حسانی میں قافلہ روکا گیا ہے۔ آج وہ بھی اُس قافلہ سے آ ملا۔ میر صاحب کا جو سامان اُنکے جمال کے کوتل اونٹ پر بندھا رہتا تھا اُس میں ایک ٹین گھی کا بھی تھا۔ یہ کسی صورت سے ٹوٹ گیا اور سارا گھی بہ گیا۔ بیر حسانی میں جب اس سے آگاہی ہوئی تو میر صاحب بہت پریشان اور اپنے جمال سے ناخوش ہوے۔ مگر کرتے کیا۔ بازار میں بہت تلاش کیا کہیں گھی نہ ملا۔ ۲ مجیدی فی شغدف کے حساب سے بدوؤں کی نذر کرکے بیر حسانی سے بعد ظہر روانہ ہوے۔ قافلہ میں بعض لوگ اس زائد خرچ کے متحمل نہ ہوسکتے تھے اس لیے اُنھوں نے اپنے شغدف یہیں چھوڑ دیے اور اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہوے۔ خالی اونٹوں سے جن پر شغدف یا شبری نہ ہو بدو کچھ نہیں لیتے۔ نصف شب کے بعد ایک تنگ وادی میں جسکے دونوں جانب بلند پہاڑیاں ہیں قافلہ ٹھہرا تو معلوم ہوا کہ آج بھی میرا اونٹ ساتھیوں سے الگ ہو گیا ہے۔ جمال پر غصہ تو بہت آیا مگر میدان کی تنگی اور راستے کی ناہمواری کی وجہ سے مستورہ کی طرح یہاں اس کا موقع نہ تھا کہ ساتھیوں کو تلاش کرتا اس لیے مجبور ہوکر رات وہیں بسر کی۔ اس مقام کا نام شفاعیہ یا شفعیہ بتایا گیا۔

۷۔ جون روز پنجشنبہ | صبح کو مترجم نے کہدیا کہ میر صاحب کے جمالوں کا مکان یہاں سے قریباً ایک دوسری سمت میں ہے اور وہیں وہ چلے گئے ہوں گے۔ اس لیے تلاش بے سود سمجھی گئی۔ یہاں کوئی بازار بھی نہ نظر آیا اس وجہ سے کھچڑی پر قناعت کی۔ مگر کھانا کھا کر جب میں نکلا تو قریب ہی میر صاحب کے شغدف مل گئے۔ راستہ ایسا تنگ تھا کہ شغدف وہاں نہ لایا جا سکتا تھا اس لیے خاموش ہو رہا۔ اور جمال کو بخشش دینے سے قطعاً انکار کر دیا۔ عصر کے بعد قافلہ روانہ ہوا تو ایک بلند پہاڑی پر چڑھنا پڑا۔ جب پہاڑی سطے کرکے سطح میدان میں تھوڑی دیر چلے ہونگے تو یہ اطلاع ملی کہ آگے بدو راستہ روکے پڑے ہیں۔ ناچار کچھ دیر رُکے رہنے کے بعد قافلہ پھر اپنی جگہ پر واپس آیا۔ اب سب ساتھی پھر یکجا ہو گئے۔ اور رات وہیں بسر ہوئی۔ مترجم نے بہت کچھ گفت و شنید کے بعد کچھ روپے مجھ سے قرض لیکر بدوؤں کو دیدیے۔

۸۔ جون روز جمعہ | آج معلوم ہوا کہ عوفیوں کے قبیلہ نے ساڑھے پانچ مجیدی فی شغدف طلب کیے

ہیں۔ دن میں اور قافلہ والوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ خصوصاً حیدرآباد کے قافلہ میں ہمارے لکھنؤ کے ایک کرم فرما تھے اُن سے ملا۔ حیدرآباد کے قافلہ سالار ایک تونسی عرب تھے۔ وہ بہت اخلاق سے ملے۔ چائے پلائی۔ اور بہ اصرار کہا کہ جس قسم کی ضرورت ہو بے تکلف کہیے۔ رقم مطلوبہ ادا کرکے بعد نماز ظہر روانہ ہوئے۔ پہاڑی طے کرکے جب سطح میدان میں آگئے تو میرے جمال نے پھر اونٹ کو ساتھیوں کے اونٹ سے جدا کرکے اُن جاویوں کے اونٹوں سے جا ملایا جو اُسکے دوسرے اونٹوں پر سوار تھے۔ مجھے یہ امر بہت ناگوار گذرا کہ مستورہ میں اور پھر شعیبہ میں پختہ عہد و پیمان ہو جانے کے باوجود جمال نے مجھے میرے ساتھیوں سے جدا کر دیا۔ چونکہ دن کا وقت تھا اس لیے مجھ کو فوراً خبر ہوگئی۔ اب میں نے اپنے جمال کے خلاف ستیاگرہ کرنے کا ارادہ کرلیا۔ میرے ساتھی رحمت شاہ کو چونکہ ابر پیچش ہو رہی تھی اس لیے اُنھیں تو میں نے اُترنے کا مشورہ نہیں دیا مگر میں خود اونٹ سے اُتر پڑا۔ اور اپنے ساتھیوں کے اونٹوں کے پاس پہونچ گیا۔ مترجم اور جمال دونوں نے بہت اصرار کیا لیکن میں نے کہا کہ مجھ کو پیدل چلنا گوارا ہے مگر اپنے ساتھیوں کا ساتھ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ بالآخر جمال کو اپنی ضد چھوڑ کر اونٹ وہیں لانا پڑا اور میں پھر سوار ہوکر روانہ ہوا۔

تھوڑی دیر کے بعد جمال نے پھر اونٹ کو جدا کر دیا۔ میں پہلی دفعہ پیدل چلنے کی وجہ سے بہت تھک گیا تھا اس لیے چپ ہو رہا۔ کچھ وقفہ کے بعد عصر کی نماز کے لیے اونٹ سے اُترا اور نماز پڑھکر جب دوبارہ اونٹ پر سوار ہونے لگا تو عجیب اتفاق ہوا۔ ہمارا اونٹ ذرا رُکا، جس سے آگے والے اونٹ کو بھی جس پر جاوی سوار تھے رُکنا پڑا۔ وہ اونٹ بدمزاج تھا، اس لیے بگڑ گیا۔ اور ایسا بگڑ کر باوجود جمال اور اُسکے بھائیوں کی کوشش کے قابو میں نہ آیا اور قافلہ سے الگ ہوکر اُس نے شغدف کو گرا دیا جس سے اُن جاویوں کے سخت چوٹ آئی جو اُس پر سوار تھے۔ اس پر جمال اور اُسکے بھائی مجھ سے بہت بگڑے اور غصہ میں بہت کچھ سخت و سُست کہا۔ اور ایک نے تو تلوار نیام سے ذرا باہر کرکے مجھے دھمکایا۔ جاویوں کے جو مترجم صاحب تھے وہ بھی طیش میں آکر میری طرف دوڑے کے آئے اور لگے سخت کلامی کرنے۔ تو میں نے اُن کو اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی میں ڈانٹا۔ اور کہا کہ آپ اپنی راہ لیں مجھ سے کچھ آپ کا تعلق نہیں ہے۔ آخر اُنکے ہوش درست ہوگئے تو وہ جمالوں پر خفا ہوئے اور اُنھیں مجبور کیا کہ میرے اونٹ کو کھول کر میرے ساتھیوں کے اونٹوں کے ساتھ ملا دیں۔

مغرب کے بعد قافلہ پھر رکا - میر صاحب کا اونٹ ذرا آگے تھا اُنھوں نے مجھے بلوایا اور مقوم کا یہ پیام سنایا کہ دو مجیدی فی شغدف یہاں راستے میں بدووں کا امیری قبیلہ طلب کر رہا ہے۔ میں اسکو مقومین کی شرارت سمجھتا تھا، کیونکہ مانگنے والا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ اسلیے میں نے رقم دینے میں عذر کیا۔ جس پر مقوم صاحب آئے اور اُنھوں نے کہا کہ جو رقم نہ دے گا اُس کا شغدف یہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ میں نے کہا کہ اچھا آپ میرا شغدف یہیں چھوڑ دیجیے مگر میرے پاس مجیدیاں نہیں ہیں اور یہ واقعہ تھا کہ شفعیہ میں مجیدیاں دیدینے کے بعد اب میرے پاس کوئی مجیدی باقی نہیں رہی تھی۔ بہرحال میر صاحب نے ہم سبھوں کی طرف سے مجیدیاں دیدیں - عشا کے اول وقت کچھ فاصلہ پر روشنی دکھائی دی تو ہم سمجھے کہ منزل آگئی - مگر کہیں دو تین گھنٹے کے بعد تراع یا تراو پہونچے۔ معلوم ہوا کہ ہم بلندی پر تھے اور تراو نشیب میں تھا اس لیے روشنی دُور سے دکھائی دینے لگی تھی۔

۹ - جون روز شنبہ | صبح کو حسب معمول بازار کی طرف رُخ کیا - یہاں کوئی باقاعدہ بازار اگرچہ نہیں ہے تاہم ایک جانب بلندی پر بہت سی دوکانیں نظر پڑیں - کنواں یہاں ایک ہی ہے اس لیے پانی گراں ملا - رحمت شاہ کو پیچش کی شکایت تو کئی روز سے تھی لیکن یہاں پہونچکر تکلیف بڑھ گئی۔

دن بھر خوب گرمی رہی اور لو بھی چلی - کچھ قافلہ بیر عباس میں ٹھہرا ہے جو تراو سے شاید کوس بھر کے فاصلہ پر ہوگا - ہمارا جمّال عبد الرحمٰن کل سے جو بگڑا ہے تو اُس نے نہ شام کو معمول کے مطابق کھانا لیا اور نہ آج دوپہر کو آیا - کھانا نکال کر اُسکے لیے رکھدیا گیا - اُس نے اپنے بھائی کو بھیجا - مگر جب اُس سے کہا گیا کہ عبد الرحمٰن کو بھیجدو یا اپنے برتن لاؤ تو وہ بھی جا کر بیٹھ رہا - مجھے تمبا کو پینے اور کھانے کی عادت دیرینہ ہے - حقہ یا چرٹ کا استعمال کیے بغیر قبض ہو جاتا ہے - اس واسطے برسوں کا معمول ہے کہ صبح کو لازماً تمباکو پیتا ہوں - البتہ جیل میں یہ تجربہ ہوا کہ دماغی محنت نہ کرنا ہو یا کم پڑے اور مشقی یا ورزش کرنے کا موقع ملے تو پھر تمباکو کی حاجت نہیں - چنانچہ فتح گڈھ جیل میں باوجود سرکاری اجازت اور سامان کی موجودگی کے میں نے تقریباً ڈیڑھ سال تک حقہ نہیں پیا - بمبئی سے روانہ ہوتے وقت میں نے کئی بکس چرٹ کے لے لیے تھے - جو جہاز پر اور مکہ معظمہ میں برابر استعمال کرتا رہا - جب مدینہ منورہ کی روانگی کا وقت آیا تو میں نے تہیہ کیا کہ اس سفر میں چرٹ یا سگریٹ کا استعمال نہ کروں گا - مگر بعد کو اس خیال سے کہ بدو سگریٹ کے عادی اور شائق ہیں میں نے اپنے بدو کے لیے ایک پاؤنڈ

تمباکو اور سگریٹ بنانے کا کاغذ لیکر رکھ لیا۔ راستہ میں برابر عبدالرحمٰن اور اُسکے بھائیوں کو تھوڑا تھوڑا دیتا رہا۔ یہاں عبدالرحمٰن تو نہیں مگر اُسکا بھائی عبدالصبیر تمباکو مانگنے آیا تو میں نے کہا کہ کل تو تم لوگ مجھے گالیاں دے رہے تھے آج تمباکو مانگنے آئے ہو؟ اس پر وہ مایوس ہو کر چلا گیا۔ شام کو کچھ قافلہ اور آکر اُترا اور یہ خبر معلوم ہوئی کہ ان لوگوں کو بیر حسانی سے اس وقت تک کل ۸ مجیدیاں فی شغدف دینا پڑیں۔ جن میں سے تین ابھی مقوموں کے پاس جمع ہیں جو یہاں دی جائیں گی۔ حالانکہ ہم ۹½ مجیدیاں فی شغدف دے چکے تھے یہ بھی سننے میں آیا کہ دو جاویوں کو راہ میں مجیدیاں نہ دینے کی بنا پر بندوق سے مار دیا۔

۱۰۔ جون روز یکشنبہ | آج صبح کو ضیاء الاسلام صاحب کو تلاش کیا۔ اُنھوں نے کہا تھا کہ اُن کے پاس دواؤں کا کافی ذخیرہ ہے اور کچھ طبابت میں بھی اُنکو دخل ہے۔ جب وہ نہ ملے تو حیدرآبادی قافلہ میں جا کر حکیم غلام احمد مدنی کو جو اُس قافلہ کے طبیب تھے لایا اور رحمت شاہ کو دکھایا۔ ضیاء الاسلام صاحب کی تلاش میں مختلف پڑاؤں پر جانا پڑا۔ کل جو نیا قافلہ آیا تھا اُس میں بعض میرے جہاز کے بنگالی ہمراہی بھی تھے جن سے اب ملاقات ہوئی۔ وہ بیحد پریشان و مضطرب نظر آئے بہت سمجھایا بجھایا تب اُنکی تسلی ہوئی۔ حکیم صاحب نے صبح کو ایک دوا دی تھی مگر کچھ نفع نہ ہوا۔ شام کو دوسری دوا دی۔ مگر رات بھر غریب کو دست آتے رہے اور سخت اُلجھن رہی۔

۱۱۔ جون روز دوشنبہ | آج حکیم صاحب نے رحمت شاہ کو پھر دیکھا۔ اب اُنکو بخار تھا۔ مگر حکیم صاحب نے غسل تجویز کیا۔ اور دوا بدل دی۔ غسل کے بعد سے رحمت شاہ کی طبیعت کچھ سنبھلی۔

بدو کا مزاج خدا خدا کر کے اب درست ہوا۔ تو اُس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ دو دن کے کھانے کی قیمت دی جائے۔ مگر یہ خلافِ انصاف تھا اس لیے اُس نے اپنا مطالبہ ترک کر دیا۔ اور دونوں وقت کا کھانا لیکر راضی ہو گیا۔ جسکے بعد پھر ہمارے تعلقات دوستانہ ہو گئے۔ لوگوں سے معلوم ہوا کہ قبیلۂ ظواہر کے لوگ ایک ایک مجیدی فی شغدف پر راضی ہو گئے ہیں مگر احمدی قبیلہ سے ابھی تک کچھ تصفیہ نہ ہو سکا۔ اس لیے ابھی قیام رہے گا۔ وادی فاطمہ اور بیر حسانی پر ایک ایک روز زیادہ ٹھہرنا ہی کچھ کم ناگوار نہ گذرا تھا کہ نہ صرف منزل مقصود پر پہونچنے میں دیر ہو رہی تھی بلکہ میری تمنا یہ تھی کہ آستانۂ رسالت پناہیؐ پر ایک ماہ تک حاضر رہوں۔ اور جتنی دیر راہ میں ہوتی تھی اُسی قدر میری حاضری

کے دنوں میں کمی ہونے کا احتمال تھا۔ اس وجہ سے مجھ پر یہ تاخیر بہت شاق تھی۔ مگر بے بس تھا۔ قافلہ
میں ایک ہنگامہ ہوگیا: جس کی وجہ سے بدوؤں میں عجب شور و غوغا رہا۔ کنوئیں پر جو تکروری (حبشی)
پانی بھرتے تھے اُن سے اور ایک جمال سے کسی بات پر تکرار بڑھی۔ زبانی تو تو میں میں کے بعد مار پیٹ کی
نوبت آگئی۔ یہاں تک کہ ایک بدو کی تلوار نے اُس تکروری کو واصل بحق کر دیا۔ بہت سے بااثر
بدوؤں اور مقوموں کے درمیان میں پڑنے سے اُسوقت تو تصفیہ یہیں ختم ہوگیا مگر رفتہ رفتہ یہ خبریں
گشت کرنے لگیں کہ تکروریوں کی جماعت کثیر انتقام لینے کے منصوبے کر رہی ہے۔ اب جہاں دیکھیے
کچھ لوگ بیٹھے اسی کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ جمالوں کی ٹولیاں الگ اسی مبحث پر بحث و گفتگو میں مصروف
ہیں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ جذبات انتقام زیادہ اُبھرتے نہ پائے اور پھر کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔
اتفاق سے آج میری طبیعت بھی کسی قدر بد مزہ رہی۔ کھچڑی ذرا کچی رہ گئی تھی۔ شام کو
حیدرآبادی قافلہ میں اپنے لکھنؤ کے کرم فرما فقیر محمد خاں صاحب کے پاس گیا تو اُنکے ایک دوست
نے فروٹ سالٹ اور ست لیموں کا شربت پلا دیا۔ جس سے طبیعت ٹھیک ہوگئی۔

۱۲۔ جون، روز سہ شنبہ | آج اطلاع ملی کہ پندرہ مجیدی فی شقدف یہاں دینا ہوں گے جن میں سے
ایک مجیدی قبیلۂ ظواہر کی جس کی خبر کل ملی تھی، ۱۳ مجیدیاں احمدیوں کے لیے اور ایک امانتاً مقوم
کے پاس رہے گی کہ راستے میں بیر درویش اور مدینۂ منورہ کے درمیان کے بدوؤں کو دی جائے۔ ہم لوگوں
کے پاس نہ اب مجیدیاں باقی تھیں نہ روپے۔ حیدرآباد کے قافلہ سالار عبداللطیف تونسی نے تصفیہ میں
چونکہ یہ کہا تھا کہ روپیہ کی حاجت ہو تو ہم قرض دیدیں گے۔ اس لیے اُن سے صورت حال بیان کی
مگر اُنکے پاس صرف دو اشرفیاں نکلیں، جن سے ہمارا کام نہیں نکل سکتا تھا۔ مجبوراً جمالوں کی جو اشرفیاں
مکہ معظمہ سے روانگی کے وقت ہمارے معلم کے وکیل عبدالرحمن بتناس نے امانتاً میر صاحب کے پاس
رکھا دی تھیں اور جو انھیں مدینہ منورہ پہونچکر دینا تھیں اُنکو بھنا کر دس مجیدی فی گنی کے حساب سے
لیں اور مقوم کے حوالہ کیں۔ ہمیں تبادلہ کے اس نرخ سے بہت نقصان پہونچا مگر کیا کرتے سوا اسکے
کوئی چارہ نہ تھا۔ اور جتنے ملنے والے تھے وہ اس قافلہ میں نہ تھے۔ رحمت شاہ دوپہر تک اچھے
رہے۔ پھر رفتہ رفتہ اُلجھن بڑھنے لگی اور شام تک بدحواسی بہت بڑھ گئی حتیٰ کہ نصف شب کے
بعد اچھی خاصی سرسامی حالت ہوگئی اور بیہوشی کے عالم میں وہیں بستر پر دست آتے رہے۔ اُن کی

اس حالت کی وجہ سے رات بھر ہم لوگ سخت پریشان رہے اور میں تو بالکل نہ سو سکا۔
۱۲- جون روز چہارشنبہ | آج سورت کے ایک حکیم صاحب کو بُلا کر لایا۔ اور حضرت شمس المشائخ سے جا کر اس پریشانی کا ذکر کیا تو اُنھوں نے ایک تعویذ مرحمت فرمایا۔ حکیم صاحب نے بلطف دوا بھی عنایت کی۔ صبح کو غسل کے بعد سے رحمت شاہ کی طبیعت ذرا ٹھہری ہوئی تھی۔ مگر جیسے جیسے دھوپ بڑھتی گئی طبیعت بگڑتی گئی۔ بعد ظہر جب قافلہ روانہ ہونے لگا تو وہ شقدف سے باہر نکلے اور بیدم ہو کر زمین پر لیٹ گئے۔ منہ میں پانی ٹپکانے سے کچھ طبیعت اُبھری تو کئی آدمیوں نے مل کر اُنکو بمشکل شقدف پر سوار کیا۔ قافلہ روانہ ہوا اور عصر کے وقت بیر عباس پہونچ کر رُک گیا۔ اب جو شقدف سے رحمت شاہ کو اُتارنا چاہا تو اُنکی حالت متغیر نظر آئی۔ لہذا اونٹ کو بٹھا کر شقدف وہیں کھلوا دیا گیا۔ اور میں ضیاء الاسلام صاحب کی تلاش میں دوڑا گیا۔ وہ ملے تو بہت متاسف ہوئے۔ مگر اب اُنکے پاس دواؤں کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا اس لیے کہ سولہ سترہ دن میں کثرت لوگ بیمار ہوئے اور وہ ہر اُس شخص کو جو اُن تک پہونچا برابر دوا دیتے رہے تھے۔ بہرحال اُنھوں نے تھوڑا سا جوہر مہرہ دیا کہ اسکو پلانے سے طبیعت اُبھر آئے تو پھر علاج کی فکر کی جائے۔ لیکن بمشکل چند قطرے حلق سے اُترے ہونگے کہ روح نے قالب خاکی سے جدائی اختیار کی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میرے لیے یہ تمام دن کلفت و پریشانی کے تھے۔ لیکن جب تک امیدِ حیات باقی تھی باوجود اپنے ضعف و بے سروسامانی کے جو کچھ بن پڑا کرتا رہا۔ مگر خدا کی حکمتوں کو کون جان سکتا ہے۔ ہمارے مختصر قافلہ میں متعدد ایسی ضعیف، ناتوان، اور مریض عورتیں تھیں جنکو حرکت کرنا مشکل تھی اور معمولی حاجات ضروریہ کے رفع کرنے کے لئے دوسروں کی مدد درکار ہوتی تھی۔ مگر موسم کی سختیاں سفر کے صعوبات سب کچھ جھیل گئیں۔ اور یہ نوجوان جو اپنی جسامت اور توانائی کے لحاظ سے ایسا نمایاں تھا کہ جہاز پر اور نیز اس سفر میں ہر شخص کی نگاہ اس پر پڑتی تھی آٹھ روز کے اندر ختم ہو گیا۔ العظمۃ للہ۔ میری ہمت نے اگرچہ فی الواقع اب جواب دیدیا تھا لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اپنے رفیق کی لاش کو ساتھیوں کے سر چھوڑ کر میں مطمئن رہتا۔ لہذا پھر ہمت باندھ کر تجہیز و تکفین کے لیے اُٹھا۔ ضیاء الاسلام صاحب جس قافلہ میں تھے اُسی میں ہمارے اودھ کے کچھ لوگ تھے جن میں دو ایک حجام بھی تھے۔ اُنکو بلا کر غسل دلوایا۔ ایک تکروری نے قریب ہی قبر کھودی۔ ساتھیوں میں سے مبین خان نے کفن عنایت کیا۔ اور بالآخر عشا کے بعد غریب رحمت شاہ کو سپرد خاک کر دیا۔

# نظرے خوش گذرے

ایک عزیز اطلاع دیتے ہیں کہ رسالہ "زمانہ" بابت ماہ مئی ۱۹۲۳ء میں اعظمی صاحب نے جو تنقید حضرت احسن مارہروی کی کتاب تضمین پر لکھی ہے اُس میں ایک غلطی یہ کی ہے کہ کتاب کے شروع میں جو مقدمہ ہے اُسکو بھی احسن صاحب کا نتیجۂ طبع سمجھا - حالانکہ دراصل وہ جناب منشی امیر احمد علوی بی اے کا ایک مضمون تھا جو مدت گذری احسن صاحب کے رسالۂ فصیح الملک میں شایع ہوا تھا - اور اسکی صراحت تضمین میں کردی گئی ہے - ایڈیٹر صاحب کو اعتراف کرنا چاہیے کہ تنقید نگار صاحب سے ایک بڑی فروگذاشت ہوگئی ہے - مگر یہ زیادہ حیرت انگیز نہیں - لاہور کے ایک رسالہ نے جس کا جوشِ شباب ہر مہینہ نئے نئے رنگ میں جلوہ افروز ہوتا رہتا ہے حال ہی میں فنِ تنقید میں ایک نئے اجتہاد کی طرح ڈالی ہے - یہ رسالہ چشم بد دور وائسرائے ہند، گورنران صوبہ، اور والیانِ ریاست کی طرح ایک وسیع "اسٹاف" رکھتا ہے - جسکے ارکان کے اسمائے گرامی ہر ماہ رسالہ کے سرورق پر صف آرا کیے جاتے ہیں - مئی کے پرچہ میں انکی تعداد بشمول اسسٹنٹ ایڈیٹر حصۂ نسواں نصف درجن ہے اور پھر بھی ایک جگہ خالی رہ گئی ہے - اگر کوئی صاحب اپنا نامِ نامی درج کرانا چاہیں تو ہم اپنے معاصر سے بخوشی سفارش کرنے کے لیے تیار ہیں کہ جب تک کوئی دوسرا مستحق امیدوار نہ پیدا ہو نقطوں کی جگہ ان صاحب کا نام درج کردیا جائے -

اسی پرچہ میں ایک فاضل جائنٹ ایڈیٹر صاحب نے جو ماشاءاللہ "ایم اے، ایل ایل بی وکیل" سب ہی کچھ ہیں، شذرات کے زیرِ عنوان "تاریخ عرب مصنفہ موسیو سیدیو" پر سطور ذیل میں اپنی رائے گرامی، "ریویو" یا تنقید تحریر فرمائی ہے :-

"ہم اپنے معزز و ممتاز ہمعصر جناب ظفر الملک علوی ایڈیٹر "الناظر" لکھنؤ کے نہایت مشکور رہیں کہ آپ نے کتابِ مستطاب کی ایک جلد: تمدن ہند عطا فرمائی - اسے ایک فرانسیسی محقق ڈاکٹر گستاولی بان کی اصل تصنیف سے شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی مرحوم ایم اے - جیسے فاضل ہندی عالم نے ترجمہ کرکے تمدن ہند نام رکھا ہے - ہمارے خیال میں ایسی جامع کتابیں آج تک بہت کم لکھی گئی ہیں - یہ ایک آئینہ ہے جس میں ہندوستان کی تاریخ قدیم و جدید ایک مجسم صورت میں نظر آتی ہے

قیمت قسم خاص مجلد جری سات روپئے آٹھ آنہ ہے- اور قیمت عام مجلد پانچ روپیہ ہے - الناظر بک ایجنسی لکھنؤ سے دستیاب ہوگی"

اس تحریر میں صرف ابتدائی اور آخری سطریں اُس کتاب سے تعلق رکھتی ہیں جس پر اظہار رائے کیا گیا ہے، باقی ساری عبارت "ایک آئینہ ہے" جس میں ہمارے معزز معاصر کے عہد شباب کی شوریدگی و بدمستی "مجسم صورت میں نظر آ جاتی ہے"۔ رسالہ کے سرورق پر اگر فارسی کا یہ شعر بھی لکھ دیا جائے تو بہت مناسب حال ہوگا :

ساقیا مرنج از من، عالم جوانی ہاست　　گہ خم سبو بر سر، گہ بہ پائے خود رقصم

---

مئی کے الناظر میں صفحہ ۱۶ پر حضرت تپش خورجوی کی ایک غزل تھی جس کا ایک مصرعہ یہ تھا

کرتا ہوں تصور میں شغل زلف سے تیری

شغل میں غین کی حرکت کے متعلق ایک صحبت میں گفتگو آئی تو متعدد سخن سنج و سخن فہم احباب نے اسکو غلط بتایا - پرچہ چھپ چکا تھا لہذا اشتہار کے صفحات میں جگہ نکال کر ایک نوٹ لکھدیا گیا۔ تپش صاحب نے اُس نوٹ کو ملاحظہ فرما کر غیاث اللغات کا حوالہ دیا۔ غیاث اللغات کے علاوہ صراح بھی اُن کے دعوے کی موید ہے۔ اور ہم اس سند کو کافی سمجھتے ہیں۔ لیکن تپش صاحب غالباً اسے تسلیم کریں گے کہ یہ صورت نامانوس ہے اور اساتذۂ اُردو نے غین کی حرکت کو پسندیدہ نہیں سمجھا۔ اگر وہ اساتذہ کے کلام سے بھی کوئی سند پیش کر سکیں تو بہتر ہے - جن احباب نے شغل کی حرکت کو غلط بتایا تھا اُنکی رائے بھی معلوم ہونا چاہیے -

---

لکھنؤ میں جو انجمن اُردو بنائی گئی ہے اُسکے متعلق الناظر کے کسی نمبر میں اپنے معروضات پیش کر چکا ہوں۔ اُسکے بعد انتخاب عہدہ داراں کی منزل آئی اور جس بات کا ابتدا ہی سے اندیشہ تھا وہی ہوا یعنی ایسے اشخاص کا انتخاب کیا گیا جو اس کام کو انجام نہیں دے سکتے تھے۔ شمس العلما مولوی کمال الدین ایم اے پروفیسر عربی لکھنؤ یونیورسٹی بہت واجب الاحترام ہیں مگر انجمن اُردو کی معتمدی کے لیے موزوں نہ تھے۔ اسی طرح جناب عبداللہ یوسف علی آئی سی ایس انگریزی کے مشہور ادیب ہیں مگر انجمن اُردو کی صدارت کے لیے اس سے زیادہ کی ضرورت ہے۔ بہرحال شمس العلما صاحب ترقی پا کر اپنے وطن مشرقی بنگالہ میں پہونچ گئے ہیں اور اب اُنکی جگہ ہمارے شہر کے فاضل ادیب جناب مرزا محمد عسکری بی اے کا انتخاب عمل میں آیا ہے - صاحب موصوف ایک خاموش کام کرنیوالے بزرگ ہیں اس لیے اُمید ہے کہ بہت جلد انجمن اردو اُنکی توجہ سے ایک کام کی مجلس بن جائے گی -

# الناظر کا مستقبل

جون کے الناظر میں جو معروضات پیش کیے گئے تھے خدا کا شکر ہے کہ بے نتیجہ نہیں ثابت ہوے اور قدردانانِ الناظر میں سے متعدد اصحاب نے فوراً توجہ فرمائی - چنانچہ اعدادِ ذیل سے اُن کے مساعیِ جمیلہ کا اندازہ ہوجائے گا :-

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| ۱ - | مولوی سید ہاشمی فریدآبادی | نے اب تک | ۳ خریدار | دیے ہیں |
| ۲ - | مولوی محمد مسلم عظیم آبادی | " | ایک | " |
| ۳ - | مولوی عبدالماجد دریابادی | " | ۲ | " |
| ۴ - | نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی | " | ۳ | " |
| ۵ - | منشی یوسف علی قدوائی سندیلوی | " | ۲ | " |
| ۶ - | منشی محمد ظفر وکیل گرگانوہ | " | ۴ | " |
| ۷ - | مسٹر ظفر عمر بی اے | " | ۵ | " |
| ۸ - | مولوی محمد سلیمان رئیس بدایوں | " | ۴ | " |
| ۹ - | قاضی غلام امیر مختار بدایوں | " | ۱ | " |
| ۱۰ - | مسٹر سلطان حیدر جوش | " | ۷ | " |
| ۱۱ - | مولوی معشوق حسین خاں | " | ۱۲ | " |

اور اُمید ہے کہ آیندہ اور نام بھیجیں گے -

انکے علاوہ مولوی محمد حبیب اللہ ایم اے ، جناب عزیز لکھنوی ، مسٹر بدرالحسن ردولوی ، سید اظہر علی ایم اے دہلوی ، وامق بدایونی ، قاضی تلمذ حسین ایم اے نے خریدار فراہم کرنے کا وعدہ کیا ہے - لیکن ابھی بہت سے اصحاب کی توجہ اس طرف منعطف نہیں ہوئی ہے - خصوصاً اُن حضرات سے خاص توجہ کی استدعا ہے جنھوں نے الناظر کے ابتدائی دور میں اسکے ساتھ گہری دلچسپی کا اظہار فرمایا تھا -

ناظرین الناظر کو مخاطب کرنے کے علاوہ میں نے ایک گشتی عریضہ اُن معاصرین کرام اور قلمی معاونین کی خدمت میں بھی بھیجا تھا جو الناظر کو سالہا سال سے مطالعہ فرماتے رہے ہیں - ان اصحاب سے الناظر کے متعلق اُن کی رائے گرامی دریافت کی گئی تھی اور نیز مشورہ طلب کیا گیا تھا کہ الناظر کو بہتر اور مفید تر بنانے کے لیے کیا مزید فکر کرنا چاہیے - بعض اصحاب نے مصلحتاً یا اتفاقاً جواب نہیں لکھے - مگر اکثر اصحاب کے جوابات وصول ہوئے اور دو صاحبوں نے میرے اُس خانگی مراسلہ کو اپنے اخبارات میں بھی شائع کر دیا - سب صاحبوں نے الناظر کو قائم رکھنے کی ضرورت ظاہر کی، بعض نے اسکی خدمات کو میری توقعات سے بہت زیادہ سراہکر حوصلہ افزائی فرمائی، بعض نے مناسب نکتہ چینی فرماکر مفید اور کارآمد مشورے دیے - اور ایک صاحب نے جو الناظر کی ایک تنقید سے صدرجہ بیزار ہیں الناظر کے وجود کو قطعاً ناقابل برداشت قرار دیا - میں ان سب اصحاب کا بہ دل ممنون ہوں اور متوقع ہوں کہ جن حضرات نے اب تک جواب نہیں بھیجے ہیں وہ اب توجہ فرمائیں گے -

احباب کی ہمدردی و توجہ نے الناظر کو قائم رکھنے اور پہلے سے زیادہ مفید بنانے کا ولولہ پھر پیدا کر دیا ہے - اور اب میں ہمیشہ سے زیادہ الناظر کی خدمت پر متوجہ ہوں - خدا کی مرضی ہے تو تھوڑے ہی دنوں میں نہ صرف الناظر کی مالی مشکلات رفع ہو جائیں گی بلکہ اُسکی ظاہری و معنوی حالت بھی پہلے سے بہتر و برتر ہو جائے گی - وما توفیقی الا باللہ -

ایک کرم فرمانے اُس تحریر کو پڑھکر یہ اندیشہ کیا کہ الناظر دفعتہً بند نہ کر دیا جائے - اور تحریر فرمایا کہ ایسی صورت میں توسیع اشاعت کی کوشش میں کیا کامیابی ہوسکتی ہے - جو پرچہ بند ہونے والا ہو اُسکا خریدار کوئی کیوں بنے - ان صاحب کی تشفی کے لیے خانگی تحریر کافی ہوگی مگر ممکن ہے کہ اور اصحاب کے دل میں اسی قسم کے خیالات پیدا ہوے ہوں لہذا اُنکے دفعیہ کے لیے بصراحت عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ میری تحریر کا یہ منشا نہیں کہ مالی پریشانیوں سے تنگ آکر الناظر کو بند کر دینا چاہتا ہوں بلکہ مقصود صرف یہ تھا کہ میرے احباب قدر دانان الناظر اس صورت حال سے مطلع ہوکر اُس وقت کے آنے سے پہلے کہ پانی سر سے گذر جائے الناظر کے بقا و استحکام کی کوشش میں میرا ہاتھ بٹانے پر آمادہ ہو جائیں - اور مجھے اُمید کامل ہے کہ جن اصحاب نے ابتک توجہ نہیں فرمائی وہ اس ابتدائی کامیابی کا حال پڑھکر متفکر نہ ہو جائیں گے - توسیع اشاعت کی کوششوں کے نتائج ادبار اشاعۃً درج الناظر ہوتے رہیں گے تا آنکہ الناظر کی طرف سے اطمینان کلی حاصل ہو جائے -

# مسلمانوں کی تہذیب

یعنی مسلمانوں کی تمدنی ترقی کے متعلق نواب محسن الملک مرحوم کا ایک فاضلانہ لکچر

قیمت ۲ر

(خریداران الناظر سے ۱؎)

# میلاد النبی

[illegible]

قیمت ۳ر

[illegible]

# الاحسان

مصنفہ مولوی احسان الدین علوی مرحوم جس میں لفظ صوفی کی تحقیق تصوف کی ابتدا اور اس کی درجہ بدرجہ ترقیاں کا ذکر اور آخر میں تمام شعبوں کو اسلام سے تطبیق دکھلی ہے

قیمت ۸ر خریداران رسالہ کے لیے ۶ر

# مقدمہ شعر و شاعری

مولانا حالی مرحوم نے اپنے دیوان کے ساتھ یہ لاجواب مقدمہ لکھا تھا دوسرے ایڈیشن کے وقت اس میں اضافہ ... شعر کی حقیقت ماہیت اور شاعری کے اصول و ... اس پر بحث ... اردو شاعری پر ایک بسیط تبصرہ لکھا گیا ہے۔ قیمت عہ خریداران رسالہ سے عہ

# مجموعہ کلام شبلی

مولانا شبلی مرحوم کا اردو دیوان ...

[illegible]

قیمت ۱ر

[illegible]

# ارض نہرین

میسوپوٹیمیا یا عراق عرب کے آثار قدیمہ مؤلفہ مسٹر عنایت اللہ ... حیدرآباد عثمانیہ یونیورسٹی۔ قیمت ۳ر

خریداران الناظر کے لیے ۲ر

# وکرم اروسی

مترجمہ مولوی عزیز مرزا بی اے مرحوم۔ یہ کالی داس کے مشہور و معروف ڈرامے کا اردو ترجمہ ہے جس میں لائق مترجم نے ایک بسیط مقدمہ اضافہ کیا ہے اور ہندو ڈراما کی تاریخ اور نوعیت پر بحث کی ہے اور کالی داس کا موازنہ شیکسپیر اور میرانیس وغیرہ سے کیا ہے۔ قیمت ۱ر خریداران الناظر سے ۱۲؎

# تسخیر فرانس

شیکسپیر کے لاجواب ڈرامہ ہنری دی ففتھ کا اردو ترجمہ۔ از منشی تفضل حسین صاحب ناظر۔ قیمت ۸ر

خریداران الناظر کے لیے ۶ر

# سفرنامہ مصر و شام و روم

مولانا شبلی کا مشہور سفرنامہ جو ان ممالک کے متعلق بہترین تاریخی علمی معاشرتی و مذہبی معلومات فراہم کرتا ہے۔ قیمت ۱ر

خریداران الناظر کے لیے ۱۲؎

# میکفرن اور لوسی

حضرت شوق قدوائی کا لاجواب ڈراما

قیمت ۸ر

(خریداران الناظر سے ۶ر)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۷۰۸

رسالۂ

# الناظر

لکھنؤ

ایڈیٹر۔ ظفر الملک علوی

قیمت سالانہ للعہ مع محصول

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر و پبلشر:۔ اسحاق علی علوی

بسم اللہ

# فہرست مضامین الناظر بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۲۴ء

نمبر ۱۵۸ | جلد ۳۷



خط

## تاریخ الامت

حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری کی معرکۃ الآرا تصنیف کا پانچواں حصہ جو ابھی حال میں شائع ہوا ہے اور جسمیں خلفائے عباسیہ بغداد کے حالات اور اُن کے عہد حکومت کے واقعات مفصل درج کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب اُس عہد زریں کا آئینہ اور بیش بہا تاریخی معلومات کا ذخیرہ ہونے کے علاوہ خلفاء عباسیہ کے سوانح حیات کا ایک دلچسپ مرقع بھی ہو قیمت ۱۲

## سچے نبیؐ کے سچے حالات

اس کتاب میں جناب رسالت مآبؐ کی مقدس زندگی کے واقعات نہایت معتبر و مستند ذرائع سے جمع کر کے شایع کیے گئے ہیں۔ مرتبہ مولوی محمد محفوظ الرحمن صاحب نگرامی۔ قیمت ۸ر

## ماہِ نو

ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور کی کتاب "ششو" کا ترجمہ۔ اس کتاب میں بچوں کے حسیات و خیالات کی جیسی بے عیب اور سچی تصویریں کھینچی گئی ہیں اور اُنکے بے زبان جذبات کی جو ترجمانی کی گئی ہے اسکی مثال دنیا کی زبانوں میں مشکل سے ملیگی۔ قیمت ۱۲ر

## رباعیات اکبر

لسان العصر مولانا اکبر الہ آبادی مرحوم کی رباعیات کا مجموعہ۔ جو درحقیقت حکمت و ظرافت کا مجموعہ اور نصائح و پند کے موتیوں کا مخزن ہے۔ یہ رباعیاں جو پہلے منتشر تھیں اب یکجا جمع کر کے خاص اہتمام سے کتابی صورت میں شایع کی گئی ہیں۔ قیمت ۱۲ر

# جدید خریداران رسالہ

الناظر کی بعض پرانی جلدیں جو ابھی مل سکتی ہیں فوراً منگا لیں۔ ورنہ کچھ دنوں کے بعد بعض جلدیں بالکل نہ ملیں گی۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| جلد (۱) | جولائی لغایت دسمبر ۱۹۰۹ء | مجلد | عہر |
| جلد (۲) | جنوری لغایت جون ۱۹۱۰ء | 〃 | عہر |
| جلد (۳) | جولائی لغایت دسمبر ۱۹۱۰ء | 〃 | عہر |
| جلد (۴) | جنوری لغایت جون ۱۹۱۱ء | 〃 | عہر |
| جلد (۵) | جولائی لغایت دسمبر ۱۹۱۱ء | غیر مجلد | عہر |
| جلد (۶) | جنوری لغایت جون ۱۹۱۲ء | 〃 | عار |
| جلد (۱۲) | جنوری لغایت جون ۱۹۱۵ء | 〃 | عہر |
| جلد (۱۳) | جولائی لغایت دسمبر ۱۹۱۵ء | 〃 | عہر |
| جلد (۱۴) | جنوری لغایت جون ۱۹۱۶ء | 〃 | عہر |
| جلد (۱۶) | جنوری لغایت جون ۱۹۱۷ء | 〃 | عہر |
| جلد (۱۸) | جنوری لغایت جون ۱۹۱۸ء | 〃 | عہر |
| جلد (۱۹) | جولائی لغایت دسمبر ۱۹۱۸ء | 〃 | عہر |
| جلد (۲۰) | جنوری لغایت جون ۱۹۱۹ء | 〃 | عہر |
| جلد (۲۱) | جولائی لغایت دسمبر ۱۹۱۹ء | 〃 | عمر |
| جلد (۲۲) | جنوری لغایت جون ۱۹۲۰ء | 〃 | عہر |
| جلد (۲۳) | جولائی لغایت دسمبر ۱۹۲۱ء | 〃 | عہر |
| جلد (۲۴) | جنوری لغایت جون ۱۹۲۲ء | 〃 | عار |
| جلد (۲۵) | جولائی تا دسمبر ۱۹۲۳ء | 〃 | عہر |
| جلد (۲۶) | جنوری تا جون ۱۹۲۴ء | 〃 | عار |

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# الناظر

نمبر ۱۵۸ جلد ۲۷ اگست سنہ ۱۹۲۴ء

## فیہ مافیہ

(اثر: چلبی)

**دیر آمدی اے نگار سرمست!** رئیس صحافت، محمد علی نے بالآخر ایک بار پھر قلم ہاتھ میں لینے کا تہیہ کر لیا۔ ممکن ہے، کہ سطور ہذا کے وقتِ طبع تک ہمدرد و کامریڈ کی باقاعدہ اشاعت شروع بھی ہو چلی ہو۔ لُو کی لپیٹ اور گرمی کی تپش کے بعد پانی کا چھینٹا کس قدر خوشگوار ہوتا ہے! برسات کی اُمس اور حبس کے بعد ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے کیسی نعمت ثابت ہوتے ہیں! اس وقت قوم جس انتشار میں مبتلا ہے، طبائع میں جو افسردگی پیدا ہو گئی ہے، اخباری دُنیا جس بدمذاقی کا شکار ہو رہی ہے، قلوب جس ردِ عمل سے متأثر ہو رہے ہیں، مخالفین کا پروپیگنڈا جس قوت و اہتمام کے ساتھ جاری ہے، بدی پر پردہ ڈالنے، اور نفسانیت پر وارنش کرنے کی جو پیہم و سرگرم کوششیں عمل میں آ رہی ہیں، ان تمام حالاتِ مخالف و کیفیاتِ ناموافق کے درمیان، یہ مژدہ کس قدر روح نواز و جاں پرور ثابت ہوگا، کہ کوچۂ چیلاں، دہلی، کا اُجڑا ہوا نشیمن ایک بار پھر آباد ہو رہا ہے۔ اب پھر

وہی جام ہوگا وہی صراحی، وہی محفل وہی ساقی، وہی ذوق وہی خمار، وہی سوز وہی گداز، پس پاک ہے وہ ذات، جو مُردہ کو زندہ کرتی ہے، تاریکی کو نور سے تبدیل کرتی ہے، اور مایوسیوں کے بعد اُمید کو پھر تازہ کرتی ہے! فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ۔

---

جو خوش نصیب ہمدرد و کامریڈ کے شیفتگان قدیم میں ہیں، وہ خود اندازہ کر سکتے ہیں، کہ نقاش کا "نقش ثانی" "نقش اوّل" سے کتنا بہتر و محبوب تر ہوگا۔ نوگرفتاروں کو یہ سمجھ لینا کافی ہوگا، کہ دونوں پرچوں کی ادارت اُس شخص کے ہاتھ میں ہوگی جسے اللہ نے اپنے فضل و کرم سے دل و دماغ دونوں کی اعلیٰ قوتوں کا جامع بنایا ہے، جو انگریزی و اُردو دونوں کے ادب و انشاء کا مالک ہے، جسکے کمال فن کا اعتراف صحافتِ انگلستان کے بہترین ناقدین کر چکے ہیں، اور جو ایک ہی وقت میں قوم کا خادم بھی ہے اور مخدوم بھی، ناصح تلخ گفتار بھی ہے اور یارِ غمگسار بھی۔ قوم کی بدنصیبی ہوگی، اگر اس مخلصِ چارہ ساز کی عملی قدر دانی دل کھول کر نہ کی گئی۔ آسمان صحافت کے یہ آفتاب و ماہتاب بڑے اشتیاق و انتظار کے بعد طلوع ہو رہے ہیں، نہ ہو، کہ خدانخواستہ غروب ہونے میں عجلت کر جائیں۔ ع

زودت نہ دہیم دامن از دست

---

**"رُو کردہ از ما یک طرف"** کامریڈ و ہمدرد کے اجراء کے تذکرہ کے ساتھ ذہن قدرۃً اُن احباب کی جانب منتقل ہوتا ہے، جو کل تک "یاران بزم" تھے، اور آج "حریفانِ رزم" کی حیثیت سے صف آرا ہو رہے ہیں۔ کل تک جنکی زبانیں مہاتما جی کا کلمہ پڑھنے میں مصروف تھیں، آج اُنھیں کے ہاتھوں میں علمِ بغاوت بلند ہے۔ کل تک جنکا فتویٰ تھا، کہ کونسلوں میں شرکت معصیتِ کبیرہ ہے، آج اُنھیں اس "معصیت" پر سکوت نہیں، اصرار ہے۔ اس جمعیت عالیہ کے سالار لشکر، جو الٰہ آباد کے ایک نامور ہندو لیڈر ہیں، سُنا ہے کہ کامریڈ و ہمدرد کے "زہر" کے لیے تلاش تریاق میں ہمہ تن سرگرم کار ہیں، اور بمبئی کرانیکل کو اپنا بنا چکے ہیں۔ کلکتہ، پہلے ہی سے اُنکا تھا، چلیے بمبئی بھی انکا ہوگیا۔ کلکتہ و بمبئی کے بعد دہلی اور لکھنؤ کی باری آئی، اور چشم فسوں ساز کی ایک گردش سے ان مقامات

کی بھی ممتاز انگریزی و اُردو صحافت اسی جماعت کی "زر خرید" بن گئی۔ ایک طرف ان روٹھے ہوے، اور یارانِ قدیم کی طرف سے منہ پھیرے ہوے،

انگندہ کاکل یک طرف، زلفِ چلیپا یک طرف

دوستوں کا دَل بادَل لشکر صف بستہ ہو رہا ہے، جسکے پاس سرمایۂ و تنظیم جیسے زبردست دکارگر آلاتِ حرب موجود ہیں، دوسری طرف کا مرٹھ و ہمدرد ہیں، جن کے پاس بجز توکل وحق پرستی کے کسی قسم کا سامان موجود نہیں۔ وکفیٰ باللہ وکیلا۔

کہتے ہیں، کہ فرعون کے قبضۂ اقتدار میں ساحروں کی ایک پوری جماعت تھی، جنھوں نے اپنی قوت تدبیر وتنظیم کی مدد سے، بہت سے خطرناک سانپ بنا کر چھوڑ دیے۔ اُدھر تنہا ذاتِ کلیمؑ تھی، اور اُن کا عصا۔ لیکن وہ ایک عصا، حق وصداقت کا اژدر بن کر سرمایۂ وتنظیم کے تمام سانپوں کو نگل گیا، فَاِذَا ہِیَ تَلْقَفُ مَا یَأْفِکُوْن۔ کیا اس وقت بھی ایک فریق کو کچھ ایسا ہی خطرہ درپیش ہے؟

## "اک ولی پوشیدہ اور کافر کھلا"!

زلیخا کے محبوب کا کمالِ حسن یہ تھا کہ عورتیں جلوہ دیکھ کر بیخود ہوگئیں، اور اپنے ہاتھ چھریوں سے کاٹ لیے۔ خداوندِ عالم کے محبوب کا اعجازِ جمال یہ ہے کہ اہلِ ذوق، جلوہ دیکھ کر نہیں، محض تذکرہ سُن کر، بیخود ہو جاتے ہیں، اور معتقداتِ آبائی کے زنجیر وبند کو عشق ومحبت کی تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں۔ نجاشی، شاہِ حبشہ نے تثلیث پرستی کے آغوش میں آنکھیں کھولیں، مگر جب بند کیں، تو جمیل کائنات کے رُخِ انور کی حسرتِ دید پیش نظر تھی۔ اویس قرنی کو زیارتِ جمال ایک بار بھی نہیں حاصل ہوئی، لیکن شیفتگی و فریفتگی کے لحاظ سے یہ عاشقِ نادیدہ آج سارے گروہ عشاق کا سرتاج سمجھا جاتا ہے۔

یہ مثالیں پُرانی ہو چکیں، کیا دورِ حاضرہ میں، اس قسم کی، اعلیٰ یا ادنیٰ، کوئی مثال نہیں مل سکتی؟ اسکے جواب میں ایک سکھ سرفروش کھڑا ہوتا ہے، اور دربارِ رسالتؐ میں عشق ومحبت، خلوص ونیاز، احترام وعقیدت کا ہدیہ، چند اوراقِ مرتب کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ خدا اُسکی اس نذر کو قبول کرے!

---

* یہ شخص آبائی مسلمان نہیں، ایک غیر مسلم خاندان کا رُکن ہے۔ کسی اسلامی دارالعلوم کا نہیں،

انگریزی یونیورسٹیوں کا تعلیم یافتہ ہے۔ سادھو یا جوگی نہیں، بیرسٹر ہے۔ قیام کسی اسلامی آبادی میں نہیں، خاص شہر لندن میں رکھتا ہے۔ شغلِ قلم کسی مسلمان رئیس کی قصیدہ نگاری نہیں، ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار ہند کی ایڈیٹری ہے۔ اللہ کی شان کے قربان جایئے، کہ اس شخص کو ان حالات مخالف کے اجتماع میں، ہدایت نصیب ہوتی ہے، اُسکی روح نورِ ایمان سے روشن ہوتی ہے، اسکے قلب کو سرورِ عالم کے ساتھ محبت پیدا ہوتی ہے، اس کا پیارا ثمرہ یہ "رسولِ عربی" کے پیارے نام سے قلمبند کرتا ہے، اور اسے ۱۸ + ۲۲ کی تقطیع پر ۱۲۵ صفحوں کی ضخامت کے ساتھ، دفتر دارالمصنفین علیگڈھ سے شایع کرتا ہے۔ جو لوگ طلسم سازِ فطرت کی گہری حکمتوں اور مخفی صنعتوں کا تماشا، شب و روز، چشمِ بصیرت و دیدۂ عقیدت سے دیکھتے رہتے ہیں، اُنکے لیے یہ واقعہ ایک معمولی بات ہے، لیکن ظاہر پرستوں کو اسپر جس قدر بھی حیرت ہو، بجا ہے۔

گورودت سنگھ دارا، بی اے، بی ایل، ایڈوکیٹ، لاہور، و بیرسٹر، و ایڈیٹر ہند (لندن)، کا نام قومی حلقوں میں نامانوس نہیں، البتہ مصنف "رسول عربی" کے نام سے شاید وہ پہلی بار دنیا کے سامنے پیش ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اُردو کے ادیب یا کوئی مشّاق مضمون نگار نہیں۔ اس لیے انکی تحریر میں ادب اُردو کا چٹخارہ تلاش کرنا خود اپنی غلطی ہوگی۔ ہندی اور بھاشا کے الفاظ قدرۃً وہ کثرت سے استعمال کرتے ہیں، باایں ہمہ سوز و گداز، درد و اثر سے انکی کوئی سطر خالی نہیں۔ حضور انور کی سیرت مبارک کے تقریباً پورے واقعات اُنھوں نے معتدل اختصار کے ساتھ قلمبند کیے ہیں اور کسی اہم واقعۂ زندگی کو نظرانداز نہیں ہونے دیا ہے۔ اس جامعیت کے ساتھ دلآویزی کا سررشتہ کسی مقام پر بھی ہاتھ سے جانے نہیں پایا ہے۔ سکھ قوم سرفروشی و جاں بازی کے لیے مشہور رہی ہے، اس گلدستہ میں بھی ایک ایک لفظ سے پریم اور شوق کے پھولوں کی مہک آ رہی ہے۔ اقتباساتِ ذیل ملاحظہ ہوں:-

"مگر کیا کہوں اے عرب! رب کے رنگ نیارے ہیں، داتا جسے چاہے دیدے، ورنہ تیرے ہاتھ آئے یہ دولتِ محمدی! تجھے نصیب ہو یہ جانِ احمدی! تجھے ملے یہ رسولِ عربی! کیا کہوں عرب! اللہ بے نیاز ہے۔ اے زمانہ کی چوٹیو! تم ہی کچھ کہو، سیکڑوں رشیوں نے تمھاری

شفقت اور پیار کی گود میں نواسے کیے، مہاجوگیوں نے تھارے چلوے محبت میں جوگ
کمائے .... گر سچ کہنا، کہیں دیکھا؟ تم نے وہ مکہ کا راج دُلارا، کہیں نظر پڑا تمھیں وہ مدینہ
کا پیارا ...... اے موج آب گنگا، جس کسی کی آنکھیں تجھ سے دو چار ہوئیں تو نے ایسے گنگ
منتر پڑھائے چھوڑا۔ مگر اے اب رود گنگا، مجھے اتنا تو بتا، کہیں اس آب زمزم والے
سے بھی تیری آنکھ لڑی، کہیں اس کی رحمت نے بھی تجھ سے کوئی گنگا جلی بھری ..... اے
ہمارت تیرے یہ اونچے اونچے کوہ، دوٹ اور اونچی شان، اے ہند تیری دلفگار دلی،
اور تیرا آگرہ، اجمیر و ملتان، تیرے محل، گلزار اور انکی یہ سدا بہار یہ ہی اور رہنے کی،
تو مٹائے مٹی نہ مٹے گی۔ داتا نے اپنی دنیا سے تجھے ہر طرح سرفراز کیا، مگر اس دن کا مکہ اور
وہ موہن کا مدینہ، وہ کعبہ، سلام و قبلۂ انسان، وہ تجھے حق نے نہ دیا پر نہ دیا۔"

---

ایک اور مقام :-

اے رسول عربی! تو خود ہی ہند کی بیماری دیکھ، اور ہندیوں کی چارہ سازی کر۔ اے احمد!
تیرے عشق نے ایک ہندی کے دل پر زخم کاری لگائے ہیں، تو آ، اور دلنوازی کر۔ اے
صد ہاں شاہ ہیں کہ کوئی یوسف تیرے پایہ کا کسی مصر میں کبھی عزیز نہ بنا، نہ کسی کی گرم
بازاری نے یہ رونق پکڑی جو حسن حقیقت نے تجھے عطا کی۔ کچھ لوگ ہیں جو تیرا شہرہ خوبی
اپنے گوش ہوش سے سنے اور تیری کشش حسن سے تڑپ گئے! اے پیغمبر پیارے، میرے
کہاں کہ تو کہوں کہ تیرے درشن کئے ہوئے، پھر تجھ سے کوئی ایسا جوڑ کہ تیار ہوتا کہ جہاں
سے تیرا نظارہ نظر پڑتا، مگر یہ کہاں! میری خوش بختی!"

سیرت مبارک کے تمام جزئیات، سوانح و تاریخ، اسی والہانہ انداز کلام میں بیان کیے گئے
ہیں۔ امید ہے کہ ہر کلمہ گو اس پیاری کتاب کی عملی قدرشناسی، اور مصنف کی حوصلہ افزائی
اپنا فرض ایمانی سمجھے گا۔

**شیخ الجامعہ کا دست طلب** ہمارے ایک مشہور شاعر نے ایک بار مسید کے زیر سایہ خرابات" کا خواب

دیکھا تھا۔ شکلِ معکوس میں تعبیر نکلی، کہ خرابات کے زیرِ سایہ ایک مسجد تعمیر ہوگئی۔ یعنی شاہ خرچ نیم سرکاری مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے پہلو میں نقر نواز قومی جامعۂ اسلامیہ کی بنیاد پڑگئی۔ سنہ ۲۱ء سے یہ جامعہ قائم ہے، اور اس اثنا میں اپنی خدماتِ جلیلہ کا کافی سے زائد ثبوت دے چکی ہے، اس قلیل عرصہ میں متعدد مفید مطبوعات و تالیفات شایع کرچکی ہے، ایک قابلِ قدر و سنجیدہ ماہوار رسالہ جامعہ کے نام سے نکال رہی ہے، اسکے طلبہ کا طرزِ زندگی سادگی و ایثار کا نمونہ ہے، اسکے بعض اساتذہ اور کارکن بڑی بڑی آزمایشوں سے گذر چکے ہیں۔ اس کا نصب العین اسلامی معیار سے بہت ہی قریب ہے۔ یہ سب کچھ ہے، لیکن قوم کی جانب سے، اب تک عملاً اسکی کتنی ہمت افزائی کی گئی ہے؟ اسکے جواب میں دفترِ جامعہ کے رجسٹر نہایت مایوس کن اعداد پیش کرتے ہیں، اور اسی لیے اب شیخ الجامعہ (خواجہ عبد المجید، سابق بیرسٹر) کو اسکی اعانت و امداد کے لیے ایک پُرزور اپیل شایع کرنا پڑا ہے۔ چنانچہ روزنامہ خلافت (بمبئی) میں انھوں نے تفصیل کے ساتھ اپنی ضروریات کو بیان کیا ہے، اور اپنے گذشتہ کارناموں کا مفصل ذکر کرکے اپنے حقوق جتائے ہیں۔ جامعہ کے سالانہ مصارف کا تخمینہ ۴۲ ہزار ہے، کیا ایک اسلامی درس گاہ کے لیے اس قدر رقم کا صرف قوم کے لیے ناقابلِ تحمل ہے؟

---

جامعہ کے حقوق امرا سے کہیں زیادہ غربا، و طبقۂ متوسط پر ہیں۔ جامعہ ہر قسم کے سرکاری و نیم سرکاری تعلق سے آزاد ہے۔ جامعہ میں طرزِ معاشرت دولتمند فرنگیوں کی نہیں، غریب مشرقیوں کی سکھائی جاتی ہے۔ جامعہ کے در و دیوار "حکام والا مقام" کے نہیں، خادمانِ قوم و ملت کے استقبال کے لیے چشم براہ رہتے ہیں۔ جامعہ کے پاس دفاتر کی دو منزلہ عمارات نہیں، صرف ایک مختصر کمرہ ہے، سکرٹری کا دفتر بھی وہی ہے، اور رجسٹرار کا بھی وہی، اور پرنسپل کا بھی وہی۔ جامعہ کے سامنے زندگی کا نمونہ لٹن و مارلین کا نہیں، محمود الحسن و محمد علی کا ہے۔ جامعہ کے طلبہ بیش قیمت میز و کرسی، کوچ اور سوفے کے نہیں، معمولی دری اور چٹائی، بلکہ کھُردری زمین تک پر بیٹھنے کے عادی ہیں۔ جامعہ کا مطمحِ نظر سرکاری ملازم یا نیم ملازم نہیں، قوم و ملت کے خادم پیدا کرنا ہے۔ جامعہ کا نصاب، درسِ غلامی کی تکرار کے لیے نہیں، احساسِ خودداری کے لیے ہے۔ جامعہ کو فخر و امتیاز اپنی عالیشان و شاہانہ عمارتوں پر نہیں، بلکہ اُن طلبہ

کی اخوت اسلامی و قوت اخلاقی پر ہے' جو شکستہ و بوسیدہ مکانوں میں گذر کیا کرتے ہیں۔ جامعہ کے پاس بڑے بڑے لکچر روم نہیں، بہت سے طلبہ درختوں کے سایہ کو سقف و بام کا قائم مقام سمجھتے ہیں۔ جامعہ کے پاس کوئی الگ ڈائننگ ہال نہیں، کوئی اسٹریچی ہال نہیں، کوئی نظام میوزیم نہیں، صرف ایک خس پوش عمارت ہے' وہی مسجد کا بھی کام دیتی ہے' دینیات کا درس بھی وہیں ہوتا ہے، اور کھانا بھی طلبہ وہیں کھاتے ہیں۔ کیا اس قسم کی درسگاہ کو مسلمان زندہ رکھنا چاہتے ہیں؟ اس کا جواب زبان سے نہیں، زبانِ عمل سے ملنا چاہیے۔

## ایک افسوسناک وفات

ماہ گذشتہ میں ایک افسوسناک واقعہ سید افتخار عالم مارہروی کی وفات کا ہوا۔ دوسری تحریروں سے قطع نظر کرکے مرحوم کا ایک یادگار کارنامہ ضخیم و دلچسپ حیات النذیر ہے۔ آخر عمر میں، کئی سال سے امیر خسروؒ کے حالات و سوانح جمع کرنے میں مصروف تھے، اور ایک معتد بہ ذخیرہ فراہم بھی کر لیا تھا۔ مرحوم کا ادبی ذوق نہایت پاکیزہ تھا، تصوف کے بھی لذت آشنا تھے، اور اپنے اخلاق میں ایسی خوبیاں جمع رکھتے تھے، کہ ان کا شمار اگر اہل دل مین کیا جائے، تو بیجا نہ ہوگا۔ خدائے غفور و رحیم انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے، اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔

## "تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا!"

ماہ گذشتہ کا ایک نہایت دلچسپ واقعہ یہ ہے، کہ اس کے رسالے نیاز کیشان ازل و وفا شعارانِ قدیم نے عرصۂ دراز کے سکوت کے بعد ایک بار پھر، اپنی قوم کی تعلیمی فلاح و بہبود کے لیے' (اپنی ہی اصلاح میں) ایک "عاجزانہ عرضداشت" پیش کی۔ خداوند ذوالجلال کی پیشگاہ میں نہیں، خالق ارض و سما کے حضور میں نہیں، بارگاہِ رب العزت میں نہیں، بلکہ اس آستان مقدس پر، جو انکی نظر میں مرشد کل و ہادی سبل، قبلۂ حاجات و کعبۂ آمال کا حکم رکھتا ہے، جو ان کے عقیدہ میں انکی قسمتوں کا مالک و مختار، اور قوی موت و زیست کا متصرف با اختیار رہے، اور جس کے ایک گوشۂ چشم پر وہ اپنی عزت و وقار، دولت و خودداری سب کچھ نثار کر دینے کو حاضر رہتے ہیں۔ یعنی تال و شملہ کے پاس عظمت و قوت دیوتاؤں کے بڑے بڑے کہن سال پرستار، بڑے بڑے پرانے پجاری ایک بار پھر علی گڈھ سے آگرہ کا سفر کرکے، پھر عبدیت و معبودیت کے مندر میں اکٹھے ہوئے، اور انتہائی خضوع و خشوع کے ساتھ

تھی، ان کے عقیدت مندوں نے آستانۂ قدس پر اپنی جبینِ نیاز کو گھسا۔ لیکن خدا معلوم، ابھی برہمن سے ساعت بتانے میں کچھ غلطی ہو گئی، اور کسی نحس ساعت بھینٹ چڑھانے کے لیے مقرر کی گئی، کہ سارا خضوع و خشوع سب رائیگاں ہو کر بجائے اس کے کہ آثارِ مقبولیت و پذیرائی ظاہر ہوں، بیچارے خوش عقیدہ پرستاروں کو روکھے پن کے ساتھ الٹے پاؤں واپس کر دیا گیا!

سُنا ہے کہ اس جمعیت عاشقاں کے ایک بزرگ، اس حادثۂ المناک و درد انگیز کو غالب کے اس شعر کی نحوست پر محمول کرتے ہیں۔

اب کہاں قسمت آزمانے جائیں  تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا!

لیکن اسی درگاہ عشق و وفا کے ایک پروفیسر صاحب اس دل و گردہ کے ہیں، جن کی جبیں پر شکن تک نہیں پڑی ہے، اور وہ ہندوستان کے اصنامِ صغیرہ کو خیر تست پاکر انگلستان کے "صنمِ اکبر" کی زیارت کے لیے فی الفور روانہ ہو گئے ہیں۔ بعض راویوں کا بیان ہے کہ ان بزرگ سے کیمبرج و گوٹنگن یونیورسٹیوں میں ریاضیات کے بعض مقامات ناتمام رہ گئے تھے، اس سفر میں ان کی تکمیل ہوایٹ ہال و ڈاؤننگ اسٹریٹ میں ہوگی!

---

## ایک خوش آیند مراجعت

مقامِ مسرت ہے کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، علیگڈھ واپس آگئے، اور اب مستقل قیام کریں گے۔ انکا قیام، کام کے مرادف ہے۔ انکی واپسی سے امید ہے کہ علیگڈھ کی بہت سی ابتریاں دُور ہو جائیں گی۔ ظاہر ہے کہ کسی اہم و اصولی تغیر کی اُن سے توقع نہیں ہو سکتی، تاہم جسقدر جزئی اصلاحات بھی اُنکے زمانہ میں ہو سکتی ہیں، انکی جماعت کے کسی دوسرے فرد سے اسقدر بھی توقع نہیں۔ ان کا عہدِ امارت، ایک مسلمان کا عہد امارت ہوگا، گو وہ مسلمان بجائے قرنِ اُولیٰ کے سرسید کے زمانہ کی تجدید چاہتا ہو۔ ان کے زمانہ میں انشاء اللہ مسجدیں ویران نہ رہیں گی، اور اعلیٰ ملازمین کالج اپنے تئیں پابندیِ فرائض سے مستثنیٰ نہ سمجھیں گے۔ اس آفتاب کے طلوع ہونے سے کم از کم، فضا اس قدر تو تیرہ و تار نہ رہے گی، کہ سلیمان ندوی کو کورٹ کی رکنیت کے ناقابل سمجھا جائے، اقبال کو اعزازی ڈگریوں کے لیے نااہل، اور نواب صاحب .... کو اہل قرار دیا جائے، اور محمد علی کو قوم و ملت کا دشمن کہا جائے۔

---

# جدید دنیائے اسلام

حال ہی میں ایک جلسہ کی شام کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی شاخ بمبئی میں پادری ڈاکٹر سیموئیل زویمر نے "جدید دنیائے اسلام" پر تقریر کی۔ آنریبل سر ریل لے شا چیف جسٹس بمبئی ہائیکورٹ نے صدارت فرمائی۔ پادری صاحب نے فرمایا کہ آج اس خودمختاری کے دن اس نمایاں ومقتدر لوگوں کے مجمع کے روبرو تقریر کرنا میرے لیے عزت کا باعث ہے جبکہ امریکہ نے تمام قوموں اور نسلوں کی مساوات کے متعلق دعوت مقابلہ دی تھی جسے جدید دنیائے اسلام نے اپنے شوق جمہوریت میں قبول کر لیا ہے۔ اسلام سے اتحاد و استحکام کا اظہار ہوتا ہے اور اس سے جغرافیائی اتحاد بھی ٹپکتا ہے۔ مسلمانوں نے ساتوں سمندروں کو پار کر لیا ہے اور وہ دنیا کے ہر حصہ میں آباد ہو گئے ہیں۔ شمالی امریکہ کے محنت مزدوری کے مرکزوں میں گیارہ ہزار مسلمان رہتے ہیں اور جنوبی امریکہ میں دو لاکھ۔ آسٹریلیا میں بیس ہزار مسلمان ہیں اور برطانوی گائنا میں ڈیڑھ کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ ہندوستان میں ماسوائے لنکا کے ۷۷۶۸۱۶۳۳۵۲۳ اسلامی آبادی ہے۔ نظر بریں یہ نئی اسلامی دنیا ہے جو دنیا کی آبادی کا ساتواں حصہ ہے۔ آج محققانہ علم وفضل اور مسلمان عالموں اور مشہور فاضلوں کے اس مقدس ملک کو تجسس وتفحص کرنے کی بدولت عرب کی اصلی تصویر دنیا کے پیش نظر ہو گئی ہے آج دنیا میں قرآن مجید کے ۲۳ ترجمے ہیں جن میں سے پانچ انگریزی میں، گیارہ جرمنی میں اور چھ اطالوی زبان میں ہیں۔ اسلامی علم ادب ماضی کی طرح اب گرد و غبار اور دھندلکے میں نہیں بلکہ اب اس میں زور وشور اور آب وتاب ہے۔ دنیا کو نئی روشنی اور نیا انکشاف عطا کر رہا ہے۔ سرکاری اعداد وشمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ پچاس سال پہلے مسلمانوں میں افسوسناک جہالت تھی لیکن اب زبردست تعلیمی احیا ظہور میں آگیا ہے۔ جو ایک ملک یا مرکز تک محدود نہیں بلکہ تمام دنیا پر پھیلا ہوا ہے۔ نسائیت کی مساوات اور آزادی کے لیے ایک نیا دن طلوع ہو گیا ہے۔ اسلام کی یہ زبردست پیشقدمی بڑی حد تک اسلامی مطبع کی جدوجہد اور بین الاسلامی تحریک کا نتیجہ ہے۔ اسلام سیاسیات کا سلسلہ نہیں ہے۔ نہ یہ کوئی معاشرتی انضباط ہے بلکہ سرتاپا توحید وخدا پرستی ہے یہ خدا سے روشناس کرتا اور اسکی رفاقت وموجودگی کا سبق دیتا ہے۔

جدید دنیائے اسلام کی اہمیت اب دنیائے مغرب کے مدبروں اور مصنفوں کے ہر وقت پیش نظر رہتی ہے۔ اس زبردست تقریر کے علاوہ ایک اور کتاب ہمارے سامنے ہے جس کا نام "جدید دنیائے اسلام" ہے۔ یہ امریکہ کے ایک مشہور ماہر سیاسیات ڈاکٹر لوتھراپ اسٹاڈرڈ کی تصنیف ہے جسے منشی محمد جمیل الدین صاحب بدایونی بی اے (علیگ) ڈپٹی کلکٹر نے اردو کا جامہ پہنایا ہے اور سچ یہ ہے کہ انھوں نے ترجمہ میں بہت جانفشانی سے کام لیا ہے۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ ایک مرتبہ جب وہ اس ترجمہ کا مسودہ مطبع کو دینے والے تھے تو دوران سفر میں وہ سارا مسودہ جاتا رہا اور انکو پھر ترجمہ کی زحمت اٹھانی پڑی، بلکہ اس لیے بھی کہ ترجمہ میں بڑا غور و فکر کیا ہے۔ گو اس جانفشانی کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ ترجمہ ادق اور عام فہم سے بالا ہوگیا ہے لیکن مترجم کا منشا بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ ایک خاص طبقہ تک محدود رہے۔

مصنف امور اسلامی سے بخوبی واقف معلوم ہوتا ہے اور جہاں اس نے مغربی تعصب کا خفیف سا اظہار بھی کیا ہے وہاں فاضل مترجم نے اپنے مفصل حاشیوں سے اسکی کافی گوشمالی کردی ہے۔ مثلاً عام یورپی مصنفوں کی طرح اس نے عرب کے یکایک غفلت و جہالت سے اس بام ترقی پر پہونچ جانے کا جس سے ایک عالم حیران ہے سہرا حضرت رسول کریمؐ کی معجز نمائی کے سر نہیں باندھا بلکہ یہ لکھا ہے کہ عرب میں جدید معلومات اور ترقی کی قابلیت پیدا ہوگئی تھی اور مواد پک رہا تھا کہ آں حضرتؐ کے دعوے رسالت سے اس میں سرعت پیدا ہوگئی۔ فاضل مترجم نے اس رائے کی غلطی اپنے حاشیہ میں دکھا کے اسے درست کیا ہے۔

فاضل مصنف نے دیباچہ اور مقدمہ کے علاوہ اپنی کتاب کو نو فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔ دیباچہ میں مصنف نے بتایا ہے کہ اسوقت دنیائے اسلام سخت ہیجان میں ہے اور اس میں نئی نئی باتیں ظاہر ہو رہی ہیں۔ اور نئی نئی امنگیں نشو و نما پا رہی ہیں۔ اس کتاب میں اس ارتقا کو مختلف یعنی تمدنی، معاشرتی، سیاسی، اقتصادی، مذہبی پہلوؤں سے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے وغیرہ۔

مقدمہ میں قدیم اسلامی دنیا کے انحطاط و زوال کا ذکر ہے۔ اسلام کی ترقی کا مختصر تذکرہ کرکے وہ اس طرح اپنے مضمون کو ختم کرتا ہے :-

"عرب اپنی حکومت کے مستحکم کرنے کے طریقے خوب جانتے تھے۔ یہ کوئی خون کے پیاسے

وحشی تھے جو لوٹ مار اور غارت گری کے خواہشمند ہوتے۔ برخلاف اسکے وہ جبلی طور پر عمدہ اوصاف سے متصف اور اُن شایستہ صفات کو جو قدیم تہذیبوں سے حاصل ہوسکتی تھیں سیکھنے کے متمنی تھے۔ یہ فاتحین اور مفتوحین ایک ہی مذہب کے پیرو ہو گئے۔ ایک دوسرے سے مناکحت کرنے لگے۔ لہذا سرعت کے ساتھ ایک دوسرے میں ضم ہو گئے۔ اس اختلاط سے ایک جدید تمدن یعنی عربی (سارسنک) تہذیب پیدا ہوئی۔ عرب کی طبعی قوت نے یونانی رومی اور ایرانی تہذیب کو مستحکم کردیا اور عربی ذہانت اور اسلامی روح نے اس پر جلا کرکے اپنی تہذیب میں ملا لیا۔ پہلی تین صدیوں (۷۵۰-۱۰۰۰ء) میں بلاد اسلامی دنیا کے سب سے زیادہ مہذب اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ حصے تھے۔ ان میں جابجا بارونق شہر، عالیشان مسجدیں، اور پُر سکون درسگاہیں تھیں۔ ان درسگاہوں میں دنیائے قدیم کی حکمت کی حفاظت اور قدر کی جاتی تھی۔ نصرانی مغرب سے جو ازمنۂ مظلمہ کی تاریک شب میں چھپا ہوا تھا اسلامی مشرق کا کھلا ہوا تقابل تھا۔"

عربی تمدن کے تنزل کے اسباب مصنف نے یہ بتائے ہیں کہ "اولاً گروہ بندی کا مستقل جذبہ عود کرنے لگا جو ہمیشہ سے قبائل عرب کے لیے تباہ کُن تھا" اسکے بعد مصنف اپنے مضمون میں اسقدر جذب ہوا کہ اُس نے جس طرح اسباب کو گن کے بتانے کی فکر کی تھی اُسے وہ بھول گیا۔ اور مضمون سے مضمون پھیلتا چلا گیا۔ اس مقدمہ کے مطالعہ سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس سبب کے علاوہ مذہبی اختلافات اور سیاسی مناقشات، معقول و منقول کا جھگڑا، جمہوریت کے بجائے مطلق العنانی کا زور اس انحطاط کے باقی وجوہ ہیں۔ اس مقدمہ میں اسلامی تاریخ کا ایک مجمل خاکہ ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے کہ خلفائے راشدین کی خلافت کیا تھی اور اُنکے بعد بنی اُمیہ و بنی عباس کے ہاتھوں اسکی کیا گت بنی؟ کس طرح یہ خلافت ہسپانیہ اور مصر میں پہونچی اور پھر کس طرح ترکوں کے ہاتھوں میں آئی۔ یورپی ممالک میں اسلامی پیشقدمی کا اس میں ضمناً ذکر آگیا ہے جو نفس مضمون کے لحاظ سے دلچسپ ہے۔ اس انحطاط میں مغربی ارتقا شروع ہو گیا جس نے اب تمام مشرق پر اپنا تسلط جما لیا۔ اس مقدمہ کو فاضل مصنف نے اس طرح ختم کیا ہے۔

"ان فتوحات کا آخری درجہ جنگ عظیم میں ظاہر ہوا۔ اس جنگ کے اختتام پر جو صلحنامہ کے شرائط لکھے گئے اُن سے ترکی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا..... اسلامی دنیا کی مغلوبیت کم ازکم کامذ پرتو کمل ہوگئی..... مغربی تفوق کے روز افزوں

سیلاب نے آخر کار خوابیدہ مشرق کو بیدار کر دیا اور اسلام بالآخر اپنی کمزوری سے واقف ہوا اس واقفیت کے ساتھ پچیس کروڑ پیروان اسلام میں مراکش سے لے کر چین تک اور ترکستان سے لیکر کانگو تک ایک ایسا ہیجان پیدا ہو گیا کہ جس نے اگرچہ خاص شکل اختیار نہیں کی ہے تاہم اسکی قوت اور شدت میں کلام نہیں ہو سکتا ............. آج اسلام بڑی طاقتوں کے ساتھ ایک جدید اسلامی دنیا کی تعمیر کے لیے بے چین ہے۔ اسلامی مستقبل کی تعمیر میں کون کون سی طاقتیں بروئے کار رہیں؟ اس سوال کے حل کرنے اور صحیح اندازہ کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

اس بیداری کو خود مسلمان بھی محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ اس جگہ مسلم آؤٹ لاہور مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۲۴ء کے ایک مدیری مقالہ کا ترجمہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

"انڈین ڈیلی میل بمبئی کے ایک خاص تار میں کنٹربری کے لاٹ پادری کی ایک تقریر کا خلاصہ آیا ہے جو انھوں نے چند عیسائی مبلغوں کے خیر مقدم کے وقت فرمائی تھی اپنی تقریر کے اثنا میں پادری صاحب یہ فرماتے بتائے جاتے ہیں کہ "زیادہ تر یہ جنگ اسلام کی دیواروں کے منہدم کرنے کی ذمہ دار ہے" اگر یہ الفاظ جو غلط ہونے کے علاوہ خبث باطن کا اظہار کرتے ہیں کسی غیر ذمہ دار پادری کی زبان سے ادا ہوتے تو ہم اُن سے ایسا حقارت آمیز سکوت برتتے جس کے وہ مستحق ہوتے لیکن چونکہ یہ ایسے شخص کی زبان سے نکلے ہیں جو انگلستان کے بادشاہوں کی تاجپوشی میں نمایاں حصہ لیتا ہے اس لیے ضرورت ہے کہ ان پر نفرت کا اظہار کیا جائے۔ پادری صاحب اپنے مذہب کے جوش میں اس قدر وارفتہ ہوئے کہ صداقت اور ہوشمندی کے سب اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اس لڑائی کے بعد اسلام پہلے سے زیادہ گردن افراز ہے۔ ایک نہ ایک بہانہ سے بلالی ممالک مغربی طاقتوروں نے ہڑپ کر لیے ہیں لیکن ان ملکوں کے مسلمان باشندے اپنی ضرورتوں سے خوب آگاہ ہیں اور قریب ترین موقعہ پر آزاد ہونے پر تلے ہوئے ہیں۔ لڑائی سے پہلے ترکی کے سوا کوئی اسلامی ملک نام کے لیے بھی آزاد نہ تھا۔ اب حالت یہ ہے کہ تازہ دم ترکی خود مختار افغانستان اور نوزائیدہ ایران کے علاوہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ مصر بہت جلد منزل مقصود پر پہونچنے والا ہے، ہندوستان اپنی قوت کا اظہار کر رہا ہے اور ریاست اپنی آزادی کے لیے

برسرپیکار ہے۔ غیر متعصب آنکھوں کو تمام اسلامی ممالک میں نئی زندگی کے آثار نظر آتے ہیں جن سے
لاٹ پادری صاحب اپنے منہ کی کھا رہے ہیں۔ اسلام کی روشنی خدائی نور ہے جو گل نہیں ہوسکتی
خواہ عیسائی پادری کچھ ہی کہیں اور کچھ ہی چاہیں۔ لاٹ پادری کا خیال خواہش کا نتیجہ ہے۔
اور یہ خیال مسلمانوں کو بیش از بیش عیسائی طوقِ غلامی نکال پھینکنے پر اُبھارے گا"

فصل اول کا عنوان "مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ" ہے جس میں مصنف نے دکھایا ہے کہ کس طرح عالم اسلام جمود کی حالت میں پست و ذلیل تھا اور کس طرح اُس میں آثار ترقی نمودار ہونے لگے۔ مترجم نے درست کہا ہے۔

"مصنف نے یہ دکھایا ہے جسکے متعلق میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں تک حق بجانب ہے کہ اس (اسلامی نشاۃ ثانیہ) کی ابتدا محمد بن عبدالوہاب نجدی کے مساعی سے ہوئی۔ اس وہابی تحریک کا مقصد اسلام کو بدعات اور بدعت سے پاک و صاف کرنا اور اسلامی سلطنت کو بیدار کرنا تھا۔ یہ تحریک اگرچہ سیاسی طور پر ناکامیاب رہی اور مذہبی تجدید میں بھی تنگ خیالی کی ملزم ٹھہرائی گئی لیکن اس نے اسلامی اقوام کو بیدار ضرور کردیا اور مسلمانوں میں بطور خود اصلاحی تحریکیں شروع ہوگئیں جسے مغربی خیالات کی رو سے مزید تقویت پہونچی"

مصلحین کے گروہ ہر جگہ پیدا ہوئے۔ ہندوستان میں سرسید نے آزادی کی تحریک کا آغاز کیا اور ہندوستان کے مسلمانوں میں نئی تعلیم کی ترویج سے ایک نئی روح پھونکی۔ غدر کے بعد مسلمانوں کی حالت مائل بہ پستی و نکبت تھی، لیکن سرسید نے اُنکو ایسا اُبھارا کہ آج ہندوستان میں جو کچھ ترقی کے آثار مسلمانوں میں نظر آتے ہیں اُنکی ہی مساعیِ جمیلہ کے نتائج ہیں۔ ترکوں میں مدحت پاشا پیدا ہوئے، مصر میں شیخ محمد بن عبدہ۔ اس فصل کے آخر میں مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کا مصنف نے ذکر کیا ہے۔ ایک وہ ہیں "جو اسلام کو زندہ اخلاقی قوت جانتے اور اسی سے اپنی غذائے روحانی اخذ کرتے ہیں"۔ اور وہ جماعتیں بھی ہیں جو مغربیت کی ایسی شکار ہوگئی ہیں کہ انکو اپنے روحانی اور تمدنی ماضی سے کم و بیش کوئی ربط نہیں! تیسرا وہ گروہ ہے جو معناً ملحد ہے اور اشتراکیت و بالشویت پسند ہے۔

فصل دوم کا عنوان "اتحاد بین اسلامی" ہے اور یہ بہت دلچسپ ہے۔ اس میں دکھایا ہے کہ یورپ کے اقتدار اور تسلط کے بڑھے چلے جانے سے جو منافرت مسلمانوں کے دلوں میں پیدا ہوئی اُسنے

انکی آنکھیں کھول دیں، انھوں نے دیکھا کہ یورپ سارے اسلامی ممالک میں اپنے پانوں پھیلائے چلا جا رہا ہے اور روز بروز اسلامی آزاد ملکوں کا مرتبہ کم ہوتا چلا جاتا ہے - اس تحریک کو سلطان عبد الحمید خاں ثانی نے بہت تقویت دی اور سچ یہ ہے کہ آج اسلامی دنیا اُنکی بہت زیادہ ممنون ہے۔ اس تحریک میں سلطان کو جمال الدین افغانی کی شخصیت سے بڑی مدد ملی - اسی اثنا میں افریقہ میں سنوسی جماعت پیدا ہوئی اور روز بروز اسکا اقتدار چپکے چپکے بڑھنے لگا - اسکے ضمن میں مصنف نے دکھایا ہے کہ سنوسی اپنا کام نہایت خاموشی سے کرتے ہیں اور اس کا اثر یہ ہے کہ جو افریقی طبقے پہلے اسلام کے نام سے واقف بھی نہ تھے آج کل کے کل مسلمان ہو گئے ہیں اور اسلام نے نصرانیت کو بُری طرح پچھاڑ دیا ہے - الجزائر اور کوہ قاف میں بھی حریت پسند رہنماؤں کی مدد سے مسلمانوں میں بیداری پیدا ہوئی - مہدویت کی تحریک نے کئی مقام پر فرانس اور برطانیہ کو بہت پریشان کیا۔ اور مسلمانوں میں اس سے بڑا ہیجان پیدا ہوا - چین میں بھی وہی اشتعال مسلمانوں میں پیدا ہوا - غرضکہ ہر ملک میں مسلمانوں میں ترقی کی روح نمودار ہونی شروع ہو گئی -

اب مصنف نے واقعات سے تدریجی طور پر اس بےچینی کے اسباب مستنبط کیے ہیں۔ سنہ ۱۹۰۴ء کی جنگ روس و جاپان نے ایشیا کے اس خوف کو دُور کر دیا کہ یورپ مفتوح نہیں ہو سکتا۔ روس کے اپنے منہ کی کھانے کی گھر گھر خوشی تھی - ہندوستان میں چوپالوں میں رات کو یہی ذکر ہوتا تھا - سنہ ۱۹۰۵ء سے ہندوستان میں جو جوش پھیلا اُسکا ذکر مصنف نے بعد کی فصل میں کیا ہے لیکن مسلمانوں کی بےچینی کا بیج اس طرح پھوٹا کہ طرابلس پر اطالیہ نے بلا وجہ حملہ کیا اور یورپ نے اخلاقی طور پر اس حملہ کی ستایش کی - برطانیہ نے مصر کو جو ترکی علاقہ تھا غیر جانبدار قرار دے کے ترکوں کا راستہ بند کر دیا۔ بعد میں جب اطالیہ نے طرابلس پر اپنے قبضہ کا اعلان کیا تو برطانیہ نے سب سے پہلے اسکو تسلیم کیا۔ اسکے بعد فرانس نے افادر پر جھگڑا کیا اور مراکش میں خاص حقوق حاصل کیے - پھر جنگ بلقان نے اسلامی دنیا میں ایک کھلبلی ڈال دی - یورپ کے رویّے نے پہلے سے زیادہ مسلمانوں میں اُبال پیدا کر دیا - اسکے بعد جنگ عظیم شروع ہوئی - مصر پر برطانوی صیانت کا اعلان ہوا - برطانیہ نے عربوں کو خودمختاری کے سبز باغ دکھائے - جہاد کا سلطان نے اعلان کیا - لیکن اس کا کچھ اثر نہیں ہوا - اُسکے متعلق مصنف نے نہایت معقول بحث کی ہے کہ اس کا کیوں اثر نہ ہوا - کاش کمالی اس کا خیال کرتے جنھوں

نے خفگی سے خلافت کا چولہ محض اس وجہ سے اُتار پھینکا کہ خلافت کی وجہ سے ترک مصائب و آلام کا نشانہ بنے رہے اور فی نفسہ اس کا ترکوں کو کچھ فائدہ نہ پہونچا۔ چنانچہ جہاد کا اعلان ہونے پر بھی مسلمان بے حس و حرکت رہے۔ مصنف لکھتا ہے:

"ان حالات میں بہ نظر اول یہ عجیب معلوم ہوگا کہ ۱۹۱۴ء کے اختتام پر جب ترک میدان میں آئے اور سلطان خلیفہ نے جہاد کے لیے باضابطہ دعوت دی تو اسلامی دنیا میں کوئی عام تلاطم نظر نہ آیا۔ بلا شبہہ یہ دعوت اس قدر ناکامیاب نہ تھی جس قدر کہ اتحادیوں کے خبر رسانوں نے یورپ کو اُس وقت اسکی ناکامیابی کا یقین دلایا۔ واقعہ یہ ہے کہ عملاً ہر اسلامی ملک میں جو اتحادیوں کے تسلط میں تھے سخت مشکلات پیدا ہوئیں۔ ........ عام بغاوت یقیناً ہو جاتی اگر اسلام کے اصحاب حل و عقد ہر جگہ اُس بہتم بالشان لفظ کو اپنی زبان سے نکال دیتے جس سے ہزارہا تقدیریں وابستہ تھیں۔ لیکن وہ لفظ منہ سے نہ نکلا۔ بجائے اسکے ترکی کے باہر با اثر مسلمانوں نے عام طور سے ترکوں کے فعل پر اظہار ناراضی اور حتی الوسع متعصب عوام کے جذبات کو روکنے کی کوشش کی۔ ان سربرآوردہ مسلمانوں کا طرز عمل انکی وسعت نگاہ کی وقعت ظاہر کرتا ہے۔ وہ جان گئے کہ مغرب سے فیصلہ کن جنگ کے لیے نہ تو یہ موزوں وقت تھا نہ مناسب موقع۔ وہ اس وقت اسکے لیے مادّی طور پر طیار نہ تھے اور اُنھوں نے نہ تو خود آپس میں اور نہ اپنے متوقع غیر مسلم اتحادیوں سے کوئی سمجھوتہ کیا تھا۔ سب پر طرہ یہ تھا کہ اخلاقی اقتضا بھی مفقود تھا۔ اُنھیں علم تھا کہ خلیفہ کے فرمان پر "مصنوعہ جرمنی" ثبت تھا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ اس ہیجان کے محرک کون تھے یعنی "نوجوان ترک" پارٹی مستفرنج لامذہبوں کی جماعت تھی جن میں اکثر برائے نام بھی مسلمان نہ تھے بلکہ یہودی ملاحدہ تھے۔ وہ اذکی مسلمانوں کو ذرا بھی پروا نہ ہوئی کہ جرمنی کا آلۂ کار بننے کے لیے اپنے آپ کو گرفتار بلا کریں۔ اور نہ دنیا پر روشیا کے اقتدار حاصل کرنے کی تدابیر کی حمایت کرنا چاہتے تھے۔ کیوں کہ یہ اُنکے لیے محض آقاؤں کا تبادلہ ہوتا۔ یہ بدرجہا بہتر تھا کہ مغرب کو اُس کی مایوسانہ لڑائیاں لڑنے دیا جائے تاکہ وہ کمزور ہوکر اپنے آیندہ کے منصوبات کو ظاہر کرے اور اس اثنا میں اسلام وقت گذاری کرکے مزید قوت حاصل کرے اور منتظر فردا رہے۔"

آخر مصنف نے نتیجہ نکالا ہے کہ

"مذہبی جنون بلاشبہہ گذشتہ قرن کے سیاسی واقعات سے بہت مشتعل ہوگیا ہے۔ حتیٰ کہ آج مغرب سے مذہبی تمدنی و سیاسی نفرت نے وہ دماغی حالت پیدا کر دی ہے جو بالیقین امن دنیا کے لیے فال بد ہے۔ ہم کو موجودہ حالت کے امکانی خطرات کو خفیف سمجھ کر خود فریبی نہ کرنا چاہیے۔ محض اس وجہ سے کہ گذشتہ ۱۹۱۴ء میں جرمنی کے اغوا سے نوجوان ترکوں نے جس نمائشی "جہاد" کا اعلان کیا تھا وہ کامیاب نہ ہوا۔ یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ حقیقی جہاد بھی ناممکن ہے چنانچہ ایک جرمن فوجی افسر نے جو جنگ گذشتہ میں ترکی ملازمت میں تھا نہایت آزادی سے کہا ہے "جہاد محض تماشہ تھا کیونکہ یہ جہاد ہی نہ تھا" میں بیان کر چکا ہوں کہ کس طرح اکثر مسلمان چال کو سمجھ گئے اور اُنھوں نے جنبش تک نہ کی"۔

آج بھی ترکوں کی مذہبی حالت الآن کما کان ہے۔ جو لامذہبی جہاد کے بے اثر رہنے کی مددگار رہوئی وہ آج بھی موجود ہے۔ ترکوں نے شیخ الاسلام کا عہدہ توڑ دیا۔ خلیفہ کو پہلے تو ایک پوپ کی طرح قسطنطنیہ میں قائم کیا پھر اُسے نکال باہر کیا۔ ترکی دستور میں سے یہ قرارداد نکال دی گئی کہ سلطنت کا مذہب اسلام ہے۔ عورتوں نے اپنے خیالات ظاہر کیے کہ اسلامی قیود اور مسائل نے ہماری ترقی کو مسدود رکھا۔ اس طرح وہ یورپ کی علمبردار جنس لطیف کے نقش قدم پر چلنے لگیں۔ آج تصویر میں ہم مصطفٰے کمال کی بیوی کو بے نقاب اور فرانسیسی و انگریزی عورتوں کی طرح برہنہ سینہ و بازو دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب مسلمانوں میں ترکوں کے لیے وہ جذبۂ احترام و محبت نہ رہا جو سلطان عبدالحمید خاں ثانی کے وقت سے پیدا ہو کے ان میں ترکوں کے حق میں خروش ہمدردی پیدا کر دیا کرتا تھا۔ اطالیہ نے حال میں ترکوں سے لڑنے کی جو بحری نقل و حرکت کی تو مسلمانوں میں وہ ہیجان بالکل پیدا نہیں ہوا جو ہمیشہ ایسے موقعوں پر نمودار ہوا کرتا تھا۔ اس وقت گویا یہ ایک معمولی بات تھی۔ اب ترکوں کو اگر نقصان پہونچا تو مسلمانوں کو رنج تو ہوتا لیکن صرف اتنا جو وہ ایران، مراکو اور سرحد ہند کے متعلق محسوس کیا کرتے ہیں۔

غیر جو وعدے دول نے اس جنگ عظیم میں کیے تھے صلح ہونے پر اُنکی ایفا کے بجائے یہ ہوا کہ عرب پابزنجیر ہو گئے۔ مصر کی حالت میں کوئی بہتر فرق نہ تھا۔ قسطنطنیہ پر قبضہ ہوگیا اور ایک طرح ترکی سلطنت ناپید کر دی گئی۔ مسلمان چراغ پا ہوے اور جن مشرکوں سے دو گزوں کے فاصلہ پر رہتے تھے اُن سے

وہ حیرت انگیز طور پر متحد ہوگئے۔ اور سب مل کے یورپی طاقتوں سے زور آزمائی کرنے لگے۔ مغربی تمدن نے بھی یہ جذبہ پیدا نہیں کیا بلکہ یورپی صنعت و حرفت کے غلبہ نے بھی اس تنفر کو تیز کیا۔ اس فصل کو مصنف اس طرح ختم کرتا ہے:

"اب سوال یہ ہے کہ اقتصادی اتحاد بین اسلامی کا خاص نظام عمل کیا ہے؟ یہ نظام عمل آسانی سے بیان کیا جا سکتا ہے یعنی اسلام کی دولت مسلمانوں کے لیے عیسائیوں کی بجائے تجارت اور صنعت کا نفع مسلمان اٹھائیں اور مسلمانوں کے سرمایہ سے مغربی سرمایہ کو خارج کیا جائے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اراضی و معدنوں و جنگلات و ریلوں و محصولات کی ان مراعات کو ختم کرکے جن کی بدولت آج بلاد اسلامی کی دولت سواحلِ غیر کو کھنچی جارہی ہے۔ اسلام کے قدرتی ذرائع کو یورپ کی گرفت سے رہائی دلائی جائے"۔

تیسری فصل کا عنوان "مغرب کا اثر" ہے۔ اس میں دکھایا ہے کہ یورپ کی تہذیب کا ایشیا پر کیا اثر پڑا۔ ظاہری نقل بھی لوگوں نے کی ہے۔ یورپی لباس میں لوگ خوش ہوتے ہیں۔ طرز ماندوبود بھی یورپی ہوگیا ہے۔ اندرونی طور پر بھی ایشیا نے یورپ کی تقلید کی ہے۔ خیالات پر بھی بہت کچھ مغربی اثر ہے۔ پرانی باتیں مفقود ہوتی چلی جارہی ہیں۔ پرانی رسوم کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ ملک میں تار، ریلیں وغیرہ رائج ہوگئی ہیں۔ مصنف نے صاف طور پر مانا ہے کہ ریلوں وغیرہ کے متعلق ہندوستان پر ہمارا کوئی احسان نہیں۔ ہم اپنے منافعہ کے لیے ان چیزوں کو جاری کرتے ہیں۔

"مشرقی ملک پر یورپی حکمران ...... کو متعدد وجوہ سے اس ملک میں مغربی تہذیب کی اشاعت کی حمایت کرنا پڑی۔ محض ذاتی مفاد نے انکو مجبور کیا کہ ملک کو پرامن اور خوشحال بنائیں تاکہ نفع اٹھائیں"۔

ایشیائی مطلق العنان سلطنت کے بجائے ذمہ دار حکومت کے قائل ہوگئے۔ اب ہر طرف یہی جذبات ہیں اور ہندوستان نے بھی ایشیا کے اور ملکوں کی طرح ذمہ دار حکومت کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کردیے ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود ایشیا مغرب سے متنفر ہے۔ اور پرانے زمانہ کو آہیں بھر بھر کے یاد کیا کرتا ہے اور اُس زمانہ کو زریں عہد شمار کیا جاتا ہے۔ وہ کیا پُرلطف زمانہ تھا

کہ اپنی نیند سونا اور اپنی نیند اُٹھنا معمول تھا۔ اب کاروباری زندگی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ منٹ منٹ کی گھبراہٹ ہے۔ وہی مغربی تگا پو اور جلد بازی ہے اور قناعت مفقود ہے۔ اطمینان میسر ہے نہ دلجمعی۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ مغربی تسلط نے ایشیائی خودمختاری کا جگہ جگہ خاتمہ کر دیا۔ اور جنگ عظیم نے جو اُمیدیں ایشیائیوں کے دلوں میں پیدا کر دی تھیں اور جن کے متعلق کھُلم کھلا وعدے کیے گئے تھے، وہ محض سراب ثابت ہوئے۔ اس سے عام بے چینی پھیل گئی۔ یہ فصل اس طرح ختم ہوتی ہے:

"آج تو یہ حالت ہے کہ مشرق جو قدیم اور جدید کے نزاعات میں منقسم ہے وہ اس یورپ کے مقابل ہے جو نااتفاقیوں سے پاش پاش اور اپنی حماقتوں میں مبتلا ہے۔ غالباً اس سے قبل کبھی بھی دونوں دنیاؤں کے باہمی تعلقات میں ایسے بے شمار اور فتنہ انگیز امکانات کا موقع نہ تھا۔ یہاں پر قابل لحاظ یہ امر ہے کہ یہ اجنبی جدید مشرق جو ہمارے مقابل ہے زیادہ تر اُن مغربی اثرات کا نتیجہ ہے جو گذشتہ سو سال سے عدیم المثال طور پر مشرق میں اپنا عمل کر رہے ہیں"۔

چوتھی فصل میں "سیاسی تبدیلی" کا ذکر ہے کہ لوگوں کے عقائد میں تبدیلی ہو رہی ہے مطلق العنانی کے بجائے اب جمہوریت کی طرف میلان عام ہو رہا ہے۔ صاف طور پر کہا جا رہا ہے کہ مطلق العنان حکومت بدتر حکومت ہے۔ ترکی اور ایران کی آنکھیں کھُل گئی ہیں۔ اسلام جب تک جمہوریت پر چلتا رہا معراج ترقی پر رہا۔ خلفائے راشدین کا زمانہ اصلی جمہوریت کا آئینہ تھا۔ چنانچہ مصنف لکھتا ہے۔

"ڈابسری کہتا ہے "اسلام اس وقت بھی دنیا میں سب سے زیادہ جمہوری مذہب ہے یعنی یہ ایسا مذہب ہے جو حریت اور مساوات کا حامی ہے۔ اگر کبھی بھی کوئی دستوری حکومت تھی تو وہ خلفائے راشدین کی تھی"۔ مشرق ادنیٰ کا ایک بڑا انگریز ماہر بیان کرتا ہے "جمہوری سلطنت کی حقیقی اور صحیح تصویر قبائل عرب ہی میں ملیگی اور عرب قبیلہ کا ہر فرد اس جمہوریت کے قیام کے لیے ہر وقت مسلح رہتا ہے جیسا کہ بہت سے شخصی حکومت کے خواب دیکھنے والے بہت کچھ کھو کر واقف ہو گئے ہیں"۔ ............

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عقلمند ترین اصحاب سے مشورہ فرماتے تھے۔ علما بھی زمانہ موجودہ تک باہم مشورہ کرتے رہے ہیں۔ قانون مقدس یعنی اسلامی شریعت اصلاً جمہوری ہے۔ اور

اصلاً سلوکِ انسانی و شخصیت کے خلاف ہے"۔

اس کے بعد مصنف ہندوستان کی حالت پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے کہ اس ملک میں ہندوؤں کی ذاتوں کی تمیز دستوری حکومت کے راستہ میں حائل ہے۔ برہمن اپنے آپ کو "منجانب اللہ ملک کا حکمراں سمجھتے ہیں۔ اور دوسروں کو حق رائے دہندگی سے بھی باز رکھنا چاہتے ہیں" آخر اس نے ثابت کیا ہے کہ ہندوستان اصلاً و طبعاً جمہوریت کے ناقابل ہے اور بہت سے دور اندیش ہندی محسوس کرتے ہیں کہ ہندوستان سلف گورنمنٹ کے قابل نہیں ہوا ہے۔ اور اگر برطانوی اثر یہاں سے ہٹ جائے تو یہ ہندوستان کے لیے ایک بڑی مصیبت ہوگی۔ انگریزوں کا منشا ہندوستان میں ہندوؤں کو حکومت عطا کرنا نہیں ہے بلکہ سب چھوٹے بڑوں میں مساوات کے جذبات پھیلانا اور سب کو دنیا کی نعمتوں سے بہرہ ور کرنا ہے۔ مساوات کے سبق دے کے سب کو جمہوریت کے لیے طیار کیا جا رہا ہے۔ آخر میں مصنف لکھتا ہے :

"جنگ عظیم نے مشرقی قوم پرستوں کی قوتوں کو ایسا قوی اور یورپی اقتدار و قوت کو ایسا ضعیف کر دیا ہے کہ مشرق پر یورپ کا تسلط عام طور پر کم ہو رہا ہے۔ اس کا نتیجہ برا ہو یا اچھا لیکن بظاہر یہ ناگزیر ہے کہ ایک پشت یا ایک قرن کے بعد مشرق ادنیٰ و وسطیٰ کا بڑا حصہ خود مختار یا بالکل آزاد ہو جائے گا"۔

دوسری فصل کی طرح پانچویں فصل بھی دلچسپ ہے۔ سچ پوچھو تو یہی دونوں فصلیں اس کتاب کی جان ہیں۔ یہ فصل سب فصلوں سے زیادہ طویل ہے۔ مصنف نے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ قوم پرستی کے مختلف منازل کو تینوں حصوں میں جداگانہ زیر بحث لایا ہے۔ نسل اور قوم کی تمیز اس نے اس طرح کی ہے :

"قومیت اور نسل میں کیا فرق ہے؟ بدقسمتی سے ان دونوں اصطلاحات کا اگر بطور مترادف کے نہیں تو نہایت لاپروائی سے استعمال کیا گیا ہے ..... امر واقعہ یہ ہے کہ ان اصطلاحات سے بالکل مختلف امور مراد ہیں۔ قومیت ایک ذہنی ادراک یا دماغی کیفیت ہے۔ نسل ایک جسمانی واقعہ ہے جس کی صحیح تحقیق علمی آزمایش سے ہو سکتی ہے۔ مثلاً کاسۂ سر کی پیمایش۔ بالوں کی ساخت۔ اور آنکھوں اور کھال کا رنگ۔ بالفاظ دیگر انسانوں کی جو کیفیت جسمانی

ساخت کے لحاظ سے ہے اُسے نسل کہتے ہیں اور جماعت جو کچھ اپنے آپ کو سیاسی طور پر
سمجھتی ہے اُسے قومیت کہتے ہیں"

اس تعریف کے بعد اُس نے دکھایا ہے کہ جنگ عظیم نسلوں کی لڑائی تھی۔ قومیت کا خیال پہلے ترکوں میں پیدا ہوا۔ گو مصنف اس پر حیران ہے۔ کیونکہ اسلام خود چند لحاظ سے قومیت کا مخالف ہے۔ "کل مومن اخوۃ" کا اسلامی مسئلہ اور امامت یا عام خدائی جمہوریت کا اسلامی سیاسی نصب العین خالص قومی اماد کی شہنشاہی کی استقامت کا قدرتی طور پر سدّ راہ ہوا۔"

ہمارے ہندو برادران وطن ہم پر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ مسلمان پُرانے قصوں کو یاد کر کرکے "پدرم سلطان بود" کی رٹ لگائے رہتے ہیں اس سے ہندی قومیت کو صدمہ پہونچتا ہے۔ مسلمانوں کو اپنے ملک ہندوستان سے مطلق ہمدردی نہیں۔ باہر کی مسلمان قوموں کے حسرت و غم سے بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں وغیرہ۔ لیکن اُنھیں پُرانی تاریخوں کی اہمیت کا اس لیے احساس نہیں ہو سکتا کہ اُنکے اجداد کو بھی تاریخ کی تدوین وغیرہ کا ذرا بھی شوق نہ تھا۔ باایں ہمہ آج ہم لوگوں کی دیکھا دیکھی وہ بھی اس یادِ گذشتہ کے جذبے سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں۔ اپنے اخباروں میں زمانۂ سلف کے راجپوتوں کی جھوٹی سچی کہانیاں لکھ لکھ کے اپنے ہم قوموں کے جذبات کو برانگیختہ کیا کرتے ہیں۔ تاریخ کے قومی ارتقا میں ممد و معاون ہونے کا تازہ ثبوت خود ترکی ہے جس کے متعلق مصنف لکھتا ہے:۔

"یورپ کی طرح ترکی میں بھی قوم پرستی کی تحریک تاریخی روایات کے احیا اور زبان کی صفائی سے شروع ہوئی۔ نصف صدی قبل ترک اپنی اصل اور تاریخ سے بالکل نابلد تھے۔ اُن کو اپنے اجداد کے جنگی کارنامے اور اپنی سلطنت کے ولولہ انگیز واقعات محض قصص اور عجائب و خیال کی طرح یاد تھے اور وہ قومی تاریخ کے پڑھنے سے غافل تھے۔ دولت عثمانیہ کی فتوحات کے واقعات جو دنیا کے تین بڑے اعظموں سے تعلق رکھتے تھے عوام کے لیے ایسے دلچسپ نہ تھے جیسے کہ مذہبی مباحث یا آنحضرت صلعم کی حیات کا تذکرہ اور ابتدائی اسلام کے حالات۔ پیشوایان قوم پرستی نے اپنے ہموطنوں کو اُن کی تاریخی عظمت بتا کر گذشتہ پر افتخار اور آیندہ کے لیے اعتماد سکھایا۔"

مغرب کے تسلط اور تعدّی نے اس تحریک کو اُبھارا۔ سلطان عبد الحمید خاں کی تحریک پین اسلامی نے عربوں کے جذبات نفرت کو ٹھنڈا کر کے ترکوں سے متحد کر دیا تھا۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھی ان میں سرسراہٹ نظر آ جاتی تھی جو اپنے آپ کو آنحضرت صلعم کا ہمقوم سمجھ کے ترکی حکومت کو طوق غلامی تصور کرتے تھے۔ مختلف اوقات میں اُنھوں نے ہنگامہ آرائیاں کیں مگر سلطان عبد الحمید خاں کے تدبر نے اس آگ پر پانی کا کام کیا۔ لیکن اب

> "قوم پرستوں نے علانیہ طور پر کہا کہ ترکی کے طوق غلامی کو اُتار ڈالا جائے۔ اور عرب ممالک کو ایسی جماعت میں منسلک کیا جائے جس کا سرگروہ ایک مذہبی بااختیار غالباً شریف مکہ ہو۔ دراصل اس کا منشا یہ تھا کہ مغربی قوم پرستی کو ایک خدائی جمہوریت کے قدیم نصب العین کے مطابق بنایا جائے جس کی تکمیل بھی خلافت اور نجد کی وہابی حکومت کی صورت میں پہلے ہی ہو چکی تھی"۔

ان جذبات کو جنگ عظیم میں اتحادیوں کے ابلہ فریب وعدوں سے تقویت پہونچی۔ عربوں نے بغاوت کر کے ترکوں کی پشت میں جب وہ دشمن سے برسرِ جنگ تھے خنجر بھونک دیا۔ اتحادیوں کو اس سے اس قدر فائدہ پہونچا کہ ترک اور اُنکے اتحادی مغلوب ہو گئے۔ جب صلح ہوئی اور عربوں سے ایفائے وعدہ کا وقت آیا تو اُنھیں معلوم ہوا کہ ایک جال تھا جس میں اُنھیں پھانسا گیا۔ ایک انگریزی قصے کے مطابق اُنھوں نے بلّی کے پنجے کا کام دیا جو بندر نے بھڑکتی ہوئی آگ میں سے اخروٹ نکالنے کے لیے بلّی سے عاریۃً لیا تھا۔ اب عربوں میں اشتعال پھیل رہا ہے اور وہ اُس وقت کو پچھتا رہے ہیں جب اُنھوں نے اپنے ہم مذہبوں کو دھوکا دے کے اُنھیں مروا ڈالا۔ شریف مکہ کی ناعاقبت اندیش رہنمائی میں خدا جانے اُنھیں اور کیا کیا روز بد دیکھنے پڑیں گے۔ نام نہاد آزادی کے بعد اُس نے دامنِ خلافت ہاتھ میں لیا ہے۔ لیکن حالت یہ ہے کہ حاجی اُنکی جان کو روتے ہیں اور جو آرام ترکوں کے زمانے میں حاجیوں کو ملا کرتا تھا اب خواب و خیال ہو گیا ہے۔ یہی نہیں جانیں بھی خطرے میں پڑ گئی ہیں۔ چنانچہ مسلم آوٹ لُک لاہور بھی ہمدم لکھنؤ کے ایک خاص نامہ نگار کی چٹھی کا ذکر کرتا ہے کہ ۲۲ ہزار حاجیوں کا قافلہ جس میں زیادہ تر جاوا کے مسلمان تھے حج سے پہلے مکہ سے مدینہ روانہ ہوا۔ شاہ حجاز کی ہدایات کے مطابق ہر حاجی کو

مالعہ روپیہ فی اونٹ دینا پڑا۔ چنانچہ ان غریبوں نے رقم مطلوبہ ادا کی اور وہ حضور رسول مقبولؐ کے روضہ پر حاضری دینے کے لیے روانہ ہوئے۔ شتربانوں کو صرف مالعہ روپیہ فی اونٹ دیا گیا اور اُن کے ذہن نشین کیا گیا کہ شریف نے صرف للعہ روپیہ فی اونٹ اپنا حق رکھا ہے۔ سفر کی پانچ منزلیں طے ہوئی تھیں کہ اونٹ والوں کو معلوم ہوا کہ تقدس مآب خلیفۂ ساختہ نے للعہ روپیہ کا تو صرف بہانہ ہی کیا تھا، اُس نے فی اونٹ مالعہ روپئے سے کم غبن نہیں کیا۔ چھ ہزار بدوؤں کی پنچایت مدینہ سے دو دن کی مسافت پر منعقد ہوئی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ شریف سے یہ رقم واپس مانگی جائے۔ اور اگر وہ دینے سے انکار کرے تو حاجیوں کو رینج پر جو مکہ سے پانچویں منزل پر ہے اُنکی قسمت پر چھوڑ دیا جائے۔ اس نام نہاد "شاہ" نے اُس نگلی ہوئی رقم کو جیسی کہ توقع تھی اُگلنے سے صاف انکار کر دیا۔ رینج جھلسنے والی تپش، صحرائے بے آب وگیاہ کے لیے مشہور ہے۔ شریف کے انکار سے بہت سے اونٹ والوں نے حاجیوں کو اس جنگل بیابان میں چھوڑ کر اپنے گھر کی راہ لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً دو ہزار حاجی وہاں مر گئے اور اُنکی گلی ہوئی ہڈیاں شریف کی جان کو دعائیں دے رہی ہیں اور حالات موجودہ پر مرثیہ پڑھ رہی ہیں۔

خیر۔ عربوں کی موجودہ حالت کس نہج پر قائم رہے گی اور اس کا کیا انجام ہوگا خدا کو معلوم ہے۔ مصنف نے عربوں کے ساتھ ساتھ مصری قوم پرستی کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح مصطفےٰ کامل کے زمانہ میں اس تحریک کو ترقی ہوئی اور اُسکے بے وقت انتقال سے احمد فرید بے کے زمانہ میں کس طرح شدت اختیار کی گئی اور پھر برطانیہ نے کیا کیا سختیاں کیں اور اب ذاغلول کے زمانہ میں یہ قوم پرستی کس درجہ پر ہے۔ عارضی خلیفہ کے خواب ۱۹۱۲ء کے برطانیہ کے اعلانِ حمایت سے درہم برہم ہوگئے۔ بربرہ میں اتحادِ قومیت نہ تھا لیکن فرانسیسی تسلط نے وہاں بھی اشتراکِ عمل پیدا کر دیا۔ مصنف نے اتحاد بین الاتراک و بین التوران کا ذکر کیا ہے کہ یہ جنگ عظیم میں ظاہر ہوئے۔ بالشوک تحریک سے بین التورانی اتحاد والوں کو بڑی مسرت ہوئی اب ساری اسلامی دنیا میں ایک جوش رونما ہوگیا ہے:۔

"ایک سیلِ عظیم ہے جو ایشیا و ہندوستان اور افریقہ کی کل اسلامی دنیا پر موجزن ہے..."

ممکن ہے کہ بین الاسلامی قوم پرستی اس طرح مستقبل میں ایک جزوِ عظیم ہو جائے جس کا مقابلہ نہایت سنجیدگی سے کرنا ہوگا"

مصنف نے ترکی اور مصری ہیجان کا مفصل ذکر کیا ہے۔ مصطفےٰ کمال پاشا کی تحریک اور فتحیابی کا عمدہ خاکہ کھینچا ہے۔ وہ ان سب کی وجہ صلح کا نمائشی ہونا بتاتا ہے۔ دول کی نااتفاقی سے اس جوش کو تقویت پہونچی۔

فصل ششم میں مصنف نے "ہندوستان میں حمایتِ قومی" کا تذکرہ کیا ہے۔ ہندوستان کی معاشرت اور ہندوؤں کی ذات پات کے قاعدہ کی تفصیل کے بعد اُس نے نتیجہ نکالا ہے کہ

"متعدد اتحادات میں برہمنوں نے نیچ ذات والے ہندوؤں کے دل میں وہمکی دے کے یہ ڈر پیدا کر دیا ہے کہ جو برہمن کو روٹے نہ دیں گے وہ ذات باہر کیے جائیں گے اور پھر لیسے ایسے اچھوت ہو جائیں گے جن کو ہندو معاشرت میں کوئی حق حاصل نہ ہوگا"

مصنف نے ہندوستانی بےچینی کے منازل کانگریس کے ابتدائی انعقاد سے لے کے ۱۹۰۵ء کے تقسیم بنگالہ، بم بازی، کا ذکر کرتے ہوئے رولٹ ایکٹ کی بےچینی عدم تعاون کی تحریک تک بیان کیے ہیں۔ وہ آخر میں لکھتا ہے۔

"حقیقت معاملہ یہ ہے کہ آج ہندوستان ارتقائی اور انقلابی تبدیلی کی قوتوں کی رزمگاہ ہو۔ یہ پُرشور شر زمانہ ہے۔ پُرانا نظام بالبداہتہ گذر رہا ہے اور نیا نظام ہنوز نظر نہیں آتا۔ اس وقت اچھائی اور خرابی دونوں کے بڑے امکانات ہیں اور نتیجہ کے لیے کوئی شخص یقینی طور پر پیشین گوئی نہیں کر سکتا"

فصل ہفتم میں اقتصادی انقلاب پر بحث ہے۔ کسی زمانہ میں ہندوستان کی دستکاری مشہور تھی۔ دُور دُور اسکی مصنوعات جاتی تھیں۔ لیکن اُن میں وقت زیادہ لگتا تھا۔ اور اس قدر گراں تھیں کہ ہر کس و ناکس ان سے مستفید نہ ہوتا تھا۔ کپڑوں کے متعلق ذیل کی تحریر کافی ہے۔

"اس پارچہ بافی کی خوبصورتی اور نفاست کا حال حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ ململ کا ایک باریک تھان جو ۱۵ گز لمبا اور گز بھر عرض کا تھا اسکا وزن صرف نو سو گرین یعنی تقریباً ایک چھٹانک تھا یہ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر غازی نے اپنی لڑکی

کو اس امر پر سرزنش کی کہ اُس کا لباس کافی ستر پوش نہ تھا باوجودیکہ شہزادی نے کہا کہ میں ململ کی سات تہ پہنے ہوئے ہوں"

مغرب کی سستی چیزوں نے دیسی مصنوعات کو برباد کر دیا۔ لیکن اب سیاسی بیچینی نے اقتصادی تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ دیسی مصنوعات رواج پکڑتی جاتی ہیں۔ مغرب کے سے کارخانے جاری ہو گئے ہیں اور اب میلان طبع یہ ہے کہ یورپ کے مقابلہ میں ہر چیز مشرق میں ہی تیار کی جائے۔

فصل ہشتم میں معاشرتی انقلاب او فصل نہم میں معاشرتی بیچینی اور بوالشوزم کا ذکر ہے۔ اور آخر میں "نتیجہ" پر مصنف نے کتاب کو ختم کر دیا ہے کہ

"موجودہ شکست جو عظیم ہونے کے ساتھ ہی بہم بھی ہے اس نوزائیدہ مشرق کی دردزہ ہی ثابت ہوگی جو نئی دنیا میں عنقریب اپنا مقام اور وقار حاصل کرنے والا ہے"

یہ اس کتاب کا ایک سرسری خاکہ ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کتاب اس قسم کی ہے کہ اسے شروع سے آخر تک غور سے پڑھا جائے۔ اور یہی منشا مترجم صاحب کا ہے کہ ابنائے وطن اس کتاب کے آئینہ میں اپنے آپ کو دیکھیں اور اپنی ذمہ داریوں کو پہچانیں۔ جو برائیاں ہیں انھیں دور کریں اور جو فرائض اُنکے ذمہ ہیں اُنھیں ادا کریں۔

مصنف نے بہت صاف گوئی سے کام لیا ہے اور دقیق مسائل پر بہت کچھ غور و خوض کیا ہے۔ چنانچہ وہ شہنشاہیت کے اصول لارڈ کرومر کے الفاظ میں اس طرح ضبط تحریر میں لاتا ہے:

"شہنشاہی حکمت عملی بلاشبہ عاقلانہ و دوراندیشی سے نافذ ہونا چاہیے۔ اقوام محکوم سے ہمارے تعلقات جن اصول حکومت کی بنا پر قائم ہوتے ہیں وہ سیاسی اور اقتصادی طور پر صحیح اور اخلاقی طور پر قابل استدلال ہونا چاہییں۔ فی الحقیقت یہ شہنشاہی محراب کی درمیانی زینت ہے۔ شہنشاہیت کا اصل جواز ان کاموں سے ثابت ہوتا ہے جن میں شہنشاہی قوت صرف کی گئی ہے۔ اگر ہم اپنے اختیارات کا اچھا استعمال کریں تو ہم مستقبل کا مقابلہ بلا اس خوف کے کر سکتے ہیں کہ ہم اس قہر الہی میں گرفتار ہوں گے جو سلطنت روما کی بدنظمی پر نازل ہوا تھا۔ اگر معاملات اسکے برخلاف ہیں تو برطانوی سلطنت کا زوال واجب ہے۔ اور بالیقین آخرکار اُس کو زوال ہوگا"

مصنف نے عالمگیر بےچینی کے اسباب یہ بتائے ہیں کہ (۱) حاکم و محکوم میں اجنبیت پائی جاتی ہے۔ حاکم اپنے آپ کو ایک طرف کھینچتا ہے اور محکوم سے ملنا گناہ سمجھتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ محکوم اقوام کے دلوں میں زبردست منافرت پیدا ہوگئی (۲) تسلط کی شدت (۳) شہنشاہیت (۴) وعدہ خلافیاں۔

> مشرقیوں کی نظر میں اس جنگ کی تلافی آزادانہ نظام عمل تھا۔ جس کو اتحادی مدبرین نے اپنے پرچوں پر ثبت کیا تھا۔ لیکن جب جنگ ختم ہوئی اور اتحادیوں کو فتح حاصل ہوئی تو فوراً ہی پتہ چل گیا کہ عین اسوقت میں جبکہ اتحادی لیڈر آزادی کے وعدوں سے پر تقریریں کر رہے تھے تو اس کے ساتھ وہ تجزیۂ مشرق ادنیٰ کے لیے آپس میں نہایت حریصانہ ملک گیری کی خاطر متعدد خفیہ عہدنامے طے کر رہے تھے ........ یہی خفیہ عہدنامے تھے جن کی بنا پر... کل مشرق ادنیٰ و وسطیٰ یورپ کے سیاسی تسلط کے تحت میں آگیا۔

مصنف نے اس منافرت کی خلیج کو پُر کر دینا دونوں براعظموں کے لیے بہتر تصور کیا ہے چنانچہ لکھتا ہے

> مشرق اور مغرب دونوں نے ماضی میں ترقی کے لیے بہت کچھ کیا ہے اور مستقبل کے لیے ان سے بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں لیکن جو کچھ بھی حقیقتاً قابل قدر خدمت کرسکتے ہیں وہ اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ یہ دونوں فی نفسہ اپنی اصلیت پر قائم رہیں۔ اختلاط نسل سے انکی نسلی روح خراب ہوگی جس کا نتیجہ ہولناک دوغلاپن ہوگا اور جس سے صرف انحطاط اور تنزل ہی پیدا ہوگا۔

مصنف نے اسلام میں زبردست جمہوریت ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ اس موقع پر اس نے حضرت ابوبکرؓ کا خطبہ نقل کیا ہے۔

> اے قوم تم نے مجھ کو جو تم میں سب سے زیادہ نا قابل ہے اپنا خلیفہ منتخب کیا ہے۔ جب تک میں انصاف پر عمل کروں میری مدد کرو۔ اگر اسکے خلاف کروں تو مجھ کو نصیحت کرو اور انجام دہی فرائض کی یاد دلاؤ۔ چونکہ میں کمزور کا حامی ہوں میری اُسوقت تک اطاعت کرو جب تک کہ میں شریعت کا اتباع کروں۔ اور اگر تم یہ دیکھو کہ میں ذرہ بھر بھی شریعت سے انحراف کرتا ہوں تو میری اطاعت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

شخصی حکومت کی بُرائی بھلائی پر مصنف نے اچھی طرح بحث کی ہے جو قابل دید ہے۔ اس نے دکھایا ہے

کہ اچھی شخصی حکومت کے لیے زبردست اور طاقتور آدمی کی ضرورت ہے جس کی قابلیت اور جوش حیرت انگیز نتائج پیدا کرتے ہیں۔

اس کے عزم اور عمل سے وہ قوت محرکہ پیدا ہوتی ہے جو اسکے ماتحتوں کو کافی قابلیت سے کام کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ نالائق اور بے ایمان کی سزا ایسی سختی سے دی جاتی ہے جیسی کہ ایرانی شاہ نے ایک ظالم صوبہ دار کی کھال زندہ کھنچوا کر منصب کی کرسی کو منڈھوا دیا اور جدید گورنر نے اس پر بیٹھ کر معدلت گستری کی۔

وہ کہتا ہے کہ ایسے طاقتور آدمی کا بیٹا اکثر کمزور ہوتا ہے اور اُس میں باپ کی وہ قابلیتیں وراثتاً نہیں پہونچتیں جس کا نتیجہ خراب نکلتا ہے اور رعایا کو مصائب کا سامنا ہوتا ہے۔

مصنف نے ہندو مسلمانوں کے نقاطِ نظر کے فرق کو نہایت خوبی سے اس طرح دکھایا ہے۔

ہر جگہ کے مسلمانوں کے پیش نظر دو چیزیں ہیں - عرب جمہوریت کی سیاسی مثال اور ایسے مذہب کی تعلیم جس میں وسیع الخیالی کے رجحانات بہت زیادہ ہیں - خواہ یہ رجحانات اس مذہب کے متبعین کے باہم ہی کیوں نہ ہوں - ہنود کے پیش نظر نہ ایسی مثال ہے نہ ایسی تعلیم مذہب - انکی سیاسی روایت تو عملاً مشرقی تجرد و تشدد کا سلسلہ ہے جس کے مصائب سے کبھی نجات ہی نہ ملی - مستثنیات محض یہ ہیں کہ اوائلِ ایام میں چند ابتدائی خود اختیاری حکومت کی جماعتیں تھیں جن کا دائرۂ اثر کبھی وسیع نہ ہوا اور جو بہت جلد فنا ہوگئیں - مذہب براہمہ یعنی ہندو مذہب غالباً سب سے زیادہ تنگ نظر اعتقادات کا مجموعہ ہے جو بنی نوعِ انسان پر مسلط ہوا کیونکہ یہ جماعت کو ایسے لاانتہا غیر متبدل ذاتوں میں منقسم کرتا ہے جنکے درمیان کوئی باہمی ربط ممکن ہی نہیں - ہر ذات اپنے سے کمتر کو ناپاک و اچھوت اور جانوروں کے برابر سمجھتی ہے - یہ ظاہر ہے کہ ایسے موانع کی موجودگی سے مسلمانوں کے مقابلہ میں ہنود کے لیے حقیقی سلف گورنمنٹ کا قائم کرنا زیادہ دشوار ہوگا۔

ہندو مسلمانوں کے اتفاق کے متعلق صفحات ۲۵۴ - ۲۵۵ پر مترجم کا حاشیہ بہت زبردست ہے اور معلوم ہوتا ہے بہت ہی غور و خوض سے لکھا گیا ہے - وہ لکھتے ہیں کہ اتحاد کے تین وجوہ ہو سکتے ہیں - اشتراکِ خیال - اشتراکِ اغراض - اور مشترک منافرت - اشتراکِ خیال کے متعلق وہ مایوسی

ظاہر کرتے ہیں کہ جب ایک ہی ملت کے مختلف طبقات میں اشتراکِ خیال نہ ہو تو بدیگراں چہ رسد۔ اشتراک اغراض کے متعلق بھی ان کا جواب نفی میں ہے کہ ہندو محض اپنے آپ کو اس ملک کے باشندے تصور کرتے ہیں اور دوسروں کو دخل بیجا کا مرتکب۔ اسی وجہ سے انھوں نے پہلے تو مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملایا۔ جب اس اشتراک سے فوری فائدہ نہ پہونچا تو اب انکا غصہ مسلمانوں پر پڑا کر یا تو وہ ہندو قوم میں جذب ہو کے ایک نئی ذات قائم کریں اور یا وہ ہندوستان سے فنا ہو جائیں چنانچہ شودھی اور سنگھٹن کے سلسلے جاری کیے گئے۔ جس کا خمیازہ دہلی بھگت رہا ہے۔ اندیشہ ہے کہ یہ وبا دوسرے شہروں میں نہ پھیل جائے گو کم و بیش ہر جگہ موجود ہے لیکن اس قدر کشت و خون کی نوبت ایک وقت کہیں نہیں آئی۔ خود ہندوؤں میں بھی کشمکش ہے۔ اسوقت بظاہر متفق نظر آتے ہیں کہ کسی طرح شودھی پھیلے۔ لیکن وقت بے وقت مواد پھوٹ نکلتا ہے۔ چنانچہ وائیکوم ستیہ گرہ کی مثال تازہ ہے کہ برہمن وہاں کے اچھوتوں کو اس قدر حقیر تصور کرتے ہیں کہ ایک خاص فاصلہ پر اچھوت کو کھڑا ہو جانا پڑتا ہے۔ تاوقتیکہ برہمن گذر جائے اور خاص خاص راستوں پر ان غریبوں کو نکلنے کا حکم نہیں۔ اسی کے دور کرنے کے لیے وہ زندانوں کو پر کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عوام

انگریز حاکم ضلع کو پسند کرتے ہیں اور دائمی و ہمیں سکوت میں رہنے کے طالب ہیں۔ انکو انگریزوں پر اس لیے اعتماد ہے کہ وہ ہمیشہ سے غریب پرور ہیں۔ اور وہ نہ ہندو ہیں نہ مسلمان۔ اور ایمان داری کے لیے مشہور ہیں۔"

رہی مشترک منافرت۔ یہی اس اتحاد کی محرک ہوئی تھی۔ سلطنت سے دونوں کو نفرت تھی "حصولِ مدعا کی ناکامیابی اور وجوہِ منافرت میں کمی پیدا ہونے سے وہ اتحاد غائب ہو گیا"۔

اس تنقید میں میں اس پر بہت کچھ بحث کرنا چاہتا تھا لیکن اب وقت موزوں نہیں رہا۔ چاروں طرف بےچینی پھیلی ہوئی ہے۔ ایسی بحث سے اجتناب مناسب ہے جس سے خواہ مخواہ قیل و قال پیدا ہو۔ اسکے علاوہ تنقید ختم کرنے کی جلدی ہے۔ کم فرصتی کی وجہ سے اس میں غیر معمولی دیر ہوئی۔ اکثر ایسا ہوا کہ دو سطر لکھ کے اپنے کسی اور کام میں مصروف ہو جانا پڑا اور پھر پانچ چھ دن بعد قلم تنقید کے لیے ہاتھ میں لینا پڑا۔ پھر آدھا صفحہ لکھا اور مضمون کئی دن کے لیے رکھ دیا گیا۔

اشاعت اسلام کے متعلق مصنف نے جو کچھ لکھا ہے غور سے پڑھے جانے کے قابل ہے۔

اسلامی بیداری کے پہلے جھونکے نے اشاعت دین کی سلگتی ہوئی چنگاریوں کو نئے جوش سے جوش زن کر دیا۔ اور یورپ کے سوا ہر جگہ اسلام نے اپنی دور دراز سرحدوں پر توسیعی ترقی شروع کی (مصنف اس جگہ غلط بیانی کر رہا ہے۔ اسے اس کا علم نہیں۔ خود انگلستان میں اسلام سرعت سے پھیل رہا ہے اور قادیانی جماعتیں مختلف مغربی ملکوں میں اسلام کی اشاعت میں کامیاب جدوجہد کر رہی ہیں۔ محمد ظفر) ایک حد تک ہر مسلمان فطرۃً مبلغ ہے اور طبعاً اپنے مذہب کو غیر مسلم ہمسایوں میں شائع کرتا ہے لہذا یہ کام صرف مذہبی ماہرین دین ہی نے نہیں کیا بلکہ بیشمار سیاح تجار۔ اور غریب تارکان وطن مزدوروں نے بھی سرانجام دیا۔ بلا شبہ بہت سے فدائیان ملت نے اپنی زندگی اس کام کے لیے وقف کر دی۔ مذہبی جماعتوں پر یہ بالخصوص صادق آتا ہے۔ سنوسیوں نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں میں خاص امتیاز حاصل لیا۔ اور اُن قدرتی خانقاہوں یعنی نخلستان صحارا سے ہزارہا مربوط (زاہد) جن کی آنکھیں نور اسلام سے منور اور سینے جوش سے معمور تھے اسلام کی عجیب و غریب تعلیم کی نشر و اشاعت کے لیے چل کھڑے ہوئے۔ یہ لوگ از منۂ متوسط کے نصرانی گداگر راہبوں کی طرح جوش مذہبی سے مشتعل تھے۔ پچھلی صدی میں مغربی اور وسطی افریقہ کے حبشیوں میں اسلامی تبلیغ کی کامیابیاں غیر معمولی تھیں۔ ہر صاحب دل یورپی ناظر ایک ہی قصہ بیان کرتا ہے۔ بیس سال ہوئے ایک انگریز نے بہت ٹھیک لکھا کہ اسلام وسط افریقہ میں حیرت انگیز ترقی اور باطل پرستی کا استیصال کر رہا ہے۔ اسکے مقابلہ میں عیسائی تبلیغ ایک خرافات ہے ...... اسلام کو اپنی کامیابی پر اس قدر وثوق ہے کہ وہ اپنے سب سے اہم رقیب یعنی نصرانیت سے بالکل بے پرواہ ہے عیسائی تو فتح افریقہ کے خواب ہی دیکھتے رہے مگر مسلمان اُسکی تعبیر پوری کر رہے ہیں اسلام جنوب میں جس قدر بڑھ رہا ہے اس کا ثبوت حال کے ایک واقعہ سے اچھی طرح ہوتا ہے۔ چند سال ہوئے کہ افسران برطانیہ کو دفعۃً معلوم ہوا کہ اسلام نیاسا لینڈ پر تسلط کر رہا ہے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ یہ زنجباری عربوں کی کارگزاری ہے۔ انھوں نے اپنی تبلیغ سنہ ۱۹۰۶ء میں شروع کی۔ دس سال بعد جنوبی نیاسا لینڈ کے ہر موضع میں ایک اسلامی معلم اور خوش پوش

مسجد موجود تھی - اگرچہ یہ تحریک علانیہ یورپین کے خلاف تھی لیکن برطانوی حکام کو دوسری جگہ کے فسادات کے ڈر سے اسکو دبانے کی جرأت نہ ہوئی - بہت سے یورپی ناظرین کو اندیشہ ہے کہ کوئی دن جاتا ہے کہ اسلام دریاے زمبیسی کے پار جاکر جنوبی افریقہ میں داخل ہو جائے گا۔

ایک اور جگہ مصنف کی ذیل کی تحریر شوخی کی صدائے بے ہنگام کا نہایت موزوں جواب ہے -

اسلام کے عظیم اتحادی احساس سے غالباً سب سے بڑا پتہ اس امر کا چلتا ہے کہ اسلام کا اپنے پیرووں پر ایسا زبردست اثر کیوں ہے - کسی دوسرے مذہب کا اپنے پیرووں پر ایسا اثر نہیں ہے - اسلام نے نصرانیوں اور ہندؤوں[له] کے وسیع ممالک فتح کیے اور مجوسیت کو روے زمین سے نکال دیا - لیکن ایسی ایک بھی مثال نہیں ملتی کہ جو قوم ایک مرتبہ مسلمان ہوگئی اُس نے کبھی بھی ترک مذہب کیا ہو - یہ ممکن ہے کہ وہ بالکل مٹ گئے ہوں مثلاً اسپین میں مور - لیکن مٹ جانا ارتداد نہیں ہے ............

ترجمے میں بعض جگہ سلاست بالکل جاتی رہی ہے - بعض جگہ ترجمہ کی اُلجھن میں اُردو فقرے اس قدر پیچیدہ ہوگئے ہیں کہ پڑھنے والا اُکھٹ اُکھٹ گرتا ہے مثلاً

اس وقت سے یورپ کے امکانی تمدن اور بے رحمانہ مایوس کن حالت میں دست بدست لڑائی شروع ہوگئی -

ہر عمیق تبدیلی میں ناکارہ تحصل لازمی ہے -

انسانی تاریخ میں قسمتوں کے سبب سے بڑی تبدیلی کی صف آرائی و توسیع پذیر ہوگئی -

قدیم مشرق میں حیات کی بڑی بازی تھی -

اور اسی قبیل کی دیگر اقوام کی آبادی کی وجہ سے اتحاد بین الاقوامی کے مؤیدین کو قوراتی زمین پر مختلف ضخامت کی سلامتی تہ معلوم ہوتی تھی -

مسلمانوں کی بیداری کی اصلاحانہ شروعات فوراً زیادہ تعمیری راہوں پر دست پذیر ہوئیں

---

[له] اسلام نے صرف مذہب براہمہ کے وطن ہندوستان ہی میں قدم نہ جمایا بلکہ جزیرہ ہاے جاوا وساترا کی تقریباً کل آبادی کو مسلمان بنالیا جہاں کہ مذہب براہمہ کا پہلے بہت زور تھا۔

یہ لوگ نہایت پختہ اختصاص پسند ہیں"۔

"ہم میں سے ہر شخص سے میرا یہ سوال ہے کہ آیا اسکو اپنی زندگی کے کسی اہم ترین موقعہ پر ایک بڑے خاندان کی پرورش ہی حارج نہیں آئی ہے اور آیا اس کفالت کی بدولت ترقی کے ان موانع پر جو ابتدائی استعداد و اہلیت اور غیرمعمولی قابلیت کی وجہ سے حاصل تھے اثر نہ پڑا ہو"۔

اکثر جگہ ترجمہ میں بہت زیادہ انگریزیت ہے۔ چند فقرے نمونہ کے طور پر پیش ناظرین کیے جاتے ہیں :۔

"نصرانی مغرب سے جو ازمنۂ مظلمہ کی تاریک شب میں چھپا ہوا تھا اسلامی مشرق کا کھلا ہوا تقابل تھا"۔

انقلاب کا تموج ہوا میں ظاہر تھا"۔

محرک ان خانہ بدوش اقوام کے مغربی شعبے تھے۔

چند درس گاہیں جو ہولناک زوال میں باقی تھیں۔

مشرق پر مغرب کا موجودہ اثر بالکل ہی جدید ہے۔

یہ اس طور پر ان قوتوں کے ارتباط کے لیے جو احیاء مشرق کے لیے سرگرم عمل تھیں ہاتھ کا اشارہ تھے

وہ جوان ہو کر شاندار ظالم ...... ہو جاتا ہے۔

ہر جگہ پر خطر شورش کی کاشت کرکے اپنا اتحاد قائم کرنا چاہتی ہے۔

مغربی سرمایہ مشرقی ممالک میں بہنے لگا۔

روز افزوں موت کی بنا سلیٹ گورنمنٹ کی تنا ہی نہیں بلکہ حکمت عملی پر غصہ بھی ہے۔

مجوزہ اسکیم کی ساخت بہت پیچیدہ ہے۔ اور بعض تفاصیل میں ترقی کی ضرورت ہے۔ بالخصوص بالائی حصہ میں لیکن بہرحال یہ ایک ترقی کن تدبیر ہے۔

کہیں کہیں ترجمہ بالکل لغو اور مہمل ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر صفحہ ۱۱۸ - ۱۱۹ سر ولینٹائن چرول کے مختصر اشارات بالکل خارج از فہم عبارت میں ترجمہ کیے گئے ہیں۔

مطبع کی مہربانی تو اس کتاب پر یہ ہوئی ہی تھی کہ کہیں سے چھاپہ اڑا ہوا ہے اور کہیں سیاہی پھیلی ہے۔ کہیں صفحے بتھر پر غلط چپکا کے صفحوں کی ترتیب بگاڑ دی لیکن کاتب نے بھی سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔ مترجم کے رسم الخط کی اس نے خوب پابندی کی ہے۔ لکھنے میں جہاں مترجم نے

یاے مجہول کے بجاے یاے معروف لکھی وہاں اُس نے بھی اُسی طرح لکھ دیا - ملاحظہ ہو

کابلی کے فصیل کو ایسا منہدم کیا کہ کسی دوسرے چیز سے ایسا ممکن نہ تھا - مشرق کو مجبور کیا کہ اپنے پرانی ڈگر کو چھوڑکر خواب و خیال کے بجاے حقیقت اشیا کے اثبات کا محاسبہ ایسا ہی کرے جس طور پر اس واقعاتی دنیا میں موجود ہیں -

بلا خوف انقلاب اور بدنظمی اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابلیت کے لیے عارضی طور پر آزادی کے محرومی سے راضی ہیں -

کتابت میں غلطیاں بھی ہیں - ایک اقتباس کافی ہے -

پرچہ جات موت ایشوع اخبارات کے ذریعہ سے -

مترجم کی تاریخ دانی قابل داد ہے - جہاں مصنف کی عبارت میں کوئی تاریخی تلمیح آئی ہے مترجم نے فوراً نیچے حاشیہ دیا ہے اور اکثر حاشیے بہت مفصل ہیں - جس سے اس ترجمہ کی خوبی بڑھ گئی ہے - آخر میں ایک نقشہ بھی دیا ہے جس میں رنگوں اور نقطوں کے ذریعہ اسلامی ممالک اور مخلوط اسلامی آبادی وغیرہ کے حدود دکھائے گئے ہیں - اس کتاب میں فہرست مضامین نہ ہونے سے بڑا نقص رہ گیا ہے -

کتاب دیباچہ کے علاوہ الناظر کی تقطیع اور اسی قسم کے کاغذ پر ۲۴۴ صفحوں پر چھپی ہے - اور قیمت عہ ہے - مولوی محمد سلیمان صاحب میونسپل کمشنر - قاضی ٹولہ بدایوں سے یا دفتر رسالہ الناظر لکھنؤ سے مل سکتی ہے - ناظرین منگا میں اور پڑھیں -

محمد ظفر

# کلام امیر

(۱)

بل پڑگئے کمر میں قربان گدگدی کے　　آتے مزے ہیں کیا کیا خلوت میں دل لگی کے
بیٹھے ہیں سامنے وہ بیخود بنا ہوا ہوں　　صہباے حسن کو میں آنکھوں سے اپنی پی کے
زخموں سے دل ہے رنگیں داغوں سے سینہ روشن　　کیا کیا صلے ملے ہیں یہ ہم کو دوستی کے

رہتا ہے محو ہر دم وہ حسن مہوشاں میں — دشوار اب ہے جینا، الجھن ہیں گریہ جی کے
عالم سکوت پرور، دل میں خیال اُن کا — آتے مزے ہیں کیا کیا، دریا پہ، چاندنی کے

—:(۲):—

توڑو جمود اپنا، میٹو نہ اپنی ہستی — چمکو! تڑپ دکھاؤ! میداں میں زندگی کے

—:(۳):—

قبروں پہ بیکسوں کی حسرت برس رہی ہے — سوتے پڑے ہیں غافل، سایہ میں بیکسی کے

—:(۴):—

کشمیر دیکھو جا کر گلشن ہے ایشیا کا — منظر ہیں روح پرور، ساماں ہیں دل لگی کے
اے کاش دیکھیں جا کر ہم جلوۂ بنارس — کیا صبح کا سماں ہے، کیا رنگ ہیں خوشی کے

—:(۵):—

سب راز کن فکاں کے وہ دل سے کہہ رہے ہیں — سرگوشیاں ہیں کیا کیا سجدوں میں بندگی کے

—:(۶):—

برسات کا موسم :-

برسات کا ہے موسم، دریا ہیں گنگناتے — کلیاں چٹک رہی ہیں، عالم ہیں کیا خوشی کے
بادل گھرے ہوئے ہیں رقصاں ہیں بجلیاں بھی — چھڑ جائیں ساز عشرت، ہوں دور میکشی کے
جنگل ہرے بھرے ہیں چشمے اُبل رہے ہیں — سرسبز وادیاں ہیں، منظر ہیں دلکشی کے
ہیں آبشار جاری، نہریں بھی بہ رہی ہیں — ہیں مست سب پپیہے پی کی شراب پی کے
چرواہا گا رہا ہے بنسی بجا رہا ہے — سبزے پہ لوٹتا ہے عالم میں اک خوشی کے
آباد میکدے ہیں، رندوں میں ہیں تلاطم — ہیں جوش پر اُمنگیں، چرچے ہیں عاشقی کے

ہر شعر اس زمیں کا دل میں اُتر رہا ہے
یہ بول سارے گویا نغمے ہیں عاشقی کے

محمد امیر (اورنگ آبادی) بی اے

# تصوّف

تصوف کا مسئلہ ہر زمانہ میں فکر و نظر کا جولان گاہ رہا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسکا دارومدار بحث و تمحیص سے زیادہ ذوق و وجدان پر ہے۔ ایک ناواقف آدمی کے سامنے شکر کی ماہیت پر جسقدر گفتگو چاہو کرو، وہ اذعان و یقین حاصل نہیں ہو سکتا جو شکر کے چکھ لینے سے ہوتا ہے۔

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

مضمون ہذا میں ہم جس نقطۂ نظر سے تصوف پر بحث کریں گے اُس میں نہ تحقیق کا دعویٰ ہے نہ وجدان کا۔ مقصود صرف یہ ہے کہ یہ دکھایا جائے کہ تصوف کے عقائد کس ماحول میں پیدا ہوئے اور اُن سے ملتِ اسلامی پر کیا اثر پڑا۔ اسکے لیے یہ مناسب ہے کہ پہلے تعلیم اسلامی کے اولیں اصول پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے۔

## اسلام کے اولیں اصول

اسلام جب دنیا میں آیا فضائے عالم کفر و شرک اور انواع معاصی و مناہی سے گونج رہی تھی۔ اسلامی تعلیم نے دفعتًا علم و عمل کی دُنیا میں کایا پلٹ کر دی اور متشرک اور بد اعمال انسانوں کو موحّد اور صالح بنا کر انسانیت اور روحانیت کا اعلیٰ معیار قائم کر دیا۔ وہ صاف اور سادہ اصول جو ہادیِ اسلامؐ نے مخلوق کو پہونچائے یہ تھے:۔

(۱) خدا ایک ہے اور اُسکے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں۔ ذات و صفات میں کوئی اُسکا شریک و نظیر نہیں۔ یہ اعتقاد عمارتِ اسلامی کا اولیں سنگِ بنیاد ہے اور یہی تمام انبیاؑ و رسلؑ کی زندگی کا مقدس مشن رہا ہے۔ سرورِ عالمؐ اور صحابہؓ کی حیاتِ عملی کا ایک ایک لمحہ اس عقیدہ کا آئینہ نظر آتا ہے۔ مختصر یہ کہ قرآن مجید کا کوئی ورق اگر بلا قصد بھی اُلٹیے گا تو اسی عقیدہ کی صراحت پائیے گا۔

(۲) رسالت۔ پیغمبروں۔ کتابوں۔ اور فرشتوں پر ایمان لانا۔ گویا معرفتِ الٰہی ایک اہم مقصود ہے جسکی یہ ضروری سیڑھیاں ہیں۔

(۳) حشر و بعث کہ تمام اعمال کی سزا اور جزا کا فائدہ بغیر اسکے مترتب ہونا ممکن نہیں۔

اسکے ساتھ ہی عبادات و معاملات میں بھی اسلام نے ایک ایسی راہ عمل پیش کی ہے جس سے بہتر خیال میں نہیں آ سکتی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان میں تصوف کے عقائد و اعمال کی جھلک بھی پائی جاتی ہے یا نہیں دُنیا جانتی ہے کہ اور مذاہب کے برخلاف اسلام Form اور Spirit (صورت و معنی) دونوں کا جامع ہے۔ نہ وہ یہود کے مذہب کی طرح چند رسمی اعمال اور پابندیوں کا دستور العمل ہے اور نہ عیسائیوں کے دین کے مانند کچھ اخلاقی اور روحانی ہدایتوں کا مجموعہ۔ بلکہ وہ ایک مکمل قانون ہے جو دن میں سریرِ حکومت پر متمکن رہ کر جہاں بانی کے اصول پر کاربند ہونے کی تعلیم دیتا ہے، اور شب کو بوریائے فقر پر بیٹھ کر ریاضت و مجاہدہ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ جو ایک طرف جسم کی طہارت کے ضمن میں غسل و وضو کے فرائض و واجبات سکھاتا ہے اور دوسری طرف قلب کی پاکیزگی کے سلسلہ میں تسلیم و رضا کے نکات بتاتا ہے۔ غرضکہ مسلمان کی زندگی کا کوئی شعبہ نکاح و بیع کے احکام سے لیکر سونے اور جاگنے کے آداب تک اس عالمگیر احاطہ سے باہر نہیں۔ ان تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کی حقیقت ایک ہی ہے مگر اُسکے دو پہلو ہیں۔ شریعت و طریقت۔ ہم سہولت کی غرض سے احکامِ ظاہر کو شریعت، اور تصوف و حقیقت کے اسرار کو طریقت کہیں گے۔ یہ اگرچہ اصطلاح میں خفیف سی ترمیم و اصلاح ہے مگر لا مناقشۃ فی الاصطلاح۔

یوں سمجھیے کہ حضورِ پُر نُور سے جو دین ہم تک پہونچا ہے اُسکی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ تصفیۂ ظاہر و تزکیۂ باطن۔ زید نماز پڑھتا ہے۔ ایک فقیہ کی نظر جن امور پر جائے گی وہ یہ ہیں۔ کیا اُس نے طہارت کی شرائط پوری کری تھیں۔ اور واجبات و سنن اور تعدیل ارکان میں کوئی کمی تو نہیں ہوئی؟ مکروہات و مفسدات صلوٰۃ تو عارض نہیں ہوے؟ مگر ایک صوفی کی نظر یہ تلاش کریگی کہ نماز حضورِ قلب سے ادا ہوئی یا نہیں، اور استقبالِ بیت کے ساتھ ربِ البیت کی طرف بھی دل رجوع ہوا یا نہیں؟ اگر یہ تصوف ہے (اور بیشک یہی صحیح اسلامی تصوف ہے) تو کہنا چاہیے کہ شریعت ایک جسم ہے اور طریقت (تصوف) اُسکی روح۔ قرآن حکیم کی متعدد آیات جن میں صدق و خلوص کی تاکید اور ظاہر الاثم و باطنہ سے بچنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے اگر طریقت کی جان نہیں تو اور کیا ہیں۔ احادیث رقاق جو زہد و توکل صبر و رضا کے فضائل سے مالامال ہیں، تصوف کا ماخذ نہیں تو آخر کیا ہیں؟ حدیث جبرئیل جس میں حضرت جبرئیل

نے جناب رسول خدا روحی فداہ سے احسان (تصوف) کی تعریف پوچھی ہے اور جواب میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اپنے رب کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اُسکو دیکھ رہے ہو، اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم سے کم یہ سمجھو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ دیکھو اور بتاؤ کہ یہ نکتہ اگر حقائق و معارف کا خلاصہ نہیں تو کیا ہے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی برکات صحبت سے حصہ لینے والے جس انقطاع اور توکل کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ تاریخ سے پوشیدہ نہیں۔ یہاں تک تو تصوف کی اصل ہمیں خود اسلام اور شارع اسلام کی تعلیمات میں ملتی ہے۔ اس سے زیادہ جو عقائد و اعمال اس میں اضافہ کر لیے گئے اُن کا ذکر آگے آتا ہے۔

اس جگہ ایک شبہہ کا رفع کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بعض لوگ شریعت و طریقت کو دو متناقض حقیقتیں شمار کرتے ہیں مگر حق یہ ہے کہ

## شریعت و طریقت جدا نہیں

اس لیے کہ یہ دونوں اگرچہ دو متمائز نام ہیں مگر اصل میں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ انکو مخالف جاننا ہی گمراہی اور اسلام میں تفرقہ اندازی ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ شریعت ظاہریوں کیلیے ہے اور طریقت ماجدلوں کے لیے یعنی اہل باطن سے تکالیف شرعیہ ساقط ہو جاتی ہیں، وہ کھلم کھلا الحاد کی تعلیم دیتے ہیں۔ ملاحدۂ باطنیہ نے بھی ایک زمانے میں ظاہر[عہ] و باطن کی تقسیم کی آڑ میں پناہ لی تھی اور اپنے تمام مزخرفات کی اصل اپنے نزدیک کتاب و سنت سے نکال لی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہوتا ہے جس پر سوائے امام کے کوئی مطلع نہیں ہو سکتا۔ اُسی وقت بلکہ اُس سے پہلے علمائے حق نے عقائد و کلام میں اسکی صراحت کر دی تھی کہ تمام نصوص قرآن و حدیث اپنے ظاہر پر حمل کی جائیں گی تاوقتیکہ کوئی صارف قطعی نہ ہو۔ شکر اللہ مساعیہم۔ واقعی اگر اُس فتنہ کا جلد سدباب نہ کیا جاتا تو شریعت مطہرہ سے امان اُٹھ جاتی اور دین متین میں رخنے پڑ جاتے۔ ایک مسلمان کے نزدیک حج سے مراد طواف کعبہ اور ادائے مناسک وغیرہ ہے لیکن ایک باطنی کے نزدیک نیت و خلوص سے امام کی خدمت میں حاضر ہونا حج کا نعم البدل ہو سکتا ہے۔ فشتان بینہما۔ اس ضروری تمہید کے بعد ہم تصوف کے اصل پر

عہ بعض حکمائے باطنیین نے احکام شریعت کے اسرار و مصالح پر کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً احیاء علوم الدین اور حجۃ اللہ البالغہ مگر اس میں اور باطنیین کی بحث میں بڑا تفاوت ہے۔

غور کریں گے۔ پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لفظ تصوف کی حقیقت کیا ہے ؟

**لفظ تصوف کی اصل** اسکے متعلق مختلف توجیہیں بیان کیجاتی ہیں :

(۱) تصوف عربی لفظ صفا (پاکیزگی) یا صَوت (یکسوئی) سے ماخوذ ہے کیونکہ تصفیۂ قلب اور انقطاع علائق تصوف کے خاص ارکان ہیں۔

(۲) بعض اس لفظ کو صُفّہ یا صوفہ سے ماخوذ بتاتے ہیں۔ اصحابِ صُفّہ رسول کریمؐ کے چند صحابہ تھے جو ایک چبوترے (صُفّہ) پر بیٹھے رہتے تھے اور جو دنیا اور مال دنیا میں سے کسی چیز کے مالک نہ تھے حتی کہ لباس و مسکن بھی نہ رکھتے تھے۔ صوفہ کے متعلق مشہور ہے کہ ایام جاہلیت میں ایک قوم تھی جو تجرد و تجرید کی زندگی بسر کرتی تھی، اور خدمت خلق میں اوقات صرف کرتی تھی۔

(۳) بعض لوگوں کے نزدیک تصوف کا ماخذ لفظ صُوف (پشمینہ) ہے چونکہ حضرات صوفیہ موٹے جھوٹے لباس کے عادی تھے لہذا اس نام سے موسوم ہوے۔

توجیہاتِ بالا میں نمبر ایک کی تائید پورے طور پر لغاتِ عرب سے نہیں ہوتی۔ نمبر۲ قرین قیاس ہے لیکن تاریخی سلسلہ قائم کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ نمبر۳ غالباً سب سے زیادہ صحیح ہے اور پشمینہ پوشی کا استعمال صوفی حضرات کے لیے اکثر دیکھا اور سنا گیا ہے۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تصوف کی ابتدا کیونکر ہوئی ؟

**تصوف کی تاریخ** واقعہ یہ ہے کہ لفظ تصوف کی طرح خود تصوف کی اصل بھی ایک تاریخی عقدہ ہے جسکے حل کرنے کے لیے مختلف نظریے پیش کیے گئے ہیں۔

(۱) بعض حضرات کا خیال ہے کہ تصوف کے اسرار و غوامض خود حضور سرورِ عالم سے سینہ بسینہ خلفاء کرام اور اُن سے اولیاے عظامؒ تک پہونچے ہیں۔ انکے نزدیک احکام شریعت کے علاوہ جو قرآن و حدیث میں موجود ہیں ایک علم باطن تھا، جو ہر کس و ناکس کو نہیں بتایا جاتا تھا اور جسکی عام نشر و تبلیغ ممنوع تھی۔ چنانچہ وہ علی الخصوص جناب مرتضویؓ کو اس علم سینہ کا حامل سمجھتے ہیں اور اپنی تائید میں بعض احادیثؑ لاتے ہیں۔

عہ حضرت ابوہریرہؓ سے ایک قول منقول ہے کہ مجھے رسول خداؐ نے بعض ایسے امور کی خبر دی ہے کہ اگر بیان کروں تو میرا گلا کاٹ ڈالا جائے۔ اس میں دراصل آنے والے فتنوں کی طرف اشارہ ہے۔

(۱) بعض لوگ اسکو غیر ممالک کا پودہ جانتے ہیں جو بلاد اسلامیہ میں آکر پھلا پھولا۔ اُنکے زعم میں جب اسلامی فاتحین نے دوسرے ملکوں پر حملہ کیا اور اُنکو مسخر کرلیا تو مفتوح اقوام نے پورے طور پر قوم اُنکے عقائد اور عبادات کو قبول نہ کیا البتہ کچھ اُنکے عقیدے اختیار کیے اور کچھ اپنے عقیدے بطور ردِ عمل اُن میں جذب کر دیے۔ جس سے تصوف وجود میں آیا۔ اب پھر متعدد نظریات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک گروہ ہندوستان کو ان خیالات کا ماخذ قرار دیتا ہے، دوسرا یونان کو۔ تیسرا ایران کو۔ وللناس فیما یعشقون مذاہب۔

(۲) کچھ لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ تصوف کے خیالات کسی نہ کسی صورت میں ہر زمانہ اور ہر قوم میں پائے جاتے ہیں اور علمی اور دماغی ارتقا کے خاص دور میں ہر جماعت کے اصحابِ فکر و نظر ان عقائد سے معمور نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف بلاد جنکے مابین کوئی تاریخی رشتہ نہیں رہا ہے تصوف کے میدان میں متحد منازل؎ طے کرتے دیکھے جاتے ہیں۔

اب مذکورہ بالا نظریات پر اگر غائر نظر ڈالی جائیگی تو ہم کو صاف معلوم ہو گا کہ توجیہ نمبر ۱ ابھی تاریخی حیثیت سے محتاج توثیق و تصدیق ہے۔ اور جب تک قطعی شواہد ہمارے سامنے نہ آئیں ہم اسکو ایک نظریہ؎ سے زیادہ وقعت نہیں دے سکتے۔ نمبر ۲۔ اگرچہ علم النفس کا ایک مسلمہ مسئلہ ہے لیکن اسلامی تعلیمات میں نفس تصوف کا وجود ہوتے ہوئے ہمکو اس نظریہ سے بھی استمداد کی حاجت نہیں۔ لامحالہ یہ ماننا پڑیگا کہ تصوف جسکی اصل تعلیم نبوت میں نمایاں طور پر ملتی ہے اور جو ہادی اسلام اور صحابہ کی مقدس زندگی کا نصب العین رہا ہے یقیناً اسلام کی تعلیمات سے براہِ راست استنباط کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ ہم محض اسلامی تصوف سے بحث کر رہے ہیں اور قرآن اور نزول قرآن کے زمانہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے

---

؎ کہا جاتا ہے کہ نوشیرواں کے زمانے میں چھ حکمائے یونان فارس میں پناہ گزیں ہوئے اور اُن سے تصوف کے خیالات عجم میں اور عجم سے عرب میں پھیل گئے۔

؎ چنانچہ ہندوستان کی ویدانت فلاسفی جسپر ہندو سنیاس کا دارومدار ہے اور یونان کی اسٹوئک Stoic فلاسفی اور عیسائی مذہب میں کوئیکرس Quakers کے عقائد باہم ملتے جلتے اور تصوف کے اصول سے الگ بھگ پائے جاتے ہیں۔

؎ اس نظریہ میں ایک غلطی یہ بھی پائی جاتی ہے کہ قبل اس کے کہ مسلمان ان غیر ممالک سے مختلط ہوں تصوف کے خیالات اُن میں سرایت کر چکے تھے۔

مآب علیہ السلام کی حیاتِ مقدس سے خاص طور پر استشہاد چاہتے ہیں چند سوال خود بخود ذہن میں پیدا ہو جاتے ہیں -

کیا اسلام کی سادگی ان پیچیدہ غوامض کی متحمل ہو سکتی ہے ؟ کیا نام نہاد تصوف کا ثبوت قرآن و حدیث سے اسی طرح ممکن ہے جس طرح توحید اور نماز وغیرہ کا ؟ کیا سرورِ عالم اور آپ کے صحابہ وحدت وغیرہ کے عقائد کو اسی طرح مانتے تھے جیسے اکثر صوفی اکابر کی تصانیف سے ثابت ہیں وغیرہ وغیرہ - درحقیقت یہ بہت نازک مسئلہ ہے لیکن اگر ہم کتاب و سنت کی روشنی میں دیکھیں گے تو نظر آئیگا کہ جس طرح دیگر امور میں مابعد کے زمانوں میں افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے تصوف بھی اس غلبہ سے نہ بچ سکا - اسی سلسلہ میں تصوف کی تاریخی حیثیت اور نیز اُسکی مذہبی منزلت واضح کرنے کے لیے ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ تصوف اسلام میں سب سے پہلے کس نے اختیار کیا ؟ جہاں تک تحقیق ہوا ہے صحابہ کے زمانہ میں تصوف کے مخصوص عقائد کا کہیں پتہ نہیں چلتا - تابعین کے آخر زمانہ میں شاذ طور پر کہیں کہیں اُس کی جھلک نظر آتی ہے سب سے پہلے جس نے صوفی کا لقب اختیار کیا ابو ہاشم شامی تھے جنکی وفات تقریباً ۱۹۵ھ میں ہوئی ہے - ابتدائی صوفیہ میں یحییٰ بن معاذ رازی ابراہیم بن ادہم - داؤد طائی ، فضیل بن عیاض ، رابعۃ العدویہ ، سفیان ثوری کے نام گنائے جا سکتے ہیں - یہ سب اکابر امت ۲۰۰ھ کے لگ بھگ گذرے ہیں - مگر حق یہ ہے کہ اُسوقت تک تصوف محض اسی قدر تھا جسکا جلوہ سیدنا علی مرتضیٰؓ کی ذات میں نظر آتا ہے یا حضرت ابو ذرؓ کی -

اس سرسری اور اجمالی تبصرہ سے کم از کم اسقدر ذہن نشین ہو گیا ہوگا کہ تصوف کے خصوصیات کیا ہیں - لیکن ہم کسی قدر تفصیل سے اربابِ تصوف کے مخصوص عقائد اور اصول پر بحث کریں گے -

## اہلِ تصوف کے خاص عقائد

پروفیسر براؤن نے اپنے خاص ادبی انداز میں تصوف کو بجائے ایک *definite movement* (معین تحریک) کے *indefinite immobility* (غیر معین سکون) سے تعبیر کیا ہے - یہی وجہ ہے کہ ایک

---

ﮯ اس دور کے بعد مشہور صوفیائے کبار کا زمانہ آتا ہے جو اس فن کے امام مانے گئے ہیں - مثلاً حضرت جنید بغدادی شیخ شبلی - بایزید بسطامی - وغیرہم - جن اکابر سلف کی تصانیف میں اصول تصوف مدون ہوئے ہیں انہیں حضرت امام غزالی اور محی الدین ابن عربی کے نام لیے جا سکتے ہیں -

صوفی دیگر اہلِ مذاہب کے برخلاف اپنے عقائد کی نشر و تبلیغ پسند نہیں کرتا - اور جد و جہد کے بدلے خاموشی اور سکون کا حامی ہے - ہم یہاں پر تصوف کے مشہور عقائد کا حوالہ دینا مناسب سمجھتے ہیں -

(۱) ذاتِ باری تعالیٰ وجودِ بحت - خیرِ محض اور حُسنِ مطلق ہے - اُسکی صفات عالمِ کون کے اندر بیشمار آئینوں پر اپنا پرتو ڈال رہی ہیں - ماسوا اللہ کا وجود صرف اسی قدر ہے جسقدر آئینہ کے عکس کا - جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ، اربابِ شرع کا اعتقاد توحید کے بارے میں یہ ہے کہ خدا ایک اور بےمثل ہے - وہ مخلوق سے الگ ایک ازلی اور ابدی وجود ہے - بخلاف اسکے اہلِ طریقت کا عقیدہ یہ ہے کہ وجود صرف ایک ہے - ماسوا اُس عالم بیرنگی میں محض اعتباری تعینات کا حکم رکھتے ہیں - حباب ، موج ، گرداب وغیرہ بظاہر متعدد تشخصات ہیں مگر حقیقت میں ایک دریا ہی ہے جو مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے - علمائے ظاہر یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ مخلوق عدم سے وجود میں آتی ہے اور اجل ہونے کے بعد مٹ جاتی ہے (اگرچہ روح باقی رہتی ہے) دوسری طرف اہلِ باطن کا اعتقاد ہے کہ مخلوق علیحدہ چیز نہیں بلکہ اُسی وجودِ مطلق سے نکلی ہے اور اُسی میں مل کر فنا ہو جائیگی - یہ مسئلہ تصوف کی اصل الاصول ہے -

(۲) اہلِ شریعت نقل کے بعد اشیاء اور حقائقِ اشیاء کے ادراک کے لیے حواس اور عقل کو کافی سمجھتے ہیں - مگر اصحابِ طریقت اُسکے ساتھ ہی ایک حاسۂ باطنی کا وجود بھی مانتے ہیں - جس سے مراد علمِ لدنی یا کشف ہے جو حضراتِ انبیاءؑ و اولیاءؒ کے ساتھ مخصوص ہے -

(۳) سببِ آفرینش و حقیقتِ گناہ - وجودِ مطلق نے (جو خیرِ محض بھی ہے) بموجب الاشیاء تعرف باضدادہا اپنے آپ کو عدم و وجود کے مظاہر میں ظاہر کیا - کُنتُ کنزاً مخفیاً فاحببت ان اُعرف فخلقت الخلق اور ان اللہ خلق آدم علیٰ صورتہ اس دعوے پر شاہد ہیں - اور اسی سلسلہ میں دُنیا میں گناہ اور غم بھی پیدا ہوئے - جس طرح ظلمت روشنی کے نہ ہونے کا نام ہے اسی طرح گناہ نیکی کے نہ ہونے کو کہتے ہیں - گویا گناہ تو کوئی مستقل وجود نہیں رکھتا - گناہ سے بچنے کی کیا صورت ہے ؟ اسکے لیے اربابِ تصوف یہ نسخہ تجویز کرتے ہیں کہ اگر ہم مظاہر کو نیہ

کو سرتاپا بے اصل سمجھیں اور ہستی کو جو تمام احساسات کی ذمہ دار ہے سرے سے موہوم جانیں تو گناہ اور (غم بھی) بے حقیقت ثابت ہوں گے۔

(۴) محبت - ارباب تصوف کے نزدیک محبت تمام زندگی کا حاصل ہے اور اسی لیے بام حقیقت تک پہونچنے کے واسطے محبت مجاز کا زینہ ایک حد تک لازمی قرار دیا گیا ہے کہ المجاز قنطرۃ الحقیقۃ۔

(۵) تصوف بجائے Socialistic (اجتماعی) شان رکھنے کے Individualistic (انفرادی) حیثیت رکھتا ہے اسی لیے وہ تبلیغ و اشاعت کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

(۶) صوفیوں کے یہاں سلوک کے متعدد مقامات مانے گئے ہیں مثلاً فکر، حیرت، بقا، فنا وغیرہ۔ تصوف بقول علامہ شبلی ایک تصحیح خیال کا نام ہے جو رفتہ رفتہ عارف کی عملی زندگی کے ہر شعبہ پر طاری ہو جائے۔ مثلاً اگر توکل کا مقام درپیش ہو تو یہ نظر آنے لگے کہ تمام عالم دست قدرت میں ایک بازیچہ کے مانند ہے جدھر اُسے چاہا پلٹ دیا۔ اسی طرح فنا کے مقام پر پہونچکر وہ اپنی ہستی کو بھول جاتا ہے اور ہر چیز میں وہی تجلی نظر آنے لگتی ہے۔ فنا کے تین درجے فنا فی الشیخ، فنا فی الرسول، اور فنا فی اللہ مشہور ہیں۔ یہ آخری درجہ انا الحق کی منزل ہے۔

یہ چند مخصوص اور مشہور عقائد ہیں جو مشاہیر متصوفین کی تصانیف میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہاں ہم پھر تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر کر یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آیا یہ عقائد بعینہ ہادی اسلام علیہ السلام اور آپ کے اصحاب کرام کے عقائد تھے۔ بخوف طوالت صرف پہلے عقیدے کو لے لیجیے جو وحدت کا معرکہ آرا مسئلہ کہا تا ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا اس اعتقاد میں ایک حد تک افراط و مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ نصوص قطعیہ کی صراحت سے یہ امر تو ضرور مترشح ہوتا ہے کہ تمام موجودات میں وجودِ واجب ہی صرف مستقل ہستی رکھتا ہے باقی تمام کائنات اُسکا ظل و پرتو ہے۔ جس طرح ظل کا وجود اصل کے وجود کا تابع ہے اسی طرح جملہ موجودات عالم ذاتِ باری کے محتاج ہیں۔ یہی توحید شہودی کہلاتی ہے۔ اب رہی توحید وجودی (وحدت الوجود) یعنی صرف ایک ہی ہستی ہے اور کوئی نہیں۔ لاموجود الا اللہ یہ در اصل ایک وجدانی کیفیت ہے اور مستقل شرعی اعتقاد کی شان نہیں رکھتی۔

اسباب و نتائج  اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے جو ہم نے قصداً مؤخر کر دیا تھا۔ تاکہ مسئلہ کے

---

صفحہ الجنۃ من ارباب ذوق ہے یہ عقیدہ حالت وجد و بیخودی میں ثابت ہوا ہے وہ معذور ہیں۔

تمام پہلو اجمالی طور پر خود بخود ذہن میں آجائیں۔ یعنی تصوف کس طرح اور کن حالات کے اندر پیدا ہوا، اوران خیالات نے کس ماحول میں نشوونما پائی؟ اوپر دیکھ چکے ہو کہ تصوف کے عقائد ہجرت کے اُمۂ ثانیہ کے وسط میں پیدا ہوئے تھے۔ ایک طرف تو لوگوں نے دیکھا کہ اسلامی تعلیمات میں صوفیانہ اعتقادات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ دوسری طرف انھوں نے محسوس کیا کہ دنیا کا جاہ وجلال ڈھلتی چھاؤں ہے۔ حکومتوں کے انقلابات، زندگی کے مصائب اور گناہوں کا طغیان دیکھ کر خدا سے لو لگائی اور دنیا کی حشمتوں پر لات مارکر گوشۂ غربت میں بیٹھ گئے۔ گردوپیش کے واقعات نے دنیا کی آلودگیوں سے بیزار کردیا اور طبعی مناسبت نے عرفان کے ذوق سے آشنا بنادیا۔ یہی وجہ ہے کہ باآں ہمہ زہد وتوکل صحابہ کے فاتحانہ دَور میں اس انقطاع وتجرید کی مثالیں کم ملتی ہیں۔

آخر میں یہ پہلو یہ دیکھنا ہے کہ تصوف نے مسلمانوں کی قومی زندگی پر کیا اثر ڈالا اور اُس سے کیا نتائج مترتب ہوئے؟

ہر انصاف پسند شخص اسکا اعتراف کرنے پر مجبور ہوگا کہ تصوف کی چاشنی نے مسلمانوں کی زندگی کے ہر پہلو کو ذوق اور جذبات سے متکیف کردیا۔

ہند وفلاسفی یا اسٹوائک فلاسفی میں محبت اور جذبہ کا وہ عنصر نہیں جو اسلامی تصوف میں پایا جاتا ہے۔ اسی محبت نے صوفی حضرات کو جزوی نزاعات اور فروعی اختلافات کی سطح سے ہمیشہ بالاتر رکھا۔ تم ارباب تصوف کو علمائے ظاہر کے برخلاف مجادلہ اور مناقشہ کے میدان میں کبھی پیش نہ پاؤگے۔ اسکے علاوہ شخصی حکومتوں کے استبدادی دَور میں ان ارباب توکل کا استغنا برتنا اور سلطنت کے جاہ وحشم کو حقیر جاننا خوشامد پسند امراء اور خوشامدگو مصاحبین کے لیے تازیانۂ عبرت کا کام دیتا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص زخارفِ دنیا کو ذلیل سمجھتا ہے اور زندگی کے مصائب وشدائد کو علناً اور علانیہ جانتا ہے وہ اس پیکر خاکی کی بربادی کے خوف سے یا چند سنہرے روپہلے ٹکڑوں کے لالچ میں باطل کی بڑی سے بڑی قوت کے سامنے بھی حق گوئی سے دریغ نہیں کرسکتا۔ شان وشکوہ کے متوالے استبدادی پتلے حیران تھے کہ نہ معلوم کیوں تمام جہان ان چند خرقہ پوش بوریہ نشینوں کی طرف ڈھلا چلا جارہا ہے جو تخت وافسر تو درکنار، ایک گز زمین اور ایک پارہ پیرہن کے بھی مالک نہیں۔ اسپر بھی ہمارے جلال وعظمت کو خاطر میں نہیں لاتے۔

لیکن جس طرح ہر تحریک کا حشر ہوتا ہے امتداد زمانہ سے یہ مقدس تحریک بھی بے اعتدالیوں کا شکار ہو گئی۔ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِہِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّہَوٰتِ۔ رفتہ رفتہ وہ زمانہ آیا کہ تصوف ایک پیشہ بن گیا اور بجائے ذوقی اور وجدانی کیفیت کے ایک رسمی اور مصنوعی دکانداری رہ گئی۔ یوں تو کوئی زمانہ اہلِ دل سے خالی نہیں، لیکن مرور ایام سے بالعموم توکل، صبر، زہد کی جگہ گداگری، بے شرمی اور رہبانیت نے لے لی۔ ایک طرف تو قناعت کے معنی جد و جہد سے پاؤں توڑ کر بیٹھ جانے اور دوسروں کے دست نگر رہنے کے قرار دیے گئے، دوسری طرف ریاضت کا مفہوم تمام مباح اور مشروع آسائشوں سے پرہیز کرنا سمجھ لیا گیا۔ یاران طریقت نے اپنے اباحت و الحاد کی تائید میں یہ کلیہ ذہن نشین کرا دیا کہ شریعت اور ہے، طریقت اور۔ اس پردے میں تمام محرمات دینی جائز ٹھہرائی گئیں اور جملہ تکالیفِ شرعیہ ساقط کر دی گئیں۔ ہوتے ہوتے ہر کس و ناکس کی یہ ہمت پڑی کہ اپنی گرم بازاری کی خواہش میں کمالات و کرامات کا دعویٰ کرے اور شریعت مقدسہ پر طعنہ زن ہو۔[1]

بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروے شیوۂ اہلِ نظر گئی

ضیاء احمد ایم اے (بدایونی)

[1] اس مضمون سے مقصود تعریض و اعتراض نہیں، نہ یہ اس انداز میں لکھا گیا ہے۔ تصوف اور ارباب تصوف کی عظمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے صرف مدعیان باطل کوش کی مذمت کی گئی ہے۔ اِن اُرِیدُ اِلَّا الاِصلاحَ مَا استَطَعتُ۔ ہاں کوئی صاحب بمقولے الدین النصیحۃ اگر کوئی لغزش پائیں تو مطلع فرمائیں۔

## محسوسات اقدس حیدرآبادی

شوق اثر گداز دے درد اثر طراز دے
بجلی بنا ہوا رہوں اتنا تو سوز و ساز دے

چشم نظارہ باز بھی خوب نکالے حسرتیں
فرصت دید کچھ اگر تیری نگاہ ناز دے

شاہد بزم حسن سے میری یہی ہے عرض شوق
سب سے الگ تھلگ رہوں خاطر بے نیاز دے

راحت و رنج و وصل و ہجر اُسکے ہیں اختیار میں
جسکو وہ چاہے سوز دے جسکو وہ چاہے ساز دے

گردشوں پہ یہ گردشیں دیتا جو ہے تو رات دن
فرصتِ دم زدن ذرا چرخ کرشمہ ساز دے

صرف نیاز غم رہوں میری یہی آرزو یہ ہے
دل تو دیا ہے دردمند شوقِ اثر گداز دے

اقدس دلفگار پھر آہ کرے جگر خراش
ذوق خلش کا لطف پھر مرہم چارہ ساز دے

# ماتا بدل

بستی کی جتنی بوڑھیاں ہیں اس امر پر متفق ہیں کہ ماتا بدل کا صحیفۂ حیات بالکل سادہ ہے۔ وکلا، مقدمہ باز، حتی کہ افیونیوں کا بھی جن کی عمر کا تعین بالکل غیر متعلق ہے، اُنکی نسبت یہی خیال ہے۔ ممکن ہے اسکی وجہ یہ ہو کہ موجودہ نسل میں ایسا کوئی نہیں ملتا جو ماتا بدل کے ابتدائی چہل سالہ دَورِ زندگی میں انکا ہمعصر رہا ہو۔ ماتا بدل مزدوری کرتے ہیں اور حُقّہ پیتے ہیں۔ حیات کا ثبوت انکی مزدوری اور حِسِّ حیات کا حقہ نوشی ہے۔ یہ اکثر اور بیشتر انھیں دو مشاغل میں مصروف پائے گئے ہیں۔ جب یہ متحرک ہوتے ہیں، انکے سر پر ٹوکری ہوتی ہے اور حالت سکون میں حُقّے سے ہم آویز ہوتے ہیں۔ مزدوری میں انکا محبوب ترین مشغلہ سفالہ پوش مکانوں کی مرمت ہے لیکن کام کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو، کوئی موقعہ یا محل ہو، انکے جامد سکوت میں فرق نہیں آتا۔ انکی شکل و صورت دیکھ کر میرا ذہن لارڈ ولزلی کی کہن سالگی کی اُس تصویر کی جانب منتقل ہوتا ہے جو بعض ابتدائی درجوں کی تاریخ ہندوستان میں نظر آتی ہے۔ وہی آنکھیں، وہی پلکیں، وہی چہرہ کی جھریاں، وہی تیور، وہی بشرہ!

کوئی مکان ایسا نہیں ہے جسکے بنانے، بگاڑنے یا مرمت کرنے میں ماتا بدل کی خدمات سے کسی نہ کسی وقت فائدہ نہ اُٹھایا گیا ہو اور شاید ہی کوئی خاندان ایسا ہو جسکے زندہ یا مردہ افراد سے ماتا بدل واقف نہ ہوں۔ ہر مکان کے جزئی جغرافیہ سے یہ آشنا ہیں۔ ماتا بدل کو یہ بھی معلوم ہے کہ انکی خدمات کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہوگی مثلاً ٹوکری، بیلچہ، رسّی، سیڑھی، مٹی، پھاوڑا، گھڑا، وہ مکان کے کس حصہ میں ملیں گے یا اگر یہ چیزیں موجود نہیں ہیں تو کہاں سے عاریتاً حاصل کی جا سکتی ہیں۔ یوں تو ماتا بدل کی زندگی ایک 'کلاک' سے بھی زیادہ یکساں اور یکسو ہے لیکن خود انکے نزدیک زندگی کا مفہوم صرف 'احتیاط' ہے اور شاید یہی ایک چیز ہے جسکی طرف سے انکو کبھی اطمینان نہیں حاصل ہوا۔ بولتے بہت کم ہیں اِلّا ایسی حالت میں جب انکے نزدیک خاموشی منافیِ احتیاط ہو۔ جب کبھی انکو دوسرے مزدوروں کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے، انکا فرض اکثر اچھے

ساتھیوں کو حُقہ یا پانی پلانا ہوتا ہے۔ ایسے اوقات میں کسی کو کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں رہتی۔ وقت معینہ سے پہلے یہ کبھی ان چیزوں کی طرف مائل نہیں ہوتے اور نہ کسی کی فرمائش پر مخاطب ہوتے ہیں۔ مٹی پھیلنے کے یہ ماہر خصوصی ہیں اور جب تک اس مشغلہ سے فرصت نہیں پاتے کسی طرف توجہ نہیں کرتے۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ کسی دوسرے ساتھی یا ساتھیوں کے سخت اصرار پر بھی اپنے مشغلہ سے دستکش ہوجائیں اور مرمت یا تعمیر کے لیے مٹی حوالہ کردیں۔ بعض امراض کے مانند انکے یہاں بھی ہر مشغلہ کا ایک کورس (دور) ہے بغیر اسکے ختم ہوے انکے ہاتھوں کے فرض کا ناتمام یا نامکمل رہ جانا ناممکن ہے۔ اس موقع پر سارے مزدور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے لیکن یہ ناممکن ہے کہ کہیں سے کسی قسم کی حیلۃً یا صراحتاً کوئی تحریک پیش کی جا سکے۔ اگر کسی ناواقف نے ایسا کیا تو اس کا جواب ماتا بدل کے ہاں صرف اپنی آنکھوں کو پوری طور پر کھول دینا اور مٹی کو اور زیادہ انہماک اور کسی قدر طیش کے ساتھ پامال کرنا ہوتا ہے۔ ماتا بدل کا بوجھ لیکر سیڑھی پر چڑھنا بھی خاص طور پر قابل لحاظ ہوتا ہے۔ ہر درجہ پر یہی معلوم ہوگا گویا انکو کسی غنیم کے مقابلہ میں ایک نہایت مستحکم محاذ قائم کرنا منظور ہے اور کسی شاندار پیشقدمی یا اس سے زیادہ شاندار پسپائی کا ارادہ نہیں ہے۔ دوپہر میں جب کام ختم کرنے کا وقت آتا ہے، کسی ساتھی کی یہ سمجھ کر کام چھوڑنے کی ہمت نہیں ہوتی کہ ۱۲ بج چکے ہیں۔ ایسی حالت میں سب کی نظریں ماتا بدل کی سمت اُٹھتی ہیں۔ یہ کمر پر ہاتھ باندھے اور سر نیچے کیے ہوے مٹی پھیلتے ہوتے ہیں اور مزدور سمجھ لیتے ہیں کہ ابھی ماتا بدل اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوے ہیں کہ اگر سورج مہاراج کو خدانخواستہ گرپڑنا نصیب ہو تو یہ احتیاط کے ساتھ اپنی ایک پیچ والی پگڑی کے عین وسط پر روک لیں گے اور مہاراج یا اُنکی مٹی کو کسی قسم کا گزند نہ پہونچ سکے گا اور چونکہ زمین خود متحرک ہے اس لیے یہ نہایت انہماک اور احتیاط کے ساتھ اپنے محدود حلقۂ تگ و تاز میں اس بات کے درپے ہیں کہ کسی طور پر انکا کاسۂ سر آفتاب کے ساتھ خطِ عمودی قائم کرسکے۔ اس کوشش میں کامیاب ہونے کی صرف یہ علامت ہے کہ ماتا بدل سر سے پگڑی کھول دیتے ہیں اور دیوار کے سائے میں جہاں اُپلے کا ایک نہایت مختصر ٹکڑا سلگتا ہوتا ہے اُسی کو بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ گویا کمر کھول دینے کا اذنِ عام ہوتا ہے۔ سارے مزدور انکے گرد جمع ہوجاتے ہیں۔ سب سے کم عمر مزدور کا فرض ہوتا ہے کہ وہ فوراً حقہ چڑھا کر پیش کرے۔

ماتا بدل وہی چارکشش لے کر "اسپنسر سگار" کے فلسفہ میں محو ہو جاتے ہیں جسکا ایک نامکمل سا نمونہ اکثر اُس اشتہار میں دیکھا گیا ہے جسمیں ایک نہایت ہی فربہ اندام بزرگ (کو بزرگ کہدینے کے بعد فربہ اندام کہنا بالکل غیر متعلق ہے) سگار کا ایک کونہ لبوں سے دبائے ہوئے نیم باز آنکھوں اور کسی قدر تبسم زیرلب لوگوں کی توجہ اور سگار کے دھوئیں کو جذب کرتے ہوئے دیکھے گئے ہیں اور نیچے لکھا ہوتا ہے "آسودگی کامل"۔

---

کام ختم کرنے کے بعد شام کو مزدور رخصت ہوتے ہیں۔ اب گویا ماتا بدل کی انتہائی مشغولیت وانہماک کا وقت آگیا ہے۔ یہ تمام مزدوروں سے دن کے کام کا جائزہ لیتے ہیں۔ جن جن چیزوں سے کام لیا گیا ہے مثلاً کدال، پھاوڑا، ٹوکری گھڑا۔ ان سب کو اس طور پر "جا بے موقعہ" سے اُٹھاتے ہیں کہ کسی متلاشیِ آثارِ قدیمہ کو بھی اسکے حزم و احتیاط پر رشک آسکتا ہے۔ مالک مکان نے بھی انکو مکان جانے اور تمام چیزوں کو اپنی اپنی جگہ پر رکھدینے کا حکم دے دیا ہے لیکن انکی احتیاط کا یہ عالم ہے کہ ہر چیز کو ٹھیک طور پر رکھدینے اور دروازہ کو مقفل کر دینے کے بعد بھی اطمینان کلی نہیں حاصل ہے۔ جاتے وقت کوئی موجود نہ بھی ہو تو یہ خود بخود کہتے جائیں گے کہ تمام چیزیں ٹھکانے ٹھکانے رکھدی گئی ہیں، ٹوکری کونے میں ہے، کدال اُسکے پیچھے ہے، رسی کھونٹی پر ہے وغیرہ وغیرہ۔ ابھی دس بیس قدم بھی آگے نہ بڑھے ہونگے کہ لوٹ آئیں گے۔

"کیوں ماتا بدل کیسے پلٹ آئے؟"

ماتا بدل:۔ "معلوم نا ہیں گھڑوا کیھون آہے" (معلوم نہیں گھڑا کہاں ہے)

۔ اندر جاکر سب دیکھ بھال آئے اور پھر "خیریت بول کر" آگے بڑھے۔ تھوڑی دور جاکر دوبارہ مراجعت کی۔

"کیوں اب کیا رہا"

ماتا بدل:۔ "سرکار دوپہروا کے جون روپیوا دے رہین اوماں کے پیسوا سرکار بیچ نلے رہن کہ نا ہیں" (دوپہر کو جو روپیہ سرکار نے دیا تھا اُسکے پیسوں کو سنبھال لیا تھا کہ نہیں)

"ہاں ہاں گن لیا تھا، اب تم بے فکر ہو کر مکان جاؤ۔"

ماتا بدل چند ہی قدم بڑھنے کے بعد پھر پلٹے اور سیدھے مکان کی طرف بڑھے
"کیوں کیسے؟"
ماتا بدل:- کچھو ناہیں تنی دیکھے کے رہا کہ تلوا لاگل ہے کہ ناہیں۔" (کچھ نہیں ذرا دیکھنا تھا کہ قفل لگا ہوا ہے کہ نہیں)۔

---

اتفاق سے ماتا بدل کو ایک ایسے مکان میں ہاتھ لگانا پڑا جسکی ہمسایہ "برق بھی مرمرتی یا تھا زلزلہ" کا مصداق تھی۔ جس گلی سے گذر ہوتا لوگ الامان اور الحفیظ پکارنے لگتے تھے۔ اسکی بے پناہ گالی گلوج اور جنگجوئی کی ساری بستی قائل تھی۔ جس دوکان پر یہ سودا خریدنے پہونچ جاتی، تمام بھیڑ چھنٹ جاتی تھی اور دوکان دار سارا کام چھوڑکر چھتیا کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ حتیٰ کہ بستی کے نہایت شریر اور جھگڑالو لڑکے اور کتے وغیرہ اسکو دیکھ کر راستہ سے کترا جاتے تھے۔ بارش اور کیچڑ، سردی اور کہرا، دھوپ اور لو، غرضکہ موسم کی بے اعتدالیاں اور اکثر اسکی ذمہ دار ہستی بھی اسکے غیظ وغضب اور سب وشتم سے محفوظ نہ تھی۔ بعض ستم ظریفوں کی زبانی یہ روایت بھی سُنی گئی ہے کہ چھتیا کی شادی ایک ایسے مردِ معقول سے ہوئی تھی جو آج کل ہوتے تو اُن پر یورپ کے مکمل ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوان کا دھوکا ہوتا۔ بیوی اور شوہر کے روابطِ ازدواجی کا "مقسوم علیہ اعظم" چھتیا کی جوتی تھی جسے وہ وقت بے وقت، موقعہ بے موقعہ اکثر بسلسلۂ تفریح یا ورزش نہایت آزادی اور تندہی کے ساتھ بر سرِ کار لاتی تھی اور جسکی پذیرائی، یہ مردِ معقول مصلحتِ وقت، اقتضائے مسلک یا پھر مشیت الٰہی سمجھ کر کیا کرتے تھے۔ مکان کے اندر ایک انار کا درخت تھا جسے کسی جن نے اپنا نشیمن بنا لیا تھا۔ شوہر اس حقیقت سے باخبر تھے اور یہ سمجھ کر کہ شاید یہ چھتیا کی درازدستیوں کا سدِ باب کر سکیں، بالکل خاموش رہے۔ لیکن نووارد کو چھتیا سے عہدہ برآ ہونے کی ہمت نہیں ہوتی تھی اور شوہر کو وہ ہر طرح سے قابلِ رحم تصور کرتے تھے۔ ایک دن شوہر نے بیوی سے اذن سفر طلب کیا اور کہا کہ اب کچھ کھانے کمانے کی فکر کرنی چاہیے، ممکن ہے جتنے فراغت کے دن اب تک بسر ہوئے ہیں آئندہ میسر نہ آئیں۔ بیوی کا اعتراض ہوا "اور میری جوتیوں کا کون حامل ہوگا"؟ شوہر نے کہا "میں جلد واپس ہوں گا، میری عدم موجودگی میں تم اس انار کے درخت کو زیر بار کرنا" غرضکہ ایک تھوڑی

٭ حق ات وِ ع

سی ردّ و قدح کے بعد جس میں کچھ الوداعی (۰۰۰۰۰؟) کو بھی دخل تھا شوہر صاحب سفر کو سدھارے۔ کچھ عرصہ بعد کسی شہر میں ایک مہاجن کے ہاں نوکر ہوئے اور فراغت سے رہنے لگے۔ اتفاق سے مہاجن کی لڑکی کو آسیب کا دخل ہوا۔ اور تمام جھاڑ پھونک اور گنڈہ تعویذ سے تنگ آکر مہاجن نے اعلان کیا کہ جو شخص لڑکی کو اس آفت سے نجات دلائے گا صلہ میں اسی سے لڑکی کی شادی کر دی جائیگی۔ یہ بیچارے بھی حق نمکخواری ادا کرنے کے لیے آمادہ ہوئے۔ لیکن آدمی تھے دُور اندیش اور مہاجن کچھ انکے والدین میں سے تھا نہیں کہ صرف انکا سہرہ دیکھنے کے لیے زندہ ہوتا، انعام کی شرط منسوخ کرا دی۔ لڑکی کے پاس پہنچکر اول تو انھوں نے جناب جنات سے بہت کچھ منت سماجت کی کہ لڑکی کی جان چھوڑ دیں لیکن کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ بالآخر یہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور جنات کے شدید اصرار کے باوجود انھوں نے گریۂ و زاری کا سبب نہ بتایا۔ بالآخر جنات نے یہ دیکھ کر کہ یہ تو سارا عیش ہی منغص کیے دیتا ہے کہا "بھئی اگر تم کو رونا ہی ہے تو کہیں دوسری جگہ جاکر روؤ۔ یہاں آخر اس کا کیا موقعہ ہے؟"

شوہر:- میں کیا کروں مجھے تو آپ کی قسمت پر رشک آتا ہے۔ ایک میں ہوں کہ جس مصیبت کے باعث آوارہ وطن ہوا، ہر قسم کی مصیبتیں اُٹھائیں وہ اب معلوم ہوا کہ میرے خیر ہی میں ہے۔"

جنات:- آخر وہ کیا مصیبت پیش آئی کہ اپنی زندگی سے بیزار نظر آتے ہو

شوہر:- آپ سے کیا پردہ ہے۔ مجھے بھی اپنا سا بنا لیجیے۔ دنیا میں جنات بنکر رہنا انتہائی خوش نصیبی ہے۔

جنات:- بھئی سنوں بھی تو، آخر معاملہ کیا ہے؟

شوہر:- (ہچکیاں لیتے ہوئے) ۰۰۰۰ وہی!

جنات:- کون وہی؟

شوہر:- چہ ۰۰۰۰۰۰۰ چہ ۰۰۰۰۰۰۰۰ ہ

جنات:- (کسی قدر چونکنا ہوکر) ۰۰۰۰۰۰ کیا؟

شوہر:- چہ ۰۰۰۰ چہت ۰۰۰۰ چھتیا!

جنات:- (سراسیمہ ہوکر) چھتیا؟

شوہر:- ہاں وہی!

جنات:- (از خود رفتہ ہوکر) پھر کیا ہوا؟

شوہر:- یہاں بھی آنے والی ہے !

یہ سننا تھا کہ جنات صاحب کے سارے ہوش و حواس معطل ہوگئے اور آناً فاناً غائب ہوگئے۔ لڑکی اچھی ہوگئی۔ شوہر صاحب انعام اکرام لیکر مکان واپس آئے تو معلوم ہوا کہ چھتیا نے انار پر اپنی روزانہ مشق جاری رکھی تھی۔ اور یہی سبب تھا کہ جنات کو چھتیا کے شوہر ہی کے نقش قدم کو اپنا خضر راہ بنانا پڑا۔

---

ماتا بدل اُس کوٹھے کی کھپریل درست کر رہے تھے۔ معلوم نہیں زمانہ کے کس نشیب و فراز پر غور کر رہے تھے اور حقہ نوشی کے کن مدارج سے گذر ہو رہا تھا کہ یکایک چھت سے پھسلے اور کوٹھے کی دوسری سمت، چھتیا کے صحن میں، حقہ سمیت جا گرے۔ دھماکے کی آواز سن کر چھتیا دوڑ پڑی اور چور، چور، چلا کر تمام محلہ سر پر اُٹھا لیا۔ پاس پڑوس کے لوگ جمع ہوگئے۔ چھتیا کی زبان سے مغلظات کا ایک آبشار رواں تھا۔ ادھر ماتا بدل کا قریب قریب وصال ہی ہو چکا تھا۔ چھتیا کو اصرار تھا کہ یہ ہم سادھے ہوئے ہیں۔ ماتا بدل بیچارے بیہوش تھے۔ لوگوں نے آکر انکو پہچانا اور بہزار دقت لاد پھاند کر گھر پہونچایا۔

ماتا بدل ایک عرصہ کے بعد چلنے پھرنے کے قابل ہوئے۔ تندرست ہونے کے بعد ان میں جو تبدیلی پیدا ہوئی وہ یہ تھی کہ یہ اب اور زیادہ احتیاط برتنے لگے تھے۔ چلنے پھرنے میں قدم پھونک پھونک کر دھرتے تھے۔ اور کھپریل وغیرہ کی مرمت بھی اسی سلسلہ میں بالکل بند کر دی تھی۔ صرف وہی کام کرتے تھے جن میں زمین سے تعلقات منقطع نہ ہونے پائیں۔ جس چیز کو اُٹھاتے تھے اُسکی پوری طور پر دیکھ بھال کر لیتے تھے اور جہاں رکھتے تھے اُس مقام کی بھی کافی جانچ پڑتال کر لیتے تھے۔ حقہ نوشی میں البتہ کسی قدر اور مشق بڑھ گئی تھی لیکن اسی تناسب کے ساتھ یہ سکون اور تحمل میں بھی ترقی کر چکے تھے۔

حسن اتفاق سے برساتی مرمت کے سلسلہ میں جامع المتفرقین نے چھتیا اور ماتا بدل کو ایک دفعہ پھر یکجا کر دیا۔ کچھ کھپروں کی ضرورت تھی اور یہ اس کام کے لیے تعنات کیے گئے۔ ماتا بدل کمہار کے مکان پر پہونچے اور کھپرے ٹوکری میں اور ٹوکری سر پر رکھکر مکان واپس آئے۔ مسافت کسی قدر طویل تھی وہ سیدھے صحن میں داخل ہوتے ہی، ٹوکری زمین پر رکھ دی اور اُسی کے سامنے بیٹھ کر حقہ

پینے لگے۔ ممکن ہے حقہ کی موسیقی اسکی ذمہ دار رہی ہو، تھوڑے ہی عرصہ میں ایک کالے سانپ نے جس کا تمام جسم کھپروں میں تھا ایک بالشت اوپر سر نکال کر ماتا بدل کی بین نوازی کی رقص اور وجد کے ساتھ داد دینی شروع کی۔ ماتا بدل پر تو گویا "اسپنسر سگار" کا کیف طاری تھا، انکی نیم باز آنکھوں کے سامنے سارا اسکان، ٹوکری اور چھتیا خود رقص اور وجد میں تھی، اس لیے انکو یہ نہ معلوم ہوا کہ ٹوکری میں وہم پرست عورتوں کے "ماموں" ناچ رہے تھے یا خود انکے ناریل کا دھواں پیچ کھا رہا تھا یا انار پر دانے بن بن کر چھتیا کی نظر بچا کر چہل میں مصروف تھے۔ لیکن یہ سارا طلسم آناً فاناً حقیقت میں تبدیل ہو گیا۔ چھتیا چیخ مار کر ماتا بدل پر جھپٹی، انھوں نے بھی آنکھیں کھول دیں۔ چھتیا کے شور پکار پر محلہ والے بھی دوڑ پڑے۔ اب ایک ہنگامہ برپا تھا۔ لیکن ماتا بدل کے سکون میں اب بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ چھتیا نے لپک کر انکے حقہ کو ایسا دوہتڑ رسید کیا کہ چلم اور ناریل دونوں ٹوکری کے پاس جا گرے۔ "بھانجی" کی یہ حرکت "ماموں" کو کچھ پسند نہ آئی۔ اُنھوں نے ادھر کا رُخ کیا تو سارے مجمع میں بھگدڑ مچ گئی۔ چھتیا نے چیخ مار کر جست کی تو ماتا بدل کے اوپر مسلط تھی۔ سانپ اب بالکل اُنکے پاؤں کے پاس آ چکا تھا۔ ماتا بدل کو کچھ تو خفت اور غصہ اور کچھ چھتیا کا غیر متوقع بوجھ۔ غرضکہ ان سب سے متاثر ہو کر اپنی سخت، کھردری اور دندانہ دار ایڑی کا ایک ایسا بھرپور دھکا دیا کہ "ماموں" کا سر سپندے کی بوٹی بن گیا اور جھٹکے میں "بھانجی" مرحوم کے اوپر آ رہی۔ یہ ایک مزید خلفشار کا باعث ہوا۔ کسی کو کیا معلوم کہ شیش ناگ کی مکتی ہو چکی تھی، لوگ یہی سمجھے کہ چھتیا کی جان خطرہ میں تھی۔ کسی نے پاؤں پکڑا کسی نے ہات۔ بعضوں نے سر، ہر ایک نے بیک وقت اپنی اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چھتیا معلق ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد کچھ امن و تسلط ہوا، تو مجمع عام کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔ مدعیہ نے کچھ چیخ کر کچھ غصہ کر کے اور کچھ رو کر کہا،

چھتیا:۔ یہ حرام خور پہلی دفعہ گھر میں کودا تھا، ابکی دفعہ اپنے باپ کو اُٹھا لایا۔ ماموں نے اسکی بجو والی آنکھ کو نہیں ڈس لیا۔

ماتا بدل:۔ (کچھ حسیں بیں اور کچھ جھنجلا کر) ارے او گھر ماں کو دب رہا کہ دیوکا کوپ۔ ہے سرکار تی ایسا کھپرا میں وکہاں گھسرتی رہا۔ (ارے وہ گھر میں کودنا تھا کہ خدا کا غضب۔ یہ ایسے

معلوم نہیں کہاں کھپروں میں گھسا ہوا تھا)

مجمع میں ایک سالخوردہ کانسٹبل بھی تھے جو اول تو نانا بدل سے کچھ "ومت غیب" کے طالب ہوئے، لیکن مایوس ہو کر بالآخر سب کو تھانہ پر پکڑ لائے۔

---

راج ریاست کی فضا، وہیں کے قوانین، ویسے ہی حاکم، اور اسی قسم کے ماتحت!

"داروغہ جی" لالہ گنپت رائے، "نائب صاحب" لالہ جگل کشور اور "دیوانجی" لالہ چھیل بہاری، غرضکہ سارا تھانہ "لالہ زار" تھا۔ لالہ گنپت رائے صرف بہرے تھے اور بات چیت کرتے وقت ہمیشہ آلہ سماعت کانوں سے لگا رکھتے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ داروغہ جی ایک کثیف دھوتی کا نصف حصہ باندھے اور نصف اوڑھے ہوئے نیب کے سایہ میں ایک کھرّی بانس کی چارپائی پر سو رہے تھے، چارپائی کے ایک پایہ سے آلہ سماعت اور دوسرے سے ناریل کا حقہ آویزاں تھا۔ لالہ جگل کشور کوئیں پر کھڑے اشنان کر رہے تھے اور ایک کثیف کہارن کوئیں سے پانی نکال نکال کر انکے اوپر ڈالتی جاتی تھی، بشرہ سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ انکو اپنی صفائی سے زیادہ کہارن کی صفائی کی تمنا تھی۔ منشی چھیل بہاری دفتر میں روزنامچہ سر کے نیچے رکھے ہوئے خراٹے لے رہے تھے۔ جس کی ممکن ہے یہ وجہ رہی ہو کہ حلبی شیشوں والی عینک ناک سے پھسل کر نیم کشادہ دہن میں آگئی تھی اور ہر سانس کے ساتھ حلق تک پہونچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شور و غل سنکر چونکے اور احاطۂ تھانہ میں ایک مجمع کثیر دیکھ کر جلد عینک درست کی اور کاغذات الٹنے پلٹنے لگے لیکن کبھی کبھی عینک کے اوپر سے آنکھ اٹھا کر یہ سین بھی دیکھ لیتے تھے۔ لالہ گنپت رائے بھی اٹھائے گئے تھوڑی دیر میں سب لوگ اکٹھا ہوئے اور مدعیہ، ملزم، اور تماشائیوں کے بیانات شروع ہوئے۔ سارا قصہ سننے کے بعد افسران تھانہ کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ ملزم پر کیا دفعہ لگائی جائے۔ شروع سے آخر تک ہر ایک نے تعزیرات ہند کی ورق گردانی کی اور سب نے تنگ آکر کتاب پٹک دی اور کہنے لگے یہ معاملہ زبانی ہی طے ہو جائے تو اچھا ہے۔ کتاب کو چھیڑنا اچھا نہیں ہے ورنہ وکیل مختاروں کی ہیر پھیر سے جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی۔

دیوانجی کی رائے تھی کہ دفعہ ۳۲۳ تعزیرات ہند (مارپیٹ) عائد ہوتی تھی، لالہ جگل کشور کو اصرا

تھا کہ یہ نقض امن اور مجمع خلاف قانون کے تحت میں آتا تھا۔ بہر حال کچھ طے نہیں ہوتا تھا کہ لالہ گنپت رائے نے یک لخت آلۂ ساعت کشا کو ایک بار پھر چارپائی کے پایہ سے آویزاں کیا اور فرمایا

"یہ سب کچھ نہیں۔ کپتان صاحب کا کیمپ قریب ہے۔ یہ تک بندیوں کا موقعہ نہیں ہے۔ آپ لوگوں کی دعا سے میں اس سارے مسئلہ کی تہ تک پہونچ چکا ہوں۔ صرف تھوڑا سا اشتباہ ہے، وہ بھی پرمیشور کی کرپا سے دُور ہوا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ دفعہ ۳۰۲ (قتل عمد) ہے یا ۳۰۴ (قتل انسان) تعزیرات ہند! اگر کپتان صاحب نئے نئے نہ آئے ہوتے تو قتلِ انسان چل سکتا تھا، لیکن بھائی زمانہ نازک ہے، ہم لوگوں کی پنشن کا زمانہ بھی قریب ہے۔ ایک کمانے اور سب کھانے والے ہیں۔ قتل عمد ہی چلانا مناسب ہے۔ ایشور نے ایسا صاف قتل کا مقدمہ بھیجا ہے کہ مدعی اور مدعا علیہ دونوں موجود ہیں۔ قیصر ہند کو بھی مدعی بننے کی ضرورت نہیں رہی۔ چلتے چلاتے ایسی کارروائی ہوئی جاتی ہے کہ سارا علاقہ تھرا جائے گا۔ مقدمہ کی صورت یہ ہے کہ اس سے قبل ملزم، مدعیہ کے گھر میں قتل کی نیت سے گھُسا تھا، لیکن کامیاب نہ ہوا۔ دوسری دفعہ کپڑے لانے کے بہانے سے عمداً (ذرا اچھی غور کیجیے گا، عمداً!) ایک سانپ پکڑ لایا۔ اور مدعیہ کو کٹانا چاہتا تھا۔ صورت دیکھیے اچھا خاصہ سنپھرا معلوم ہوتا ہے۔ کیوں بھئی فقشی چپیل ہماری کیسی رہی؟ بھئی تم کو کتاب قسم!"

بالآخر یہ طے پایا کہ سب کو کپتان صاحب کے ہاں لیچلنا چاہیے" بھئی اس کارروائی کی بھنک کپتان صاحب کے کان میں بھی ڈال دینی چاہیے۔ افسر اعلیٰ ہے اور پھر انگریز ہے انگریز کیا معلوم خوش ہوکر ہم کو آپ کو کہاں سے کہاں پہونچا دے، انسپکٹر صاحب بھی رخصت پر جانے والے ہیں!"- لالہ گنپت رائے نے فرمایا۔

---

ڈورس صاحب "کپتان" تھے اور کپتان ہی نہیں بلکہ اپنے وقت کے کلکٹر، کمشنر اور لاٹ صاحب بھی۔ قانون اور قاعدہ سے انکو اتنا ہی مس تھا جتنا نئی روشنی کی دختران ہوا کو اپنے مہذب اور مصلحت اندیش شوہروں سے۔ اکثر تمام دن دھوپ میں، روئی کی نیم آستین پہنکر کپتان صاحب خندق کھدوایا کرتے تھے اور شام کو کشتی لڑتے تھے۔ رات کو اجلاس شروع ہوتا تھا۔ اپنی اختلاف آرا کا اظہار یہ محض اُس بلے کوڑے سے کیا کرتے تھے جو ہر وقت انکے پاس ہوتا تھا اور معلوم نہیں

پیروی سنت کے لحاظ سے یا حفاظت خود اختیاری کے سلسلہ میں انکے لواحقین بھی، بلا قید موسم، روئی دار کپڑا استعمال کرتے تھے۔ معلوم نہیں کیا اتفاق ہوا۔ ایک بار محرر بیشی کو ملزم کی حیثیت سے کسی عدالت میں حاضر ہونا پڑا۔ اتفاق سے اُس دن ڈورس صاحب کا بھی اجلاس تھا۔ محرر کی طلبی ہوئی تو غیر حاضر پایا گیا۔ جھنجھلا کر کوڑے کی طرف متوجہ ہوئے تو بوڑھے اردلی نے کہا۔

اردلی:- (حقارت آمیز لہجے میں) کوڑا ہی پھٹکارنا آتا ہے یا کچھ کرتے دھرتے بھی ہو؟

ڈورس صاحب:- (تلملا کر) ..... کیا ہوا؟

اردلی:- ہوا کیا، پیشکار کو فوجداری والے پکڑ لے گئے۔ کچھ کرتے دھرتے تو ہو نہیں، سب کو ناحق بے ناحق پیٹا کرتے ہو۔

ڈورس صاحب:- (غضبناک ہوکر) کہاں گیا فوجداری والا؟

اردلی:- وہ کیا سامنے اجلاس ہو رہا ہے۔

ڈورس صاحب نے فوراً کوڑا سنبھالا، عدالت میں پہونچے تو دیکھا کہ محرر صاحب ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے ہیں، بیان ہو رہا ہے۔ وکیل مختار تو دیکھتے دیکھتے غائب ہو گئے، حاکم صاحب نے بھی دفعتاً آرام کمرہ کا رُخ کیا، پیشکار صاحب کو کہیں جگہ نہ ملی تو میز کے نیچے دبک گئے۔ ڈورس صاحب نے اپنے محرر کی گردن دبوچی اور ایک کوڑا رسید کیا "بدمعاش یہاں کس کے حکم سے آیا؟" اور دھکے دیتے اور کوڑے سے ہنکاتے ہوئے اپنے اجلاس میں پکڑ لائے۔ حاکم اجلاس نے فوراً کلکٹر صاحب سے جاکر شکایت کی، کلکٹر صاحب نے ڈورس صاحب کا نام سنا تو دم بخود رہ گئے اور کچھ دیر تامل کرنے کے بعد فرمایا "بس جانے ہی دو، اس پاگل سے دور ہی دور رہنا اچھا ہے!"

ڈورس صاحب جب کبھی سوال کرتے تھے تو اُسکے فوراً ہی بعد پوچھتے تھے "سمجھا"۔ مخاطب کی خیریت اسی میں تھی کہ اگر نہ سمجھا ہو تو فوراً بول اُٹھے "نہیں سمجھا"۔ یہ سوال جواب متواتر ہوتا رہے تو کوئی قباحت نہیں لازم آتی تھی لیکن اگر کسی نے ذہن پر زور دے کر، شامت اعمال سے اِدھر اُدھر کا جواب دے دیا اور ڈورس صاحب کی تشفی نہ ہوئی تو پھر فوراً کوڑے سے مرافعہ کیا جاتا تھا۔ اتفاق سے جس روز چھتیا اور ماما بدل کا مقدمہ پیش ہونے والا تھا، ڈورس صاحب نے پیشکار سے دریافت کیا

ڈورس صاحب :- پیشکار ، ایک ہم ایک تم، کیا ہوا؟ سمجھا۔
پیشکار صاحب :- (فوراً) حضور نہیں سمجھا۔
ڈورس صاحب :- دیکھو، ایک ہم اور ایک تم، کیا ہوا؟ سمجھا۔
پیشکار صاحب :- (بیکلفت) حضور بالکل نہیں سمجھا، اگر حکم ہو تو داروغہ جی کو بلا لوں، وہ خوب سمجھتے ہیں اور اسوقت اتفاق سے حضور کو سلام کرنے آئے ہوئے ہیں۔
ڈورس صاحب :- اچھا بلا لو۔

پیشکار صاحب نے اردلی کی طرف اشارہ کیا، لالہ گنپت رائے ایک لمبا چغہ پہنے، پگڑی باندھے ہوئے حاضر ہوئے۔

ڈورس صاحب :- ول تھانہ دار، ایک ہم ایک تم کیا ہوا؟

تھانہ دار صاحب نے حسب دستور آلۂ سماعت نکال کر کان کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ ڈورس صاحب کا کوڑا ہوا میں طبند ہوا۔ تھانہ دار صاحب نے فوراً راہ فرار اختیار کی، ڈورس صاحب نے تعاقب کیا۔ خاردار جھاڑی کا احاطہ تھا، لالہ گنپت رائے نے کوشش کی کہ کسی طرح صاف نکل جائیں لیکن کانٹے نے دامن اور پگڑی دونوں کو گرفتار کر لیا۔ داروغہ جی کانٹوں میں گرے اوپر سے ڈورس صاحب نازل ہوئے۔ ادھر چھتیا، عمال تھانہ، اور دوسرے تماشائیوں میں خلفشار مچا اور جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگ نکلا۔

شام تک ناتابدل بھی مکان پہونچ گئے۔

رشید احمد صدیقی (علیگ)

خود فراموش جنوں بن کے جو برباد رہے
وہ حجابات اٹھا جن سے کھلیں رازِ لطیف
کیا ملا بندِ علائق میں انھیں کر کے اسیر
دل کی جب قیدِ عناصر میں ہے شورش اتنی
مسلکِ دردِ محبت کا یہ پہلا ہے اصول
دیکھ لینا کہ بدل دیں گے قفس کی دنیا
نظر آنے ہی کو ہے جلوۂ جاناں شارقؔ

اسکو احساس کہاں قید کہ آزاد رہے
دیکھنے والے کو ! حشر تو کچھ یاد رہے
تیرے دیوانے تو ہر حال میں آزاد رہے
کیا غضب ڈھائے جو بھولے سے بھی آزاد رہے
مرتے دم تک بھی حریفِ لبِ فریاد رہے
ہمصفیر اتنے جو دلدادۂ فریاد رہے
گرم یوں ہی ابھی ہنگامۂ فریاد رہے۔

# کلام شاد

(شایع کردہ انجمن ترقی اُردو پٹنہ - قیمت با ختلاف کاغذ ۴ر و ۳ر)

جناب شاد نہ صرف اپنے صوبۂ بہار بلکہ کُل ہندوستان کے ادبی مذاق رکھنے والے افراد میں خاص شہرت اور امتیاز رکھتے ہیں اور اپنی کہنہ مشقی اور قدامت کی بنا پر ملک کے بہت سے شعرا سے ممتاز و فائق ہیں - حال ہی میں ہماری مایۂ ناز قومی یونیورسٹی "جامعہ ملیہ" علی گڑھ کے مطبع سے اُنکے کلام کا انتخاب ۱۵۰ صفحات کے ضخیم دیوان کی صورت میں شایع ہوا ہے - ایک نامور اور کہنہ مشق شاعر کے دیوان سے جو اُمیدیں قائم کی جا سکتی تھیں وہ بڑی حد تک اس نے پوری کردیں حقیقی انتقاد در تبصرہ کے لیے کافی وقت اور تعمق نظر کی ضرورت ہے لیکن سرسری مطالعہ کرنے پر دیوان کا بڑا حصہ دلچسپ، خوش مذاقی اور تصوف کا دلکش مجموعہ اور فنی حیثیت سے بلند نظر آتا ہے بعض غزلیں شروع سے اخیر تک مرصع ہیں - ہائے کیا شعر کہا ہے

تجھی کو نزع میں پوچھا ترے خموشوں نے
اخیر وقت جب آیا چھپے نہ راز اُن کے

اس شعر والی پوری غزل رنگِ حقیقت میں ڈوبی ہوئی ہے - مشہور بابی خاتون قرۃ العین طاہرہ کی غزل کے بعد اسی طرح اور قافیہ میں ایسی غزل کہنا شاد ہی صاحب کا حصہ ہے - حق یہ ہے کہ پوری غزل لاجواب ہے - نمونتاً چند شعر درج کیے جاتے ہیں

ترا نور رخ جو ہوا عیاں ہوا آشکار جو تھا نہاں
حجاب اُٹھے دشت و جبال سے پر شعشعۂ متنزلا

ہیں نگاہِ شوق میں متحد ترا کوچہ ہو کہ ہو قتل گہ
تری جلوہ گاہ ہیں دونوں ہی جو منیٰ ہے وہ تو یہ کربلا

اسی قسم کی بہت سی غزلیں ہیں جن کی تعریف نہ کرنا ادب اُردو اور کمالِ نظم کا خون کرنا ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ ہم کو نہایت ادب اور کمال تعجب سے چند امور کی طرف توجہ دلانی ہے اور یقیناً ان پر توجہ نہ دلانا فرض انتقاد میں کوتاہی کرنا ہے

ردیف شعر کی جان ہے - اور اگر ردیف شعر میں دست و گریبان اور پوری طرح چسپاں نہ ہو تو مضمون کتنا ہی عالی ہو شعر مہمل اور لغو سمجھا جائے گا - ہم کو تعجب ہے کہ ایسے مشاق اور کہنہ مشق

شاعر کے یہاں بعض مقامات پر ردیف کمزور ہے یا چسپاں نہیں ہے۔

چلے جب شاد ہم سوئے عدم دنیا پکار اُٹھی　　ہمارے پاس سے پھر بھی اگر ہے مرد ہوتا جا

اگر ہے مرد کے پہلو سے ذم کو چھوڑ کر دیکھیے تو ایسے موقع پر بجائے "ہوتا جا" کے "ہوتے جاتا" چاہیے تھا

ہے اب یہ چھیڑ کہ بستر اُٹھا گلی سے مری　　کبھی یہ غیظ و غضب وہ نکال دیتے ہیں

غصہ نکالنا تو مستعمل ہے۔ غیظ و غضب نکالنا نظر سے نہیں گذرا اور اگر ہو بھی تو "نکال دیتے ہیں" اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے اور ردیف چسپاں نہیں ہوتی۔

صدق دل سے شاد کی تصدیق کر ایمان لا　　فرق کر اے مدعی جادو سے اور اعجاز سے

ایسے موقع پر "سے" نہیں اچھا معلوم ہوتا۔ قاعدے سے "جادو میں اور اعجاز میں" ہونا چاہیے

بے وضو ساقی سے پائے گا نہ مے　　کہہ دو میکش اپنے منہ کو دھو رہے

رو رہے اور کھو رہے میں دھو رہے فرمایا ہے ردیف "رہے" غلط ہے۔ ایسے موقع پر ہماری زبان میں "دھو رکھے" بولا جاتا ہے

مقدمہ نگار مولوی سید سلیمان نے شاد صاحب کی بلند نظری اور خوش مذاقی کی بہت تعریف کی ہے لیکن اشعار ذیل کے "عامیانہ اور سوقیانہ انداز بیان سے تمام تر پاک" ہونے کا فیصلہ ہم نہیں پر چھوڑتے ہیں

گرا جو ہاتھ سے شیشہ معاف کر ساقی　　کسی نے زور سے پنچہ مرا مروڑ دیا

کسے لحاظ ہے تحت الحنک کا قاتل کے　　بگوں میں دیر سے کھوئے لا پو الیہ ہوگا

کیا اس معاملہ کے سزاوار ہم نہیں　　کیا اور بھی کوئی ہے خریدار آپ کا

میں پنچہ مروڑنا، تحت الحنک، اور معاملہ تو شاید اُستاد امانت کے یہاں زیادہ اچھا معلوم ہوتا۔

بعض اشعار میں تو حیدرآباد کی پُرانی اُردو کا لطف مل جاتا ہے

غم فراق پہ اے آسمان نہیں قوت　　وہ جو سہائیں غریبوں کو ہر طرح سہنا

شاد کے آگے بھلا کیا ذکر یار　　نام اوس کا آیا کہ اُسنے رو دیا

"وہ جو سہائیں غریبوں کو ہر طرح سہنا" اور "اُس نے رو دیا" پر بے اختیار سید سجاد حیدر کے خیالستان کے نواب غیاث الدولہ (آف حیدرآباد دکن) یاد آ گئے:

آپ ایک پوربی دوست کا نام ہم لوگوں نے "شامل بدمعا" رکھ دیا تھا اور اس "شامل" سے خاص لطف اٹھایا کرتے تھے۔"

یہی لطف بعض جگہ اس دیوان میں بھی مل جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو

جھلک کچھ کچھ نظر آئے گی گو پردہ ہے پوشیدہ ہیں ہوس گر ہے تو آئیں میرے شامل دیکھنے والے

شعر گربہ او ضمائر کی عدم مطابقت قاعدہ انشا کے کس قدر خلاف ہے۔ عجیب ہے شاد صاحب فرماتے ہیں

چلے جائیں گے ہم جو محفل سے کوئی اور میری جگہ آ رہے گا

"ہم" اور "میری" کیا ہے؟

حشو و زوائد کا خیال رکھنا اور شعر میں ایک حرف بھی ایسا نہ رکھنا جس کا حذف کر دینا مطلب میں خلل نہ ڈالے ہنر بلکہ شاعر کے لیے ضروری ہے۔ اشعار ذیل میں نشان دادہ الفاظ ظاہر نظر میں حشو نظر آتے ہیں

بظاہر مٹ چکا ہے عشق کا آزار لیکن پھر طبیعت ہر گھڑی رہ رہ کے کیوں غمگین ہوتی ہے

یوں تو تھے مد نظر لاکھوں حسیں آخر آخر ہم انھیں کے ہو رہے

بعض محاورات وہ نظم ہوئے جو لکھنؤ اور شاید دلی میں بھی مستعمل نہیں ہوتے۔ ممکن ہے کہ صوبہ بہار کے ساتھ مخصوص ہوں:

دل لے گیا کلام فصیحانہ آپ کا

یہاں کلام فصیحانہ کی جگہ پر کلام فصیح ہونا چاہیے تھا۔

پیغام آ رہے ہیں تواتر وصال کے ہر ہر نفس فراق میں قاصد ہے یار کا

تواتر آنا غلط ہے علی التواتر بولا جاتا ہے۔

نہ آئی مرے بادہ خانہ میں عید محرم کا بارہ مہینہ رہا

دوسرے مصرع کی زبان کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔

مقتل میں حقیقت کیوں کھلتی اس میرے شہادت ہونے کی
آپ اپنی خطا سے قاتل کی پہچانا گیا شرمانے سے

میں "شہادت ہونا" ثبت بھونڈا ہے۔ ایسے موقع پر "شہید ہونا" فصیح ہے

اسی طرح کی بعض اور خامیاں ہیں جو خدا کرے مظلوم کاتب کی ہوں اور ہمارے نامور شاعر کا دامن ان سے پاک ہو۔

آخر میں پھر ایک بار عرض کیا جاتا ہے کہ اس پر بھی دیوان مجموعی حیثیت سے ظاہری اور باطنی خوبیوں سے آراستہ ہے ناظرین ضرور لطف اندوز ہوں۔

'انصاری'

# دانی کہ ایں حیات تو داری باصل چیست!

دانی کہ ایں حیات تو داری باصل چیست — ترکیب آں ہمہ ز خزان و بہار ہست
یعنی گہے حیاتِ تو خرم چو نو بہار — گاہے چو روزگار خزاں تیر و تار ہست
اندک برنگ لیل و کمی در لباسِ نور — جز تیرگی و لے ہمہ بے اعتبار ہست
طورے کہ صبح و شام شود ژالہ رونما — ہم صبح و شام عمر کسے اشکبار ہست

---

کیفِ حیات نیک بماند برود زن — کآرد زود و عود نواہائے تلخ و تر
اول ز فتح و سوز و سرورے کند بیاں — مسرور می کنند ز سرودش دلِ بشر
تغییر زود می دہدش آں نوائے خوش — انگشتہاش باز زند پردۂ دگر
در جائے سوز و عیش سراید ز رنج و درد — آرد بروں ز چنگ نواہائے جاں فشگر

---

باز ت حیات ہمچو فسانہ ست بس شگرف — اندوہ و عیش ہر دو بہم ساختہ درآں

پیکار و رزم و صلح و صفا اندر و یے — لذت بگوش جاں رسد از حرفہائے آں
ویں طرفہ تر کہ گوش چو مسحورِ آں شود — دل پُر کند ز خوف و ز اندوہ ہماں زماں
آخر ز دستِ آں تو بسر دست می شوی — از چشم خوں فشانی و پیچی بہ ملیساں

---

دیگر شنو حیات چو جزمیست خود نما — کاید ز روئے عرش بریں تودۂ غبار
مقصودش ایں بود کہ بر ایں ارضِ بے ثبات — آرد بدست دولت و ہم عیش و اقتدار
اینہا بود چو کرم شب افروز کم فروغ — انکار او ز جہل ضیا نیست پائدار
زودش چو نو عروس بآغوش در کشد — آخر شود بحسرت و افسوس خود شکار

---

باز ہم شنو حیاتِ تو در اصل خویش چیست — زیبا چو قوس قزح نظر آید بر آسماں
خوشرنگ و پُر شکوہ و پُر افسون و دلکشا — قائم بچرخ و محکم و بر پائے در عیاں
لاکن چو نیک در نگری زود در رسی — کیں ہست بے ثبات چو ادوارِ آسماں
ہر رنگ و ہر شکوہش و افسون و دلکشی — مخلوط در فضا شود و نیست بے گماں

---

شمعیست ایں حیات فروزاں بہ تیرہ شب — کم کم بہ تیرگی دہر از نور خود نشاں
گر باد شعلہ اش بفزاید فزود مرد — در دست نورِ او بفزاید شود زجاں
تا بہ چو تیز تر بشود زود تر خموش — در ساعتے بہ تیرگی اندر فتد جہاں
دلہا ز سوز ہجر فشاند چو شمع اشک — چوں جاں ازیں جہاں بکشد رختِ خود بآں

---

سید اظہر علی، ایم اے، ایم ر ا، ایل (از دہلی)

# حقیقی مسرّت اور ظاہری نمائش

سلاطین یورپ نے اپنے ماتحتین کو، اُن کی حُسن خدمات کا صلہ دینے کا یہ طریقہ نکالا ہے، کہ اُن کو دو گز لمبا نیلے رنگ کا فیتہ دیتے ہیں، جو اُن کے کاندھے پر لگادیا جاتا ہے، وہ لوگ جو اس عزت کے نشان سے مشرّف کیے جاتے ہیں 'نائیٹ' کہلاتے ہیں، اور پادشاہ ہمیشہ اس طبقہ کا سردار ہوتا ہے۔ بڑی بڑی اہم خدمات کے صلہ دینے کا، یہ بہت ہی کم خرچ بالانشین طریقہ ہے۔ اور پادشاہوں کی یہ بڑی خوش نصیبی ہے کہ اُن کے ماتحتین ایسے بے حقیقت انعاموں سے خوش ہوجاتے ہیں۔

اگر میدان جنگ میں کسی سپہ سالار کا پاؤں ضائع ہوجائے تو پادشاہ اُسکو دو گز فیتہ دیتا ہے اور اُسکے تلف شدہ عضو کی تلافی کردی جاتی ہے۔ اگر کوئی سفیر، ممالک غیر میں، اپنے ملک کی عزت قائم رکھنے میں، اپنی کل موروثی جائداد صرف کردے، تو پادشاہ اُسکو دو گز فیتہ بخشتا ہے، جو اُسکی جائداد کے مساوی سمجھا جاتا ہے۔ القصّہ اگر کسی یوروپین پادشاہ کے پاس دو گز سبز یا نیلے رنگ کا فیتہ بچ رہے، تو پھر اُسکو اس کا خوف نہ رہنا چاہیے کہ اُسکے پاس مدبّروں، جرنیلوں، یا سپاہ کی کوئی کمی ہے۔

میں اُن سلطنتوں کی کافی طور سے قدر نہیں کرسکتا، جہاں موروثی جائداد رکھنے والے اشخاص عنایاتِ تہی کے لیے، حقیقی مصائب اور تکالیف کا بار اُٹھاتے ہیں! ایک شخص جو پہلے ہی سے دولتمند ہے، اور جو حرص و ہوا کی زندگی میں داخل ہوتا ہے، اپنی اس حیثیت میں وہ متعدد حقیقی تکالیف محسوس کرتا ہے، اور اُسکو اب ایسی خوشی جو پہلے میسر تھی حاصل نہیں ہوتی، ایک درباری بننے سے قبل وہ کھا پی، اور سو، سکتا تھا۔ غالباً زیادہ اچھی طرح، بہ نسبت اسکے کہ جب اُس کو یہ خدمت عطا کی گئی۔ وہ خوشامدیوں پر خانگی زندگی میں اسی طرح حکومت کرسکتا تھا جس طرح کہ اپنے پبلک اختیارات کے ماتحت اُسکو اب اقتدارات حاصل ہیں، اور اپنی ہر ایک مرغوب خاطر خواہش میں بغیر لوگوں کی نکتہ چینی اور اُنکی نظر پڑنے اسکے ہمہ تن

غرق رہتا تھا - تو پھر ایک ایسی دولت میں، جو پہلے سے وافر ہے مزید اضافہ سے کیا حقیقی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟ کچھ نہیں! -

اگر وہ نامور شخص اپنی دولت بڑھانے سے اپنی خواہشات میں اضافہ کر سکے، تو اس صورت میں اس کا اعلیٰ مرتبہ حقیقی تفریح کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے۔

کیا وہ اپنی ایک ہزار اشرفیوں کو المضاعف کرنے سے، دو بیویوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے یا بجائے ایک کے، دو پُر تکلف ضیافتیں احباب کو دینے کے قابل ہو گیا؟ اگر ایسا ہے تو بلا شبہ وہ معاف کیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ اس نے اپنے آرام و آسایش کے دائرہ کو بڑھانے کی غرض سے کسی قدر تکلیف برداشت کی، لیکن برخلاف اسکے جبکہ وہ مصائب برداشت کر کے اپنی مسرت کی خواہش کو ترقی دینا پایا جاتا ہے تو وہ اسکو اکثر گھٹتا ہوا پاتا ہے اور جوں جوں اس کا تمول بڑھتا جاتا ہے، اسکی مسرت اور تفریح کی وسعت گھٹتی جاتی ہے۔

اس لیے میں نامور اور معزز اشخاص کو حسد کی نظر سے دیکھنے کے بجائے، انکو عموماً کسی قدر افسوس سے دیکھتا ہوں - میں تو اُن کو ایک خوش خلق راہ گم کردہ، لوگوں کا گروہ سمجھتا ہوں جو اپنا التمام خوشیوں کے لیے جو وہ منا رہے ہیں، ہمارے ممنون و شکر گزار ہیں۔ وہ، خود کو نہیں، بلکہ ہم کو خوش کرنے کے لیے، زیبائش کی تکلیف وہ خدمن کے نیچے، پسینہ پسینہ ہو جاتے ہیں، وہ صرف ہم کو خوش کرنے کے لیے، اپنے ملازموں کی قطار کے ساتھ بڑی سنجیدگی اور تمکنت سے ہمارے سامنے سے گذرتے ہیں - صرف ایک کوٹ، یا صرف ایک وردی پوش ملازم بھی عبث ترین راستگی کے اغراض کے جواب میں کافی ہو سکتا ہے، اُن لوگوں کے متعلق جن کے پاس بیس کوٹ ہیں، یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک کوٹ اپنی مسرت کے لیے رکھتے ہیں اور بقیہ انیس صرف ہمارے لیے - واقعی کنفیوشس کا مقولہ بالکل صحیح ہے کہ "ہم بجائے اسکے کہ خود کو خوش و خرم خیال کریں، دوسروں کے دلوں میں یہ بات ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم خوش اور بشاش ہیں" لیکن اگرچہ گفتگو کے عنوان بنائے جانے، اور ایک اعلیٰ حیثیت کے مراتب کو قائم رکھنے کی خواہش، ایک حریص کے لیے بہت ہی تکلیف دہ ہے، تاہم سوسائٹی کے لیے بہت بہتر ہے کہ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو برضا و رغبت آرام و سلامتی کو خطرہ اور فتنہ سے بدل لیں گے!

ہم کو ان لوگوں کی رعونت اور خود پسندی سے کوئی نقصان نہیں پہونچتا - اور یہ ذرا نا منصفانہ بات ہے کہ ایک شیر خوار بچہ سے، اُس کا جھنجھنا چھیننے کی کوشش کی جائے - اگر ایک ڈیوک[1] یا ڈچیس[2] ہماری دلچسپی کے لیے، رضامندی سے، اپنے ملازموں سے لباس کے دامن اُٹھوائے ہوئے گذریں تو یہ اُن کے حق میں بہت ہی بُرا ہے - اگر وہ شخص اپنی رفعت و شان دکھانے کے لیے، سَو غلاموں اور ملوک کے ساتھ جمہور کے سامنے گذریں تو یاد رہے ہیچ پوچ صرف تماشہ بیں ہی وہ لوگ ہیں جو کہ خوشی حاصل کرتے اور مسرت بخشتے ہیں، صرف یہی، وہ سرگرم افراد ہیں جو ظاہری نمائش کو ترقی دیتے ہیں -

ایک دفعہ، ایک عیار چینی پوجاری، ایک چینی حاکم سے، جسے زیور پہننے کا بہت شوق تھا، مخاطب ہوا - اور فراشی سلام کرکے، اُس کا بہت شکریہ ادا کیا، اُس نے کہا "عزیز من، تم کس وجہ سے میرا شکریہ ادا کر رہے ہو؟ میں نے کبھی تمہیں کوئی زیور نہیں دیا" اُس نے جواب دیا "یہ سچ ہے کہ تم نے مجھے کوئی زیور نہیں دیا، لیکن تم نے مجھے ان زیورات کو جی بھر کے دیکھنے کی اجازت دی، اور تم بھی سوائے اسکے کہ ان کو دیکھ کر شاداں ہو، اور کچھ نہیں کرسکتے، اس لیے ہم میں کوئی فرق نہیں ہے، بجز اسکے کہ تم کو ہر وقت ان پر نظر رکھنے کی تکلیف گوارا کرنی پڑتی ہے، اور یہ ایسا شغل ہے کہ مجھے اس کی زیادہ خواہش نہیں - خدا حافظ"

(ترجمہ از گولڈ اسمتھ)

محمد عزیز الحسن قریشی - متعلم فرسٹ ایر نظام کالج

[1] انگلستان کے بڑے درجہ کا امیر - [2] ڈیوک کی بیگم -

جس بات کو مفید سمجھتے ہو خود کرو — اوروں پہ اس کا بار نہ اصرار سے دھرو
کافی ہے بس یہ وعظ کہ غیرت ضرور ہے — تقوی بہت ضرور ہے اللہ سے ڈرو
حالات مختلف ہیں ذرا سوچ لو یہ بات — دشمن تو چاہتے ہیں کہ آپس میں لڑمرو

اکبر - الہ آبادی (مکاتیب اکبر حصہ دوم)

# افکارِ جگر

بے نقاب آج تو یوں جلوۂ جاناں ہو جائے
جو جہاں پر ہو وہیں بیخود و حیراں ہو جائے

ایک ذرّہ کا اگر حسن نمایاں ہو جائے
آدمی شدّتِ انوار سے حیراں ہو جائے

واقفِ سرِّ حقیقت اگر انساں ہو جائے
غم سے نزدیک ہو، راحت سے گریزاں ہو جائے

قلبِ عالم جو مرے حال سے جنباں ہو جائے
سعیِ ناکام بھی اک کار نمایاں ہو جائے

حُسن خود ہو نگراں، عشق جو حیراں ہو جائے
جان خود جسم بنے، جسم اگر جاں ہو جائے

اس کی اک موجِ تبسم جو نمایاں ہو جائے
دل کا ہر ذرّہ بے کیف خمستاں ہو جائے

جامعِ حسن کسی رنگ میں انساں ہو جائے
گُل بداماں نہ سہی، خار بداماں ہو جائے

یوں بڑھے پائے طلب حُسنِ قدم کی جانب
ایک ہی جست میں طے، عالمِ امکاں ہو جائے

عرش تک ہو نہیں سکتی جو رسائی نہ سہی
یہی انساں کی ہے معراج کہ انساں ہو جائے

تم سُنا دو کسی پردہ سے جو اپنی آواز
روح خوابیدہ ابھی جسم میں رقصاں ہو جائے

رفتہ رفتہ نہ رہا لطفِ توازن باقی
ہوش و مستی میں بہم پھر کوئی پیماں ہو جائے

دل نے دیکھا ہے جو آنکھوں کو نظر آ جائے اگر
یہ توجّہ ہو نگہ میں کہ پریشاں ہو جائے

بھول کر جائے نہ رنگینیِ صورت کی طرف
عظمتِ روح سے واقف اگر انساں ہو جائے

اس سے بڑھ کر کوئی دلسوز بھی دُنیا میں نہیں
نفسِ چالاک اگر تابعِ فرماں ہو جائے

مستیِ عشق کا افسانہ اگر چھیڑ دوں میں
کفر کی شرح میں گم، شیخ کا ایماں ہو جائے

دل ہے گنجینۂ انوارِ نگاہِ محمود
کاش اس گل کا ہر اک جزو پریشاں ہو جائے

اللہ اللہ یہ عرفانِ جنوں کی تاثیر
آج جس خار سے کہہ دوں، وہ گلستاں ہو جائے

خام سمجھو طلب و شوق کا اعجاز جگر
ہر نفس عشق میں جب تک نہ رگِ جاں ہو جائے

جگر۔ (مرادآبادی)

# اظہار رائے

## گویم مشکل، وگرنہ گویم مشکل!

اس خیال سے نہیں کہ اصحاب الرائے کے ممتاز دائرہ میں میرا بھی شمار ہونے لگے، بلکہ اس لحاظ سے کہ میرے عنایت فرما اڈیٹر الناظر کہیں وعدہ وفا نہ ہوسکنے پر آیندہ کسی اشاعت میں ایفاے وعدہ کے متعلق احادیث نبوی و کلام الٰہی سے استدلال نہ شروع کردیں، میں ایک عرصہ کے بعد آج کچھ اظہار خیالات پر مجبور ہوتا ہوں -!

الناظر کے متعلق مجھ سے بھی میرے عنایت فرمانے رائے طلب کی تھی مگر میں اپنی عدیم الفرصتی اور کثرتِ مشاغل و فرائض کی وجہ سے تعمیل ارشاد سے قاصر رہا اور ہمیشہ یہ ہی عذر کرتا رہا تاہم تقاضاے شدید، زبانی و تحریری میرے عنایت فرما کی طرف سے برابر جاری رہا!

میرے خیال میں الناظر کی ترقی کے لیے سب سے زیادہ جس چیز کی فی الحال ضرورت ہے وہ صحیح مذاق علمی ہے! اگر میں یہ کہوں کہ الناظر بصورت موجودہ، ایک نہایت خشک، کھدرپوش اور چاشنیٔ ادب سے گریزاں، رسالہ ہے تو مجھے خوف پیدا ہوتا ہے کہ الفاظ "خشک و کھدرپوش" کی حمایت میں "فیہ ما فیہ" کے تحت میں یا "نظرے خوش گذرے" کے زیر سایہ ایک مطول بحث نہ شروع کردی جائے! بہرحال جب تقاضاے شدید مجھے لب کشائی پر مجبور کرتا ہے تو میں اپنی ذاتی راے کا اظہار۔ عام اس سے کہ وہ رائے از سرتا پا غلط ہی کیوں نہ سمجھی جائے۔ اپنا فرض اخلاقی سمجھتا ہوں!

الناظر کی وہ تصویر بھی میرے پیش نظر ہے جو ۱۴ء یا ۱۵ء تک باقی رہی اور وہ بھی جو جنگ عظیم کے اختتام سے اڈیٹر صاحب کی عارضی دست کشی تک کسی نہ کسی طرح قائم رکھی گئی۔ مگر اُن دونوں حالتوں اور موجودہ صورت میں ایک بیّن اور نمایاں شانِ امتیاز نظر آتی ہے! پہلی صورت میں ادبی چاشنی، مذاق سلیم کے نمونے، کبھی کبھی شگفتہ نگاری کے مرقع اور مختصر و سبق آموز افسانے، سب ہی کچھ پائے جاتے تھے لیکن اب خدا کے فضل سے اول سے آخر تک

تمام رسالہ زادِ نجات یا فلاح المؤمنین نظر آتا ہے !

اکثر احباب کی رائے ہے کہ "الناظر" کی کوئی خاص پالیسی، رَوِش یا مقصدِ زندگی طے ہو جانا ضروری ہے ! پہلے یہ ایک علمی و ادبی رسالہ تھا : اب اگر مذہبی اور سیاسی ہوگیا ہے تو اس کا صاف صاف اعلان سرورق پر ہونا ضروری ہے !

الناظر کا مذہبی یا سیاسی رسالہ بن جانا کوئی خدانخواستہ عیب نہیں ہے۔ البتہ اس سے خریدارانِ رسالہ کو جنس خرید کردہ کے پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہوگی اور اس کو علمی و ادبی پرچہ سمجھنے کی غلط فہمی کا احتمال بھی جاتا رہے گا !

کاغذکی عمدگی، روشنائی کی چمک، غرض رسالہ کی ظاہری آب و تاب، تحریکِ سودیشی نے اپنی کلہاڑاؤں سے، ہمیشہ کے لیے، یا عرصۂ دراز کے لیے کچل ڈالی ! اسکے متعلق اگر ایک حرف کہا جائے تو سودیشی کی بحث کی سلسلہ جنبانی ہو گی جو غالباً اس حد پر ختم ہو گی کہ ایسی رائے دینے والا، اخلاقی، مذہبی، قومی، انسانی اور خدا جانے کس کس نقطۂ نظر سے گنہگار و خطاوار قرار پائے !

مضامین کے علاوہ ذاتیات پر حملے، الناظر کا اب مستقل شیوہ نظر آتا ہے ! ایک بات کو بار بار۔ اور اکثر نہایت کرخت لہجے میں دُہرانا غالباً اظہارِ شانِ استغنا، قرار دیا گیا ہے ! اڈیٹر صاحب کی سیاسی دلچسپی اور شرکت کا آغاز جس زمانہ سے ہوتا ہے اُسی زمانہ سے الناظر میں اس درشت نگاری کی جھلک نظر آتی ہے۔ آگے چل کر جس راستہ پر اور جس حد تک وہ دلچسپی و نقل و حرکتِ سیاسی بڑھتی جاتی ہے اُسی سمت اور اُسی قدر، حق گوئی، اظہارِ فیصلۂ ناطق، اور گروہِ مخالف کی نکتہ چینی ذاتیات کی حد تک، نہایت سختی کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے !

حاشا وکلا ! میں اڈیٹر صاحب کی زاہدانہ زندگی پر نکتہ چینی نہیں کرنا چاہتا ہوں مجھے صرف الناظر کے معیارِ حیات سے تعلق ہے ! بفضلہٖ میں رسالۂ الناظر کو خود اڈیٹر صاحب کی طرح ہنوز ناقابلِ علاج نہیں سمجھتا ہوں !

الناظر کا موجودہ دور وہ ہے جو سیاسی میدان سے مذہبی دائرہ کی طرف نقل و حرکت سمجھا جا سکتا ہے ! الناظر کے ۶۴ صفحات کا اگر اب تجزیہ کیا جائے تو معقول تعدادِ اوراق

نذرِ عیب جوئی نظر آئے گی !

تنقید و تحقیق نہایت عمدہ اور ضروری شعبے ہیں ۔ مگر تنقید و عیب جوئی کی حد فاصل کو مٹا دینا نہایت ناموزوں دریدہ نگاری ہے ! اگر میں الناظر کے گذشتہ دو سال کے تمام نمبر نکالوں تو اس قسم کی متعدد مثالیں پیش کر سکتا ہوں ! فی الحال " تحریم سود " سے ناظرین الناظر کی معقول تعداد کا دم ناک میں آ گیا ہے !

میں سید طفیل احمد صاحب کا رُوشناس بھی نہیں اور اِس خاص مسئلہ میں اُن کا ہمنوا بھی نہیں ، مگر ساتھ ہی چلپی صاحب کے خطبۂ ربا سے عاجز آ گیا ہوں ! چلپی صاحب نے سید صاحب کے جوابِ مضمون پر جو اپنے نوٹ گذشتہ رسالہ میں دیے تھے وہ ذاتیات اور عیب جوئی کے علاوہ درشت نگاری کی بیّن مثال تھے !

جولائی کا الناظر بھی اسی راگ کو الاپتا نظر آتا ہے ۔ خدا ہی جانے طفیل احمد صاحب کی عزت و جان اب کب تک معرضِ خطر میں رہتی ہے ! اس مرتبہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب بھی چلپی صاحب کی کسوٹی سے نہ بچ سکے !

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں صاحبزادہ صاحب موصوف کی جماعت مدّاحین میں شامل ہونے کا اعزاز کبھی نہیں پا سکا مگر پھر بھی جس معمولی بات پر چلپی صاحب نے پورے تین صفحوں پر احادیث نبوی کے حوالے دے کر اپنی شانِ تقدس کا اظہار فرمایا ہے وہ ایک معقول حد تک غیر ضروری ، ناموزوں اور ناپسندیدہ ہے ! الناظر اگر ادبی و علمی رسالہ ہے تو یقیناً خود اڈیٹر صاحب میرے ہم خیال ہونے پر مجبور ہوں گے !

مجھے یہ قوی اندیشہ ہے کہ آیندہ نمبر میں چلپی صاحب کا قلم اس عاجز کے خیالات ۔ بلکہ ممکن ہے کہ ذات ۔ پر بہت کچھ جولانی دکھائے گا اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری زبان بند کرنے کے لیے ایک درجن احادیث و کلام الٰہی کا حوالہ اُس کرخت نکتہ چینی اور دریدہ نگاری میں ہوگا ! میں اِسکے لیے تیار ہوں ۔ اور دو وجوہ سے تیار ہوں !

اوّل یہ کہ میں اس قدر پُر معاصی ذات ہوں جو دُنیا کے کسی بدترین سے بدترین گناہ سے بھی بچ نہ سکی ، میری عیب جوئی تحصیلِ حاصل ہو گی !

دوسرے یہ کہ محض اپنے ہدفِ ملامت بننے کے خوف سے میں اپنے عنایت فرما اڈیٹر الناظر کو مخلصانہ رائے دینے سے باز نہیں رہ سکتا!

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ الناظر کے ظاہری حلیہ کے علاوہ اُسکے موادِ مضامین میں بھی کسی قدر ادبِ لطیف، شگفتہ نگاری، دلچسپ افسانے وغیرہ کی اصلاح و اضافہ کی حاجت ہے!

اور اگر کھدر پوشی، خشک نگاری، عیب جوئی، ذاتیات، اور وریدہ دہنی الناظر کا مستقل مسلک قرار دیدی گئی ہیں تو نہایت ادب کے ساتھ یہ التجا ہے کہ برائے خدا اس رسالہ کا نام تنبیہ الغافلین۔ یا۔ تعزیرات الفاسقین، یا ایسا ہی کوئی اور موزوں نام بمشورہ چلپی صاحب رکھ دیجیے!

میرے ایک بے تکلف دوست۔ جو علم دوست بھی ہیں۔ مجھ سے مصر ہیں کہ میں کسی نہ کسی طرح حافظ شیراز کا وہ شعر جس کا پہلا مصرعہ" واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند" ہے کہیں نہ کہیں اس مضمون میں ٹھونس دوں مگر اڈیٹر صاحب یقین مانیے میرے گلے گلے پانی میں تو یہ ہے۔ حاشا وکلاّ۔ میں اس کو لکھ کر" فیہ ما فیہ" کی بندوق اپنے اوپر فسلاً بعد نسلٍ نہیں دغوانا چاہتا ہوں!

سلطان حیدر

---

محبی سلطان حیدر صاحب جوشؔ نے ایک خانگی مراسلہ کے جواب میں مضمون برائے اشاعت بھیجکر یقیناً میرے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ دوسرے احباب کے لطف وکرم پر نظر کرکے چاہیے تھا کہ اسکے ساتھ اُنکی تحریریں بھی شایع کی جاتیں مگر اوراق الناظر بہت محدود ہیں اس لیے میں اُن سے عذر خواہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

سلطان حیدر صاحب کے اخلاص پر اعتماد کلی ہے۔ اس لیے باوجودیکہ اُنکی تحریر ظریفانہ شوخی سے گذرکر درشتی و تلخی کی حد تک پہونچ گئی ہے، میں اُن کی نکتہ چینی سے بدمزہ نہیں ہوا۔ اور امید ہے کہ چلپی صاحب بھی اُن کے تیز و تند جملوں سے بے کیف نہ ہوں گے۔

اس مراسلہ میں جو اعتراضات کیے گئے ہیں اُنکے متعلق سلسلہ وار حسب ذیل معروضات پیش کیے جاتے ہیں:

(۱) الناظر "خشک" مضامین کی اشاعت کے لیے ہمیشہ بدنام رہا۔ علمی مضامین عموماً "خشک" ہی ہوتے ہیں۔ اور اگرچہ میری یہ ہمیشہ کوشش رہی کہ خشک علمی مضامین کے پہلو بہ پہلو شگفتہ مضامین بھی شایع کیے جائیں

لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اس لئے کو اتنا کبھی نہیں پڑھا یا کہ رسالہ کی علمی حیثیت نظرانداز ہو جائے ورنہ جو مالی نقصانات الناظر کو اٹھانا پڑے اُن کا افسانہ کم سے کم اتنا طولانی نہ ہوتا۔

مگر چلپی صاحب کی تحریریں یقیناً اس نقص سے پاک ہیں۔ تھوڑے ہی دن ہوئے ایک شفیق دوست نے جو شگفتہ مضامین لکھنے میں خاص امتیاز رکھتے ہیں تحریر فرمایا تھا کہ

"حضرت چلپی کے حواشی اگر کچھ اور زیادہ، نیز متنوع ہو جائیں جیسے ماڈرن ریویو والے لکھتے ہیں تو یقین ہے اس کی (الناظر کی) قبولیت میں اضافہ ہوگا .... ان کے زورِ تحریر اور جذبات اسلامی کی وکالت پر مجھ کو رشک آنے لگا ہے۔"

ایک دوسرے نامور انشا پرداز جن کی شگفتہ تحریریں مولانا شبلی مرحوم کو اس قدر پسند تھیں کہ جب اُنھوں نے شعر العجم کی دوسری جلد خاکسار کو بغرض ریویو عنایت فرمائی تو ساتھ ہی یہ فرمایش بھی کی کہ اس پر ریویو ان صاحب سے لکھوایا جائے۔ اپنے ایک گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

".... البتہ فیہ ما فیہ کسی زبردست نامہ نگار کے قلم سے نکل رہا ہے۔ اور باوجودیکہ وہ نامہ نگار اپنی عربی دانی کا خواہ مخواہ بہت ثبوت دینا چاہتا ہے، نہایت دلکش اور مفید ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں واقعی اضافہ مناسب ہے مگر اس حد تک کہ تعزیرات ہند کے وار سے بچتا رہے۔ اس نامہ نگار کے قلم کی شوخی بعض وقت مجھ کو متوالا کر دیتی ہے۔ اللہ اسکے زور قلم میں ترقی دے اور وہ تھوڑی سی عربی بھول جائے۔"

(اس پرچہ کو دیکھ کر صاحب مذکور خوش ہوں گے کہ اُنکی یہ دعا قبول ہو گئی)

خود سلطان حیدر صاحب کے وطن میں جو ایک ظرافت و شوخی کے مجسم اوتار تشریف فرما ہیں اور جو مستقلاً الناظر کے لیے "سنسر" بنا دیے گئے ہیں وہ بھی بار بار اسی قسم کی رائے ظاہر فرما چکے ہیں۔

اسکے بعد جو کمی ہے اُس کی تلافی سلطان حیدر صاحب کے اختیار میں ہے کہ وہ الناظر کے قدیم فسانہ نگار ہیں اور اب تک باوجود زبانی و تحریری تقاضوں اور وعدوں کے "ترکِ قلم" کی قسم کھائے بیٹھے ہیں۔

(۳) "کھدر پوشی" کا الزام میں بخوشی تسلیم کرتا ہوں۔ مگر یہ کوئی نیا روگ نہیں ہے۔ الناظر جس دن سے جاری ہوا ہے دیسی کاغذ پر چھپتا ہے اور اگرچہ دوسرے رسائل کی ظاہری آب و تاب سے لوگوں کی گرویدگی مجھ سے پوشیدہ نہیں تاہم میں مُلکی و قومی فلاح کے لیے اپنے ذاتی نفع اور احباب کی نفاست پسندی دونوں کو

قربان کرنے کے بعد بھی الناظر کی کھدر پوشی سے شرمندہ نہیں ہوں۔ وہ دن دُور نہیں جب ملک میں اتنی بیداری پیدا ہو جائے گی کہ ہر شخص غیر ملکی مصنوعات کے استعمال کو فیشن کے خلاف جاننے لگے گا۔

(۳) "چاشنیِ ادب" کی مبہم اصطلاح سے شاید الناظر کے حصۂ نظم میں موجودہ کمی کی طرف اشارہ ہے۔ اسکو میں تسلیم کرتا ہوں۔ انشاء اللہ یہ بات جلد رفع ہو جائے گی۔ اور اگر یہ مقصود ہے کہ علمی مضامین کے بجائے ادبی مضامین پر زیادہ توجہ کی جائے تو دوسری بات ہے۔

(۴) الناظر کی پالیسی کے بارہ میں بہت سے شبہات وارد کیے جاتے ہیں۔ اور میں اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر اُس کے مقاصد کی صراحت کر دینا چاہتا ہوں۔

الناظر یقیناً علمی و ادبی رسالہ تھا ہے۔ اور انشاء اللہ رہیگا۔ مذہبی تبلیغ اور سیاسی مناظرہ اسکے دائرۂ عمل میں نہ کبھی داخل تھا اور نہ اب ہے۔ لیکن وہ مذہب سیاست کو شجرِ ممنوعہ بھی نہیں تصور کرتا۔

الناظر اُردو کا مبلغ ہے اور اسکے ساتھ ہی ساتھ قوم کی علمی ترقی، اخلاقی اصلاح، معاشرتی بہبود اور اقتصادی فلاح بھی ابتدا سے اُسکے پیشِ نظر ہے

جوش صاحب سنہ ۱۳ء یا سنہ ۱۵ء تک کے الناظر کی روش کو پسند فرماتے ہیں۔ کیا اُن کو یاد ہے کہ دسمبر سنہ ۱۲ء کے الناظر میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجتماع لکھنؤ کو مخاطب کر کے الناظر نے بزرگان علیگڈھ کی اس کارروائی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی کہ اُنھوں نے کانفرنس کے شعبۂ اصلاح تمدن کو مکمل بند اور لٹریری سکشن یا انجمن ترقی اُردو کو کیسر معطل کر رکھا ہے۔ اور اس سے بھی پیشتر سنہ ۱۹۱۰ء میں الناظر میں یہ تحریک اُٹھائی گئی تھی کہ آل انڈیا لیڈیز کانفرنس منعقد کی جائے۔ جسکے ضمن میں پردہ کی بحث چھڑ گئی تھی۔ یا وہ بے خبر ہیں کہ عورت کی منزلت اور ہندوستان میں مسلمانوں کی معاشرت اور اُسکی اصلاح پر سنہ ۱۰ء سنہ ۱۱ء و سنہ ۱۲ء میں درجنوں مضامین الناظر میں شایع کیے گیے

پھر سنہ ۱۸ء سے آج تک مسلم یونیورسٹی، انجمن ترقی اُردو، مسلم لیگ و خلافت کمیٹی پر یا بعض دیگر قومی جلسوں کی کارروائی کے متعلق جو کچھ لکھا گیا وہ مذہبی و سیاسی بحث میں کیوں شمار کیا جائے۔ آپ اِن مضامین کو ایک دفعہ پھر پڑھنے کی تکلیف گوارا کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں مذہب و سیاست کی قطعاً بحث نہیں ہے۔ مسلم یونیورسٹی کن شرائط پر قبول کی جائے۔ انجمن ترقی اُردو کا نظام کار کیا ہو۔ مسلم لیگ کے حسابات کی جانچ کے کیا نتائج نکلے۔ خلافت فنڈ کی بربادی اور خلافت کمیٹی کی ابتری کے کون ذمہ دار ہیں۔ فلاں فلاں

جلسہ میں فلاں فلاں اصحاب نے کیا ویہرے اختیار کیے وغیرہ میں سے کس مضمون کو آپ مذہبی وسیاسی تصور کرتے ہیں ؟

ہاں سنہ ۱۹۳۰ء میں ماہ گذشتہ کے عنوان سے مجالس سیاسی کی کارروائیوں پر جو تبصرہ کیا جاتا تھا اُسے آپ ایک حد تک سیاسی تصور کرنے میں حق بجانب ہوں گے مگر یہ سلسلہ بہت تھوڑے دنوں قائم رہا۔ اور اب عرصہ ہوا کہ بند کر دیا گیا ہے ۔

سود کا مسئلہ یقیناً ایک مذہبی مسئلہ ہے ۔ مگر کیا ساتھ ہی ساتھ یہ قوم کی اخلاقی، معاشرتی و اقتصادی زندگی سے کچھ تعلق نہیں رکھتا ؟ الناظر میں اس بحث میں جو کچھ شایع ہوا ہے اُسے غور سے پڑھیے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اُس میں اگر مذہبی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے تو علمی، اقتصادی، اخلاقی، اور معاشرتی پہلو بھی نظر انداز نہیں ہوئے ہیں ۔

(۵) فیہ ما فیہ میں قرآن وحدیث کی سند دیکر جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ بے شبہہ مذہبی رنگ کی چیز ہے مگر کیا چلپی صاحب کی تحریر میں صرف یہی ہوتا ہے ۔ اور بس ۔

مولانا شبلی مرحوم نے اپنے ایک فارسی قصیدہ میں جدید تعلیم یافتہ گروہ کی ذہنیت کا کیا خوب نقشہ اُتارا تھا ۔

اے کہ پروردۂ یورپ ہماں باشی — حیف باشد اگر از جملۂ ایشاں باشی
حیف اگر از اثرِ فلسفۂ مغربیاں — منکرِ فلسفۂ سنت و قرآں باشی
سحر از شعبدۂ جلوہ دہ سحر بنی — منکرِ معجزۂ موسیٰؑ عمراں باشی
گفتۂ سولن و آئینِ جہانبانی او — بر زباں داری و بیگانہ زنعماںؒ باشی
از ہنیبال صد افسانہ و دستاں گوئی — جاہل از معرکہ ہائے شہِ مرداںؓ باشی
قیصراں را ہمہ یک یک بشماری ز آغاز — بے خبر از عمرؓ و حیدرؓ و عثمانؓ باشی
از خداوند جہاں یاد نیاری گاہے — روز و شب خود بہ پرستاری سلطاں باشی

اُس وقت اگر یہ حالت نہ تھی تو آج تو یقیناً یہی صورت ہے ۔

یہی "چلپی صاحب" ایک زمانہ میں "ایک طالب علم" کے نام سے مولانا شبلی کی کتاب "الکلام" پر تنقید لکھ رہے تھے، اور وجود باری تعالیٰ و نبوت جیسے اسلامی مسائل پر مولانا کے عقلی دلائل کو "ہلکے"، "حل"، "مین"،

بوشنر اور برٹشو وغیرہ یورپین فلاسفہ کی تحریروں سے قطع کر رہے تھے تو تمام تعلیم یافتہ جماعت میں ایک غلغلہ مچ گیا تھا اور ہر شخص اُن کے علمی مضامین کی داد دیتا تھا - اور اُسکے بعد بھی جب تک صاحب موصوف فلاسفۂ یورپ کے ترجمان رہے اور اُنھیں کے اسناد سے اپنے مضامین کو مزین کرتے رہے تعلیم یافتہ جماعت میں سے کسی کو حرف گیری کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی - مگر جب اس خدا کے بندہ کو راہِ ہدایت نصیب ہوئی اور بیکن و ڈیکارٹ، کانٹ و اسپنسر کے خیالی و قیاسی علوم کی ترجمانی سے گذر کر انھوں نے خدا اور رسول کے اقوال سے اپنی تحریروں میں استنباط شروع کیا تو ایک نہیں متعدد تعلیم یافتہ اصحاب کی ناک بھوں چڑھ گئی - چنانچہ کئی مہینے ہوئے جب ایک دوست نے ہمارے لائق انشاپرداز کے "انداز قد" کو جلوۂ تو میں دیکھ کر پہچان لیا اور ازراہِ ترحم اُن کی انشاپردازی پر فاتحہ خوانی کردی -

یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ ہوا کا رخ کدھر ہے - اب سے چند سال پہلے اگر خود چلپی صاحب ایسی باتیں لکھتے تو مجھے کچھ تعجب نہ ہوتا - کیونکہ تعلیم یافتہ احباب کے نزدیک اسپنسر و ڈارون، بیکن و ڈیکارٹ، چاسر و ملٹن، شیکسپیر و مکالے کے اقوال تو علمی و ادبی ہوسکتے ہیں مگر خدا کے کلام اور رسول خدا کی حدیثوں کو علم و ادب سے کیا لگاؤ - انکے لیے بزم علمی کے دروازے بند ہیں - مسجد اور محفلِ میلاد سے آگے قدم رکھنے کی اجازت نہیں - تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو -

اگر سلطان حیدر صاحب یہ شکایت کرتے کہ رسالہ پر قومیت و اسلامیت کا اثر حاوی ہے، وطنیت اور ہندوستانیت کا عنصر نمایاں کیا جائے تو میں اس کو بخوشی مان لیتا - ایک دوسرے اہل قلم نے ان الفاظ میں نہیں مگر اسی مفہوم کو اپنے رنگ میں لکھ کر مجھے ممنونِ منت بنایا - اگرچہ مختلف اسباب ایسے ہیں جن کی بنا پر مجھے اس راہ میں بہت دشواریاں نظر آتی ہیں لیکن پھر بھی میں اُسے بہتر جانتا ہوں اور حتی المقدور اس کی کوشش کی جائے گی کہ اُن ہندو احباب کی قلمی اعانت حاصل کی جائے جو اُردو سے خاص دلبستگی رکھتے ہیں - اور الناظر کے مستقل معاونین سے بھی یہ التماس ہے کہ جہاں تک اُن کے امکان میں ہے ایسے مضامین لکھیں جو دونوں قوموں کے لیے یکساں مفید ہوں یا کم سے کم ہندوؤں کے لیے بالکل بیکار نہ معلوم ہوں -

(۶) ذاتیات پر حملہ کرنا اگرچہ الناظر کا شیوہ نہیں لیکن چونکہ بیانِ واقعات میں اکثر اصحاب کے نام بھی آجاتے ہیں اس لیے وہ احباب جنھوں نے اس خیال کو ایک ہوّا بنا رکھا ہے فوراً چراغ پا ہوتے ہیں مگر تنقید کرنے والے کو اسکے بغیر چارہ نہیں - اور اگر ہمارے دوست کو اس میں عذر ہو تو لائق سے لائق انشاپرداز

اخبار نویسوں، مدبروں، شاعروں اور فلسفیوں کے مطبوعہ اوراق میں سے ایک دو نہیں سیکڑوں مثالیں اس بیان کی تائید میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ سلطان حیدر صاحب اپنی اسی معصوم تحریر کو کسی غیر جانبدار شخص سے پڑھوا کر سُن لیں تو اُنکو اندازہ ہو جائے گا کہ ایک خانگی تحریر یا اظہار رائے جیسے کار خیر میں بھی محض اس سبب سے کافی درشتی و تلخی آگئی ہے کہ اُنھوں نے اپنے خیالات کو آزادی سے برہنہ کر دیا۔ خدا کرے وہ کچھ دنوں کے لیے کسی اخبار (خواہ وہ تحصیل گزٹ ہی کیوں نہ ہو) کے ایڈیٹر بنا دیے جائیں۔ پھر دنیا دیکھے گی کہ اُن کا شوخ نگار قلم معزز حکام اور حکام پرستوں کی کیسی کیسی قصیدہ خوانیاں کرتا اور شوریدہ سر سوارا جیوں اور تارکینِ موالات کو نام بنام کیسی کیسی اُودھیاں سُناتا ہے۔

اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام　　قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

بہرانہیم چونکہ ایڈیٹر الناظر سے ایک دفعہ ایسی لغزش ہو چکی ہے جسکے لیے اُس کو نادم ہونا پڑا اور ملامتِ ضمیر سے بچنے کے لیے علی الاعلان عذر خواہی کرنا پڑی، وہ خود اب اس بارہ میں بہت احتیاط برتتا ہے۔ اور کم سے کم سلطان حیدر صاحب تو اطمینان رکھیں کہ "فیہ ما فیہ" کی بندوق اور "نظر سے خوش گذرے" کی مشین گن سے وہ نہ صرف اس وقت بلکہ ابدالآباد تک کے لیے محفوظ ہیں۔ بشرطیکہ وہ الناظر کے لیے صرف مختصر افسانے تحریر فرمایا کریں اور کتابیں لکھ لکھ کر ریویو کے لیے نہ ارسال فرمائیں۔　　ایڈیٹر

# شکریہ

الناظر کی توسیع اشاعت کے بارہ میں جو تحریک کی گئی تھی اُسکے نتائج کی تفصیل گذشتہ مہینہ میں درج کی جا چکی ہے۔ اس کے بعد جن احباب نے توجہ فرمائی ہے اُس کی کیفیت حسب ذیل ہے:-

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱- مولوی سید محفوظ علی بی اے نے | ۲ | خریدار دیے | |
| ۲- مولوی عبد اللہ خاں پنشنر خورجوی نے | ۱ | " | |
| ۳- قاضی انتظار علی خاں عباسی بی اے " | ۲ | " | |
| ۴- مسٹر عبد الشکور بریلوی ایم اے " | ۳ | " | |
| ۵- مولوی مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی " | ۱ | " | |
| ۶- منشی محمد ظفر ایم اے ایل ایل بی " | ۳ | " | (سابقہ ۴ خریداروں کے علاوہ) |

اور اصحاب ذیل نے آیندہ توجہ فرمانے کا وعدہ کیا ہے:- پروفیسر رشید احمد صدیقی - خواجہ نجم الغنی قریشی حافظ سید ظہیر الحسن ایم اے -

ظفر الملک

# انعامی مضمون

الناظر کے دائرۂ خدمت کو وسیع اور مفید تر بنانے کے متعلق تقریبًا ایک سال سے بعض احباب و مخلصین سے مشورہ کیا جا رہا تھا۔ اور منجملہ دوسری باتوں کے ایک یہ امر زیر غور و بحث تھا کہ اہل قلم کی کثیر جماعت کو شریک کار بنانے کے لیے انعامی مضامین کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ مالی مشکلات کی بنا پر اب تک کسی اعلان کی جرأت نہ ہو سکی تھی کہ بعض مخلصین کی محبت و فیاضی نے بالآخر ایک راہ نکال دی۔ اور آج میں نہ صرف الناظر کے جملہ قلمی معاونین اور اہل قلم ناظرین کو بلکہ ہندوستان بھر کے اُن تمام اصحاب کو جو اس امتحان مقابلہ میں شرکت فرمانا گوارا کریں، دعوت دیتا ہوں کہ مندرجۂ ذیل عنوان پر طبع آزمائی فرمائیں :-

## عنوان

**"آزاد - حالی - نذیر احمد اور شبلی میں سب سے بڑا انشا پرداز کون تھا اور سب سے زیادہ اُردو کی خدمت کس نے انجام دی۔"**

## شرائط مقابلہ

(۱) مضمون فلسکیپ کاغذ کے کم سے کم ۳۰ صفحوں پر صرف ایک جانب لکھا جائے۔

(۲) ۳۱ ر دسمبر ۱۹۳۰ء تک دفتر الناظر میں وصول ہو جائے۔ بیرونی اصحاب بذریعہ رجسٹری ارسال فرمائیں۔

(۳) مندرجۂ ذیل اصحاب تمام مضامین موصولہ کی جانچ کر کے بہترین مضمون کا انتخاب فرمائیں گے:

۱ - جناب مولوی سید محفوظ علی بی اے - رئیس بدایوں

۲ - جناب مولوی عبد الماجد بی اے - دریاباد ضلع بارہ بنکی

۳ - جناب مولوی سید ہاشمی فرید آبادی - رکن دار الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی

۴ - جناب منشی امیر احمد علوی بی اے - سشن جج نیپال

۵ - جناب مرزا محمد عسکری بی اے سکرٹری انجمن اُردو لکھنؤ

(۴) جن صاحب کا مضمون مجلس انتخاب کی رائے میں سب سے بہتر قرار پائے گا اُن کی خدمت میں

مبلغ پچاس روپے کی تھیلی ، اور اس مضمون کے پچاس مطبوعہ نسخے بطور انعام نذر کیے جائیں گے۔

(۵) جملہ مضامین سوا ان کے جو مجلس انتخاب کی رائے میں ناقابلِ اشاعت قرار پائیں ایک مجموعہ کی صورت میں شایع کر دیے جائیں گے۔ جن اصحاب کے مضامین اس مجموعہ میں شامل ہوں گے اُن کو ایک نسخہ ہدیۃً دیا جائے گا۔

(۶) کوئی مضمون کسی صورت میں واپس نہ کیا جائے گا۔

(۷) جس مضمون پر انعام دیا جائے گا اُسکے طبع و اشاعت کے جملہ حقوق بحق الناظر محفوظ ہوں گے۔

(۸) بقیہ مضامین مجموعہ کی اشاعت تک سوائے اوراق الناظر کے اور کہیں شایع نہ ہو سکیں گے۔ بعد اشاعت مجموعہ ہر مضمون نگار کو اپنے مضمون کے طبع و اشاعت کا کامل اختیار ہوگا۔ البتہ کوئی صاحب مجموعۂ مضامین کے طبع و اشاعت کے مجاز نہ ہوں گے۔ یہ حق صرف الناظر کے لیے محفوظ رہے گا۔

اُمید ہے کہ وہ تمام اہل قلم جو اس بات کی اہمیت کا اندازہ رکھتے ہیں کہ اُردو ادب میں جو ذخیرہ اب تک فراہم ہو چکا ہے اُس کی تنقید اور درجہ بندی کرنا ضروری ہے تاکہ موجودہ اور آیندہ کارکنوں کو دورِ گذشتہ کے ادبی کارناموں کی صحیح قدر و قیمت معلوم ہو، اس عنوان پر طبع آزمائی فرمائیں گے اور اگر قارئین انشا پردازوں نے اُمید کے مطابق توجہ فرمائی تو انشاءاللہ تعالیٰ آیندہ دوسرے انعام کا انتظام کیا جا سکے گا۔

چونکہ یہ انعام صرف الناظر کے ناظرین و معاونین کے لیے نہیں ہے بلکہ جملہ اہل قلم کو خواہ وہ کسی حصۂ ملک کے باشندے ہوں یا کسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں اس دعوت عام میں شریک کرنا منظور ہے اس لیے جملہ معاصرین کرام سے التماس ہے کہ اپنے اپنے اخبارات و رسائل میں اس اعلان کے ضروری حصہ کو شایع فرما دیں تاکہ اُن کے ناظرین و معاونین قلمی بھی اس سے مطلع ہو جائیں۔ بہت سے حضرات کو دعوتی خطوط علیحدہ بھیجے جائیں گے۔ مگر جن حضرات کو کسی سبب سے نہ پہونچیں وہ یہ نہ تصور فرمائیں کہ اُن کو دعوت دینا منظور نہیں ہے

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

ظفر الملک

# نظرے خوش گذرے

الناظر کے نادقت شایع ہونے سے جس قدر دُکھ ایڈیٹر الناظر کو ہوتا ہے اُس کا اندازہ ناظرین کرام مشکل کر سکتے ہیں۔ تہیہ کیا گیا تھا کہ یہ پرچہ ۲۰ ستمبر سے قبل شایع کیا جائے۔ ستمبر کا اکتوبر کے عشرہ اول میں اور اکتوبر کا اُسی ماہ کی آخری تاریخ کو، تاکہ اُس کے بعد ہر مہینہ کے اندر اندر رسالہ شایع ہو جا سکے اسی نہج پر کام ہو رہا تھا اور ۱۵ ستمبر تک پرچہ تیار ہو جانے کی قوی اُمید تھی کہ دفعتًا ۱۲ ستمبر کو لکھنؤ میں ہندو مسلمانوں کے مابین فساد ہو گیا۔ شہر میں کئی روز بدامنی رہی۔ جس کی وجہ سے بازار بند ہو گئے اور شرفا خانہ نشینی پر مجبور۔ اس غیر معمولی اُفتاد نے سارا منصوبہ خاک میں ملا دیا۔ اور اب مشکل اسکی امید کیجا سکتی ہے کہ ستمبر و اکتوبر دونوں مہینوں کے پرچے اکتوبر ہی میں شایع ہو سکیں۔ خصوصًا اس بنا پر کہ ماہ رواں کے آخر میں تقریبًا پندرہ دن کے لیے ذاتی و کاروباری ضرورتوں سے باہر جانا منظور رہے، بہر حال ناظرین کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اس سال کے اندر اندر یہ بدنظمی اوقات ختم ہو جائیگی اور اکتوبر کا نہیں تو نومبر کا پرچہ ضرور اُسی ماہ کے اندر شایع ہو گا۔ دلی تمنا تو یہ ہے کہ جس طرح ابتدائی سالوں میں الناظر ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو لازمًا شایع ہو جایا کرتا تھا وہی انتظام پھر قائم ہو جائے۔ لیکن،

بہت ارمان ایسے ہیں کہ دل کے دل ہی میں رہتے ہیں

حالتِ موجودہ میں اس کی اُمید کم نظر آتی ہے۔ اس لیے اگر مہینہ کے مہینہ پرچہ شایع ہوتا رہے تو یہی غنیمت معلوم ہو گا۔

---

جولائی نمبر کے صفحہ ۰ میں جلیبی صاحب نے "پرستان فرنگ" کے زیر عنوان جو کچھ لکھا تھا اُس کے متعلق ایڈیٹر صاحب اودھ اخبار اپنے گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ

"پریس کے متعلق جس مضمون کا حوالہ گذشتہ اشاعت میں دیا گیا ہے، وہ ہندو بزرگ کا نہیں ہے۔"

ہم اس تصحیح کو نہایت مسرت سے شایع کیے دیتے ہیں۔

ایڈیٹر صاحب نے یہ بھی شکایت کی ہے کہ الناظر کو اودھ اخبار سے "اس قدر نفرت ہے" کہ

کہ وہ اخبار مذکور کا نام تک اپنے اوراق میں درج کرنا گوارا نہیں کرتا۔ جہاں تک ایڈیٹر کا تعلق ہے وہ اسکو تسلیم نہیں کرسکتا، اور شکرگزار ہوگا اگر اُس کی تحریروں میں کوئی ایک ایسا موقع بتا دیا جائے جب وہ اس جُرم کا مرتکب ہوا ہو۔ اور اپنے قلمی معاونین کی تحریروں کا اس بارہ میں وہ یقیناً ذمہ دار نہیں قرار دیا جا سکتا۔ البتہ اگر چلبی صاحب کے متعلق یہ سوءظن ہے تو انھوں نے اپنے گرامی نامہ میں تحریر فرما دیا ہے کہ

> "ایڈیٹر صاحب کی یہ بدگمانی صحیح نہیں۔ وہ خود اس امر سے یقیناً واقف ہوں گے کہ کسی پرچہ یا شخص کے نام کی عدم تصریح کی وجہ محض "نفرت" ہی نہیں ہوتی، بلکہ دوسرے اسباب بھی ہوتے ہیں اور ہم اُنھیں یقین دلانا چاہتے ہیں، کہ اِن سطور کے راقم کو اودھ اخبار سے "نفرت" کی ہرگز کوئی وجہ موجود نہیں۔"

خدا کرے ایڈیٹر صاحب کو اب اطمینان ہو جائے۔ اور وہ ایسے پریشان خواب نہ دیکھا کریں۔

---

اُسی پرچہ میں صفحہ ۳۵ پر حضرت آثر لکھنوی کی غزل کے مقطع میں ایک غلطی رہ گئی ہے۔ پہلا مصرعہ " اک گونہ تسکین ہو جاتی ہے دل کی آثر بیتابی میں" ہونا چاہیے۔

---

سنہ ۱۷ء میں " انجمن ترقی اُردو کا نظام" کے عنوان سے جو مضامین الناظر میں شایع کیے گئے تھے اگرچہ اُن کا براہ راست تعلق اُسی انجمن سے تھا مگر بہت سی باتیں ایسی تھیں جو انجمن اردو لکھنو کے حق میں بھی مفید ہو سکتی ہیں۔ اُن مضامین کی اشاعت تو موجب طوالت ہوگی، مگر انجمن اردو کے ارکان انتظامی کی اطلاع کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند ضروری باتیں اختصار کے ساتھ یہاں عرض کر دی جائیں :—

(۱) انجمن کو ایسی صورت سے چلانا چاہیے کہ اُس کی زندگی اور بقا کسی ایک ہستی پر منحصر نہ ہو جائے بلکہ ابتدا ہی سے ایسا ڈھنگ ڈالا جائے کہ بہت سے افراد تقسیم کار کی بنا پر انجمن کے کاموں میں ہاتھ بٹائیں۔

(۲) انجمن اُردو کو کسی ایک طبقہ کے لیے محدود نہ کرنا چاہیے۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی وغیرہ

سب حرفوں کی شرکت سے اُردو زبان کی خدمت زیادہ ہو سکے گی۔

(۳) انجمن اُردو نے اپنے دستور العمل کے رُو سے اس قدر ذمہ داریاں اپنے سر لے لی ہیں کہ حالاتِ موجودہ میں اسکی توقع نہیں کہ وہ ان سب کاموں کو انجام دے سکے۔ دستور العمل میں تبدیلی کا فی الحال کوئی سوال نہ ہونا چاہیے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ جتنا کام آئندہ سال دو سال میں کیا جا سکے اُسکے لیے ایک نظام عمل مرتب کر کے بقیہ امور کو سردست نظر انداز کر دیا جائے۔

(۴) انجمن اُردو کی طرف سے کم سے کم اِن صوبہ جات کے جملہ ایسے اصحاب کو دعوتِ شرکت دینا چاہیے جن کو اُردو علم ادب سے خاص دلچسپی ہے اور جو دامے۔ درمے۔ قدمے۔ سخنے۔ قلمے کسی نوع سے انجمن کی مدد کر سکتے ہیں۔

(۵) جملہ ضروری کاموں کے انصرام کے لیے ایسے اصحاب کی ایک مجلس عاملہ بنالی جائے جو جلد جلد یکجا ہو کر سرانجام کار میں معین ہو سکیں۔

(۶) علاوہ چندۂ رکنیت کے ایک "مستقل سرمایہ" فراہم کرنے کی کارروائی جلد سے جلد شروع کر دینا چاہیے جس کی مقدار کم سے کم دس ہزار ہو۔

آخر میں مضامین کے خاتمہ پر جو سطور سپرد قلم ہوئی تھیں اُن کو بجنسہ نقل کیے دیتا ہوں:—

"اُن اسباب کی بنا پر ہماری دلی آرزو اور تمنا یہ ہے کہ جدید اجتماعی تحریکات کے منتظمین اس بات میں بدل ساعی ہوں کہ چند دولتمندوں کی نگاہِ التفات پر نہیں بلکہ کثیر التعداد متوسطین کی امداد پر ان تحریکوں کا انحصار رہے۔ موجودہ زمانہ میں اور خصوصاً کسی کام کی ابتدا میں یہ کچھ آسان نہیں۔ لیکن صبر و استقلال، پامردی اور حوصلہ مندی کے ساتھ کام کیا جائے تو تھوڑے ہی دنوں میں خود نتائج اس بات کا ثبوت دیدیں گے کہ سب سے بہتر اور قابل اعتماد طریقہ یہی ہے۔"

---

منشی طفیل احمد صاحب تبلیغ سود کے سلسلہ میں غالباً ہر ہفتہ ایک گشتی مراسلہ ارسال فرماتے رہتے ہیں۔ پہلے بھی تحریر کیا جا چکا ہے اور اب پھر بصراحت عرض کیا جاتا ہے کہ ان مراسلات کی اشاعت کے لیے علمی و ادبی رسائل کے پاس گنجائش نہیں۔ منشی صاحب خواہ مخواہ اپنے ٹکٹ اور کاغذ کیوں ضائع فرماتے ہیں۔ اسراف مذہباً اگر ممنوع ہے تو اقتصادی حیثیت سے بھی لائق تحسین نہیں۔ کاش یہ دام غریب قوم ہی کے کام آئیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رجسٹرڈ نمبر ایل ۸۴۲

رسالہ

# الناظر

لکھنؤ

## ایڈیٹر ۔ ظفر الملک علوی

قیمت سالانہ للعہ مع محصول

فی پرچہ ۳

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر و پبلشر :۔ اسحاق علی علوی

ماہ مئی

# مطبوعات الناظر پریس لکھنؤ

## اسلام

نواب محسن الملک کا قابل دید مضمون

قیمت ۲ر (خریداران الناظر سے ۱ر)

## تاریخ عرب

مصنفۂ

**موسیو سیدیو فرانسیسی**

عربوں کے متعلق یہ کتاب اُن تمام تاریخوں کا نچوڑ ہے
جو یورپ ایشیا کے کتبخانوں کی زینت ہیں مسلمانوں
کی ترقیات اور عربوں کے کمالات کا یہ آئینہ ہے
اور یورپ کے افترا و کذب کا بہترین جواب

قیمت مجلد چرمی سعہ مجلد پارچہ صہ

## طالب علم کی زندگی کا مقصد

خواجہ غلام الثقلین مرحوم کا نہایت سبق آموز اور مفید لکچر

قیمت ۳ر (خریداران الناظر سے ۲ر)

## قواعد المنتخب

جلال لکھنوی کا لاجواب رسالہ جو
زبان کے متعلق بہترین تحقیقات سے لبریز ہے

قیمت ۴ر (خریداران الناظر سے ۳ر)

## ترقی زبان بذریعۂ تراجم

پروفیسر گھوشال ایم اے کا وہ قیمتی
لکچر جو لکھنؤ کی اردو کانفرنس میں پڑھا گیا

قیمت ۴ر

(خریداران الناظر سے ۳ر)

## موازنۂ انیس و دبیر

مولفۂ

**مولانا شبلی مرحوم**

جس میں میر انیس کی شاعری پر تفصیلی
ریویو اور میر انیس و مرزا دبیر کا
موازنہ کیا گیا ہے۔

قیمت سے ر

(خریداران رسالہ کے لیے ۱۲)

## شوکیہ اور دو مظلوم بہنیں

قیصر بھوپالی کے دو مختصر افسانے

قیمت ۲ر (خریداران الناظر سے ۱ر)

## مثنوی صبح امید

مولانا شبلی کی سب سے پہلی مطبوعہ نظم

قیمت ۴ر

(خریداران الناظر سے ۳ر)

## مولانا شبلی کے متفرق مضامین

زیب النسا ۱ر

جہانگیر اور تزک جہانگیری ۲ر

اسلامی حکومت ۲ر

اسلامی مدارس ۴ر

(خریداران الناظر سے نصف قیمت)

ملنے کا پتہ :- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ

# فہرست مضامین الناظر بابت ماہ ستمبر سنہ ۱۹۲۴ء

نمبر ۱۵۹ — جلد ۲۷

# مطبوعات جدیدہ

## معراج الکلام (جلد اول)

جانشین مرزا دبیر مرزا محمد جعفر اوج مرحوم کا کلام جس میں ۱۲ مرثیے سلام اور رباعیات ہیں۔ اور شروع میں مرزا صاحب کے ذاتی وخاندانی حالات اور عکسی تصویر۔ قیمت ۶ر

## بانگ درا

ڈاکٹر اقبال کا مجموعہ کلام جسمیں قدیم وجدید ہر قسم کا شایع شدہ اور غیر مطبوعہ کلام ہے۔ شایع کنندگان نے شاید معقول معاوضہ دینے کی وجہ سے یہ صورت اقبال کی قیمت ومقبولیت پر نظر ہے تاجروں کے لیے اگرچہ مجموعہ کی فراہمی کو بجائے خود ایک مسئلہ بنا دیا ہے تاہم الناظر کے مخیر ناظرین کے لیے کچھ نسخے حاصل ہوگئے ہیں۔ شائقین فوراً منگالیں۔ کتاب کی خوشنما جلد بندھوائی گئی ہے۔ قیمت عہ ر

## نقش فرنگ

مصنفہ قاضی عبد الغفار صاحب سابق ایڈیٹر ہمدرد و صدا وغیرہ جس کا تعارف قیمہ الناظر کے ذیل میں کرایا جا چکا ہے۔ اور جس میں یورپ کے موجودہ تمدن کا نہایت دلچسپ مرقع پیش کیا گیا ہے۔ قیمت عمر

---

تجدید دنیائے اسلام۔ جس کا مفصل ریویو اگست کے الناظر میں درج ہوچکا ہے۔ اگر کسی صاحب کو مدد کا ریو تو منگالیں۔ قیمت عہر

## عمرو بن عاص رض

مشہور صحابی جنھوں نے مصر فتح کیا۔ مولانا اسلم جیراجپوری نے انکی سوانحمری تالیف کی ہے قیمت عہ

## جاپان اور اسکا تعلیمی نظم ونسق

نواب مسعود نواز جنگ بی اے ناظم تعلیمات ریاست حیدر آباد دکن کچھ عرصہ ہوا ریاست کی طرف سے جاپان بھیجے گئے تھے کہ وہاں کے تعلیمی حالات کا مطالعہ کریں۔ واپس آکر انھوں نے جو دلچسپ رپورٹ جاپان انگریزی میں مرتب کی انجمن ترقی اردو نے اہل ملک کے نفع کے لیے اسکو اردو میں شایع کیا ہے

## سوانحمری مہاراجہ اشوک

مہاشے پرکاش دیو جی آنجہانی جنکی تصانیف "سوانح حضرت محمد صلعم" اور "مہاتما بدھ" وغیرہ بہت مقبول ہوچکی ہیں۔ یہ کتاب بھی انھیں کی تالیف ہے جسمیں ہندوستان کے مشہور ومعروف مہاراجہ اشوک کے حالات لکھے گئے ہیں۔ قیمت ۱۲ر

## تقریب مغربی معمل خانے

از سید طالب علی طالب الہ آبادی۔ مغربی ممالک کے سائنس دان اپنے تجربات کس طریقہ پر کرتے ہیں؟ اس کا دلچسپ خاکہ اس رسالہ میں پیش کیا گیا ہے۔ اسلوب بیان ایسا رکھا گیا ہے کہ کتاب افسانہ بنگئی ہے۔ قیمت ۸

---

ملنے کا پتہ:- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# الناظر

نمبر ۱۵۹ جلد ۲۷ — اکتوبر سنہ ۱۹۲۴ء

## فیہ مافیہ

(اختر چلپی)

### عبرت!

کتب حدیث میں باب الفتن کے زیرعنوان جو ارشاداتِ نبویؐ محفوظ ہیں، زمانہ اُن کی تصدیق ہر ہر قدم پہ کرتا جاتا ہے - اسلام کا نام لے کر اسلام کو جس طرح مٹایا جا رہا ہے، دوستی کے پردہ میں جس طرح دشمنی کی جا رہی ہے، اصلاح کی آڑ میں ہدم و تخریب کے جو تیشے چلائے جا رہے ہیں، ان کا اندازہ ہر صاحبِ ایمان کو ہے - اہلِ فرنگ کو اسلام کا دوست و محافظ بتایا جاتا ہے، قرآن کی تفسیر ڈارون و ہیگل کے اقوال کی ہتحتی میں کی جاتی ہے، سود خواری کے جواز و ترویج میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا جا رہا ہے، یہ سب اسی دورِ فتن کے مظاہر و آثار ہیں - لیکن حال میں پنجاب کے ایک "مشرقی" بزرگ نے جو قیامت بپا کر دینی چاہی ہے، اُسکے سامنے یہ تمام فتنے گرد ہو گئے ہیں - ان "مشرقی" محقق نے اپنے اجتہاد کا ہدف کسی جزئی مسئلہ کو نہیں، بلکہ اسلام کو اُسکی مجموعی و کُلی صورت میں بنایا ہے،

اُنکا دعویٰ یہ نہیں، کہ کسی خاص مسئلہ میں اُنھیں دنیاے اسلام سے اختلاف ہے، بلکہ وہ یہ ارشاد فرماتے ہیں، کہ دُنیا اسلام کے مفہوم ہی سے آشنا نہیں! گویا اسلام وہ نہیں، جسے ائمہ ومحدثین، تابعین وصحابۂ کرام، سمجھتے تھے، شاید وہ بھی نہیں، جسے حضور سرورِ عالمؐ سمجھے تھے، بلکہ صحیح اسلام (نعوذ باللہ) وہ ہے، جس کی تلقین وتشریح، ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد، دنیا میں پہلی بار، انڈین ایجوکیشنل سروس کے اس رُکن رکین نے کی ہے!

---

اس کتاب (تذکرہ) پر سردست تبصرہ مقصود نہیں، اس کے لیے دوسرے مواقع انشاء اللہ عنقریب نکلیں گے۔ خداے تعالیٰ جزاے خیر دے، صاحبِ معارف (اعظم گڈھ) کو، جنھوں نے اپنے رسالہ کے اگست نمبر میں اس ناپاک کتاب کا مختصر تعارف اپنے ناظرین سے کرادیا، اور چودھری محمد حسین، ایم، اے کو جنھوں نے زمیندار (لاہور) میں تفصیل کے ساتھ کتاب مذکور کے مغالطات اور گمراہیوں پر وہ دری نہایت معقولیت ومتانت کے ساتھ کی ہے۔ افسوس کہ جمعیۃ العلماء نے اسکے متعلق صرف ایک تجویز ملامت کا پاس کردینا کافی سمجھا، توقع تھی کہ علماء اسکی مفصل تردید لکھ کر شایع کریں گے، اور قوم کو ایک فتنۂ عظیم سے بچانے کی کوشش کریں گے۔

---

مشیت الٰہی یوں واقع ہوئی ہے، کہ کوئی فرعون "بے سامان" نہیں رہنے پاتا۔ ہر تماشہ کے گرد تماشائیوں کا ہجوم ضرور ہو جاتا ہے، ہر بُت کے پجاری ضرور پیدا ہو جاتے ہیں، ہر سامری کی معتقد ایک جماعت ضرور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہ فتنۂ جدید بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں، اور اسکے پرستار، قلم آزمائی ومضمون نگاری کے فن سے ناآشنا نہیں۔ البتہ یہ دیکھکر عبرت ہوتی ہے، کہ اسکے پرستاروں کے حلقہ میں جامعۂ اسلامیۂ ملیہ کا رسالہ جامعہ بھی شامل ہے! کیا یہ وہی جامعہ ہے، جسکی بنیاد شیداے اسلام محمد علی کے ہاتھوں پڑی تھی؟ کیا یہ وہی جامعہ ہے، جسکی تقریبِ افتتاح مقدس وبرگزیدہ محمود الحسن کے دستِ حق پرست سے انجام پائی تھی؟ کیا یہ وہی جامعہ ہے، جسکے وجود سے مستقبل اسلام کی بہترین توقعات قائم تھیں؟

"مجبوروں" کے سخت سے سخت وار برداشت کیے جا سکتے ہیں، لیکن کبھی "اپنے" کی معمولی

چٹکی بھی تیر و نشتر سے بڑھ کر جاں گداز ہوتی ہے - کاش جامعہ کو اسکا اندازہ ہو سکتا، کہ اُس کی غیر ذمہ دارانہ جنبش قلم نے کتنے دلوں کو جنبش دیدی ہے!

رونا یہ ہے کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ یاں
طعنِ رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

## دانائی کی بات

قادیان کی جماعتِ احمدی سے ہمارے اختلافات ظاہر ہیں، لیکن اسلام کی یہ تعلیم نہیں، کہ دانائی کی کسی بات کو محض اس بنا پر رد کر دیا جائے، کہ وہ ایسے شخص کی زبان سے نکلی ہے، جو ہم سے مختلف عقائد رکھتا ہے - کچھ روز ہوئے اس جماعت کے امام، مرزا بشیر الدین محمود صاحب سفر یورپ پر روانہ ہوئے ہیں - روانگی کے وقت اُنھوں نے جو تحریر شایع فرمائی، اُس میں اشاعت اسلام کے متعلق خطرات کا ذکر اس حکیمانہ نکتہ سنجی سے کیا ہے، کہ دل سے بے اختیار صدائے آفریں نکلتی ہے - ایک اقتباس درج ذیل ہے :-

"یورپ ضرور اسلام لائیگا، مگر ساتھ ہی اسلام کو بگاڑ بھی دیگا - اور اُسکی شکل کو بالکل مسخ کر دیگا - بالکل ممکن ہے کہ یورپ میں چاروں طرف سے اللہ اکبر کی آوازیں آنے لگیں، اور سب جگہ گرجوں کے بجائے مسجدیں بن جائیں، لیکن یہ فرق ظاہر کا ہوگا - لوگ تثلیث کی جگہ توحید کا دعوےٰ کریں گے ... گرجوں کی جگہ مسجدیں بنائیں گے، مگر انکا وہی ناچ گھر، وہی عورت و مرد کا تعلق، وہی شراب وہی سامان عیش نظر آئیں گے - یورپ بھی رہے گا، گو وہ بجائے عیسائی کے مسلمان کہلانے گا"

جو لوگ اس حقیقت کا احساس رکھتے ہیں، کہ اسلام اپنے وطن سے نکل کر کس قدر مسخ ہو گیا ہے، اور جو یہ سمجھتے ہیں، کہ ترکی و مصر، حبش و سوڈان، ایران و افغانستان، عرب و ہندوستان کا موجودہ اسلام، صاحب شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لائے ہوئے، اور صدیق رضی اللہ عنہ و حیدر رضی اللہ عنہ کے اسلام سے بمراحل دُور ہے، وہ اندازہ کر سکتے ہیں، کہ فرنگیوں کا اسلام بھی کس قدر فرنگیت آب

ہوگا۔ اس خطرہ سے محفوظ رہنے کی تدابیر پر ہر ہمدرد اسلام کو بجائے خود غور کرنا چاہیے۔

---

فرنگستان تو پھر "مغرب" ہے، جو ہم سے 'بُعد المشرقین' رکھتا ہے، مشرق ہی میں اسلام جہاں جہاں پھیلا، آج کہیں بھی اپنی اصلی، خالص، دبے آمیز صورت میں موجود نہیں۔ خود ہندوستان کا کیا حال ہے؟ ایک گروہ علم کلام کے مباحث کو اسلام کی روح سمجھ رہا ہے، ایک فرقہ بدعات و ممنوعات میں سرگرم ہے، ایک طائفہ نے ہر قسم کی قیود شرعی سے آزادی کا نام حقیقت اسلام رکھ لیا ہے، ایک جماعت تقلید فرنگ کو عین اسلام قرار دے رہی ہے، غرض ہر طرف خود ساختہ اصنام کا دَور دورہ ہے، اور اسلام کے نام کو خواہشاتِ نفس کے لیے ایک حیلہ بنا لیا گیا ہے۔ غیروں کو اپنا بنانے سے کہیں زائد ضروری یہ ہے، کہ خود اپنوں کو اپنا بنایا جائے، اور یا ایہا الذین آمنوا آمنوا کی عملی تفسیر ہر سمت نظر آنے لگے۔

## جملہ ترکان جہاں ہندے تو! -

ترکوں کے عاشق زار اور اُردو کے مشہور ادیب، حضرت "یلدرم"، یورپ و ترکی کے سفر کے بعد ابھی ہندوستان پہونچے ہیں۔ انکے مشاہداتِ سفر کے اقتباسات ذیل قابل مطالعہ ہیں:—

"میرے سفر اول اور اس سفر کے درمیانی زمانہ میں یہاں کی زندگی میں کس قدر عظیم فرق ہو گیا ہے ..... سب سے زیادہ جو تغیر آنکھ کو فوراً محسوس ہوتا ہے یہ ہے کہ کلیاں پھول ہو گئی ہیں، غنچے جو گھنڈیوں میں بند تھے چٹک کر باہر نکل آئے ہیں۔ یعنی ترکی خاتون نے نقاب چہرہ سے ہٹا دیا ہے .... پاؤں سے لیکر گردن تک لباس، بالکل یورپین لباس ہے۔ پیرس کے تازہ ترین قطع و فیشن کو دیکھنا ہو تو ترکی خاتون کو دیکھیے"

یہ اُس قوم کی اسلامیت ہے، جسکو مسلمانان ہند اپنی سادہ مزاجی سے کل تک محافظ اسلام، و وارث خلافت نبوی علیٰ صاحبہا التحیۃ والسلام سمجھ رہے تھے! آگے اور ملاحظہ ہو:—

ترک اسوقت نہ صرف اس نشہ (قومیت) میں مست ہیں، بلکہ روز بروز اس نشہ کے آتشہ کے اثر سے مدہوش تر ہو رہے ہیں۔ ترکیت کی پرستش کی جا رہی ہے۔ اور اس

پرستش میں وہ مدنیتِ حجازی پر بعض اوقات سخت حملہ کر جاتے ہیں، جو میری طرح باہر کے مسلمانوں کو بہت گراں گزرتے ہیں۔ وہ اس وقت عرب کا نام نہیں سن سکتے ......
ہر ملک و قوم کی طرح ترکوں میں بھی ایک انتہا پسند گروہ ہے۔ یہ لوگ 'عرب، اہل عرب، و مدنیتِ عرب سے ایسی بیزاری ظاہر کرتے ہیں، کہ خیال ہونے لگتا ہے کہ دین عرب سے بھی بیزار ہیں۔ اس وقت اس گروہ کے حسیات کے ترجمان واصف بک ہیں، جو وزیر تعلیم ہیں۔ ... دو دن ہوئے کہ خود مصطفےٰ کمال پاشا نے اپنی تقریر میں کہا، کہ ... گئے وہ دن جبکہ سلطان، قاآن، خلیفہ، غیر ترکی عناصر کی مدد سے ترکی قوم کو دبا کر حکومت کرتے تھے۔ غیر ترکی عناصر سے اشارہ زیادہ تر عربوں کی طرف ہے۔ نفرت اس درجہ بڑھی ہوئی ہے کہ ترک اس وقت اسکے بھی خلاف ہیں کہ کوئی حج کو جائے"۔

پرستش خواہ "ترکیت" کی ہو، یا "فرنگیت" کی، یا "ہندیت" کی، سب اسلام سے یکساں خارج ہیں۔ قومیت و وطنیت، یعنی قوم پرستی و وطن پرستی، خاص تحفہ مغرب ہے، اور بدقسمتی سے یہ بلا تمام عالم پر مسلّط ہوتی جاتی ہے۔ ترک کل تک اسلام کی حلقہ بگوشی پر نازاں تھے، اور اس لیے انھیں قدرۃً سرافرازی حاصل تھی، آج انھیں بتِ مغرب کی پرستاری پر فخر ہے، کیا اب بھی انکی سیادت قائم رہ سکتی ہے؟ کل تک، ترک بہ اصطلاحِ شعراء "ترک" تھے، کیا اب "ہندو" کی اصطلاح انکے لیے موزوں نہ ہوگی؟

## آخر کار

مشہور و معروف آریہ لیڈر سوامی شردھا نند جی نے بالآخر ایک بار پھر معاملاتِ ملکی و سیاسی سے اپنی کنارہ کشی، اور بقیہ زندگی کو مذہبی و علمی خدمات کے لیے وقف کر دینے کا اعلان فرمایا ہے۔ انکی زبان مبارک سے، اپنی نوعیت کا یہ پہلا اعلان نہیں، اس لیے قدرۃً بعض طبائع کو اسکے باور کرنے میں تامل ہو رہا ہے، لیکن بعض ہستیاں ایسی بھی ہیں جنکا عمل اُستاد داغ کے فلسفہ پر ہے۔

پھر بھو ہوگئیں تری وعدہ خلافیاں　　　　پھر اعتبار ہے مجھے عہدِ جدید کا!

انکا خیال ہے کہ قدرت کو اس تارکِ دنیا زاہد اور مرتاض سنیاسی سے جو کام لینا تھا، وہ پورا ہو چکا۔ شدھی کی تحریک نے ملک کے امن و امان میں ایک سرے سے دوسرے تک آگ لگا دی

گاندھی جی کی ساعیِ اتحاد پر یکلخت پانی پھیر دیا، ہندو مسلم فسادات کی قربان گاہ پر ہزاروں بیگناہوں کی جانیں نذر ہو گئیں، سوامی جی کا مشن اُسکے بعد بھی کسی پہلو سے ناکام یا ناتمام کہا جا سکتا ہے؟ اب وہ ہر طرح آسودہ و مطمئن ہو کر اپنے کنجِ عافیت سے اپنی کوششوں کے نتائج مدتوں تک دیکھ سکتے ہیں! خدا معلوم، سوامی جی کو کبھی مرزا غالب کے کلام سے بھی دلچسپی رہی ہے، جی میں آتا ہے، اُن سے اس شعر کے معنی دریافت کرتے ؎

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!

## سیدنا عمر فاروقؓ پر افتراءِ عظیم

سود کی بحث میں جناب طفیل احمد صاحب نے ایک عجیب دلچسپ طریقہ یہ رکھا ہے، کہ جب اُنکے کسی دعوے پر گرفت ہوتی ہے، جھٹ اُسکو چھوڑ کر دوسرے مسائل پر اظہارِ خیال شروع فرما دیتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ اس طرح بحث کا سلسلہ عمر بھر جاری رہ سکتا ہے۔ البتہ ایک دعوے ایسا ہے، جس سے وہ اب تک دست بردار نہیں ہوئے ہیں، بلکہ اُس کا اپنے ایک جدید مضمون میں پھر اعادہ کیا ہے، حالانکہ اُس کا بے بنیاد ہونا اُن پر بخوبی واضح کیا جا چکا تھا۔ اپنے رسالہ مسئلہ سود کی بالکل ابتدا ہی میں اُنھوں نے مسئلۂ سود کو "غیر منفصل" اپنے زمانہ سے نہیں بلکہ "عہدِ صحابہ" سے قرار دیا ہے، اور سند میں حضرت فاروق اعظمؓ کے ایک قولِ مبارک کو پیش کیا ہے۔ اپنے جدید مضمون میں پھر اسی بے بنیاد دعوے کو دہرایا ہے، اور حضرت رضی اللہ عنہ کا نام اس حیثیت سے لیا ہے، کہ گویا اُنکو بھی حرمتِ سود میں تردد و تامل تھا۔

حضرت رضی اللہ عنہ کے اصل الفاظ حسبِ ذیل ہیں:—

| | |
|---|---|
| عن عمر بن الخطاب قال انّ آخر ما نزلت آیة الربٰوا و ان رسول اللہ صلعم قبض ولم یفسرها لنا فدعوا الربٰوا والریبة (ابن ماجہ۔ باب التغلیظ فی الربا) (مشکوٰة۔ باب الربوا۔ فصل ثالث) | آیۂ ربوا سب سے آخر میں اُتری۔ حضور رسول اللہ صلعم دنیا سے تشریف لے گئے اور اسکی کچھ تفسیر ہمارے لیے نہ بیان فرما گئے؛ پس چھوڑ دو ربوا کو اور ہر اُس شے کو جو اس سے ملتی جلتی ہو |

یہ تصریح خود سیدنا عمرؓ کی زبان مبارک سے تھی۔ اب شارحین کا ایک آدھ قول ملاحظہ ہو۔

| | |
|---|---|
| ان آخر ما نزلت آیة الربٰوا الخ وہی الذین | آخری آیۂ ربوا سے مراد آیۂ کریمہ الذین یاکلون الربٰوا لا یقومون |

یاکلون الربوٰا لا یقومون الایۃ فھی غیر منسوخۃ ولا مشتبھۃ فکذا لم یفسرہا النبی صلعم، فدعوا الربوا والریبۃ ای فاترکوا الحیلۃ فی حلّھا

الخ ہے۔ یہ آیت غیر منسوخ وغیر مشتبہ ہے (یعنی حکم حرمت ربوا بالکل قطعی و غیر منسوخ ہے) اور اسی لیے رسول خدا صلعم نے اسکی تفسیر بھی بیان فرمائی بس چھوڑ دو ربوٰا کو اور جواز ربوا کے لیے حیلہ ڈھونڈنے کو۔

یہ قول طیبی کا تھا، اسی کو صاحب مجمع البحار (جلد اول ص۔ ذکلشوری) نے اختیار کیا ہے۔ صاحب لمعات (شرح مشکوۃ) نے اسے بھی نقل کیا ہے، اور اپنی طرف سے یہ اضافہ کیا ہے،

آخر ما نزلت آیۃ الربوا یعنی ہی ثابتۃ غیر منسوخۃ لکن رسول اللہ صلعم قبض ولم یفسرہا بحیث یحیط بجمیع جزئیاتہ وموادہا فینبغی لکم ان تدعوا الربوا الصریح وما یشتبہ الامر فیہ

آیۂ ربوا کے آخر میں نازل ہونے سے مراد ہی یہ ہے کہ یہ آیت قطعی و غیر منسوخ ہے۔ لیکن رسول خدا صلعم دنیا سے تشریف لیگئے اور اسکی تفسیر نہیں فرما گئے جو اسکی جمیع جزئیات و فروع پر حاوی ہو۔ اسلیے یہ چاہیے کہ سود کو بھی چھوڑ دو اور مشتبہات سود کو بھی

گویا جواز سود تو الگ رہا، سیدنا فاروق رضی اللہ عنہ نے جیسی کہ اُن جیسے مومن کامل سے توقع تھی، حرمت سود و مشتبہات سود کو اور زیادہ قوی و مستحکم کر دیا ہے۔ کیا اُنکے اس قول مبارک کے اصل الفاظ کے مطالعہ کے بعد، کوئی شخص جسے اپنی دیانت ذرا بھی عزیز ہے، اسے جواز سود کی تائید میں پیش کرنے کی جرأت کر سکتا ہے؟ جناب طفیل احمد صاحب قرآن پاک کی ایک آیت سے تجارت میں بددیانتی کو تو مسلمانوں کے لیے جائز کر چکے ہیں، کیا مضمون نگاری و تالیف میں بھی بددیانتی کے لیے انھیں سند جواز کسی آیۂ پاک سے ہاتھ آگئی ہے؟

## ایک احمدی کی سنگساری

پچھلے دنوں کابل سے ایک احمدی کی سنگساری کی جو خبر موصول ہوئی، اُس پر اُردو پریس میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، اور اب تک صدہا مضامین اس تعزیر کی تائید و مخالفت میں شایع ہو چکے ہیں۔ احمدی پریس قدرۃً پُرزور مخالفت و احتجاج کر رہا ہے، اور عام اسلامی پریس (با استثناء شاذ) تائید و مسرت کے نعروں سے گونج رہا ہے۔ یہ سزا اگر کسی ملکی یا سیاسی جُرم کی بنا پر دی گئی ہے، اور کابل کے قانون میں اُس جرم کے لیے اس سزا کا رواج ہے تو کسی بیرونی شخص کو یقیناً مداخلت کا حق حاصل نہیں، لیکن اگر یہ سزا محض "ارتداد" کی بنا پر دی گئی ہے، جیسا کہ عموماً اخبارات کا بیان ہے، تو علمائے کابل نے غالباً مفہوم شریعت کے

سمجھنے میں غلطی ہوئی۔

مسئلہ میں دو تنقیحات قائم ہوتی ہیں:-

(۱) آیا اسلام نے ارتداد کی سزا سنگساری رکھی ہے؟

(۲) آیا شخص مقتول مرتد تھا؟

سوال اول کے جواب میں معلوم نہیں، علماء قرآن پاک کی کس آیت، یا کس حدیث صحیح سے استناد کر سکتے ہیں۔ حضرت صدیق کا مرتدین سے قتال کرنا، اس باب میں، کافی حجت نہیں ہو سکتا۔ ضرورت ایسی سند کے پیش کرنے کی ہے، جس پر محض تبدیل عقیدہ پر، اختلال سیاسی و نظمی ملت سے قطع نظر کر کے، اسلام نے سزائے موت واجب کی ہو، اور پھر سزائے موت بھی سنگساری ہی کی شکل میں ہو۔

سوال دوم کا جواب کسی طویل بحث کا محتاج نہیں۔ کوئی شخص جب تک ایک خدا کا قائل ہے، محمد رسول اللہ صلعم کی رسالت کا اقرار کرتا ہے، قرآن کو حرفاً حرفاً کلام الٰہی تسلیم کرتا ہے، کعبۃ اللہ کو اپنا قبلہ مانتا ہے، کیونکر دائرہ اسلام سے خارج کیا جا سکتا ہے، اور خارج بھی ایسا، کہ اس پر پوری طرح "مرتد" ہونے کا اطلاق ہو سکے۔ فرقۂ احمدی اسلامی عقائد کی رو سے، بے شبہ ایک غلط رو، اور گمراہ فرقہ ہے، لیکن ارتداد، جس آخری و قطعی اور انتہائی گمراہی کا نام ہے، اس کا اطلاق کسی کلمہ گو پر کرنا بڑی جسارت ہے۔

## الناظر پر تنقید

الناظر کے اگست نمبر میں اظہار رائے کے زیر عنوان جو مکتوب سلطان حیدر صاحب جوش کا شائع ہوا ہے، یقین ہے، کہ اکثر ناظرین نے اسے ایک خاص قسم کی دلچسپی کے ساتھ پڑھا ہو۔ اس کے کاتب صاحب اپنے ان خیالات میں منفرد نہیں۔ تعلیم یافتہ یا نیم تعلیم یافتہ، روشن خیال و "علم دوست" حضرات کی ایک اچھی خاصی جماعت ان کی ہم خیال موجود ہے، ان سب کے خیالات و جذبات کی ترجمانی مضمون مذکور سے ہو گئی۔ راقم سطور نے مارچ ۱۹۱۸ء کے پرچہ میں فیہ ما فیہ کا یہ سلسلہ شروع کرتے ہوئے پروردگار کے حضور میں بعد منت و الحاح یہ عرض کی تھی، کہ اسے خلوص و توفیق حق نصیب کر، اور اس حقیر و بے بساط کوشش کو قبول کر۔

توقع نہ تھی کہ ایک سیہ کار بندہ کی دعا شرفِ قبولیت حاصل کر لیگی! لیکن الحمد ﷲ کہ آثارِ قبولیت روز بروز روشن تر و نمایاں تر ہوتے جاتے ہیں چلبی کی گزارشات پر برہمی و ناگواری ایک خاص طبقہ میں بہت عرصہ سے پیدا ہونا شروع ہوگئی تھی، خانگی صحبتوں میں اکثر یہ تذکرے ہوتے رہے، کبھی کبھی ایک آدھ اخبار نے بھی کچھ لکھا، تا آنکہ یہ شرف مخصوص، سلطان حیدر صاحب کے حصہ میں آیا، کہ اُنھوں نے ایک عرصہ کے حیص بیص، تامل و تردد کے بعد اپنی ہمت مجتمع کرکے بالآخر الناظر میں اس طبقہ کی نیابت کا فرض ٹھیک انہیں خصوصیات کے ساتھ ادا فرمایا، جو اس طائفۂ عالیہ کے علامات امتیازی ہیں!

## "قوی اندیشہ"

صاحبِ تنقید کو یہ تامل و تردد خدانخواستہ کچھ اس وجہ سے نہ تھا کہ اپنی رائے کی صحت میں تزلزل تھا، بلکہ اس کا محرک صرف وہ "خوف" تھا، جو "فیہ ما فیہ کی بندوق" سے صاحبِ تنقید کو "اپنی ذات" اور "اپنی نسل" کے لیے تھا۔ فرماتے ہیں،

> "حاشا وکلا، میں اسکو لکھ کر فیہ ما فیہ کی بندوق لینے اور نسلاً بعد نسلٍ نہیں دغوانا چاہتا"

اُن کے دل پر سب سے زیادہ ہیبت "اس قوی اندیشہ" کی مسلط تھی، کہ

> "آیندہ نمبر میں چلبی صاحب کا قلم اس عاجز کے خیالات بلکہ ممکن ہے کہ ذات پر بہت کچھ جولانی دکھائیگا۔"

یہاں تک مضائقہ نہ تھا، مگر ناقابلِ برداشت یہ اندیشہ تھا، کہ اس جولانیٔ قلم میں

> "ایک درجن احادیث و کلام الٰہی کا حوالہ" بھی ہوگا!

روشن خیال "شگفتہ نگار" بلند ہمت و شیر دل "تنقید نگار" "ادبی چاشنی" مذاق سلیم کے نمونے، شگفتہ نگاری کے مرقعے، مختصر و سبق آموز فسانے" سب کچھ برداشت کرسکتا ہے، لیکن اس کا تحمل تو بہرحال نہیں کرسکتا، کہ اسے "احادیث و آیات" کا حوالہ دیا جائے! اور وہ بھی ایک دو نہیں، اکٹھی ایک درجن!! الناظر کی یہ معصیت تو وہ کسی حال میں بھی نہیں معاف کرسکتا، کہ ایک

> "معمولی بات پر چلبی صاحب نے پورے تین صفحوں پر احادیث نبوی کے حوالہ" دیدیے!

اللہ اکبر! اس قسم کی کوئی حد ہے، کہ پورے تین تین صفحے احادیث نبوی کی تذکرہ دیے جائیں! اس انتہائی بدمذاقی و تاریک خیالی کے مظاہرے کے بعد بھی، کوئی شخص الناظر پر "علمی" رسالہ کا اطلاق کرسکتا ہے!! رسالہ "علمی و ادبی" صرف اُسی وقت تک رہ سکتا ہے جب تک اُسکے اوراق

کو مغربی مصنفین کے اسمائے گرامی سے زینت دی جاتی رہے' ہر صفحہ میں بے سوچے سمجھے "ارتقاء" "سائنس" "ترقی" "ادب لطیف" وغیرہ الفاظ متبرکہ کی تکرار ہوتی رہے' یا پھر کذب و دروغ کے انبار "مختصر افسانہ" کے زیر عنوان شایع ہوتے رہیں۔ یہ بھی نہ سہی' تو کم از کم اتنا تو ہو کہ ریلوے اسٹیشنوں پر وہیلر کمپنی کے ہاں سے جنگ کے متعلق کوئی ارزاں کتاب خرید کر لی جائے' اور اسکے خلاصہ سے ناظرین کو اپنے ماہر فن حربیات ہونے کا یقین دلا دیا جائے! الناظر اگر اس طریق کو آج پھر اختیار کرلے' تو چشم زدن میں باوجود "دریدہ نگاری" کے وہ پھر ایک "علمی و ادبی" رسالہ بن سکتا ہے' اور سلطان حیدر صاحب جیسے "شگفتہ نگار" اسکے ذریعہ سے "ابن مسلم" کی طرح "ادب لطیف" کے حیرت انگیز نمونوں سے دنیا کو ایک بار پھر محوِ حیرت بنا سکتے ہیں۔ باقی "آیاتِ قرآنی و احادیث نبوی" سو ظاہر ہے کہ دنیا کی کسی لغت اور کسی محاورہ کے اعتبار سے بھی ان پر "علم" و "ادب" کا اطلاق نہیں ہو سکتا!

---

## "حد ہو گئی"

سلطان حیدر صاحب کا حسن عدالت گستری' طفیل احمد صاحب کو اسکی پوری اجازت دیتا ہے' کہ وہ جب تک اور جس عنوان سے چاہیں' تبلیغ جواز سود کرتے رہیں' لیکن اگر کوئی بدبخت اسکے جوابات کا اقدام کرگزرتا ہے' تو وہ یقیناً گردن زدنی ہے' اس لیے کہ اس تذکرہ سے ان "شگفتہ نگار" افسانہ نویس صاحب کا "دم ناک میں آجاتا ہے"!! انکو بڑی ہی فکر الناظر کی "بندوق" سے طفیل احمد صاحب کی "جان و عزت" کی ہے' وہ کس قدر شفقتِ برادرانہ کے لہجہ میں آہِ سرد کے ساتھ فرماتے ہیں' کہ

"خدا ہی جانے طفیل احمد صاحب کی عزت و جان کب تک معرض خطر میں رہتی ہے"!

چلپی' اور الناظر کے ناقابل عفو معاصی کو کہاں تک گنایا جائے۔ حد یہ ہوگئی' کہ اور تو اور' تنقید و بحث سے ماورا' جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب تک

"چلپی صاحب کی کسوٹی سے نہ بچ سکے"!

معاذ اللہ! اس قدر دریدہ نگاری! اتنی شدید گستاخی کے بعد بھی اگر سلطان حیدر صاحب الناظر اور اسکے شذرات نگار کو "ناقابل علاج" نہیں خیال فرماتے' تو یہ محض انکی غایت کرم اور لطف عمیم ہے۔

---

## "موزوں نام"

"آپ کی نظر میں آج بہترین تالیفات راہ نجات اور فلاح المومنین ہیں۔" آج "[illegible]" کو

اس رسالے کے آزادانہ اظہار کا حق حاصل ہے، لیکن اس کا اصلی فیصلہ "کل" اُسوقت ہوگا، جب راہ نجات اور ابن مسلم دونوں کے مصنفوں کو اپنے اپنے اعمال کے ہمراہ ایک بڑے ہی ذی اقتدار حاکم کے حضور میں حاضر ہونا پڑیگا! اُس وقت شاید "شگفتہ نگاری" اور ادبی "چاشنی" اتنقد محبوب نہ رہ جائے، اور "خشک نگاری" اور "کھدر پوشی" شاید اس قدر قابل مضحکہ نہ ثابت ہو، جتنی آج رسائل کے صفحات یا عدالت کی کرسی پر ظاہر ہو رہی ہے! الناظر کے لیے موزوں نام آپ "تنبیہ الغافلین" یا "تعزیرات الفاسقین" تجویز فرماتے ہیں، تعجب ہے کہ آپ کا ذہن انھیں کے ہم قافیہ ایک اور نام کی جانب نہ منتقل ہوا، جو آپ کے آبائے طریقت آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل ایک اور کتاب کے متعلق تجویز کر چکے تھے، یعنی "اساطیر الاولین"۔ بہرحال ان ناموں میں آپ "ادب لطیف" کا لحاظ فرما کر جو بھی انتخاب فرما دیں، یقیناً ایڈیٹر صاحب الناظر کے لیے قابل قبول ہو جائے گا، بشرطیکہ تھوڑی سی جرأت کو کام میں لا کر جناب والا بھی اپنے اسم گرامی میں کسی ایسی تبدیلی کا اعلان فرما دیں، جسکے بعد کسی کو جناب کے متعلق مومن ہونے کا حسن ظن باقی نہ رہ جائے۔

موت کے بعد "صاحب" کے ساتھ آخری آرامگاہ میں استراحت فرمانے کو تو آپ اپنے اسی مضمون میں "ایک معمولی بات" قرار دے چکے ہیں، بہتر ہوگا، کہ اپنے ملحدانہ عقائد کے اعلان اور اسم گرامی کی تصحیح سے ہم تاریک خیالوں کو جرأت و ہمت کا عملی درس عطا فرمائیں۔

---

قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ

آپ کے جذبات وحسیات اپنی نوعیت میں کچھ انوکھے اور نادر نہیں، آپ سے صدیوں پیشتر، آپ ہی حضرات کی طرح، ایک روشن خیال و عقل دوست، جماعت اور بھی تھی، جو آیات قرآنی کو سُن سُن کر انتہائی غیظ و غضب سے لبریز ہو جاتی تھی، اور اُنکے ساتھ طرح طرح کی تحقیر کرتی تھی، أَفَبِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَنتُم مُّدْهِنُونَ؟ (واقعہ - ع ۳) - آپ "شگفتہ نگار" حضرات کی طرح اُس جماعت میں بھی "شگفتہ گفتار" شعرا و فصحا کثرت سے شامل تھے، قرآن ساری دنیا کے لیے نسخۂ شفا بن کر آیا تھا لیکن اس جماعت کے دید کفر و مرض طغیان و انکار ہی میں اضافہ کرتا رہا۔ آپ سے پیشتر آپ کے

وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ ... طُغْيَانًا وَكُفْرًا - (مائدہ ۹۰)

پیشتر وحضرات اس پیام حق کے اول سُنانے والے (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے سر ہوگئے، اور جھنجلاتے رہے، کہ کیسی آیات نازل ہوتی رہتی ہیں، جو ہمارے محبوب مشاغل اور دلفریب معاشرت میں مخل انداز ہوگئی ہیں، اور فرمایش کرتے رہے کہ ان

قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَیْرِ ہٰذَا اَوْ بَدِّلْہُ (یونس - ع ۲)

خشک وبے مزہ آیات کے بجائے کچھ اور دلچسپ مضامین سناؤ۔

لیکن جواب ہمیشہ یہی ملا، کہ یہ کلام حق ہے۔ یہ تمھارے مٹائے نہیں مٹ سکتی۔

یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِؤُا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاہِہِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ (صف - ع ۱)

یہ نورِ خدا ہے، تم اسے پھونک مار کر نہیں بجھا سکتے۔ یہ نور پھیل کر رہیگا، خواہ تم منکرین کتنا ہی انگاروں پر لوٹو۔

تیوروں پر بل ڈالنا، مضحکہ کرنا، غصہ میں آکر سخت الفاظ استعمال کرنا،

قُلْ مُوْتُوْا بِغَیْظِکُمْ (آل عمران)

سب لا حاصل ہے۔ آیاتِ کلام الٰہی قائم وباقی ہیں، اور قائم وباقی رہیں گی۔ اس کلام حق، اور اسکی اشاعت کو روکنا جس طرح عرب کے کسی شاعر، کسی سحر بیان کے بس میں نہ تھا، اسی طرح آج بھی ہندستان کے کسی افسانہ نویس، کسی "شگفتہ نگار" کی قدرت وبساط میں نہیں۔

## تقیہ چھوڑیے

نفاق وانکار، الحاد وماّدہ پرستی، بدعقیدگی واسلام بیزاری کی حقیقت اس لیے نہیں بدل سکتی، کہ اُسے بکمال عیاری "علم وادب" کا لباس پہنا کر پیش کیا جائے، یا اُسے "مخلصانہ مشورہ" کے عنوان سے موسوم کیا جائے۔ بہ قول مولانا سید سلیمان ندوی کے، اگر ایمانیات آپ کے نزدیک اسی درجہ کی فضول وکم رتبہ چیزیں ہیں، تو آخر خدا و مذہب کا پردہ ہی کیوں رکھا جاتا ہے؟

"صاف صاف اور کھلم کھلا مسٹر ظریف کی طرح الحاد بیدینی اور مذاہب کی تکذیب ہی کا وعظ کیوں نہ کہا جائے، آج ہارون ومہدی یا ملک شاہ وسنجر کی تلوار نہیں جسکا خوف کیا جائے۔ آزادی کا دور ہے، محتسب کا ڈر نہیں، پھر تستر وتقیہ وتبدیل ہیئت کی کیا ضرورت داعی ہے۔ جو کچھ کیجیے ثواب ہے آج"

قرآن وحدیث کے تذکرہ سے اگر نفرت ہے، تو بہتر یہ تھا، کہ صاف صاف ان خیالات کا مستقل عنوان کے ذریعہ اظہار کیا ہوتا، الناظر باوجود اپنی کمدرپوشی کے ان "افکار عالیہ" کے لیے گنجایش نکال ہی لیتا۔

# ابن رشد

دار المصنفین کے سلسلہ میں ابن رشد کے سوانح زندگی اور اُسکے فلسفہ کی تاریخ (مولفۂ مولوی محمد یونس مرحوم فرنگی محلی) جو حال میں شایع ہوئی ہے اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ اس سلسلہ کی کتابوں سے جس کے بانی مولانا شبلی مرحوم تھے اردو لٹریچر میں جو بیش قیمت اضافہ ہوا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ قدیم مسلمانوں میں بیاگرفی کا رواج نہ ہونے کے سبب سے کسی ماہر علم یا فن کے حالات زندگی کا پتہ لگانا ایک اہم کام ہے۔ یہ نوجوان مصنف پہلا شخص ہے جس نے ابن رشد کے فلسفہ سے قوم کو روشناس کیا۔ جس کاوش سے اُنھوں نے اس کے حالات کو فراہم کیا ہے اور جس قابلیت سے اُسکے فلسفہ کا موازنہ کیا ہے اس سے اُن کے طالب علمانہ ذوق تحقیق، دقت نظر اور وسعت معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔ مصنف کے لیے ایک مشکل یہی تھی کہ عربی لٹریچر میں ایسی تصنیف کے لیے بہت کم مواد مل سکتا تھا۔ اُنکو زیادہ تر یوروپین مورخین کی کتابوں سے مدد لینی پڑی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کتاب کا بڑا حصہ انھیں مورخین کی کتابوں کا ترجمہ ہے۔ مگر یہ ترجمے اُنھوں نے بڑی فیاضی کے ساتھ کیے ہیں۔ مثلاً حصہ سوم میں گیبرو اور رلن وغیرہ کے صفحوں کے صفحوں کا ترجمہ درج کر دیا ہے۔ ان اقتباسات کو ابن رشد کے حالات سے چنداں تعلق نہیں ہے اگر جاہلیت یورپ کی حالت دکھانی منظور تھی تو اسپین کی علمی حالت کے ذیل میں انکو درج کرنا چاہیے تھا۔ تاکہ ناظرین کو دونوں کا مقابلہ کرنے میں سہولت ہو۔ اس حصہ میں غیر متعلق واقعات بکثرت پائے جاتے ہیں جن میں اختصار کی بہت گنجایش تھی۔ گو ابن رشد کا فلسفہ تقویم پارینہ ہو چکا لیکن جب اس نظر سے دیکھا جائے کہ باوصف فقیہ اور محدث ہونے کے اُس نے اسلام کے بعض مسلمہ عقائد سے اختلاف کیا اور یورپ نے اُسکی تصانیف کی کچھ عرصہ تک بہت قدر کی تو علمی حیثیت سے اُس کی تصانیف سے بے اعتنائی نہیں کی جا سکتی۔ بعض لوگوں کا شاید یہ خیال ہو کہ اس زمانہ میں اُس کے فلسفہ کی اشاعت اور تنقید سے کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ لیکن جو مسایل فلسفہ کے درج ہوے ان میں انکا تعلق کسی خاص زمانہ سے نہیں ہے۔ وہ واقعات عالم اور انسان کے خیالات کی تاریخ ہیں

ماضی وحال ومستقبل ایک دوسرے سے جدا نہیں کیے جا سکتے۔ زمانۂ ماضی کے خیالات اور اعمال کا نتیجہ ہماری حالتِ موجودہ ہے اور اس وقت جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے وہ مستقبل کا سرمایۂ وجود ہے۔ صدیاں گذر گئیں اور ہر جویان راز ہستی اس بزم فانی سے بزبان حال یہ کہتا ہوا اٹھا۔

با ہیچکس نشانے زاں دلستاں نہ دیدم

یا من خبر ندارم یا او نشاں ندارد

مگر انسان کی خلقت میں جو مادہ تجسس کا ہے وہ اسکو مایوس نہیں ہونے دیتا۔ تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے اور آج بھی ان مباحث میں اُسکو وہی دلچسپی ہے جو ارسطو اور افلاطون کے زمانے میں تھی۔ اس لحاظ سے متقدمین کے خیالات اور اُنکے نتائج تحقیقات سے آگاہی حاصل کرنا محض قدامت پرستی نہیں ہے بلکہ آیندہ ترقی کے لیے ضروری ہے۔

مصنف نے ابن رشد کے فلسفہ پر نہایت تفصیل سے بحث کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ وہ خود کسی فلسفہ کا موجد نہ تھا ارسطو کا مقلد محض تھا۔ ہم بطور مثال کے اُس کی بعض رائیں یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو اسکے عقائد کی بابت فیصلہ کرنے میں سہولت ہو۔ آفرینش عالم کے مسئلہ میں اُسکی رائے یہ تھی کہ عالم قدیم اور ازلی ہے، مادہ غیر مخلوق اور ناقابل فنا ہے۔

"حرکت کے پہلے سکون یا سکون کے پہلے حرکت نہیں ہوتی۔ بلکہ حرکت خود ازلی ہے۔ زمانہ کا وجود بھی حرکت سے ہے اگر حرکت کا وجود نہ ہوتا تو عالم میں جو سلسلہ پیدائش کا جاری ہے اُس کا وجود بھی نہ ہوتا۔ خدا یا علت العلل اس بارے میں مختار بالارادہ نہیں ہے۔ عالم کی پیدائش اُس سے فیضان وجود کے طور پر ہوئی ہے۔ چونکہ وہ خیر محض تھا اسلیے وہ مجبور تھا کہ عالم کو وجود میں لائے۔ وہ علم رکھتا ہے لیکن محض کلیات کا۔ جزئیات کے علم سے وہ بے بہرہ ہے۔"

جب مادہ اپنے وجود میں علت کا محتاج نہیں اور حرکت اس کا خاصہ ہے تو پھر خدا یا علت العلل کی ضرورت کیا باقی رہی۔ اور خدا بھی اس حیثیت کا کہ اُس کا کوئی فعل ارادی نہیں۔ کل متبعین ارسطو کا یہی مذہب تھا۔ اور اسکی جھلک زمانۂ حال میں کپلے اور ہیگل کے فلسفہ میں پائی جاتی ہے۔ ابن رشد کے بعد اٹھارویں صدی میں فرانس میں اور جرمنی میں اُنیسویں صدی کے وسط تک دو ہیں کے یہ عام عقائد تھے۔ انگلستان میں

ہابس، ہیوم اور مل وغیرہ نے اس درجہ سے تجاوز کیا اور بجائے مادہ کو خالق تسلیم کرنے کے وہ ایک اور جداگانہ ہستی کے قائل تھے۔ اس زمانے میں یورپ میں بجز طبیعین کے فلاسفہ میں کسی فرقہ کا یہ خیال نہیں ہے بلکہ عام طور پر روحانیت کی جانب میلان پایا جاتا ہے۔ طبیعیات اور علم طبقات الارض کے ذریعہ سے ماہیت مادہ اور کرۂ ارض کے متعلق جو انکشافات ہوئے ہیں وہ مذہب کے خلاف نہیں ہیں بلکہ جدید تحقیقات کی رو سے ایک صانع حقیقی کے وجود کا یقین اور مستحکم ہوتا ہے۔ گو مادئین اب بھی اسکے منکر ہیں۔

کلام ربانی میں خلقتِ انسانی کی تفصیل ایک موقع پر یوں فرمائی گئی ہے۔ "وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ .... ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوحِهِ"۔ (اور انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی پھر اسکو درست کیا۔ اور اس میں اپنی روح پھونکی)

دوسرے مقام پر اس سے بھی زیادہ صاف یعنی "نَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي" فرمایا۔ جو ہستی حامل نورالٰہی ہے جس کا میلان فطرتاً ہمیشہ اعلیٰ کی طرف ہوتا ہے۔ جو کہیں انبیا اور اولیا کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور کہیں شیطان کا جامہ پہن لیتی ہے خود انسان کے ہاتھوں اتنے پست درجہ میں پہونچ جاتی ہے کہ حشرات الارض اور انسان میں خلقت کے اعتبار سے کوئی فرق امتیازی باقی نہیں رہتا۔

تخلیق عالم کے مسئلہ میں ابن رشد کی جو رائے ہم اوپر لکھ چکے ہیں اس سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ وجود باری کا منکر ہوگا۔ لیکن بجائے اسکے اس نے وحدت عقل کا مسئلہ ایجاد کیا۔ اس کے نزدیک تمام انسانوں میں ایک ہی عقل پائی جاتی ہے۔ انسانیت کسی میں کم اور کسی میں زیادہ نہیں ہے۔ اس لحاظ سے تمام کائنات ایک عقل کل کی مظہر بلکہ اس کا جزو ہے۔ ہم اسکے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے عالم مادہ سے وجود میں آیا لیکن مادہ میں عقل و شعور نہیں۔ اسی بنا پر ایک عقل کل کو ماننا پڑا۔ اگر وہ اسی رائے پر قناعت کرتا تو کم سے کم مادئین کے اعتراض سے محفوظ رہتا لیکن وہ آگے چل کر عقل کی پانچ قسمیں قرار دیتا ہے اور اپنے اجتہاد سے اس مسئلہ کو اس قدر پیچیدہ بنا دیتا ہے کہ خود اس میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ فلسفہ صرف اصطلاحات کا نام ہے۔ ورنہ وہ قیاسات انسانی کا مجموعہ ہے جن میں کچھ غلط اور کچھ صحیح ہیں۔ حقائق اشیا پر تو کس نے

کسی حد تک دسترس حاصل کیا ہے لیکن روحانیات میں وہ انسان کی رہبری سے بالکل قاصر ہے۔ قدم قدم پر اُسکو لغزش ہوتی ہے اور اُس کا بھرم کھل جاتا ہے۔

ابن رشد بحیثیت متکلم یہ اصول قائم کرتا ہے:

"صرف قرآن مجید کو پیش نظر رکھو تو تمام مشکلیں حل ہو جائیں گی۔ اس سے ایک عامی بھی اسی طرح مطلب سمجھ لیتا ہے جس طرح ایک فلسفی۔ اس کے دلائل جس طرح خطابی ہیں اُسی طرح وہ قیاسی اور بُرہانی بھی ہیں یعنی منطق کے معیار پر پورے اُترتے ہیں۔"

لیکن ایک فلسفی کی حیثیت سے وہ خود اپنے اصول موضوعہ پر عمل نہیں کرتا۔ بجائے اسکے کہ وہ انھیں دلائل کی بنا پر خدائے عزوجل کے وجود کا اقرار کرتا وہ اپنے مفروضہ خدا میں بجز عقل کے اور کوئی صفت نہیں پاتا۔ اور اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاف طور پر صفاتِ باری کا منکر تھا۔ کاش وہ یہ کہتا کہ انسان کی فطرت اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ از خود اُسکو معلوم ہوتا ہے کہ خدا ہے اور ایک ہے۔ یہ خیال ہر ایک کے دل میں خود بخود پیدا ہوتا ہے اور اسکی تردید فطرت کے خلاف ہے۔ یہی مطلب ہے "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوا بَلٰی" کا۔ اُنیسویں صدی کا مشہور جرمن فلسفی کانٹ اس تہ کو پہونچ گیا۔ اُس نے تسلیم کیا کہ خود نفس انسانی ہستیِ مطلق کا شاہد ہے۔

ہر کس نہ شناسندۂ رازست وگرنہ

اینہا ہمہ رازست کہ معلوم عوام ست

اسکے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابن رشد کی نسبت علمائے دین کی بدگمانی اور بالآخر اُسپر بیدینی کا جو الزام عائد کیا گیا وہ کہاں تک واجبی تھا۔ مصنف نے منجملہ اور اسباب کے اسکے دو خاص وجوہ قرار دیے ہیں:-

(۱) تقربِ شاہی کی وجہ سے اسکے خلاف حاسدانہ سازشیں۔

(۲) فلسفہ میں اس کا انہاک۔

ایک یوروپین مصنف کا قول ہے کہ فلسفہ کی تحصیل کسی حد تک ایک دلچسپ اور مفید شغلہ ہے لیکن اس میں زیادہ انہاک انسان کی تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ ابن رشد اس کا پورا مصداق تھا۔

مسلمانوں کو فلسفہ کے ساتھ جو بیگانہ وشی اور تعصب تھا اس سے قطع نظر خود ابن رشد کے عقائد ایسے تھے کہ اسکے خلاف الحاد کا فتوے حاصل کر لینا کچھ مشکل نہ تھا - جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ خدا کو خالق اور مختار بالارادہ تسلیم نہیں کرتا، صفات باری اور حشر اجساد کا منکر ہے - تو ہم کو علمائے دین کی رائے سے اختلاف کی جرأت نہیں ہوتی -

ابن رشد نے مذہب اور عقل میں تطبیق کا دعویٰ کیا تھا لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا - یہ خیال اُس کا نیا نہیں تھا - اُسکے پیشتر اور اُسکے بعد اکثر حکما اور بعض مصلح قوم نے مذہب کو عقل کے معیار پر لانا چاہا - ہمارے زمانہ میں سرسید احمد خاں مرحوم تمام عمر اسی کوشش میں مصروف رہے لیکن نتیجہ کیا ہوا - قرآن اور حدیث کی بیجا تردید اور غلط تاویلات سے اُنھوں نے مذہب کو ضعیف کر دیا - نہ وہ کوئی جدید حکیمانہ مذہب قائم کر سکے نہ اصل مذہب کی گتھیاں سلجھا سکے - فی نفسہ یہ ایک مغالطہ ہے کہ عقل الٰہی اور عقل انسانی دونوں ایک سطح پر چل سکتے ہیں - اگر فلسفہ اور مذہب پورے طور پر منطبق ہو جائے تو دنیا میں کسی الہامی مذہب کا وجود باقی نہ رہے - ارسطو کی اصطلاح میں عقل انفعالی (عقل انسانی) عقل فعال کا جزو ہے - اور جزو اپنے کل پر حاوی نہیں ہو سکتا - لہذا یہ محال عقلی ہے کہ فلسفہ جس کا موجد انسان ہے، علم الٰہی کا مقابلہ کر سکے ............. اس بارے میں قابل مصنف کی رائے یہ ہے کہ مذہب اور فلسفہ میں سے کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ایک دوسرے کی سرحد میں قدم رکھے - ہم کو ایسا کوئی قانون نظر نہیں آتا جسکے روسے عقل اور مذہب کا بٹوارہ مکمل ہو سکے اور دونوں کی حد بندی کر دی جائے - یہ امر انسان کی عقل سلیم اور وجدان صحیح پر منحصر ہے کہ وہ جن چیزوں کا ادراک نہ کر سکے اُن میں خواہ مخواہ عقل کو دخل نہ دیا جائے اور اُس کی عاجزی کا اعتراف کیا جائے -

ہم کو اس بات پر تعجب نہیں ہوا کہ ابن رشد تصوف کا مخالف اور اُس سے بیگانہ محض تھا - وہ مشائین کے رنگ میں اسقدر شرابور تھا کہ اُسکو روحانیات سے مناسبت ہو ہی نہیں سکتی تھی - وہ موت کے بعد روح انسانی کے عقل فعال میں جذب ہو جانے کا قائل تھا لیکن اُس کی رائے میں یہ اتصال محض علم کی مدد سے حاصل ہو سکتا ہے جو عقل کی استعداد اور صلاحیت پر منحصر ہے

ع ایں سعادت بزورِ بازو نیست ۔ اس رائے میں کئی غلطیاں ہیں ۔ اگر علم اور عقل کے ذریعہ سے معرفتِ الٰہی حاصل ہوسکتی تو ہر فلسفی بایزید اور منصور بنجاتا ۔ عقل میں ذوق و شوق کی صلاحیت کہاں ۔ محلِ ذوق قلب ہے نہ کہ قوتِ مدرکہ ۔ بغیر ذوق کے دل میں کشش الٰہی پیدا نہیں ہوتی ۔ خدا اپنی معرفت عطا فرمائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک خود بیں زاہد جو حور کے واسطے عبادت کرتا ہے اور ایک ہیئت داں فلسفی جو بزعم خود آسمان میں چلتی لگاتا ہے دونوں شاہراہِ حقیقت سے یکساں فاصلہ پر ہیں ۔ منزلِ مقصود کا راستہ عالمِ روحانی کے سنسان اور نامتناہی فضا میں ڈھونڈھنے سے ملتا ہے جہاں عقل حیران اور ششدر رہ جاتی ہے اور علم موجبِ حجاب ہوتا ہے ۔ جس مقدس طبقہ نے ہم کو رموز و اسرارِ روحانی سے آگاہ کیا وہی اسلام کے اصلی فلسفی تھے یعنی صوفیہ کرام ۔ ان کا علم ظنی اور قیاسی نہیں بلکہ عملی ہے ۔ انھیں کی بدولت طالبانِ حق فنا اور بقا کے مدارج تک پہونچے ۔ اور انھوں نے اپنی زندگی میں یہ ثابت کردیا کہ جزو کا کل میں فنا ہوجانا یہی اصلی مقصدِ حیات ہے ۔

گر دو چشمِ حق شناس آمد ترا
دوست پر بیں عرصۂ ہر دو سرا

ا ۔ ح

---

بندۂ عشقِ بتِ دشمنِ ایماں ہوگا
پہلے کافر تھا مرا دل وہ مسلماں ہوگا

ہم جو کہتے ہیں کہ محفل سے اٹھے جاتے ہیں
ہنس کے کہتے ہیں بڑا آپ کا احساں ہوگا

پیشتر ہی سے تجھے مدِ نظر تھا شاید
تیرے رہنے کا ٹھکانا دلِ انساں ہوگا

یعنی یہ سمجھوں کہ قیامت کا ہے آنا برحق
زیبِ آغوش جو وہ فتنۂ دوراں ہوگا

ڈھونڈھ لے ڈھونڈھ لے میرے دلِ صد پارہ میں
انھیں ٹکڑوں میں ترے تیر کا پیکاں ہوگا

جب بنا قالبِ خاکی کی یہ بڑی آئی صدا
ہوگا وہ واے خدائی جسے انساں ہوگا

سنگِ اسود کو تو کچھ اور بتاتا ہے شیخ
میں سمجھتا تھا کہ سنگِ درِ جاناں ہوگا

اے بتو قہرِ خدا ہوگا نہ یا وہ جس پر
اُس پہ دوزخ میں عذابِ شبِ ہجراں ہوگا

بندۂ عشقِ بتاں روزِ ازل سے ہے جگر
تو ہوا ہے نہ کبھی دل سے مسلماں ہوگا

# افادات مہدی پر ایک نظر

لا تقنطوا الدرة ان ینثر عقدہا ۔ لیعود احسن فی النظام واجملا

سب سے پہلے میں بیگم صاحبہ کا تہ دل سے متشکر و ممنون ہوں، کہ انھوں نے باوجود حوادث اور وقتی کاوشوں کے مہدی مرحوم کے منتشر مضامین کی تفصیر و تنظیم فرمائی، اور لوگوں کو شکریہ کا موقع عطا فرمایا۔ ظاہر ہے کہ ایک خانماں برباد و مضطرب الاحوال خاتون کو جس قدر موانع پیش آتے رہتے ہیں، بلحاظ انکے ایسے کار خطیر کا انصرام صرف ان ہی کا حصہ ہے۔

جو کچھ میں لکھوں، یہ لکھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سوگوار بیگم نے "آئی یادش" کے عنوان سے جو ماتم گساری کی ہے، اس کا ایک ایک حرف باہمی خلوص اور سچی محبت کی بہترین یادگار رہے، اور زناشوئی کے لطیف جذبات کی زندہ تصویر۔ وہ بالا مسرت اسوقت ہوگی جب وہ دلکش مکاتیب کا مجموعہ خوشنما کتاب کی صورت میں اہل علم کے پیش نظر ہوگا۔ جن اصحاب نے مرحوم کے خطوط دیکھے ہیں یا جنھیں خط و کتابت کا فخر حاصل رہا ہے، انکو معلوم ہے کہ مہدی مرحوم شرک و تقلید سے پاک تھے، اور اردو لٹریچر میں طرز خاص کے موجد، مولانا سید مقبول احمد صاحب صمدانی جو جنت نصیب "ایم مہدی حسن افادی الاقتصادی" کے مخلص و دیرینہ دوستوں میں ہیں اور دنیائے ادب میں کافی شہرت رکھتے ہیں، مجھ کو ممدوح کی خدمت میں اکثر و بیشتر حاضری کا اتفاق ہوتا ہے، مرحوم کے کل وہ خطوط جو ممدوح کے نام موصول ہوئے میری نظر سے گذرے ہیں۔ میں بلا اندیشۂ تردید کہہ سکتا ہوں کہ یہ خط سلک مضامین کے گوہرہائے آبدار ہیں" اور روایت و تحقیق کے روح رواں۔

"حضرت مہدی مرحوم کی تحریر کی نسبت کچھ لکھنا درحقیقت تحصیل حاصل ہے۔ مرحوم کے تبحر علمی اور انکی تحریری قوت کا (جن کا اہل علم نے ہمیشہ استقبال کیا ہے) کچھ وہی لوگ اندازہ کر سکتے ہیں۔ سچ ہے کہ انکے پاکیزہ جذبات اور انکی بلاغت و فصاحت کا ضبط تحریر میں لانا دشوار و پرخطر ہے!

مرحوم کی عمر کا کوئی اندازہ بیگم صاحبہ نے نہیں فرمایا، اس لیے میں بھی نظر انداز کرتا ہوں، لیکن حضرت مہدی کے شوق انشاپردازی اور بر وا استقلال کا جہاں تک تجسس کیا گیا اس سے پتہ

چلتا ہے کہ اُنکی مضمون نگاری کا آغاز "تمدن عرب پر ایک کھلی چٹھی" کے عنوان سے ہوا، جو فروری ۱۸۹۹ء میں ریاض الاخبار گورکھپور میں اشاعت پذیر ہوئی، اور آخر میں "حالی و شبلی کی عامرانہ چشمک" ۱۹۱۹ء کے معارف اعظم گڑھ میں جلوہ افروز ہوئی۔ یہ مرحوم کے مضامین کا آخری دَور ہے!

یہ کتاب نہ تو مبسوط یا مختص الفن ہے اور نہ کوئی جامع تصنیف بلکہ اخبارات و مجلات میں چند اشاعت یافتہ مضامین کا مجموعہ ہے جس میں مختلف عنوان سے اپنے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اسی کو مرحوم کی عمر بھر کی کمائی اور سالہا سال کی سرگرم تلاش کا نتیجہ کہنا چاہیے۔

ایسی بے نظیر تالیف چاہتی ہے کہ مستقلاً ایک تفصیلی نظر اُس پر ڈالی جائے۔ اسکو میں اپنے سے لائق تر حضرات کے لیے چھوڑتا ہوں۔ اُمید ہے کہ ملک عام طور پر دست شوق بڑھائے گا۔

میرا تو خیال ہے کہ مرحوم کی ندرتِ تحریر و جدتِ طبع خود ہی ایک ایسی بڑی ممتاز حیثیت رکھتی ہیں جسکے لیے محض مہدی کا نام کافی ضمانت ہے۔

مجھ کو ہر حیثیت سے "مہدی" مرحوم کے فلسفیانہ خیالات سے اتفاق ہے، لیکن سردست فلسفۂ تمدن کے ساتھ ساتھ جہاں روحانیات سے بحث کی ہے اور علامہ شبلی کی جانب سے جو حریفانہ جواب دیا گیا ہے، اگرچہ آزاد (جدید) فلسفہ کے لحاظ سے بالکل درست ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی عرض کروں گا کہ مذہب کے دامن پر یقیناً ایک بدنما دھبہ ہے۔ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ

"صوفیانہ ریاضت و اعمال جو قطعاً غیر فطری ہیں، بے وقت کی شہنائی سے کم نہیں۔ ہم مردوں میں ہیسٹریا یعنی اختناق الرحم کے خواص پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ نہ تشنج اعصابی اور حرکات رقاصی کے لیے بوڑھے شبلی کہیں موزوں ہیں۔ اسلم اور اُن کے یاران طریقت کو یہ ناچ ناچنا از افعالِ صوفیانہ مبارک۔ دیکھیے یہ نہ سکیے گا،

اے کہ آگاہ نۂ حالت درویشاں را     تو چہ دانی کہ چہ سودا ہوست ایشاں را"

اگرچہ اس قسم کے خیالات دَور اولیٰ یا "ایام جوانی چناں کہ دانی" کے مصداق ہیں لیکن مہدی جیسے ذمہ دار شخص کے لیے ایک معمولی سا تسامح بھی حسن ظن کی اجازت نہیں دیتا۔ اس بے محل بحث سے ناظرین کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ میرا مقصد مہدی مرحوم کے کسی مضمون پر نقد یا لازم کا ہے؟ حاشا وکلا میری ہرگز یہ مراد نہیں۔ میرا منشا صرف اس امر کے انکشاف کا ہے کہ میرے سامنے وہ ایسے گروہ فرقی

کی حیثیت سے ہیں جو اپنے اصول سے متجاوز ہوکر [illegible] ہیں - ایک گروہ [illegible] کا ہے اُن سے مجھے کوئی غرض نہیں - دوسری وہ جماعت ہے جو روحانی کو دنیاوی ترقی کا متضاد خیال کرتی ہے - میرا حق اعتراض بیشک آخرالذکر پر ہے - خیال ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ تباہی و بربادی کا سب سے بڑا سبب ایسے پوچ خیالات کی جلوہ گستری ہے - ایک طبقہ نے اپنا مقصد یہ سمجھا ہے کہ ہمیں صرف دنیوی ترقی کرنا چاہیے اور روحانیات سے کوئی سروکار نہیں، بلکہ معراج ترقی کے لیے ایک دوسرے کو مخالف تصور کرتے ہیں - اُن کا قول ہے کہ انسان اسوقت تک دنیا کے جادۂ ترقی پہ گام زن نہیں ہو سکتا، جب تک اصول بالا پر عامل اور کاربند ہوگا - صورت ثانیہ میں اگر اسلام کے عروج کا دارومدار اور ذریعہ فلاح محض رہبانیت پر، یا ترقی کا مدار صرف دولت و ثروت تو ہم کو بھی مہدی کے مذکورۂ بالا فلسفہ سے کلیتاً اتفاق ہوگا -

لیکن یہ نہ صرف اُنکی غلط فہمی ہے بلکہ مذہب پر صریح الزام و بہتان - مذہب نے یہیں نہیں بتایا کہ مسلمانوں کا اصلی مقصد اور بہترین مشاغل علاوہ فرض نماز و روزہ کے صرف نوافل پڑھنا اور وظیفوں کا وِرد رکھنا، عزلت گزینی کرنا، دنیا و مافیہا سے بیخبر رہنا ہے -

چیست دنیا از خدا غافل بُدن　　　نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

کس قدر تعجب کی بات ہے کہ جو طبقہ اپنے آپ کو مسلمانوں کی روحانی ارتقا کا ذمہ دار سمجھتا ہے اُس کا یہ خیال ہو کہ دنیوی عروج اور علوئے جاہ، اطمینان نفس و نظافت روح کے متضاد و متنافر ہیں اور ایک دوسرے کے لیے سم قاتل!

میں آپ کو قرآن مجید کا حکم بتاؤں - اس کا وعدہ ہے کہ مسلمانوں کی روحانی ترقی کی ایک بدیہی علامت یہ ہے کہ وہ انتہائی دنیاوی ترقی کر سکیں اور پورے غالب ہو جائیں - ارشاد ہوتا ہے وعد اللہ الذین آمنوا منکم و عملوا الصلحت لیستخلفنہم فی الارض کما استخلف الذین من قبلہم ولیمکنن لہم دینہم الذی ارتضی لہم ولیبدلنہم من بعد خوفہم امنا - (سورہ نور - آیت ۵۵)

(ترجمہ - تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور عمل نیک بھی کرتے ہیں اُن سے خدا کا وعدہ ہے کہ انکو ملک کی خلافت (سلطنت) ضرور عطا کرے گا، جیسے اُن لوگوں کو خلافت عطا کی تھی جو اُن سے پہلے گذر چکے ہیں اور جس دین کو اُس نے اُنکے لیے پسند کیا ہے اسکو اُن کے لیے جمع کرے گا اور خوف و

خطرہ انکو لاحق ہے اسکے بعد انکو اسکے بدلہ میں امن دے گا۔

کسی نافہم کا اعتراض، اسلامی تصوف پر جان بوجھ کر یا نادانستہ، نکتہ چینی اور محض تعصب ہے۔ خود قائل کی قوت امتیاز اور حسن ادراک کا روشن نمونہ ہوگا، مہدی پر قطعاً اس کا الزام نہیں بلکہ یہی مرحوم کی معقول پسندی کا کافی ثبوت ہے اور صداقت ودراستبازی کی بڑی حجت۔ سچ تو یہ ہے کہ مرحوم کے ابتدائی زمانہ کے خیالات اور آخر عمر کے مضامین سے بے انتہا تفاوت ہے۔ افسوس ہے کہ مہدی مرحوم کی حیات نے وفا نہ کی ورنہ آپ دیکھتے کہ مذہبی حیثیت سے بھی وہ قوم کے پیشوا ہوتے، اور اپنے ہی قلم سے بہت سی غلط فہمیوں کی اصلاح کر جاتے۔

"مہدی مرحوم" سے جس قدر اردو ادب کو امیدیں تھیں، اسکے متعلق کچھ عرض کرنا ہیں۔ مہدی کی جدت پسند طبیعت نے رنگینی کے ساتھ ساتھ سنجیدگی کا اثر جب قبول کیا اسوقت نشاۃ ادبیہ کے لحاظ سے "مرحوم" کی عمر بیس برس سے اوپر نہ ہوئی تھی، افسوس کہ اپنی جگہ خالی کر گئے۔ "افادات" میں یوں تو مجموعی حیثیت سے لطائف و ظرائف کے ساتھ علمی اور خصوصاً ادب و انشا کے ایسے ایسے نکتے مذکور ہیں جو ہر ادیب کے لیے وجہ تفاخر ہیں اور ظریف کے لیے سرمایۂ دلبستگی و نشاط، مگر خصوصیت کے ساتھ آخر کے مضامین، یعنی' ارتقاء ادب، شبلی سوسائٹی' حیدرآباد کی بزم ادب' حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک' مضامین سابق الوقت' سے بہت نمایاں امتیاز رکھتے ہیں۔ مہدی کی تحریر میں جہاں اور ممتاز خصوصیات ہیں، وہاں ایک یہ بھی ہے کہ کسی مشکل سے مشکل اور اہم سے اہم مضمون کو روزمرہ کی گفتگو اور باتوں باتوں میں کچھ اس طرح کہ جاتے ہیں کہ جس پر ادب ناز کرتا ہے۔

انسانی ہستی کا جزو اعظم محبت و عشق ہے۔ اور انسان کے لیے محبت کا ہونا شاعرانہ نقطۂ خیال سے لازمی ہے' خواہ وہ محبت ملکی ہو یا قومی، حقیقی ہو یا مجازی۔ فطری شاعر، عام ازیں کہ نثر کا شاعر ہو یا نظم کا، وہ ہے جس میں مجازی حسن کے مشاہدہ اور حقیقی معنی کے ادراک کی قوت ہو۔ یہی کافی نہیں، بلکہ نیچر کی طرف سے ایسی قوت عطا کی گئی ہو جس کے ذریعہ سے وہ اپنے مشاہدات اور محسوسات کو ایسے رنگ میں بیان کرے کہ سننے والوں کی آنکھوں میں اُس کا سماں بندھ جائے۔ جس سے سامع کے جذبات میں اشتعال، قلوب میں کشش پیدا ہو۔ اور الفاظ کی نشست و برخاست، بیان کی رنگینی سے اُس کے سامنے وہی تصویر آموجود ہو جسکو وہ خود دیکھتا ہے اور خود محسوس کرتا ہے

مہدی کے تمن خیال، اُنکی بلند پروازی اور اچھوتے مضامین کی قدر کچھ وہی اصحاب کر سکتے ہیں جو جوہر شناس اور علم دوست ہیں، اور جنھوں نے مرحوم کے تحقیق کمال اور قوت تحریر کا ہمیشہ خیر مقدم کیا ہے، اگر میں اُسکے سمجھنے سے قاصر ہوں، تو "مہدی" کی جنبش قلم کی کوئی کوتاہی نہیں۔ مشتے نمونہ مہدی کے چند مضامین کے اقتباسات حوالہ قلم کرتا ہوں۔ انکی پاکیزگی خیال و نفاست طبع کو ملاحظہ کیجیے اور لطفِ انشا کی داد دیجیے۔

"فلسفۂ حسن وعشق یونانیوں کے نقطۂ خیال سے"

"محبت کیا ہے؟ ایک تقاضیی کشش ہے! عورت بغیر چاہنے والے کے رہ نہیں سکتی۔ اسکی نزاکت فطری چاہتی ہے کہ کسی کا سہارا ہو، یعنی دو ایک ہوکر رہیں۔ جہاں یہ خود جان دینے کو تیار رہے، یہ چاہتی ہے کہ کوئی اس پر بھی مرتا ہو۔ دنیا میں یہ صرف محبت کے لیے آئی، اور گلے کا ہار بننے بنانے کے لیے۔ پھولوں کی سیج پر اسکی بہار دیکھیے کہ تھوڑی دیر کے لیے افکار دُنیا بُھلا کر رہتی ہے۔ عالم خیال عورت کی ایک وسیع دنیا ہے جہاں وہ اپنے جذبات کو فضائے بسیط میں چھوڑ دیتی ہے، اور جو باتیں دراصل اُسکو حاصل نہیں ہیں اُن کا بھی لطف اُٹھاکر رہتی ہے۔ اسکی ساری زندگی حسن وعشق کا افسانہ ہے۔ وہ خود کسی پر مرتی ہوگی یا کوئی اُس پر جان دیتا ہوگا! عورت پھنستی ذرا مشکل سے ہے، لیکن جہاں پھنسی اُس سے چھٹکارا پسند نہیں کرتی۔ اُسکی اصلی غایت زندگی دوسرے کی پھانس ہے، لیکن اُسے معلوم نہیں کہ جال ڈالنے سے پہلے وہ خود شکار ہو چکی ہے۔"

"عورت کتنی ہی پاکیزہ وش ہو، اس خیال سے خالی نہیں ہوتی کہ کوئی اُسکی کافرادائی کا شیدائی ہو۔ اس کی "فتوحات" اُس کا سرمایۂ نشاط ہیں جن سے اُسکے دل کو راحت ملتی ہے اور جن سے وہ جیتے جی کبھی دست بردار نہیں ہو سکتی۔ وہ داؤ کرکے رہے گی، کیونکہ یہ امر اُسکی فطرت میں داخل ہے! شانہ سے آنچل خود نہ گرائے، لیکن اگر اتفاق سے گر جائے تو وہ دل میں خوش ہوگی۔ یہ اُسکی فطرت کا راز ہے جسے وہ ہی خوب سمجھتی ہے! وہ لہرائے ہوئے آنچل میں دراصل اُسے سینے کا اُبھار غائب کرنا منظور نہیں، بلکہ وہ چاہتی ہے کہ اور نظر جماکر دیکھیے! محرم کا جائزہ نظروں ایک طرح

کی دادِ حُسن ہے، جو ہزار پارسائی کے ساتھ بھی وہ آپ سے لیکر رہے گی! اسی لیے جوانی کی آرائشوں میں داستانہ کی طرح چھپی ہوئی چیز اُسے دل سے پسند ہے جس میں یہ اُن "سرکشوں" کو قید رکھتی ہے جنھیں عورت کے "ارمانِ مجسم" کہیے!

"مئے دو آتشہ" وہ بھی شباب کی، جب چھلک چھلک کر قدرتی کنٹروں میں بھری ہو، تو کون ہے جو ان کیفِ مستی اور بیخودی کے "مجسموں" کی پرستش کا دلدادہ نہ ہوگا! ترکیب عناصری تو ہے، ذرا فطرت کی شوخی دیکھیے گا! "فتنۂ قیامت زا" کے لیے گنجِ پیش نکالی تو کہاں؟ ........"

"سچ کہیے عذرا واقعی بہت حسین ہے؟ حسین تو ایک معمولی لفظ ہے۔ عورتیں سبھی اپنی اپنی جگہ حسین ہوتی ہیں، لیکن میں اپنے تخیل میں اوروں سے اس قدر مختلف ہوں کہ صرف گوشت پوست سے کام نہیں چلتا۔ عذرا میری عذرا! تو نظمِ زندگی یعنی پوری شاعری ہے، اُسکی آواز کامل موسیقی، اُس کا تبسم میرا عنصرِ حیات ہے۔ وہ قطعاً تو بہ شکن ہے، تو بہ شکن اور کافر ایمان! ناممکن ہے کہ نظر پڑتے ہی اُس پر قابو حاصل کرنے کو جی نہ چاہے، جہاں آنکھیں ملیں بس یہ معلوم ہوتا ہے تمام جسم میں بجلی دوڑ گئی، مدت ہوئی جب میں پہلی نظر میں شہید ہوا، دل سے آواز آئی "خدایا خیر"! جس کا نتیجہ آج تک بھگت رہا ہوں۔ مجھ پر اتنا سخت وار کبھی نہیں ہوا، کچھ تو ہے جس کی وجہ سے مٹا ہوا ہوں، میری آنکھوں سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن خود مجھے معلوم نہیں کس ادائے خاص کا دلدادہ ہوں پچھلی دفعہ بہت اُتری ہوئی حالت میں دیکھا پھر بھی ایک بات تھی۔ آج تک عالم تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے!

"کیا عذرا آپ کے دل کا راز جانتی ہے؟" ہاں ہاں خوب جانتی ہے کہ میں اُس پر مٹا ہوا ہوں لیکن تم کو ہندوستانی سوسائٹی کی حالت معلوم ہے۔ ہمارے ہاں جائز عشق کا پتہ نہیں، نہ جذبات قوت سے فعل میں آسکتے ہیں۔ یہ بات مہذب اقوام میں ہے کہ عقد سے پہلے بیگانگی نہیں رہتی۔ اسکا افسوس ہے کہ میں نے عذرا کے لیے ایک نئی خلش پیدا کردی اور ایک ایسی فضائے بسیط پیش نظر کردی جس میں کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ برسوں کے فتنۂ خوابیدہ کو چھینٹے دے دے کر جگانا صریحی ظلم تھا، حصولِ آرزو جسے شعرا اپنی اصطلاح میں "وصل" کہتے ہیں ایک طرح کی خود غرضی ہے۔ انتظار و ناکامی میں ایک لذت خاص ہے۔ اور چونکہ مجھ کو عذرا

کے ساتھ خالص روحانی تعلق ہے اس لیے گو وہ مجھے گلے کا ہار نہ بنا سکے تاہم میں اُسکی پرستش سے جیتے جی کبھی دست بردار نہ ہوسکوں گا۔ وقت گذر جائے گا قصے رہ جائیں گے"۔

"خیر سے سن کیا ہوگا؟" "یہ نہ پوچھو۔ میں وہ پھل چاہتا ہوں جو ڈال میں ٹپکا اور پکا پکایا ہو، اُدھ کچرے یعنی ثمر خام کی ضرورت نہیں، نہ پال ڈالنے کی فرصت"۔

اُردو لٹریچر کے عناصر خمسہ کے ذیل میں سرسید، پروفیسر آزاد، نذیر احمد، حالی و شبلی کے تذکرے اور انکی تحریرات کی خصوصیات دیکھنے کے قابل ہیں اور افادہ و استفادہ کے لائق۔

تِلْكَ آثَارُنَا تَدُلُّ عَلَيْنَا　　فَانْظُرُوا بَعْدَنَا اِلَى الْآثَارِ

سید حبیب احمد

---

نہ ہو ذوقِ دید حاصل رہے اضطرار اپنا　　دمِ حشر ذرہ ذرہ ہو نگاہ وار اپنا
نہ ہے قافلہ نہ منزل نہ کہیں دیار اپنا　　سرِ رہگذر رہیں ہیں کہ یہ ہے غبار اپنا
اُدھر اپنی یہ تمنا کہ ہجومِ حشر کم ہو　　اُدھر انکا یہ تقاضا کہو حالِ زار اپنا
یہ اُٹھانے کس نے فتنے وہ مٹا نشانِ تربت　　یہ لگائی کس نے ٹھوکر وہ اُٹھا غبار اپنا
کوئی اُسکو لاکھ چاہے وہ کسی سے کیا نباہے　　جسے شوخیوں کے ہاتھوں نہ ہو اعتبار اپنا
ابھی زخمِ خونفشاں میں وہی وجلہ باریاں ہیں　　ابھی ترجمانِ غم ہے دلِ داغدار اپنا
یہ اُمنگ کا زمانہ یہ شباب کی ترنگیں　　کہ ہمیں ہے جان جو کھوں دلِ بیقرار اپنا
پسِ پردہ کہہ اُٹھے وہ کہ خدا ہی شرم رکھے　　کسی راز کا مرقع نہ ہو حالِ زار اپنا
انھیں اچھی صورتوں میں کوئی شکل تھی قیامت　　انھیں اُجڑی بستیوں میں کہیں تھا دیار اپنا
اُڑے پھول کچھ ہوا میں نہ ہوئی مراد حاصل　　رہی شمع گردشوں میں نہ ملا مزار اپنا
ابھی توبہ ٹوٹتی ہے وہ قسم دلائے نازش
پسِ مَے کشی کے ۔ زاہدوں میں نہ رہے شمار اپنا

محمد مبین۔ نازش بدایونی

# یورپ میں فن تاریخ کی تاریخ

تاریخ کیا ہے؟ گذشتہ واقعات کو صحت کے ساتھ بیان کرنے کا نام تاریخ ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ان واقعات میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں جو مورخ کے زمانہ سے صدیوں قبل گذر چکے ہوتے ہیں، اس لیے اسکو مختلف مصنفین اور اشیا کی شہادت پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اور اس شہادت کی بنا پر جس قدر صحت اس خطا و نسیان کے پتلہ انسان سے ممکن ہے وہ اس کو کام میں لاکر واقعات قلمبند کرتا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شہادت کی صحت اور عدم صحت کا اندازہ کرنا اور شاہد کی ثقاہت اور غیر ثقاہت کا معلوم کرنا آسان کام نہیں۔ اور اسکے ساتھ ہی واقعات اور حادثات کو مورخ کے ذاتی خیالات اور معتقدات کی رنگ آمیزی سے پاک و صاف رکھنا بھی معمولی بات نہیں یہی وجہ ہے کہ بعض فلسفی تاریخ کے فن کو قابل اعتبار و لائق وثوق نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک تاریخ کذب و افترا کا ایک مجموعہ پیدا کرتا رہتا ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ صرف چند مورخین کی وجہ سے تاریخ کے اہم فن کو برباد کر دینا اور اسکو عبث سمجھنا بھی غلطی ہے حقیقی مورخین کبھی اس کو گوارا نہیں کرتے کہ وہ واقعات کے بیان کرنے میں محض "زینت داستان" کے لیے اپنی طرف سے کچھ بڑھا یا گھٹا دیں۔ وہ شہادت کو جانچنے میں بہت احتیاط کرتے ہیں اور شاہد کے بیانات کو پرکھنے میں نہایت سختی برتتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ عام فطرت بشری کی وجہ سے اونادانستہ طور پر ان سے غلطیاں ہوں لیکن یہ غلطیاں دوسرے مصنفین دور کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح تاریخ ہر قدم پر پاکیزہ تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ گذشتہ واقعات کے بیان کرنے کا نام تاریخ ہے۔ لیکن ہماری اس تعریف میں وہ تمام منظوم افسانے بھی شامل ہو جاتے ہیں جو قرون متوسطہ میں اس قدر عام تھے۔ انکو کہاں تک تاریخ میں شمار کیا جا سکتا ہے؟ اصل یہ ہے کہ اس قسم کے افسانوں کو ہم تاریخ میں شامل نہیں کر سکتے کیونکہ ان میں ضرورت شعری کی وجہ سے بعض ایسی باتیں بھی داخل کر لی جاتی ہیں جن کو تاریخ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اگر ان میں کوئی سچا اور واقعی واقعہ بیان کیا بھی جاتا ہے تو اسکو اتنا بڑھا چڑھا کر

کہ اصلیت اُس کے حشو و زوائد میں گُم ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے افسانوں کی اصلی غرض و غایت یہ ہوتی تھی کہ عوام الناس کو اُن کے بزرگوں کے کارنامے سنا کر اُبھارا جائے اور اس طرح اُنکی قوت حیات اور حمیت کو برقرار رکھا جائے۔ کیونکہ یہی قوت حیات اور حمیت اُن کی بقا میں ممد ہوتی تھی۔ یہ غرض و غایت اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ شاعر اس میں رنگ آمیزی نہ کرے اور یہی رنگ آمیزی تاریخ کے لیے مہلک ہے۔ مختصر یہ کہ منظوم افسانوں کو کسی صورت سے بھی تاریخ کی صف میں جگہ نہیں دی جا سکتی۔ لیکن ان منظوم افسانوں کے علاوہ منثور افسانے بھی ہوتے ہیں یعنی ناول، انکو بھی تاریخ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اول تو ان میں بعض موہوم اور خیالی واقعات بیان کیے جاتے ہیں اور اگر سچے واقعات ہوں بھی تب بھی منظوم افسانوں کی طرح ان میں بھی واقعات کی قطع و برید ہوتی ہے۔ اگر ان دونوں مستثنیات سے قطع نظر کر لی جائے تو ہماری تعریف زیادہ صحیح ہو جاتی ہے۔

عملی طور پر تاریخ اور تخیل میں کوئی حد فاصل مقرر نہیں کی جا سکتی۔ لیکن نظری حیثیت سے ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ تاریخ کا دار و مدار تمام تر بیان کردہ واقعات کے متعلق ہمعصر شہادت پر ہوتا ہے۔ خواہ اس واقعہ کو ظہور پذیر ہوے کتنے ہی دن گذرے ہوں۔ تحریری دفاتر پارینہ تاریخ کے لیے لازمی نہیں کیونکہ اکثر اوقات روایت سے وہی کام نکل سکتا ہے اور اُس سے بھی نہایت قابل اعتبار شہادت مل سکتی ہے۔ لیکن با ایں ہمہ روایت پر بھروسا کرنا نہایت خطرناک ہوتا ہے۔ کیونکہ انھیں روایات کے زیر اثر اور انسان کے خلاق تخیل کی رو سے تمام خرافات الاصنام پیدا ہوتے ہیں، اور وہم و حقیقت کے اس مقام اجتماع پر اصلیت اور غیر اصلیت میں امتیاز کرنا اکثر حالتوں میں ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ روایت میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض اہم باتیں اور حوادث نظر انداز کر دیے گئے ہوں یا یہ کہ روایات میں واقعات کے بجاے اُنکے موہومہ اور مزعومہ نتائج بیان کر دیے گئے ہوں۔ اور اس لیے ممکن ہے کہ وہ روایت اصلیت سے بہت دُور جا پڑی ہو۔ پھر اسکے ساتھ ہی بعض روایات سینہ بسینہ متوارث چلی آتی ہیں اور انھیں پر تاریخ کو مبنی کیا جاتا ہے۔ لیکن اس قسم کی روایات کو تسلیم کرنے میں حقیقی تاریخ کے لیے اور بھی زیادہ خطرات ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ایک ہی واقعہ کو دو اشخاص مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں اور دونوں میں زمین و آسمان کا

فرق ہو سکتا ہے - انکی حالت ان چار اندھوں کی سی ہو سکتی ہے جو ہاتھی کو دیکھنے گئے تھے، اور ہر ایک نے اپنے تجربہ کے مطابق ہاتھی کی شکل و صورت بیان کی تھی - جب ایک ہی واقعہ کے متعلق ہمعصر روایات اس قدر متفاوت ہو سکتی ہیں تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ گذشتہ واقعات کے متعلق ان روایات پر کہاں تک بھروسہ کیا جا سکتا ہے -

اسی ضمن میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تاریخ کے لیے ہی حقیقی واقعات کافی نہیں ہوتے - چین، مصر، اور اشور کے متعلق بہت سے واقعات اور سنین بیان کیے جاتے ہیں جو غالباً درست ہیں - مگر ان واقعات و سنین سے ہم ان ممالک کی تاریخ بیان نہیں کر سکتے - یہ بات کہ فلاں بادشاہ فلاں سنہ میں تخت نشین ہوا، اپنی ہمسایہ سلطنتوں سے برسرپیکار رہا، اُن پر فتح حاصل کی اور فلاں سنہ میں مرگیا - سنین کے لحاظ سے اہم ہو تو ہو لیکن اسکو تاریخ نہیں کہا جا سکتا - تاریخ کا کام صرف یہی نہیں کہ وہ معاشری واقعات و ارتقا کو بیان کرے بلکہ اس کا ایک اہم وظیفہ یہ بھی ہے کہ ان پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کرے اور سوسائٹی کے ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنے اور اُس کی نشأۃ و حرکت کو خاص طور پر واضح کرے - دوسرے الفاظ میں تاریخ واقعات، سنین اور بادشاہوں کے ناموں اور اُن کے شجرہ ہائے نسب کے مجموعہ کا نام نہیں بلکہ اس میں ان واقعات کی توجیہ، اُنکے نتائج کی توضیح، اور اُنکے اثرات کی توصیف ہوتی ہے - اس کارگاہ حیات میں ہر ایک واقعہ علت و معلول کی سلک میں منسلک ہے اور اسی سلک کو معلوم کرنا تاریخ کا اہم وظیفہ ہے - اسکے بغیر تاریخ میں چمک پیدا نہیں ہوتی -

اس تمام بحث سے ظاہر ہے کہ بلحاظ مکان و زمان تاریخ کی حدود بہت تنگ ہیں - اس کی وسعت انسان کے طول حیات اور زمین کے اُس حصہ کی نسبت سی ہوتی ہے جس پر انسان آباد ہے - ابتدائی اور وحشی انسان نے اپنی کوئی تاریخ نہیں چھوڑی کیونکہ اُس کی تمام تر طاقت و قوت جہد للبقا میں صرف ہوتی تھی - اور اس لیے نہ اس کے پاس اتنا وقت تھا اور نہ طاقت کہ وہ اپنے آپ کو ایک مدنی انسان فرض کرے اور اپنے تجربات کو آیندہ نسلوں کے لیے چھوڑ جائے - اسکے بعد جب یہ وحشی انسان کسی قدر مہذب ہوگیا تب بھی وہ تاریخ لکھنے کے قابل نہ ہوا اور نہ وہ اس کا مواد حاصل کر سکا - ہندوستان، مصر اور چین جیسے ممالک میں جہاں علی الترتیب ذاتوں کا

امتیاز، قدامت پسند دولت تخت ریاست. لہٰذا اور جابرانہ روایت کا دور دورہ رہا ہو معاشرتی ارتقا اس قدر سست ہوتا ہے کہ ان میں حرکت کے آثار بہت مشکل سے پیدا ہوتے ہیں بلکہ وہ متحرک معلوم ہی نہیں ہوتے۔ پوتا ایسے حالات میں زندگی بسر کرتا ہے جو دادا کے وقت کے حالات سے بہت کم مختلف ہوتے ہیں۔ ایسی صورتوں میں تاریخ کا مواد آئے تو کہاں سے۔ جمود اور سکون ایسی چیزیں ہیں کہ ان کی طرف توجہ شاذ ہی منعطف ہو سکتی ہے۔ ربع مسکون کے اکثر حصے نے اپنی تمام زندگی ایسے حالات میں گذاردی ہے جو گذشتہ حالات سے بہت کم یا بالکل مختلف نہ تھے۔ چنانچہ مشرق کی داستانوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں فنون حرب و امن تو بہت ترقی کر گئے تھے لیکن اس ترقی سے تاریخ یا اُس کے مواد کے جمع کرنے میں کوئی مدد نہ ملی۔

اگر ہمارے یہ خیالات درست ہیں تو صرف ۴۰۰۰ برس قبل کی اصل اور صحیح معنوں میں تاریخ لکھی جا سکتی ہے۔ شروعات اسکی عہد عتیق کی تاریخی کتابوں سے ہوتی ہے۔ اسکے بعد یہودی تحریرات کا ذخیرہ تو ختم ہو گیا لیکن یونانیوں نے تاریخ کی تدوین میں مدد دی اور ان کے فوراً بعد رومن لوگوں کی جد و جہد شروع ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح اُس وقت سے لیکر اس وقت تک تاریخ کا سلسلہ نہیں ٹوٹتا۔ تاریخ کا مسکن بحر روم کے وہ سواحل رہے جو اگر نسل انسانی کی جائے پیدائش نہیں تو اوائل شباب اور ایام کہولت کی درس گاہ ضرور تھے۔ اسکے بعد تہذیب بحیرۂ روم سے پھیل کر دور و دراز کے اُن جزائر اور بر اعظموں تک پہونچ گئی جو قدما کو معلوم نہ تھے۔ اور تہذیب کے طابق النعل بالنعل تاریخ بھی پھیلتی گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک وقت وہ آنے والا ہے جب تاریخ تمام کرۂ ارض پر حاوی ہو جائے گی۔ مگر ہنوز دلی دور است۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تاریخ کا جو مواد مغرب اقصیٰ، جنوب اقصیٰ، اور مشرق اقصیٰ میں جمع ہو رہا ہے اسکی تمام وجہ وہ وراثت ہے جو ہم کو اسلاف سے ملی ہے اور وہ تہذیب ہے جو یادگار زمانہ مراکز روم، ایتھنز اور یروشلیم میں ضیا افگن ہوئی۔

شروع شروع کی تاریخوں میں واقعات کی تحقیق و تفحص میں کوئی کد و اہتمام نہیں کیا گیا کیونکہ اُس وقت مورخ اور اسکی تاریخ کا پڑھنے والا دونوں کے دونوں تربیت کے لحاظ سے اس درجہ پر نہ پہونچے تھے جب صحت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ شروع کی تاریخوں کا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ وہ

دلچسپ ہوں اور جذبات کو برانگیختہ کرنے والی ہوں - افزائش معلومات اور ازدیاد علم سے انکو سروکار نہ تھا - قاعدہ ہے کہ ایک درد انگیز یا مضحکہ خیز نقصہ صحت واقعات کی وجہ سے پسند نہیں کیا جاتا - زمانۂ اولیں کے مصنفین کا تمام زور جدت تشابیہ پر ختم ہوتا تھا یا ان مکالمات کی رنگینیِ بیان پر جن میں خیر و شر کو بہت بڑا کرکے دکھایا جاتا تھا - یہ لوگ حقیقت و وہم کو ایسی نفاست اور عمدگی سے مخلوط کر دیتے تھے جیسے کہ ایک ڈراما نویس - بلکہ بعض اوقات تو یہ بھی ڈراما نویسوں کی طرح اپنا ایک ایسا ہیرو بنا لیتے تھے جس نے حیات قومی کے تحفظ میں اپنی جان نثار کر دی - یا ان میں بھی ایسی جنگوں کا پُر زور الفاظ میں بیان ہوتا تھا جن میں ایک بیرونی رُوسیہ دشمن مار بھگایا گیا ہو - ان دونوں حالتوں میں تخیل اور حسیات سے بہت کچھ مدد لی جاتی تھی - اور یہی وہ بات ہے جو آج کل کے فن تنقید کے خلاف ہے - لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اس قسم کی تاریخوں میں جذبات کی مصوری نہایت خوبی سے کی جا سکتی ہے لیکن اسکو تاریخ سے کیا تعلق ہے اس قسم کی تمام تاریخیں گویا نثر کی شاعری ہیں - ان میں تخیل کا عنصر غالب ہوتا ہے - ہیروڈوٹس اور فرائسرٹ کی تاریخیں اسی قبیل کی ہیں - لیکن اور اطراف میں علم کی ترقی اور رجز اور شہسواری کے کارناموں کی جگہ سیاسی خیالات کے تسلط کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس قدیم طرز کو ہاتھ سے دیئے بغیر تاریخ لکھنے کا ایک نہایت متین اور محققانہ طریقہ رائج ہو گیا - چنانچہ تھیوسی ڈائیڈیس اور ٹےسی ٹس کی تاریخات اسی رنگ میں ہیں -

تاریخ دو قسم کی ہوتی ہے - قدیم جس میں الفاظ کی گلکاری ہوتی ہے اور جدید یا معاشرتی - قسم قدیم یونانیوں کی ایجاد تھی اور تقریباً زمانۂ حال تک مروج رہی - طرز تحریر کی تکمیل، پُر شکوہ اور دقیق الفاظ، اخلاقی تفکرات کا عمق اور سیاسی تاملات کی زود فہمی اسکی غایت ہوتی تھی تحقیق و تفحص کی طرف سے یہ ہمیشہ لاپروا ہوتی تھی - اس کے خیال میں یہ بات نہ آتی تھی کہ سوسائٹی ایک کل ہے من قبیل آلی - اسکے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان واقعات کے پس پردہ جنکو وہ بیان کر رہے ہیں بعض عمیق اور متنوع قوتیں اپنا کام کر رہی ہیں - اسکے برخلاف جدید تاریخ میں طرز تحریر ایک ثانوی چیز ہے - نہ یہ اخلاقی تفکرات میں پھنستی ہے - اس میں تحقیق کا خاص خیال رکھا جاتا ہے - اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُسکو یہ معلوم ہے کہ سوسائٹی قوتوں کا ایک مجموعہ ہے جو مخصوص قوانین کے زیر اثر کام کرتی ہیں اور زندگی کی دوسری شکلوں کی طرح اس میں بھی ارتقا اور نشاۃ ہوتا رہتا ہے -

یونانی قسم قدیم کے موجد تھے - اور اس پر اُن ہی کا بلا شرکت غیر قبضہ رہا - تناسب اور خوبی کے اسباب میں، انکی غیر معمولی دقتِ نظر، جو انکی ہر جگہ اور ہر صنیفۂ علم ادب و دیگر فنون میں مددگار ہوئی، یہاں بھی انکی رہبر تھی۔ ڈراما کے تجربی مضامین نے ایس کی لس، سوفوکلیس اور ارسٹوفنیس پیدا کیے۔ اسی طرح تاریخ میں بھی مسدود ے چند متقدمین سے ہیروڈوٹس کو تاریخ لکھنا سکھایا - عجیب بات یہ ہے کہ تاریخ کو ایسے شخص نے سنبھالا جس کے برابر آج تک کوئی شخص نہ نکلا - تھیوسی ڈائیڈیس کی پیلاپونیشین جنگوں کی تاریخ اس وقت تک تمام تاریخوں کا نمونہ ہے - مگر اس وقت تک کوئی مورخ اس سے بڑھ نہ سکا - علم اور فن میں فرق صرف اسی قدر ہے کہ ایک علمی تصنیف کتنی ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو بعد میں ہو سکتا ہے کہ کوئی تصنیف اُس سے بڑھ جائے - مگر فن میں تکمیل کے بعد کوئی شخص اُس پر اضافہ نہیں کر سکتا - تھیوسی ڈائیڈیس کی تصنیف اسی قسم کی ہے - یونانیوں کے قائم کردہ اصول میں گذشتہ صدی کے اختتام اور موجودہ کے شروع تک کسی قسم کا تغیر و تبدل نہ ہوا - چنانچہ تھیوسی ڈائیڈیس سے لے کر گبن تک تمام تاریخیں اسی یونانی ڈھنگ پر لکھی گئی ہیں -

تاریخ کی تاریخ ابھی لکھی جانے والی ہے - اگر اس قسم کا کام ہو گیا تو اس کا سب سے زیادہ قابل ستایش کام بعض مصنفین کی تنقید ہی نہ ہوگا بلکہ انکے قرون اور انکے اجتماعی ماحول کا مقابلہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ ہوگا - اُسی سے ہم کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ان چیزوں نے انکی تاریخی تحریرات کی ماہیت پر کیا اثر کیا - مثلاً یہ بات قابل غور ہے کہ تاریخ شعر و سخن اور علم و فلسفہ سے بھی زیادہ عوام کی آزاد خیالی اور حریت پر مبنی ہے - یہ تمام علوم ایک مستبد حکومت کے ماتحت پھلے اور پھولے ہیں مگر تاریخ کے لیے یہ ایک سم قاتل ہے - اسکے علاوہ بعض قرون مورخین کے لیے اچھے ہوتے ہیں جس طرح بعض لڑائیاں سپاہیوں کے لیے اچھی ہوتی ہیں - یونانی تاریخ کو ہم خواہ کتنا ہی اعلیٰ مرتبہ کیوں نہ دیں مگر یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ اُنکو غیر معمولی سہولتیں میسر تھیں - چوتھی اور پانچویں صدی قبل مسیح کے یونان کی سیاسی حالت مورخین کے لیے بہت برانگیختہ کرنے والی تھی - چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا غیر معمولی مجموعہ، اُنکی سیاسی زندگی، اُنکی لڑائیاں اور اُن کا اتحاد و انقلاب اس قدر دلچسپ کوائف تھے کہ بعد میں کسی کو خواب میں بھی نظر نہ آئے - اسی طرح

یونانی مورخین کے لیے یونانی سنگتراشوں کی طرح حالات موافق تھے۔

اگر کوئی قوم یونانیوں کا مقابلہ کر سکتی ہے تو وہ رومن قوم تھی۔ اگرچہ یہ قوم ہر جگہ یونانیوں کی نقل کرتی تھی اور بہت بھدے طریقہ سے نقل کرتی تھی۔ مگر تاریخ میں اگر یہ لوگ یونانیوں پر سبقت نہیں لے گئے تو اُنکے ہمرتبہ تو ضرور ہو گئے۔ مگر اسکی وجہ کیا ہے؟ صرف یہی کہ اُنکی قومی زندگی اکثر صورتوں میں یونانیوں کی زندگی سے بھی زیادہ اعلیٰ رتبہ رکھتی تھی۔ قرون متوسطہ کے مطالعہ سے مورخ تاریخ پر اجتماعی ماحول کے اثر کو بخوبی واضح کر سکتا ہے۔ اُس زمانہ کی تمام تاریخی درس گاہوں کے متعلق کافی وجوہ مل سکتے ہیں کہ اُنھوں نے یہ خاص صورت کیوں اختیار کی۔ فرائسرٹ کی تاریخی تصانیف سے صاف ظاہر ہے کہ ایک بردست تاریخی تصنیف کے لیے موقعہ اور دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ فرائسرٹ کی تصانیف محض اتفاقیہ نہیں۔ جنگ صد سالہ کی انگلستان اور فرانس کے درمیان پہلی لڑائیاں، مٹیس مارسل کی سرکردگی میں جمہور پیرس کا عظیم الشان مگر لاحاصل خروج، اور فرانس کے پہلے جنرل کا عمل دخل ایسی باتیں تھیں جنھوں نے فرائسرٹ کے دماغ کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ اگرچہ ان تمام حالات کے باوجود فرائسرٹ میں بہت سی کمزوریاں باقی رہ گئیں۔ اسی طرح پندرہویں صدی میں نظام الاقطاع اور شہنشاہیت کے درمیان تنازع کے لیے کامنائیس سب سے زیادہ اہل تھا۔ سولھویں صدی کے پُر آشوب زمانہ میں مورخین کی بہت کثرت ہے۔ اس کے بعد عجیب بات یہ ہے کہ ڈیڑھ سو برس تک براعظم یورپ پر تاریخ کا نام لیوا تک باقی نہ رہا۔ سی سالہ اور ہفت سالہ جنگوں کے مابین کوئی یادگار مورخ پیدا نہ ہوا۔ اگرچہ پیرزارے کا نام اب تک باقی ہے۔ مگر اسکی وجہ یہ ہے کہ اس کا طرز تحریر عجیب و غریب ہے۔ تعجب تو اس بات پر ہے کہ یہ زمانہ لوئی چہاردہم کا ہے جب علم ادب اور فلسفہ زوروں پر تھا اور فرانسیسی سائنس کی بنیاد پڑی تھی۔ مگر کیتھولک اور شہنشاہی ردعمل موافق نہ آیا۔ اس زمانے میں فرانس میں بھی تاریخ لکھی جارہی تھی مگر یہ اس قابل نہ تھی کہ سو برس تک کوئی اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے۔ اسکے برخلاف باغی اور انقلاب پسند انگلستان نے کلیرنڈن اور برنٹ پیدا کیے۔ اسی طرح اٹھارہویں صدی پر نظر ڈالنے سے ہمارے بیانات کی تصدیق ہوتی ہے۔

تاریخ کی قسم قدیم گویا نقاشی کی ایک صنف تھی اور نقاشی میں سوائے مطابقت اصل کے تمام خوبیاں ہوتی ہیں۔ اصلیت یہ ہے کہ قدما مصنفین رنگوں کی چمک اور تصاویر کی اثر آفرینی کے

مقابلہ میں حقیقت کی بہت کم پرواہ کرتے تھے - قدما، مورخین قدما، نقاشین کی طرح تھے - وہ نوں اس کی پرواہ نہ کرتے تھے کہ جو کچھ وہ تیار کر رہے ہیں وہ اصل کے کہاں تک مطابق ہے - اُن کی تمام احتیاط اس میں صرف ہوتی تھی کہ اُن کی تصاویر دلکش ہوں، خوبصورت ہوں، اُن کے تمام رنگ عجیب و غریب ہوں، اُن کا خاکہ نایاب ہو خواہ وہ اس کوشش میں اصلیت سے کتنی ہی دور نہ جا پڑیں - اس پر غضب یہ کہ وہ لوگ تحقیق و تفحص سے متنفر تھے - اور یہ تمام باتیں مل کر آج کل کے لوگوں کے لیے بہت نفرت انگیز ہو جاتی ہیں - آج کل تو تاریخی شہادت کی جانچ میں اس قدر سختی اور احتیاط کی جاتی ہو جتنی ایک کمرۂ عدالت میں - اس میں شک نہیں کہ یونانیوں میں یہ تمام عیوب تھے مگر انکے ساتھ ہی اُن میں ہنر بھی تھے - وہ تحقیق و تفحص سے گریزاں سہی مگر وہ کشادہ دل تھے، ہمدرد تھے اور نرم دل تھے - اُنکی تمام تصانیف عوام کے لیے ہوتی تھیں نہ کہ ماہرین کے لیے اُن کا طریقہ اگرچہ بہت بے پروایانہ تھا مگر اُن کو اپنی لیاقت کے نمود کی ضرورت نہ تھی -

کومٹ نے سچ کہا ہے کہ اہم تاریخی واقعات کسی تحقیق و تفحص کے رہین منت نہیں ہوتے - تاریخ میں کتابی پہلو (جس میں ہر واقعہ کی صفحہ و نشان کے حوالہ سے تصدیق کی ضرورت پڑتی ہے) کے علاوہ اخلاقی اور نفسیاتی پہلو بھی ہوتا ہے - صفحہ و باب کا حوالہ اگرچہ اہم ہے مگر بعض اوقات یہ تکلیف دہ اور صبر آزما ہو جاتا ہے - اسناد کا پشتارہ ایک غبی آدمی کے کیرکٹر کے جانچنے میں مدد نہیں دے سکتا - وہ اُسکو اس قابل نہیں بناتا کہ ایک تاریخی واقعہ کو اچھی طرح ذہن نشین کر لے وقس علیٰ ہذا - ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ قدما کی کمزوری کا علاج متاخرین نے کیا اور متاخرین کی کمزوریاں متقدمین کی قوت تھی - متقدمین کی غرض و غایت صرف کیرکٹر کا بیان کرنا تھی - اور اس میں وہ کامیاب ہو گئے - جہاں اُن میں بہت سے خفیف اسقام ہیں وہاں یہ خوبی بھی ہے کہ وہ قیاس سے کیرکٹر کے میزات خصوصی تک پہونچ جاتے ہیں اور اس قدر کامیاب ہوتے ہیں کہ آج کل کی تحقیقات بھی اُسکو بدل نہیں سکتی - مثلاً بیکن نے ہنری ہفتم کی جو تصویر کھینچی ہے وہ اس وقت تک جوں کی توں باقی ہے - حالانکہ یہ کتاب اُس نے صرف چار ماہ میں لکھی اور اُسکے پاس وہ ذرائع علم نہ تھے جو اسوقت موجود ہیں - آج کل باوصف اسکے کہ بہت سی معلومات فراہم ہو گئی ہیں جنکے مقابلہ میں اُس وقت کی معلومات کچھ حقیقت نہیں رکھتیں پھر بھی بیکن کی تصویر میں کچھ تغیر و تبدل نہ ہو سکا۔

متقدمین مورخین نے بعض موہوم اور من گھڑت تقاریر بھی اپنی تاریخوں میں شامل کرلی ہیں۔ مگر اس کی بھی کوئی وجہ تھی۔ اگرچہ زمانہ حال کے ناقدین اس کو بہت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ میکالے کا خیال ہے کہ یہ رویہ بیہودہ تھا اور یہ کہ اگر کوئی انگریز مصنف آج ایسا کرے تو ناصر مضحکہ بن جائے۔ مگر میکاولی اور گروشیس اور بیکن جیسے دماغ اس پر کاربند ہیں۔ اصلیت یہ ہے کہ اس میں صرف طریق اظہار کا فرق ہے۔ آج کل کے مصنف اسکو مسلسل دلائل قاعدہ اسناد، حوالجات اور ذیلی حواشی کے ساتھ بیان کرتے ہیں جو اس میں شبہ نہیں کہ بہت اچھا طریقہ ہے مگر ذرا سکون اور اطمینان کے ساتھ متقدمین کے طریقہ کے متعلق بھی غور کرنا چاہیے۔ بیکن نے ہنری ہفتم کی تاریخ میں جو تقاریر شامل کی ہیں اُن کے متعلق اسپیڈنگ کہتا ہے:۔

"میری ذاتی رائے یہ ہے کہ جدید طریقہ پر لکھی ہوئی تاریخ کی نسبت قدیم طریقہ پر لکھی ہوئی تاریخ سے ناظرین کو غلط فہمی کا کم اندیشہ ہے اگرچہ مقدم الذکر طریقہ زیادہ محتاط طریقہ ہے۔ زمانۂ ماضی کی تاریخیں اس قدر نامکمل ہیں کہ ایک ذہین سے ذہین مورخ بھی انکی بناپر اُس زمانہ کی ایسی مسلسل تاریخ بیان نہیں کرسکتا جس میں تخیلات، استدلالات اور غیر مستند روایات کو دخل نہ ہو۔ بعض اوقات وہ خود اپنے قیاسات اور تخیلات سے مدد لیتا ہے اور کبھی دوسروں کے قیاسات و تخیلات سے۔ لیکن ان کا ہونا لازمی ہے۔ قدیم طریقہ میں یہ خوبی تو ہے کہ تحریفات بالکل واضح ہوتی ہیں۔ برخلاف اس کے جدید طریقہ میں ارادی اور صاف تحریف کو بُرا کہکر یہ فرض کیا جاتا ہے کہ جو کچھ پیش نظر ہے وہ خالص واقعات ہیں۔ حالانکہ اصل میں ایسے حالات مصنف خود اپنے یا دوسروں کے قیاسات بیان کرتا ہے گویا وہ خود ایک تقریر کررہا ہے"۔ (بیکن جلد ششم صفحہ ۷۷)

اس قسم کی موہوم اور من گھڑت تقاریر کو اپنی تاریخوں میں شامل کرنے سے متقدمین اور اُن کے متاخرین نقالوں کی اصلی توجیہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ اُنکے تعیمات کے بیان کرنے کا طریقہ تھا۔ انھوں نے عینی اور تمثیلی طریق کو اختیار کیا ہم آج کل مجرد اور غیر شخصی شکل میں ان ہی کو پیش کرتے ہیں اور بقول اسپیڈنگ ان کا طریقہ اتنا ہی درست ہے جتنا کہ ہمارا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قدیم قسم کس طرح جدید میں تبدیل ہوگئی۔

سترہویں صدی پوری اور اٹھارویں کے نصف اول کی تاریخ کی کمزوری اور بےچیزی اُس وقت ظاہر ہوتی ہے جب ہم اُس کا مقابلہ معصر ادب سے کرتے ہیں - فرانس میں لوئی چہاردہم اور انگلستان میں ایّن کے عہد حکومت میں کوئی مورخ پیدا نہ ہوا - بوسے کی تاریخ عالم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں - کیونکہ یہ تاریخ ہونے کے بجاے ایک لمبا چوڑا وعظ ہے - حالت یہاں تک گرگئی تھی کہ اُس زمانہ کے لوگ تاریخ کو حقیر سمجھنے لگے تھے - کیونکہ فروتر لوگوں نے فروتر نقطہ نظر (یا کسی اور نقطہ نظر) سے تاریخیں لکھنی شروع کردی تھیں - ڈاکٹر جانسن نے تو کھلم کھلا اس کا مذاق اُڑایا ہے - پھر بھی اس زمانہ میں بہت سے ماہرین علوم قدیمہ تھے - میڈکس اور ڈاکٹر انگلستان میں تو اکری اور تابلان فرانس میں اور لائبنٹز جرمنی میں - مگر تاریخ بالکل بے دست و پا تھی - ہمارے نقطہ نظر سے بھی یہ جاہلانہ اور کورانہ تھی - اول تو یہ واضح ترین واقعات کو بھی دیکھ نہ سکتی تھی اور جو کچھ دیکھتی بھی تھی اُسکو توڑ مروڑ کر بالکل مسخ کردیتی تھی - یہ حالت صرف معمولی اور فروتر درجہ کے مورخین ہی کی نہ تھی بلکہ حیرت تو یہ تھی کہ ہیوم اور رابرٹسن، گبن اور والٹیر جیسے عالی دماغ مورخ زمانۂ ماضی کو اس قدر غلط سمجھتے ہیں کہ یہ غلط فہمی بذات خود ایک دلچسپ تاریخی واقعہ بن گئی ہے - اس سے مصنفین پر کوئی دھبہ نہیں آتا بلکہ بذاتہ قابل غور ہے -

جب زمانۂ حال کے ناقدین اٹھارویں صدی کے مورخین کو قرون متوسطہ اور ازمنۂ گذشتہ کی غلط فہمی پر لعنت ملامت کرتے ہیں تو وہ اُن لوگوں کی تاریخی حالت کو نظرانداز کردیتے ہیں - اٹھارویں صدی میں تاریخ لکھنا اس سے پہلے تاریخ لکھنے سے بالکل مختلف ہوچکا تھا - یہ اختلاف مختلف حیثیتوں سے تھا - سب سے پہلے تاریخی نگاہ وا پسیں کی تطویل نے تاریخی تحقیقات کی حدود کو بہت وسیع کردیا تھا - اٹھارویں صدی کے ایک مصنف کو زمانہ گذشتہ کے تقریباً اتنے ہی حصہ پر غور کرنا پڑتا تھا جتنا کہ ہکو - ان کا یہی کام کچھ کم قابل تعریف نہیں کہ انھوں نے اس وسیع جنگل کو چھاننے کی ہمت کی اگرچہ ان کے پاس اسکے لیے کافی زاد راہ نہ ہوتا - بعض اوقات یہ نظرانداز کردیا جاتا ہے کہ متقدمین اور اٹھارویں صدی تک متاخرین ہمیشہ معصر تاریخ لکھتے تھے یا زیادہ سے زیادہ ماضی قریب کی - ہیروڈوٹس وغیرہ کی تاریخیں اس کی شاہد ہیں - معصر تاریخ میں مورخ کی اعلیٰ ترین خصوصیات آسکتی ہیں - مگر اس میں ایک بات پیدا نہیں ہوسکتی تھی اور اُنکو

اسکی ضرورت ہوتی ہے یعنی یہ کہ وہ زمانہ گذشتہ کو بنظر امعان نہیں دیکھ سکتے جو اُنسے تہذیب و تربیت، سیاسیات اور مذہب میں مختلف تھا - پھر بھی اٹھارویں صدی کے لوگوں نے اس خطرناک کام کو بڑی ہمت اور جواںمردی سے شروع کیا - اور اگر اس میں اُنکو ناکامی ہوئی تو کوئی تعجب کی بات نہیں بلکہ اس میں کامیاب ہونا معجزہ ہوتا -

آج کل ارتقا کے خیالات ہمارے دماغوں میں اس مضبوطی کے ساتھ جاگزیں ہوگئے ہیں کہ ہم سوسائٹی کو اسی رنگ میں دیکھتے ہیں - مگر یہ خیالات اٹھارویں صدی میں ناپید تھے - انکی شروعات انیسویں صدی کے اوائل میں ہوئی - لہذا ظاہر ہے کہ اٹھارویں صدی کے لوگوں کو اپنے زمانہ کے لوگوں اور سوسائٹی اور زمانہ گذشتہ کے لوگوں اور سوسائٹی میں کوئی فرق نظر نہ آتا تھا - اور اگر ان سے کہا جاتا تھا کہ وہ اُن سے مختلف تھے تو یہ اُنکو وحشی، کندہ ناتراش اور اس لیے ناقابلِ اعتنا سمجھ لیتے تھے - یہی وجہ ہے کہ وہ قرون ماضیہ کے لوگوں کا ذکر نہایت ہی حقارت سے کرتے ہیں جو ہمارے لیے بہت دلچسپ ہے - اس بات پر ہر شخص کا اتفاق تھا - ڈاکٹر جانسن کا قول تھا

"ڈیاس تھے نیس کے زمانہ کے باشندگان انتہٰی وحشی اور جانور تھے"

بعینہ یہی خیال والٹیر کا تھا - اس قسم کے خیالات ہوتے ہوے زمانۂ گذشتہ کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا ناممکن تھا - اور حق تو یہ ہے کہ اُنھوں نے اس کی کوشش بھی نہیں کی - اُنھوں نے بالاکثر اپنے زمانہ کو سب سے زیادہ قابل تحسین اور لائق احترام تسلیم کر لیا تھا - اُن کا خیال تھا کہ اُن ہی کا زمانہ محاسن اخلاق کا سرمایہ دار تھا - زمانۂ ماضی کو وہ جرم، جہالت، حماقت، اور مذہبی جوش کا مجموعہ سمجھتے تھے - چنانچہ رابرٹسن نے جنگہاے صلیبی کا ذکر اسی طرح کیا ہے - اُن کی کبھی یہ خواہش ہی نہ ہوئی کہ اصلیت کو معلوم کریں - ظاہر ہے کہ اس قسم کی تاریخ (جن معنوں میں ہم اُسکو استعمال کر رہے ہیں) لکھ ہی نہ سکتے تھے - اس پر اضافہ یہ ہوا کہ اخلاقی تعصبات نے قرون ماضیہ کا حلیہ بگاڑ دیا تھا - وہ لوگ اسی کو ترجیح دیتے رہے اور اُمید کرتے رہے کہ وہ دن سے کچھ بہتر بن جائیں گے - اُنھوں نے قرون ماضیہ کو ہمیشہ حال کے رنگ میں دکھایا - اس باب میں فرانسیسی مصنفین نے انگریزی مصنفین کو بھی مات کر دیا ہے - اُنکے لیے لوئی چہاردہم بادشاہ کا نمونہ تھا - اور اس لیے ہر ایک بادشاہ کم و بیش اُسکے مشابہ ہونے لگا -

اور ڈوپلے نے تو کمال ہی کر دیا۔ کلاوس کی رسم اصطباغ کا ذکر کرتے ہوئے وہ وحشی افرنجیوں کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے :

> یہ لوگ لمبے بالوں والے تھے۔ ان کا طریق نشست و برخاست مرعوب کن تھا۔ ان کا لباس مشک و عنبر اور عطریات میں بسا ہوا تھا، اور قدیم فرانسیسیوں کی رسم کے مطابق انکے سروں پر گھونگھر والے اور لمبے بالوں کی ایک ٹوپی تھی جس میں سے خوشبوئی لپٹیں نکل رہی تھیں :

ایک بڑے شخص اور ایک بڑے زمانہ کو (جو موجودہ زمانہ سے مختلف تھا) انھوں نے سمجھنے میں اور بھی فاش غلطیاں کی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی اور مذہبی واقعات کی ترجمانی میں دیدہ و دانستہ غلطی کی گئی ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ یہ سب کچھ نتیجہ تھا اس بات کا کہ ان میں کافی تربیت نہ تھی۔

صرف یہی تعصبات ان مورخین کے سدراہ نہ تھے۔ انکے پاس معلومات کا ذخیرہ بھی بہت کم تھا۔ سوسائٹی کے متعلق ان خیالات کا تو ذکر ہی کیا جو آج کل ہمارے ذہن میں ہیں۔ ان کے پاس ماضی کے مشاہدہ کے لیے وہ ذرائع و وسائل بھی نہ تھے جو بعد میں منکشف ہوئے۔ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ معاشیات نے تاریخ کے بعض مبہم مسائل پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ اس زمانہ کے لوگوں کے پاس یہ علم بھی نہ تھا اور اس میں یقیناً وہ بالکل بے قصور ہیں۔ ٹاسٹک جیسا طباع اور عالی دماغ شخص روم کے زوال کی ایک وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ سلطنت کی تقسیم کے وقت تمام سونا اور چاندی قسطنطنیہ چلا گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ دولت اقوام کے متعلق صحیح خیالات کی اہمیت کیا ہے۔ لیکن اُس وقت یہ قیمتی دھاتیں دولت کا ذریعہ وحید یا بڑا ذریعہ سمجھی جاتی تھیں۔ چنانچہ اس نے اسی خیال کو اپنی تاریخ میں جگہ دیدی۔ گبن نے زوال روم کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ سپاہی زرہ بکتر استعمال کرنے سے کتراتے تھے۔ وہ لکھتا ہے :-

> " سپاہی اپنے زرہ و بکتر کے وزنی ہونے کی شکایت کرتے تھے اور اسی وجہ سے اُن کو استعمال بھی بہت کم کرتے تھے۔ اسی طرح سے انھوں نے بارہا خودوں اور جوشنوں کو استعمال نہ کرنے کی اجازت حاصل کی۔ اسلاف کے وزنی اسلحہ اُنکے

کمزور ہاتھوں سے چھوٹ گئے۔ اُن کی اس بزدلانہ سستی کو سلطنت کے زوال کی ایک وجہ قرار دیا جاسکتا ہے" (باب ۲۷)

ماآن ٹسک اور گبن کی عظمت میں کون شبہ کر سکتا ہے۔ مگر یہ لوگ بھی اسی قسم کی بھول بھلیوں میں پڑ گئے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کے وقت تک "دولتِ اقوام" اور فوجی طاقت کے اصلی ذرائع معلوم نہ ہوئے تھے۔ اس قسم کی مثالوں کی کمی نہیں۔ ان لوگوں کی توجیہات ایسی ہوتی تھیں جیسے ہم زلزلہ کی توجیہ سطح زمین کو کھرچنے سے کریں۔ اُن لوگوں کو اُن طاقتوں کا خیال بھی نہ آسکتا تھا جو واقعات کے پس پردہ عمل کر رہی تھیں۔

لیکن خیالات اور علم میں بہت بڑا انقلاب ہونے والا تھا۔ اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں رومنٹک تحریک نے تاریخ، فلسفہ، سیاسیات اور مذہب سب کی قلب ماہیت کر دی۔ فرانس میں روسو کی بغاوت شدیدنے انگلستان اور جرمنی کے ادبیات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اسکی بدولت ایسے ایسے خیالات رونما ہوئے جو مروجہ خیالات سے بالکل مختلف تھے۔ آدمیوں کے مذاق و مزاج دونوں نہایت سُرعت کے ساتھ بدل گئے۔ اٹھارویں صدی کا فلسفہ جو اس وقت تک بہت بلند پایہ اور محفوظ سمجھا جاتا تھا مسترد کر دیا گیا۔ لاک، ہیوم، دیدرو اور والٹیر الگ کر دیے گئے اور ان کی جگہ دوسرے کھڑے ہوگئے۔ یہ تمام تحریک اُس وقت رجعی اور پا یان کا سلا حاصل اگرچہ کامیاب معلوم ہوتی تھی۔ مگر اسکے ظہور کی وجوہ تھیں اور فوائد بھی تھے۔ ان ہی فوائد میں وہ خدمت تھی جو اُس نے تاریخ کی کی۔ چونکہ اس تحریک کا اصول یہ تھا کہ جن اشیا کی ان کے اسلاف نے قدر کی تھی اُن کو اُنھوں نے دوبارہ زندہ کیا۔ اس طرح زمانۂ ماضی بھی قابل احترام ہوگیا۔ اور بالخصوص قرون متوسط جن کو بے فائدہ اس قدر بُرا کہا جاتا تھا۔ جس جگہ لوگوں کو سوائے وحشت، توہم اور جہالت کے کچھ اور نظر نہ آتا تھا اُنھوں نے اور اُنکی اولاد نے اُسی جگہ حسن، اتقا اور خوبی کو موجود پایا۔ اسکے بعد سر والٹر اسکاٹ نے تو اس رَو کو سمندر کی تیزی دیدی۔ قرونِ متوسط کا پھر دوبارہ اور شوقیہ مطالعہ شروع ہوگیا۔ جب لوگوں نے گیارھویں صدی کے پوپوں اور شاہنشاہوں، اُنکی رہبانیت اور اُنکے نظام الاقطاع اور مدرسیت کا مطالعہ کیا اور اُنکو اچھی طرح سمجھ گئے تو اُن کی ہمتیں اور بڑھ گئیں اور تاریخی میدان میں وہ اور ثابت قدم ہوگئے۔ غرض رفتہ رفتہ

انسان کی تمام گذشتہ زندگی قابل مطالعہ سمجھی جانے لگی۔

اس کے روش بروش علم میں بھی تغیر پیدا ہوا۔ مدت سے موجودہ دنیا کی روز افزوں دولت اور بیش از بیش صنعت و حرفت کے مسائل لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ چکے تھے۔ آدم اسمتھ نے متقدمین کے کام سے مدد لیکر ان میں اضافے کیے۔ اور معاشیات کو ایک نئی اور مثبت بنیاد پر کھڑا کر دیا۔ مگر اس کی یہ تحریک صرف اسی علم تک محدود نہ رہی۔ اصل میں اُس وقت معاشیات کی تاریخی خدمت کو پوری طرح تسلیم نہیں کیا گیا۔ زمانۂ حال کی دولت کے ذرائع کی تحقیقات سے زمانۂ گذشتہ کی حکومتوں کے ترقی اور اُن کے زوال کی توجیہ کی گئی۔ اور اس طرح عجیب و غریب نتائج حاصل ہوئے جو غیر مترقبہ ہونے کی وجہ سے نہایت محیرالعقول تھے۔ اس وقت تک دولت کو ابتذال کا باعث سمجھا جاتا تھا، اور عیش تو ہمیشہ کا بدنام ہے ہی۔ فقر اتقا کا موجب تھا۔ زمانۂ اولین کے لوگ اس وجہ سے متقی تھے کہ وہ غریب تھے۔ بہت پہنچت فلسفیوں اور عیسائی راہبوں نے دولت کو برا کہا، معاشیات نے اس شبہہ کو دور کیا۔ اُس نے دکھایا کہ حکومت کی دولت کا ایک خاص فرقہ کی امارت سے کوئی تعلق نہیں۔ کسی زمانہ میں کسی قوم کو بھی دولت کی بہتات سے گزند نہیں پہونچا۔ معدودے چند لوگوں کی امارت عوام کے فقر کی مرادف ہے۔ مختصر یہ کہ تمام خرابی تقسیم دولت کے غیر مساوی ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ اٹھارویں صدی کے شروع میں معاشیات کی یہ تمام باتیں متعید اور معمّا نظر آتی تھیں اور جیسا کہ ہونا چاہیے تھا اُس زمانہ کے مورخ ان کی اہمیت سے ناواقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ کسی حکومت کے زوال کے اسباب کی تلاش کرتے ہیں تو وہ یہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اُس نے اپنا تمام سونا اور چاندی گم کر دیا، یا یہ کہ عیاشی کا کا دور دورہ ہو گیا تھا، یا یہ کہ فوج کی جرأت و ہمت زوال پذیر ہو گئی تھی۔ اُن کو اس بات کا خیال بھی نہ آتا تھا کہ اسکی بڑی اور بعض اوقات یکلی کیلی وجہ عوام کی غربت ہے۔ آدم اسمتھ کی یہ تصنیف تمام گذشتہ واقعات پر ریویو ہے۔ جس میں معاشیات سے مدد لی گئی ہے۔ اس نے روم کے زوال کو اٹلی میں زراعت کے زوال کا معلول قرار دیا ہے۔ لکھتا ہے :۔

" لوگوں میں اناج کے مفت یا تھوڑی قیمت پر تقسیم کرنے سے ملک کے اُس حصہ کی کاشتکاری کو مزید نقصان پہونچا ہوگا جو روم کے قریب تر ہے سے قریب ہے۔ یہ اناج مفتوحہ علاقوں سے آتا تھا،

ان علاقوں میں سے اکثر محصول کی بجائے اپنی تمام پیداوار کا دسواں حصہ مقررہ قیمت پر سالانہ دیا کرتے تھے۔ اناج کی قیمت کم ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہوگا کہ روم کی منڈی میں اس اناج کی قیمت کم ہو گئی ہوگی جو لے ٹی اَم یا روم کے قدیم علاقہ سے آتا تھا اور اس طرح وہاں کی کاشتکاری کو بھی ضرور ضرر پہونچا ہوگا۔"

یہ اصلی علت تھی۔ اور جب بعد میں لوگوں نے اس پر غور کیا تو عجیب عجیب باتیں معلوم ہوئیں۔

اخلاقی اور عقلی طاقتوں کو، جو تاریخ کے متعلق نئے نئے خیالات پیدا کر رہی تھیں، انقلاب فرانساوی سے اور بھی مدد ملی۔ اس طوفان نے سوسائٹی کی تمام پس پردہ طاقتوں کو ظاہر کر دیا جو اَب تک خوابیدہ تھیں اور جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھیں۔ لوگوں نے اس قعر کے عمق کو دیکھا جو وہ بحالت جہالت طے کر چکے تھے اور انسانی سوسائٹی اور تاریخ کے متعلق ان کے خیالات میں بہت بڑی تبدیلی واقع ہوئی؛ تاریخ کو ایک نئی روشنی میں دیکھا جانے لگا۔ ۱۸۱۵ء کی صلح کے بعد تاریخی مطالعہ نہایت شدت اور وسعت کے ساتھ شروع ہوا؛ ان لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ تمام تاریخیں نظر باز دیدکی محتاج ہیں، وہ سب کی سب نئے نقطہ ہائے نظر، زیادہ علم، عمیق تر نظر اور ہمدردانہ طریق سے از سر نو لکھی جانی چاہئیے۔ اس تحریک میں فرانسیسیوں نے سابقت کی۔ اور اپنی مخصوص پُرشکوہ طرزِ تحریر کو اپنا مددگار بنایا۔ لیکن چونکہ انقلاب کو انھوں نے بہت قریب سے دیکھا تھا اور اسکے نفع و نقصان سے وہی زیادہ متأثر ہوے تھے اس لیئے اُن ہی کی آنکھیں سب سے زیادہ کھلیں۔ بازیافت کے زمانے میں ماہرین کے ایک گروہ نے تاریخ کو اتنا قابل احترام بنا دیا کہ آج تک اسکو کبھی نصیب نہ ہوا تھا۔ اگرچہ اس وقت اُنکی ان تمام خدمات کو حوالۂ نسیاں کر دیا گیا ہے کیونکہ بعد کے محققین ان پر بھی سبقت لے گئے۔ مگر اُنکی عظمت اسی سے ظاہر ہے کہ اُنھوں نے ایسے اسباب پیدا کیے کہ بعد کے لوگ اُن سے بڑھ جائیں۔ جرمن بھی فرانسیسیوں سے کسی طرح کم نہ رہے۔ انھوں نے قرون متوسطہ، یونانی، رومی، اور قرون ماضیہ کو نہایت دقت نظر کے ساتھ مطالعہ کیا اور اس تاریخ نے قسم جدید میں قدم رکھا۔

اسکے بعد تمام تاریخی میدان اچھی طرح چھان ڈالا گیا۔ رد۔ چونکہ یہ کام ایسے اشخاص نے کیا جو متقدمین سے دقت نظر اور وسعت معلومات میں کہیں بڑھکر تھا وہ اپنے کام کو اچھی طرح سمجھتے تھے اس لیے انھا دیں

صدی سے قبل کی تمام تاریخیں ہیچ ہوگئیں - البتہ گبن ایک ایسا خوش نصیب شخص ہے جو ابھی تک پوجا جا رہا ہے - قرون ما بعد کی تاریخ جرمنوں کے غیر معمولی شوق اور فطنت کی بدولت بہت زیادہ ......... دلچسپ اور نفع بخش ہوگئی ہے - بہت سے سالوں کی محنت کے بعد روم اور یونان کی تاریخوں میں سے تمام وہمی اور من گھڑت عنصر خارج کر دیا گیا - اور اسکے بعد یہ بخوبی ذہن نشین ہوگیا کہ یونانی اور رومن زندہ لوگ تھے بت نہ تھے - اور پھر ان کی سیاسیات، ادارات اور مذاہب پر مزید غور کیا گیا اور ان کو جیسے کہ وہ اصل میں تھے دیکھنے کی کوشش کی گئی - ایتھنز کی جمہوریت، اسپارٹا کی دولت اعیان، روم کے امرا اور عوام اور ان چھوٹے چھوٹے تنازعات کی ماہیت پر غور کیا گیا جن کی وجہ سے جمہوریت سلطنت سے مبدل ہوگئی - قدیم سلطنتوں کے مذہب، حکومت، اور محصول وغیرہ کی تحقیقات کے لیے نئے نئے طریقے اختیار کیے گئے جو زمانۂ گذشتہ میں ممکن نہ تھے۔

(ماخوذ)

معتضد ولی الرحمن ایم اے
پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ - حیدرآباد دکن

---

# کلام عزیز

رخصت اے صبر آس ٹوٹ گئی | کھل گیا راز بات پھوٹ گئی
غلط انداز اک ادا اٹھی | دل کی بستی تمام لوٹ گئی
نہ ملا سنگِ آستان تیرا | ہائے تقدیر میری پھوٹ گئی
اب تپ ہجر ہے رات دن مجھ کو | نا رسا آہ و نالہ چھوٹ گئی
لاکھ پردوں میں تم چھپے پھر بھی | حسن پنہاں کی بات پھوٹ گئی

نخل امید کیا پھلے گا عزیز
ایک ایک شاخ اس کی ٹوٹ گئی

# کلامِ میرؔ

اُردو زبان جب تک زندہ ہے لکھنؤ کی بندۂ احسان رہے گی کہ اُس نے الوانِ نعمت کے خوان بچھا کر دہلی کے سخنوروں کو رجھایا اور اپنے خونِ جگر کے قطروں سے ادب کی اُس وقت تواضع کی جبکہ بادشاہی شاہ عالمؔ "از دلی تا پالم" رہ گئی تھی اور تنگدستی کے باعث اُردو کے وطن میں قدرِ سخن کا کال تھا۔

"غمِ الفت" کا قحط تو مرزا غالبؔ کے عہد میں پڑا ہوگا

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ ہم نے مانا یہ کہ دلّی میں رہیں کھائینگے کیا؟

لیکن داد و دہش، ہمت افزائی، اور صلۂ کمال کا قحط بیسیوں برس پہلے سے تھا جس نے شاہجہاں آباد کے قریب کل سربرآوردہ ہنرمندوں کو لکھنؤ کا زیرِ بارِ منت ہونے پر مجبور کیا اودھ کی سرزمین قابلیت کا جوہر رکھتی تھی۔ میرؔ و سوداؔ، انشاؔ و مصحفیؔ، جراٰتؔ و میر حسنؔ کی تربیت نے اُسکو آسمان بنا دیا اور لکھنؤ کی زبان اُنکے دامنوں میں پرورش پاکر ایک ہی نسل کے بعد دہلی کی حکومت سے آزادی کا اعلان کرنے کے قابل ہو گئی۔

نظمِ اُردو کو لکھنؤ کی سا قدر نوازی کا اعتراف کرنا لازم ہے۔ لیکن یہ بھی تاریخی واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جن شعرا نے آصف الدولہ کی چھاؤنی کو زبان و محاورات کی درسگاہ بنایا اُنکی قبروں کا بھی آج وہاں نشان نہیں ملتا۔ نہ انشاؔ اور جراٰتؔ کے مرقدوں کا صحیح پتہ ہے اور نہ باور کرنے کی کوئی دلیل کہ آغا میر کی ڈیوڑھی کے اسٹیشن کے پاس گنج تمبور میں جو ایک بے نام و نشان تربت ہے وہ کسی فقیر کی ہے یا شیخ محمد تقی میرؔ کی!!

انشاؔ و جراٰتؔ نے تو زندگی میں خوب داد عیش دی تھی لیکن میرؔ کو اُنکی حیات میں بھی وہ قدر و منزلت نصیب نہیں ہوئی جو اُن کے شایانِ حرمت تھی۔ اس کی وجہ ممکن ہے کہ اُنکی نازک دماغی اور شانِ استغنا بھی ہو۔

"تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی تجھے میرؔ سمجھا ہے یاں کم کسو نے"

لیکن اس کا اصل راز اُن کے طرز کا لکھنؤ میں مقبول عام نہ ہونا تھا۔

یہاں کے ممتاز شعرا ہمیشہ میرؔ کی عظمت کا ترانہ گاتے رہے یہاں تک کہ کسی اُستاد کے کمال پر دہلی و لکھنؤ کو ایسا کامل اتفاق نہیں ہے جیسا کہ میر صاحب پر

غالبؔ اپنا تو عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ	آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

لیکن تعریف اور محبت کی سچائی کا شاہدِ عادل ممدوح کی پیروی کا شوق ہے، اور یہ گوہر لکھنؤ کی بازار میں ہمیشہ کمیاب رہا۔

میرؔ کی سیدھی سادی عبارت یہاں عامیانہ زبان سمجھی گئی اور اُن کے دلکش طرز بیان و لطیف اندازِ بندش سے مستفید ہونے کی کسی نے (الا ماشاءاللہ) کوشش نہیں کی۔ خواجہ آتشؔ کے نامور شاگرد سید محمد خاں رندؔ نے بڑا بول بولا کہ

"تیرا کلام کتنا مشابہ ہے میرؔ سے	عاشق ہیں ہم تو رندؔ اسی بول چال کے"

لیکن یہ صرف ایک شاعرانہ خیال یا زبانی جمع خرچ تھا ورنہ اُن کا بہترین کلام سوداؔ اور مصحفیؔ کے طرز پر ہے اور جب میرؔ کے کوچہ میں جانا چاہتے ہیں تو جرأت بن کر ایسی ٹھوکر کھاتے ہیں کہ چوک میں بھی نہیں بلکہ چکلہ میں جاکر گرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

ہو نہ انگشت نما شکل ہلال	جانو چندی میں جایا نہ کرو
خوش نہیں آتا اگر میرا کلام	تو غزل بھی مری گایا نہ کرو

اگر اس کلام پر میرؔ کی شباہت کا گمان ممکن ہے تو رندؔ پر صد رحمت!

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!!

میرؔ کی شاعری کا اصلی جوہر زبان کی سادگی کے ساتھ انوکھے طرز پر درد و حسرت کی مصوری تھا۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے	درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

اُن کی زندگی حسرت و حرماں کی تصویر تھی۔ جو خیالات دل میں پیدا ہوتے وہ اُنکو بیساختہ نظم کرتے تھے اور اظہارِ جذبات میں صادق البیان تھے۔ اسی حقیقت نگاری نے اُنکے سوز و گداز میں تاثیر پیدا کی اور وہ جادو جگایا کہ آج سو برس کے بعد بھی اُن کے نشتر کلیجوں کے پار ہوتے ہیں ....

اور اُن کے بیسیوں مصرعے ضرب المثل کے طور پر مستعمل ہیں ۔
لکھنؤ تصنع اور تکلف کے امراض میں گرفتار تھا ۔ وہاں ایہام اور شوکتِ الفاظ کی تلاش تھی میر کی تقلید کون کرتا ؟ نظم کو ترقی دی تو "امانت" کا سا شاعر بے ہمتا پیدا کیا اور نثر کی طرف متوجہ ہوئے تو "سرور" کو حیاتِ جاوید عطا کی !

ناسخ نے زبان میں مفید اصلاحیں کیں ۔ آتش نے غزل کا پایہ بلند کیا ۔ وزیر، صبا، خلیل رند، اور نسیم نے اپنی نازک خیالیوں اور موشگافیوں سے اصنافِ سخن کے خوشبودار گلدستے تیار کیے لیکن ان میں سے کوئی میر کی "سہل ممتنع" کا مقلد نہ تھا ۔ غرض یہ دعویٰ یقیناً صحیح ہے کہ لکھنؤ میں میر کی وہ قدر نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے ۔ اور جو دو ایک پیروانِ میر پیدا بھی ہوئے وہ مقصود تک پہنچنے سے پہلے ٹھوکریں کھا کھا کر گر پڑے ۔

حیرت ہے کہ شرفائے دہلی و لکھنؤ جو زبان بولتے تھے وہ قریب قریب یکساں تھی صرف لہجہ کا اختلاف تھا لیکن جب قلم ہاتھ میں لیتے تھے تو ایک "چار درویش" لکھتا تھا اور دوسرا "فسانۂ عجائب" ! ایک کہتا تھا کہ ہجر و فراق کی مصیبت میں

"کسی نے کہا گر کہ کچھ کھائیے کہا خیر بہتر ہے منگوائیے"

فطرت کے اصول کے مطابق اور حسبِ حال ہے ۔ دوسرا سمجھتا تھا کہ دردِ جدائی میں بھوک پیاس کا علاج آنسو پینے اور قسمیں کھانے سے ہو سکتا ہے !!

"گر تی تھی جو بھوک پیاس بس میں آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں"

فسانۂ عجائب اور گلزارِ نسیم دونوں سحر نگاری کا بہترین نمونہ ہیں ۔ ایک نے نثر میں طلسم بنایا اور دوسرے نے نظم میں جادو کیا ۔ اس مضمون کا موضوع میر کی حقیقت نگاری کی تعریف ہے نہ کہ لکھنؤ کے کمالات کا انکار !!

فسانۂ عجائب اور گلزارِ نسیم پر جس قدر اہلِ لکھنؤ ناز کرتے بجا تھا لیکن افسوس یہ ہے کہ اربابِ کمال کے حاشیہ نشیں سحرِ سامری کو معجزۂ موسیٰ سمجھنے لگے اور گو سالۂ الفاظ کی پرستش میں ایسے محو ہوئے کہ چند روز کے بعد خدائے معنی بھی فراموش ہو گیا ۔ !!!

اُردو، فارسی اور برج بھاشا کے ملنے سے بنی تھی ۔ اس لیے ان دونوں نا پاک ناقوں کے الفاظ

تو لازمی طور پر اس میں ہونا چاہیے تھے۔ فارسی نے عرب کے دامن میں اور بھاشا نے سنسکرت کے سایہ میں نشو و نما پایا تھا۔ عربی و سنسکرت کے بعض الفاظ فارسی و بھاشا میں اس طرح پیوست تھے کہ اُن کا جدا کرنا دشوار تھا۔ لہذا جب اُردو زبان وجود میں آئی تو عربی و سنسکرت کا ایک ذخیرہ بھی اُسکو ترکہ میں ملا اور نہایت شکریہ کے ساتھ قبول کیا گیا۔

اگلے شعرا نے اُن الفاظ کو جس طرح بے تکلف بولتے تھے اپنے نظم میں استعمال کیا اور کچھ عرصہ کے بعد وہ اُردو کا جزو بن گئے۔ میر تقی کی زبان بھی عربی و سنسکرت کی آمیزش سے پاک نہیں ہے لیکن غضب یہ ہوا کہ پچھلے تیس سال میں اہل لکھنؤ اور اُن کے مقلدین نے عربی کے اسقدر ثقیل لغات اپنے افسانوں اور رسالوں میں استعمال کیے اور اُس کے جواب میں اہل پنجاب نے اسقدر دشوار الفاظ سنسکرت کے اپنے اخباروں اور کتابوں میں شامل کیے کہ متوسط طبقہ کے لیے اُردو زبان لاطینی یا یونانی بن گئی۔

تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمان بولتے تو قریب قریب ایک ہی زبان تھے لیکن جب لکھتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ ایک عباس صفوی کا مصاحب ہے یا ولید بن عبد الملک کا درباری، اور دوسرا بکرماجیت کا پجاری ہے یا چندرگپت کا منتری!! علمی مضامین کے لیے اگر عربی یا سنسکرت کی اصطلاحیں لی جاتیں تو بجا و درست! کلام میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے خوبصورت الفاظ استعمال کیے جاتے تو جائز ورَوا!! فارسی اشعار یا بھاشا کے دوہوں سے نثر کو زینت دی جاتی تو سونے پہ سہاگا!! آیات قرآنی یا اقوال حکماے ہند سے بیان کی تائید کی جاتی تو چاندی کی انگوٹھی پر گجرات کا نگینہ!!! لیکن خیالی مباحث، عشقیہ فسانوں، یا سیاسی تحریروں میں بے ضرورت عربی اور سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ لانا یا فارسی کی پیچیدار اضافت در اضافت ترکیبیں صرف کرنا عرث حرکت عبث ہی نہیں بلکہ ادب کے چہرہ پر نہایت بدنما داغ تھا۔

جو خال اپنی حد سے بڑھا وہ مسَا ہوا

انجام یہ کہ ہمارے وقت میں مضمون نگاری کا مقصود صرف خوبصورت الفاظ کا جمع کرنا رہ گیا۔ فقرہ چست اور ترکیب نرالی ہونی چاہیے۔ الفاظ کے معنی ہوں یا نہ ہوں، اور جملہ از روے قواعد درست ہو یا نہ ہو۔

اکبر آباد سے ایک رسالہ شایع ہوتا ہے، جس کے قابل اڈیٹر کی شہرت نے اس پرچہ کو کافی مقبولیت عطا کر دی ہے۔ اس کے سرورق پر "مجلہ علمیہ و ادبیہ" لکھا جاتا ہے۔ "مجلہ" شاید عربی زبان کا لفظ ہو مگر اس قدر غیر مانوس ہے کہ اس کے معنی رسالہ کے "رئیس التحریر" اور "معاون مدیر" کے طبقۂ احباب کے باہر کم لوگ جانتے ہوں گے۔ اس "مجلہ" کے اکتوبر سنہ کے نمبر میں صفحہ ۱۱ پر ایک عجیب و غریب مضمون شروع ہوتا ہے جس کی سرخی ہے "میں ہوں اپنے شکست کی آواز" عنوان خوبصورت الفاظ کا مجموعہ ہے لیکن اس کا مطلب کیا ہے؟ یہ معمّا سارا مضمون پڑھنے کے بعد بھی حل نہیں ہو سکتا!! مضمون یوں شروع ہوتا ہے:۔

"نازلہ پیاری۔ تمھاری تحریر جو ایک ہی وقت میں نامۂ مودت بھی تھی اور مکتوب ماتم بھی۔ ملی۔ کاش میں تمھیں بتا سکتی کہ تمھارے اس خط نے میرے خوابیدہ جذبات کے ساتھ کیا کیا۔ ہر چند اس کا اعتراف میں خود اپنی ذات سے بھی کرنا نہ چاہتی تھی لیکن اب میرے قابو میں نہیں کہ میں اس حقیقت کو مزید عرصہ تک راز بنائے رکھوں۔ کچھ تو اس لیے کہ میں اس درد دیرینہ کو اب چھپا نہیں سکتی اور کچھ اس لیے کہ میرا یہ اقبال جرم تمھارے کرب روحی کا بھی مرہم ثابت ہوگا۔ میں اپنی حیات معاشقہ کا افسانہ آج پہلی بار دوہراتی ہوں۔ اگرچہ مشاغلِ زندگی سے فرصت اس لیے نکالنا کہ ایک مردہ و مدفونِ محبت کا ماتم کیا جائے دشوار ہے۔"

سبحان اللہ! سبحان اللہ!! کیسے پیارے الفاظ ہیں!!! مسرت کی بات ہے کہ ہندوستان کی عورتیں اب ایسی دلفریب زبان میں خط کتابت کرتی ہیں جو لکھنؤ کے دشوار پسندوں کے لیے بھی عجزانی ہے!!! اور صراح و غیاث کی امداد کے بغیر اُن عربی و فارسی الفاظ کے معانی معلوم نہیں ہو سکتے جو ان تعلیم یافتہ مستورات کے روزمرہ میں داخل ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

(۱) "لبوں میں التہاب عقیق کو گویا دیکھا اور آنکھوں میں شباب کو متموج۔"
(۲) "اپنے اندر ایک شعلہ کا التہاب لرزاں محسوس کیا جس کا مقتضا یکسر اغراق و محویت تھا۔"
(۳) "ایک لمس سے اُس کی آنکھیں مشعلِ نیم شبی کی طرح روشن ہو گئیں۔"
(۴) "آن واحد میں میرے اندر کی دیویت نے اُسے ایک دیوتا بنا لیا۔"

"ڈویت" معلوم نہیں ڈیو سے بنا ہے یا ڈیوی سے ۔ ظاہرا جرمنی یا روسی زبان کا لفظ ہے !!
بدقسمتی سے اہل ہند کو انگریزی کی تعلیم اس قدر مہلت نہیں دیتی کہ یورپ کے کُل ملکوں کی زبانیں سیکھی جائیں اس لیے یہ رسالہ طاق پر رکھیے اور جدید ترین نمونہ گلابی اُردو کا ملاحظہ فرمائیے ۔

اگست ۱۹۴۳ء سے ایک رسالہ "دارالنشوء" علیگڑھ سے جاری ہوا ہے ۔ اور اُسکے سرورق پر بھی "مجلۂ ادبیہ" کا دعد گرجتا ہے ۔ اسکے پہلے نمبر میں صفحۂ ۱۴ پر یہ مضمون ہے :-

"بیداریِ حُسن"

"جھٹ پُٹے کے وقت ایک دوشیزۂ کشیدہ قامت اپنے حُسن نوبہار کی تمام قمرزائیوں اور تبسم جلوہ زار کی ہمہ ہلال آفرینیوں کو لیے ہوئے ایک سفید ساری میں لپٹی ہوئی مکان کی چھت پر شانہ بزلف تھی ۔ ۔ راتیں پیدا ہو ہو کر مٹ رہی تھیں ۔ جبینیں طلوع ہو ہو کر چھپ رہی تھیں پورنماشی کا چاند اس بدر فسوانی کو دیکھ کر خجالت کی ہنسی ہنسا ۔ چاندنی کبھی اتنی پُر رونق نظر نہ آئی تھی ۔
چندر کنول کے عنفوان جگریز و تابش یاسمن افشاں پر جب چاندنی کے پھول اس طرح نچھاور ہو رہے تھے ..............."

"قمرزائیاں" اور "ہمہ ہلال آفرینیاں" ممکن ہے کہ کوئی پہیلی ہو، چاند کی "خجالت سے چاندنی کا "پُر رونق" نظر آنا شاید کوئی چیستاں ہو، لیکن یہ "جگریز" اور "تابش یاسمن افشاں" تو یاجوج ماجوج کی زبان معلوم ہوتی ہے !! اناللہ وانا الیہ راجعون ۔
یہ مسلمانوں کے کارنامے تھے ۔ اب ہندوؤں کا جواب سُنیے ۔ اینجاست کہ آفتاب تیز تر است ۔

(۱)

"دوِیش اگنی جلد بجھاؤ ۔ دوِیش کی آگ زبردست آگ ہے ۔ اس دوِیش اگنی نے کئی قوموں کا ستیاناش کر دیا ..........."

(۲)

"گو دو عنان ہو نشل اور راگ کا ایک حیرت بخش نظارہ ۔ شری گوروناٹک دیو جی پردہ اٹھا

کو پہونچ چکے ہیں۔ انکے لیے شردھا کا بھاؤ ملک کے مختلف حصوں میں پھیل چکا ہے۔ صوبہ بھر کے نامی گرامی فقیر ان کی مہما کا گیت گاتے ہیں۔ کثرت سے دولتمند لوگ اُن کا سنمان کرتے ہیں۔ سیکڑوں لوگ ان کے شری چرنوں میں اپنی بھگتی اور پوجا کے پھول چڑھاتے ہیں۔

...............

صور پھونک گیا اور قیامت آگئی !!!

آنکھیں کہیں کہ دل نے ہمکو کیا خراب — دل یہ کہے کہ آنکھوں نے ہمکو ڈبا دیا
جھگڑا کسی کا کچھ نہیں ہے درد عشق میں — دونوں کی ضد نے خاک میں ہمکو ملا دیا

ایک مقدس دانشمند کا قول ہے کہ رہبر کامل اپنے مقلدین کی سیہ کاری کا جواب دہ ہے۔ نیز اُردو کی موجودہ تباہی کا وبال لکھنؤ پر پڑے گا جس نے پہلی مرتبہ زبان اردو کو عبارت کی سادگی ترک کرنے اور شوکت الفاظ کی طرف اس حد تک متوجہ ہونے کا سبق پڑھایا کہ مضمون کا چیستاں بنانا جائز، مگر عامیانہ زبان کا استعمال گناہ!! اگر بچپن میں سادگی اور سچائی کی تعلیم دی ہوتی تو آج عنفوان شباب پر یہ "قہر زبان" کیونکر ظہور میں آتیں؟

ہزار احسان "انجمن ترقی اُردو" کا کہ اس نے "مجلۂ ادبیہ" اور "درویش اگنی" کے دور میں میر تقی کا منتخب کلام شایع کرنے کی ہمت کی اور بگڑے ہوئے مذاق کو "معلم اول" کی بیاض دکھا کر سدھارنا اور سیدھے رستہ پر لگانا چاہا۔ ہماری نئی تعلیم یافتہ جماعت غالب اور اقبال کی قدر شناس ہے لیکن کلیات میر سے قطعاً نا آشنا ہے۔ جواب یہ دیا جاتا ہے کہ میر کے اشعار میں متروک الفاظ اور قدیم محاورے شامل ہیں۔ اُنکی فارسی آمیز ترکیبیں بھونڈی ہیں۔ اور اُس کی صرف ونحو اس قدر تبدیل ہوگئی ہے کہ اب میر کے کلام سے کوئی لطف نہیں حاصل کیا جا سکتا۔ واقعی میر نے "مجلہ" اور "جگر ریز" کے سے خوبصورت الفاظ "یہ ہلال آفرینوں" کی سی دلکش ترکیب استعمال نہیں کی اور اُردو کی جدید نثر کو میر کے کلام سے وہی نسبت ہے جو شاہ قاچار کے سفرنامہ سے گلستاں کو، یا (بے تشبیہ) کشف الغطا عن فنون الادبا سے قرآن کو! لیکن کسی شایستہ قوم نے اپنی زبان کے ابتدائی خزانوں کو اس عذر سے برباد نہیں کیا کہ قدیم زبان سمجھنا دشوار ہے۔

ایران اس وقت تک رودکی کی پرستش کرتا ہے۔ عرب ایام جاہلیت کے "سبعۂ معلقہ" درس میں شامل کرتا ہے۔ انگلستان چاسر اور اسپنسر کے کلام سے آشنائی پیدا کیے بغیر تعلیم کو ناقص قرار دیتا ہے۔ ہندوستان کالی داس کا شیدائی ہے اور یونان ہومر کا فدائی۔ کیا معقول وجہ ہوسکتی ہے کہ میر کا کلیات اس بنیاد پر فراموش کیا جائے کہ وہ کبھی کبھی "ٹک" اور "کسو" کا استعمال کرتا ہے، یا اُسکے بعض محاوروں سے ملک نا آشنا ہو گیا ہے۔ لطف سخن ہو تو اسکی پرانی بول چال پر آج کل کی ہزاروں "قمرزائیاں" قربان کرنے کے قابل ہیں۔

بیشک میر کے کلیات اور نیز تمام ہندی شعرا کے دواوین میں رطب و یابس شامل ہے، اور اس لیے مناسب ہے کہ اُنکے کلیات کا انتخاب مرتب کیا جائے جو ایسا جامع ہو کہ اصل کے مطالعے سے بے نیاز کردے۔

شکر ہے کہ میر مغفور کے مردہ دیوان پر انجمن ترقی اُردو نے آب حیات کے قطرے ٹپکائے اور مولوی عبدالحق صاحب بی اے نے "انتخاب کلام میر" کو شائع کیا۔

خدا کرے کہ سودا، انشا، درد، مصحفی، اور جرأت کا انتخاب بھی شائع کرنے کی اسکو توفیق ہو۔ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔

ایک زمانہ میں مشہور تھا کہ میر صاحب کے کلام میں بہتر نشتر، اور مرزا رفیع سودا کے کلام میں بہتر خنجر ہیں۔ شروع شروع میں تو "بہتر" کا لفظ غالباً "بہت" کی جگہ بولا گیا تھا اور نشتر و خنجر کے پردہ میں میر و مرزا کے کلام کا ایک نازک امتیاز بیان کرنا مقصود تھا، مگر چند روز کے بعد میر کے بہترین اشعار بہتر ہی تک محدود سمجھے جانے لگے اور بعض بذلہ سنجوں نے میر کے بہتر نشتر اور سودا کے بہتر خنجر مرتب بھی کیے۔ مرزا کی بابت بحث کرنے کا تو یہاں موقع نہیں لیکن میر کے نشتروں کو بہتر تک محدود کرنا صریح ظلم تھا جسکی تردید "انتخاب کلام میر" سے بخوبی ہو سکتی ہے کیونکہ اس میں تقریباً دو ہزار اشعار ہیں۔ اور ہر ایک شعر کسی خاص وصف سے ممتاز ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب نے میر کی مثنویوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ حالانکہ یقیناً میر اُردو زبان میں طویل مثنویوں کا موجد تھا۔ اور اُنکے بعض اشعار جو اس وقت تک زبان زد خاص و عام ہیں اپنے انتخاب میں شامل نہیں کیے ورنہ نشتروں کی تعداد میں اور بھی اضافہ

ہو جاتا۔

درد و حسرت کا بیان میر صاحب کی زبان سے نشتر کی خاصیت رکھتا ہے۔ اگر اس انتخاب سے صرف اسی مضمون کے اشعار چھانٹے جائیں تو کتنے ہی بہتر نکلیں گے۔ سادگی عبارت، درد، اور تاثیر میر کے کلام کے تین آبدار جوہر ہیں۔ ان موتیوں سے بہتر دانہ کا ایک ہار گوندھکر بطور مشتے نمونہ از خروارے اس مضمون کا جزو کیا جاتا ہے[a] جس سے ثابت ہوگا کہ میر کا کلام اس وقت بھی عام فہم ہے اور "کلیاتِ میر" نہیں تو "انتخاب کلام میر" سے زمانۂ حال کے ادیبوں کو سبق لینا چاہیے۔

انتخاب کے ساتھ مولوی عبدالحق صاحب نے ایک بسیط مقدمہ بھی شامل کیا ہے اور میر کی زندگی کے بعض حالات بغیر تعین سنہ ولادت و وفات کے لکھ کر اُنکے کلام پر تبصرہ کیا ہے۔ انشاپردازی اور دیباچہ نگاری میں مولوی صاحب شہرتِ عام حاصل کر چکے ہیں۔ اُنکے مقدمہ کا کیا کہنا۔ بقول غالب مرحوم' دیوان معشوق ہے تو مقدمہ اُس کا گھنا! لیکن تعجب ہے کہ اُنھوں نے مقبولیت میں میر صاحب کو سعدی سے مشابہت دی۔ لکھتے ہیں:۔

"میر تقی سرتاج شعرائے اُردو ہیں۔ اُن کا کلام اُسی ذوق و شوق سے پڑھا جائیگا جیسے سعدی کا کلام فارسی زبان میں"

زمانۂ ماضی میں سخن فہموں نے میر کا کلام ذوق سے پڑھا مُسَلَّم، زمانۂ مستقبل میں ان کا کلام پڑھا جائےگا، خدا ہمچنیں کند۔ لیکن زمانۂ حال میں تو اہل ہند کو کلام میر سے بہت ہی کم دلچسپی ہے اور اسی محسن کُشی نے ادب اُردو کی وہ شرمناک حالت بنا دی ہے جس کا تفصیل سے اوپر اظہار کیا گیا۔

علاوہ اسکے ایران نے تین چار سو برس کی عرقریزی اور جاں کاہی کے بعد فردوسی و سعدی پیدا کیے تھے۔ نظم اُردو جامۂ حیات پہنتے ہی میر تقی کو سعدی کا سا جامع کمالات کیونکر جنا سکتی تھی اور اُس کے کلام کے لیے سعدی کی طرح حیاتِ جاویدکی کیونکر توقع ہو سکتی تھی؟ فردوسی تو غالباً اُردو زبان کو نصیب ہی نہ ہوگا کیونکہ رزم کا چراغ ہندوستانیوں کے لیے مدت سے ٹھنڈا ہو چکا ہے۔ البتہ سعدی ممکن ہے کہ دو سو برس کے بعد پیدا ہو بشرطیکہ المتابعت

[a] یہ ہار آیندہ نمبر میں ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جائےگا۔ اس دفعہ گنجایش نہیں۔ ایڈیٹر

اور "شش انورانگ" کے مہلک امراض سے یہ زبان جانبر ہوا اور قِران السعدین کے بُرج سے زندہ و سلامت نکلے۔

میر تقی کو سعدی کے مقابل لانا ویسا ہی تھا جیسا نذیر شاد کا میر کو منہ چڑھانا! اگر میر کو رودکی سے مشابہت دی جاتی تو بیشک درست تھا۔ جس طرح میر کی عظمت کا یوں اعتراف کیا جاتا ہے

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب ۔۔۔ ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

اسی طرح رودکی کے سامنے یوں سرِ تسلیم خم ہوتا ہے کہ

غزل رودکی وار نیکو بود ۔۔۔ غزلہاے من رودکی وار نیست

صاحب مقدمہ سے ایک اور شکایت ہے۔ صفحہ ۲۶ پر تحریر فرماتے ہیں:-

"اُن بے تہوں کو جنھیں اتفاق سے ہلدی کی گرہ ہاتھ لگ جاتی ہے اور پنساری بن بیٹھتے ہیں میر کی زندگی کا مطالعہ غور سے کرنا چاہیے۔"

"بے تہوں" پر نوٹ ہے:-

"بے تہ۔ یہ خاص میر صاحب کا لفظ ہے۔ اُنھوں نے اسے کم مایہ کے معنوں میں استعمال کیا ہے آج کل سطحی کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو ایک انگریزی لفظ کا ترجمہ ہے اور بے تہ کے مقابلہ میں بہت بھونڈا اور ثقیل ہے۔ یہ لفظ استعمال کرنے اور رواج دینے کے قابل ہے۔"

"ہلدی کی گرہ" اور "پنساری کی دوکان" مقدمہ کی شان متانت سے بہت گری ہوئی ہے۔ اگر محض لفظ "بے تہ" کو رواج دینے کے لیے ان مسالوں کی ضرورت تھی تو نہایت مفید خدمت ملک اور زبان کی ہوتی اگر میر کے تمام مصطلحات کی ایک فرہنگ مرتب کر کے مقدمہ کے ساتھ شامل کر دی جاتی جس سے قدیم اور جدید زبان کا فرق معلوم ہوتا۔ کلام میر سے لطف اُٹھانے میں آسانی ہوتی اور اُردو کے جدید شعراء جو خوبصورت الفاظ کی تلاش میں سرگرداں رہا کرتے ہیں اُس فہرست سے زیادہ غیر مانوس الفاظ منتخب کر کے اپنے "مجلّہ" کو زینت دیا کرتے۔

کفر ست در طریقت ما کینہ داشتن ۔۔۔ آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

# مختصر تاریخ جاوہ وملحقات

سنسکرت میں جاوہ کا نام یاوہ دویپا (Jawa Dwipa) ہے۔ بعض کہانیوں میں اس کا نام دولت سے بھری زمین بھی پایا گیا ہے۔ عرب تاجروں نے ان جزائر کا نام "ذابج" (Zabaedj) رکھا۔ یعنی سونے کی زمین۔

پرانے کتبوں سے پتہ لگتا ہے کہ یہ سرزمین ایک زمانہ میں دولت سے بھری ہوئی تھی۔ اور یہاں ہر طرح کی کانیں موجود تھیں۔ چنانچہ پرتگیزوں نے بھی ان کا نام سونے کے جزائر رکھا۔ ٹالمی (PTolemy) مشہور یونانی مورخ نے ان جزائر کو بہترین جزائر لکھا ہے۔ اور یہاں کے باشندوں کو متمدن ترین اقوام عالم بیان کیا ہے۔

ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں یہ علاقہ تمدن میں اعلیٰ ترقی کر چکا ہے۔ لیکن یہ تہذیب کہاں سے آئی تھی؟ اس کا پتہ لگانا کوئی آسان کام نہیں۔ یہاں کے باشندوں کی تو کی روایات جن سے تاریخ میں بہت کچھ امداد لی جا سکتی ہے بہت ہی خراب حالت میں ہیں۔ چونکہ باعتبار تقسیم جنسیت یہ جزائر منگول اور ایرین کی مخلوط النسل جنس سے آباد ہیں اور منگولین اقوام کی مرکزی سلطنت چین ہی رہی ہے اس لیے قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانہ میں یہ جزائر بھی چین کے ماتحت ہوں۔ یہ کہ یہ جزائر ایک وقت مہذب ترین ممالک میں شمار کیے جاتے تھے۔ جاوہ اور سماترہ (جسے جاوہ کچیل یعنی جاوہ خورد بھی کہا جاتا ہے) میں اسکے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ ریفلز (Raffles) لکھتا ہے کہ ان لوگوں نے قدیم زمانہ میں مصر سے تمدن حاصل کیا۔ فیبل (Fable) کا خیال بھی قریب قریب یہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بحر احمر کے راستہ سے یہاں تہذیب آئی۔ کچھ تعجب نہیں کہ قدیم مصریوں نے بحر احمر کے راستہ سے ان جزائر میں آمد و رفت شروع کی ہو۔ اور وہی ان لوگوں کے تمدن کے ذمہ دار ہوں۔

قدیم دیسی تحریروں سے پتہ لگتا ہے کہ ۷۵ء میں ایک شخص اجی ساکا (Aji Saka)

نامی جسکو استینا (Astina) کے زیر دست شہزادہ کا وزیر بیان کیا جاتا ہے اس ملک میں آیا اور اسی کے باعث ان جزائر میں تہذیب پھیلی - بعض کہتے ہیں کہ یہ شخص وزیر نہیں بلکہ شہزادہ تھا - ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ ولی تھا اور پانی اور پہاڑوں کے اوپر سے اُڑکر آیا تھا۔ لیکن سب کا اس پر اتفاق ہے کہ اس شخص کے ذریعہ سے جادی طرز تحریر کی بنیاد پڑی۔ سلطنت کی باضابطہ ابتدا ہوئی اور بدھ مذہب جاری ہوا - اسکے زمانہ کے قوانین عام طور پر سنہ ۹ء تک اور ماجاپاہت (Majapahat) میں سنہ ۱۵ء تک استعمال ہوتے رہے - اجی ساکا کے وجود سے قبل ان لوگوں میں کوئی خاص مذہب نہ تھا - صرف قدیم دستور کے مطابق بعض قبائل نے اپنے لیے کوئی خاص چیز عبادت کے لیے مقرر کر رکھی تھی - مثلاً چاند سورج آگ پانی درخت وغیرہ - اسی طرح اُس زمانہ میں کوئی سلطنت بھی نہ تھی صرف فطرتی قاعدہ کے مطابق سب سے بڑی عمر والے کے سامنے سر تسلیم خم کیا جاتا تھا -

چونکہ یہ جزائر ہندوستان ہی کا ایک جزو ہیں اس لیے اگر مصری تہذیب بھی اس طرف آئی تو ہندوستان ہی کے راستہ سے آئی ہوگی - اگرچہ اس دعوے کا کوئی ثبوت دینا مشکل ہے کیونکہ بالکل ممکن ہے کہ مصریوں نے سواحل ہند کے چھوئے بغیر اپنے آپ کو ان جزائر میں پہونچایا ہو - گو یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ سب سے اول ان جزائر میں مصری تمدن پہونچا - لیکن اس تمدن کے ساتھ کوئی مذہب نہ آیا - مصری تمدن کے لیے کوئی صحیح زمانہ مقرر کرنا مشکل ہے - ہاں اتنا کہا جا سکتا ہے کہ مصری تمدن کے عروج کے زمانہ کا یہ واقعہ ہوگا - جب مصری تمدن کو ضعف پہونچا تو قدرتاً ان جزائر میں اس کا اثر کم ہوا - اور یہی وہ زمانہ تھا جب اجی ساکا کا ان جزائر میں پہونچنا بیان کیا جاتا ہے - اس شخص کے آنے کے متعلق ذرا غور سے کام لینے کی ضرورت ہے - ان جزائر کے باشندے سب منگولین ہیں - یا یوں کہو کہ اُسی نسل سے ہیں جس نسل سے چینی اور جاپانی ہیں - اس لیے قدرتاً یہ لوگ شاہ چین کو اپنا رئیس سمجھتے ہونگے - انکے ہاں مشہور ہے کہ اجی ساکا استینا سے آیا - استینا کے نام کا کوئی شہر یا ملک موجود نہیں - لیکن ملایو زبان میں ایوان شاہی کو "استانہ" کہا جاتا ہے - اس لیے بالکل ممکن ہے کہ یہ شخص چین کے دربار سے اس علاقہ میں گورنر ہو کر آیا ہو - اور چونکہ شہنشاہ کی طرف سے آیا تھا، مشہور ہوا کہ استانہ سے آیا ہے - اس قسم کے قائم مقام چین کی طرف سے تمت

برھما وغیرہ میں بھی بھیجے جاتے تھے۔ اجی ساکا اگرچہ چینی نام نہیں ہو سکتا، لیکن یہ نام جاپانی ضرور معلوم ہوتا ہے۔ اور چونکہ اُس زمانہ میں چین اور جاپان ایک ہی تھے کچھ تعجب نہیں کہ یہ شخص در اصل جاپانی نسل سے ہو۔ یا یہ کہ چینی نام توڑ مروڑ کر ایسا ہو گیا ہو۔ بہرحال اجی ساکا کے آنے سے ۷۸ء میں یہاں سلطنت اور مذہب کی بنیاد پڑی۔ اور یہی شخص جاوی رسم الخط کا بانی ہے۔ چونکہ یہ شخص امور سلطنت سے واقف بلکہ اُس میں کامل تھا اس لیے یہ بھی ایک دلیل ہے کہ یہ شخص چین کے دربار سے یہاں آیا ہو۔ چنانچہ اسکے بنائے ہوئے قواعد اور قانون ہزار بارہ سو سال تک بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اسلام کے ان جزائر میں داخل ہونے تک مستعمل رہے۔ مذہب جو یہ شخص اپنے ہمراہ لایا بُدھ مت تھا۔ اور یہ پہلا مذہب ہے جو اُن جزائر میں پھیلا۔ جس کی تقویت ایک بدھ راہب فاہیان (Fahian) سے ہوئی۔ جو ۴۱۴ء میں چین سے جاوہ آیا اور بدھ مذہب کی اشاعت کا عام طور پر سبب بنا۔ اجی ساکا کے بعد پھر یہاں کی تاریخ پردۂ کتمان میں ہو جاتی ہے۔ اور کئی سو سال تک کچھ پتا نہیں چلتا۔ یہاں تک کہ ہندو مذہب کی ابتدا ان جزائر میں ہوئی۔ ڈاکٹر براندس (Dr. Brands) کا خیال ہے کہ [illegible] میں ہندو مذہب کی ابتدا ان جزائر میں ہوئی۔ لیکن مشہور ڈچ مورخ فان درلیٹس (P.m. Vonder lilts) لکھتا ہے کہ ان جزائر میں ہندو مذہب اس سے قبل آ چکا تھا۔ بہرحال ماننا پڑے گا کہ آٹھویں صدی میں رفتہ رفتہ ہندو مذہب نے اپنا اثر جما لیا تھا۔ لیکن ہندو مذہب بُدھ مت کو مٹا نہ سکا۔ بلکہ ان دونوں کے ملاپ سے ایک مخلوط مذہب کی بنا پڑ گئی۔ چنانچہ یہاں کے مندروں اور آثار قدیمہ میں ہر جگہ بدھ کی تصاویر کے ساتھ ساتھ کرشنا، سیوا اور گنپتی وغیرہ کی مورتیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ صرف جزیرہ بالی ہندو مذہب و تہذیب کا مرکز رہا اور وہاں سے بُدھ مت کا اثر تقریباً جاتا رہا۔ باقی ہر جگہ مخلوط مذہب رہا۔

جاوہ میں ہندوؤں کی تین مشہور سلطنتیں گذری ہیں (۱) پاجاجاران (Paja Jaran) مشرقی جاوہ میں ایک قوی سلطنت تھی۔ جس کا دارالخلافہ پاگور (بیوٹن زرگ) کے قریب کسی جگہ تھا۔ یہ سلطنت ۱۱۰۰ء سے ۱۵۲۶ء تک رہی۔ اس سلطنت میں ایک لاکھ جرار فوج ہر وقت تیار رہتی تھی لیکن آخر میں اسلام کے زور پکڑنے کے سبب سے یہ نیست و نابود ہو گئی۔ (۲) ماجاپاہٹ (maja pahat) کا دارالخلافہ سورابایا کے قریب کسی جگہ بیان کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس سلطنت

کی ابتدا میں سخت اختلاف ہے - لیکن یہ سلطنت سنہ ۱۲۹۳ء اور سنہ ۱۳۲۷ء کے درمیان میں کسی وقت پیدا ہوئی - اور اس کا خاتمہ سنہ ۱۵۱۵ء سے سنہ ۱۵۲۵ء تک ہوا - (۳) ڈیماک (Damak) کی سلطنت کا دارالخلافہ کارنگ کے قریب بیان کیا جاتا ہے - اس سلطنت کی ابتدا کا کوئی پتہ نہیں ملتا - لیکن سنہ ۱۴۷۵ء میں یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ شامل ہوگئے - جو اس زمانہ میں سواحل پر قابض ہوچکے تھے - اور بعد میں یہ سب لوگ مسلمان ہوگئے - ان کے علاوہ اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں جو ان سلطنتوں کی ماتحت تھیں اور اُنکے ساتھ ہی ختم ہوگئیں -

اسلام کی ابتدا تیرھویں صدی کے اندر ان جزائر میں ہوئی اور تقریباً سو سال کے زمانہ میں کئی اسلامی ریاستیں قائم ہوگئیں - صرف جاوہ میں سات مشہور اسلامی سلطنتیں تھیں (۱) ڈیماک (Demak) (۲) پاجانگ (Pajang) (ماتارام - جلجا) (۳) گریسی (grime) (۴) قدیری (Kediri) (۵) چریبون (cheribon) (۶) جکارتا (jakarta) (۷) بنٹام (Bantam) - پاجانگ (ماتارام - جلجا) کا بادشاہ سوسوہونان (Soosoo-hainam) یعنی شہنشاہ کہلاتا تھا -

سنہ ۱۵۱۰ء سے پرتگیزوں نے اس طرف اپنا رسوخ جمانا شروع کیا لیکن کامیاب نہ ہوسکے پھر سنہ ۱۵۲۲ء یا ۱۵۲۱ء میں اُن کا دوسرا مشن اس طرف آیا - جسے صرف اتنی کامیابی ہوئی کہ ان جزائر میں اپنے تجارتی تعلقات قائم کیے وہ بھی اس طرح پر کہ چونکہ مسلمانوں کا زور تھا - ایک نامسلمان راجہ نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ پرتگیزوں کے ساتھ دوستی کے تعلقات قائم کرے اور اس طرح پر مسلمانوں کی تعدی سے امن میں رہے - چنانچہ پرتگیز تاجروں نے اس کی خواہش کے مطابق اسکے لیے ایک قلعہ بھی تعمیر کیا - جسکے معاوضہ میں راجہ نے اُن کے لیے سالانہ ایک ہزار بوری سیاہ مرچوں کی مقرر کی -

لیکن اُس زمانہ میں مسلمانوں کی سطوت روز روز بڑھ رہی تھی - اور اگرچہ ہر طرح کی تدابیر ان کے مقابلہ میں کی گئیں - کسی کی کچھ پیش نہ گئی - اسی زمانہ کے قریب ڈچ لوگوں نے ان جزائر کا پتہ لگایا اور پرتگیزوں اور ڈچوں کے آپس میں لڑائیاں بھی ہوتی رہیں - جن میں کبھی ایک اور کبھی دوسرا کامیاب ہوتا رہا جس کی تفصیل بہت طولانی ہوگی -

آخر زمانہ نے پلٹا کھایا۔ مسلمانوں کو زوال شروع ہوا۔ اور ڈچوں کی حکومت کی ۱۶۱۰ء میں باضابطہ ابتدا ہوئی۔ ڈچوں نے ۱۶۱۹ء میں بٹاویہ شہر کی بنیاد ڈالی۔ روز بروز اُن کی سلطنت کو استحکام ہوتا گیا۔ لیکن اطمینان کامل نہ رہا۔ ۱۸۱۱ء سے ۱۸۱۶ء تک جاوہ انگریزوں کے قبضہ میں رہا لیکن آخر میں انکو بھی یہاں سے جانا پڑا۔ اس پانچ سال کے عرصہ کو چھوڑ کر باقی ۱۶۱۰ء سے آج تک دراصل ڈچ ہی اس سرزمین کے مالک ہیں۔ اب انکی یہ نوآبادی بہت وسیع ہوگئی ہے اور دُور دُور کے جزائر تک ان کے قبضہ مین آگئے ہین۔ صرف **تیمور (Timor)** کے دور دراز جزیرہ کے نصف حصہ پر ابھی تک پرتگیز قابض ہیں۔

چونکہ اُس زمانہ مین ہالینڈ فرانس کے زیر اثر تھا اور فرانسیسیون اور انگریزون مین لڑائی تھی اس سبب

جاوہ اور اُسکے ملحقات میں اسوقت کوئی مستقل اسلامی سلطنت موجود نہیں اور جو ہیں وہ سب ڈچوں کے ماتحت ہیں۔

۱۹۰۵ء سے ڈچوں نے زمانہ کے اقتضا کو دیکھ کر اپنے طرز حکومت میں تبدیلی شروع کی ہے جسے ایک طرح پر جاوہ میں سلف گورنمنٹ کی ابتدا سمجھنی چاہیے۔ اس وقت تک ۱۶ مختلف مقامات میں لوکل کونسلیں قائم ہیں۔ اور سرکاری آمدنی کا ایک حصہ انکے ہاتھوں میں دیا جاتا ہے۔

## جاوہ اور اُسکے ملحقات میں اسلام

اسلام کیونکر ان ممالک میں آیا اور اسکی ابتدا کس سنہ میں ہوئی؟ ان دونوں باتوں میں بیحد اختلاف پایا جاتا ہے۔ عوام میں جیسا کہ ہر جگہ دستور ہے یہاں بھی اسلام کی اشاعت کے متعلق عجیب عجیب کہانیاں مشہور ہیں (۱) کسی ہندو راجہ نے کسی مسلمان کو نماز پڑھتے دیکھا اور ایمان لایا (۲) کسی راجہ کو اُسکے نجومی نے اطلاع دی کہ اگر وہ مسلمان نہ ہوگا تو اُسکا ملک برباد ہو جائے گا۔ (۳) کسی مسلمان درویش کے سبب سے اسلام پھیلا

(۴) ایک مقدس مسلمان عورت ان ممالک میں اسلام پھیلانے کا سبب ہوئی (۵) کسی راجہ کو خواب میں ہدایت ہوئی کہ وہ اسلام قبول کرے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ عربوں کا دعوے ہے کہ اسلام ان جزائر میں اُنکے ذریعہ سے آیا۔ بعض مورخوں کا دعوے ہے کہ ان جزائر میں اسلام ایرانی مسلمانوں کے ذریعہ سے پھیلا۔ نئی تحقیقات والے بعض نئے مورخ بڑے زور سے کہتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اس طرف اسلام پھیلایا۔ ایک مغربی صاحب

نے مجھ سے کہا کہ مغربیوں کے واسطہ سے اسلام اس طرف آیا - یہ آخری دعویٰ صرف دعویٰ ہی دعویٰ نظر آتا ہے اور کوئی قابل التفات دلیل اس بارے میں پیش نہیں کیجاتی - تمام مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ اسلام کی ابتدا ان جزائر میں جن لوگوں سے ہوئی وہ خلیج فارس سے آئے ہوئے تاجر تھے اور یہی مغالطہ ہے جو بعض مورخوں کو ان لوگوں کے ایرانی ہونے کے متعلق ہوا - دراصل سب سے اول عرب تاجر جو بصرہ اور بغداد کے اطراف کے رہنے والے تھے - اس طرف آئے اور پہلے ملاکا اور پھر ساترہ میں تجارت کرتے رہے - اور یہی لوگ اسلام کی اشاعت کے بانی قرار دیے جاسکتے ہیں - چونکہ یہ لوگ خلیج فارس سے آئے تھے اور ان کے اور ایرانیوں کے لباس بھی یکساں ہوتے ہیں - بعض مورخوں نے ان کو ایرانی الاصل سمجھا - نیز چونکہ ان کا راستہ بحر ہند ہی سے تھا اور کچھ تعجب نہیں کہ ہندوستان کے بعض شہروں خاص کر سورت سے ہوکر یہ لوگ اس طرف آتے رہے ہوں بعض مورخوں کا خیال ہوا کہ ہندوستان ہی سے یہاں اسلام آیا - ان لوگوں کے پاس اپنے دعوے کے اثبات کی دلیل یہ ہے کہ " ایک زمانہ میں سورت کے بعض حکمرانوں کے تعلقات جاوہ کے بعض سلاطین کے ساتھ پائے جاتے ہیں - اور دیکھنے میں آتا ہے کہ اس طرف پرانے سلاطین کی قبروں کے پتھر اور کتبہ بالکل اسی قسم کے ہیں جیسے کہ ہندوستان کے مقابر میں ہیں " لیکن نظر تعمق سے دیکھا جائے تو یہ کوئی زبردست دلیل نہیں - کیونکہ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسلام کی ابتدا یہاں ہندوستان کے مسلمانوں سے ہوئی - کیونکہ زیادہ سے زیادہ یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ جب ان جزائر میں اسلامی ریاستیں قائم ہوگئیں تو ان لوگوں نے ہندی رئیسوں کے ساتھ اپنے تعلقات قائم کیے بلکہ رشتہ داریاں بھی کیں - اور نہ صرف یہ کہ قدرتاً انسان اپنے ہمسایہ سے ایسے تعلقات قائم کرتا ہے بلکہ ان جزائر کے تعلقات اسلام پھیلنے سے بہت قبل ہندوستان سے تھے - اور اس ذریعہ سے یہاں کے مسلمان رئیسوں نے وہاں کے مسلمانوں سے برادری قائم کی - اور پھر روز بروز ہندی مسلمانوں کی آمد و رفت ان ممالک میں زیادہ ہوتی گئی - جہاں تک میں نے تحقیقات کی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی ابتدا خلیج فارس کے عرب تاجروں سے ہوئی چنانچہ بعض تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان ابتدائی مسلمانوں کا پرتگیزوں کے ساتھ تجارتی مقابلہ ہوتا رہا اور اپنے اپنے جہازوں کی حفاظت کے لیے دونوں فریق اسلحہ سے کام لیتے رہے - یہ لڑاکا تاجر بھی عرب ہی ہوسکتے ہیں - لیکن اسلام کی ابتدا کی ٹھیک تاریخ متعین کرنا مشکل ہے - ہاں تیرھویں صدی عیسوی

تب اسلام ان ممالک میں آچکا تھا - مشہور سیاح مارکوپولو (marco Polo) تیرہویں صدی کے آخر میں جاوہ کے شمالی حصہ میں اسلام کا زور بیان کرتا ہے - ابن بطوطہ ۱۳۴۶ء میں بہت زیادہ پھیلا ہوا اسلام ان ممالک میں بتلاتا ہے -

باگور (بیوٹن زرگ) کے قریب ایک جگہ "باتو تولیس" نامی ہے - جس کے معنی ہیں سنگ تحریر - مشہور ہے کہ اس پتھر کے ذریعہ سے شہزادہ پربو راجہ پورانا (راتو دواتا) نے پیشین گوئی کی تھی کہ ان ممالک میں اسلام زور پکڑ جائے گا - لیکن تاریخ کا پتہ اس سے بھی نہیں چلتا -

اسلام کی ابتدا مقامات Acheh اور Paaie میں ہوئی - پھر جاوہ کے شمالی اور اسکے بعد غربی سواحل میں پھیلا - کہتے ہیں کہ جاوہ میں سب سے اول ایک شخص حاجی پرواتا نامی (سنہ اور تاریخ کا پتہ نہیں ملتا) آیا اور اسی نے ریاست پاجاجاران میں اسلام کی اشاعت شروع کی لیکن اُسے کامیابی نہیں ہوئی - گرے سک جو جاوہ کے مشرق میں واقع ہے عرب تاجروں کا تجارتی مرکز تھا - اور اسی کو جاوہ میں اشاعت اسلام کا مرکز بھی سمجھنا چاہیے - چنانچہ مولانا ملک ابراہیم بھی جن کا نام کثرت سے تاریخ میں آتا ہے اور جن کے بیشمار معتقدین بیان کیے جاتے ہیں گرے سک کے قریب ہی مقام گیری میں تھے - انھیں کے زمانہ میں اسلام نے زور پکڑنا شروع کیا - ان کا جانشیں اگرچہ "رادن پاکو" ہوا لیکن رادن رحمت جس نے "وجایا" یا جو پاہت کے بادشاہ کی لڑکی کے ساتھ شادی کی تھی، اشاعت اسلام میں رادن پاکو کا دست راست ثابت ہوا اور سورابایا کے قریب نگام پل میں اُس نے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی - ان دونوں ہی کی کوششوں سے تمام ریاستوں میں اسلام پھیلا - یہاں تک کہ جنوبی سواحل کی تمام ریاستیں حلقۂ اسلام میں داخل ہوگئیں - اور آہستہ آہستہ آزاد ہوکر اصلی باشندوں اور اُن کے راجاؤں کے ساتھ معرکہ آرا ہوتی رہیں اور کبھی آپس میں بھی ایک دوسرے پر تفوق حاصل کرنے کے لیے لڑتی رہیں - اور اس طرح اسلام جاوہ کے مشرقی اور وسطی حصہ میں ترقی کرتا رہا - یہاں تک کہ ماتارام (جگجا) سے ہوتا ہوا آبنائے مادورا کو عبور کرکے مادورا میں پہونچا - ۱۴۴۵ء اور ۱۴۹۰ء کے درمیان نورالدین ابراہیم بن مولانا اسرائیل المعروف سونار، گونونگ جاتی نے مغربی جاوا میں اسلام پھیلایا - اور اس عرب شیخ نے مقام چریبون میں اس مقدس کام کو انجام دیا - جہاں بعد میں جاوہ کی سب سے پہلی مسجد تعمیر کی گئی - ان حالات کو دیکھ کر ان مورخوں پر افسوس آتا ہے

جو تعصب سے اندھے ہو کر اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں :-

"ان جزائر میں بھی اسلام بزور شمشیر پھیلایا گیا"۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ جب کوئی اسلامی سلطنت اس طرف حملہ آور ہی نہیں ہوئی اور سب مورخ متفق ہیں کہ صرف مسلمان تاجروں کے ذریعے سے اسلام اس طرف پھیلا تو پھر وہ کونسی تلوار تھی جس کا ذکر کیا جاتا ہے؟ اگر اس مورخ کا اشارہ اُن لڑائیوں کی طرف ہے جو مسلمان سلاطین کی غیر مسلمان راجاؤں سے ہوتی رہیں۔ تو اسکی عقل و دور اندیشی پر رونا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ مسلمان سلطنتیں کس طرح قائم ہوئیں۔ کیا تلوار کے زور سے؟ یا صرف اسلام کی تعلیم سے؟ اور جب سلطنتیں قائم ہوئیں تو جنگ ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ لیکن یہ لڑائیاں اسلام کی اشاعت کے لیے نہیں بلکہ ملک گیری کے لیے ہر جگہ ہوئی ہیں۔ کیا مسلمان مسلمان آپس میں نہیں لڑتے رہے؟ کیا عیسائی عیسائی انہیں جزائر میں (ڈچ۔ پرتگیز) باہمی جنگ نہیں کرتے رہے؟ تنگر کے علاقہ میں انیسویں صدی کے آخری نصف میں اسلام پھیلا۔ جبکہ یہ عیسائی ڈچوں کے قبضہ میں عرصہ سے آچکا تھا۔ یہاں کس تلوار نے اسلام پھیلایا؟

جب اسلام نے اس علاقہ میں اپنے پاؤں جمائے تو اسلام کو نصرانیت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ پرتگیز۔ انگریز اور ڈچ لوگوں کے سخت مقابلہ کے باوجود اسلام برابر پھیلتا رہا۔ اور نصرانیوں کو اپنا مذہب پھیلانے میں کامیابی نہ ہوئی اور تقریباً تمام باشندے مذہب اسلام میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ آج کل جاوہ یا سماترہ میں بمشکل ایک لاکھ میں سے ایک شخص اصلی باشندوں میں سے ایسا ہوگا جو اسلام کا حلقہ بگوش نہ ہو۔ جو جزائر ڈچ گورنمنٹ نے نئے فتح کیے اُنکے اصلی باشندوں (لا مذہبوں) کو ہر طرح سے نصرانیت میں داخل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کو ظاہر طور پر اشاعت اسلام کی اجازت نہیں۔ اور نصرانی راہبوں کو متواتر امداد دے کر عیسائیت پھیلانے کے لیے روانہ کیا جاتا ہے۔

آچے (achch) کا علاقہ سارے کا سارا سلطان علی منایت کے عہد میں (۱۵۰۷ء تا ۱۵۲۲ء) اسلام کا حلقہ بگوش ہوا۔ نورالدین نے جب جمبوئن میں اپنا پولٹیکل اور مذہبی اثر جمایا تو منانام کے علاقہ میں بڑھنا شروع کیا تاکہ مغربی ساحل اگر باقاعدہ اسکے زیر حکومت نہ آجائے

تو کم از کم زیر اثر تو ہو جائے - جس کا فائدہ یہ ہو کہ آبنائے سندھا کے ساتھ مسلمانوں کی تجارت آزادی سے ہو سکے - کیونکہ پرتگیزوں کے سبب سے ان دنوں آبنائے ملاکا سے گزرنا خطرہ سے خالی نہ تھا - بنتام کے رئیس نے جب اسلام اور نصرانیت کا تجارتی مقابلہ دیکھا تو آخر الذکر کا ساتھ دیکر مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے ان سے مدد چاہی - اور اس طرح دونوں نے مل کر چریبون اور ڈیمارک کی اسلامی ریاستوں کو نابود کرنا چاہا - مگر نورالدین کے ایک بیٹے مولانا حسن الدین نے ان لوگوں کو سخت شکست دی - اور علاقہ بنتام کے باشندے بھی مذہب اسلام میں داخل ہو گئے - اسی طرح نورالدین کے دوسرے بیٹے نے انھیں دنوں میں سنداکلایا میں اسلام پھیلایا۔ حسن الدین نے درمیانی ریاستوں کو زیر اثر کرکے تقریباً ۱۵۲۲ء میں پاجاجاراں کی افواج کا مقابلہ کیا جو شہزادۂ سیلی وانگی کے زیر کمان تھیں - اور انکو شکست دے کر بزور شمشیر انکی سلطنت پر قبضہ کر لیا - بنتام کی ریاست چونکہ اسلام قبول کر چکی تھی - اس لیے ان لڑائیوں میں چریبون والوں کی مدد کرتی رہی -

اس عظیم الشان اسلامی سلطنت (چریبون) نے اگرچہ بنتام اور پاجاجاراں جیسی ریاستوں پر قبضہ کر لیا لیکن آہستہ آہستہ اپنی قوت کھوتی گئی - اور ۱۶۲۵ء میں ماتارام (ملکیا) کے زیر اثر اور ۱۶۳۲ء میں بالکل ماتارام میں مدغم ہو گئی - جس کا اصلی سبب پانام باہاں کے مرنے کے بعد اس سلطنت کے دو حصے ہونے ہیں جو اسکے دو بیٹوں میں تقسیم ہوے - جو بعد میں سلطان سیپوہ اور سلطان انوم کے نام سے مشہور ہوے - ان دونوں کو باپ نے اس شرط پر سلطنت دی تھی کہ وہ تیسرے بیٹے کے لیے گوڈونگ (بنام باہاں) کی ریاست فتح کر دیں گے - اس مشہور جنگ میں وہ دونوں پکڑے گئے، اور کارٹا میں سیاسی قیدی بنا کر رکھے گئے - اور بعد میں سلطان بنتام معروف بہ ابو الفتح کی وساطت سے آزاد ہو کر اپنی مملکت میں واپس آئے -

ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۶۱۹ء میں شہر بٹاویہ کی بنیاد ڈالی - اور چریبون کے شہزادوں کے قید ہو جانے کے دنوں میں چریبون پر قبضہ کر لیا تھا - اس لیے ان دونوں نے واپس آتے ہی ایک طرف ماتارام کی اسلامی سلطنت سے عداوت کو بڑھانا شروع کیا - دوسری طرف ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بر خلاف کارروائی شروع کی - کمپنی والے چاہتے تھے کہ اس سلطنت کو تینوں

حصہ داران سلطنت میں اس طرح پر تقسیم کردیں جس میں سراسر اپنا ہی فائدہ ہو[1]۔ چنانچہ اس ڈچ کمپنی نے انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی سے مل کر نبتام وغیرہ کے سلسلۂ تجارت بحری کو اپنے جہازوں کے ذریعہ سے بند کردیا۔ جس سے یہ سب راجگان مجبور ہوئے کہ نصرانیوں کے ساتھ سلسلہ دوستی قائم کریں۔ اور ۱۶۵۹ء میں اس کی ابتدا ایک عہدنامہ کے ذریعہ سے ہوئی۔ اور رفتہ رفتہ نصرانیوں کے پانوں جمتے گئے۔

مسلمانوں کی ایک قوی سلطنت ماتارام (جگجا) کی تھی۔ جس کی طاقت ۱۶۱۳ء سے ۱۶۴۶ء تک تمام جاوہ اور مدورا میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس سلطنت کے بادشاہ کو جس کا نام سلطان اگنگ تھا۔ سنہ ۱۶۳۰ء میں مکہ سے سلطان کا خطاب ملا تھا۔ اب اس تمام علاقہ میں یہی ایک اسلامی سلطنت قوی رہ گئی تو نصرانیوں نے "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کرکے وسط جاوہ کے سلاطین کو مغربی جاوہ والوں کے خلاف بھڑکا دیا۔ یہاں تک کہ دونوں کی طاقتیں اس خانہ جنگی میں برباد ہوگئیں۔ اور "دو مرغ جنگ کنند فائدۂ تیرگر" والی مثل ان پر صادق آگئی۔ ڈچوں نے ان لوگوں کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر تمام ریاستوں پر اپنا اثر جمالیا ... اب ان تمام جزائر میں سوائے چند مجبوس اور بے اختیار سلاطین کے کوئی خودمختار علاقہ باقی نہیں رہا۔

ڈچ گورنمنٹ نے اسلامی سپہگری سے بہت کچھ فائدہ اُٹھایا۔ اور اب تک اُٹھا رہے ہیں۔ سنہ ۱۶۲۷،۲۸ء میں جب ماتارام کے سلطان نے بٹاویہ کی ڈچ آبادی پر حملہ کیا تو ڈچوں نے مسلمانوں ہی کی فوج سے ان کو شکست دی۔ جن کو آخر خانہ جنگی اور تجارتی مقاطعہ کے سبب سے نبتام اور چریبون والوں کی طرح نصرانیوں کے ساتھ دوستی ہی کرنی پڑی۔ آج کل بھی ڈچ گورنمنٹ کی جاوہ کی فوج کا معتدبہ حصہ مسلمان ہے۔ اور اسلامی فوج کے ذریعہ سے ڈچوں نے دور و دراز کے وحشی جزائر پر اپنا قبضہ کرلیا۔ اور ہر جگہ اپنی سلطنت قائم کی۔

آج کل یہاں کے مسلمانوں میں سب سے بڑی عزت حاجی بننے کی ہے۔ اور جو لوگ حج کر آتے ہیں وہ سر پر عمامہ باندھ لیتے ہیں۔ اسی طرح جو عورت حج کر آتی ہے وہ سر پر کپڑا باندھ لیتی ہے۔ ورنہ عورتیں

---

[1] Monumental Java By J. F. Scheltema, M. A.
(مانومنٹل جاوا مولفہ شلٹما صفحہ ۲۷)

بالکل ننگی پھرتی ہیں۔ گویا بچے کے بیں۔ یہ لوگ نصف عربوں کی سی شکل بنا لیتے ہیں۔

آج کل توہمات کا ان لوگوں میں بہت زور ہے۔ اخلاقی حالت بہت ہی خراب ہے۔ یہ لوگ آرام طلب بہت زیادہ ہیں لیکن زمین زرخیز ہے۔ اس لیے آسودہ حال ہیں۔ دین اسلام کی حقیقت سے بالکل واقفیت نہیں۔ مذہباً سب شافعی ہیں۔

عبدالسلام رفیقی

# جذبات فانی

کیوں نہ نیرنگ جنوں پر کوئی قرباں ہو جائے
گھر وہ صحرا کہ بہار آئے تو زنداں ہو جائے

برق دم لینے کو ٹھہرے تو رگِ جاں ہو جائے
فتنۂ عشق مجسم ہو تو انساں ہو جائے

جوہر آئینۂ دل ہے وہ تصویر کہ تو
دل وہ آئینہ کہ تو دیکھ کے حیراں ہو جائے

غم وہ رحمت ہے جسے قسمت کے دھنی پاتے ہیں
دم وہ مشکل ہو کہ موت آئے تو آساں ہو جائے

عشق وہ کفر کہ ایمان ہے دل والوں کا
عقل مجبور وہ کافر جو مسلماں ہو جائے

ذرہ وہ راز بیاباں ہے جو افشا نہ ہوا
دشت وحشت ہے وہ ذرہ جو بیاباں ہو جائے

غم محسوس وہ باطل جسے کہتے ہیں مجاز
دل کی ہستی وہ حقیقت ہے جو عریاں ہو جائے

خلد میخانے کو کہتے ہیں بقول واعظ
کعبہ بتخانہ کو کہتے ہیں جو ویراں ہو جائے

سجدہ کہتے ہیں در یار پہ مر جانے کو
قبلہ وہ سر ہے جو خاکِ درِ جاناں ہو جائے

موت وہ دن بھی دکھائے مجھے جس دن فانی
زندگی اپنی جفاؤں پہ پشیماں ہو جائے

فانی

# زاریِ عفت

فطرت ہیں آسماں کی بلندی و سرکشی — خاکِ حزیں کو ضعف ہے اور عجز و نارسی
لیکن اس اختلاف کی ضامن ہے شانِ جبر — تنظیمِ کائنات ہے وہ بندشِ قوی
بجلی گرائے چرخ زمیں پر ہزار بار — طاقت نہیں غریب کو جنبش کرے کبھی
وہ شوخیاں کرے یہ تحمل کیا کرے — حاصل ہے اس نظام کا دُنیا کی زندگی

اے خوگرِ شدائدِ دَورِ زماں خفا نہ ہو
سرگرمِ شکوۂ ستمِ ناروا نہ ہو

اے خاکِ پاک حُسنِ نباتی کی ماں ہے تُو — آغوشِ مہر پرورشِ بحر و کاں ہے تُو
تو ہی محلِ عقل ہے اور تو ہی ظرفِ روح — نوعِ بشر کا محملِ لیلائے جاں ہے تو
جذب و کشش سے تیری ہے اُلفت ترا جہاں — معشوقۂ جمیلۂ دَورِ زماں ہے تو
متبار و بُردبار و متین و حلیم و نرم — تانیث کی صفات کی روحِ رواں ہے تو

وہ جسمِ نازنیں کہ جو اُمُّ البنات ہو
تو خود اگر نہیں تو تری ذریات ہو

عورت میں ہے زمیں کے خصائص کا انضمام — سعیِ بقائے جنس ہے کام اُس کا لاکلام
تولید و تربیت میں ہے مشغول رات دن — اُس کے بغیر امرِ معیشت ہیں ناتمام
دُنیا کے کاروبار میں اور دیں کی راہ میں — ہے اُس کی ذات لازمۂ حُسنِ انتظام
نے نور کا وجود نہ ظلمت کی ہو نمود — باہم جو مختلط نہ ہوں ہر روز صبح و شام

اس جنس کا عدم بھی عدم ہے وجود کا
لازم ہے اہتمام وِلود و ودود کا

اے توشہ دارِ خلوتِ آدم نگارِ خُلد — ہے اس عذابِ نار میں تو یادگارِ خُلد
رفتارِ اہتمام مشاغل نہیں تری — جاری ہے صحنِ خانہ میں اک آبشارِ خُلد

تزئینِ خانہ دخترِ حوّا اگر کرے — آئے نظر ہجومِ خزاں میں بہارِ خُلد
تسکینِ مضطرب تری الفت سے کیوں نہ ہو — بخشا تجھے خدا نے سکون و قرارِ خُلد

رحمت مؤدّت اب جو کہیں اس جہاں میں ہے
وہ حلیۂ جناں ترے گنجِ گراں میں ہے

چادر سکونِ شب کی تھی رخ پر پڑی ہوئی — کھینچی سحر نے آکے تو تو اٹھ کھڑی ہوئی
اقلیمِ خانماں کی فداکار و جاں نثار — ہردم ہے اپنے عزم مہم پہ اَڑی ہوئی
اللہ ری ناخوشی میں تری خوش کلامیاں — بلبل چہک رہی ہے صبا سے لڑی ہوئی
وہ آبلہ ہے تو کہ نہ آہستہ گیر کا — غش ہو گیا ذرا جو ہتھیلی کڑی ہوئی

خلقت تری حیا سے سدا باغ باغ ہے
چھولے اگر نسیم تو تو داغ داغ ہے

بچوں کی پرورش میں گذاری تمام عمر — شوہر کے قہر و مہر پہ واری تمام عمر
تھک تھک کے گر پڑی نہ رہا تن بدن کا ہوش — خدمتگذاریوں سے نہ ہاری تمام عمر
کنجِ قفس ہمیشہ رہا تجھ سے باغ باغ — نکلی نہ گھر سے فصلِ بہاری تمام عمر
تاثیر سے تری ہوئے آوارہ پارسا — بگڑے ہوؤں کی تو نے سنواری تمام عمر

[illegible] تری دواروی میں جب اک بات کر گئی
سینے میں شورِ قلزمِ جذبات بھر گئی

ناخوش ہوا کوئی تو زباں بستہ ہو گئی — دیکھا جب التفات رضامند ہو گئی
تلخی کی بول چال میں پیدا کیا یہ ذوق — لب پہ جو آئی بات وہ گلقند ہو گئی
بارانِ شیر کیوں نہ کرے چرخ سے نزول — تو کمسنی میں مادرِ فرزند ہو گئی
جس در پہ آکے بیٹھ گئی مر مٹی وہیں — ایسی ہٹی کہ ناک کا پیوند ہو گئی

سرنامۂ مروت و مہر و وفا ہے تو
مظلوم کی شریک و رفیقِ بلا ہے تو

زانو ہے اور مریض کا سر ہے تمام رات — بیداریوں میں تیری بسر ہے تمام رات

دن بھر ہوا نہ طفلِ حزیں گود سے جدا　　ناطاقتی سے دردِ کمر ہے تمام رات
معلوم ہے مجھے وہ مصیبت کہ جس میں روز　　بیکس تری خدا پہ نظر ہے تمام رات
فاقہ میں چشم سدِ رمق ہے تمام دن　　سردی میں انتظارِ سحر ہے تمام رات

رکھتی ہے لاج کھیل کے تو اپنی جان پر
مرنے میں تجھ کو باک نہیں آن بان پر

اے وہ کہ تیرے حق کی حمایت خدا نے کی　　مظلومیوں میں دادرسی انبیا نے کی
اے ہمنشین بوسۂ خوش و لذتِ نماز　　توقیر تیری بادشہِ دوسرا نے کی
دن رات جبکہ عالمِ بالا کا شوق تھا　　اُس وقت تیری یاد رسولِ خدا نے کی
تیری کبھی کچھ مزاج شگفتہ میں آگئی　　تسلیم شرطِ عفو جو خُذ ما صفا نے کی

شاد و گدا کے ساتھ ترا ایک ڈھنگ ہے
بیساختہ ہے بات تری بے درنگ ہے

کرتے ہیں ذکر تیرا مذمت کے ساتھ اگر　　وہ شکوۂ تغیرِ عادت ہے سر بسر
جس خاصہ پہ نا نہ ہو مخصوصِ وصف کو　　اُس خاصہ بغیر ہے تخصیص بے اثر
تیرہ ہو آبگینہ تو پتھر کہو اُسے　　خالص اگر نہیں ہیں تو مٹی ہیں سیم و زر
اک شرف ہے شرافتِ انساں کا لازمہ　　جب وہ نہیں تو حضرتِ انساں ہیں گاؤ خر

باقی ہے بو تو مشک ہے بعد اُسکے خاک ہے
پانی نہیں کوئیں میں تو تیرہ مغاک ہے

مرنے کے بعد دفن کا ساماں ہے ضرور　　میت کو لیکے بیٹھے وہ ناداں ہے ضرور
بیگانہ و یگانہ غرض وہ کوئی بھی ہو　　بے روح کا جسد تنِ بیجاں ہے ضرور
شرطِ صفت ہے ہستیِ موصوف کا وجود　　انساں میں عقل اگر نہ ہو حیواں ہے ضرور
اوصاف سے جب اپنے کیا اُسنے انحراف　　خاتون کے لباس میں شیطاں ہے ضرور

اُس کا علاج دیں نے سکھایا ہے دہ بُرد
تدبیر اس کی شرع میں آئی ہے قصرِ بو

دنیا نے تجھ غریب پہ کیا کیا کیے ستم — پردہ میں دوستی کے عداوت ہے دمبدم
ہر نظر ہے دزدی کسی کے ظلم کی — چادر تری ہجوم تماشا میں ہے قلم
لہو و لعب کی مشق زنی اور وہ نازنیں — تار نظر کے بوجھ سے گردن ہو جس کی خم
تہذیب نو کے نام سے اعداے زندگی — آب بقا کے جام میں حل کر رہے ہیں سم

جس نے تجھے حجاب سے آزاد کر دیا
لاوارثی میں گنج کو برباد کر دیا

اے برق اضطرار محبت کے اضطراب — اے شعلہ زار آتش غیرت کے التہاب
اے لعل بے بہاے حیا کی چمک دمک — اے جرم آبگینۂ عفت کی آب و تاب
موج نظر ہے بزم میں چاروں طرف بلند — ٹوٹے نہ شمع شیشۂ فانوس جوں حباب
تو اور سب کے ساتھ تری بے حجابیاں — تو اور تیرے حق میں کوئی ظن ناصواب

لیکن تو خود بھی سوچ ذرا دل پہ رکھ کے ہاتھ
عورت پہ کیا گذرتی ہے نامحرموں کے ساتھ

تیری نگاہ غیر سے توہین کیوں نہ ہو — میلا نظر سے جلوۂ رنگین کیوں نہ ہو
تاب نفس سے جبکہ ہو آئینہ سرگراں — تو اپنے عکس رخ سے بھی غمگین کیوں نہ ہو
ہنگامہ زا ہے تیزی احساس دمبدم — بے اختیار تو پئے تسکین کیوں نہ ہو
جوں شمع زندگی تری سوز و گداز ہے — اس زندگی میں صبر کی تلقین کیوں نہ ہو

در در پھرا کرے وہ سکندر نہیں ہے تو
ہرجائیوں کی بزم کا ساغر نہیں ہے تو

---

پیدا ہوئے ہیں مصلح نسواں جناب بھی — اس فن میں لکھتے رہتے ہیں حضرت کتاب بھی
ہے حسن ظن آپ کا مقبول زناں — بخشا ہے بیگمات نے انکو خطاب بھی
سیدے کی ذکور پہ شفقت وگرنہ آج — مسلم کو چھوڑنے دیتے نہ صاحب رکاب بھی
ب لڑکیوں کے واسطے یہ قبلۂ اناث — دنیا کے ساتھ لاتے ہیں دیں کا ثواب بھی

علم و عمل میں اُن کو یگانہ بنائیں گے
عنوانِ ارتقائے زمانہ بنائیں گے

جاتا تھا میل جانبِ کلکتہ ایک شب　تھا میں بھی اُس میں راہروِ منزلِ تعب
ہر سفر در آئیں خراماں ہجوم میں　کچھ طالباتِ مدرسۃ العلم والادب
جن علم کی شراب سے لبریز تھے وہ جام　نازل ہوا ہے علم پہ اللہ کا غضب
کہنے کو شیخ و سید و علوی و ہاشمی　اور دیکھنے میں نسل نصاریٰ تھیں سب کی سب
بار گراں تھی شرم جوانی کے جوش پر
برقع بغل میں تھا تو دوپٹہ تھا دوش پر

ساری میں تھی کوئی کوئی سایہ میں بے نقاب　بوڑھوں سے کچھ حذر نہ جوانوں سے اجتناب
وارفتہ اٹھ دھام ہیں ہر سو رواں دواں　اپنوں سے کوئی شرم نہ غیروں سے کچھ حجاب
بخشا اگر سلف کو خدا نے تو کیا ہوا　کافی ہے انکی قبر میں انکو یہی عذاب
فرزند انکے ہوں گے صحابہ کے متبع　ملت کے شیخ و برتر ہیں یہ افرنجیت مآب
غضِ بصر کے حکم کا کیا اہتمام ہو
جب آیتِ حجاب کا یہ احترام ہو

…شور ہے بلند کہ پردہ روا نہیں　فریاد ہے کہ اُن کو سرِ بزم جا نہیں
…بھر کے لاؤ شربتِ دیدار کے گلاس　اب تاب تیرہ تشنہ لبوں کو ذرا نہیں
…چار کی جگہ یہ ہزاروں کے گرد ہیں　دعوے ہے یہ ملا کہ [illegible] نہیں
…تو بتاؤ دین و شریعت کے منکرو　شرم و حیا بھی ہے کہیں دنیا میں یا نہیں
حامی کوئی بزرگ مساواتِ زن کے ہیں
زوجہ میں اُن کی حوصلے مردانِ فن کے ہیں

…کچھ دماغ آپ کو اسکے شعور کا　فائق ہے کیوں اناث سے حصہ ذکور کا
…ل مجال عذر تعدد سہی مگر　چلتا نہیں یہاں کوئی حیلہ قصور کا
…ملک سجا ہیں اُن کی مساوات خواہیاں　کیا انتہا نہ انکو ملا ان [illegible] کا

آغاز حشر و نشر ہے مغرب کی روشنی گُل کرتے ہیں چراغ تجلّاے طور کا
فتوٰے ہے اب یہ مسئلۂ ازدواج پہ
ایمان لاؤ بھائیو انگلش رواج پہ ؂
وقت طلوع شمس ہے ظلمت کا انہزام روشن روانِ روز ہوے فائز المرام
زور تابناک کے طوفاں کا شور ہے موجوں میں غرق ہو گئے ایران و روم و شام
پھر جب ہوا غروب سے آغاز تیرگی روے زمیں پہ چھا گئی بدبختیِ ظلام
اب ہم ہیں اور یہ وسط اللیلِ پُر خطر ہر اک قدم پہ دیکھیے فتنوں کا اژدہام
آہ ایں چہ سیل بود کہ مارا ز سر گذشت
تنہا ز سر مگو کہ ز دیوار و در گذشت
تپش خورجوی

# نواے جلیل

مٹ کے تیغِ نازِ حسنِ یار جب قاتل ہوا دل نکل کر پہلوے عاشق سے خود بسمل ہوا
یا نیلے سے تصور میں یہ تصویریں کھنچیں سینہ صحرا ہو گیا، دل قیس کا محمل ہوا
گر بچا مژگاں سے دل ابرو نے ٹکڑے کر دیے ناوک افگن ہو کے خنجر آزما قاتل ہوا
کچھ ہے پاسِ ملّتِ عشق کچھ اُن کا خیال جان دینا بھی محبت میں بہت مشکل ہوا
گو نہ ساحل تک پہونچتے ڈوبتے ہی کاش ہم بحرِ الفت میں اُترنا سعیِ لا حاصل ہوا
ہم کو رکھا سرخرو دونوں جہاں میں عشق نے "کائناتِ ہر دو عالم اک ہمارا دل ہوا"
بحر و خارِ محبت اور یہ جسمِ ناتواں جتنا پہونچا پاس میں دور اُتنا ہی ساحل ہوا
بحرِ ہستی کے تلاطم میں مری منزل نہ پوچھ کشتیِ ہستی جہاں ڈوبی وہیں ساحل ہوا
یوں ہوئی جذبِ محبت کی نمایش اے جلیل
خونِ دل کا عکس حسنِ یار میں شامل ہوا
جلیل قدوائی

# نظرے خوش گذرے

میں باہر نہیں جا سکا، اور جاتا تو بارش و سیلاب نے جو ریلوں کے انتظام میں ابتری پیدا کی ہے اُسکی وجہ سے غالباً وقت پر واپسی نہ ہوتی، اور یہ پرچہ بہت تاخیر سے شائع ہوتا۔ الناظر کے کاتب صاحب کے عین وقت پر دفعۃً بیمار ہو جانے کے باعث یہ پرچہ بھی ایک ہفتہ کی تاخیر ہوئی اور مزید تاخیر سے بچنے کے لیے کتابوں پر تبصرہ اور رُوداد سفر حجاز دونوں سے قطع نظر کرنا پڑا۔ جن اصحاب کو خطوط میں توقع دلائی گئی تھی کہ اُنکی کتابوں پر اس نمبر میں تبصرہ شائع ہوگا وہ معاف فرمائیں۔ تبصرہ لکھا ہوا موجود ہے۔ انشاءاللہ آئندہ پرچہ میں درج ہوگا۔ الناظر کی اشاعت بڑھانے والوں کا شکریہ بھی سردست ملتوی۔

---

جوش صاحب کو جس بات کا کھٹکا تھا، وہی پیش آئی۔ چلپی صاحب کی بندوق بالآخر داغ گئی۔ اب دیکھیے جان و عزت دونوں میں سے کون سلامت رہے۔ مجھے تو دونوں کی خیر نہیں نظر آتی۔ اسلیے کہ بندوق اگرچہ توڑے دار ہے، مگر اسکی مار شاہان زمانہ کے شیر بچہ سے کم نہیں۔ شیر بچہ میں مدو سا ہی پلیے بھرے ہوتے تھے تو چلپی صاحب کی بندوق میں طنزیات ادبیہ اور آیات کا ایسا آتشیں مرکب بھرا ہوا ہے کہ اسکے زہریلی گیس سے دُور دُور تک لوگوں کو پناہ نہ ملیگی۔ الحفیظ والاماں۔

میں اپنے مخلص دیرینہ سلطان حیدر صاحب کے ساتھ اس حادثۂ فاجعہ میں دلی ہمدردی رکھتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ صبر و تحمل کی ناقابل نفوذ زرہ اُنکی جان و عزت کو صدمہ سے بچالے ورنہ مجھے رسم تعزیت ادا کرنے کے لیے زحمت سفر گوارا کرنا ہوگی۔

چلپی صاحب سے بھی ایک عرض بے موقع نہ ہوگی۔ اسلام نے انتقام کی رخصت دی ہے مگر عفو کا درجہ اتنا بلند کر دیا ہے کہ انتقام میں کوئی خوبی نہ رہی۔ مہاتما گاندھی کے عدم تشدد کا بھی یہی مقصود و مفہوم ہے۔ حکیم شیراز نے کیا خوب کہا ہے

در عفو لذتیست کہ در انتقام نیست

۹ اگست ۱۹۲۴ء

## فصلی بخار و طحال کی دوا

فصلی بخار و طحال کے لیے یہ ایک بڑی دوا ہے۔ آج کل سیکڑوں اشتہار فصلی بخار و طحال کی دوا کے آپ دیکھتے ہوں گے مگر ان میں عموماً کونین رہتی ہے۔ اس لیے یہ دوائیں بخار کو کچھ وقت تک روک دیتی ہیں مگر جڑ سے آرام نہیں کرسکتی ہیں۔ ایسے بخار کے لیے ڈاکٹر ایس کے برمن کی فصلی بخار و طحال کی دوا جڑ سے ایک دم آرام کرنے کا دعوے رکھتی ہے اور عوام کے فائدہ کو مدنظر رکھکر قیمت بھی بہت کم رکھی گئی ہے۔ اس میں تین خاص صفتیں ہیں (۱) ملیریا کے کیڑوں کو مار دیتی ہے جس سے چار پانچ ہی خوراک کے استعمال سے بخار کا آنا بند ہو جاتا ہے (۲) یہ خون کو بڑھاتی ہے اور اس کی خرابیوں کو مٹاتی ہے (۳) یہ طحال کو گلاتی ہے۔ قیمت فی شیشی کلاں صہ شیشی خورد ۱۰ محصول ڈاک شیشی کلاں ۸ر اور خورد ۷ر

## پرانے ملیریا بخار کی گولیاں

لرزہ بخار پرانا ہو جانے پر باری سے نہ آکر دن رات تھوڑا بہت چڑھتا ہے۔ جسم کا خون پانی سا ہو جاتا ہے اور آدمی کا رنگ پھیکا میلا ہو جاتا ہے۔ تھوڑی محنت سے کلیجہ کانپنے لگتا ہے۔ تلی پھول جاتی ہے۔ کھانے کی خواہش اور قوت بہت ہی گھٹ جاتی ہے۔ تلی کے بڑھنے سے پیٹ نکل آتا ہے۔ کبھی منہ اور ہاتھ پیروں پر ورم آجاتا ہے اور زندگی وبال ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ گولیاں فائدہ کرتی ہیں اور چار ہی پانچ خوراک میں بخار کا آنا بند ہو جاتا ہے قیمت پچیس گولیوں کی ڈبیہ ۱۰ محصول ڈاک ایک سے دو ڈبیہ تک ۶ر

## کونین کی گولیاں

: چار گرین کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت ٹکیاں بنی ہیں اور سنہری پیٹنٹ ڈبیہ میں ہوتی ہیں۔ کونین کا استعمال کرنا ہو تو یہ گولیاں پاس رکھیے۔ اس میں نہ وزن کی ضرورت ہے نہ کھانے میں تلخی ہے قیمت پچیس گولیوں کی ڈبیہ صہ محصول ڈاک ۶ر

**ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ تاراچند دت اسٹریٹ - کلکتہ**

**ایجنٹ :- گنگا رام مہتلی - چوک لکھنؤ۔**

## کلام حالی

مولانا حالی کی متفرق نظمیں جو بیحد مقبول ہیں
شکوہ ہند. بیوہ کی مناجات. عرض حال ۲؍
سدس نُک. خدمت. مناظرہ رحم و انصاف ۱؍
حب وطن. بچہ اور اُسکے کا مناظرہ ۱؍
(خریداران الناظر کیلئے تین چوتھائی قیمت پر)

## مثنوی امید و بیم

لکھنو کے مشہور شاعر و انشاپرداز و فلسفی
مرزا محمد ہادی رسوا بی اے کی لاجواب نظم
جسے اُردو میں اعلیٰ درجہ کے فلسفیانہ خیالات
کی پہلی نظم کہنا بجا ہوگا۔ قیمت ۴؍
(خریداران رسالہ کے لیے ۳؍)

## کلام اقبال

ڈاکٹر اقبال کی مقبول عام نظمیں:۔
شکوہ ۲؍ جواب شکوہ ۲؍ شمع و شاعر ۲؍
بلال ۔ فریاد امت ۔ تصویر درد ۱؍
(خریداران رسالہ کو تین چوتھائی قیمت پر)

## مسلمانان اُندلس

نامور مورخ اسٹینلی لین پول کی کتاب
"مورس ان اسپین" کا اُردو ترجمہ از مولوی
سید عبدالغنی وارثی قیمت ۲؍
(خریداران رسالہ سے ۲؍)

## خوان دعوت

لڑکیوں کو کھانا پکانا سکھانے کیلیے
م ب صاحب لکھنوی نے افسانہ کے دلکش
پیرایہ میں یہ کتاب مرتب کی ہے جسمیں
باورچی خانہ کے ضروری انتظامات
اور عمدہ و لذیذ کھانوں کی مجرب
ترکیبیں ذاتی تجربہ کی بنا پر تحریر
کی ہیں۔
قیمت ۱؍
(خریداران رسالہ کے لیے ۱۲؍)

## تذکرہ حزیں

مشہور شاعر شیخ علی حزیں۔ جو ایران
سے ہجرت کر کے ہندوستان میں آئے
ان کی دلچسپ سوانح عمری قیمت ۴؍
(خریداران رسالہ سے ۳؍)

## دلچسپ مختصر افسانے

ایک نادان خدا پرست اور دنیا دار کی
کہانی ۱؍ ۔ مساوات ۔ از مسٹر سلطان
حیدر جوش ۱؍ اتفاقات زمانہ ۱؍
(خریداران رسالہ کے لیے نصف قیمت)

## حیات نظامی

مشہور شاعر حضرت نظامی گنجوی
کی سوانح عمری ۔
قیمت ۴؍
(خریداران الناظر کے لیے ۳؍)

## جمیل و بثینہ

عرب کے حسن و عشق کا
دلچسپ افسانہ
قیمت ۳؍
(خریداران الناظر کے لیے ۲؍)

## عورتوں کی انشا

خواتین اور اُنکی صاحبزادیوں کو خطوط
نویسی سکھلانے والی کتاب مصنفہ بیگم
صغرا علی صاحبہ ۔ قیمت ۱؍
(خریداران رسالہ کے لیے ۱۲؍)

## مصنوعی شوہر

انقلاب ایران کی ایک ظریفانہ داستان
ہنستے ہنستے لوٹ جایئے گا۔
قیمت ۲؍
(خریداران الناظر کے لیے ۱؍)

ملنے کا پتہ:۔ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رجسٹرڈ نمبر ل ۸۰۲

رسالۂ

# الناظر

لکھنؤ

ایڈیٹر۔ ظفر الملک علوی

قیمت سالانہ للعہ ر مع محصول

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر و پبلشر:۔ اسحاق علی علوی

باسمہ

الناظر

# فہرست مضامین الناظر بابت اکتوبر و نومبر ۱۹۲۴ء

نمبر ۱۶۰ و ۱۶۱ — جلد ۲۷



ظ

## فصلی بخار و طحال کی دوا

فصلی بخار و طحال کے لیے یہ ایک ہی دوا ہے۔ آج کل سیکڑوں اشتہار فصلی بخار و طحال کی دوا کے آپ دیکھتے ہوں گے مگر ان میں عموماً کونین کی جزو رہتی ہے۔ اس لیے یہ دوائیں بخار کو کچھ وقت تو روک دیتی ہیں مگر جڑ سے آرام نہیں کر سکتی ہیں۔ ایسے بخار کے لیے ڈاکٹر ایس کے برمن کی فصلی بخار و طحال کی دوا چند روز میں الیدم آرام کرنے کا خاص دعویٰ رکھتی ہے اور عوام کے فائدہ کو مدنظر رکھ کر قیمت بھی بہت کم رکھی گئی ہے۔ اس میں تین خاص صفتیں ہیں (۱) ملیریا کے کیڑوں کو مار دیتی ہے۔ اس لیے چار پانچ ہی خوراک کے استعمال سے بخار کا آنا بند ہو جاتا ہے (۲) یہ خون کو گاڑھا کرتی ہے اور اسکی خرابیوں کو مٹاتی ہے (۳) یہ طحال کو گلاتی ہے۔ قیمت فی شیشی کلاں عہ شیشی خورد ۱۰ر محصولڈاک شیشی کلاں ۸ر اور خورد ۷ر

## پرانے ملیریا بخار کی گولیاں

جب بخار پرانا ہو جانے پر باری سے نہ آکر دن رات تھوڑا بہت چڑھتا ہے۔ جسم کا خون پانی سا ہو جاتا ہے اور آدمی کا رنگ پھیکا میلا ہو جاتا ہے۔ تھوڑی محنت سے کلیجہ کانپنے لگتا ہے سانس پھولتی ہے۔ کھانے کی خواہش اور قوت بہت ہی گھٹ جاتی ہے۔ تلی کے بڑھنے سے پیٹ نکل آتا ہے۔ کبھی منہ اور ہاتھ پیروں پر ورم آ جاتا ہے اور زندگی وبال ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ گولیاں فائدہ کرتی ہیں اور چار ہی پانچ خوراک میں بخار کا آنا بند ہو جاتا ہے۔ قیمت پچیس گولیوں کی ڈبیہ ۱۰ر محصولڈاک ایک سے دو ڈبیہ تک ۶ر

## کونین کی گولیاں

یہ چار گرین کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت ٹکیاں بنتی ہیں اور سفری پیٹنٹ ڈبیہ میں ہوتی ہیں۔ کونین کا استعمال کرنا ہو تو یہ گولیاں پاس رکھیے۔ اس میں نہ وزن کی ضرورت ہے نہ کھانے میں تلخی ہے قیمت پچیس گولیوں کی ڈبیہ ۳؎ محصول ڈاک ۶ر

**ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ تارا چند دت اسٹریٹ کلکتہ**

**ایجنٹ :- ڈاکٹر گنگا رام جیتلی۔ چوک لکھنؤ**

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# مطبوعات جدیدہ

**سرگذشت حیات** (مولفہ مسٹر نظیر حسین فاروقی) انسانی زندگی کو ابتدا سے انتہا تک جو جو منازل ارتقائی طے کرنا ہوتے ہیں اُنکی نہایت ہی دلچسپ تفصیل جسکے ضمن میں سائنس و حکمت کے اکثر ضروری مسائل نہایت سلیس و زود فہم طریقہ پر بیان ہوے ہیں۔ شایع کردۂ انجمن ترقی اُردو۔ قیمت [illegible]

**نگارستان** ۔ حضرت نیاز فتحپوری کے مخصوص ادبی رنگ کے مضامین کا مجموعہ جس میں سے بعض مضامین علحدہ کتابی صورت میں شایع ہوکر حسن قبول حاصل کرچکے ہیں۔ قیمت [illegible]

**دیوان فانی** ۔ مسٹر شوکت علی خاں فانی بی اے ایل ایل بی وکیل کا کلام نہایت بامزہ اور پُردرد ہوتا ہے۔ آپ کا دیوان کئی سال ہوے چھپا تھا مگر مطبع کے بند ہوجانے کی وجہ سے اشاعت نہ ہونے پائی۔ اب یہ گنج گرانمایہ ہمارے ہاتھ لگا ہے شائقین فوراً طلب کرلیں۔ قیمت عام مہر مگر ناظرین الناظر کے لیے ۱۲ر

**من چلے** ۔ دفتر رسالہ نقیب جو دیوان فانی کے طبع و اشاعت کا ذمہ دار تھا اُس نے کئی دلچسپ اور پُرمذاق کتابیں شایع کی تھیں۔ یہ پُرمذاق فسانہ بھی اسی ضمن میں شایع ہوا ہے۔ جس میں نئی تعلیم کے اثرات کمال ظرافت کے ساتھ دکھائے گئے ہیں۔ قیمت ۸ر

**اصرار خانم کی سازش** (اخلاقی ناول) جسمیں حیدرگڈھ کے اسلامیہ کالج کے ایک طالبعلم کا فسانۂ حُسن و عشق درج ہے۔ قیمت ۹ر

**انتخاب گلابی اُردو** ۔ مولانا توحیدی عرف ملا رموزی جو اخبارات و رسائل میں وقتاً فوقتاً گلابی اُردو کے نام سے ملکی و قومی، معاشری و اخلاقی، سیاسی و تمدنی امور پر تبصرہ کیا کرتے ہیں اُنکے بعض مشہور مضامین کا انتخاب۔ قیمت ۸ر

**منصوری** ۔ کوہ منصوری (مسوری) کے حالات دلچسپ پیرایہ میں بیان کیے گئے ہیں۔ کتاب کی طباعت میں بھی جدت کی گئی ہے۔ قیمت ۶ر

**ابن مُسلم** ۔ مسٹر سلطان حیدر جوش کے اُس ناول کا دوسرا ایڈیشن جس کا حوالہ الناظر کے گذشتہ نمبر میں کسی مقام پر آیا ہے۔ قیمت [illegible]

**تاریخ مغرب ابن العذاری** ۔ جسپر اسی پرچہ میں مفصل ریویو ہے جو صاحب ملاحظہ فرمانا چاہیں طلب فرمالیں۔ قیمت [illegible]

مہتمم الناظر ۔ [illegible] ۔ لکھنؤ

بسم اللہ
خدا کا نام لے کر

# سچ

جاری کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے جو انشاء اللہ آیندہ جنوری سے ہر جمعہ کو شایع ہوا کرے گا۔
یہ اخبار نسبتاً تمام اخبارات سے مختصر ہوگا، اس لیے کہ دنیا میں سچ کہنا جس قدر دشوار ہے اُسکے سُننے والے اُسی قدر مشکل سے ملتے ہین۔ اور کم سے کم مصارف میں اخبار چلانا منظور ہے۔

سچ کے اجراء کا مقصد وحید یہ ہے کہ مسلمانوں کو مسلمان بننے یعنی اسلامی زندگی اختیار کرنے کی دعوت دی جائے۔

سچ عامۂ مسلمین کو بتانا چاہتا ہے کہ خدا کے آخری برگزیدہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سادہ اور پاکیزہ معاشرت کا اتباع ہی دین و دنیا کی فلاح کا موجب ہے۔

سچ انگریزی تعلیمیافتہ مسلمانوں کو جتانا چاہتا ہے کہ تہذیب و شائستگی کا جو معیار کلام الٰہی اور سنت نبویؐ نے قائم کیا ہے' وہی اور صرف وہی قابل اعتماد اور لائق تقلید ہے۔

سچ عربی مدارس کے طلبا، علما و مشائخ کو یاد دلانا چاہتا ہے کہ اسلامی تعلیم محض کتابوں میں پڑھنے کے لیے نہیں ہے بلکہ ضرورت اسکی ہے کہ اُسکے بموجب عمل بھی کیا جائے۔

غرضکہ سچ ہر طبقہ اور درجہ کے مسلمانوں کو اُنکی غفلتوں پر متنبہ کرکے بیدار و ہشیار کرنا اور ہر امر میں انکو صحیح اسلامی تعلیم پر عمل کرنے کی ترغیب دلانا چاہتا ہے۔ السعی منی والاتمام من اللہ

سچ کا اہتمام اس فقیر ہی کے متعلق ہے مگر ترتیب و ادارت کے کاموں میں میرے رفیق کار اور شریک خدمت مولوی عبد الماجد صاحب اور مولانا عبد الرحمن نگرامی معلم دار العلوم ندوۃ العلماء ہیں گے اللہ العالمین سچ کو اسم با مسمّٰی ثابت کریں اور اُسے اپنے مقصد میں کامیاب بنائیں۔ وما توفیقی الا باللہ

سچ کی سالانہ قیمت ۔۔ روپے جو لازماً پیشگی آنا چاہیے۔ قیمت فی پرچہ ۔۔ جو صاحب نمونہ کا پرچہ ملاحظہ فرمانا چاہیں ایک آنہ کا ٹکٹ ارسال فرمائیں۔

چونکہ الناظر کے کاروبار سے اسکا حساب الگ رکھا گیا ہے اسلیے جملہ مراسلت و ترسیل زر اس پتہ پر کی جائے

**ظفر الملک مہتمم اخبار سچ لکھنؤ**

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# الناظر

نمبر ۱۶۰،۱۶۱ جلد ۲۷ — اکتوبر و نومبر ۱۹۲۴ء

## فیہ ما فیہ

(از خامہ : چلپی)

### دو بھائی قرآن میں

دُنیا کی سب سے زیادہ معتبر و مستند کتاب میں یوں مذکور ہے، کہ ایک مرتبہ ایک برگزیدہ قوم اپنی شامتِ اعمال کی پاداش میں ایک زبردست و طاقتور حکومت کے پنجۂ غضب میں گرفتار ہوگئی تھی، اُسکے حقوق بیدردی کے ساتھ پامال کیے جانے لگے، اُس پر سختیاں ہر طرح کی ہونے لگیں، یہاں تک کہ اُسکی اولادِ ذکور پیدا ہوتے ہی ذبح کردی جانے لگی۔ ظالم گورنمنٹ کو اپنی قوت و طاقت پر غرہ تھا، ارکانِ حکومت کو اپنی حکمت و تدبیر پر ناز تھا، اور فرماں روائے وقت حدودِ بشریت و عبدیت سے متجاوز ہوکر اپنے تئیں عملاً، کارسازِ حقیقی، رب الارباب و احکم الحاکمین کے مرتبہ پر رکھنے لگا تھا۔ عین اُس وقت غیرتِ الٰہی حرکت میں آئی، اور محکمۂ قضا و قدر سے اس مظلوم و بے بس قوم کو ظالم و پُرقوت حکومت سے نجات دلانے کا فرمان صادر ہوگیا۔

---

عالمِ ناسوت، عالمِ اسباب ہے، یہاں ہر مقصد کی تکمیل بندوں کے ذرائع سے کی جاتی ہے، چنانچہ اس مقصد کے لیے بھی ایک نہایت ہی مقبول و برگزیدہ بندہ کا انتخاب ہوا، جو اُسی محکوم و مظلوم طبقہ

کا ایک بے بس وبیکس فرد تھا۔ اِس معتدبہ بندہ نے عرض کی "کہ تنہا میرا دوش ناتواں اس بارِعظیم کا تحمل نہ کرسکے گا، میرا بھائی مجھ سے زیادہ زبان کی قوت رکھتا ہے، اسے بھی میرا شریک کار و رفیق بنایا جائے"۔ یہ عرض فوراً مستجاب ہوئی، اور نیابت الٰہی کے منصب مقدس پر "دونوں بھائی" ایک ساتھ مامور ہوئے۔ ظالم و جابر حکومت کا جبر و تشدد (Violence) اور افراط و طغیان (Repression) سب میں مشہور تھا، ان دونوں بھائیوں کو اپنے متعلق بھی یہی خیال ہوا، کہ حکومت ہمارے ساتھ بھی اپنے تشدد و طغیان کے ان ہی طریقوں سے پیش آئے گی، قَالَا رَبَّنَا اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَا اَوْ اَنْ یَّطْغٰی (طٰہٰ ع ۲) سکینت الٰہی نے ڈھارس دی، اور عرش کی بلندیوں سے القا ہوا کہ "ہماری نصرت و تائید تمھاری رفیق ہوگی، پریشان خاطر نہ ہو"۔ ساتھ ہی اس کی خاص تاکید ہوئی، کہ کہیں تم بھی تشدد (Violence) کے مقابلہ میں تشدد نہ اختیار کر بیٹھنا،

فقولا لہٗ قولا لینا (طٰہٰ - ع ۲) | بلکہ عمل میں تشدد تو الگ رہا، اپنی گفتگو و تقریر تک میں عدم تشدد (Non-Violence) پر عامل رہنا کہ یہی اقوام محکوم و مغلوب کے اسلحہ خانہ میں سب سے زیادہ قوی و کارگر حربہ ہے۔

---

یہ برادران محترم (علیہما الصلوٰۃ والسلام) جس خدمت مقدس پر متعین ہوئے تھے، وہ یہ تھی، کہ مظلوم و محکوم

فَاْتِیٰهُ فقولا انا رسولا ربک فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ ولا تعذبہم (طٰہٰ - ع ۳) | قوم بنی اسرائیل کو ظالم حکومت کے شدائد سے نجات دلائیں، اور استبداد کی غلامی سے آزاد کرائیں۔

یہ دونوں برادران گرامی قدر (علیہما السلام) جس سفارت الٰہی پر مامور تھے، وہ یہی تھی کہ قوم اسرائیل

فقولا انا رسولا رب العالمین ان ارسل معنا بنی اسرائیل (شعرا - ع ۲) | کو ظالم حکومت کی غلامی سے رہائی دلاکر خدائے عالم و عالمیان کی طاعت و بندگی کی جانب لائیں۔

فرماں روائے وقت کو یہ صدائے حریت و مطالبۂ حقوق اس قدر نامانوس اور انوکھا معلوم ہوا،

قال لمن حولہٗ الا تستمعون (شعرا - ع ۲) | کہ اس نے اپنی پارلیمنٹ کے سامنے، اپنی کیبنٹ کے روبرو، بڑے ہی حیرت و استعجاب کے ساتھ اس مطالبۂ آزادی کو نقل کیا، اور کہا کہ ایسا عجیب

قال ان رسولکم الذی ارسل الیکم لمجنون (شعرا - ع ۲) | مطالبہ پیش کرنا تو کسی غیر ذمہ دار سڑی سودائی، خبطی دیوانہ ہی کا کام ہو سکتا ہے!

اُس گورنمنٹ کو اپنے وسائل مادی و مالی، اپنی قوت حربی و عسکری، اپنی اعلیٰ تہذیب و شائستگی،

اپنی تنظیم و تدبیر پر ایک غیر متزلزل اعتماد تھا۔ اور

إنّا فوقهم قاهرون (اعراف - ۱۵) | اپنے تفوق و ترفع پر ایک غیر مشتبہ اطمینان۔ اور اس عاقل و دانا، ہوشیار و فرزانہ، حکومت کے تصور میں اس کا تو امکان بھی نہیں آسکتا تھا کہ کسی مقتدر و منتظم، با اقبال و صاحب جبروت حکومت کو کسی حالت میں بھی،

قالوا انؤمن لبشرین مثلنا و قومهما لنا عابدون (مومنون - ع ۳) | مفتوح و محکوم رعایا کے دو بیکس و بے بس افراد کے مطالبات کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑے گا۔

پس رعب شہنشاہی کے جملہ آداب و لوازم کو ملحوظ رکھ کر، اپنے اختیارات و اقتدارات، تعزیرات و ضوابط کا پورا مظاہرہ کر کے اور ٹھیک اُس ڈھٹائی کے ساتھ، جو ہر سرکش و خدا فراموش حکومت کا خاصہ ہوتی ہے، شیطان کی آواز، فرعون کے دہن و زبان سے یوں بر آمد ہوئی کہ

قال لئن اتخذت الٰہاً غیری لاجعلنک من المسجونین (شعراء - ع ۲) | خبردار، اگر ہماری گورنمنٹ کے سوا، کسی دوسری حکومت سے لو لگائی، تو اتنا سمجھے رہنا کہ ہمارے جیل خانوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔!

---

"دیوانۂ" حق فرزانۂ دنیا کی دھمکیوں سے غیر متأثر رہا۔ وہ دلائل محکم و شواہد پیہم کے ساتھ اپنی قوم کی آزادی کے مطالبہ پر قائم رہا، اور یہی کہتا رہا کہ

و جاءہم رسول کریم ان ادّوا الیّ عباد اللّٰہ (دخان - ع ۱) | بندگان خدا کو اپنا بندہ بنانے کی بجائے خدا کا بندہ بننے دو۔

جب آزادی کا مطالبہ کسی طرح نہ دبا، بلکہ (باصطلاح حکومتِ حال) "شورش" و "بےچینی" روز بروز بڑھنے لگی، تو فرعون اور فرعونیوں کے کیمپ میں ایک کھلبلی مچ گئی، اور اُس وقت کے بڑے بڑے خان بہادر و رائے بہادر، نواب بہادر و راجہ بہادر، رؤساء والا مقام و امرائے عظام، خطاب یافتہ و جاگیردار، تعلقدار و زمیندار، سب چلّا اُٹھے کیا اب "سرکار کی جے" نہ پکاری جائے گی؟ کیا ہماری سرکار ابد قرار

و قال الملأ من قوم فرعون اتذر موسیٰ وقومه لیفسدوا فی الارض ویذرک والٰہتک (اعراف ۱۵) | کا تسلط اُٹھ گیا، اور اب ملک مفسدوں اور شوریدہ سروں کے اوپر چھوڑ دیا گیا ہے، کہ وہ سرکاری اقبال کو جس طرح چاہیں، پامال کریں؟ کیا امن و آئین (Law and Order) کی حکومت اب ہمارے سروں سے اُٹھ گئی ہے؟

سختیاں بڑھائی گئیں، شدائد میں اضافہ ہوا، نئے نئے قیود عائد کیے گئے، مظلوم رعایا زیادہ تاب نہ لاسکی، خود اپنے سنجات دہندہ سے شکوہ و گلہ مندی کے لہجہ میں بولی کہ ہمیں تو تمہاری اس تحریک

قالوا اوذینا من قبل ان تاتینا ومن بعد ما جئتنا (اعراف - ۱۵)

آزادی سے کچھ نفع نہیں پہونچا، ہماری تکالیف تو تمہاری آمد سے قبل بھی ایسی ہی تھیں، اور اب بھی ویسی ہی ہیں!

داعی حق (علیہ السلام) نے سمجھایا، کہ آزادی کی جنگ لڑکوں کا کھیل نہیں ہے، مادی ذرائع وتدابیر

قال موسیٰ لقومہ استعینوا باللہ واصبروا، ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین (اعراف - ۱۵)

کے بجائے اپنا اعتماد خدا پر رکھو، اُسی سے مدد چاہو اور صبر و استقلال سے کام لیتے رہو، حکومتوں کا اُلٹ پھیر اُسی کے ہاتھ میں ہے، جسکو چاہے حکومت دے۔

ہاں یہ خیال رہے کہ آخری کامیابی اُسی کی ہوتا ہے جو شیطانی ترغیبوں سے بچتا ہے، اور رضائے حق میں کوشاں رہے۔

---

خدائی کی مدعی حکومت، خدائی قانون کی گرفت سے باہر نہ تھی، بایں ہمہ فکر وتدبیر، خوش نظمی و اقبالمندی، آخر اس سرکار عظمت مدار کو کبھی کبھی مصائب و آفات سے بھی دو چار ہونا پڑتا ہی تھا۔

ولقد اخذنا آل فرعون بالسنین ونقص من الثمرات لعلھم یذکرون (اعراف - ۱۶)

کاش ان واقعات و حوادث سے عبرت و نصیحت حاصل کی جاتی! لیکن یہ ایک فاتح و متمدن قوم کی ذہنیت سے کیونکر ممکن تھا! بجائے عبرت پذیری کے ہوتا یہ تھا، کہ جب کبھی کوئی صورت فلاح و بہبود کی پیدا ہوتی

فاذا جاءتھم الحسنۃ قالوا لنا ھذہ وان تصبھم سیئۃ یطیروا بموسیٰ ومن معہ (اعراف - ۱۶)

تو اُسے بلا تامل اپنی خوش انتظامی و اقبالمندی کا نتیجہ قرار دے لیا جاتا، اور اگر کوئی واقعہ اسکے برعکس پیش آتا، تو اُسے جھٹ اُسی پیامبر حق اور اُسکی جماعت کی نحوست اور شامت عمل کی جانب منسوب کر دیا جاتا!

اس سے بھی بڑھ کر فرعونیت یہ تھی، کہ جب حکومت کو کوئی خطرہ عظیم درپیش ہوتا، تو فوراً اس آزادی طلب و آزادی خواہ جماعت سے اپنے تعلقات ہموار کر لیے جاتے، اُسکو پوری آزادی عطا کرنے کا وعدہ

لئن کشفت عنا الرجز لنؤمنن لک ولنرسلن معک بنی اسرائیل، فلما کشفنا عنھم الرجز الیٰ اجل ھم بالغوہ اذا ھم ینکثون (اعراف - ۱۶)

کر لیا جاتا، اور اُسکے سردار کے آگے سر اطاعت خم کرنے کا اطمینان دلا دیا جاتا، لیکن جوں ہی وہ خطرہ ٹل جاتا، معاً وعدے و معاہدے، مواعید و مواثیق، پس پشت ڈالدیے جاتے اور غلاموں کا طبقہ بدستور غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا رہتا۔

ادھر یہ سب کچھ تھا، اُدھر آزادی کے سچے اور پکے علمبردار کے سامنے یہ درس موعظت بھی جاری تھا کہ ہمارے ہی ہاں کے تربیت یافتہ اور ہمارے نمک خوار ہوکر ہمارے مقابلہ میں آتے ہو، اور ہماری مہذب و شائستہ حکومت کی برکاتِ امن و نظم کو یکسر نظرانداز کیے دیتے ہو! کلیمؑ کی زبان گویا ہوئی، کہ جی اور کیا! اور سب سے بڑھ کر آپ کا یہ احسان عظیم ہے، کہ ساری قوم بنی اسرائیل کو آپ نے اپنی غلامی سے مشرف و مفتخر کر رکھا ہے!

وتلک نعمۃ تمنہا علیّ ان عبدت بنی اسرائیل (شعراء - ع ۲)

---

آزادی کا جذبہ ایک بار بیدار ہوکر، جس طرح کہیں بھی مردہ نہیں ہوا ہے، یہاں بھی استبداد کی قوتوں سے مسخر و مغلوب نہ ہوسکا، مظلوموں کی آہوں نے، بیکسوں کی فریادوں نے، یتیموں کی ٹھنڈی سانسوں نے بارہا عرشِ الٰہی تک کو ہلا دیا ہے، فرعون اور اُسکی گورنمنٹ بیچاری کی کیا بساط تھی، جو انکا مقابلہ کرسکتی، ایوانِ حکومت میں لرزہ پڑگیا، قصرِ استبداد کی بنیادیں ہلنے لگیں، گھبراکر خودسر فرماں روا نے اپنی "کیبنٹ" کا ایک خفیہ اجلاس کیا، اور اہتمام رکھا، کہ کارروائی بالکل "کانفیڈنشل" رہے، باہر تک کوئی "رپورٹ" نہ پہنچنے پائے۔ بالآخر عقلائے سلطنت کی "ایگزیکٹو کونسل" بحث و مباحثہ اصلاح و مشورے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچی، کہ "دونوں بھائیوں" نے سازش کرکے قوم پر افسوں پھونک دیا ہے، بغاوت پر کمر باندھ لی ہے، اور حکومت کا تختہ اُلٹ دینے کا ارادہ کرلیا ہے، پس اس فتنۂ عظیم کے استیصال کا انتظام پوری قوت کے ساتھ کرنا ضروری ہے' اور اس کے لیے زورِ بازو و زورِ دماغ، قوتِ شمشیر، قوتِ تدبیر "آرگنائزیشن" اور "پروپیگنڈا" کے تمام ذرائع و وسائل کو بروے کار لانا چاہیے!

فتنازعوا امرہم بینہم واسروا النجوٰی (طٰہٰ - ع ۳)

قالوا ان ہٰذان لسٰحران یریدان ان یخرجٰکم من ارضکم ویذہبا بطریقتکم المثلیٰ فاجمعوا کیدکم ثم ائتوا صفاً (طٰہٰ ۳)

---

یہ رائے قائم ہوتے ہی، اسپر عملدرآمد شروع ہوگیا۔ ۱۹۲۱ء کی امن سبھاؤں کی طرح اُسوقت بھی جذبۂ آزادی کو دبانے کے لیے ملک بھر میں مجلسیں اور انجمنیں قائم ہونے لگیں، رائے عامہ کو اپنے موافق و ہموار بنانے کے لیے جس طرح آج ہر ہر صوبہ میں "پبلسٹی بیورو" قائم ہیں، اُسوقت بھی ہر ممکن تدبیر عمل میں لائی جانے لگی۔ اور خلقِ خدا کو گمراہ کرنے کا کام آج جس طرح نیم سرکاری اخبارات سے لیا جاتا ہے، اُسوقت بھی کوئی کوشش اُٹھا نہ رہی۔ غرض خلقت پر سرکار کی ہیبت و عظمت، اقبال و جبروت کا سکہ بٹھانے کے لیے "کید" "سحر" و "استرہاب" کی قوتوں کا

وابعث فی المدائن حاشرین یاتوک بکل سحارٍ علیم (شعراء - ۳)

وارسل فی المدائن حاشرین یاتوک بکل ساحرٍ علیم (اعراف - ۱۴)

سحروا اعین الناس واسترھبوھم عمل پورے زور وشور کے ساتھ جاری رہا، اور ٹھیک آجکل کے مدبرین مملکت و دانایانِ
وجاءو بسحر عظیم (اعراف - ۱۴) سیاست کی طرح فرعون کی... گورنمنٹ برابر اسی کا اعلان کرتی رہی کہ یہ تو صرف چند شورش پسند

فارسل فرعون فی المدائن حٰشرین ان ھٰؤلاء لشرذمۃ قلیلون - وانھم لنا لغائظون وانا لجمیع حٰذرون (شعراء - ۴)

اور شورش پسندوں نے ملک میں فتنہ و فساد برپا کر رکھا ہے، اور اس لیے ہم کو مجبوراً انھیں کے خلاف ذرا سخت کارروائی کرنا پڑتی ہے، ورنہ سارا ملک تو ہماری وفاداری پر ثابت و استوار ہے، اور ہماری حکومت بھی عام رعایا پر دل سے مہربان ہے!

آج کل کے وفاداران سرکار، ہواخواہان دربار کی طرح، اُس وقت کے نیاز کیشان حکومت بھی شاید اغراض ذاتی کی آلائش سے بالاتر نہ تھے، "دونوں بھائیوں" کی مخالفت میں کام تو بڑی ہی ہوشیاری وسرگرمی سے کیا، لیکن ساتھ ہی یہ مطالبہ بھی پیش کر دیا، کہ اگر اقبال خداوندی سے ہم نے حریف کو نیچا

قالوا ان لنا لاجرا ان کنا نحن الغالبین (اعراف - ۱۴)

دکھا دیا تو پھر ہم کو خاطر خواہ انعام بھی، جاگیر یا سند، خطاب یا جائداد کی شکل میں ضرور عطا ہو! حکومت کے خزانہ عامرہ میں جو غریبوں سے حاصل کی ہوئی دولت سے لبریز تھا، اسکی کیا کمی تھی۔ بہ غایت لطف وکرم ارشاد ہوا۔ کہ تنہا خطاب و جائداد

قال نعم، وانکم لمن المقربین (اعراف ۱۴۰)

پر کیا موقوف ہے، دولتِ تقرب خاص سے بھی سرفراز ہوگے، رازداری و اعتماد کے مناصب تمھارے لیے ہیں، وزارت تمھارے لیے ہے، گورنری تمھارے لیے ہے، ہم خود تمھارے لیے ہیں۔

---

غرض یہ سارے جتن ہوے، مکروفن، تدبیر و احتیال، حیلہ و سازش، طاقت و جبروت، عظمت و شوکت، ہر شے کے شاندار مظاہرے ہوے، اور وہ سب کچھ کیا گیا، جو ایک متمدن و با اقبال سرکار کے بس میں ہے، اور جن کی ساری تفصیل، قرآن پاک کے تین مختصر فقروں (فاجمعوا کیدکم - واسترھبوھم - وجاءو بسحر عظیم) کے اندر جھلک رہی ہے - لیکن آخری نتیجہ جو برآمد ہوا، وہ اوراق لیل و نہار پر ثبت ہے، صحیفۂ کائنات کی ایک ایک سطر اُس کی شہادت دے رہی ہے - سروری و سرداری کو اپنا حق فطری سمجھنے والا سر، ذلت و رسوائی کے گہرے سمندر میں غرق ہوا، دوسروں کے لیے غلامی اور اپنے لیے خواجگی کو مخصوص سمجھنے والے جسم نے اپنے تئیں پانی کی چند لہروں کے سامنے بےبس پایا، اور انا ربکم الاعلیٰ اور انا فوقھم قاھرون پر کھلنے والی زبان، جب بند ہونے لگی تو اپنے تئیں اس اعتراف پر مجبور پایا، کہ

آمنت انہ لا الٰہ الا الذی آمنت بہ | کہ بنی اسرائیل بےبس و مغلوب تھے، لیکن اُن کا معبود بےبس و

رائیل و انا من المسلمین (یونس۔ع ۹) | مغلوب نہ تھا۔ قوّت و اقتدار، حکومت و اختیار، سارے کا سارا، صرف اُسی کا تھا، اُسی کا ہے، اور اُسی کا رہے گا۔

اور وہ سلطنت، جسے اپنے اقبال و خوش بختی پر ناز تھا، جسے اپنے ذرائع و وسائل پر غرہ تھا، جسے وت و سرمایہ پر اعتماد تھا، جسے اپنی تنظیم و شائستگی پر گھمنڈ تھا، چشم زدن میں (زاروں کی سلطنت ح) ایسی معدوم ہوئی، کہ آج بجز کتاب عبرت کے، کہیں اُس کا نام و نشان تک نہیں ملتا! فرعون مٹگیا، اہ و حشم رخصت ہوگیا، اُسکی وزارتیں غائب ہوگئیں، اُسکی نسلیں افسانہ بن گئیں، اُسکے فاتحیوں اں تک ہوا میں مل گئیں، اُسکے وابستگانِ دامن اور حاشیہ نشینان و مقربین دربار کا تذکرہ، تذکرۂ عبرت۔ لیکن وہ دونوں برادران محترم (علیہما السلام)؟ وہ دونوں "دیوانہ"؟ وہ دونوں "ساحر"؟ وہ بے بس رعایا کے دو بے بس افراد؟ وہ آج بھی زندہ ہیں، کل بھی زندہ رہیں گے، اور اُس وقت تک رہیں گے، جب تک اُن کا زندہ و قائم، حی و قیوم، ازلی و ابدی، پروردگار اُنھیں زندہ رکھے!

---

## ی ہندوستان میں

آج ہندوستان میں بھی دو بھائی موجود ہیں، خدائے واحد کے پرستار، رسول کے عاشق زار، کفر و غلبۂ کفر سے بیزار، اُسوۂ موسوی کی زندہ یادگار۔ یہ دونوں بھائی بھی ایک پست ہ، مغلوب و محکوم قوم کے افراد ہیں۔ ان دونوں بھائیوں میں بھی باہم بے حد محبت و اعتماد ہے۔ یہ دونوں بھی ہر امانت الٰہی کی ادائی میں ایک دوسرے کے رفیق و شریک رہتے ہیں۔ ان دونوں بھائیوں نا بھی ایک زبردست و متمدن حکومت کے سایۂ عاطفت میں ہوا۔ یہ دونوں بھائی بھی ایک زمانہ ں جماعت سے بڑے گہرے تعلقات رکھ چکے ہیں۔ ان دونوں بھائیوں نے بھی ایک با اقبال و حکومت کے سامنے یہ مطالبہ پیش کیا ہے کہ انکے ہمقوموں کو اپنی غلامی سے آزاد کرکے خدا کی غلامی نے دے۔ ان دونوں بھائیوں نے بھی اپنے تئیں تشدد سے محترز رہنے، اور قول و فعل میں عدم تشدد رہنے کا پابند کرلیا ہے۔ یہ دونوں بھائی بھی حکومت قاہرہ کی طرف سے، سخت سے سخت شدائد ت کا تحمل کر چکے ہیں۔ ان دونوں بھائیوں پر بھی حکومت کی طرف سے یہی الزام ہے، کہ اپنی ایک عت کو ہمراہ لے کر ملک میں شورش پھیلا رہے ہیں، اور امن عامہ میں خلل ڈال رہے ہیں۔ ان بھائیوں کی تحریک کے جواب میں بھی، حکومت، اخبارات نکلوا چکی ہے، انجمنیں اور سبھائیں قائم کرچکی بکثرت مضامین و رسائل شائع کراچکی ہے۔ ان دونوں بھائیوں کی بھی مخالفت کے صلہ میں سرکار اپنے تقرب سے مشرف کرتی ہے، خطابات عطا فرماتی ہے، اور مناصب اعلیٰ عنایت کرتی ہے،

یہ دونوں بھائی بھی بجز صبر و توکل، استقامت و تحمل، اور توقع الطاف و عنایات حق کے، ہر قسم کے سازو سامان ظاہری سے معری و محروم ہیں۔ اور جس حکومت سے مقابلہ کے لیے اُٹھے ہیں، اُسے اپنے ذرائع و وسائل پر اعتماد، اپنے فوج و خزانہ پر ناز، اور اپنی تنظیم و تہذیب پر دعویٰ ہے۔

کیا اتنے اتفاقاتِ حسنہ کا اجتماع، خدائے لطیف و خبیر، حکیم و علیم، کے نظام کار و طریق عمل میں، محض بے معنی ہے؟ الٰہ العالمین، ہم سب کی آنکھوں سے غفلت کے پردے اُٹھائے، اور اشخاص و اقوام، حوادث و واقعات کو اُنکی اصلی شکل میں جلوہ گر کرے! اللّٰھُمَّ اَرِنَا الاشیاءَ کماہیَ۔

## یہ کیا کہا کہ داغ کو پہچانتے نہیں!

ہماری قوم کے اُس "تعلیم یافتہ" طبقہ نے، جس کا دائرۂ نظر کلکٹر صاحب کی گفتگو اور بعض اینگلو انڈین اخبارات کے مطالعہ تک محدود ہے، تو اپنی جگہ پر یہ فیصلہ صادر کر دیا ہے، کہ "کھدر پوشی" "عدم تشدد" اور "چرخہ" کا تذکرہ "علم و ادب" کے منافی، اور ایک "علمی" رسالہ کے مرتبہ سے فروتر ہے لیکن اُسے یہ سُن کر شاید مایوسی و تاسف ہو، کہ یورپ کا سنجیدہ و علمی طبقہ روز بروز انھیں تذکروں سے زیادہ مانوس، اور ان کا قدر شناس ہوتا جاتا ہے۔ یورپ و امریکہ کے بڑے سے بڑے اخبارات میں گاندھی جی کے اصول پر صدہا مضامین نکل چکے ہیں، اعلیٰ سے اعلیٰ رسائل (مثلاً ہیبرٹ جرنل، کرنٹ تھاٹ، ریویو یو رپا، وغیرہ) سابرمتی کے خانقاہ نشین درویش کی تعلیمات پر بارہا مفصل نقد و تبصرہ کر چکے ہیں۔ اور اب مستند و گراں پایہ مصنفین و ارباب فکر نے اسی موضوع پر مستقل تصانیف کا بھی سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ برطانیہ کے مشہور ماہر تعلیمات مسٹر فِشر، فاضل جلیل برنارڈ شا، اور نامور ادیب پروفیسر گلبرٹ مرے امریکہ کے مسٹر اپٹن سنکلیر، اور ریونڈ ہومز، فرانس کا ممتاز فلسفی و انشاپرداز رومین رولان، اور جرمنی و روس کے متعدد فضلا و اہل کمال نے اتنا ہی نہیں، کہ گاندھی و تعلیمات گاندھی پر مداحانہ مضامین شائع کیے ہیں، بلکہ بعض نے معتقدانہ حیثیت سے مستقل تصانیف بھی تیار کی ہیں۔ حال میں خبر آئی ہے کہ برطانیہ کے مشہور علمی مرکز (برمنگھم) کے انسٹیٹیوٹ نے اپنی موسم سرما کی تعلیمی ششماہی میں لکچروں کا جو سلسلہ منظور کیا ہے، وہ کل کا کل، گاندھی اور گاندھیت ہی سے متعلق ہے۔ پہلے لکچر کا عنوان "مہاتما گاندھی اور عدم تشدد" ہے، اور اسی سے ملتے جلتے ہوئے پانچ لکچر اور ہوں گے، جن میں مہاتما جی کے فلسفہ و اصول پر مفصل بحث ہوگی، اور اس بحث و مذاکرہ میں برطانیہ کے بڑے سے بڑے جلیل القدر علما (مثلاً پروفیسر سوبہا) شرکت کرینگے۔

کیا اب بھی گاندھی اور عدم تشدد، چرخہ اور کھدر کا ذکر "علم و ادب" کے منافی سمجھا جائے گا؟ کیا اب بھی یہ تذکرے، ایک "علمی" رسالہ کے مرتبہ سے فروتر سمجھے جاتے رہیں گے؟

## کانفرنس

علیگڈھ کانفرنس، جس کا نام محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سے صحیح طور پر تبدیل کر کے اب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس رکھا گیا ہے، ہماری قومی زندگی کی ایک قدیم و دلچسپ یادگار ہے۔ مسلمان جب تک سیاسیات کے شجر ممنوعہ سے الگ تھے، اُس وقت تک انکی توجہ کا اصلی مرکز اسی انجمن کے سالانہ اجلاس رہتے تھے۔ پچھلے اجلاس کی ضخیم ومبسوط رپورٹ ستمبر ۱۹۲۴ء میں شایع ہوئی ہے، اور مختلف حیثیات سے قابل ذکر ہے۔ رپورٹ چار جداگانہ حصوں میں تقسیم ہے۔ حصہ اول میں اجلاس کی پوری کارروائی درج ہے، بہ اضافۂ ضمیمہ جات۔ حصۂ دوم، اُن اردو لکچروں کا مجموعہ ہے، جو مختلف ماہرین فن نے مختلف عنوانات پر کانفرنس میں دیے تھے۔ یہ دونوں حصے ایک جلد میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ حصہ سوم، انگریزی میں ہے، اور اُن انگریزی لکچروں کا مجموعہ ہے، جو کانفرنس میں پڑھے گئے تھے۔ حصۂ چہارم، صاحبزادہ صاحب کے خطبۂ صدارت کے لیے مخصوص ہے، جس پر کسی پچھلے الناظر کے انھیں اوراق میں تبصرہ ہوچکا ہے۔ بحیثیت مجموعی، اس سال کی رپورٹ ایک دلچسپ، پُرمغز، و مستقل مفید تالیف کی حیثیت رکھتی ہے۔ کاغذ، طباعت، کتابت، ہر اعتبار سے قابل داد۔ ہر حصہ علٰحدہ علٰحدہ بھی مل سکتا ہے۔ چاروں حصوں کی یکجائی قیمت عہ ہے۔ ملنے کا پتہ، دفتر کانفرنس، علیگڈھ۔

---

حصۂ دوم، جس کی ضخامت تقریباً تین سو صفحہ ہے، علم و سنجیدگی کا ایک قابل قدر مرقع ہے۔ اس میں ۲۳ لکچر یکجا ملیں گے جو مختلف ماہرین فن نے کانفرنس کے سامنے پڑھے تھے۔ ابتداء میں کانفرنس کی تعلیمی نمائش کے شعبۂ علمی پر ایک ندوی عالم کا مضمون قابل مطالعہ ہے۔ لکچروں کی نوعیت کا اندازہ عنوانات ذیل سے ہوگا:-

(۱) تعلیمی اعتبار سے ابتدائی ریاضیات کی قدر و قیمت۔
(۲) زبان اردو
(۳) جغرافیہ کا تصور، اور اُس کی تعلیم میں مشاہدات کی ضرورت۔
(۴) کم لاگت کے اسکول،
(۵) ارض القرآن
(۶) علم کیمیا

اس طرح کے کل ۲۳ مقالات، مختلف علوم و فنون سے متعلق ہیں، اور ہر مقالہ بجائے خود ایک مستقل

رسالہ یا تالیف کی اہمیت رکھتا ہے۔ رشید احمد صاحب صدیقی کا لکچر "اردو زبان پر ایک مستقل ادبی کارنامہ ہے اور خصوصیت کے ساتھ قابلِ داد ہے۔ پروفیسر فیروزالدین مُراد، پروفیسر عبدالمجید قریشی، پروفیسر ابن حسن، قاضی جلال الدین صاحب اور خواجہ غلام الحسنین کے مقالات، علی الترتیب، طبیعیات، ریاضیات، تاریخ، جغرافیۂ قرآنی، اور علوم قرآنی پر پُرمغز ہونے کے ساتھ ہی دلچسپ و شگفتہ بھی ہیں۔

نقص و سامحت سے کوئی انسانی کوشش خالی نہیں ہوسکتی، تاہم اس میں ذرا شبہ نہیں کہ ہر ممبر نے اپنی ذمہ داری کا احساس رکھا، اور کانفرنس کی تعلیمی حیثیت کو کامیاب بنانے میں اپنی سنجیدگی و محنت سے پوری شرکت کی۔ اس خوش آیند نتیجہ پر جملہ کارکنانِ کانفرنس، خصوصاً محترم صدر، و محترم سکرٹری، قابلِ مبارکباد ہیں۔

---

حصۂ سوم، جو انگریزی زبان میں ہے، تقریباً ڈھائی سو صفحہ کی ضخامت رکھتا ہے۔ شروع میں وہ ایڈریس، درج ہے، جو گورنر بہادر کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا، اور پھر وہ جواب بھی جو صاحب موصوف کی زبان فیض ترجمان سے صادر ہوا۔ یہ جواب ایک معمولی درجہ کی چیز ہے، ہر گورنر سے کم وبیش اسی جواب کی توقع ہوسکتی تھی، اسکے طول وعرض میں اُس علم و فضل، کمال و تبحر کی قطعاً کوئی جھلک موجود نہیں، جس کا ذکر نواب صاحب بھیکم پور کے قصائد نظم و نثر میں موجود ہے۔ صوبہ جات متحدہ و پنجاب کے ڈائرکٹرانِ تعلیم کے دو ایڈریس ہیں، اور پھر وہ ۲۱ لکچر جو مختلف ماہرینِ فن نے تعلیمی مسائل پر پڑھے تھے ان ماہرینِ فن میں مسلمانوں کی تعداد صرف چار ہے، سات انگریز ہیں، باقی دس ہندو اور ملکی میسائی ہیں۔ اور ان چار ماہرِ فن مسلمانوں میں، مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ میں سے ایک فرد بھی نہیں! کیا اسے محض اتفاق پر محمول کیا جائے، یا یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہوگا کہ مسلم یونیورسٹی کے مسلم اساتذہ میں سے ایک بزرگ بھی، باوجود اپنی اعلیٰ مغربی ڈگریوں کے، کسی علم و فن سے متعلق انگریزی زبان میں اظہارِ خیال پر قادر نہیں؟ فی الجملہ اس حصہ کے مضامین کا مطالعہ بھی لطف و نفع سے خالی نہ ہوگا۔

---

حصۂ چہارم، نام ہے محض صدر صاحب کے خطبۂ افتتاحیہ کا۔ اس اہم و قابلِ قدر خطبہ پر ایک پچھلے اوراق میں تبصرہ ہو چکا ہے۔ اس لیے کسی جدید رائے زنی کی ضرورت نہیں۔ بحیثیت مجموعی، رپورٹ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اس مرتبہ کا اجلاس اپنے مقاصد کے لحاظ سے ہر طرح کامیاب رہا۔ کانفرنس کی بنیاد جن اصول پر ہے، اُن سے راقم سطور کو ایک بڑی حد تک اختلاف ہے۔ اس اختلاف

کا اظہار بارہا ان صفحات میں ہو چکا ہے، اور آیندہ بھی انشاء اللہ حسب موقع ہوتا رہے گا، لیکن اس اصولی اختلاف کی توضیح کے بعد، کانفرنس اگر اپنے محدود مقاصد کی حدود میں رہ کر مفید خدمات انجام دیتی ہے، تو اُس کا اعتراف ہر مسلم پر لازم ہو جاتا ہے۔ پچھلے سال کی درخشاں کامیابی یقیناً آفتابِ علیگڈھ کی ضو فشانی کا نتیجہ ہے، خدا اس روشنی کو روز بروز زیادہ صاف و منور کرتا جائے، اور بجائے برقی جگمگاہٹ کے اس میں نورانیت اور صفائی پیدا کرتا رہے۔ صدرِ جلسہ کا انتخاب صحیح، اس قسم کی مجالس میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، کاش صدر ہمیشہ ایسا نصیب ہوتا رہے، جو بجائے صوبہ کے حاکم کے، احکم الحاکمین کے دربار میں رسوخ و تقرب کا حریص ہو، اور جس کی جیبیں ..... اگرچہ خالی ہوں، لیکن دل محبت اسلام سے، اور دماغ خودداری و متانت سے خالی نہ ہو۔!

---

**ہم تشنہ کامانِ زیارتِ جمالِ دوست!** لیکن جلسۂ کانفرنس پر تبصرہ یقیناً نامکمل رہ جائے گا، اگر ناظرین کی سرسری نظر اُسکے سب سے زیادہ دلکش و ہوش ربا منظر کی جانب متوجہ نہ کی گئی۔ یہ وہ ساعتِ ہمایوں تھی، جب تاجدارِ حُسن، پیکرِ جمال، تمثالِ دلبری، سرولیم میرس نے اپنی "زیارتِ جمال باکمال سے "تشنہ کامانِ جمالِ دوست" کو مشرف و سرافراز فرمایا! اور سرآمدِ عاشقانِ زمن، رشکِ قیس و فرہاد، نواب مزمل اللہ خاں بہادر بالقابہ التعظیم نے بہ صد ذوق و شوق، و صد ہزار تمنا و آرزو، بڑھ کر قدم مبارک سے جبینِ عقیدت کو سربلند، اور ناصیۂ نیاز کو مفتخر کیا! اس منظر کا پورا لطف اُٹھانا ہے، تو ناظرین کو رپورٹ کے حصہ اول کے ص۳۵-۳۶ ملاحظہ کرنا چاہیے۔ مختصر یہ ہے، کہ اس خدائے مجازی کو پہلے اپنے کاشانۂ وفا و نیاز پر لنچ کے لیے مدعو کیا گیا (ص۳۵)، پھر کالج کی زمین پر "شاندار" ایٹ ہوم دیا گیا (ص۳۶)، لیکن والہانہ جذباتِ عقیدت کی اس سے بھی تسکین نہ ہوئی، اور گورنر بہادر نے جب کانفرنس ہال میں قدم رنجہ فرمایا، تو کانفرنس کی جانب سے "پُرزور خیر مقدم" کی سعادت بھی اسی خوش نصیب عاشقِ دیرینہ کے حصہ میں آئی! پھر "نثر عاری" کی سادہ زبان، جب والہانہ جوش و خروش، اور سرفروشانہ حسرت و ارمان، کی ترجمانی میں قاصر رہی، تو نظم کے خوان میں قلبِ عقیدت آگیں کی قاشیں لگا کر نذرِ خدمت کیں! خدا کرے یہ نذر دربارِ گورنری میں مقبول ہو گئی ہو!

---

" خیر مقدم" کانفرنس کی طرف سے تھا، لیکن ساری تقریرِ دلپذیر" میں اگر ایک فقرہ نہیں، ایک لفظ بھی مقاصدِ کانفرنس، مقاصدِ کالج، مقاصدِ یونیورسٹی، مقاصدِ تعلیم سے متعلق آجاتا، تو وارفتگیِ عشق کا جذبۂ صادق ناقص رہ جاتا، اس لیے الحمد للہ یہ داستانِ عشق اس قسم کے حشو و زوائد سے یکسر پاک و صاف ہے!

یوسفؑ جب جلوہ افروز ہوئے، تو دو سو زنانِ مصر میں سے ایک بھی اپنے حواس درست رکھنے پر قادر نہ ہو سکی، اور سب نے بجائے پھلوں کے اپنے ہاتھوں کو کاٹ لیا، کوہِ طور پر جب تجلی الٰہی ہوئی تو حضرت کلیمؑ بہ ایں ظرفِ نبوت و شرفِ رسالت، تابِ نظارہ نہ لا سکے، اور بیہوش ہو گئے۔ پھر آپ ہی انصاف فرمائیں کہ جب کانفرنس کے ظلمتکدہ کو کوئی رشکِ یوسف اپنے جمالِ جہاں آرا سے مطلعِ انوار بنا دے، تو ایک عاشق صادق سے یہ توقع رکھنی، کہ وہ اُسوقت موقع و محل کا لحاظ رکھے گا، کانفرنس کے مقاصد کو شمار کرائے گا، کلام کے ربط و نظم کی پابندیوں میں اُلجھا رہے گا، اقلیمِ عشق و الفت میں محال عقلی کی توقع رکھنا ہے یا نہیں! بہر حال پوری سرگذشت کے اعادہ کے لیے تو جامی و خسرو کے قلم کی ضرورت ہوگی، ہم بدمذاق اغیار کے کانوں تک جن چند الفاظ اور فقروں کی بھنک پہونچی، وہ حاضر ہیں:۔

"حضور کے محامد و مدارجِ علیا کا مفصل بیان"۔ "حضور انور کی ذاتی علمی قابلیت اور علم پروری"۔ "حضور کا کلاسیکل زبانوں کا وسیع علم اور گریک نظم کا مشہور ترجمہ" "حضور کی اپنے تمام دائرۂ عمل میں عالیشان کامیابی"۔ "اصلاحی اسکیم میں حضور کے دل و دماغ کا کتنا حصہ" "دہلی میں حضور سے ملا تھا اور گھبرا کر پوچھا تھا کہ طبیعت عالی کچھ ناساز تو نہیں" "حضور انور علیگڈھ کو یہ عزت عطا فرمائیں کہ یہاں ایک چھوٹا سا گورنمنٹ ہاؤس بن جائے" "ہم تشنہ کامانِ زیارت جمال دوست" "حضور کی زیارت جمال باکمال سے مستفید ہوں" "قانع بہ تجلی نہ شود طالبِ دیدار"

کے، سی، آئی، ای بود و از خطاب  ملکہ بالاتر ازاں آید ہمی
از ہجومِ شوقِ دیدار تو قوم  کارواں در کارواں آید ہمی
حکمرانِ ملک بسیار اند لیک  "میر" بر دل حکمراں آید ہمی
از وفورِ جوششِ مداحیِ تو  ہر بنِ مویم زباں آید ہمی

تیسرے شعر میں "میر" شاید "میرس" کا مخفف بنایا گیا ہے، اگر ایسا ہے، تو اس لطیف اجتہادِ شعری کی داد نہ دینا ظلم ہے!

---

کانفرنس کے سکرٹری صاحب کی خدمت میں، باادب التماس ہے کہ اگر آیندہ بھی اسی قسم کے لطائف کانفرنس میں پیش آتے رہیں، تو ان لطائف و نکات کے لیے ازراہِ کرم، کانفرنس کی سنجیدہ کارروائیوں سے الگ، رپورٹ کا ایک حصہ مخصوص کر دیں، اور اُس حصہ کی اشاعت صرف گورنمنٹ ہاؤس اور اُسکے لحقات تک محدود رکھی جائے۔ ورنہ عام پبلک کے سامنے جب اس مجموعہ کے اندر یہ زعفران زار بھی پیش

ہوگا، تو ہر دیانتدار تبصرہ نگار اس پر مجبور ہے، کہ طاؤس کے "نقش و نگار" کے ساتھ اُسکے "پائے زشت" پر بھی نظر رکھے، اور اگر اسکی یہ عبارت کسی حلقہ میں سوء ادب سمجھی جائے، تو اُسکو معذور رکھا جائے

---

## ایک شریف انگریز

حکمراں قوم کا ہر ہر فرد، اپنی عظمت و افضلیت کا احساس رکھتا ہے، اور اپنے مقابلہ میں محکوم و مفتوح رعایا کے بڑے سے بڑے فرد کو حقیر و بے حقیقت سمجھتا ہے۔ یہ جذبہ شاید ایک بڑی حد تک فطری ہے، تاہم ہر کلیہ میں مستثنیات ہوتے ہیں۔ اس استثناء کی اعلیٰ مثال مسٹر چارلس اینڈریوز ہیں۔ وہ نسلاً خالص انگریز ہیں، برطانیہ کے ایک معزز خاندان کے رکن ہیں، مسیحی مذہب کے زبردست عالم ہیں، ہندوستان میں کیمبرج مشن کی جانب سے مشنری ہوکر آئے، اور مدتوں اپنے فرائض کی انجام دہی میں سرگرم رہے۔

سچے مسیحیوں کی ایک شناخت کلام مجید میں یہ ارشاد ہوئی ہے، کہ

وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً (حدید-۴) اُن کے قلوب میں نرمی اور محبت ہوا کرتی ہے۔ بحمد اللہ یہ صفت مسٹر اینڈریوز میں بوجہ اتم موجود ہے، وہ ہندوستانیوں کو اپنا مساوی سمجھتے ہیں، ادنیٰ سے ادنیٰ مہتر اور چمار سے بھائی کی طرح ملتے ہیں، اُنکے قلب میں ہر مخلوق کی طرف محض محبت ہی کی گنجائش ہے۔ وہ اپنی معاشرت میں بھی ہندوستانی ہوگئے۔ اُنکی غذا، لباس، طرز ماند و بود، ہر شے ٹھیٹھ ہندوستانی ہے۔ آج سے پندرہ بیس سال قبل، جب اُن کا مستقل قیام دہلی میں بحیثیت سینٹ اسٹیفن کالج کے پرنسپل کے رہتا تھا۔ بعض مسلمان مشاہیر شہر سے انکے مخلصانہ تعلقات قائم ہوگئے تھے۔ اُن میں سے ایک اُردو کے ایک پختہ نویس مصنف شمس العلما مولوی ذکاء اللہ تھے، جو تاریخ، ریاضی، سائنس، وغیرہ میں بیسیوں تراجم و تالیفات اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ اُن کا انتقال غالباً ۱۹۱۱ء میں ہوا۔ مسٹر اینڈریوز نے اُسی وقت انگریزی میں اُنکی سوانحعمری مرتب کرنا شروع کردی۔ درمیان میں ایسے موانع پیش آئے، کہ یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ اب بارہ تیرہ برس کے بعد موصوف نے اس کام کے لیے پھر وقت نکالا ہے، اور کتاب مکمل کرکے کیمبرج میں طبع ہونے کو دے دی ہے۔ اسکے تیار ہونے میں تو ابھی کچھ وقت لگے گا، اُسوقت تک اُسکی اشاعت بہ اقساط، ہندوستان کے نامور انگریزی رسالہ ماڈرن ریویو (کلکتہ) میں ہوتی رہے گی۔ چنانچہ پہلی قسط رسالہ مذکور کے نومبر نمبر میں نکل بھی چکی ہے۔ یہ قسط صرف دو دیباچوں پر مشتمل ہے۔ ایک مفصل دیباچہ خود اینڈریوز صاحب کا ہے۔ دوسرا دیباچہ شمس العلما مولانا نذیر احمد مرحوم (مترجم قرآن) کے قلم سے ہے، جسے اپنی وفات سے اُنھوں نے چند ہفتہ قبل

سنہ ۱۹۱۲ء میں تحریر فرمایا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے، کہ کتاب مذکور میں مولوی ذکاء اللہ کے علاوہ، مولوی نذیر احمد کی بھی روئداد زندگی ہوگی۔ انگریز اہل قلم کی طرف سے ہندوستانی معاصرین کی خدمت گزاری کی یہ مثال الشاذ کالمعدوم کے حکم میں داخل ہے۔ اہل ہند، خصوصاً مسلمانوں کو اس خدمت کی علمی داد دینی چاہیے۔

## زرداروں کی ناداری

لی فیلڈ سے چلا ہوا سرکاری تار، مورخہ ۵۔ نومبر جو ہندوستان کے انگریزی اخبارات میں ۷۔ نومبر کو شایع ہوا ہے، مظہر ہے، کہ ۲۷ر اکتوبر سنہ ۳۲ء کو انگلستان میں باضابطہ "بے روزگاروں" کی تعداد کچھ اوپر ۱۲ لاکھ تھی، اور ۳۱ر دسمبر سنہ ۲۳ء کو یہ تعداد کچھ کم ۱۳ لاکھ تھی!

جناب طفیل احمد صاحب علانیہ یہ دعویٰ فرما چکے ہیں، کہ سود خوار فرنگستان کا ہر ہر فرد دولتمند و باثروت ہے۔ کیا وہ براہ کرم اس سرکاری بیان کی تردید شایع فرمائیں گے؟ یا ممکن ہے، کہ یہ اطلاع "ضلع مظفر نگر کی رپورٹ بندوبست" کے مساوی ہی مرتبۂ استناد نہ رکھتی ہو!

## بدایوں "شریف"!

جس طرح ہمارے صوبہ کے بعض امراء و رؤساء کا عشق، بعض فرماں روایان صوبہ کے ساتھ مشہور ہے، ٹھیک اسی طرح کی شیفتگی بدایوں کے بعض پیرزادوں کو ذات "شریف" کے ساتھ ہے، اور ہر گذرنے والے لمحہ کے ساتھ اس شغف و شیفتگی کو بھی ترقی ہوتی جا رہی ہے۔

حال میں اس جذبۂ عشق و نیاز نے غیظ و غضب کی شکل اختیار کر لی ہے، اور اس غیظ و غضب کے ہدف سلطان نجد، امیر عبد العزیز بن سعود، اور اُنکی سپاہ ہے، جس نے چشم زدن میں بلد امین کی ارض مطہر کو شریف حسین، و رُانکی ذریات کے وجود سے پاک کر دیا۔ اہل نجد، اس طائفۂ بدایونی کے نزدیک محض فاسق و مبتدع ہی نہیں، بلکہ قطعاً "کافر" و "خارج از اسلام" ہیں۔ یہ فیصلہ تھا۔ جرم یہ عائد کیا گیا ہے، کہ یہ لوگ

"حضرات انبیائے کرام و اولیائے عظام کی تعظیم و تکریم کو بدعت و کفر و شرک"

قرار دیتے ہیں۔ اس دعوے کی سند میں بجائے کسی وہابی یا نجدی کے قول کے چار گواہ باہر کے پیش کیے گئے ہیں، جن کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں:—

(۱) "تاریخ شامی،"

(۲) سید محمد امین کا حاشیۂ دُرِ مختار،

(۳) ہدایہ کمیہ۔

(۴) ہمدم کا ایک مضمون۔

ان چار میں سے عبارتیں صرف تین آخرالذکر سے نقل کی گئی ہیں۔ حاشیۂ درمختار کی عبارت میں عقیدۂ مذکورۂ بالا کا اشارۃً بھی ذکر نہیں، اسی طرح ہدایۂ کمیہ کی عبارت منقولہ بھی عقیدۂ مذکورہ کی بابت ایک حرف بھی شہادت میں نہیں پیش کرتی۔ لے دے کے ہمدم کا مضمون رہ جاتا ہے، اسکی شہادت ملاحظہ ہو:۔

"بت پرستی و شرک کی بیخکنی کے لیے شمشیر کف نکل آتے ہیں …… وہ تمام سست اعتقاد نام کے مسلمانوں کو بت پرست، بدعتی و مشرک خیال کرتے ہیں …… مساجد کو صاف و سادہ رکھنا پسند کرتے ہیں۔ قبر پرستی، پیر پوجا، اور تعزیہ پرستی کے جانی دشمن ہیں"

یہ ہیں، وہ زبردست شواہد اور مستحکم دلائل، جن کی بنا پر یہ نتیجہ نکالا گیا ہے، کہ اہل نجد تعظیم و تکریم انبیاء علیہم السلام کے منکر ہیں، اور اس لیے "کافر" و "خارج از اسلام" ہیں!!

---

"بدایوں کے اس طائفۂ عالیہ کو ذات شریف کے ساتھ جو والہانہ شغف و شیفتگی ہے، اسکے لحاظ سے حیرت ہے، کہ معزول حسین نے بصرہ کو اپنا مستقر قرار دیکر بدایوں کے حقوق کیوں نظرانداز کر دیے! امیر فیصل سے رشتۂ فرزندی مسلم، تاہم خاک پاک بدایوں کو شرف میزبانی سے محروم رکھنا بڑی بیدردی ہے۔ شریف صاحب اگر اب بھی اس استدعا کو شرف قبولیت بخشنا گوارا فرمالیں، تو پھر کسی بڑے سے بڑے کٹر 'وہابی' کو 'بدایونِ شریف' (خواہ بہ اعلانِ اضافت، خواہ بہ فکِ اضافت) کہنے میں یقیناً تامل نہیں ہو سکتا۔

---

## "وہابیت" یا "شریفیت"؟

وہابی، دراصل حنبلی مذہب کے اشخاص ہیں، اس لیے "وہابیت" کا تقابل اگر ہو سکتا تھا، تو "حنفیت" سے۔ لیکن عوام میں 'وہابیت'، 'صوفیت' کی حریف سمجھی گئی، اور بعض نے ترقی کر کے اسے تقلیدِ ائمہ کا مقابل قرار دیا۔ بدایوں کے نوجوان پیرزادہ نے اخبارات میں جو تار شایع کرایا ہے اس میں ترقی کا ایک قدم اور آگے بڑھا کر 'وہابیت' کو 'سنیت' کے مقابلہ میں پیش کیا ہے! کیا یہ کہنا زیادہ صحیح نہ ہوگا، کہ اس وقت نجد و حجاز کی آویزش درحقیقت، 'وہابیت' و 'شریفیت' کی ٹکر ہے؟ وہابیوں پر بڑے سے بڑا الزام یہ عائد ہو سکتا ہے، کہ مزارات و مقابر سے متعلق وہ عامۂ مسلمین کے جذبات کی پروا نہیں کرتے۔ لیکن زندہ کلمہ گویان اسلام کی جانوں اور جائدادوں کے ساتھ بے پروائی کس نے برتی؟

دشمنانِ اسلام کے ساتھ اتحاد کس نے قائم کیا؟ ہزارہا زائرین و حجاج کا خون کس کی گردن پر ہے؟

فتنے سب پیچ سہی قیامت کے لیکن آگے تمہاری قامت کے؟

## حضرت غوث جیلانیؒ کا مسلک

بدایونی پیرزادے، اپنی 'قادریت' کو شاید اپنے اسلام سے بھی بڑھ کر عزیز رکھتے ہیں، بہتر ہوتا کہ آج وہ مضبوطی کے ساتھ، حضرت غوث جیلانیؒ ہی کے مسلک پر قائم رہتے۔ حضرت موصوف بھی حنبلی تھے، یعنی اُسی حنبلیت کے پیرو تھے، جس کی تعلیم دینے کے صلہ میں آج شیخ عبدالوہاب کو "منفی قادری" خانقاہوں سے لعنت کا خطاب حاصل ہو رہا ہے! حضرت شیخؒ کی تصانیف آج ناپید نہیں، غُنیۃ الطالبین و فتوح الغیب کے مطبوعہ نسخے موجود ہیں، مواعظ و مکتوبات کا بھی اچھا خاصہ ذخیرہ .... محفوظ ہے، کیا اس سارے دفتر میں بجز تاکیدِ توحید و اتباعِ سنتِ رسول اللہؐ کے ایک لفظ بھی موجودہ مراسم تصوف سے متعلق مذکور ہے؟ کیا حضرت شیخؒ نے کہیں بھی موجودہ قادریت کی تعلیم دی ہے؟ حضرت شیخؒ نے اپنی وفات کے وقت اپنے صاحبزادہ شیخ عبدالوہابؒ کو جو بیش بہا آخری وصایا فرمائی تھیں، اُسکے بعض فقرے یہ ہیں:-

| | |
|---|---|
| علیک بتقوی اللہ وطاعتہ۔ | خدا ہی سے پرہیزگاری، اور اُسی کی طاعت اپنے اوپر لازم رکھنا۔ |
| کل الحوائج الی اللہ واطلبھا جمیعاً منہ | اپنی حاجتوں کو خدا ہی کے سپرد کردے، اور سب کچھ اُسی سے طلب کر۔ |
| لا تثق باحد سوی اللہ۔ | بجز خدا کے کسی پر اعتماد نہ کرنا۔ |
| لا تخف احداً سوی اللہ ولا ترج احداً سوی اللہ | بجز خدا کے نہ کسی سے خوف کرنا، نہ کسی سے اُمید قائم کرنا۔ |

وہابی، اگر اسکے خلاف کوئی مسلک رکھتے ہیں، تو یقیناً گمراہ ہیں، لیکن اگر اُن کا عقیدہ بعینہٖ یہی ہے، تو خدا کے لیے اُنکو بھی اپنا بھائی سمجھیے، اور یہ دعا کیجیے، کہ اس پر عمل کی توفیق خدائے تعالیٰ و قدوس، اُنکو، آپ کو، ہم کو، اور سب کو، عطا کرے۔ مُسلم کے لیے بنیادی عقاید صرف دو ہیں، اللہ کو ایک سمجھنا (لا الہ الا اللہ)، اور محمدؐ بن عبداللہ کو اُس کا سچا رسول ماننا (محمد رسول اللہ)۔ باقی تمام جزئیات و تفصیلات میں جب حضرات صحابہؓ تک میں پورا اتفاق نہ ہو سکا، تو آج اسکی کوشش نہ صرف لاحاصل بلکہ اسلام کے حق میں مضر ہے، کہ ہر جزئیۂ فقہی میں، نجد و حجاز، مصر و افغانستان، بریلی و دیوبند، دہلی و لکھنؤ کا نقطۂ نظر بالکل متحد ہو جائے۔

## صلح ہے اک مہلت سامانِ جنگ

مولانا حالی مغفور کے اس الہامی مصرعہ کی عملی شرح کی خبر امریکہ سے

یہ موصول ہوئی ہے، کہ جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد سے، اِسوقت تک، چھ سال کی مدت میں، صلح جو وامن پسند، آشتی دوست و مصالحت نواز، سرکار امریکہ، صرف بحری جنگ کے ساز و سامان پر پچاس کرور ڈالر، یعنی ایک ارب سے زائد روپیہ صرف فرما چکی ہے! واضح رہے کہ، یہ محکمۂ جنگ کے صرف ایک شعبہ کا خرچ ہے، اس سے کُل مصارفِ محکمۂ جنگ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے - پھر یہ بھی ہے، کہ امریکہ کا شمار اس وقت تک، متمدن دنیا کی جنگجو اقوام میں نہیں، صلح پسند ممالک میں کیا جاتا ہے - اسی پر ان سرکاروں کے مصارف جنگ کو قیاس کرنا چاہیے، جن کی جوع الارض (امپیریلزم) مشہور ہے -

کیا تہذیب جدید کی یہی وہ برکات ہیں، جنکی دعوت بہ تنعیب مشرق کے سامنے پیش کی جا رہی ہے؟ کیا نظام سرمایہ داری کے یہی وہ مناقب ہیں، جنکی منادی ہر ہفتہ ولایت منزل، علیگڈھ سے ہوتی رہتی ہے؟ کیا اقبالمند و باثروت، شایستہ و سود خوار، مغرب کے یہی وہ کمالاتِ عالیہ ہیں، جن پر مفلس و تنگدست، صابر و شاکر، مشرق کو رشک کرنا چاہیے؟

## خلافت کمیٹی کے مصارف

مولانا شوکت علی نے ۲۰ء سے لیکر ۲۳ء تک کے خلافت کمیٹی کا جو حساب، روزنامۂ خلافت میں شایع کیا ہے، اُس سے معلوم ہوا، کہ اس مدت میں خلافت کمیٹی کو کُل رقم تقریباً ۷۵ لاکھ روپیہ وصول ہوئی - اس میں سے تقریباً ۲۵ لاکھ ترکوں کے کام آئی - ۱۶ لاکھ روپیہ سیٹھ چھوٹانی نے اپنے کارخانہ میں لگا دیا تھا، اب وہ کارخانہ ٹرکی کو منتقل ہو رہا ہے - اس طرح گویا ۷۵ لاکھ میں سے ۴۱ لاکھ کا حساب براہ راست ترکوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے - بقیہ ۱۶ لاکھ خلافت ہی کے سلسلہ میں دوسرے ضروری شعبوں میں صرف ہوا، مثلاً دو مرتبہ وفد خلافت کی انگلستان اور دوسرے ممالکِ یورپ کو روانگی، جامعہ ملیہ علیگڈھ اور دوسری قومی درسگاہوں کی اعانت، اسیرانِ خلافت کی امداد، متعدد انگریزی و اُردو جرائد کی امداد، تحریکِ ترک موالات کی نشر و تنظیم، خلافت پریس و اخبار خلافت (انگریزی، اُردو و گجراتی) کا قیام، ہزارہا تبلیغی رسائل و تالیفات کی اشاعت، وقس علی ہذا -

یہ کہنا کہ اس حساب کا ہر جزئیہ، ہر طرح پاک اور تسلی بخش ہے، بے مزہ مبالغہ ہوگا - بعض مصارف یقیناً بیجا ہوے، بعض اشخاص نے غفلت برتی، بعض کا جُرم غفلت سے زیادہ سنگین ہے - سیٹھ چھوٹانی کے کارخانہ میں اتنی بڑی رقم کا پھنسا رہ جانا، خصوصیت کے ساتھ باعث انگیز و تکلیف دہ واقعہ ہے - لیکن یہ سب کچھ کہنے کے بعد یہ ماننا پڑے گا، کہ جو عظیم الشان خدمتِ اسلام اس زمانہ میں خلافت کمیٹی نے انجام دی، اسکی توقع مسلمانان ہند جیسی پریشاں حال، غیر ذمہ دار، و غیر منتظم جماعت سے ہرگز نہیں

ہو سکتی تھی، حسابات میں غلطیوں اور تصرف و تغلب بیجا کی مثالیں، بڑی بڑی منتظم و باقاعدہ حکومتوں کے مختلف محکموں میں برابر ملتی رہتی ہیں، مسلمانان ہند سے بھی اگر کچھ ایسے ہی قصور سرزد ہوئے، تو اسپر حیرت نہ کرنا چاہیے، حیرت اس پر ہونا چاہیے کہ اتنی قلیل لغزشیں کیوں عمل میں آئیں!

---

ان الحسنات یذہبن السیئات (بھلائیاں، برائیوں کو دور کر دیتی ہیں) خدا کا مقرر کیا ہوا قانون ہے، ہم کمزور و ناتواں، عاجز و درماندہ بندگان خدا، کو بھی حتی الامکان اسی پر عمل چاہیے اور دوسروں پر اعتراض و نکتہ چینی سے قبل بشری کمزوریوں کو بھی یاد کر لینا چاہیے۔ خلافت کمیٹی نے ہماری بیداری میں، وہ عظیم الشان حصہ لیا ہے، اور اسکے بعض جلیل القدر رہنماؤں نے وہ عظیم النظیر ایثار دکھایا ہے کہ اسکے معاوضہ میں بعض دوسرے کارکنوں کی لغزشوں اور خطاؤں کو بہ نظر عفو دیکھنا چاہیے، اُن کا قصور معاف کرنا چاہیے، اور خدا سے دعا کرنا چاہیے کہ وہ بھی معاف کرے۔ ساتھ ہی اس درمیان میں کارکنانِ خلافت کو جو تجربات حاصل ہوے ہیں، یقین ہے، کہ آیندہ وہ اُن سے پورا فائدہ اُٹھائیں گے، مسلمانوں کا مال خرچ کرنے میں بہت زیادہ احتیاط برتیں گے، اور صدیق اکبرؓ و فاروق اعظمؓ کا اسوۂ عمل ہر وقت پیش نظر رکھیں گے۔ قوم کو بھی لازم ہے، کہ وہ چند بے احتیاط اشخاص کے جرائم کی سزا اپنے اُن رہنماؤں کو نہ دے، جو پوری دیانت و امانت، صداقت و خلوص، ایثار و سرفروشی کے ساتھ خدمت اسلام و مسلمین میں مصروف ہیں۔ سرور کونینؐ کے عہد مبارک تک میں، ہر شخص تو صدیقؓ و فاروقؓ نہیں بن گیا تھا، آخر منافقین بھی تھے اور بہت تھے، اور آخر تک قائم رہے۔ باانیہمہ منافقین کے خوف سے اسلام کی اجتماعی زندگی مُردہ نہ ہوئی، بیت المال برابر معمور ہوتا رہا، امین ہاتھوں سے تقسیم بھی برابر جاری رہی۔ ایسے امین ہاتھ آج کمیاب ضرور ہیں، لیکن نایاب نہیں ۔

---

**مسلم یونیورسٹی کے جدید وائس چانسلر**　مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے جدید افسر اعلیٰ سے جو توقعات ان صفحات میں آج سے دو ماہ پیشتر قائم کی گئی تھیں، بحمد اللہ وہ تیزی کے ساتھ پوری ہونی شروع ہو گئی ہیں۔ بدنظمی و طوائف الملوکی دُور ہو کر، کالج میں ایک نظم و تنظیم کی صورت پیدا ہوتی جاتی ہے، اساتذہ کو اپنی ذمہ داری کے احساس پر مجبور رہنا پڑا ہے، ضیا فتوں میں سادگی کی تعلیم لفظاً و عملاً دونوں طرح شروع ہو گئی ہے اور فضا میں یک گونہ اسلامیت آ چلی ہے۔ وائس چانسلر صاحب کی متعدد تقریریں، جو طلبہ کے سامنے ہوئیں، وہ سب تعلیمی حیثیت سے پُر مغز، اور اسلامی حیثیت سے بھی فی الجملہ غنیمت ہیں۔ یونیورسٹی کی ایک بڑی ذمہ دار

ومعتقد ہستی، جو روایات عہد غلامی کی سب سے بڑی حامل ہے، سنا ہے کہ اپنا تعلق اب کالج و یونیورسٹی سے قطع کرنے والی ہے۔ اگر وائس چانسلر صاحب کو بعض اچھے مشیر و رفیق کار میسر آجائیں، تو اصلاح و ترقی کی بہت زیادہ توقعات قائم ہو سکتی ہیں۔ ایک خاص اصلاح یہ بھی ہوئی ہے، کہ یونیورسٹی کا ہفتہ وار آرگن "مسلم یونیورسٹی گزٹ" اب امن سبھا کی بجائے کالج و یونیورسٹی کا پرچہ معلوم ہونے لگا ہے، اور مسائل تعلیم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے قابل مطالعہ ہو گیا ہے۔ اگر "خبروں" کے حصہ میں بھی بجائے متفرق خبروں کے، بیرون علیگڈھ کی محض تعلیمی خبروں کا التزام رکھا جائے، تو اسکی حیثیت افادی میں بدرجہا اضافہ ہو سکتا ہے۔

---

سرسید کے بعض عقائد بہت ہی افسوسناک تھے، کلام مجید کی بعض آیات کی ایسی تاویلات انھوں نے فرمائیں کہ گویا اُن آیات کو مسخ کر دیا۔ انگریزی حکومت، انگریزی علوم، انگریزی تہذیب، غرض انگریزیت کا رعب اُن پر اس درجہ طاری تھا، کہ اُنھوں نے دنیا کی ہر شے کو اسی پیمانہ سے ناپا، اور جو شے اُنکے اس معیار پر پوری نہ اُتری، اُسے اُنھوں نے ناقابل التفات سمجھا، خواہ وہ فقہ ہو یا تصوف، یا حدیث، یا قرآن۔ بایں ہمہ اُنکی نیت بالکل خالص تھی۔ اُنکی تحقیق و جستجو میں ذاتی اغراض کو مطلق دخل نہ تھا۔

اُنکی نیت صرف

خدمتِ اسلام کی تھی غلطی سے وہ اسلام کی فلاح اسی میں سمجھے، کہ جس حد تک ممکن ہو انگریزیت کو اپنے میں جذب کرلیا جائے۔ یہ رائے کی غلطی تھی، نیت کا فساد نہ تھا۔ منافقت اُنکے قریب بھی نہیں گذری تھی۔ وہ تفسیر اس لیے نہیں لکھتے تھے، کہ دنیا اُنکی مفسرانہ عظمت کی داد دے، یا یہ کہ اپنی ہر دلعزیزی قائم رکھنے کو وہ اپنے ضمیر کے خلاف، مسائل کی تاویل کریں، بلکہ وہ وہی لکھتے تھے، جو کچھ اُن کا ضمیر اُنھیں سوجھاتا تھا۔ جسے وہ امر حق سمجھتے تھے، اور جس کے لیے وہ محض رضائے حق کے طلبگار رہتے، وہ انگریزوں کے دل سے خیر طلب تھے، اور اس لیے تھے کہ وہ فلاح مسلمین کے لیے اسے ضروری سمجھتے تھے، یہ نہ تھا کہ گھر پر بیٹھ کر خود بھی انگریزوں کو بُرا بھلا کہیں، اور جب سامنا ہو جائے تو خوشامد و تملق کو انتہا پر پہونچا دیں، تاکہ کسی خطاب یا صلہ سے سرافرازی حاصل ہو۔ علام الغیوب، جو قال سے زیادہ حال پر، زبان سے زیادہ قلب پر، عمل سے زیادہ مقصد عمل پر نظر رکھتا ہے، یقین ہے کہ اُنکی لغزشوں سے ضرور درگذر کرے گا، اور اُنھیں خدمات اسلام پر پورا اجر عنایت کرے گا۔

---

سید کے انتقال کے بعد یہ خصوصیت بھی علیگڈھ سے رفتہ رفتہ رخصت ہونے لگی، وقار الملک کی اسلامیت نے اپنا رنگ جمانا چاہا، لیکن اپنے تئیں مخالف قوتوں کے سامنے بے بس پایا، تاآنکہ علیگڈھ کالج، اور اُسکے ملحقات و متعلقات، سازش و رکاکت کے مرادف قرار پا گئے۔ اب نہ اسلامیت کا اثر باقی تھا، نہ شرافت کی پرسش تھی، نہ علم اور کیرکٹر کی قدر تھی، نہ ایثار و خلوص کو کوئی پوچھتا تھا۔ ہر طرف ذاتی اغراض کی کشاکش تھی، ہر سمت نمود و نمائش کی گرم بازاری تھی، ہر جانب پارٹی سازی اور گروہ بندی تھی، اور ہر فریق کی ساری کوشش اسکے لیے وقف تھی، کہ فریق مقابل کو زیر کرکے حکام والا مقام کی بارگاہ میں اپنا اثر و رسوخ قائم کرے۔ ایک بزرگ جو تعلیمات کے ماہر فن سمجھے جاتے تھے، اُن کا وقت کالج سے کہیں زیادہ، حکام کی نبض شناسی میں صرف ہوتا تھا۔ ایک بزرگ جن کے ہاتھ میں نظم و نسق کی باگ تھی، اُنھیں دختِ رز کی نیازمندیوں سے مہلت نہ تھی۔ ایک اور بزرگ قوم، کالج سے صدہا میل کے فاصلہ پر سکونت رکھتے تھے، اور شاید بُعد مادی ہی کی مناسبت سے کالج کے ساتھ بُعد روحانی بھی رکھتے تھے۔ یہ صورت حال ہر مسلمان کے لیے کس درجہ لایق شرم و باعث اذیت تھی!

اب الحمد للہ کہ زمانہ نے پھر کروٹ لی ہے، اور ایک ایسے شخص کو یونیورسٹی کا افسر اعلیٰ مقرر کردیا ہے، جو بلحاظ حیثیات سے صحیح معنی میں سرسید کا جانشین ہے۔ یہاں تک کہ سرسید کی خوبیوں کے ساتھ سرسید ہی کی کمزوریوں کا بھی وارث ہے۔ صاحبزادہ صاحب کے خلوص نیت میں ذرا شبہہ نہیں، فلاح اسلام کے وہ دل سے متمنی ہیں، لیکن بدقسمتی سے انگریزیت کے سحر سے وہ بھی سید صاحب ہی کی طرح مسحور ہیں۔ خدائے تعالیٰ اُنکے جوہر ایمان میں زیادہ آب و تاب پیدا کرے، اور اُنکے عہد کو بابرکت ثابت کرے۔

---

## انا للہ و انا الیہ راجعون

بالآخر وہی پیش آیا، جس کا کھٹکا ایک عرصہ سے تھا۔ یعنی جس لایق عزت شخصیت نے ترک موالات کا سیاسی پروگرام ملک کے سامنے پیش کیا تھا، اُسی نے اسکے خاتمہ کا بھی اعلان کردیا۔ اس سے بڑھکر قومی مصیبت اس وقت خیال میں نہیں آتی، اور مسلمان کا کام یہ ہے، کہ ہر مصیبت کے وقت اسے یاد کرلیا کرے، کہ "وہ اللہ ہی کے واسطے ہے، اور اُسے اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ واذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

گاندھی جی نے مجاہدات و ریاضات سے جس قدر تزکیۂ نفس حاصل کرلیا تھا، اور اپنی عقل و فراست کو جس قدر منور کرلیا تھا، اسکی نظیر دورِ حاضرہ کے ہندوستان میں تنہا، اسوقت ساری دنیا میں مشکل ہی سے ملے گی، تاہم بشریت کی کمزوریوں سے پاک ہوجانا کسی بشر کے بس کی بات نہیں۔ صرف انبیاء علیہم السلام

ایک ایسی نعمت "وحیِ الٰہی" سے مشرف و ممتاز رہتے ہیں، جو اُنکی بشری کمزوریوں سے اُنھیں محفوظ رکھتی ہے۔ باقی الہام و مکاشفہ، کوئی ایسی شے نہیں، جسے ہادیِ قطعی کہا جا سکے، اور اسی لیے کوئی غیر نبی خواہ بجائے خود کتنا ہی صاحب کمال ہو، رائے و فہم کی غلطیوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا، چہ جائیکہ گاندھی جو بیچارے پوری طرح نورِ ایمان سے بھی مشرف نہیں۔ ایسی حالت میں ان سے اتنی بڑی غلطی کا صدور گو کتنا ہی رنج دِہ واقعہ ہو، ناممکن یا مستبعد نہ تھا۔

بہرحال جو کچھ مشیت الٰہی میں تھا، پورا ہو کر رہا۔ اب اُسکے حسن و قبح پر زیادہ بحث و گفتگو بھی عبث ہے۔ کہنے کی بات صرف اتنی ہے، کہ جو لوگ ترکِ موالات کو ایک سیاسی و قومی پروگرام کی حیثیت سے اختیار کیے ہوے تھے، وہ بے شبہ بڑی آسانی سے کھُل کھول ڈالنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ لیکن جو خدا کے بندے اسکو خدا کا کام سمجھ چکے ہیں، اور جن پر اللہ جل شانہ نے اپنے فضل و کرم سے اس تحریک کی معنویت کو روشن کر دیا ہے، وہ انشاء اللہ اس اعلان کے بعد بھی مایوس و شکستہ خاطر نہ ہوں گے، بلکہ جہاں تک اُنکی ذات کا تعلق ہے، اس حادثۂ کبریٰ میں حسبِ فرمانِ خداوندی "استعانت بالصبر و الصلوٰۃ" میں مصروف رہیں گے، اور زبان و دل دونوں پر ان دعاؤں کو جاری رکھیں گے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْ ہَدَیْتَنَا ۔ رَبَّنَا ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا

---

اہل ایمان پر روشن ہے کہ نورِ ہدایت سے مشرف ہو کر پھر ظلمتِ فسق کی جانب واپس جانا، آئینِ الٰہی میں کس قدر شدید و سنگین جرم ہے۔ وہ کتابِ مبین میں حضرت شعیبؑ اور اُنکے رفقا کا قول پڑھ چکے ہیں:—

قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِکُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰنَا اللّٰہُ مِنْہَا، وَمَا یَکُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْہَآ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّنَا، وَسِعَ رَبُّنَا کُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا، عَلَی اللّٰہِ تَوَکَّلْنَا، رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ، وَاَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ (اعراف - ۱۱)

اُنھیں اس قانونِ الٰہی کی اطلاع مل چکی ہے، اور وہ اپنے اس ایمان پر راسخ ہیں، کہ جو لوگ راہِ حق دیکھ چکنے کے بعد باطل پرستیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں

| | |
|---|---|
| سَیَنَالُہُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّہِمْ وَذِلَّۃٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَکَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُفْتَرِیْنَ (اعراف - ۱۹) | اُن پر غضبِ الٰہی نازل ہوتا ہے اور عذابِ آخرت سے قطع نظر کرکے اسی دنیا میں اُنھیں ذلت و خواری نصیب ہوتی ہے۔ |

انسانوں کے کام، خواہ وہ کتنے ہی بہتر و پاکیزہ انسان ہوں، دُنیوی مصلحتوں کے پابند ہوتے ہیں۔ خدا کے کام ان قیود سے آزاد ہوتے ہیں۔ جن کو دنیوی کامیابیاں عزیز ہیں، اُنھیں مصلحت شناسی مبارک، جنھیں رضائے حق مطلوب ہے، اُنھیں دنیا میں ناکامیاں مبارک۔ خدا، روشن کرے اکبر کی تربت کو، کیا خوب

کہ گیا ہے :-

دینِ خدا ہے حق کی تجلی کے واسطے — دنیا اُٹھی ہے اپنی تعلّی کے واسطے
عارف جو ہیں رہیں گے وہ اللہ ہی کے ساتھ — اللہ ہی ہے اُنکی تسلّی کے واسطے

# رباعیات

(از جناب مولوی حافظ ساجد علی عباسی وکیل اورنگ آباد دکن)

آواز اذاں میں پائی سُن گُن تیری — ناقوسِ برہمن میں بھی ہے دُھن تیری
اک آن میں ہو گیا دو عالم کا ظہور — واللہ قیامت کی ہے اک کُن تیری

کچھ کام نہیں ہے این و آں سے مجھکو — کیا واسطہ ہے نام و نشاں سے مجھکو
توحید و رسالت سے ہے سینہ معمور — دولت یہ ملی دونوں جہاں سے مجھکو

یارب دمِ آخر رہے رحمت کی نگاہ — شیطانِ لعیں نہ کرنے پائے گمراہ
ہر تارِ نفس ہو نغمہ سنجِ توحید — ہر ہر بُنِ مُو سے نکلے اللہ اللہ

یارب تری رحمت کے یہ برسیں بادل — سرسبز چمن ہوں لہلہائیں جنگل
سیراب ہوں کھیتیاں شگفتہ دل ہوں — ہم دھوم سے جنگل میں منائیں منگل

گذری غفلت میں زندگانی اپنی — اک چھاؤں تھی - پیری و جوانی اپنی
کیوں آئے تھے - کیا لیا - چلے خالی ہاتھ — افسوس کہ کچھ قدر نہ جانی اپنی

# تاریخ مغرب ابن العذاری

(مترجمۂ جمیل الرحمن صاحب ایم اے، پروفیسر جامعۂ عثمانیہ)

شمالی افریقہ کا سرسبز و شاداب ساحل جو سرحد مصر سے جبل الطارق تک بحیرۂ روم کے کنارے تقریباً دو ہزار میل کی لمبائی میں پھیلا ہوا ہے انقلابات عالم کا ایک عجیب و غریب مرقع ہے۔

ازمنۂ مظلمہ سے اس وقت تک بیسیوں قومیں اس ملک میں آباد ہوئیں اور تباہ ہوگئیں۔ سیکڑوں سلطنتیں اس سرزمین پر قائم ہوئیں اور فنا ہوگئیں۔ ہزاروں فاتح جنرل اس خطہ سے پیدا ہوے اور پیوند خاک ہوگئے۔ اور بے شمار دانشمند، عالم، اور فلاسفر اس مرز بوم میں نشو و نما پاکر عالم کے راہبر بنے اور گمنام ہوگئے۔

ایک سمت بحیرۂ روم کا ناپیدا کنار پانی اور دوسری جانب صحرائے اعظم کا ہولناک ریگستان اسکے دامنوں کے قدرتی محافظ تھے اور دشوارگذار کوہستانی علاقہ ملک کے اندرونی حصہ میں مدافعت کے لیے دائمی ملجا اور مامن تھا۔

شہروں کے آباد کرنے والے فنا ہوگئے، قومیں مٹ گئیں، سلطنتیں تباہ ہوگئیں، ملکوں کے نام تک بدل گئے، مگر یہ عظیم الشان ساحل اپنی بھولی بسری شوکت پر فاتحہ خوانی کرنے کے لیے آج بھی اُسی صورت و حالت سے قائم ہے۔ جیسا کہ کئی ہزار برس پہلے تھا۔ دریاؤں کی روانی اور طغیانی میں سرمو فرق نہیں ہوا۔ پہاڑوں نے ایک قدم بھی اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔ ریگستان کے ہولناک مناظر میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ زرخیز زمین اب بھی آفتاب کی تیز شعاعوں کو اپنے آغوش میں جگہ دیکر سبزہ اُگاتی ہے اور آب و ہوا کی جاں بخش تاثیر آج بھی خرما و زیتون پیدا کرنے کو تیار ہے۔ جن کی افراط پر کبھی اس دیس کو ناز تھا۔ لیکن سمندر میں جنگی جہازات کے بیڑے نظر نہیں آتے۔ دریاؤں اور نہروں میں تجارتی کشتیاں دکھائی نہیں دیتیں۔ پہاڑوں پر محفوظ اور مستحکم قلعے اور خوبصورت

اور شاندار محل عنقا ہوگئے۔ خرما اور زیتون میں لذت باقی نہیں رہی اور دنیا کی بازار سے یہاں کی پیداوار کی مانگ اُٹھ گئی۔ اس وجہ سے کہ زراعت کے ترقی دینے والے، اسباب معیشت کی فراہمی میں کوشش کرنے والے۔ اشجار و اثمار کی افزائش و زیبائش کے باعث جنھوں نے اس سرزمین کو اپنے دماغ اور بازووں کے خون سے سینچا تھا، اور اقصاے عالم میں ناموری کا غلغلہ ڈال کر اپنی شوکت و عظمت کے پرتو سے اس دامن بحر کو تمام تہذیب یافتہ ممالک کا درسگاہ بنایا تھا، دنیا میں باقی نہیں رہے۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔!!

سب سے پہلے جس اقبالمند قوم نے اس ساحل کی عظمت کا دنیا میں ڈنکا بجایا وہ تاجروں کی ایک مختصر جماعت تھی جو عالم کی تاریخ میں "فونیشنس" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ سوداگروں کا گروہ مشرق سے تلاش معاش میں آیا اور سمندر کے کنارے ایک ہموار تختۂ زمین پر چند جھونپڑے بنا کر آباد ہوگیا۔ گرد و نواح کے وحشیوں کو رام کیا اور چند ہی روز میں ان جھونپڑوں کی جگہ ایک گاؤں نظر آنے لگا۔ یہی گاؤں اُس عظیم الشان سلطنت کا خوبصورت اور قلعبند دارالحکومت بنا جس نے ایک دن رومۃ الکبریٰ کے دھوئیں اُڑا دیے اور جو "کارتھج" کے حسرت خیز نام سے آج تک تاریخ کے صفحوں پر یادگار ہے۔ اس سلطنت کا بنیادی پتھر رکھنے والے سوداگر تھے اور تجارت ان کا ذریعہ معاش تھا۔ اپنے روزگار کے لیے انکو کشتیوں اور جہازوں کی ضرورت تھی۔ اور ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ فن جہازرانی میں اُنھوں نے اس قدر ترقی کی کہ مورخوں کا ایک گروہ اُنکو اس فن کا موجد خیال کرتا ہے۔ اپنے کاروبار کے لیے انکو حساب دانی کی احتیاج تھی اور ضروریات زندگی ہی خود زندگی کفیل ہے۔ علم ریاضی میں انھوں نے وہ درجۂ کمال حاصل کیا کہ محققین کی ایک جماعت ہندسوں کی موجودہ شکل کو انہیں جاہلوں کی ایجاد بتاتی ہے۔

جہازوں کی افراط سمندر پر قبضہ پانے کی طلسمی کنجی تھی اور تجارت کا فروغ، دولت و سامان معیشت کی فراہمی کے لیے ایک روشنی ہنڈی!!

دولت اور فراغت نے بیوپاریوں کی منڈلی میں شجاعت و حوصلہ مندی کی آتش جہانسوز مشتعل کی اور غیرت قومی یا حب جاہ نے اس آگ پر تیل چھڑکا۔ آلات جنگ فراہم کیے گئے۔ مستحکم قلعے تعمیر ہوئے۔ آزمانا کاروں کی فوجیں مرتب ہوئیں۔ یونان، مصر، اور افریقیہ کے دلیر نوجوان

ملازمت کے لیے آئے۔ سسلی، سارڈنیا، وغیرہ بحیرۂ روم کے جزائر حلقہ بگوش ہوئے اور مدبران ملک نے حکومت عالم کا سبز باغ دکھا کر ساحل کے ہر ایک باشندہ کو رستم و افراسیاب بنا دیا!!! رومۃ الکبریٰ کا آفتاب اقبال اُس وقت تک نقطۂ نصف النہار پر نہیں پہونچا تھا، لیکن چڑھتی ہوئی دھوپ میں کافی حرارت تھی۔ اُس کی تہذیب و جہانداری مشعل ہدایت تھی۔ اور اُس کا قانون معاشرت دنیا کا راہبر اور ہادی۔ اُسکے فوجی نظام کا ہمسایہ سلطنتوں میں جواب نہ تھا اور اُسکے جنرلوں کی دانشمندی و وفاداری، سپاہیوں کی شجاعت و مردانگی اور آلات جنگ کی فراوانی اُس وقت بھی تمام قرب و جوار کے حاکموں کے دل تھرّا دیا کرتی تھی۔ ایران اور ہندوستان کی گذشتہ عظمت پر ایشیا والے بہت نازاں ہیں لیکن رومیوں کے ستارۂ اقبال نے ان سب کو کرمکِ شب تاب بنا دیا تھا۔

بلبل کہ ہمیں قافیۂ گل شود بس است! ان ممالک کے لیے اتنی ہی تعریف بس ہے کہ یہاں کے باشندے بھی اُس وقت متمدن سمجھے جاتے تھے جبکہ روما اور اُس کے مقبوضات کے سوا بقیہ تمام دنیا غفلت اور جہالت کے تاریک بادلوں سے گھری ہوئی تھی، اور سارا کرۂ خاک نیم وحشیوں، وحشیوں، یا درندوں سے آباد سمجھا جاتا تھا!!!

روما کے معراج کمال کے وقت اندلس، یونان، اور ایشیاے کوچک اُس کے باجگزار صوبے بنے۔ دجلہ اور فرات اُسکی مشرقی سرحد قرار پائے، اور انگلستان کا ٹھنڈا جزیرہ جو آج برطانیہ عظمیٰ کے پُرشوکت لقب سے دعویدار ہے کہ اُس کی حکومت کے پرچم پر آفتاب غروب نہیں ہوتا، اس مظفر و منصور سلطنت کی ایک فوجی چھاؤنی بنایا گیا۔ لیکن یہ نقطۂ کمال ہنوز دور تھا اور اس منزل عروج تک رسائی نہیں ہوئی تھی کہ صقلیہ (سسلی) کے میدان کارزار میں روم و کارتیج کا مقابلہ ہوا۔

رومیوں کے تدبر، جفاکشی اور دور اندیشی کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ جب اُن کو کارتیج سے نبرد آزمائی کی ضرورت ہوئی تو اُنھوں نے ایک سو تیس جہازات کا بیڑہ ساٹھ دن کی قلیل مدت میں تیار کیا اور دشمن سے اُسی کے عنصر یعنی عالم آب میں کلہ بکلہ مقابل ہوئے۔

روما اور کارتیج کی لڑائی انیسویں صدی عیسوی میں سلطنت ہند کی کابل پر چڑھائی تھی۔

اگر پوری قوت صرف کی جاتی اور مصالح ملکی مجبور نہ کرتے تو کارتھج کا اُسی وقت نام ونشان مٹ جاتا۔ مگر زندگی کی سب سے بڑی محافظ موت ہے۔ وقت برابر نہیں ہوا تھا اور ابھی بہت سے عجائب قدرت ظہور میں آنا باقی تھے۔ ۲۴ سال کی جنگ کے بعد صلح کا پیام قبول کیا گیا اور چشم نمائی کافی سمجھی گئی۔

اس طویل جنگ نے جو روم کی تاریخ میں "پہلی پیونک وار" کے نام سے یاد کی جاتی ہے شمالی افریقہ کے تمام متمدن ساحل پر انتقام کا جوش پیدا کر دیا۔ جنگجو بہادروں، جفاکش سپاہیوں، اور جہاں دیدہ جنرلوں کی ایک قوم اس ساحل پر پیدا ہوگئی جس کے بچہ بچہ کو رومیوں سے اپنی پہلی شکست کا عوض لینے اور اُنکے دارالحکومت کو تباہ کرنے کی آرزو تھی۔ خوبیٔ قسمت سے زمام اختیار اس حوصلہ مند سپہ سالار کے ہاتھ میں گئی جو "ہنبال" کے پرعظمت نام سے آج تک جوان مردوں کی دنیا میں زندہ ہے اور جس کے زریں کارنامے تاریخ کے صفحوں سے اُس وقت تک محو نہیں ہوسکتے جب تک کہ روما کا نام بھی دنیا سے نہ مٹ جائے۔

افسوس کہ شب فرصت مختصر ہے اور افسانۂ زلف مسلسل سے زیادہ دراز ورنہ اس شجاعِ دوران کے سیلاب فتوحات کی سیر میں محمود و نادر کی پرستش کرنے والوں، بایزید و تیمور کی عظمت کے آگے سر تسلیم خم کرنے والوں، اور ارجن و رستم کا کلمہ پڑھنے والوں کو قلم اور روشنائی کی طلسمی لالٹین سے دکھاتا جس سے ظاہر ہو جاتا کہ کوہکنی کی بازار میں فرہاد کی قیمت بہت گراں ہے اور خسرو کا مرقع اپنے ہی گھر میں کھوٹے داموں بکتا ہے!!

هزار نکتهٔ باریک تر ز مو اینجاست

نه هر که سر بتراشد قلندری دارد

ہنبال کی تصویر جو اس وقت صفحۂ تاریخ پر موجود ہے وہ دشمن کی کھینچی ہوئی ہے۔ شیر کو انسان نے زنجیروں سے جکڑ رکھا ہے!! مگر یہ مقید شاہ سباع دشمن کے قلم سے بھی خط و خال میں نپولین اور سکندر کا مد مقابل ہے۔ اتنا تو عدو کو بھی تسلیم ہے کہ ہنبال "الپس" کے دشوار گذار کوہستان کو روندتا اور رومیوں کے زرخیز علاقوں کو پامال کرتا ہوا روما کے دروازہ پر پہونچ گیا تھا اور دنیا کی شایستہ ترین سلطنت کی کل قوت اُس کے ہیبت و جبروت سے جاں طلب تھی۔

کارکنان قضا و قدر نے روم کی آخری تباہی اُسکے ہاتھوں مقدر نہیں کی تھی جس طرح کہ یورپ کی شاہنشاہی نپولین کے نصیب میں اور سارے عالم کی حکومت سکندر کی تقدیر میں نہ تھی سعی انسان کے اختیار میں ہے اور انجام خدا کے ہاتھ! اتفاقات زمانہ نے مجبوریاں پیدا کیں اور اس سرکش دلیر کو اپنی مہم نامکمل چھوڑ کر وطن واپس آنا پڑا - یہ افریقہ کی بدقسمتی تھی کہ ہنبال کے بعد کسی دوسرے جنرل کو اس کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق نہ ہوئی اور ہنبال کی فتوحات کے بعد (جو روما کی.... تاریخ میں دوسری پیونک وار کے نام سے مشہور ہیں) لڑائیوں کا انجام تاجروں کی شکست پر ہونے لگا - اور بالآخر تقریباً ایک صدی کے مقابلہ، مجادلہ اور مقاتلہ کے بعد روم کارتھج پر غالب آگیا شاندار کارتھج تباہ ہوا اور روم الکبریٰ کا ایک صوبہ بنایا گیا -

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالاں
طوق زریں ہمہ درگردن خرمی بینم

اب اس بیوفا ساحل پر رومیوں کا شادیانۂ ظفر بجنے لگا - رومن قانون جاری ہوا - رومی گورنر مقرر ہوئے اور ساحل کے بربری اپنے پُرانے محسنوں کو فراموش کرکے روما کا "شہری" کہلانا طرۂ افتخار و امتیاز سمجھنے لگے -

حضرت مسیحؑ کی پیدائش سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے رومیوں نے کارتھج پر قبضہ کیا تھا، اور کم و بیش چھ سو برس تک اُنکی حکومت اس ملک پر قائم رہی - اس طویل مدت میں ساحل کی تاریخ روما کی داستان غم و شادی کا ایک جزو ہے - روما کا تمدن ساحل میں سرایت کرگیا - تھیٹر اور سرکس بنائے گئے - کشادہ سڑکیں وجود میں آئیں - ڈنگل اور اکھاڑے جگہ جگہ نظر آنے لگے - ستونوں اور محرابوں کی تعمیر میں صنعتیں صرف کی گئیں - آب رسانی کے حوض اور پانی کے وہ بے نظیر خزانے تیار ہوئے جن کے کھنڈر آج تک ٹیونس کی ریاست میں سیاحوں کو خون کے آنسو رُلاتے ہیں -

اسی تمدن کے عہد میں گورنر افریقہ کے لڑکے جان اور روما کی شہزادی ہنوریا نے ایڈیٹر مرقع عالم مرحوم کے قول کے مطابق عشق و محبت کی جو سر کھیلی تھی اور اُنکی داستان کے بعض ہنگامے اسی دلفریب ساحل پر واقع ہوئے تھے - قصہ میں تاریخی عنصر بہت تھوڑا بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے

تاہم افریقہ اور روم کی قدیم معاشرت کا ایک بگڑا ہوا فوٹو اور ساحل مغرب کی شوکت کا مٹا ہوا خاکہ ضرور ہے۔

اس تاریخی بیان میں ایک ناول کا حوالہ دینا خامۂ شکستہ پر سخت جبر ہے مگر بدقسمتی سے اُردو زبان میں شاید کوئی دوسری کتاب موجود نہیں ہے[1] جس میں قدیم ساحل مغرب کا اُتنا بھی تذکرہ ہو جتنا اس افسانہ میں تحریر ہے۔ مسلمانوں کو اپنے اسلاف کی بیجا تعریف سے اس قدر مہلت نہ تھی کہ دنیا کی دوسری شایستہ قوموں کی تاریخ پر متوجہ ہوتے۔ اور ہنود جو اُردو کے ابتدائی عہد میں اس لشکری زبان کی خدمت اپنا فرض سمجھتے تھے کچھ عرصہ کے بعد ہندی کو خویش اور اُردو کو بیگانہ تصور کرنے لگے۔ انجام کار یہ ہوا کہ سوائے تاریخ اسلام کے چند کرم خوردہ صفحوں کے اُردو کے دامن میں کوئی قیمتی خزانہ نہیں آیا۔ اور تاریخ اسلام کی بھی یہ کیفیت رہی کہ مسلمانوں کا عروج تو بڑے زور شور سے دکھایا گیا لیکن اُنکی اندرونی خرابیوں اور اُنکے زوال وتباہی کے حقیقی اسباب پر ہمیشہ پردہ ڈالا گیا تاکہ ناظرین کی دل آزاری نہ ہو!

خلافت راشدہ اور بنی اُمیہ کے فتوحات یا عباسیوں کے علمی کارنامے تو بڑی آب وتاب سے شاعروں اور مقرروں نے موقع بے موقع بیان کیے لیکن عباسیوں یا خوارزمیوں کی تباہی کے آخری شرمناک اسباب کسی نے علی رؤس الاشہاد ظاہر نہ کیے اور نہ غرناطہ کے قابل نفرت آخری حاکم کی بزدلی اور کمینہ پن سے اہل ملک کو آگاہ کرنے کی ہمت کی۔

ایک معترض کہتا ہے کہ ہندوستان کے خوشامد پرست مسلمان اپنے اسلاف کی بداعمالی پر بے لوث تنقید برداشت نہیں کر سکتے اور سوائے اپنے بزرگوں کی مدح وستایش کے کسی غیر مذہب والے کی تعریف سُن کر اپنے کانوں کو گنہگار نہیں بنا سکتے!!

گر یہی ہے اس گلستاں کی ہوا
شاخ گل اک روز جھونکا کھائیگی

[1] دینا تو نہیں ہے۔ کم سے کم الناظر بک ایجنسی کے ذخیرہ میں دو کتابیں موجود ہیں:۔ ۱ قصص مغرب (مولوی حامد علی صدیقی) ۲ تاریخ مراکش ومغرب الاقصیٰ ۲ جلد۔ اسکے علاوہ تاریخ ملل قدیمہ (شایع کردہ انجمن ترقی اردو) میں بھی اہل فینقیہ کے حالات میں.......... ایک پورا باب موجود ہے۔ ایڈیٹر

اُردو کا علمی افلاس دُور نہیں ہو سکتا جب تک کہ تمام قدیم شائستہ اور متمدن قوموں کی تاریخ اُس میں مہیا نہ کی جائے اور مسلمان اپنی مذموم اسلاف پرستی ترک کر کے جادۂ اعتدال پر نہیں آ سکتے جب تک کہ وہ امم سابقہ کے کارناموں سے اپنے ہوش و حواس درست کریں۔ اونٹ جب پہاڑ کے نیچے آئے تو جانے کہ اُس کا قد و قامت کس قدر عظمت کا مستحق ہے۔" قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلہم"۔ احباب معاف کریں۔ دل بھرا ہوا تھا اس لیے یہ جملۂ معترضہ اپنی حد سے بڑھ گیا۔ باز آمدم بر سر مطلب۔

دنیا میں ہر عروج کے بعد زوال اور ہر ترقی کے لیے ایک حدِ کمال ہے۔ آفتاب نقطۂ نصف النہار سے گذرتا ہے تو اُس کی تیزی گھٹنے لگتی ہے اور چودھویں رات کے بعد چاند کی روشنی میں اضافہ نہیں ہوتا۔ رومۃ الکبریٰ کو بھی معراج کمال کے بعد پستی کے منازل کی طرف جھکنا پڑا۔ خانہ جنگی نے سلطنت کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کیا۔ فوجی طاقت کمزور ہوئی۔ رعایا میں بغاوت و سازش کا حوصلہ پیدا ہوا۔ دور اُفتادہ صوبے یکے بعد دیگرے سُوار اج کے طلبگار ہوے اور مغرب کے بدقسمت ساحل پر وحشیوں کی ایک قوم نے جو" ونڈال" کے مہیب نام سے تاریخ کے خونیں صفحوں پر مشہور رہے اپنا سکہ چلایا۔

اس عہد تباہی کے واقعات بہت کم محفوظ ہیں مگر انکے اقبالمند جانشینوں نے سونے چاندی اور جواہرات کے جو انبار اس ملک سے پائے وہ شاہد ہیں کہ ونڈال کے وحشی درندے بھی اس زرا ندود سرزمین کا لہو چوسنے میں پوری طور پر کامیاب نہیں ہوے اور پچھلے پندرہ سو برس کے تمدن و فلاح میں جو حشمت و فراغت اس ساحل کو نصیب ہو چکی تھی وہ اس ظلم و جہالت کی دو صدیوں میں بالکل مفقود نہ ہو سکی اور آنے والی نسلوں کا اشتیاقِ غارت پورا کرنے کے لیے بہت سا مال غنیمت باقی رہ گیا۔

ہندوؤں کے مقدس رشیوں کا قول ہے کہ جب مظالم اور بدکاریوں کا طوفان حد سے بڑھ جاتا ہے تو اس سیلاب کو روکنے کے لیے ایک اَوتار جنم لیتا ہے جو ملک میں دوبارہ انصاف اور حق پرستی کی عدالت قائم کرتا ہے۔ مغرب کی زمین جب وحشیوں کے جور و ستم سے تلملانے لگی تو کرۂ بیاقِ قدسی کو اُسکے حال زار پر رحم آیا۔ پُروائی ہوا کے جھونکے چلے، عباؤں اور

ماموں کی گھٹا گھنگھور چھائی ۔ تکبیروں اور رجزوں کا بادل گرجا ۔ نیزوں کی بجلی چمکی ۔ عربی گھوڑوں کی ہنہناہٹ سے افریقیہ کی وادیاں گونجنے لگیں اور ایک ایسی سرفروش قوم میدان میں آئی جس نے آلات جنگ اور قدیم فنون حرب بیکار کر دیے ۔ جو نہ امان کی طالب ہوتی تھی نہ میدان سے منہ موڑتی تھی اور جسکے عقیدہ کے مطابق تلواروں کے سایہ میں جان دینا اور جنۃ الفردوس میں حیات ابدی حاصل کرنا مرادف تھا !!

عربوں کی ابتدائی فتوحات کا سیلاب واقعی قدرتِ خداوندی کا ایک کرشمہ تھا مگر یہ حیرت انگیز داستان متعدد بار اس قدر تفصیل سے بیان ہو چکی ہے کہ اب اس کہانی کا دُہرانا بے مزہ ہے ۔

مختصر یہ ہے کہ ایران ، شام ، فلسطین و مصر پر غلبہ پانے کے بعد ساحل مغرب کی مشرقی چوکیوں یعنی برقہ اور طرابلس پر اُنھوں نے حملہ کیا اور بغیر کسی سخت مزاحمت کے کامیاب ہو گئے ۔ حوصلہ بڑھا تو مصر کا عربی گورنر عبداللہ بن سرح ۲۰ ہزار بہادروں کی جمعیت سے جرجیر حاکم افریقیہ کے مقابل آیا جس نے ان پردیسیوں کے کچلنے کے لیے ایک لاکھ بیس ہزار فوج میدان میں استادہ کر دی ۔ اس جنگ کے انجام میں کوئی ذی فہم شک کر ہی نہ سکتا تھا مگر حضرت عبداللہ بن زبیر کی دانشمندی اور دلیری نے پانسہ پلٹ دیا ۔ جرجیر اپنی غلطی سے قتل ہوا اور فتح کا سہرا کشتۂ حرص عبدالملک کے سر رہا ۔ ابن العذاری المراکشی لکھتا ہے کہ "مال غنیمت کا اکثر حصہ سونا اور چاندی تھا .... چنانچہ ابن ابی سرح کے سامنے سونے اور چاندی کے ٹکڑے لا کر رکھنے شروع کیے گئے ۔ انھوں نے افریقیہ کے لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ تمام مال تم کو کہاں سے دستیاب ہوا ؟ (یہ سُن کر) اُن میں سے ایک شخص زمین پر کوئی چیز تلاش کرنے لگا اتنے میں وہ لوگ زیتون کی کچھ گٹھلیاں اُٹھا لائے اور اُس شخص نے جواب دیا کہ یہی چیز ہے جس سے ہم کو یہ تمام مال و متاع حاصل ہوا ہے ۔ کیونکہ اہالی بحر کے ہاں زیتون نہیں ہوتا ۔ وہ یہ چیز ہمیں سے خریدتے تھے ۔ بہرحال یہ مال غنیمت اس قدر تھا کہ ہر ایک سوار کو اُس میں سے تین ہزار دینار سرخ اور پیادے کو ایک ہزار دینار حصہ ملا ۔"

اس فتح عظیم نے مغرب کے ساحل پر عربوں کی سلطنت کا بنیادی پتھر رکھا ۔ مناسب موقعوں پر فوجی چھاؤنیاں قائم کی گئیں اور ۵۰ھ ہجری میں قیروان کا مشہور شہر آباد کر کے (جو آج تک

ریاست ٹونس میں مغرب کا مکہ کہلاتا ہے اور جہاں کسی غیر مذہب والے کو داخلہ کی اجازت نہیں ہے) مسلمانوں نے اس ملک میں گھر بنانے کا تہیہ کر لیا۔

حسرت نصیب کارتیج جسکی عظمت و صولت کی دُھندلی تصویر گذشتہ اوراق میں دکھائی گئی ہے ابھی تک عربوں کی زد سے محفوظ تھا۔ مگر ۷۸ھ میں عبد الملک اموی کے گورنر حسان بن نعمان نے شوکت افریقیہ کے اُس مجاور کی طرف رُخ کیا اور ایکی کارتیج ایسا تباہ ہوا کہ کبھی سنبھل نہ سکا۔

اس دردناک داستان پر مسلمان مورخین نے عام طور سے پردہ ڈالا ہے، لیکن العذاری نے خون ناحق چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کارتیج کی تربت پر یوں موتی چڑھاتا ہے :-

" افریقیہ کے شہر قرطاجنہ کا حال - اسی شہر کو موجودہ زمانہ کے اہل ٹونس معلقہ کہتے ہیں۔ قرطاجنہ ایک زبردست شہر تھا جس کی فصیل سے سمندر کی لہریں ٹکرایا کرتی تھیں - یہ ٹونس سے بارہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور اُن دونوں شہروں کے درمیان معمور آبادیاں اور قریے ہیں - اس وقت تک سمندر تونس کی طرف نہیں آیا تھا مگر آخر میں اس طرف آگیا - اس شہر میں عظیم الشان کھنڈر، زبردست عمارتیں اور عالیشان بنیادیں پائی جاتی ہیں جس سے اسکی گذشتہ مٹی ہوئی قوموں کی عظمت و شان کا پتہ چلتا ہے - اہل تونس اب بھی اسکے کھنڈروں میں عجیب و غریب چیزیں پاتے ہیں جو مرور زمانہ کے باوجود غور و فکر کرنے والوں کے لیے باعث تعجب و عبرت ہیں۔

جب حسان نے وہاں پہونچکر شہر کو تو تیغ کیا تو باقیماندہ لوگوں کی یہ رائے ہوئی کہ اس شہر سے بھاگ جائیں۔ بیشمار کشتیاں اور جہاز موجود ہی تھے ان میں سے بعض صقلیہ اور بعض اندلس کی طرف چلے گئے ...... حسان پھر وہاں واپس آیا اور ناکہ بندی کرکے اُسکا سخت محاصرہ کیا۔ اُسکو پھر فتح نصیب ہوئی اور وہ بزور شمشیر شہر میں داخل ہوا - اس مرتبہ اُس نے قتل و غارت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی - بیشمار قیدی اُسکے ہاتھ آئے - اسکے بعد اُس نے اردگرد کے لوگوں کو جمع ہونے کا حکم دیا - جب وہ سب اُسکے سطوت اور رعب سے خوف زدہ ہوکر جمع ہو گئے اور اُن میں سے کوئی ایسا باقی نہ رہا جو حاضر نہ ہوا ہو تو اُس نے اُنکو قرطاجنہ کے برباد و منہدم کرنے کا حکم دیا - چنانچہ حسان نے اُسکو ایسا برباد کر دیا کہ وہ گذشتہ زمانہ کی ایک قصہ کہانی ہو گیا "

اللہ اللہ ! وہ بھی کیا حسرت خیز منظر تھا کہ کارتیج کے مظلوم باشندے غلامی کی زنجیریں

گردنوں میں ڈالے، اپنے ہاتھوں میں پھاوڑے اور کدالیں لیے اپنے محسود عالم دارالسلطنت کی سرمایۂ ناز عمارتوں کو اپنے ہی ہاتھوں سے مسمار اور برباد کر رہے تھے۔ جابر بیا ہی اشاروں پر چلاتے تھے اور وہ کٹھ پتلی کی طرح ناچنے پر مجبور تھے۔ ریگستان کا ایک نو دولت حاکم ظلم و ستم کے فرمان صادر کرتا تھا اور انکو سر تسلیم خم کرنے سے چارہ نہ تھا۔ اے آسمان! کیا یہی حیدر و ہلال کا مسکن تھا؟ اے زمین! کیا یہیں ہنیبال پیدا ہوا تھا؟ اے چاند سورج ستارو! کیا یہیں روما کی فتح کا خواب دیکھا گیا تھا؟

زینہار از دورِ گیتی و انقلاب روزگار
در خیال کس نہ گشتے کانچناں گردد چنیں

مالک کی سرکار میں دیر ہو اندھیر نہیں ہے احسان اور اسکے لشکر کو اس وحشیانہ ظلم کی سزا ملی اور چند ہی روز کے بعد "وادی العذاری" کی خونی گھاٹی میں ایک کاہنہ نے اسکو ایسی سخت شکست دی اور اسکے سپاہیوں کو اس کثرت سے تہ تیغ کیا کہ پانچ سال تک عرب کو دوبارہ افریقہ سے مقابلہ کی ہمت نہ ہوئی۔ مگر جب دن برے آتے ہیں تو اپنے غیروں سے بھی زیادہ برا برتاؤ کرتے ہیں۔ حسان نے تو ایک کارتھج کو بے نشان کیا تھا، کاہنہ کی عقل پر ایسا پردہ پڑا کہ اس نے اپنا سارا مقبوضہ ملک بے چراغ کر دیا۔ اس قصہ کو بھی مشرقی مورخوں نے بیان نہیں کیا اور نکتہ چینیوں کو عربوں پر اس سے زیادہ وحشیانہ سلوک کا الزام لگانے کا موقعہ دیا جسکے وہ واقعی مستحق تھے۔ العذاری المراکشی ساحل افریقہ کی تباہی کا راز یوں آشکارا کرتا ہے:۔

"کاہنہ نے اپنے ہمقوم بربریوں سے کہا کہ عرب افریقہ میں محض شہر، سونے اور چاندی کے متلاشی ہیں۔ اسکے برخلاف ہم کو صرف اسکے کھیتوں اور چراگاہوں کی ضرورت ہے اس لیے ہمارے واسطے سب سے بہتر بات یہ ہے کہ ہم افریقہ کے تمام شہروں کو برباد اور منہدم کر دیں تاکہ عرب ان سے بالکل ناامید ہو جائیں۔ اور وہ قیامت تک افریقہ کا رخ نہ کریں۔ چنانچہ اس نے اپنی قوم کو ہر طرف بھیج دیا اور انھوں نے درختوں کو کاٹنا اور قلعوں کو منہدم کرنا شروع کیا۔ کہتے ہیں کہ طرابلس سے طنجہ تک افریقہ کے تمام ملک میں مسلسل سایہ تھا۔ اس میں ایک دوسرے سے متصل گاؤں اور قریے آباد تھے اور شہر و ان میں بھی گھنی اور منتظم آبادی تھی۔ یہاں تک

کہ دنیا کی کسی اور اقلیم میں مغرب اور افریقیہ سے زیادہ بابرکت اور باخیر علاقہ اور شہروں اور قلعوں سے مسلسل آباد اور معمور سرزمین نہ پائی جاتی تھی۔ یہ رونق اور چہل پہل برابر دو ہزار میل تک تھی مگر کاہنہ نے اس تمام ملک کو برباد اور ویران کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیوں اور اہل افریقیہ کی ایک بڑی جماعت بے خانماں ہوگئی۔ اور کاہنہ کے اس فعل سے پناہ مانگنے لگی۔"

اب ساحل مغرب میں کیا دم تھا؟ بربریوں کی اس خودکشی سے افریقیہ تباہ ہو کر مصر کا ایک صوبہ بن گیا اور حسان کے نامور جانشین موسیٰ بن نصیر کے عہد حکومت میں (جو تاریخ اسلام میں اس کارنامہ کی بدولت ہمیشہ زندہ رہے گا کہ اسی کے ایک جنرل نے اندلس کا وسیع ملک فتح کیا تھا) غم نصیب ساحل کی یہ گت بنی کہ العذاری کے قول کے مطابق "موسیٰ نے اپنے ایک بیٹے عبداللہ کو افریقیہ کے بعض حصوں کی طرف روانہ کیا۔ وہ ایک لاکھ قیدی لیکر واپس آیا۔ پھر موسیٰ نے دوسرے بیٹے مروان کو بھیجا۔ وہ بھی اسی قدر قیدی لایا۔ چنانچہ اس وقت صرف "خمس" میں ہی ساٹھ ہزار قیدی آئے۔"

انا للہ وانا الیہ راجعون

یہ پُر درد کہانی اب کہاں تک بیان کی جائے۔ رشک پولیس کا وطن تقریباً ڈیڑھ سو برس دمشق و بغداد کا ایک ماتحت باجگذار رہا اور شام و عراق کے آزاد شدہ غلام اس جنت نظیر خطہ پر فرماں روائی کرتے رہے مگر ساحل کی آب و ہوا میں جو ان مردی و حریت کی تاثیر بدستور رہی۔ عربی تمدن اس نے قبول کیا۔ فاتحوں کا مذہب اختیار کیا لیکن آزادی و خودسری کے جواہر گم نہیں کیے۔ جب مرکزی حکومت کے درخت اقبال میں دیمک لگی تو سب سے پہلے یہی صوبے مستقل بغاوت کا علم بلند کیا اور بنی اغلب و بنی ادریس نے اس جاہ و جلال کی حکومتیں قائم کیں کہ مشرق کے بعض مورخوں نے ان سلطنتوں کا تذکرہ اپنی ضخیم کتابوں میں مجمل ہی لکھنا بہتر سمجھا تاکہ عباسیوں کے آفتاب کو گرہن نہ لگ جائے!! یہ شرف بنی اغلب ہی کے نصیب میں تھا کہ انھوں نے سسلی اور کریٹ وغیرہ کا رتیج کے قدیم مقبوضہ جزائر پر دوبارہ ملکیت قائم کی اور رومیوں کو نئے سرے اپنے گھر کی خیر منانے کی فکر پڑی۔

بنی اغلب نے ایک صدی کی حکومت میں اس مردہ ساحل پر آب حیات کے قطرے

ٹپکائے اور اُن کے جانشین عبیدیوں نے اسکو دوبارہ بساط عالم میں اپنی قدیم جگہ لینے کے قابل بنایا۔ عبیدئین کی عظمت پر بھی عرب کے بعض عابد ومتقی مورخ خاک ڈالنے کی کوشش کرتے اور اُنکے بادشاہوں کا نام بغیر دشنام کے لکھنا گناہ سمجھتے ہیں کیونکہ انکے بعض عقائد شرقی خلافتوں سے مختلف تھے اور ان کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ انکی سلطنت جو دولت بنی فاطمہ کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے ایک مدت تک خلافت بنی عباس کی زبردست حریف رہی اور اُس نے شام وحجاز کو اپنا ماتحت صوبہ بنا کر ایک سال حرمین شریفین میں بھی اپنی شوکت کا خطبہ پڑھوایا!

شاہزادۂ معزالدین جس کو ہندوستان کے سرمایۂ ناز افسانہ نگار میر تقی نے اپنی بوستان خیال میں حیات جاوید عطا کی ہے اسی سلطنت کے ایک تاجدار ابوتمیم معزلدین اللہ کا بگڑا ہوا نام ہے اور ابوالحسن جوہر جس نے مصر فتح کرکے عباسیوں کی خلافت افریقہ کے براعظم سے مٹادی اسی دولت کا ایک جنرل ہے!!

قدیم اسلامی سلطنتوں کے نظام میں چند اندرونی خرابیاں تھیں جو انکی کامیابیوں کو دیرپا نہیں ہونے دیتی تھیں اور انکو "دولت مستعجل" کا طعنہ دلایا کرتی تھیں لیکن اُن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ مختصر یہ کہ دولت بنی فاطمہ کے زوال کے بعد صنہاجیہ، مرابطین، ملثمین اور موحدین نے بڑی بڑی زبردست سلطنتیں اس سرزمین پر قائم کیں جن میں سے علامہ شبلی مرحوم نے بھی اپنے سلسلۂ "ذائل ہیروز آف اسلام" کے لیے دو ایک نامور تاجداروں کو منتخب کیا تھا۔ مگر ملک کی بدقسمتی سے اُنکی زندگی نے وفا نہ کی۔ اور اُنکے قابل جانشین کو سیاسیات نے اُستاد کی یہ دیرینہ آرزو پوری کرنے کی فرصت نہ دی۔ ملثمین کی حکومت مغرب کی ایجادات واختراعات پسند آب وہوا کا ایک شعبدہ تھی جس نے دنیا کی تاریخ میں اپنا نام یوں زندہ رکھا کہ اُس عہد کی عورتیں مردانے لباس میں باہر نکلتی تھیں اور مرد نقاب پوش رہتے تھے!!

مرابطین اور موحدین کی بیش بہا خدمات مذہب اسلام کو کبھی فراموش نہیں ہوسکتیں۔ مسیحیوں کی روزافزوں سطوت سے مقابلہ کرنے میں اُن کی عظیم قربانیاں مسلمان کبھی بھول نہیں سکتے۔ اور جب تک اسپین کی تاریخ یورپ کی لکھی ہوئی بھی دنیا سے مٹ نہ جائے اُنکی حسرت والم انجام "جنگ عقاب" پر جس میں چھ لاکھ جاہد ایک میدان میں کٹ کر فدائے مذہب ہوگئے مغرب ہمیشہ آنسو بہاتا رہے گا۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما

موحدین کا خاتمہ ترکوں کے بحری عروج کا پیش خیمہ تھا اور اُس عہد کے بربری قزاقوں کا دبدبہ مسیحی بلادروں کو ابھی تک یاد ہے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ مائیں اپنے بچوں کو ترکوں کے نام سے ڈرایا کرتی تھیں اور کسی مسیحی کا بحیرۂ روم سے زندہ و سلامت واپس آنا ساحرتری کے طفیل میں گویا مُرت کے پنجے سے رہائی پاتا تھا!!!

یہ دن بھی گذر گئے۔ شیر بیمار ہوا اور مرگیا۔ فرانس، اٹلی اور اسپین نے شمالی افریقہ کی ہڈیوں پر دندان آز کو تیز کیا اور کل شام تک اس بلجیں اور بے یاد ساحل پر انھیں ملکوں کے غبار آلودہ سپاہی پولو کھیل رہے تھے مگر یہ زمین عجائبات قدرت کا تماشہ گاہ ہے۔ معلوم نہیں کہ آج رات کو رومیو جولیٹ کا ناٹک ہوگا یا راجہ اندر کا اجلاس!!

تلک الایام نداولہا بین الناس

المختصر یہ بربری ساحل انقلابات عالم کا عجیب و غریب مرقع ہے اور اسکی مکمل تاریخ کسی وقت اُردو زبان میں اگر مرتب ہو جائے تو وہ دلچسپیوں کا انمول خزانہ ہوگی۔

ضرورت ہے کہ انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں سے کارتھج کی قدیم تاریخ کو اُردو کا جامہ پہنایا جائے۔ عربی سے تاریخ مغرب کے قدیم دفینے تلاش کرکے ہندوستان میں لائے جائیں اور اسکے بعد کوئی سحر نگار مورخ اس انبار سے جو اہرات ڈھونڈھ کر مغرب کی ایک مکمل تاریخ اپنی ملکی زبان میں تیار کرے۔

بے مایہ زبان اُردو کو محمد جمیل الرحمٰن صاحب ایم اے پروفیسر تاریخ اسلامی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ اُنھوں نے اس قومی فرض کا ایک مختصر حصہ ادا کرنے کی سعی کی ہے اور ابن العذاری المراکشی کی ایک نایاب تالیف البیان المغرب فی اخبار المغرب کی پہلی جلد کا ترجمہ شایع کیا ہے۔

افسوس ہے کہ فاضل مترجم نے اپنی کتاب کے ساتھ کوئی مقدمہ شایع نہیں کیا جس سے مغرب کی قدیم عظمت و شوکت معلوم ہوسکتی اور اُن کی بیش قیمت تالیف سے روشناس کرنے کے لیے۔

اس طویل تمہید کی ضرورت نہ ہوتی کم سے کم مورخ العذاری کی مختصر سوانحعمری تو کتاب کے شروع میں ضرور دینا چاہیے تھی تاکہ یہ معلوم ہو سکتا کہ مولف کا نشو ونما کس عہد میں ہوا تھا اور جو واقعات اُس نے اپنی تاریخ میں درج کیے ہیں اُن سے واقفیت حاصل کرنے کی اُس کے پاس سوائے قدیم کتابوں کے اور کیا کیا ذرائع موجود تھے۔

جفاکش مترجم نے ملک مغرب کا ایک نقشہ کتاب کے ساتھ ضم کیا ہے جس سے تاریخ مغرب کے سمجھنے اور موجودہ شہروں کے قدیم عربی نام دریافت کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس نقشہ میں رنگ نہیں بھرا گیا اور نقاط کے ذریعہ سے یہ دکھانے کی کوشش نہیں کی گئی کہ بنی اغلب کا رقبہ حکومت کس قدر تھا؟ عبیدیین نے کتنا اضافہ کیا اور موحدین کا دائرۂ سلطنت کہاں تک وسیع ہو گیا۔ مترجم کی دیانت اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ متن کے ابتدائی اوراق جن میں غالبًا افریقہ کے حالات اور عربوں کے ابتدائی فتوحات کا تذکرہ تھا گم ہو گئے تھے یا دیمک کی نذر ہوئے تھے تو ترجمہ میں بھی نقاط کے ذریعہ سے دکھا دیا گیا کہ اصل کتاب میں اس جگہ نقص واقع ہو گیا ہے۔ اگرچہ زیادہ بہتر تھا کہ اُس زمانہ کے واقعات دیگر عربی تواریخ سے اخذ کر کے بطور نوٹ کے لکھ دیے جاتے تاکہ کتاب بحیثیت مجموعی مکمل رہتی اور ساحل مغرب کے آیندہ خوش نصیب مورخ کو اُس عہد کے لیے جو اس تالیف میں مذکور ہے کسی دوسری کتاب کی ورق گردانی کی ضرورت نہ پڑتی۔

کتاب کے خاتمہ پر تعلیقات کے عنوان سے بہت سے انمول جواہر ریزے مترجم نے اپنی کد و کاوش سے فراہم کیے ہیں۔ اور درحقیقت یہی معلومات قابل ترجمہ نگار کی وسعت نظر کا ثبوت ہے لیکن زیادہ مناسب تھا کہ یہ لعل و زمرد کے ٹکڑے موقع موقع پر کتاب کے دامن میں فٹ نوٹ کی طرح جڑے جاتے اور کتاب کے آخر میں ایک جگہ انبار نہ کر دیے جاتے جہاں ان کی قیمت کا اندازہ کرنے کی کم لوگ کوشش کریں گے۔ انھیں تعلیقات کا ایک جزو بربری قبائل کا شجرۂ نسب ہے۔ جس کے کیجا کرنے میں مترجم کو بہت تکلیف برداشت کرنا پڑی ہوگی مگر اس شجرہ کی صحت اب بھی مشتبہ ہے علاوہ ترجمہ کی عظمت میں کچھ فرق نہ آتا اگر یہ بیکار زحمت نہ اُٹھائی جاتی۔

خدا کرے کہ اس ترجمہ کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت جلد آئے۔ اور مترجم صاحب

ان تناقص کو دور کر سکیں۔

ترجمہ نہایت سلیس اور عام فہم زبان میں ہے۔ اور نکتہ چیں نگاہ ۵۰۰ صفحوں کی ضخیم کتاب میں صرف دو جگہ پنجابی اُردو کا نمونہ تلاش کر سکی:

صفحہ ۳۰ پر یہ عبارت درج ہے "جن سے ہم نے بہت سے عہدنامے اور وعدے کیے ہوئے ہیں" اور صفحہ ۳۴۰ پر ایک جگہ لکھا ہے "معلوم ہوا کہ اُنکے غلاموں نے سواری اور ہتھیاروں وغیرہ کا انتظام کیا ہوا ہے"

یہ خفیف لغزش یقیناً کاتب کی غلطی ہے جو مصحح کی نظر سے بچ گئی ورنہ ساری کتاب فصیح اور بامحاورہ اُردو میں ہے۔ اور عربی سے ترجمہ کی ہوئی کتابوں میں زبان کے متعلق ہونے کا جو نقص ہوتا ہے، اور جو ہمارے بعض عالم لیڈروں کی تحریرات میں بھی پایا جاتا ہے اس پیش بہا تالیف میں کسی جگہ نظر نہیں آتا۔ نثر سے زیادہ نظم کا ترجمہ دشوار ہے مگر اس دشوار گذار منزل میں بھی پروفیسر صاحب کا قدم نہیں پھسلا۔ اشعار کا ترجمہ صحیح ہوا اور زبان بھی صاف رہی۔ مثال کے لیے دو نمونے ملاحظہ ہوں:—

(۱) اصبر لدھر نال منک فھکذا مضت الدھور
فرح و حزن مرۃ لا حزن دائم ولا السرور

(ترجمہ۔ زمانہ کی کج ادائی پر صبر کر۔ کیونکہ زمانے اسی طرح گذرتے رہتے ہیں۔ خوشی اور غم آتے جاتے رہتے ہیں۔ نہ غم ہمیشہ رہتا ہے اور نہ خوشی)

(۲) اسلامی سلطنتوں کے آخری فرماں رواعام طور پر اپنی جان بچا کر بھاگنا میدان جنگ میں کٹ کر مرجانے سے بہتر سمجھا کیے ہیں۔ کیونکہ اپنے ملک و قوم کی حفاظت کے لیے اگر وہ جان دیدیتے تو اُن میں اور چیتوڑ گڈھ کے راجاؤں میں کیا فرق باقی رہ جاتا!! اسی صلح و عافیت کی انجیل پر عمل کرنے کے لیے بنی اغلب کا آخری تاجدار زیادۃ اللہ بھی افریقیہ سے فرار ہوا اور بیت المقدس میں جاکر مرا۔ جب وہ اپنے اہل و عیال، مال و متاع اور ایک ہزار صقلیوں کے ساتھ قیروان سے بھاگا ہے تو ایک لونڈی کو پیچھے چھوڑنا چاہتا تھا۔ جس نے رخصت کے وقت یہ دو شعر گائے تاکہ وہ اسکو بھی ساتھ لے جائے:

لم انس یوم الوداع موقفها وجفنها فی دموعها غرق

وقولها والرکاب واقفۃٌ تترکنی سیدی وتنطلق

(ترجمہ) "میں نہیں بھولا رخصت کے دن اُس کے ٹھہرنے کے مقام کو ایسی حالت میں کہ اُس کی پلکیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ اور اُس کا یہ کہنا اُس وقت جبکہ سواری تیار کھڑی تھی کہ ہمارے سردار ہم کو چھوڑ کر جا رہا ہے!"

یہ اشعار سن کر عبید اللہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اُس نے مال کا ایک بوجھ گرا دیا اور لونڈی کو ساتھ لے گیا۔ (صفحہ ۲۰۲ وصفحہ ۲۳۰)

---

نثر میں بھی ایک مقام پر رعایت لفظی نے عربی عبارت کا اُردو میں ترجمہ کرنا دشوار کر دیا تھا مگر مترجم نے نہایت خوش اسلوبی سے اُس مہم کو آسان کیا۔ ملاحظہ ہو:

"ابن خنیش معروف بہ یونانی نے مجھ سے کہنا شروع کیا کہ "کہا جاتا ہے کہ نمکین چیز (ملوحہ) مزہ دار ہوتی ہے (تحلو)" میں نے کہا ہاں۔ پھر کہا کہ" اور کہتے ہیں مٹھاس (حلاوۃ) میٹھی ہوتی ہے (تحلو)" میں نے کہا ہاں۔ اس پر اُس نے کہا "پھر مٹھاس ہی نمکینی ہے اور نمکینی مٹھاس ہے"۔ میں نے جواب دیا کہ مٹھاس اپنی لطافت کی وجہ سے مزہ دار ہوتی ہے اور نمکینی اپنی ثقالت کی وجہ سے۔ اسکے بعد اُس نے اسی قسم کی گفتگو جاری رکھی۔ آخر میں نے تنگ آ کر کہا کہ کہتے ہیں کہ تم زندہ ہو۔ اُس نے جواب دیا کہ ہاں۔ میں نے کہا یہ بھی کہتے ہیں کہ کُتا زندہ ہے۔ اُس نے کہا ہاں۔ میں نے کہا کہ پھر تم کتے ہو اور کُتا تمھارے برابر ہے۔ یہ سنکر زیادۃ اللہ خوب قہقہے مار کر ہنسا۔ میں سمجھ گیا کہ بجائے کام کی باتوں کے ان ہی ہزلیات کی طرف زیادہ مائل ہے"۔ (صفحہ ۱۹۲)

ترجمہ کی خوبیاں ظاہر کرنے کے لیے اتنے ہی نمونے کافی ہیں۔ اب متن کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔ فن تاریخ نویسی بیسویں صدی میں بہت ترقی کر گیا ہے اور زمانۂ حال کے بعض یورپین مورخ صداقت اور راستبازی کو اتنا ضروری خیال نہیں کرتے جتنا کہ اپنی تالیفات کو دلچسپ بنانا لازمی سمجھتے ہیں۔ وہ ہر ایک ملک کے واقعات جداگانہ طور پر مسلسل بیان کرتے ہیں اور اُن سوانح کے اسباب و نتائج بھی ظاہر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ عرب کے قدیم مورخ اس طرز تحریر سے ناآشنا

تھے اور اپنے علمی تصنیفات کو قصہ کہانی کی طرح عوام پسند بنانا نہیں جانتے تھے۔ وہ واقعات کو بترتیب سنین لکھتے تھے اور جس سال میں جو سانحہ پیش آتا تھا اُسکو تسلسل کا لحاظ کیے بغیر اُس سنہ کے عنوان میں درج کردیتے تھے۔ العذاری المراکشی جس کی تاریخ مغرب کی پہلی جلد کا ترجمہ اس وقت ہمارے پیش نظر ہے اسی سنت قدیم کا عامل تھا۔ وہ بھی سال بہ سال واقعات تحریر کرتا ہے لیکن غنیمت ہے کہ خاص خاص حکومتوں اور مہتم بالشان سوانح کو بطور خلاصہ ایک جگہ بھی جمع کردیا ہے۔ اس جلد میں عربوں کے ابتدائی فتوحات سے ۲۱؎ھ ہجری یعنی آغاز سلطنت موحدین تک کے حالات ہیں۔ بنی اغلب اور بنی فاطمہ کا دور حکومت کافی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ بنی ادریس، صنہاجیہ اور بنی رستم کا بھی حال ہے لیکن مرابطین اور ملثمین اس سے زیادہ توجہ کے مستحق تھے جتنی کہ العذاری نے اُنکے حال پر کی ہے۔

کتاب بحیثیت موجودہ ناول کی طرح پڑھنے کے قابل نہیں ہے لیکن معمولی تاریخی واقعات کے علاوہ ہجرت کی ابتدائی چھ صدیوں میں اہل مغرب کی معاشرت، اُنکی اخلاقی حالت، اُنکی خانہ جنگیاں، اُنکے سنگین جرائم، اُن کا علم وفضل، اُنکے ایجادات واختراعات اور اُنکے جاہ وجلال کی چلتی پھرتی تصویریں اس قدر افراط سے اس کتاب میں جمع کی گئی ہیں کہ مغرب کا آیندہ مورخ اس کتاب سے حکایات اخذ کرکے ساحل بربر کے ازمنۂ متوسطہ کی نہایت دلچسپ تاریخ مرتب کرسکتا ہے جو بالکل زمانۂ حال کے مذاق کے مطابق ہو۔ اگر ان سب حکایتوں کا اقتباس کیا جائے تو یہ مضمون ایک مستقل رسالہ بن جائے گا۔ لہذا وہی چار نمونے پیش کیے جاتے ہیں:۔

(۱) ایک ملکہ کا جنازہ

"اُسی سال نصیر الدولہ کی بیوی نے انتقال کیا۔ اُسکو ایسا کفن دیا گیا کہ کسی بادشاہ کو اُس جیسا کفن نصیب نہیں ہوا۔ ایک سوداگر نے جو اُس وقت وہاں موجود تھا بیان کیا ہے کہ اُسکی قیمت ایک لاکھ دینار تھی۔ جنازہ کو عود ہندی کے تابوت میں جو جواہرات سے مرصع تھا بند کیا گیا یہ جنازہ اس شان وشوکت سے اُٹھایا گیا کہ جس کی نظیر نہیں ملتی۔ ........ اس تابوت کی صرف کیلوں کی قیمت دو ہزار دینار تھی"۔ (صفحہ ۲۷۹ - ۲۸۰)

(۲) ایک شہزادی کی شادی

"اسی سال ماہ رجب میں شرف الدولہ کی بہن شہزادی ام العلو بنت نصیر الدولہ کی شادی ہوئی۔ غرۂ شعبان کو بُدھ کے دن ام العلو کے محل کو سجایا گیا اور عوام و خواص اُسکے دیکھنے کو آئے۔ یہاں اُنھوں نے ایسے طرح طرح کے جواہرات، مالے، بیش بہا سامان اور سونے چاندی کے برتن دیکھے کہ نہ پہلے کبھی اُس جیسے بنائے گئے تھے اور نہ کسی بادشاہ کے پاس سُنے گئے۔ ابو اسحاق کہتے ہیں کہ یہ مال اور عظمت و شان دیکھ کر عوام الناس کی آنکھیں چوندھیا گئیں اور وہ مبہوت ہو کر رہ گئے ...

...... اُس کا مہر دس بوجھوں میں دس خچروں پر بار تھا اور ہر ایک بوجھ پر ایک خوبصورت لونڈی تعینات تھی ....... ایک تجربہ کار سوداگر کا قول ہے کہ میں نے اُس تمام سامان کی قیمت آنکی تو وہ اندازاً دس لاکھ دینار ہوتی تھی۔ اس سے قبل افریقیہ میں کسی عورت کو اتنا جہیز نہیں دیا گیا"۔ (صفحہ ۳۰۲)

## (۳) ہمت و استقلال

"۴۳۶ھ میں جرجانی نے مصر میں وفات پائی۔ الحاکم بامر اللہ عبیدی نے کسی قصور پر اُسکے دونوں ہاتھ کٹوا دیے تھے مگر اُسے مصیبت سے ذرا بھی دُکھ درد نہ ہوا۔ بلکہ کہتے ہیں کہ اُس نے زخم کو باندھا اور اُسی وقت دیوان میں اجلاس کرنے کے لیے آ بیٹھا اور کام کرنا شروع کر دیا۔ جب لوگوں نے تعجب کا اظہار کیا تو کہا کہ امیر المؤمنین نے مجھ کو میرے قصور کی سزا دی ہے معزول نہیں کیا ہے۔ جب حاکم کو یہ معلوم ہوا تو اُسے پھر اُسکے کام پر مقرر کر دیا"۔ (صفحہ ۳۸۸)

[نوٹ۔ شاید "اختیارات سرسری" عطا فرما دیے ہوں گے تاکہ شہادت لکھنے کی ضرورت نہ ہو، اور جیل خانہ کی آبادی میں اضافہ ہو جائے!!۔]

## (۴) علم و قابلیت

"یہ امیر افریقیہ (ابو عباس محمد بن الاغلب) بہت کم لکھا پڑھا آدمی تھا۔ بیان کرتے ہیں کہ اُس کا کاتب بدحجاء ایک دن اُسکے پاس تھا کہ اُس نے "محم ضنین" منادے سے لکھا۔ جب مجلس برخاست ہوگئی تو کاتب نے کہا کہ خدا امیر کا بھلا کرے، "ضنین" "ظ" سے ہے نہ کہ "ض" سے۔ امیر نے جواب دیا کہ ہم کو معلوم ہے کہ اس میں اختلاف ہے۔ ابو حنیفہ اسکو "ظ" سے لکھتے ہیں اور امام مالک "ض" سے۔ یہ سُن کر تمام حاضرین تعجب میں رہ گئے"۔ (صفحہ ۱۴۴، ۱۴۵)

## (۵) ایک جدید مذہب

"متیسرین سے مراد میاسرہ یعنی میسرہ کے پیروؤں سے ہے۔ اس مذہب یا گمراہی کی تفصیل یہ ہے کہ وہ صالح بن طریف کی نبوت کے قائل تھے۔ ...... اُس نے ماہ رجب کے روزے اور رمضان میں کھانا پینا فرض کیا تھا۔ پانچ وقت کی نماز دن میں اور پانچ وقت کی نماز رات کو فرض کی۔ عید الضحیٰ گیارہ محرم کو مقرر کی ...... اُنکی بعض نمازیں بغیر سجدہ کی ہوتی تھیں اور بعض مسلمانوں کی نماز کی طرح۔ مگر وہ یکے بعد دیگرے تین سجدے کیا کرتے تھے اور اپنے چہرہ اور ہاتھوں کو زمین سے نصف بالشت بلند رکھتے تھے۔ ............ ان میں سے ہر شخص جتنی عورتیں چاہے کر سکتا تھا اور جس طرح چاہے اُنکو طلاق دے کر پھر اُنکی طرف رجوع کر سکتا تھا ........ زانی کو سنگسار اور جھوٹے کو جلا وطن کیا جاتا تھا .... تمام حیوانات اُنکے ہاں حرام تھے۔ مچھلی کا گلا کاٹے بغیر نہ کھاتے تھے۔ مرغ اور انڈا قطعاً حرام تھے۔ مرغی مکروہ تھی سوائے اسکے کہ کسی کو اُس کی بہت ہی خواہش ہو۔ اوقات کا معلوم کرنا اُن کے ہاں مرغ کی اذان پر منحصر تھا اور اسی وجہ سے اُنھوں نے اُسے حرام قرار دیا تھا، اور اُس کا تھوک اُنکے یہاں متبرک تھا۔ یہ لوگ علم نجوم کے بڑے عالم تھے ....... صالح کے قرآن میں اسّی سورتیں تھیں جن میں سے اکثر نبیوں کے نام سے منسوب تھیں۔ ان ہی میں سورۂ فرعون، سورۂ دیک، سورۂ جراد۔ سورۂ جمل، سورۂ ہاروت سورۂ ماروت وغیرہ تھیں۔ ...... ۳۵۲ھ تک اکثر قبائل اس مذہب کے پیرو رہے۔" (صفحہ ۳۱۵ - ۳۱۶)

## (۶) ایک ظالم کے دردناک ستم

"کہتے ہیں کہ اُس کی (ابراہیم بن احمد اغلبی کی) ایک لونڈی سے اُس کا ایک چھوٹا رومال جس سے وہ منہ پونچھا کرتا تھا گم ہوگیا اور ایک نوکر کے پاس سے ملا۔ اس جرم میں اُس نے تین سو خادموں کو قتل کرا ڈالا۔ اپنے بیٹے ابو اغلب کو قتل کرانے کا سبب محض ایک شبہہ تھا۔ اسی طرح اُس نے اپنے آٹھ بھائیوں کو اپنے سامنے ہی قتل کرایا۔ جب کبھی اُسکے کوئی بیٹی پیدا ہوتی تھی تو ابراہیم کی ماں اس خوف سے کہ کہیں وہ اسے قتل نہ کرادے ہمیشہ اس ولادت کو پوشیدہ رکھتی تھی۔ اس طرح ہوتے ہوتے اُسکے پاس سولہ نہایت خوبصورت لڑکیاں جمع ہوگئیں۔

ایک دن جب اپنے بیٹے کو ذرا خوش خوش دیکھا تو کہا کہ میں نے تمھارے لیے چند خوبصورت لونڈیاں پرورش کی ہیں اور میں چاہتی ہوں کہ تم اُنکو دیکھ لو۔ ابراہیم نے بھی خواہش ظاہر کی۔ اس پر اُن سب کو بُلا یا گیا۔ اور اب اُس کی ماں نے بتانا شروع کیا کہ یہ تمھاری بیٹی فلانی کے بطن سے ہے اور یہ فلاں سے وغیرہ وغیرہ۔ یہ دیکھ بھال کر وہ اپنی ماں کے پاس سے اُٹھکر باہر آیا اور ایک اپنے حبشی غلام کو حکم دیا کہ جاکر لڑکیوں کے سر لے آئے۔ خادم یہ سُن کر ہکا بکا رہ گیا۔ ابراہیم نے کہا کہ جا، ورنہ میں اُن سے پہلے تجھ ہی سے شروع کروں گا۔ مجبوراً اُسکو جانا پڑا۔ جب وہ اُس کی ماں کے پاس گیا تو اُسے بھی سخت صدمہ ہوا اور اُس نے کہا کہ جاکر پھر اُس سے کہو۔ مگر اُس نے جواب دیا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ان سب کو قتل کر ڈالا اور بالوں کو پکڑ کر ان سب کے سر ابراہیم کے سامنے ڈالے"۔ (صفحہ ۱۸۱-۱۸۲)

---

سلسلۂ سخن دراز ہوگیا۔ اور اہل مجلس زانو بدلنے لگے۔ ابن العذاری کی مورخانہ وقعت پر تبصرہ کیا جائے تو اندیشہ ہے کہ احباب کو جماہیاں آنے لگیں! "الناظر" کی جبین پر مضمون کی طوالت سے شکن پڑ چکی ہے۔ ابن العذاری کا عرب کے دوسرے مورخوں سے موازنہ کیا جائے تو خطرہ ہے کہ "باقی آئندہ" کا دلخراش عتاب نازل ہو اور اشہب قلم صفحہ قرطاس پر جو دَوڑ کر چکا اُس کا بھی لطف جاتا رہے!! لہذا شمع محفل خاموش اور مجلس برخاست!!

مگر صبح کچھ دور نہیں! باد نسیم کے جھونکے شروع ہو گئے۔ افق مشرق پر سفید دھاری نمایاں ہے۔ اُدھر جلد دوم مطبع سے طلوع ہوئی اور یہاں بزم سخن پھر قائم ہو گئی!! یار زندہ وصحبت باقی!!!

## امیر احمد علوی بی اے۔ نیمچ چھاؤنی۔ سنٹرل انڈیا

اگست نمبر میں انعامی مضامین کی جانچ کرنے والے اصحاب کے اسمائے گرامی درج کرتے وقت عزیز محترم جناب منشی امیر احمد علوی کا پتہ غلط ہو گیا تھا۔ صاحب موصوف "نیاز" میں نہیں بلکہ "نیمچ" میں تشریف رکھتے ہیں۔ اور "سشن جج" نہیں بلکہ "ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور جج" ہیں۔ ایڈیٹر

# حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر مسعود اجودھی رحمۃ اللہ علیہ

آفتاب انوار ولایت، پیشوائے عالم ہدایت، بدرالطریقت شمس الحقیقت، عمدۃ الابرار قدوۃ الاخیار، سلطان السالکین، شمس العارفین، برہان العاشقین فریدالحق والشرع والدین قدس سرہ العزیز اپنے زمانے کے سرحلقۂ واصلان حق تھے۔ صاحب مرأۃ الاسرار فرماتے ہیں کہ

"ویرا دریں طریق بغایت شانے بزرگ ہست۔ وجمیع مشائخ بر کمال عشق و عرفان و احوال وے متفق اند۔ وریاضت و مجاہدات وترک و تجرید و فقر وشوق کہ ویرا دست دادہ بود ہیچ یکے ازیں طائفہ را مجموع کمالات صوری و معنوی در یک شخص واحد میسر نشد۔ ودر کشف وکرامات و وجد وحال وہمت وشجاعت بے نظیر وقت بود۔"

آپ کے والد ماجد کا نام نامی جمال الدین بن سلیمان تھا جو کھتوال (واقع ملتان) کے قاضی تھے۔ اور والدہ ماجدہ ملا وجیہہ الدین خجندی کی دختر نیک اختر تھیں۔ آپ کے والد ماجد قاضی شعیب کی اولاد میں سے تھے جن کا سلسلۂ نسب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہونچتا ہے۔ سید محمد کرمانی کتاب سیرالاولیا میں فرماتے ہیں کہ فرخ شاہ عادل والی کابل آپ کے اجداد میں سے تھے۔ کابل کی سلطنت حوادث روزگار سے غزنی کی سلطنت میں ضم ہوگئی لیکن فرخ شاہ کی اولاد چنگیز خاں کے خروج تک کابل ہی میں رہی۔ فتنۂ تاتار کے بعد آپ کے جد قاضی شعیب تمام عیال و اطفال کو لے کر لاہور آگئے۔ کچھ وہاں چندروز قیام کرکے قصور کا ارادہ فرمایا۔ قاضی قصور نے آپ کی بڑی خاطر تواضع کی اور بادشاہ وقت کو آپ کے حالات سے مطلع کیا۔ بادشاہ نے قصبۂ کھتوال کی قضاۃ جو ملتان کے قریب واقع ہے آپ کو عطا کی۔ چنانچہ آپ نے وہیں اقامت وسکونت اختیار فرمائی۔

آپ کی والدۂ ماجدہ اپنے زمانہ کی بڑی بزرگ بی بی تھیں۔ حضرت سلطان جیؒ کے ملفوظات میں اکثر آپ کی کرامات کا ذکر ہے۔ آپ کا نام قرسم خاتون تھا۔

سفینۃ الاولیا میں ہے کہ آپ کی ولادت باسعادت قصبۂ کھتوال میں جو ملتان کے توابع

میں ت ہے اور آج کل مشائخ کی چاؤلی کے نام سے مشہور ہے، ۵۶۹ھ پانسو اُنہتر ہجری میں واقع ہوئی۔ یہ موضع پاک پٹن (اجودھن) اور بہاران ضلع ملتان کے درمیان واقع ہے۔ اپنے شیخ کے وصال کے بعد اکتیس (سی ویک) سال قید حیات میں رہے۔ اور پچانوے سال کی عمر میں [1] شنبہ کے دن پانچویں محرم ۶۶۴ھ چھ سو چونسٹھ ہجری کو اس عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرمائی۔ مراۃ الاسرار میں تاریخ وفات چھ سو اڑسٹھ (۶۶۸) درج ہے یعنی سفینۃ الاولیا سے چار سال کا تفاوت آتا ہے۔ لیکن عمر دونوں نسخے پچانوے (نود و پنج) سال لکھی ہے۔ آپ کا قصبۂ اجودھن میں جو اب پاک پٹن کے نام سے مشہور ہے دفن کیا گیا۔ مزار مبارک آج تک منبع فیوض و برکات ہے۔ یزارُ و یتبرّک۔

صاحب مراۃ الاسرار فرماتے ہیں کہ بچپن ہی سے عشق الٰہی آپ کے دل میں موجزن تھا۔ اور عنفوان شباب ہی میں تمام دنیاوی مرادوں سے دست کش ہوکر گھر سے علم ظاہری و باطنی کی طلب میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔

سیر العارفین میں حضرت سلطان المشائخؒ سے منقول ہے کہ تلاش علم میں آپ گھر سے نکل کر ملتان پہونچے۔ وہاں مولانا منہاج الدین ترمذی کی مسجد میں اُترے۔ علم فقہ میں ایک کتاب ہے نافع نام، اُسی کا مطالعہ فرما رہے تھے کہ حضرت قطب الاسلام والمسلمین خواجہ بختیار کاکیؒ اس مسجد میں تشریف لائے۔ انھیں دیکھا کہ ایک پاک صورت نیک سیرت ایک کتاب ہاتھ میں لیے پڑھ رہا ہے۔ آپ نے پوچھا مسعود کونسی کتاب پڑھ رہے ہو؟ اُنھوں نے کہا نافع۔ آپ نے فرمایا! تم سمجھتے ہو کہ اس سے تمھیں نفع پہونچے گا؟ حضرت گنج شکرؒ نے التماس کیا کہ میرا نفع حضرت کی نظر کیمیا اثر میں ہے۔ یہ کہکر قدمبوس ہوئے۔ خواجہ قطب الاسلام نے بہت نوازش فرمائی۔ اور جب ملتان سے دہلی جانے لگے تو حضرت گنج شکرؒ تین منزل تک ہمراہ آئے۔ بعدہٗ حضرت قطب الاسلام نے یہ کہکر رخصت کردیا کہ ابھی چند ایام علم ظاہری کی تحصیل میں مشغول رہو۔ اسکے بعد دہلی آکر ہمارے پاس ٹھہرنا۔ حضرت سلطان المشائخ قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں کہ اس وقت حضرت گنج شکرؒ کی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔

[1] مراۃ الاسرار میں روز وفات شنبہ درج ہے اور سفینۃ الاولیا میں سہ شنبہ۔ لیکن دونوں میں پانچویں محرم کی تاریخ وفات بیان کی گئی ہے۔

خواجہ قطب الاسلام سے رخصت ہوکر آپ قندھار کی طرف متوجہ ہوئے اور پانچ سال کامل وہاں تحصیل علم میں مشغول رہے۔ اسکے بعد بغداد کی طرف ارادہ فرمایا۔ یہاں تمام مشائخ وقت سے ملاقات فرمائی خصوصاً شیخ شہاب الدین عمر سہروردی قدس سرہٗ العزیز کی ملازمت بھی حاصل کی چنانچہ خود فرماتے ہیں کہ "شیخ شہاب الدین سہروردی را دعاگو دیدہ است و سعادت قدمبوسی حاصل کردہ"۔
حضرت گنج شکرؒ فرماتے ہیں کہ بغداد میں شیخ اجل شیرازیؒ سے بھی ملا تھا۔ بہت بزرگ و باعصمت پیر تھے۔ جب ہاتھ چومنے کے لیے بڑھا تو آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور فرمایا "بیا اے لنگر عالم نیک آدمی"۔ چند روز اُن کی خدمت میں بھی رہا۔ کسی کو نہیں دیکھا کہ اُنکی خانقاہ سے محروم گیا ہو۔ مجھے بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تیرے رزق میں برکت عطا فرمائے۔ بغداد سے نکل کر جب میدانوں میں پہنچا تو ایک درویش کو دیکھا زار و نزار۔ جسم پر صرف استخوان و پوست باقی رہ گیا ہے۔ میرے دل میں یہ خطرہ گذرا کہ اس جنگل میں یہ صاحب کب سے ہیں اور کیا کھاتے پیتے ہیں؟ اس خطرہ پر مطلع ہوکر اُنھوں نے فرمایا کہ اے فرزند چالیس سال سے اس غار میں مقیم ہوں اور سوائے خس و خاشاک اور میرے لیے کچھ نہیں ہے۔ چند روز اُن کی خدمت میں رہا۔ پھر وہاں سے بخارا کی طرف روانہ ہوا جہاں شیخ سیف الدین باخرزی رحمۃ اللہ علیہ سے قدمبوسی حاصل کی۔ بڑے باعصمت بزرگ تھے۔ اُن کی خدمت میں رہا ہوں۔ جب میری طرف نظر فرماتے یہ کہتے کہ یہ لڑکا مشائخ روزگار میں سے ہوگا۔ اور تمام عالم اس کے مُریدوں اور فرزندوں سے بھر جائے گا۔ ایک سیاہ گلیم آپ کے دوش مبارک پر تھی اُتار کر مجھے دی اور فرمایا پہن لو۔ میں نے پہن لی۔ چند روز کے بعد یہاں سے بھی رخصت ہوا۔ ایک مسجد میں پہنچا۔ وہاں سے نزدیک ایک صومعہ تھا وہاں ایک باہیبت درویش کو دیکھا کہ عالم تفکر میں کھڑا ہوا ہے اور آنکھیں آسمان کی طرف ہیں۔ چار روز بعد عالم صحو میں آئے اُس وقت میں نے سلام کیا۔ جواب سلام عطا فرمایا اور کہا کہ میری وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی، بیٹھو۔ اُنھوں نے اپنا حال بیان فرمایا کہ میں حضرت شمس العارفینؒ کے پوتوں میں سے ہوں اور تیس سال سے یہاں معتکف ہوں۔ سوائے ہیبت و حیرت کے اور کچھ نصیب نہیں ہوا۔ پھر فرمایا کہ "ایں راہ دراز است ہر کہ دریں راہ بہ راستی قدم نہ زند بہ وصل نہ رسد"۔ بعد ازاں اپنے احوال و مقامات بیان فرمائے اور کہا خویشتن سے بیگانہ ہو جاؤ تا کہ

اُس کے لگا نہ ہو ۔ رات بھر خدمت میں رہا صبح کو رخصت ہوا۔

آپ فرماتے ہیں کہ بدخشاں میں بھی بہت سے بزرگوں سے نیاز حاصل ہوا۔ ایسے تھے کہ اُنکی تعریف نہیں بیان کرسکتا۔

اس تمام دورہ دسفر کے بعد آپ ملتان کی جانب واپس ہوے ۔ اور شیخ بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات فرمائی ۔ وہاں سے مراجعت کرکے دہلی تشریف لائے اور خواجہ قطب الاسلام بختیار اوشی قدس سرہ العزیز کی خدمت میں رہنے لگے۔ خود فرماتے ہیں کہ

"نعمتے کہ دردے دیدم آں نعمت در حد وصف و بیان نیاید پس خود را در پائے ایشاں بستم و بشرف بیعت مشرف شدم ۔ سوم روز سر نعمت بمن رواں کرد و ایں سخن ہم فرمود کہ مولانا فرید کار خود تمام کردہ بودی آنگاہ بمن آمدی"

حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ حضرت گنج شکرؒ نے جب یہ بیان ختم کیا تو نعرہ مارا اور تین شبانہ روز عالم استغراق میں بےخود رہے ۔ اسکے بعد جب ہوش میں آئے تو فرمایا مردان خدا نے یہ کیا ہے جب کسی مقام پر پہونچے ہیں ۔ اُس راہ میں جب تک کوئی صدق دل سے سفر نہ کرے گا ہرگز ہرگز کسی مقام پر نہ پہونچے گا ۔ پھر یہ ابیات زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمائے جامی

تو راہ نہ رفتی و ترا نہ نمودند ورنہ کہ زد ایں در کہ بروکشودند
جاں در رہِ دوست باز اگر میخواہی تو نیز چناں شوی کہ ایشاں بودند

فوائد السالکین میں حضرت گنج شکرؒ فرماتے ہیں کہ جب میں خواجہ قطب الاسلام کے شرف ارادت سے بہرہ مند ہوا تو چار کلاہ ترکی میرے سر پر رکھی اور بہت شفقت فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ شیخ میں اتنی ذاتی قوت اور تصحیح خاطر ہونی چاہیے کہ اگر کوئی اُس کے پاس مرید ہونے کو آئے تو باطنی نظر کی قوت سے اُس کے سینہ کے زنگار کو جو آلودگی دنیا کی وجہ سے جم گیا ہے صاف کردے تاکہ کوئی کدورت اور آلائش باقی نہ رہے ۔ اسکے بعد ہاتھ پکڑ کر خدا تک پہونچا دے ۔

شرف بیعت کے بعد حضرت گنج شکرؒ غزنی دروازہ کے متصل جو برج ہے اسکے نیچے ایک حجرہ بناکر مشغول بحق ہوے ۔ وہاں سے ہر دو ہفتے کے بعد خواجہ قطب الاسلامؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے ۔ خواجہ صاحب نے آپ سے طے کے روزے رکھوائے اور فرمایا کہ تین روز کے بعد جو

غیب سے بہم پہونچ جائے اُس سے افطار کرو۔ تیسرے روز ایک شخص کے یہاں سے کھانا آیا جو شرابی تھا۔ آپ کے معدہ نے قبول نہیں کیا۔ خواجہ صاحب کو اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ دو تین روز اور صبر کرو۔ چھٹے روز اس قدر ضعف ہوا اور ایک گھڑی رات گذرنے کے بعد بھوک کی اس قدر حرارت معلوم ہوئی کہ چند سنگریزے زمین پر پڑے ہوئے تھے حالتِ اضطرار میں اُن پر ہاتھ ڈالا۔ جس وقت وہ دہن مبارک میں پہونچے شکر ہو گئے۔ آپ نے فوراً تھوک دیا کہ کہیں مکر نہ ہو۔ کئی بار ایسی نوبت آئی اور سنگریزے شکر ہو گئے۔ یکا یک حضرت خواجہ قطب الاسلام کا یہ ارشاد یاد پڑا کہ جو کچھ غیب سے ملے افطار کر لو۔ اس خیال کے آتے ہی آپ نے مواہب الٰہی خیال کر کے چند سنگریزے منہ میں ڈال لیے جو شکر ہو گئے۔ خواجہ سنائی نے اسی مضمون کو نظم فرمایا ہے

سنگ در دست تو گہر گردد  زہر در کام تو شکر گردد

صبح ہوتے ہی خواجہ قطب الاسلام سے اس واقعہ کو عرض کیا تو آپ نے فرمایا کہ اچھا کیا کہ اُس سے افطار کیا۔ غیب سے جو شے پہونچی وہ اچھی ہی ہے۔ انشاء اللہ شکر کے مانند تم شیریں رہو گے۔ اسکے بعد جو آپ کو دیکھتا تھا گنج شکر کے نام سے خطاب کرتا تھا۔ لیکن سفینۃ الاولیا میں گنج شکر کی وجہ تسمیہ دوسری ہی لکھی ہے۔ صاحب سفینۃ الاولیا لکھتے ہیں کہ سات روز گذر گئے کہ آپنے افطار نہیں کیا تھا۔ ضعف غالب تھا۔ اسی حالت میں اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں روانہ ہوئے اثنائے راہ میں ضعف سے پیر لڑکھڑایا اور آپ زمین پر گر پڑے۔ دہن مبارک میں کچھ مٹی چلی گئی جو تمام شکر ہو گئی۔ وہاں سے اُٹھ کر حضرت پیر و مرشد کی خدمت میں پہونچے۔ حضرت شیخ نے فرمایا

"فرید گلے کہ بدہنت رسیدہ شکر شدہ حق تعالیٰ وجود ترا گنج شکر گردانیدہ است ہموارہ شیریں خواہی بود"

پیر کی خدمت سے جب باہر آئے دیکھا کہ جو شخص دیکھتا ہے گنج شکر کے لقب سے آپ کو یاد کرتا ہے۔ حسنا سیر العارفین لکھتے ہیں کہ روزے بود بخدمتِ خواجہ می آمد از ضعف ریاضت پایش بلغزید بر زمین اُفتاد پارۂ گل بدہن رسید شکر شد از اں وقت گنج شکر گویند"۔ مولانا عبدالحق محدث دہلویؒ اخبار الاخیار میں ایک دوسری حکایت لکھتے ہیں کہ ایک سوداگر جو چند گاؤ شکر بار کر کے کہیں جا رہا تھا۔ حضرت شیخ

فرید الدین گنج شکر نے اُس سے تھوڑی شکر مانگی اُس نے جواب دیا کہ یہ نمک ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ نمک ہی ہوگا۔ چنانچہ سوداگر نے جب بوجھ کھولے تو تمام نمک نظر آیا۔ شرمندہ ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور نہایت عاجزی کی۔ آپ نے فرمایا اچھا شکر ہوگی۔ اسکے بعد جو دیکھا تو تمام شکر تھی۔ ایک عزیز نے اس مضمون میں چند شعر خوب کہے ہیں۔

کاں نمک جہاں شکر شیخ بحر و بر کز شکر نمک کند وز نمک شکر

اس کے بعد حضرت خواجہ قطب الاسلام قدس سرہ العزیز نے چلۂ معکوس کے لیے آپ کو حکم فرمایا کہ ایسے مقام پر جاؤ جہاں مسجد ہو اور اُس مسجد میں ایک کنواں ہو اور اس کنوئیں کے مُنہ پر ایک درخت ہو اور اُس مسجد میں ایک ایسا مؤذن ہو جو متدین لایق اور درویشوں کی صحبت کے قابل ہو۔ وہاں چالیس شب اپنے پاؤں کو سینے سے باندھ کر سرنگوں کوئیں میں لٹکو اور یاد الٰہی میں معروف رہو۔ حضرت گنج شکر نے کوشش فرمائی تو ایسا مقام خطۂ اُچہ میں ملا جہاں اسی طرح کی ایک مسجد۔ کنواں اور درخت تھا۔ اور خواجہ رشید الدین مینائی موذن تھے۔ آپ نے اس ارادہ کا اُن سے ذکر کیا اور اخفاے راز کی تاکید کی۔ عشاء کی نماز پڑھ کر آپ وہاں جاتے اور رات بھر اسی حالت میں لٹکے رہتے۔ صبح کو خواجہ رشید الدین آتے اور آپ کو کنوئیں سے باہر نکالتے۔ آپ نماز فجر ادا کرکے اُسی مسجد میں مراقب رہتے۔ اسی طرح چالیس راتیں گزر گئیں اور چلہ ختم ہوا۔

خواجہ نظامی:

دارد دو سرایں رشتہ یکے عجز دگر ناز زیں سو ہمہ عجز آمد وزاں سو ہمہ ناز

امیر حسن دہلوی:

ہر دل کہ در و مہر تو آویختہ شد آویختہ شد عاقبت از کنگرۂ عشق

اس طرح نماز معکوس حضرت سرور کائنات علیہ الف الف تحیۃ والصلوٰۃ سے بھی مروی ہے۔ حضرت شیخ ابو سعید ابو الخیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی پڑھی ہے۔ سلسلۂ چشتیہ میں خواجہ ابو محمد چشتی نے نماز معکوس بہت ادا فرمائی ہے۔

حضرت سلطان المشائخ قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ خواجہ بزرگ معین الحق والدین قدس سرہ العزیز دہلی تشریف لائے اور خواجہ قطب الاسلام قدس سرہ العزیز کے مکان پر ٹھہرے۔

حضرت گنج شکرؒ اس وقت وہیں قیام فرما تھے - خواجہ بزرگ نے اُنھیں دیکھ کر فرمایا "بابا بختیار ایں جوان را چند در مجاہدہ خواہی سوخت ، چیزے بخشش کن" خواجہ قطب الاسلام نے عرض کی کہ "مرا چہ مجال کہ در نظر آں حضرت عطائے توانم کرد" آپ نے فرمایا تمھیں سے اس کا تعلق ہے - اسکے بعد خواجہ بزرگؒ قبلہ رو حجرہ میں کھڑے ہوگئے - خواجہ قطب الاسلام نے بھی موافقت فرمائی اور حضرت گنج شکرؒ کو بُلایا - خواجہ بزرگؒ نے انھیں اپنے اور خواجہ قطب الاسلام کے درمیان کھڑا کیا - پھر دونوں بزرگوار حضرت گنج شکرؒ کے حق میں بہت دیر تک دعائیں مانگتے رہے اور اتنی نوازش فرمائی کہ بیان سے باہر ہے - اور یہ ارشاد فرمایا کہ "فرید شمعے ست کہ خانوادۂ درویشاں روشن خواہد کرد" میر سید محمد کرمانی نے سیر الاولیا میں خوب کہا ہے

بخشش کونین از شیخین شد درباب تو
بادشاہی یافتی زیں بادشاہانِ جہاں
مملکت دنیا و دیں گشتہ مسلّم مر ترا
عالم کُن گشت اقطاع تو اے شاہ جہاں

سفینۃ الاولیا میں ہے کہ "ایشاں بخدمت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نیز رسیدہ بودند و حضرت خواجہ معین الدین درباب ایشاں می فرمودند کہ بختیار عظیم شاہبازے را بقید آوردہ است کہ جز بہ سدرۃ المنتہیٰ آشیاں نگیرد ، ایں شمعیست کہ خانۂ درویشاں روشن و منور سازد" آپ اپنے زمانہ کے قطب وقت و غوث زماں ہوئے اور اتنے خوارق عالیہ آپ سے ظاہر ہوئے ہیں کہ اس سلسلہ میں بمشکل کسی سے ظہور میں آئے ہوں گے -

سلطان المشائخؒ فرماتے ہیں کہ خواجہ قطب الاسلام کے وصال کا وقت جب قریب پہونچا اُس وقت حضرت گنج شکرؒ قصبۂ ہانسی میں تھے - قاضی حمید الدینؒ ناگوری اور بدر الدینؒ غزنوی کے دلوں میں گذرا کہ خرقہ و سجادہ ہمیں عطا ہوگا - لیکن خواجہ صاحب نے فرمایا کہ میں اپنا خرقہ و عصا اور چوبی نعلین فرید الدین مسعود کو دُوں گا ، وہی میرے خلیفہ اور جانشین ہوں گے - یہ امانت قاضی حمید الدینؒ کے حوالہ کرکے جاں بحق تسلیم ہوئے - ہانسی میں یہ امر حضرت گنج شکرؒ کو معلوم ہوا آپ دہلی کی طرف روانہ ہوئے اور خواجہ قطب الاسلامؒ کی وفات کے تیسرے روز آپ کے مزارِ پاک پر پہونچ کر شرف زیارت سے مشرف ہوئے - قاضی صاحب نے وہ تمام نعمتیں آپ کے سپرد کیں - حضرت گنج شکرؒ نے بقطعہ خرقہ پہنا اور جس گھر میں خواجہ قطب الاسلام رہتے تھے اُسی میں

قیام فرمایا۔

خواجہ قطب الاسلام اژدہام خلائق کے خیال سے ایک دربان رکھا کرتے تھے۔ حضرت گنج شکرؒ نے اپنے پیر کی سنت سمجھ کر اس دربان کو برقرار رکھا۔ اتفاقاً ایک دن ایک مجذوب سرہنگا نام جو ہانسی میں حضرت گنج شکر کی خدمت میں بہت آیا جایا کرتا تھا اور بہت خلوص و محبت رکھتا تھا آیا۔ دربان نے روکا اور اندر نہیں جانے دیا۔ دستور کے موافق حضرت گنج شکر جب جمعہ کے روز باہر تشریف لائے تو سرہنگا مجذوب روتا ہوا پیروں پر گر پڑا اور کہنے لگا کہ ہانسی میں روز آپ کو دیکھتا تھا، یہاں تین روز سے آیا ہوا ہوں اور بار نہیں ملتا۔ حضرت گنج شکرؒ نے فرمایا کہیں نہیں رہوں گا۔ حاضرین نے کہا بھی کہ خواجہ قطب الاسلام نے یہ مقام آپ کو عطا کیا ہے مناسب نہیں کہ کہیں اور تشریف لے جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ جو نعمت خواجہ صاحب نے مجھے مرحمت فرمائی ہے وہ کیا شہر کیا بیابان سب جگہ میرے پاس ہے۔ اسکے بعد دہلی سے روانہ ہوکر ہانسی میں تشریف لائے۔ یہیں شیخ جمال الدین ہانسوی کو شرف ارادت حاصل ہوا۔ یہ آپ کے محبوب ترین مُرید تھے۔ ہانسی میں بھی جب بہت بھیڑ بھاڑ ہوئی تو وہاں سے بھی روانہ ہوے اور قصبۂ کھتوال میں جو آپ کے آبا و اجداد کا وطن تھا قیام اختیار کیا۔ یہ مقام ملتان سے قریب تھا اور دہلی اور ہانسی کی طرح یہاں بھی ہجوم ہونے لگا تو آپ نے لاہور جانے کا ارادہ کیا۔ اس زمانہ میں لاہور چنگیزی مغلوں کی تاخت و تاراج کی وجہ سے بہت خراب اور ویران ہوگیا تھا مگر آخرکار آپ نے اجودھن میں جو اَب پاک پٹن کہلاتا ہے قیام فرمایا۔ بعض کہتے ہیں کہ اٹھارہ سال اور بعض کہتے ہیں کہ چوبیس سال آپ اجودھن میں رہے۔ یہ آپ کی عمر کا آخری زمانہ تھا۔ صاحب مرأۃ الاسرار فرماتے ہیں کہ آں مقام بہ وجود مبارک وے قبلۂ ہندوستان و خراسان گشت و تا روز قیامت خواہد بود

برزمینے کہ نشان کفِ پائے تو رسد سالہا سجدہ صاحب نظران خواہد بود"

حضرت شیخ نصیرالدین چراغ دہلیؒ فرماتے ہیں کہ اجودھن میں آپ نے کئی شادیاں کیں اور بچے ہوئے۔ جامع مسجد کے پاس آپ کا مکان تھا وہیں سب اہل و عیال رہا کرتے تھے۔ اور خود کبھی مسجد میں مشغول رہا کرتے تھے اور کبھی جنگل میں درختوں کے تلے بسر کرتے تھے۔ اور قناعت

پر نہایت عسرت کے ساتھ بسر ہوتی تھی - ایک مرتبہ ایک نوکر ایک دانگ کا نمک قرض لایا جب
جب افطار کے وقت آپ کے سامنے کھانا آیا تو آپ نے فرمایا اس میں اسراف کی بو آتی ہے۔
اس کھانے کو میں نہیں کھاؤں گا - ایک مرتبہ آپ کے ایک صاحبزادے گرسنگی سے ہلاک
ہوگئے - آپ کی بیوی صاحبہ نے عرض کی تو آپ نے فرمایا کہ مسعود بندہ کیا کر سکتا ہے اگر خدا کی
یہی مرضی ہے اور وہ مرگیا ہے تو ایک پیر میں رسی باندھ کر باہر پھینک دو - سبحان اللہ - یہ کسقدر
استغراق، فنا، قناعت، استقامت اور بلندی ہمت تھی - یہ زمانہ جب گذر گیا اور فراغت
کا زمانہ آیا اور آپ کی عظمت و شہرت کی شہرت تمام عالم میں ہوئی اور ہر طرف سے فتوحات
آنے لگیں اُس وقت بھی یہی حال تھا - یہ تمام فتوحات مجاورین و مسافروں کے کام آتی تھیں۔
حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ صبح سے ایک گھڑی رات تک جو کوئی آتا طرح طرح
کے کھانے آپ کے باورچی خانہ سے کھاتا - اور ہر جا نذرات کو آپ کے پاس مٹھائیاں آتیں
اور اُنکے انبار لگائے جاتے اور نقد بھی موجود رہتا - جو کوئی ادنیٰ مبارکباد کو آپ کے پاس
حاضر ہوتا اُس میں سے ضرور کچھ نہ کچھ اُسے عطا ہوتا - کسی کو شیرینی اور کسی کو نقد روپیہ - کسی کو
دونوں - جس کا جو حال ہوتا اُسی کے مناسب اُسے عطا ہوتا -

حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ آپ اکثر صائم رہتے اور شربت سے افطار فرمایا
کرتے - ایک پیالہ میں چند مویز بھگو دیے جاتے اُسی کا شربت بن جاتا - نصف یا ثلث حاضرین
پر تقسیم ہوتا باقی خود نوش فرماتے بلکہ اُس میں سے بھی بچا کر کسی کو مرحمت فرماتے - بعد ازاں
نماز کے پہلے دو گھی چپڑی روٹیاں لائی جاتیں - ایک حاضرین کو تقسیم فرماتے اور ایک خود
تناول فرماتے بلکہ اُس میں سے بھی کسی کو دیدیتے - اسکے بعد سُرخ دسترخوان بچھایا جاتا اور طرح
طرح کے کھانے چُنے جاتے اور لوگ کھاتے - خود بہت کم شاذ ہی کبھی ارادہ فرماتے بلکہ اُسی
ایک روٹی میں سے کچھ بچا کر دوسرے روز کے افطار کے لیے رکھ دیتے - سلطان المشائخ فرماتے
ہیں کہ آپ اکثر زنبیل کی روٹی کھایا کرتے تھے - افطار کے وقت اسی نانِ زنبیل کے دو ایک
ٹکڑے سامنے لائے جاتے - کبھی مکان میں دو دفعہ زنبیل کی روٹی تقسیم ہوتی لیکن احباب
کو اکثر دن کے وقت نانِ زنبیل اور رات کے وقت دسترخوان پر کھانا ملتا تھا مصرعہ

ہر تنک حوصلہ شایستہ ہوائی نیست

صاحب مرأۃ الاسرار سیرالاولیا کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ جب سلطان ناصرالدین بن سلطان شمس الدین التمش نے اُچھ اور ملتان کی طرف لشکرکشی کی تو حضرت گنج شکرؒ کی ملاقات کو بھی اجودھن آیا۔ ملازمت کے بعد کچھ زر نقد اور چار گاؤں کا فرمان الغ خاں کے ہاتھ خدمت مبارک میں پیش کیا۔ زر نقد تو آپ نے لیکر اُسی وقت درویشوں کو تقسیم کر دیا اور فرمان واپس کر دیا کہ یہ گاؤں کسی مستحق کو دیے جائیں مجھے ضرورت نہیں۔ الغ خاں کے دل میں یہ خیال آیا کہ سلطان کے کوئی لڑکا نہیں ہے کیا اچھا ہو اگر حضرت کی توجہ سے دہلی کی سلطنت اُسکے بعد مجھے مل جائے۔ اس خیال پر مطلع ہو کر آپ نے وہ بیت زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمائے:

فریدون فرخ فرشتہ نبود | زعود و ز عنبر سرشتہ نبود
بداد و دہش یافت نیکوئی | تو داد و دہش کن فریدوں توئی

سلطان ناصرالدین کی وفات کے بعد یہی الغ خاں بادشاہ ہوا اور سلطان غیاث الدین بلبن کے نام سے مشہور ہوا۔

حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ کی محاسن مبارک سے ایک بال ٹوٹ کر نیچے گرا۔ خدوی نے عرض کیا اگر اجازت ہو تو میں یہ لے لوں اور تعویذ بنا کر رکھوں۔ فرمایا اچھا۔ جب میں دہلی گیا تو یہ تعویذ اپنے ساتھ لیے آیا۔ جس کسی کو کوئی حاجت ہوتی اور مجھ سے تعویذ مانگتا تو میں یہ دے دیتا اور یہ شرط کر لیتا کہ جب کام نکل جائے تو مجھے واپس کر دینا۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا کہ کام نکلنے والا نہ ہوتا تو ہر چند تلاش کرتا تعویذ نہ ملتا۔ سبحان اللہ جب ایک موے مبارک میں یہ عظمت و کرامت تھی تو دیگر خوارقِ عادات کا کیا ذکر۔

آپ کے چند اقوال سیرالاولیا، راحت القلوب، اسرارالاولیا، مرأۃ الاسرار و اخبارالاخیار سے انتخاب کرکے ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں:۔

آپ فرماتے ہیں کہ خدا سے بزرگ و برتر کے ساتھ معاملہ رکھو۔ سب چھتے ہیں اور وہ دیتا ہے اور جو وہ دیتا ہے اُسے کوئی نہیں لے سکتا۔ اپنے سے بھاگنا (یعنی اپنے نفس کے کرے بچنا) خدا سے ملنا ہے۔ ہر شخص کا کھانا مت کھاؤ۔ لیکن ہر شخص کو کھانا کھلاؤ۔ مستحقین کو کبھی فراموش مت کرو۔

قیاس پر باتیں نہ کیا کرو اور دل کو شیطان کا کھلونا نہ بناؤ۔ جس قدر تم اپنے ظاہر سے واقفیت رکھتے ہو اُس سے زیادہ باطن سے واقفیت رکھو۔ ظاہری آرائش کے پیچھے مت پڑو۔ پرانے گھرانوں کی عزت کرو۔ جنگ کی جگہ صلح سے کام لیا کرو۔ اور کسی دشمن سے گو وہ تم سے خوش نظر آئے بے خوف مت رہو۔ جو تم سے ڈرے اُس سے تم بھی ڈرو۔ اور اپنے زور بازو پر بھروسہ مت کرو۔ شہوت نفسانی کے وقت تمام اوقات سے زیادہ خویشتن داری سے کام لینا چاہیے۔ جب اہل دولت کے پاس بیٹھو تو اپنے دین کو مت بھول جاؤ۔ عزت وحشمت عدالت وانصاف میں سمجھو۔ تونگری کے وقت ہمت بلند رکھو۔ دیتے وقت اپنی ذات کو درمیان سے اُٹھا لو۔ اُسپر نظر نہ پڑے۔ دشمن کو نیک مشورہ سے شکست دو اور دوست کو تواضع سے غلام بناؤ۔ اپنے عیبوں پر نظر رکھو۔ دشمنوں کی سخت کلامی سے برانگیختہ مت ہو۔ اگر آسودگی چاہتے ہو تو حسد سے بچتے رہو۔ اور ہمیشہ یہ کوشش کرتے رہو کہ موت کے بعد زندگی نصیب ہو۔ زندہ دل وہی ہے جس میں محبت اور اشتیاق ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ درویشی پردہ پوشی کا نام ہے۔ درویش کو لازم ہے کہ ان چار چیزوں سے دُور رہے۔ یعنی لوگوں کے عیب نہ دیکھے۔ نہ سُننے کے لائق باتیں نہ سُنے۔ نہ کہنے کی باتیں زبان سے نہ کہے اور جہاں جانا مناسب نہ ہو وہاں نہ جائے۔ نیز درویشی قناعت کا نام ہے۔ جو کچھ تجھے ملے اس پر قناعت کر اور یہ نہ کہہ کہ ایسا ملنا چاہیے تھا۔ اسراف اُسے کہتے ہیں کہ جو دے بے نیت دے اور اللہ تعالیٰ کے نام پر نہ دے۔

آپ فرماتے ہیں کہ جو کوئی میرے پاس آئے اور کوئی چیز نہ لائے تو مجھ پر واجب ہے کہ اُسے کچھ دوں۔ درویشی کا کوئی مقام خوف وامید سے خالی نہیں۔ ہر مقام کی مصیبت اُس کی آزمایش کے واسطے ہوتی ہے۔ اگر ذرا بھی چون وچرا کی تو پھر کبھی وہ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا۔ درویش مصیبتوں میں صابر اور خوش رہتا ہے اور اٹھارہ ہزار عالم کی پروا نہیں کرتا۔ دُنیا بندہ اور مولا کے درمیان سب سے بڑا حجاب ہے (یعنی دنیا سے مراد یہ ہے کہ خدا سے غفلت ہو) کیونکہ اسلئے سب سے بڑا حجاب ہے) حب الدنیا راس کل خطیئۃ۔ قال اہل المعرفۃ من ترک الدنیا ملک ومن اخذہا ہلک۔ دل مردہ بھی ہوتا ہے اور زندہ بھی۔ پس مردہ دل کو ذکر الٰہی سے زندہ کرو۔

جب دل دنیا وی لذتوں، شہوتوں، ماکولات اور مشروبات میں مشغول ہو جاتا ہے تو غفلت طاری ہو جاتی ہے اور خواہشات نفسانی غالب آجاتی ہیں اور دل میں ہر طرف سے خطرات آنا شروع ہو تے ہیں جو اُسے سیاہ کر دیتے ہیں اور جب دل سیاہ ہو جاتا ہے تو گویا مردہ ہو جاتا ہے اسے اندیشہ الٰہی اور ذکر الٰہی سے زندہ کرو۔

آپ فرماتے ہیں کہ جو درویش دنیا کے کاموں میں مصروف ہوا اور مال و مرتبہ و ترقی جاہ کا طلبگار ہوا وہ درویش نہیں بلکہ مرتدِ طریقت ہے۔ اس راہ میں بڑا اصول حضوریِ دل ہے جو بغیر لقمۂ حلال کھائے اور دنیا سے پرہیز کیے حاصل نہیں ہوتی۔ جب تک دوست کی شناخت حاصل نہ ہو ہزار سال بھی عبادت کرے تو بھی ذوق حاصل نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہی نہیں کہ طاعت کس کے لیے کر رہا ہے۔ اہل سلوک نے فرمایا ہے کہ جو پیر اہل سنت و جماعت کے طریق پر کاربند نہیں اور اُس کے اقوال و افعال، حرکات و سکنات حدیث و قرآن مجید کے مطابق نہیں وہ اس راہ میں راہزن ہے۔ بارگاہِ الٰہی میں مومن کے دل کی بڑی قدر و منزلت ہے لیکن لوگ دل کی اصلاح سے غافل ہیں اسی واسطے گمراہی میں پڑتے ہیں۔ سلوک کا اصل اصول ہی دل ہے۔

آپ کا ارشاد ہے کہ فقیر کے لیے دولتمند کی صحبت سے بڑھ کر کوئی چیز مضر نہیں۔ جب فقیر گوشہ نشینی اختیار کرتا ہے تو اُس کے دینی و دنیوی کام اپنے آپ بنتے چلے جاتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کا شیخ کامل نہ ہو تو اہل سلوک کی کتاب کو پیش نظر رکھے اور اُس کی متابعت کرے۔

آپ کا ارشاد ہے کہ جس شخص کو کوئی زحمت یا تکلیف ہو سمجھو کہ اُسے گناہوں سے پاک کر رہے ہیں۔ بندہ کو سمجھنا چاہیے کہ سب درد و محبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں اور اپنے نفس کا طبیب خود بننا چاہیے۔

اے بسا درد کاں ترا دارو ست اے بسا شیر کاں ترا آہو ست

آپ نے فرمایا کہ آدمی کو درویشوں کے حق میں ہمیشہ نیک گمان رکھنا چاہیے تاکہ اُنکی حمایت نصیب ہو۔ جو بندہ اللہ تعالیٰ کے کام میں ہوتا ہے اللہ جل شانہٗ اُس کے کام میں ہوتا ہے۔ جو شخص دوست کی رضا کا طلبگار ہوتا ہے تو دوست بھی اُسکی رضا کا جویندہ ہوتا ہے۔ طالب کو

ہر حالت میں مطلوب کے عشق و محبت اور اُسکی یاد میں رہنا چاہیے تاکہ متقدمین کے مانند ہو جائے۔ طریقت کی راہ رضا و تسلیم ہے۔ اگر کوئی گردن پر تلوار مارے تو اُسی پر راضی رہے۔ جسکی یہ حالت ہو وہ درویش ہے۔

آپ نے فرمایا کہ اگر عابد سے کوئی ورد یا طاعت فوت ہو جائے تو اُسی کو اُسکی موت کہا جاتا ہے۔ صاحب ورد کو چاہیے کہ جو وظیفہ اگر دن کو پورا نہ کرسکے تو رات کو پورا کرے۔ بہرحال ترک نہ کرے۔

آپ نے فرمایا کہ اپنے تئیں کسی کے پلہ باندھ لینا اچھا ہے اور یہ شعر پڑھا جو حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہٗ کی زبان مبارک سے سنا تھا ؎

گر نیک تو ام مرا ازیشاں گیرند　　ور بد باشم مرا بدیشاں بخشند

آپنے فرمایا کہ جب لوگ کھانا کھائیں تو چاہیے کہ طاعت بھی کر دکھائیں کیونکہ طاعت کے لیے کھانا بھی طاعت ہے۔ ہوائے نفس کے لیے کھانا نہیں کھانا چاہیے۔ سعدی

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است　　تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است

آپ نے فرمایا کہ اگر لوگوں کو علم کا درجہ معلوم ہو جائے تو تمام کام چھوڑ کر علم ہی تحصیل کیا کریں۔ علم ایک ایسا بادل ہے جس میں رحمت ہی رحمت کی بارش ہوتی ہے۔ افسوس علمائے ظاہر علم سے غافل ہیں کیونکہ اُنھوں نے دنیا کو اپنا بُت بنا رکھا ہے اور شریعت کو کھیل سمجھ رکھا ہے۔ قیامت کے دن ان علما کے لیے جو دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ انہماک رکھتے ہیں اور علم سے جو مقصود ہے اُس پر عمل نہیں کرتے حکم ہو گا کہ انھیں آگ کے طوق پہنا کر دوزخ میں لیجائیں۔ پھر فرمایا کہ حق تعالیٰ کی ذات سب سے بزرگ تر ہے۔ پھر لوگ کیوں ایسی نعمت سے محروم رہتے ہیں اور اپنی ساری عمر اُسکے ذکر و فکر میں صرف نہیں کرتے۔ کوئی ذکر کلام الٰہی سے بڑھ کر نہیں۔ اُسی کو پڑھنا چاہیے۔ اس کا پھل تمام طاعتوں سے بڑھ کر ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ انوار و اسرار کے لیے وسیع حوصلہ چاہیے۔ اسرار و انوار الٰہی جو عاشق پر متجلی ہوتے ہیں اگر اُنکے نور کا ذرہ بھر بھی ہر نظر آجائے تو تمام جہان منور ہو جائے۔ اس راہ میں صدق کی ضرورت ہے تاکہ دوست کے تمام اسرار سے واقفیت حاصل ہو جائے۔ راہ خدا

یں ایسے مرد بھی ہیں کہ ایک ساعت میں دوست کے اسرار کے لاکھ دریا پی جاتے ہیں - اور ذرہ بھر اثر ظاہر نہیں ہوتا -

آپ فرماتے ہیں کہ فقرا اہل عشق ہیں اور علما اہل عقل - لیکن واقف کار وہی لوگ ہیں جنہیں یہ دونوں چیزیں پائی جائیں ۔

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

سرّ سیت عاشقاں را ور طاقت نہانی پوشیدہ ورا زخود تا شنجاً نجل نہ مانی

جہاں محبت آتی ہے وہاں دوئی اُٹھ جاتی ہے - محبت کے معاملہ میں یگانہ ہونا چاہیے تاکہ خانۂ وصال محبت کے معاملہ میں بارحاصل ہو سکے ۔

تا نفس من زعشق دوست زدم خاست از ما بسے دوئی خیز دوست

عشق کی آگ ایسی ہوتی ہے کہ درویش کے دل کے سوا کہیں اور قرار نہیں پکڑ سکتی - درویشوں کو عشق کی خاک اور انوار تجلی سے پیدا کیا گیا ہے - عشق کی یہ بے بہا نعمت کسی فرشتہ کو بھی نہیں ملی صرف آدمی کو ملی ہے جیسا کہ خود فرمایا ہے ولقد کرّمنا بنی آدم - جس وقت عشق پیدا کیا گیا تو اُسے حکم ہوا کہ جا اور اندوہناک آدمیوں کے دل میں قرار پکڑ - وہی مقام تیرے رہنے کے قابل ہے

گفتم صنما گر تو جانان منی اکنوں کہ نگاہ می کنم جانِ منی

مرتد گردم اگر زمن برگذری اے جان جہاں تو کفر و ایمانِ منی

اے درویش تجھے قدر ہی نہیں معلوم کہ تیرے دل کے اندر ایسی خوبصورت نعمت مقام کیے ہوئے ہے -

آپ فرماتے ہیں کہ متعبد اُن لوگوں کو کہا جاتا ہے جن کا ظاہر و باطن حق سے آراستہ ہو اور کسی قسم کی ریا، حسد، بغض اور کھوٹ ظاہر و باطن میں نہ ہو - جو طاعت کریں خالصۃً لوجہ اللہ کریں - پھر فرمایا کہ درویشوں نے دنیا ہی میں بحالت زندگی اپنے تئیں مردہ بنا لیا ہے اور تمام خواہشات نفسانی سے اپنے تئیں باز رکھا ہے - آپ نے فرمایا کہ مومنوں کے دل پاکیزہ زمین کے مانند ہیں - اگر محبت کا بیج اس میں بویا جائے تو رنگ برنگ کی نعمتیں پیدا ہوں گی - پھر فرمایا کہ جب تک تو سانپ کی طرح کینچلی نہ اُتارے گا کبھی محبت حق کے دعوے میں صادق نہیں ہو سکتا۔

کامل حال درویش ہے جو کسی اور کی حاجت نہیں رکھتا اور اسرار کی نعمت سے آنے والوں کو اُن کا حصہ دیتا اور اُن کا مدعا پورا کر کے رخصت کرتا ہے - مرد خدا وہی تھے جو ذرہ برابر راہِ خدا سے باہر نہ ہوئے اور رزق کی خاطر کبھی مشوش نہیں ہوئے -

آپ کا ارشاد ہے کہ توبہ کی چھ قسمیں ہیں - دل و زبان سے توبہ کرنا - آنکھ - کان - ہاتھ - پاؤں اور نفس کی توبہ - اس کی تشریح یوں بیان فرمائی کہ جب تک دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار نہ ہو توبہ درست نہیں ہو سکتی - ایسی چیزوں کے دیکھنے سننے سے توبہ کرے جو دیکھنے اور سننے کے قابل نہیں ہیں ایسی چیزوں کے چھونے اور مدد کرنے سے - ہاتھ سے مدد اور پاؤں سے قصد - توبہ کرے جو اس قابل نہیں کہ انکی مدد یا اُن کا قصد ہاتھ پاؤں سے کیا جائے - اور نفس کو تمام خواہشات ماکولات و شہوات سے باز رکھا جائے - اور ان سب سے توبہ کی جائے اور نفس کی خواہش کے مطابق کام نہ کیا جائے -

توبہ کی بحالت زمانہ اور تین قسمیں بیان فرمائیں - حال، ماضی و استقبال - حال .... یعنی کیے ہوئے گناہ سے ندامت حاصل ہو - ماضی یہ کہ تلافیِ گناہاں کرے مثلاً دشمن کو راضی کرنا کسی سے اگر کوئی شے لی ہے تو اسے واپس کرنا یا اُس کا معاوضہ کرنا - اور استقبال یہ کہ آیندہ گناہ سے بچنے کا مصمم ارادہ کرنا -

آپ فرماتے ہیں کہ اے درویش جس نے سعادت حاصل کی ہے بزرگوں کی خدمت سے حاصل کی ہے - جو کچھ انسان کرے اُسے یہی سمجھنا چاہیے کہ سب خدا کی مرضی سے ظہور میں آ رہا ہے اور خود وہ درمیان میں نہیں ہے -

تلاوت قرآن کی آپ بہت تاکید فرماتے ہیں اور ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ سے کلام کرنا چاہے وہ کلام الٰہی پڑھا کرے - نیکبخت بندہ وہ ہے جو اپنے دوست اور مولا سے ہمکلام ہو - اس ہمکلامی کی سعادت تلاوت قرآن مجید سے حاصل ہوتی ہے - عاشق و معشوق میں الفت باہم گفتگو سے بڑھتی ہے - پس راہ سلوک میں تلاوت قرآن سے بڑھ کر کوئی شے نہیں - آپ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں خلوت میں یادِ الٰہی میں مشغول تھا - جب سورۂ اخلاص پر پہونچا تو مجھ پر عالم تجلی سے اسرار و انوار نازل ہونا شروع ہوئے - ان انوار نے عشق و محبت کے سحرا میں

مجھے جا پھینکا۔ جب وہاں سے نکلا تو اللہ جل شانہٗ کے عشق و محبت کے دریا میں غرق ہوا سات دن رات میری یہی حالت رہی پھر عالم صحو میں آیا۔

آپ فرماتے ہیں اے درویش خرقہ پہن لینا تو آسان ہے مگر اُس کا حق ادا کرنا بہت مشکل ہے اگر صرف خرقہ پہن لینے سے نجات ہوتی تو تمام لوگ خرقہ پہن لیتے اور نجات حاصل کر لیتے۔

درکوہ و دشت ہر سبجی صوفی بُدے　　گر ہیچ سود مند بُدے صوف بیصفا

خرقہ خرقہ پوش کی وجہ سے قابل اعتبار ہوتا ہے۔ اس کا بطور خود کوئی اعتبار نہیں جب درویش صوف پہن لے تو اُس پر واجب ہے کہ گوشہ نشینی اور تنہائی اختیار کرے اور دولتمندوں سے ملنا جلنا چھوڑ دے۔

پھر فرمایا کلام مجید میں ہے الم یان للذین آمنوا ان تخشع قلوبہم یعنی اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے کہ اے میرے بندو کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ میرے خوف سے تمہارے دل نرم ہوں، یا کوئی تم میں سے ایسا ہے جو ہم سے صلح کرے یعنی توبہ کرے اور ہم اُسکی توبہ قبول کریں۔ پھر فرمایا کہ خائف اُس شخص کو کہتے ہیں جس میں تین باتیں پائی جائیں۔ اول روزہ کی خاطر کم کھانا۔ دوم نماز کی خاطر کم بولنا۔ سوم ذکر کی خاطر کم سونا۔ اور جس طرح یہ باتیں درویش کے لیے ضروری ہیں اسی طرح خوف۔ اُمید۔ اور محبت بھی ضروری ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ عقلمند وہ شخص ہے جو سب کاموں میں اللہ تعالیٰ پر توکل کرے اور کسی سے کسی طرح کی اُمید نہ رکھے۔ پھر فرمایا اہل توکل پر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اگر اُسوقت انہیں آگ میں پھینک دیا جائے یا زخمی کیا جائے تو اُنہیں مطلق خبر نہ ہوگی۔ نیز فرمایا کہ جو شخص عالم توکل میں حق تعالیٰ کے کرم پر بھروسہ کرتا ہے اُسے عالم غیب سے روزی پہونچتی ہے اور جو کچھ وہ طلب کرتا ہے اُسے مل جاتا ہے۔

آپ نے فرمایا کہ اے درویش لوگوں کی تین قسمیں ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو دنیا سے محبت کرتے ہیں اور ہر وقت اُسی کی یاد و طلب میں رہتے ہیں۔ ایسے بہت ہیں۔ بعض اسے دشمن سمجھتے ہیں اور محبت نہیں کرتے۔ بعض نہ اسے دوست سمجھتے ہیں نہ دشمن۔ یہ تیسری قسم کے لوگ پہلی دو قسموں سے اچھے ہیں۔ پھر فرمایا کہ جو شخص جس قدر اللہ تعالیٰ سے غافل ہے اُسی قدر دنیا میں مبتلا ہے

پھر فرمایا کہ میں نے خواجہ بختیار اوشی سے سنا ہے کہ دنیا میں تین کام سب کاموں سے افضل ہیں۔ اول دنیا کو پہچاننا اور اس سے بچنا۔ دوسرے حق تعالیٰ کی طاعت کرنا اور ادب ملحوظ رکھنا۔ تیسرے آخرت کی آرزو رکھنا اور اس کی طلب میں کوشش کرنا۔ اس راہ میں مرد وہی ہے جو ان تین باتوں پر عمل کرے یعنی (۱) دنیا سے بچا رہے (۲) مرنے سے پہلے گور کے لیے تیاری کرے (۳) حق تعالیٰ کو دیکھنے سے پہلے اسے خوش کرے۔ پھر فرمایا جو شخص جس قدر زیادہ موت سے غافل ہو گا اسی قدر دنیا کا ذکر اس کے دل میں محکم ہو گا۔ سلوک کے بارے میں لکھا ہے اکثروا ذکر ہادم النفس وہادم اللذات۔ جو شخص ہمیشہ موت کو یاد رکھتا ہے اللہ جل شانہٗ اس سے خوش ہوتا ہے۔

آپ کا ارشاد ہے کہ جس شخص کا اپنے پیر کے حق میں نیک عقیدہ نہیں وہ مرید نہیں۔ پیر میں اتنی قوت ہونی چاہیے کہ جب کوئی مرید ہونے کی نیت سے آئے تو اس کے حسن عقیدت کو دیکھے۔ اگر اسکو فرمان حق میں راسخ نہ پائے، تو کہدے واپس جاؤ ابھی تمہارا وقت نہیں آیا۔

آپ نے فرمایا کہ مذہب۔ تصوف و سلوک کے مطابق وہ شخص صوفی و سالک نہیں ہے جو یاد حق میں نہیں۔ کیونکہ جس دم وہ یادِ الٰہی سے غافل ہوتا ہے اسے نہیں معلوم اس وقت کن کن نعمتوں سے محروم رہتا ہے۔ اس لیے جہاں تک ہو سکے یاد الٰہی سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔ اہل تصوف صرف اسی دل کو زندہ سمجھتے ہیں جو یادِ حق میں مستغرق ہو اور ایک دم بھی یاد الٰہی سے غافل نہ ہو۔ جو یادِ الٰہی سے غافل ہیں وہ مردہ ہیں۔

آپ کا ارشاد ہے کہ ہمارے خواجگان نے سلوک کے پندرہ مراتب مقرر کیے ہیں جن میں سے پانچواں مرتبہ کشف و کرامت کا ہے۔ اگر سالک اس مرتبہ میں کشف و کرامت ظاہر کر دے تو اچھا نہیں۔ پورے پندرہ مراتب طے کر کے کشف کا اظہار کرنا چاہیے۔

آپ کا ارشاد ہے "مرید کو چاہیے کہ پیر کا فرمان دل و جان سے بجا لائے۔ فرمایا کہ جب انسان پر رنج و مصیبت نازل ہو تو اسکے سبب پر غور کرنا چاہیے اور تنبیہ حاصل کرنا چاہیے۔ جو شخص ہر وقت طاعت میں رہتا ہے اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں پہونچتی۔ ایسے درویش جو لوگ مصیبت میں صبر کرتے ہیں اللہ جل شانہٗ ان کے گناہوں کو ملیا میٹ کر دیتا ہے۔ یہ سعادت ہے

جو گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے۔ اے درویش۔ اس راہ میں عاشقوں نے درد و بلا کو اپنی خوراک بنایا ہے۔ جس دن اُن پر بلا نازل نہیں ہوتی وہ ماتم کرتے ہیں کہ آج ہمیں دوست نے یاد نہیں فرمایا اور جب کسی درد و بلا میں مبتلا ہوتے ہیں تو یاد آوری کے شکرانے بجا لاتے ہیں۔ اے درویش راہِ محبت میں صادق وہی شخص ہے جو بڑی خواہش سے درد و بلا کی تمنا کرے۔ پھر فرمایا کہ اے درویش ہم مسافر ہیں، بلا کے سر پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ بلا دنیا ہے۔ ہماری عمر کی بساط یکایک پلیٹ دی جائے گی اور قبر ہمارا مقام و منزل ہوگی۔

جہان چیست بگذر ز نیرنگ او  رہائی بچنگ آر از چنگ او
مقیمے نہ بینی دریں باغ کس  تماشا کند ہر یکے ہر نفس
دریں چار سو ہیچ بیگانہ نیست  کہ کیسہ بر مرد خود کامہ نیست
در و ہر دمے نو برے می رسد  یکے می رود دیگرے می رسد
جہاں گرچہ آرامگاہے خوش است  شتابندہ را نعل در آتش است
دو دروازہ ایں باغ آراستہ  در و بند ایں ہر دو برخاستہ
درآ از درے باغ بنگر تمام  ز دیگر درے باغ بیروں خرام
اگر زیرکی با گلے خو مگیر  کہ باشد بجا ماندنش ناگزیر
دریں دم کہ داری بشادی بسیچ  کہ آئندہ در زیر پیچ ست و پیچ
یکے را در آرد بہ ہنگامہ تیز  دگر را ز ہنگامہ گوید کہ خیز
نظامی سبکباش یاراں شدند  تو ماندی بہ غم غمگساراں شدند

آپ کا ارشاد ہے کہ فقیر جب جامہ پہنے تو یہ سمجھے کہ جامہ نہیں بلکہ کفن پہنا ہے۔

صاحب سیر الاولیا لکھتے ہیں کہ آپ کے پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں لیکن پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں بہت ہیں۔ آپ کے سب سے بڑے صاحبزادہ کا نام شیخ نصیر الدین قدس سرہٗ ہے۔ صاحب مرأۃ الاسرار سیر الاولیا سے نقل کرتے ہیں کہ "بہ او صاف سینہ و اخلاقِ مرضیہ موصوف بود۔ روزگار بعبادت باری تعالیٰ و بہ کسب زراعت جہت لقمۂ حلال گذرانید و عمر عزیز در رضاعے حق تعالیٰ بسر بردہ رحمۃ اللہ علیہ۔ آپ کے دوسرے صاحبزادہ کا نام شیخ

شہاب الدین قدس سرہٗ ہے۔ آپ وفورِ علم و فضائل سے آراستہ تھے اور اکثر اوقات اپنے والد کی خدمت مبارک میں رہا کرتے تھے۔ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ مجھ میں اور شیخ شہاب الدین میں باہم محبت تھی۔ ایک مرتبہ بلا قصد مجھ سے کوئی خطا سرزد ہوگئی تھی اُنھوں نے درمیان میں پڑ کر معافی دلوائی۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ۔ آپ کے تیسرے صاحبزادہ کا نام بدرالدین سلیمان بن گنج شکر تھا قدس سرہ العزیز۔ یہ بھی علم و تقویٰ میں مشہور اور اوصاف مشائخ کبار سے موصوف تھے۔ حضرت گنج شکرؒ کے وصال کے بعد انھیں کو تمام بھائیوں اور اہل ارادت کے اتفاق رائے سے سجادہ پر بٹھایا تھا۔ صاحب مرأۃ الاسرار فرماتے ہیں کہ "آں مقام را ہنوز حضور یہ جادۂ طریقت متور گردانید و یرا گنج شکر مرید خلفاے چشت گردانیدہ بودند"۔ چوتھے صاحبزادہ کا نام نظام الدین تھا۔ حضرت گنج شکرؒ کو تمام لڑکوں سے زیادہ انھیں سے محبت تھی۔ آپ نے فوج کی نوکری کی اور والد ماجدؒ کی وفات کے بعد حملۂ کفار میں لڑ کر شہید ہوے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ کی نعش مبارک نہیں ملی۔ اور بعض کہتے ہیں علاء الدین خلجی کے زمانہ میں قلعہ سہور کی تسخیر میں آپ شہید ہوے اور وہیں آپ کا مزار ہے۔ یزار و یتبرک۔ پانچویں صاحبزادہ شیخ یعقوب بن گنج شکرؒ تھے قدس سرہ العزیز۔ آپ سب سے چھوٹے تھے اور بذل و ایثار میں شہرت تام رکھتے تھے - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - آپ کا طریقہ ملامتیہ تھا اور کرامات ظاہر تھیں۔ آپ اکثر سفر میں رہتے۔ اثناے سفر میں قصبۂ اترو ہہ میں کہتے ہیں کہ آپ مردان غیب کے ساتھ شامل ہو گئے۔

صاحب مرأۃ الاسرار سیرالاولیا سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت گنج شکرؒ کی بڑی صاحبزادی کا نام بی بی مستورہ تھا۔ دوسری کا نام بی بی شریفہ تھا۔ بی بی شریفہ نہایت عابدہ زاہدہ تھیں اور ... عنفوان شباب ہی میں بیوہ ہوگئی تھیں۔ پھر عمر بھر شادی نہیں کی اور عبادت الٰہی میں بسر کی۔ حضرت گنج شکرؒ نے بارہا فرمایا ہے کہ اگر عورت کو خلافت و سجادۂ مشائخ دینا روا ہوتا تو میں شریفہ کو دیتا۔ تیسری صاحبزادی کا نام فاطمہ تھا۔ ان کا نکاح شیخ بدرالدین اسحاق سے ہوا تھا۔ جن سے دو لڑکے خواجہ محمد اور خواجہ موسیٰ پیدا ہوے اور حضرت سلطان المشائخ کے زیر تربیت رہ کر مقامات عالی پر پہونچے۔

حضرت گنج شکرؒ کے پوتے شیخ علاء الدین بن شیخ بدر الدین سلیمان بن گنج شکر قدس سرہٗ تمام پوتوں اور نواسوں سے زیادہ ممتاز تھے۔ ایک بار کھیلتے کھیلتے آئے اور اپنے دادا کے سجادہ پر بیٹھ گئے۔ شیخ عیسیٰ ایک درویش نے ہٹانا چاہا مگر حضرت گنج شکرؒ نے فرمایا "بگذار تا نشستہ باشد"۔ ان انفاس متبرکہ کی برکت سے تقریباً دو قرن شیخ علاء الدین اپنے دادا کے سجادہ پر متمکن رہے۔ اور چھپّن سال حق سجادگی ادا کیا۔ سلطان فیروز شاہ بادشاہ دہلی آپ کے مریدوں میں تھا۔ شیخ رکن الدین جو شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے پوتے تھے جب دہلی سے ملتان کی طرف معاودت فرماتے تو شیخ علاء الدین سے ضرور ملتے اور فرماتے کہ حق تعالیٰ نے آپ کو ایسی استقامت بخشی ہے کہ کوئی شخص اس جگہ سے آپ کو جنبش نہیں دے سکتا۔ جب آپ کا وصال ہوا تو حضرت گنج شکرؒ کے جوار میں آپ کو دفن کیا گیا۔ اور سلطان محمد تغلق نے جو آپ کا مرید اور معتقد تھا ایک بڑا گنبد مزار پر تعمیر کیا۔ یتبرک و یُزار۔

"عبداللہ"

ارے وصل کا آسرا دینے والے — کہاں تک کوئی موت کو روز ٹالے
جو آنکھیں لڑائیں تو آنکھیں نکالے — ستم ہے پڑے ہیں ستمگر کے پالے
جنھیں سن کے تم آ گئے دل سنبھالے — وہ آہیں ہیں آہیں وہ نالے ہیں نالے
عدم جا رہا ہے کوئی در سے اُٹھ کر — ذرا اپنے روٹھے ہوئے کو منا لے
ہولے اجل نے سُلایا ہے جنکو — جگانے سے جاگے نہ وہ سونے والے
ہوئے سارے جنگل کے سیراب کانٹے — جو دو ایک ٹوٹے ہیں تلوے کے چھالے
ہماری لحد کو بھی ٹھکرا دے آ کر — ارے مُنہ اُدھر پھیر کر جانے والے
گلستاں محبت کا عبرت کدہ ہے — کہ شبنم ہے گریاں ہیں بلبل کے نالے
سنبھلتا نہیں تم سے سینہ پہ آنچل — سنبھلتا نہیں دل ہمارے سنبھالے

جگر خاک میں دل ملا کر ہمارا
وہ گھر جا رہے ہیں کلیجا سنبھالے

جگر بسوانی

# انتخاب از سیرالمصنفین

مکرمی مولوی محمد یحییٰ تنہا بی اے (علیگ) وکیل غازی آباد نے سیرالمصنفین کے نام سے ایک تذکرہ مصنفین اُردو کا لکھا ہے۔ جس کا حجم وہ ۷۰۰ صفحے بتاتے ہیں۔ آزاد نے تذکرۂ آبِ حیات میں شعرا کے پانچ دَور قائم کیے تھے۔ تنہا صاحب نے اپنے تذکرہ کو چار دوروں میں تقسیم کیا ہے۔ جلد اول جو زیر طبع ہے اُس میں ابتدائی دو دَوروں کے اور جلد دوم میں جو بعد کو چھپے گی تیسرے دَور کے مصنفین کے حالات ہیں۔ چوتھا دَور ابھی لکھنا باقی ہے جس میں اُردو کے موجودہ مصنفین کے حالات آئیں گے۔

اس کتاب پر تبصرہ کا ابھی وقت نہیں ہے مگر بے شبہہ یہ ایک نہایت ضروری کام ہے۔ جس کے لیے تنہا صاحب دُنیائے اُردو کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ تنہا صاحب نے ازراہِ کرم اپنے مسودہ کے بعض اجزا ارسال فرمائے ہیں جو شکریہ کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں۔ کتاب کے متعلق امید دلائی گئی ہے کہ نومبر میں تیار ہو جائے گی۔ ایڈیٹر

## اُردو کی پیدائش

جب دو صاحبِ زبان قومیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اور آپس میں رشتۂ اتحاد و ارتباط قائم ہوتا ہے تو قانونِ فطرت کے مطابق اخلاق، مذہب، زبان، طرز بود و باش، ادب و آداب، لباس اور دیگر شعائر پر ایک دوسرے کا اثر نامعلوم طریقہ سے شروع ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ یہ اثر کچھ دونوں میں ایک صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور سب کو نظر آنے لگتا ہے۔ اس قاعدۂ کلیہ میں کوئی استثنا نہیں۔ جن لوگوں نے تاریخ عالم کا مطالعہ کیا ہے وہ اس امر کی بھی شہادت دے سکتے ہیں کہ ایسی حالت میں دیگر امور متذکرۂ بالا کی نسبت دونوں قوموں کی زبان پر خصوصاً زیادہ اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ اظہارِ مطالب کے لیے ہر شخص وہ لفظ استعمال کرنے کی قدرتاً کوشش کرتا ہے جسکو

دوسری قوم کا فرد آسانی سمجھ لے اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ خرالذکر قوم کی زبان کا لفظ بولا جائے۔ اس طریقہ سے دونوں قوموں کے افراد روزمرہ کے کاروبار چلانے کے لیے کچھ الفاظ ایک دوسرے کی زبان کے سیکھ لیتے ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ ایک زبان کے بہت سے الفاظ دوسری زبان کے اصلی الفاظ بن جاتے ہیں۔

انگریزی زبان جو آجکل مخزن علوم و فنون بنی ہوئی ہے، اُس میں اُردو سے لیکر لاطینی و یونانی زبان تک کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں زبان ہونے کے اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ انگریزوں کو دنیا کی تمام قوموں سے خوب ملنے جُلنے کا واسطہ رہا ہے۔ اس لیے ان قوموں کی زبانوں کے بہت سے الفاظ بھی بجنسہ اُن کی زبان میں داخل ہوگئے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں۔ پس ہماری زبان کی ابتدا اُسی وقت سے ہوگئی تھی، جب سے مسلمان اِس ملک میں داخل ہونے شروع ہوگئے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ زبان جو اُس وقت ہندو اور مسلمان بغرض ادائے مطالب بولتے تھے اُردو نہیں کہی جا سکتی، تاہم اختلاطِ الفاظ کی بنیاد پڑ چکی تھی اور یہی اختلاطِ الفاظ آگے چل کر ہماری زبان کی پیدایش کا باعث ہوا۔

ابوریحان بیرونی نے جو علامہ البیرونی کے نام سے موسوم ہے اور جس کا شمار دربار غزنوی کے افاضل و اکابر میں ہے ہندوؤں کی قدیم علمی درسگاہوں میں طالب علمی کر کے سنسکرت حاصل کی اور ہندوؤں کے علوم عربی میں اور عربوں کے علوم سنسکرت میں منتقل کیے اور برسوں اُن شہروں میں رہ کر جہاں اسلام کا نام و نشان بھی نہ تھا یہاں کی مروجہ زبانیں سیکھیں۔ اُسی عہد سے وابستہ فارسی کا شاعر مسعود سعد سلمان ہے جس کی نسبت تذکرہ مجمع الفصحا، میں لکھا ہے " وے راسہ دیوان بودہ، تازی، ہندی، پارسی"۔ اور مولانا شبلی لکھتے ہیں "تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ ہندی زبان میں اُس نے ایک دیوان لکھا تھا"۔ یہ غزنویوں کے عہد اوّلیں کا ایک نامور مسلمان شاعر تھا۔ وہ لاہور میں پیدا ہوا تھا۔ اگرچہ خاندانی لحاظ سے وہ عجمی تھا تاہم اُس نے اپنے وطنِ ولادت کی زبان میں بھی ایک دیوان مرتب کر ڈالا۔

۱۱۹۳ء میں جبکہ شہاب الدین غوری نے رائے پتھورا پر فتح پائی تو چاند کوی ایک نامی شاعر نے پرتھی راج راسو لکھا۔ اس کتاب کے ہر صفحہ میں فارسی، عربی کے کئی کئی لفظ نظر آتے ہیں۔

اگر محمود غزنوی کے وقت کی نظم یا نثر مل جائے تو اس میں بھی عربی، فارسی کے الفاظ پائے جائیں۔

کشمیر کے حکمراں سلطان زین العابدین نے جو فارسی کے علاوہ ہندی اور تبتی زبانوں میں بھی پورا دخل رکھتا تھا، فارسی کتابوں کا ترجمہ ہندی میں اور بہت سی ہندی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کرایا۔ اور سب سے پہلے اُسی کے حکم سے مہابھارت اور راج ترنگنی (قدیم تاریخ کشمیر) کا ترجمہ فارسی میں ہوا۔ اسی عہد کے قریب قریب امیر خسرو نے جو ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء میں فوت ہوئے خالق باری تصنیف کی۔ یہ کتاب بازار میں عام طور پر فروخت ہوتی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سبب تصنیف یہ ہے کہ جو طلباء فارسی سیکھنے کا شوق رکھتے ہوں اسکو پڑھیں، کیونکہ اس میں اکثر فارسی، عربی الفاظ کا ترجمہ یہاں کی اُسوقت کی عام اور مروجہ زبان میں کیا گیا ہے۔ نمونہ کے طور پر ایک شعر کافی ہے۔

بیا برادر آؤ رے بھائی　　بنشیں مادر بیٹھ ری مائی

اُس وقت سے لیکر اُنیسویں صدی عیسوی کے اختتام تک یہ کتاب مبتدی طلاب کا وظیفۂ زبان رہی ہے۔ البتہ بیسویں صدی کے آغاز سے اسکی کساد بازاری ہوگئی ہے۔ اور وجہ صرف یہ ہے کہ اب فارسی زبان حاصل کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

امیر خسرو آنکھوں کا ایک مجرب نسخہ دوہروں کی بحر میں اس طرح لکھتے ہیں کہ

لودھ، پھٹکری، مردہ سنگ　　ہلدی، زیرہ ایک ایک ٹنگ
افیون چنا بھر، مرچیں چار　　اُردبرابر تھوتھا ڈار
پوست کے پانی پوٹلی کرے　　تُرت پیڑ نینوں کی ہرے

ظاہر ہے کہ اس عہد میں مسلمانوں کی زبان بھی آپس کے تعلقات کی بنا پر ضرور برج بھاشا ہوگی۔ جسکو وہ آدھی اپنی اور آدھی اُنکی ملاکر ٹوٹی پھوٹی بولتے ہونگے۔ ان زبانوں کی کوئی نثر تصنیف نہیں ملتی۔ البتہ امیر خسرو کی ایک غزل جس کا مطلع ہے

زحال مسکیں مکن تغافل، دورائے نیناں بنائے بتیاں　　کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں، نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

اور پہیلیاں، مکرنیاں اور گیت پتہ دیتے ہیں کہ ۷۰۰ھ ہجری میں یہاں کے مسلمان خلطی بھاشا بولتے ہوں گے۔ بلکہ اس سے یہ بھی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمان بھی اُس وقت یہیں کی زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے تھے اور اس زبان کو کس شوق اور محبت سے بولتے تھے۔ بیشک ہندوؤں کی نسبت اُنکی زبان پر

فارسی، عربی الفاظ زیادہ آجاتے ہوں گے لیکن جتنا یہاں رہنا سہنا اور استقلال زیادہ ہوتا گیا اُتنا ہی روز بروز فارسی ترکی نے منعت اور یہاں کی زبان نے زور پکڑا ہوگا۔

پندرہ صدی عیسوی میں جبکہ سکندر لودی سریر آرائے سلطنت تھا، اوّل کایتھ فارسی پڑھ کر شاہی دفتر میں داخل ہوئے، اور عربی فارسی کے الفاظ اُنکی زبانوں پر بکثرت آنے لگے۔ اور اسی سکندر لودی کے زمانہ میں کبیر شاعر بنارس کے رہنے والے علم میں اَن پڑھ تھے، گُرو رامانند کے چیلے ہوکر ایسے ہوئے کہ کبیر پنتھیوں کا مت نکالا۔ اُنکے دوہروں میں فارسی عربی کے الفاظ بکثرت موجود ہیں مثلاً

دین گنوایو دُنی سے دُنی نہ آیو ہاتھ | پیر کلہاڑی ماریو گافل (غافل) اپنے ہاتھ

کبیر سبریر سرائے ہے کیوں سوے سُکھ چین | کوچ نگارا (نقارہ) سانس کا باجت ہے دن رین

گرونانک کی تصنیفات میں بھی جو سنہ ۹۰۰ھ (۱۵۰۰ء) کے بعد فوت ہوئے عربی فارسی کے الفاظ پائے جاتے ہیں:-

ساس ماس سب جیو تمہارا تو ہے کھرا پیارا | نانک شاعر ایو کہت ہے سچے پروردگارا

جو چیزیں وظیفہ عبادت کے طور پر ہیں اُن میں بھی الفاظ مذکورہ اسی کثرت سے ہیں۔ جپ جی کے دو فقرے ملاحظہ ہوں:-

وارن جاؤں آن ایک بار | تو سدا سلامت جی نرنکار

سولھویں صدی عیسوی میں کہ شیر شاہی عہد تھا ملک محمد جائسی نے پدماوت کی داستان نظم کی۔ اور یہ التزام کیا کہ فارسی عربی کا ایک لفظ نہیں آنے دیا اور بحر بھی ہندی رکھی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان اس ملک میں رہ کر یہاں کی زبان کو کس پیارے بولنے لگے تھے۔

بعد ازاں اکبر کے عہد سے جبکہ مسلمان ہندوؤں سے شیر و شکر ہوگئے یہ نوبت پہونچی کہ ہندو شرفا بلکہ راجہ مہاراجہ ایرانی لباس پہن کر اور فارسی بول کر فخر کرنے لگے جس طرح کہ آجکل انگریزی بولنے اور انگریزی لباس پہننے پر فخر کیا جاتا ہے۔

سترہویں صدی عیسوی میں بابا تلسی داس برہمن نے جو ضلع باندہ کے رہنے والے تھے، اور پنڈت، اور شاعر، اور فقیر تھے، رامائن کو بھاشا میں اس طرح ترجمہ کیا کہ یہ لاثانی کتاب مطبوع خاص و عام ہوئی۔ اُن کے دوہروں میں بہت اور کتاب مذکور میں کہیں کہیں فارسی عربی کے الفاظ موجود ہیں

سنکا ہے سیوک کل چلے سوامی پرکھو پائے | گھر ترو تروبن وباگ (باغ) و بر ڈیرا دیو لگائے

گھر بسو اس سجن ہٹ بولے　　　کتنی بھنگ کلہ (ٹوپی) بھی کھولے
رام اتیک گریب نوا سجے　　　لوک بید بربرد برا سجے
گنی (غنی) گریب (غریب) رام نز ناگر　　　پنڈت موٹے ملین اُو جاگر
مایا کو ملے کر کر لیے ہاتھ　　　تلسی داس گریب کو کوئی نہ پوچھے بات

اسی زمانہ میں سورداس جی نے سری کرشن جی کے ذکر سے اپنے کلام کو مقبول خاص و عام کیا۔ اِنکی تصنیف میں شاید کوئی شعر ہوگا جو فارسی عربی لفظ سے خالی ہوگا۔ پس اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جب یہ بزرگانِ مذہب اپنے دوہروں میں فارسی لفظ بول جاتے تھے تو گفتگو میں عام ہندو لوگ کیا کچھ اس سے زیادہ نہ بولتے ہونگے۔ سورداس جی کہتے ہیں :-

مایا دھام دن و تا باندھوں ہوں اس ساج (ساز)　　　سنت سبھی جانت ہوں تو نہ آیو باج (باز)
کھیت بہت کاہے تم تانے سبن سنی آواج (آواز)　　　دیونہ جات پار اُتر آئے چاہت چڑھیں جہاج (جہاز)
لیجے پار اُتار سور کوں مہاراج برج راج　　　نیں کرت کہت پرہوتم ہو سد گریب نواج (غریب نواز)

رفتہ رفتہ شاہجہان کے زمانہ میں شہر اور شہر پناہ تعمیر ہو کر نئی دلّی دار السلطنت ہوئی۔ بادشاہ اور ارکان دولت زیادہ تر وہاں رہنے لگے۔ اہل سیف، اہل قلم، اہل حرفہ اور تجار وغیرہ ملک ملک اور شہر شہر کے آدمی ایک جگہ جمع ہوے۔ ترکی میں اُردو بازار لشکر کو کہتے ہیں۔ اُردوے شاہی اور دربار میں بلے جلے الفاظ زیادہ بولے جاتے تھے۔ وہاں کی بولی کا نام اُردو ہو گیا۔ اور یہ زبان خاص و عام میں شاہجہاں کے اُردو کی طرف منسوب و مشہور ہو گئی۔

سنا جاتا ہے کہ ہماری زبان کو ریختہ بھی کہتے تھے۔ یہ لفظ ہمارے کانوں کو غیر مانوس اور اجنبی معلوم ہوتا ہے، تاہم متقدمین اور متاخرین شعرائے اُردو کے بجائے لفظ ریختہ اشعار میں لکھا ہے۔ میر تقی میر فرماتے ہیں :-

خوگر نہیں کچھ یوں ہی، ہم ریختہ گوئی کے　　　معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اُن کے ہم عصر قائم بھی کہتے ہیں :-

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ　　　اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

متاخرین میں مرزا غالب کا ارشاد ہے :-

ریختہ کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالب — کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا
یا
یہ جو کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی — گفتۂ غالب ایک بار پڑھکے اُسے سُنا کہ یوں

نواب مرزا داغ اور اُنکے ہم عصروں کے یہاں ریختہ متروک ہو گیا اور ہماری زبان کا نام صرف اُردو رہ گیا۔ چنانچہ داغ نے ایک جگہ فخریہ کہا ہے:-

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ — ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

ایک اور شعر ہے

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہدو — کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

نسیم دہلوی شاگرد حکیم مومن خاں یوں نغمہ سرا ہیں:-

نسیم دہلوی ہم موجد باب فصاحت ہیں — کوئی اُردو کو کیا جانے کہ جیسا ہم سمجھتے ہیں

اُردو کو ریختہ پہلے اس وجہ سے کہتے تھے کہ مختلف زبانوں نے اسے ریختہ کیا ہے - جیسے دیوار کو اینٹ، مٹی، چونہ، سفیدی وغیرہ ریختہ کرتے ہیں- یا یہ کہ ریختہ کے معنی ہیں گری پڑی، پریشان چیز چونکہ اسمیں الفاظ پریشان جمع ہیں اسلیے اسکو ریختہ کہتے تھے اور یہی سبب ہے کہ اسمیں عربی، فارسی، ترکی وغیرہ کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں اور انگریزی بھی داخل ہوتی جاتی ہے اور ایک وقت ہو گا کہ عربی، فارسی کی طرح انگریزی زبان بھی قابض ہو جائے گی - اور شاید وہ وقت بسرعت تمام قریب آ رہا ہے -

اُردو کی ابتدائی تصنیفات نظم سے شروع ہوئیں - اگرچہ فطرت بھی اسی کی مقتضی رہی ہے کہ ادب اور علم کی ابتدا ہمیشہ نظم سے ہوتی آئی ہے- کیونکہ ایک وحشی قوم جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتی ہمیشہ اپنے بزرگوں کی روایات، رسم و رواج اور اُنکی شجاعت و بسالت کو جسکو اُس قوم کی تاریخ سمجھنا چاہیے اپنی قوم کے بھاٹ اور کبیشر کے ذریعہ سے گیتوں اور راگ راگنیوں میں محفوظ رکھتی آئی ہے - چنانچہ یہی بھاٹ اور کبیشر تھے جنھوں نے نہ صرف یورپ بلکہ چین، تبت اور تاتار اور اسی طرح ہند، سندھ، بلوچستان، مغربی ایشیا، جزائر بحر اسود، مصر، مغربی افریقہ، شمالی امریکہ، جنوبی امریکہ، اور جزائر بحرالکاہل کے مطبوع و مقبول افسانہائے قدیم کو محفوظ رکھا - پس علم کی سب سے پہلی بنیاد ہمیشہ شاعری اور اکثر اوقات قافیہ بندی سے پڑتی ہے - ایک وحشی کے کانوں کے لیے یہ الفاظ کی زیر و بم عجب ترنم پیدا کرتی اور خوش آیند معلوم ہوتی ہے - لیکن یہ حالات ہماری زبان

پر منطبق نہیں ہوتے کیونکہ اسکے بولنے والے ان پڑھ اور وحشی نہ تھے بلکہ ایک طرف سنسکرت اور بھاشا کے خزائن کی کنجی ہاتھ میں لیے ہوئے تھے اور دوسری طرف عربی، فارسی کے گنجینوں کو سینوں میں نہاں رکھتے تھے۔ تاہم نتیجہ وہی برآمد ہوا کہ اردو کی تصنیفات کی ابتدا نظم سے ہوئی۔ ہمارے نزدیک اسکی وجہ یہ ہے کہ مطالب ضروری کی سب کارروائی فارسی میں ہوتی تھی۔ اردو نثر کی طرف کسی کو اصلا توجہ نہ تھی اور اردو کے اُس وقت کے اہل زباں جو ذی استعداد ہوتے تھے وہ اردو کی شاعری کو بھی فخر نہ سمجھتے تھے۔ کچھ کہنا ہوتا تھا تو فارسی میں کہتے تھے۔ البتہ عوام الناس موزوں طبع دل کی ہوس پوری کرنے کو جو منہ میں آتا تھا کہے جاتے تھے اور اس طرح ابتدا شعر و شاعری سے ہوگئی۔

تو از نام ایک مصنف نے فرخ سیر کے عہد میں شکنتلا کا ترجمہ بھاشا میں کیا اور اردو کو محروم رکھا۔ لہذا یہ بات قابل افسوس ہے کہ سنسکرت اور بھاشا سے باوجود قدرت کوئی فائدہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنی مشترکہ زبان کو نہیں پہونچایا اور وہ اسلوب بیان اور وہ صحیفۂ فطرت کے مناظر جن سے سنسکرت اور بھاشا کی نظمیں مالا مال ہیں اُن سے اردو مفلس نظر آتی ہے۔ البتہ فارسی کی انشا پردازی کے گلزار جا بجا کھلے ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نظم اردو کے آغاز میں سنسکرت کی تقلید ضرور کی گئی۔ سنسکرت میں ایک لفظ کے کئی کئی معنی ہیں۔ اسی واسطے اس میں اور برج بھاشا اسکی شاخ میں ذومعنین الفاظ اور ایہام پر دوہردں کی بنیاد ہوتی تھی۔ فارسی میں یہ صنعت ہے مگر کم۔ اردو میں پہلے پہل شعر کی بنا اسی پر رکھی گئی اور دور اول کے شعرا میں وہی قانون جاری رہا۔ اُس عہد کے چند اشعار بطور نمونہ پیشکش ہیں۔

| | |
|---|---|
| لام نستعلیق کا ہے اُس بت خوشخط کی زلف | ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے |
| کیوں نہ ہو ہم سے وہ سجن باغی | قد ہو جس کا نہال کی مانند |
| تو جو دریا کے پار جاتا ہے | دل مرا وار وار جاتا ہے |
| تم دیکھو یا نہ دیکھو ہم کو سلام کرنا | یہ تو قدیم ہی سے سر پر ہمارے کرہے |
| نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا دیوے | کہ آخر بدنما لگتا ہے دیکھو چاند کو گہنا |

لیکن جس چیز کی اردو میں نقل کرنی چاہیے تھی اُس سے قاطبۃً اعراض کیا گیا۔ ولی نے عالمگیر کے

عہد میں نظم اُردو کی ابتدائی اور محمد شاہ رنگیلے کے زمانہ میں جبکہ عیش و عشرت کی بہار تھی اور اُردو شاعری کا ستارہ چمک رہا تھا فارسی کا تتبع اختیار کیا اور غزل میں رنگ اُڑانا شروع کیا۔ شاعروں نے بھی اُسکی دیکھا دیکھی فارسی کے خاکے اُردو میں اُتار کر غزلخوانیاں شروع کردیں اور قصیدے کہنے لگے۔ چنانچہ ہمارے یہاں نئے نئے اسلوب بیان، عمدہ عمدہ تراکیب الفاظ، تشبیہ و استعارات بکثرت موجود ہیں لیکن مصلحات علمی سے ہماری زبان ناآشنا رہی کیونکہ اُس عہد میں علوم و فنون، تاریخ و فلسفہ و ریاضی وغیرہ کا چرچا نہ تھا۔ الغرض یہی سلسلہ اب تک جاری رہا۔ اور کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ اس پگڈنڈی کو چھوڑ کر ایک دوسری شاہراہ اختیار کریں اور آنکھ بند کیے اگلی بھیڑوں کے پیچھے چلتے رہے۔ آخرکار انگریزی علم ادب نے ہماری آنکھیں کھولیں اور آزاد و حالی نے ایک علحدہ روش اختیار کی جس پر آجکل ہمارے نوجوان شعرا جادہ پیمائی کر رہے ہیں اور مترجمین مصطلحات علمی بہم پہونچا رہے ہیں۔

اُردو زبان کی طبیعت ایسی ملنسار واقع ہوئی ہے کہ ہر زبان سے مل جل جاتی ہے سنسکرت آئی اُس سے مل گئی، عربی فارسی آئی اُسے بسم اللہ خیر مقدم کہا۔ اب انگریزی الفاظ کو اس طرح جگہ دے رہی ہے گویا اُسکے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اسکی اس ملنساری اور آسانی کی وجہ سے یہ ملکی زبان ہوگئی ہے۔ کشمیر سے راس کماری تک اور بنگال سے سندھ تک اُردو بولی یا سمجھی جاتی ہے۔ اس قلیل عرصہ میں جب سے کہ ولی نے اپنی پہلی غزل اُردو میں تصنیف کی جس کو سوا دو سو برس کا زمانہ گذرا آج تک جو کچھ ہوا وہ کسی تحریک یا ارادہ سے نہیں ہوا تاہم اُردو کی ترقی نمایاں اور روزافزوں ہے۔ بلاشبہ یہ رفتار دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلہ میں نسبتہً بہت کم ہے لیکن یہ اسکے ابتدائی مدارج ہیں اور دوسری زبانیں اپنی ترقی مکمل کر چکی ہیں۔ انگریزی زبان نے اپنا موجودہ علم ادب چوتھی صدی سے بیسویں صدی تک یعنی ایکہزار چھ سو برس میں پیدا کیا ہے جبکہ کل قوم اور حکومت انگلشیہ برابر اسکی ترقی کے لیے کوشاں رہی ہیں تو کیا تعجب خیز امر نہیں ہے کہ اُردو نے بغیر کسی امداد اور وسیلہ کے اس قدر جلد ایک معتدبہ علم ادب بہم پہونچایا۔

افسوس ہے کہ نظم اُردو کے ساتھ ساتھ نثر[1] اُردو کی ابتدا نہیں ہوئی بلکہ ایک عرصہ کے بعد

---

[1] مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی اپنے ایک خط مورخہ ۱۰۔ ستمبر [illegible]ء میں تحریر فرماتے ہیں (ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ)

محمد شاہ کے عہد میں فضلی تخلص ایک بزرگ نے ۱۱۴۵ہجری میں دہ مجلس لکھی - اسکے دیباچہ میں وہ سبب تالیف لکھتے ہیں اور غالباً یہی نثر اُردو کی پہلی تصنیف ہے :-

"پھر دل میں گذرا کہ ایسے کام کو عقل چاہیے کامل اور مدد کسو طرف کی ہوئے شامل کیونکہ بے تائید صمدی اور بے مدد جناب احدی یہ مشکل صورت پذیر نہووے اور گوہر مراد رشتۂ امید میں نہ آوے - لہذا کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع اور اب تک ترجمۂ فارسی بعبارت ہندی نثر نہیں ہوا مستمع - پس اس اندیشۂ عمیق میں غوطہ کھایا اور بیابان تامل و تدبیر میں سرگشتہ ہوا - لیکن راہ مقصود کی نہ پائی - ناگاہ نسیم عنایت الہی دل افگار پُر اہتزاز میں آ - یہ بات آئینۂ خاطر میں مُنہ دکھلائی "

میر کی مثنوی شعلۂ عشق کے مضمون کو بھی مرزا رفیع السودا نے نثر میں لکھا ہے (جن کا زمانہ ۱۱۲۵ہجری سے ۱۱۹۵ہجری تک ہے) اُس کا انداز بالکل یہی ہے جو سودا کی کلیات کے دیباچہ کا ہے

نثر مرزا رفیع

"ضمیر منیر پر آئینہ داران معنی کے مبرہن ہو کہ محض عنایت حق تعالیٰ کی ہے جو طوطی ناطقہ شیریں سخن ہو - پس یہ چند مصرع کہ از قبیل ریختہ دُر ریختۂ خامہ و زبان اپنی سے صفحۂ کاغذ پر تحریر پائے - لازم ہے کہ تحویل سخن سامعہ سنجان روزگار کروں - تا زبانی ان اشخاص کی ہمیشہ مورد تحسین و آفریں رہوں

قسمت قدر شناسا ہی سے پہونچے ہے بہم — ورنہ دنیا میں خذف بھی نہیں گوہر سے کم

مضمون سینہ میں بیش از مرغ اسیر نہیں کہ ہو بیچ قفس کے - جس وقت زبان پر آیا فریادی ہے واسطے گوش دادرس کے - غرض جیس اہل سخن کا دُر مضمونی زینت لب ہے سررشتۂ حسن معانی کا اس کلام کے اُس سے انصاف طلب ہے - اگر حق تعالیٰ نے صبح کاغذ سفیدی کا مانند شام سیاہ کرنے کو یہ خاکسار خلق کیا ہے تو ہر انسان کے فانوس دماغ میں چراغ ہوش دیا ہے - چاہیے کہ دیکھ کر نکتہ چینی کرے ورنہ گزند زہر آلودے جسے آجل کلہے کو مرے "

(حاشیہ صفحہ ۵۰) کہ ایک صاحب تاریخ اُردو لکھ رہے ہیں اُن کو عہد شاہجہانی تک کی نثریں دستیاب ہو گئی ہیں - اس لحاظ سے نثر اُردو کی ابتدا نظم اُردو کے ساتھ ساتھ ہوئی - وہ نثریں جیسا کہ متن میں حوالہ دیا گیا ہے کچھ ان سے بہتر نہ ہونگی - تمنا

اس تصنیف سے تخمیناً تیس برس کے بعد جب میر انشا اللہ خاں اور مرزا مظہر جانجاناں کی دتی میں ملاقات ہوئی ہے، اُس گفتگو کے چند فقرے بھی قابل غور ہیں۔ سید انشا مرزا جانجاناں سے فرماتے ہیں :-

"ابتدائے سن صباسے تا اوائل ریعان اور اوائل ریعان سے الی الآن اشتیاق مالا یطاق تقبیل عتبۂ عالیہ کا سجدے تھا کہ سلک تحریر و تقریر میں منتظم ہو سکے لہذا بے واسطہ و وسیلہ حاضر ہوا ہوں"

مرزا صاحب جواب میں فرماتے ہیں :-

"اپنے تئیں کوں بھی بدو طفلی سے بعض ایسے اشخاص کے ساتھ موانست و مجالست رہا کی ہے"

یہ وہ زمانہ ہے جبکہ بزم شعرا کے تین دور ختم ہو چکے ہیں۔ اگرچہ میر تقی میر اور مرزا رفیع السودا چراغ سحری ہیں لیکن انکی گرم نفسی اور آتش بیانی ہر صحبت اور جلسہ کو گرما رہی ہے اور چوتھے دور کے شعرا، کے قہقہوں کی آواز دور سے پیہم سنائی دے رہی ہے کہ اب آئے اور اب آئے۔

باایںہمہ اُردو میں اُس وقت نثر کی کوئی قابل الذکر کتاب ایسی نہیں لکھی گئی جس سے زبان کی تبدیلیوں کا سلسلہ معلوم ہوتا۔ کیونکہ نثر اُردو کی انشاپردازی اور وسعت فقط شعرا، کی زبان پر تھی اور عرصہ تک یہی حال رہا۔ آخر تیرہویں صدی ہجری کے شروع میں کئی قدرتی سامان جمع ہوگئے اور سب سے مقدم سبب اسکی عام فہمی تھی۔ چونکہ ہر شخص سمجھتا تھا۔ اس لیے نثر لکھنے والوں کو بھی اسی میں واہ واہ لینے کا شوق ہوا۔

## اُردو کا عنفوانِ شباب

## تیسرا دَور

(۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۲ء تک)

دوسرا دَور ہنگامۂ مشرق یعنی غدر تک منتہی ہو جاتا ہے اور اسکے بعد تیسرے دَور کا آغاز ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک دَور دوسرے دَور سے اس قدر چسپاں ہے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا آسان نہیں ہے۔ بے شک ہر دَور کی خصوصیات نمایاں ہیں لیکن یقینی طور پر یہ نہیں

کہا جا سکتا کہ فلاں سنہ سے فلاں سنہ تک دورِ اوّل رہا اور اسکے بعد دوسرا دور شروع ہوا یا یہ کہ تیسرا دَور ٹھیک غدر کے بعد شروع ہو گیا۔ دراصل مصنفین کی طرزِ تصنیفات کے لحاظ سے ہم نے یہ تین دَور قائم کیے ہیں۔ خواہ اُنھوں نے اپنی کتابیں کسی دَور میں کیوں نہ تصنیف کی ہوں۔ مثلاً سر سید تیسرے دور میں شمار کیے گئے ہیں حالانکہ اُنکی بعض تصنیفات مثل آثار الصنادید وغیرہ غدر سے پیشتر کی ہیں۔ اسی طرح اگرچہ منشی امیر احمد مینائی نے غدر کے بعد شہرت حاصل کی اور اُنکی جس کتاب کا ذکر کیا گیا ہے وہ غدر کے بہت بعد کی تصنیف ہے لیکن اُنکو دوسرے دَور کے مصنفین میں جگہ دی گئی ہے کیونکہ انتخاب یادگار کی زبان بالکل فسانہ عجائب جیسی ہے۔ پس یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہمارے قائم کردہ دَور فی الواقع ایک سنہ سے شروع ہو کر دوسرے سنہ پر ختم ہو جاتے ہیں اور اُن میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ ہاں مطالب کو واضح طور پر سمجھنے کے لیے اور آسانی کی غرض سے یہ دور قائم کر دیے گئے ہیں۔ ممکن ہے دو چار سال کا اِدھر اُدھر پھیر ہو لیکن یہ بے ریب و شک کہا جا سکتا ہے کہ ہماری زبان کی تصنیفات ضرور تین زمانوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں اور تین سے زیادہ یا تین سے کم دَور قائم نہیں کیے جا سکتے۔ چوتھا دَور دورِ حاضرہ ہے اور اس عہد کے مصنفین کے حالات کسی آیندہ زمانہ میں شرح و بسط کے ساتھ لکھنا بہتر ہوگا۔ اس وقت اُنکے حالات پر خامہ فرسائی قبل از وقت ہے۔ پس ہم نے تیسرے دور کو ہنگامۂ مشرق یعنی غدر کے اختتام سے شروع کیا اور ہنگامۂ مغرب یعنی جنگِ یورپ کے آغاز پر ختم کیا ہے۔

تیسرا دور اپنی خصوصیات کے لحاظ سے نہایت اہم ہے۔ اگر ہم پہلے دو دور کا حال نظرانداز کر جائیں یا ۱۷۹۸ء سے ۱۸۵۷ء تک کی تصنیفات صفحۂ ہستی سے معدوم ہو جائیں تو ہماری زبان کے ادبی سرمایہ میں خشخاش کے دانہ کی برابر بھی کمی محسوس نہیں ہو سکتی۔ بلاشبہ مرزا غالب کے خطوط اگر دوسرے دَور کی تصنیفات میں شمار کیے جائیں جیسا کہ ہم نے کیا ہے تو ضرور اُنکی گمشدگی ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا۔ لیکن مرزا کے خطوط غدر کے بہت بعد شایع ہوئے ہیں اس لیے ہم بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ ہماری زبان کے لیے سرمایۂ ناز و افتخار ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک کی تصنیفات ہیں۔ البتہ یہ کہنا بیجا نہیں ہے کہ پہلے دو دَور کی تصنیفات اُردو زبان کی عمارت کے لیے بنیاد کا کام دیتی ہیں اور ظاہر ہے کہ بغیر بنیاد کوئی عمارت قائم نہیں ہو سکتی۔

تیسرا دَور نہ صرف اپنے ماسبق دو دَوروں سے گوے سبقت لے گیا ہے بلکہ اب اُمید نہیں کہ ایسا شاندار، عظیم الشان اور مختلف النوع دَور ہماری آنکھوں کے سامنے قائم ہو۔ یہ ممکن ہے کہ تصنیفات کی تعداد روز افزوں ہو اور مصنف بھی کثرت سے پیدا ہوں لیکن یہ بزرگ صورتیں جن کو زمانہ مٹا چکا ہے اب دوبارہ نظر نہیں آئیں گی اور وہ جدت اور خوبیِ زبان اور وہ تلاش و تحقیق و تدقیق جو اِن صاحبان کی تصنیفات میں پائی جاتی ہیں نہیں دکھائی دیں گی۔

یارب زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لیے لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

چوتھا دَور جس کا آغاز ہم ۱۹۱۴ء سے بتاتے ہیں دراصل ترجمہ کا دَور ہے۔ اگرچہ یہ سلسلہ بیسویں صدی کے آغاز سے یا اس سے قبل شروع ہو گیا ہے لیکن آجکل زیادہ زوروں پر ہے۔ اور اسی بنا پر دَورِ حاضرہ کو ہم ۱۹۱۴ء ہی سے شروع کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں مولانا حالی اور مولانا شبلی جو تیسرے دَور کے مصنفین میں اعلیٰ پایہ کے ہیں اسی سنہ میں ہم لوگوں کو داغِ مفارقت دے گئے ہیں اور اِنکی ذات بابرکات کے ساتھ تیسرا دَور ختم ہو جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ مولوی عبدالحلیم شرر جنکا شمار تیسرے دَور کے مصنفین میں ہے خدا کے فضل سے ۱۹۱۴ء سے اب تک یعنی ۱۹۲۴ء تک اپنی تصنیفات سے برابر ہم لوگوں کو محظوظ فرماتے رہے ہیں اور اُردو زبان کے ناولوں میں اضافہ کرتے رہے ہیں اور خدا کرے کہ وہ بہت دنوں تک زندہ و سلامت رہیں اور اُن کا یہ شغلہ برابر جاری رہے لیکن اُن سے تیسرے دَور کی مدت کے تعین میں کوئی دقت نہیں ہوتی کیونکہ آپ کی تمام تصنیفات جو ۱۹۱۴ء سے قبل کی ہیں اُن میں اور مابعد کی تصنیفات میں کوئی مابہ الامتیاز فرق نہیں۔ سب ایک ہی زنجیر کی کڑی معلوم ہوتی ہیں۔

تیسرے دَور سے اُردو کا عنفوانِ شباب شروع ہوتا ہے اور عالمِ طفولیت ختم ہو جاتا ہے اب اُردو زبان جملہ اصنافِ سخن پر قدرت حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے اور جس طرح ایک نوجوان اظہارِ مطالب کسی بچے کی نسبت بہتر طور پر کر سکتا ہے یہی حال ہماری زبان کا ہو گیا ہے، اگرچہ اسکو علمی اور سائنٹفک مضامین کے اظہار پر پوری قدرت حاصل نہیں ہوئی لیکن وہ بطرزِ احسن اُنکو ادا کرنے کی سعیِ بلیغ کر رہی ہے اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوتی جا رہی ہے حکیم ہربرٹ اسپنسر کی فلسفیانہ کتب کا ترجمہ اُردو میں مشکل اور سخت مشکل ہے۔ چنانچہ جب مولانا شبلی مرحوم نے ڈاکٹر

(اب سر) محمد اقبال سے دریافت کیا کہ حکیم موصوف کی فلسفیانہ کتب کا ترجمہ اردو میں ہونا ممکن ہے یا نہیں؟ تو اُنھوں نے نفی میں جواب دیا لیکن ڈاکٹر موصوف نے جب حکیم ہربرٹ اسپنسر کی کتاب ایجوکیشن کا ترجمہ جو مولوی خواجہ غلام الحسنین صاحب پانی پتی نے کیا ہے دیکھا تو اُنھوں نے اپنی پہلی رائے بدل دی اور کہا کہ بلا شبہ حکیم ممدوح کی کتابوں کا ترجمہ بھی اردو میں کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ مترجم دونوں زبانوں پر کامل قدرت رکھتا ہو۔

فی الحقیقت ہر زبان کی ترقی اور وسعت ترجموں پر منحصر ہے۔ جس قدر علوم و فنون کی کتب کا ترجمہ اپنی زبان میں کیا جائے گا زبان وسیع ہوتی جائے گی اور اہل زبان علوم جدیدہ سے باہر واقف ہوتے جائیں گے۔ عربی زبان میں جب تک لاطینی اور یونانی و عبرانی کتب سے ترجمے نہیں کیے گئے کچھ اضافہ نہیں ہوا اور نہ عربوں کی سلطنت میں شائستگی اور تمدن کا دَور ہوا۔ فتوحات کے بعد تہذیب کا دَور شروع ہوتا ہے اور عربوں کا یہ دَور دورِ عباسیہ ہے جبکہ ہزاروں کتابیں دیگر ممالک سے اونٹوں پر لد کر آتی تھیں اور ترجمہ ہوتی تھیں بقول مولانا حالی

نہ تھا علم پر واں توجہ کا عالم		کہ ہو جیسے مجروح پائے جو مرہم
کسی طرح پیاس اُنکی ہوتی نہ تھی کم		بُجھاتا تھا پیاس اُنکی باراں نہ شبنم

حریم خلافت میں اونٹوں پہ لدکر
چلے آتے تھے مصر و یوناں کے دفتر

وہ تارے جو تھے شرق میں لمعہ افگن		پہ تھا اُنکی کرنوں سے تا غرب روشن
نوشتوں سے ہیں جنکے اب تک مزین		کتب خانۂ پیرس و روم و لندن

پڑا غلغلہ جن کا تھا کشوروں میں
وہ سوتے ہیں بغداد کے مقبروں میں

اس دَور میں مذہبی، اخلاقی، سیاسی، معاشرتی، علمی، ادبی، تاریخی و تمدنی، غرضکہ ہر قسم اور ہر نوع کی کتابیں لکھی گئیں۔ اس عہد کے لکھنے والوں کی تعداد بھی معتد بہ ہے۔ اگرچہ وہ مصنفین جن کو ہم نے لیا ہے ایک عشرہ سے زائد نہیں ہیں لیکن دوسرے درجے کے مصنفین کی تعداد کسی طرح ایک ربع صدی سے کم نہیں۔ اگر ہزارہا نہیں تو سیکڑوں کتابیں بلا شبہ اس

دور میں لکھی گئی ہیں جو اعلیٰ سے لیکر ادنیٰ درجہ تک کی ہیں۔
رفتار زمانہ سے ضرور اُمید ہے کہ اُردو زبان ترقی کرتی جائے گی۔ اگرچہ بعض تنگ خیال اصحاب اُردو کے مخالف نظر آتے ہیں لیکن اُنکی مخالفت بے سود ثابت ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ شروع سے آج تک ہمیشہ اسکی عام فہمی اسکے رواج کی سفارش کرتی رہی ہے بشرطیکہ اسکے نادان دوست اس کا معیار بلند کرنے کے خیال سے اسکو اس صفت سے معرّیٰ نہ کردیں جیسا کہ دور حاضرہ کی بعض تصنیفات کو دیکھ کر اسکے محبان صادق کو یہ خیال پیدا ہو چلا ہے۔
اس عہد کے سرتاج یا امام سرسید احمد خاں ہیں جن کی تحریرات نے اُردو کے قالب بے جان میں جان ڈال دی۔ اُنکی کتاب آثار الصنادید کسی یورپی تصنیف سے کم پایہ نہیں۔ جس زمانہ میں یہ کتاب لکھی گئی ہے اُس وقت غالبًا فوٹو کا رواج نہ تھا یا وہ اس قدر گراں تھا کہ سرسید اُسکے صرف کے متحمل نہ ہو سکتے تھے ورنہ وہ عمارات کے فوٹو لیتے اور اپنی کتاب میں چھاپتے۔ جان جوکھوں میں ڈال کر عمارات کے کتبوں اور اُنکی پیمایش کو صحیح صحیح تحریر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب غدر سے پہلے شایع کی گئی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید کا دماغ فطرۃً صحیح اور عمدہ باتوں کے قبول کرنے کیلئے موزوں ہوا تھا۔ سفر انگلستان نے صرف جِلا کر دی۔ اسی کتاب کی بدولت سرسید کو انگلستان پہونچ کر وہ اعزاز اور خطاب حاصل ہوئے جن کا اُنکو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اور اہل یورپ نے اس کتاب کی کما حقہٗ قدر کی اور داد دی۔ اخبار نویسی، مضمون نگاری، اور مدلل بحث و تقریر کرنا در اصل سرسید نے ہم سب لوگوں کو بتایا ورنہ اُردو زبان ان ضروری اور اہم اصناف سے محروم رہتی۔
آزاد نے اُردو نثر کو نظم کا ہم پایہ بنایا۔ جو کچھ لکھا تلاش و تحقیق سے لکھا۔ تشبیہ و استعارات کو موزوں طریقہ سے برتا، انگریزی خیالات کو اُردو کا دلفریب جامہ پہنایا۔ کتابیں ہیں کہ ہنستی بولتی تصویریں ہیں۔ جو خیالات ہیں بلند و ارفع اور جو بات ہے دلفریب و دلچسپ۔
مولوی نذیر احمد نے محاورات اور روزمرہ کو اس نہج پر استعمال کیا کہ اُن کا انداز تحریر خاص ہوگیا۔ اگرچہ بعض مقامات پر موٹے موٹے عربی الفاظ بھی آجاتے ہیں لیکن اُنکی خاص خوبی یہ ہے کہ وہ اس طرح لکھتے ہیں کہ مطالب کتاب، پڑھنے والے کے ذہن نشیں ہو جاتے ہیں، بلکہ

کالنقش فی الحجر بناتے ہیں -

مولوی چراغ علی مذہبی مضامین وکتب کے مصنف ہیں - آپ کی تصنیفات مدلل اور جامع ومانع ہوتی ہیں - متانت کوٹ کوٹ کر بھری ہے - جس عنوان پر لکھتے ہیں خوب لکھتے ہیں اور تحقیق وجستجو کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتے -

مولوی ذکاءاللہ طرزِ تحریر کے لحاظ سے کوئی خوبی نہیں رکھتے - البتہ اُنکی کتابوں میں معلومات کا ذخیرہ دفن ہے - اور مختلف مضامین پر اُنکی تصنیفات نے اُنکو اردو کا سچا ہی خواہ اور محسن قرار دیا ہے -

مولانا حالی فن تنقید کے بادشاہ ہیں اور سوانحعمری لکھنے میں اپنی آپ نظیر ہیں - طرزِ عبارت سادہ اور موثر ہے - مبالغہ سے پاک ہے اور واقعیت سے وہ کبھی تجاوز نہیں کرتے - تعریف ہر تو حدود کے اندر، اور اعتراض ہے تو صحیح - نہ اُستادی کا خیال ہے نہ دوستی کا، نہ بزرگی کا خیال ہے نہ پبلک کے مذاق کا - بلکہ جو کچھ کہنا ہوتا ہے صاف صاف بے کم وکاست کہتے ہیں اور کبھی بیجا طور پر نکتہ چینی نہیں کرتے - اور واقعی نقائص کے دکھلانے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے -

علامہ شبلی ایک مورخ اور بے مثل مورخ ہیں - اگرچہ اُنکی طبیعت ہمہ گیر واقع ہوئی ہے، لیکن تاریخی رنگ نمایاں اور ممتاز ہے - عبارت صاف اور سلجھی ہوئی ہوتی ہے - الفاظ موثر اور دلکش ہوتے ہیں - اپنے ممدوح کی تعریف خوب کرتے ہیں اور اگرچہ آپ کا ممدوح اکثر صفات سے متصف ہوتا ہے تاہم وہ انسان ہے اور اُسکے نقائص کا اظہار بھی تاریک پہلو پر روشنی ڈالتی تو اُسکی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی -

ڈاکٹر سید علی بلگرامی ترجمہ کے اُستاد ہیں، اُن کا انتخاب بھی لاجواب ہے - تمدن عرب اور تمدن ہند دونوں کتابیں مشہور ومقبول ہوچکی ہیں اور کسی مزید تعارف کی محتاج نہیں - عبارت رنگ آمیزی سے پاک ہے اور اس قدر مرغوب ودلنشیں ہے کہ اُن کی کتابوں پر ترجمہ کا وہم وگمان بھی نہیں ہوتا -

سرشار کا قلم ظرافت کے موتی ٹپکاتا ہوا چلتا ہے - اگرچہ فسانۂ آزاد پڑھنے کے بعد اُنکی ہر کتاب میں وہی طرزِ خاص پایا جاتا ہے تاہم جو کچھ لکھا ہے وہ اُنھیں کا حصہ تھا - قلم برداشتہ لکھنا

ہنسی کھیل نہیں ۔ اور اُنکی بہترین تصنیف یعنی فسانہ آزاد اسی تیز قلمی کا نتیجہ ہے ۔ خاص بات یہ ہے کہ طرز تحریر سے اُنکو کوئی شخص ہندو نہیں کہہ سکتا بلکہ لطف یہ ہے کہ اُنکے الفاظ اور اُنکی معلومات اُنکو مسلمان کہنے پر مجبور کرتی ہیں ۔

شرر کا طرز تحریر متانت آمیز ہے ۔ اُنکے ناول دلچسپ او نتیجہ خیز ہیں ۔ عبارت کا انداز علمی کتابوں کے لیے بھی موزوں ہے گر تاریخی ناول فرضی افسانے ہیں اور دو چار باتوں کے سوا، قصہ کی تمام جزئیات تاریخ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتیں ۔

ہر حال یہ مصنف اس درجہ اور اس پایہ کے ہیں کہ ہر زبان کے لیے مایۂ صد افتخار ہو سکتے ہیں ۔ انکی تصنیفات دوسری زبانوں کی تصنیفات کے مقابل پیش کی جا سکتی ہیں ۔ انکے کلام سے دوسری زبانوں کو مالا مال کیا جا سکتا ہے ۔

افسوس کہ اب اِن کا کوئی جانشین نظر نہیں آتا ۔ اگرچہ دُنیا رو بہ ترقی ہے اور ہم ہرگز مایوس نہیں کہ آیندہ زمانہ میں ایسے قابل اور لایق مصنف پیدا نہ ہونگے ۔ نہیں ضرور پیدا ہونگے اور خدا کرے کہ وہ اِن سے بھی بڑھ چڑھ کر ہوں ۔ لیکن فی الحال اُمید نہیں کہ ہماری زندگی میں کوئی ایسا عالی دماغ مصنف پیدا ہو جو اِن بزرگوں کی ہمسری کر سکے ۔ چوتھا دور ہماری آنکھوں کے سامنے ہے ۔ ترجمہ کو چھوڑ کر تالیفات و تصنیفات اگرچہ تعداد میں سیکڑوں ہوں لیکن مشکل سے دو چار کتابیں ایسی نکلیں گی جو اُردو لٹریچر میں داخل ہونے کی عزت حاصل کر سکیں

———— ::: ٭ ::: ————

اگرچہ اس دور میں صرف چیدہ چیدہ مصنفین کا ذکر خیر کیا گیا ہے لیکن اس زمانہ کی حسب ذیل کتب بھی قابل ذکر ہیں ۔ افسوس کہ ہندوستان بظاہر ان کتابوں کے وجود سے محروم ہے اور انڈیا آفس لائبریری لندن انکے موجود ہونے پر جس قدر فخر کرے وہ کم ہے ۔ ممکن ہے بعض اصحاب کے کتب خانوں کو یہ کتابیں زینت دے رہی ہوں اس لیے بادب التماس ہے کہ ناظرین اخترکو اِن کتابوں کے بعض بعض مقامات کی نقل اور مصنفین کے حالات جس قدر مل سکیں بھیجدیں تا آیندہ ایڈیشن میں اس کمی کو پورا کر دیا جائے ۔

فن زراعت:

۱- علم الفلاحت از رابرٹ اسکاٹ براون صفحات ۲۵۲، علی گڑھ ۱۸۶۵ء

۲- علم الفلاحت، میجر کار برٹ الہ آباد ۱۸۶۹ء - ۳ - تجربۂ ملح از غلام نبی میرٹھ ۱۸۶۵ء

کتب حکمت

۱- علم تعمیر کالی پرشاد اور سید علی ۱۸۶۳ء پٹنہ

جغرافیہ

۱- ترجمہ مراصد الاطلاع (عربی) در اُردو - عبد المومن ۶۲-۱۸۶۱ء پورٹ بلیر ۳ جلد

۲- مختصر بیان جغرافیۂ ہند - پنڈت چنتا منی، کانپور ۱۸۶۷ء

طبعیات

۱- دائرۂ علم (نیچرل فلاسفی) محمد کرم بخش لکھنؤ ۱۸۶۶ء

معاشیات

۱- اصول سیاست مدن، دھرم سبھا، علی گڑھ ۱۸۶۹ء

۲- علم انتظام مدن ترجمۂ انگریزی ناسو ولیم سینیر، علی گڑھ ۱۸۶۴ء

علم المعاشرت

۱- دستور عمل امورات شادی وغمی از چراغ شاہ ملتانی ۱۸۶۸ء

منطق

۱- میزان العلوم از سید عبد العلی پٹنہ ۱۸۶۹ء ۲- خلاصۃ المنطق، دیوی پرشاد بدایوں ۱۸۶۹ء

## از حالات آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں بہادر

لطیفہ - ایک شخص نے سر سید کو اس مضمون کا خط لکھا کہ "میں بہت کثیر العیال ہوں اور معاش کی طرف سے تنگ رہتا ہوں۔ آپ کسی ریاست میں یا سرکار انگریزی میں میری نوکری کے لیے سفارش کر دیجیے۔ میں نے انگریزی کی تعلیم تو نہیں پائی مگر عربی کی کتب درسیہ پڑھی ہیں۔ جو کام آپ میرے لایق سمجھیں اسکے واسطے سفارش کر دیں۔" سر سید نے اُنکو لکھ بھیجا کہ "میری عادت کسی کی سفارش کی نہیں ہے اور وجہ معاش کی تدبیر میرے نزدیک اس سے بہتر نہیں ہے کہ آپ میری تفسیر کا رد لکھ کر

چھپوائیں خدا چاہے تو خوب بکے گی اور آپ کو تنگی معاش کی شکایت نہیں رہیگی۔" غالباً یہی لطیفہ سُن کر مولانا حالی نے حسب ذیل قطعہ لکھا ہے :-

اک مولوی کہ تنگ بہت تھا معاش سے
برسوں رہا تلاش میں وجہِ معاش کی

وہ شہر شہر نوکری کی ٹوہ میں پھرا
لیکن نہ اُسکے ہاتھ کہیں نوکری لگی

اخبار بھی نکال کے بخت آزمائی کی
تدبیر یہ بھی اوسکی نہ تقدیر سے چلی

روزی کی خاطر اُس نے کیے سیکڑوں جتن
پر، کی کہیں نصیب نے اُسکے نہ یاوری

راہِ طلب میں جب ہوئی سرگشتگی بہت
اک خضر پے مجبہ نے کی آکے رہبری

جُھک کر کہا یہ کان میں اُسکے کہ آجکل
سنتا ہوں چھپ رہی ہے تصانیف احمدی

جا اور لفظ لفظ پہ اُسکے چھیڑ کر
تردید اسکی چھاپ دے جو ہو بُری بھلی

پھر دیکھنا کہ راس جیپٹ گرد وپیش سے
لگتی ہے کیسی آکے زر و سیم کی جھڑی

دنیا طلب کو چاہیے ابلہ فریب ہو
دنیا پہ جب تلک کہ مسلط ہے ابلہی

## ازحالات شمس العلما خان بہادر مولوی ذکاء اللہ خاں

تصانیف پر عام رائے

اگر چہ آپ کے مزاج میں مزاح تھا اور ظرافت بدرجۂ غایت تھی لیکن آپکی تصانیف میں یہ بات نہیں پائی جاتی - خشک اور فلسفیانہ خیالات بدرجۂ اتم موجود ہیں - اس میں شک نہیں کہ آپ نے انگریزی کتابوں سے خیالات کو ستعار لیکر اپنی زبان کے لباس میں جلوہ گر کیا ہے - مگر طرز ادا ضرور قابل تعریف ہے - بیشک آپ کی کتابیں سوکھی، پھیکی ہیں مگر اس قدر بدمزہ نہیں کہ اُن کا پڑھنا ناگوار ہو - معلومات کے ذخائر جا بجا پائے جاتے ہیں اور متین و سنجیدہ مطالعہ کے لیے نہایت ضروری ہیں - آجکل کے تعلیم یافتہ انگریزی خیالات کو اپنی زبان میں ادا کرتے ہیں تو عجیب و غریب ترکیبیں استعمال کرتے ہیں، جس سے اُن خیالات کی نُدرت اور اجنبیت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے - مولوی ذکاء اللہ کے طرز بیان میں یہ خوبی ہے کہ وہ ٹھیٹھ اُردو میں اپنے ذاتی خیالات معلوم ہوتے ہیں، ترجمہ یا ماخوذ نہیں معلوم ہوتے - بلا شبہ سرسید اس بارے میں مولوی صاحب سے

بہت آگے ہیں۔ اُنھوں نے جہاں انگریزی خیالات کو اپنی زبان کا جامہ پہنایا ہے، اُنکو ایسا آراستہ اور پیراستہ کرد کھایا ہے کہ خود اصلی خیالات میں اضافہ معلوم ہوتا ہے اور طرز بیان نہایت دلکش اور موثر ہو جاتا ہے۔ لیکن سرسید سے مولوی ذکاء اللہ کا موازنہ کرنا فضول ہے کیونکہ سید صاحب تیسرے دور کے امام ہیں اور کوئی مصنف اُنکے اندازِ تحریر کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور نہ کوئی اُنکے لگ بھگ ہے

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے　　　تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

کہا جا سکتا ہے کہ آزاد نے نیرنگ خیال میں انگریزی خیالات کو نہایت عمدگی سے اپنی زبان میں بیان کیا ہے۔ یہ سچ ہے۔ لیکن مولوی ذکاء اللہ کم سے کم الفاظ میں اظہارِ خیال کرتے ہیں اور آزاد کو ایک سطر کے مضمون کے لیے ایک صفحہ چاہیے۔ آزاد کی کتابیں ناول اور قصہ کا مزہ دیتی ہیں اور مولوی ذکاء اللہ کے یہاں ثقیل اور مقوی غذائیں ہیں، اگرچہ بعض انگریزی کھانوں کی طرح ہمیں پھیکی اور اُبلی ہوئی معلوم ہوتی ہوں۔ لہذا دونوں کا اندازِ تحریر جداگانہ ہے۔ اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں بکار اور ناگزیر ہیں۔

مولوی صاحب کی کتاب تاریخ ہندوستان کے اٹھارہ حصے تیرہ جلدوں میں مجلد ہیں۔ اور انکے سات ہزار ایک سو اُنہتر صفحات ہیں۔ تفصیل حسب ذیل ہے:-

| | صفحات |
|---|---|
| ہندوؤں کے عہدِ سلطنت کی تاریخ | ١١٠ |
| مسلمانوں کے عہدِ سلطنت کی تاریخ جلد اول لغایت دہم | ٥١٠١ |
| انگریزوں کے عہدِ سلطنت کی تاریخ جلد اول لغایت چہارم | ١٩٥٨ |
| میزان کل | ٧١٦٩ |

مولوی صاحب نے سوانح عمری ملکۂ معظمہ وکٹوریا بھی لکھی ہے جو نہایت دلچسپ ہے۔ اُس سے انگریزی پارلیمنٹ اور اُسکے وزراء کا حال بخوبی معلوم ہو جاتا ہے۔

آپ نے تاریخ ہندوستان میں اُن یوروپین مورخین کی پیروی نہیں کی جو اپنی ناواقفیت تعصب اور تنگ خیالی کی بنا پر واقعات کو خواہ مخواہ رنگ دیتے ہیں۔ آپ نے جس زمانہ کا حال لکھا ہے (کم از کم مسلمانوں کے عہدِ سلطنت کی بابت) اُسی زمانہ کے مورخین کی تاریخوں سے واقعات اخذ کیے ہیں اور اس طرح سے اُن تمام غلط خیالات کو دور کرنے کی کوشش کی ہے جو بوجہ لاعلمی یا کسی مقصدِ ذاتی

کی بنا پر جھوٹے حالات سچے واقعات کی صورت میں مشتہر کیے گئے ہیں۔

مولوی ذکاء اللہ کی تاریخ نویسی میں ایک نقص ہے۔ وہ یہ کہ آپ جا و بیجا انگریزوں کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ مورخ کا یہ کام ہے کہ واقعات کو اُنکے اصلی رنگ میں ظاہر کرے نہ یہ کہ اُن پر ملمع سازی کرے۔ جہاں تعریف کی ضرورت ہو بلا شبہہ بلا لحاظ لوم لائم مدح سرائی کرے لیکن جہاں مذمت کی ضرورت ہو' ضرور بُرے کاموں کی خواہ کسی سے صادر ہوے ہوں بُرائی کرے۔ اور اگر دونوں باتیں نہ کرے تو اپنی مسلے سے اجتناب کرے اور واقعات کی جانچ پڑتال کے بعد صحیح صحیح حالات لکھدے۔

لیکن یہ نا انصافی ہوگی اگر ہم مولوی ذکاء اللہ کی محنت اور تلاش کی داد نہ دیں۔ وہ جلد ہفتم ظفرنامہ شاہجہاں کو اس طرح شروع کرتے ہیں :۔

"میرا قاعدہ ہے کہ میں سلاطین ہند کی تاریخ نویسی کے لئے وہ تواریخ لیتا ہوں جنکے مؤلف عہد بعہد ہوں اور وہ سب سے زیادہ معتبر و مستند سمجھی جاتی ہوں۔ اُن سے تاریخی حالات اخذ کرکے لکھتا ہوں اور پھر انگریزی تاریخوں سے جن کا ایک انبار میرے پاس موجود ہے' بعض مضامین التقاط کرکے لکھتا ہوں۔ اس پادشاہ کے زمانہ میں اہل یورپ (فرانسیس' پرتگیز' انگریز' ڈچ) بہت ہندوستان میں آگئے تھے۔ ان میں سے بعض فرنگیوں نے اس زمانہ کی تاریخیں اپنی زبانوں میں تصنیف کیں' یا اُنکی تاریخوں سے بعض معاصرین نے جو ہندوستان میں نہیں آئے' مضامین استنباط کرکے اور بعض سُنی سُنائی باتوں کو تحقیق کرکے تاریخیں تالیف کیں۔ یورپ میں گو یہ قدیمی تاریخیں اپنے زمانہ میں شائقین تاریخ کے لئے ایک پُرلطف غذائے علمی تیار ہوئی' اُس زمانہ کے مورخوں نے اسکے بڑے مزے لیے مگر اب وہ غذا ایسی باسی اور ایسی ہوگئی ہے کہ کوئی مورخ جسکا مذاق تاریخ صحیح ہو اُسکو زبان پر نہیں رکھتا۔ گو وہ اس زمانہ میں اپنے پایۂ وقعت سے ساقط ہوگئی ہوں مگر اُنکے سبب سے جو اہل یورپ کے دل و دماغ میں غلط خیالات جم کر نقش[1] کالحجر ہوگئے ہیں وہ کسی طرح مٹانے سے نہیں مٹ سکتے۔ اگر کوئی فرنگی مورخ یا کوئی ہندوستانی مورخ خواہ کیسا ہی اپنے ملک کی تعریف میں

[1] مولوی صاحب کی اصل کتاب میں یہ فقرہ اسی طرح درج ہے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے غلط العام فصیح پر عمل کیا۔ تنہا

عالم فاضل ہو وہ اُس پر کزلک حک لگائے تو اہل فرنگ کے نزدیک جاہل بے فرنگ سمجھا جائے گا۔
میں نے ان تاریخوں کا کہیں کہیں ذکر کیا ہے اور انکی غلطیوں کو بیان کیا ہے“

**مولوی ذکاء اللہ، آزاد اور شبلی کا موازنہ**

پس مولوی صاحب نے تاریخی واقعات لکھنے میں بہت تجسس اور مطالعہ سے کام لیا ہے لیکن یورپین مورخین کی غلطیاں فاش کرنے میں انکو ہمیشہ یہ خوف رہا ہے کہ اہل فرنگ کے نزدیک ہم جاہل بے فرنگ نہ ہو جائیں لہذا وہ اُنکی غلطیاں ظاہر کرتے ہیں مگر دبی زبان سے - برخلاف اسکے، مولوی شبلی نعمانی کا ڈھنگ بالکل جداگانہ ہے - اُنھوں نے اورنگ زیب عالمگیر پر جو تاریخی مضامین لکھے اُن میں تمام حالات پوست کندہ بیان کیے اور اہل یورپ کی غلط فہمی، تعصب، تنگ خیالی اور ناواقفیت کو علی الاعلان ظاہر کیا - تاریخ کے دو بڑے اصول روایت و درایت لازم و ملزوم ہیں - روایت کے متعلق جس قدر اہتمام مسلمانوں نے کیا ہے اور جو قواعد اسکے مرتب کیے ہیں، اس قدر ترقی علوم و فنون کے بعد بھی اُن میں اضافہ تو کیا، اُنکی تقلید بھی دوسری اقوام سے کما حقہٗ نہیں ہو سکی - درایت کے متعلق، البتہ یوروپین اصحاب نے تخیل کے جولاں گاہ سے خوب مدد لی ہے اور تاریخ ہندوستان کے واقعات کو کچھ اس ملک کے رسم و رواج کی لاعلمی سے اور کچھ یہاں کے کینگر خانوں کے ثقہ راویوں کے سُنے سُنائے حالات سے غلط نتائج کا آماجگاہ بنایا ہے - اور اپنے ملکوں کے حالات سے اُن کا موازنہ کرکے خوب خوب نکتہ چینی کی ہے -

آزاد نے دربار اکبری دوسرے طرز پر لکھی ہے - اُس نے اکبر کی خوبیاں ظاہر کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا - بدقسمتی سے یوروپین اصحاب کا بھی یہی شیوہ رہا ہے کہ اکبر کی خوبیاں اور عالمگیر کی بُرائیاں ظاہر کریں اور اُنکی تاریخ نویسی کا یہی اصل اصول ہے تاکہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں نااتفاقی کا بیج ہمیشہ سرسبز و شاداب رہے - حقیقت یہ ہے کہ مسلمان من حیث القوم اکبر کی پالیسی اور اُسکی لا مذہبی کو نظر استحسان سے نہیں دیکھتے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو سلطنت مغلیہ کے زوال کا پیش خیمہ اکبر کی پالیسی تھی - اکبر نے راجپوتوں سے رشتے ناتے کرکے اُنکو اندر اور باہر سلطنت میں دخیل کر لیا - حالانکہ محکوم قوم کا تالیف قلوب کرنا کتنا ہی عمدہ اور قابل ستائش کیوں نہ ہو لیکن حاکم کو اپنی گردن اُسکے ہاتھ میں دیدینا موت اور زوال کی

نشانی ہے۔ اورنگ زیب نے سلطنت کو ان مہلک نتائج سے محفوظ رکھنے کی تدبیریں کیں اور اُس کا یہ فعل غیراقوام کی نظروں میں کانٹا سا کھٹکتا ہے۔ حالانکہ انگریزوں نے ہم بیچارے ہندوستانیوں کو باوجود دعوی تہذیب و ترقی آج بیسویں صدی میں بھی اُن حقوق کا عشر عشیر نہیں دیا جو عالمگیر کے زمانہ میں اہل ہنود کو حاصل تھے۔

لہذا آزاد کی جہاں یہ تعریف کی جا سکتی ہے کہ اُس نے اکبر کے زمانہ کی تاریخ کو صرف شاہی کارناموں تک محدود نہیں کیا ہے بلکہ اُس زمانہ کے رسم ورواج، طرز ماندوبود، ملک کی عام حالت، رعایا کی مرفہ الحالی اور دیگر خیالات کا نقشہ کھینچکر پڑھنے والوں کو یہ یقین دلایا ہے کہ وہ اُس زمانہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور اپنی آنکھوں سے تمام حالات مشاہدہ کر رہے ہیں، وہاں یہ بھی نقص ہے کہ اُس نے اکبر کے ہر فعل کو اچھا ہی اچھا کہا ہے۔ اپنی طرف سے وہ وہ توجیہات پیدا کی ہیں کہ باید وشاید۔ یہ کہنا آسان ہے کہ بادشاہ کو امور ملکی میں مذہب کو دخل نہ دینا چاہیے اور ہم کو اسکے ماننے میں تامل نہیں۔ لیکن کیا بادشاہ کو ایک بانی مذہب بھی ہونا چاہیے؟ اور باوجود ادعاء اسلام اُسکے لیے توہین مذہب جائز ہے؟ آزاد نے ان امور کو بھی سراہا ہے۔

مولوی ذکاء اللہ زبان اور الفاظ کی برجستگی کے لحاظ سے آزاد کا مقابلہ نہیں کر سکتے لیکن تاریخ نویسی کے اعتبار سے جسقدر غور اور تامل کے بعد صحیح نتائج پر پہونچنے کی، مولوی صاحب نے کوشش کی ہے۔ آزاد نے زیادہ تر دلچسپ بنانے میں وقت صرف کیا ہے۔

مولانا شبلی اس دور کے مصنفین میں زیادہ تر مورخ ہی کے نام سے مشہور ہیں اور اس میں شبہہ نہیں کہ اُنھوں نے اُن اسلامی معلومات کو جو عربی کی ناواقفیت کی بدولت ہماری دسترس سے باہر تھیں اپنی زبان میں نہایت عمدگی کے ساتھ جلوہ آرا کیا ہے۔ خلفائے راشدین، ائمہ معصومین اور اولیائے کرام سے جن کے حالاتِ زندگی نہ جاننا ہم مسلمانوں کے لیے باعث ننگ و شرم تھا، بڑی تحقیق و تدقیق اور محنت و تلاش کے بعد ہم کو واقف بنا دیا ہے۔ اور اُنکا مایۂ عمر اُنکی آخری کتاب سیرۃ النبی ہے۔ یہ فرض اُنھوں نے نہایت خوش سلیقگی سے ادا کیا ہے اور اُردو بولنے والے مسلمانوں پر جو اب تک ایک بارگراں چلا آتا تھا اُنھوں نے اپنی قادرالکلامی اور علمیت سے کام لیکر ہم سب مسلمانوں کو اُس سے سبکدوش کر دیا ہے۔

لیکن جس ملک میں ہم رہتے ہیں اور جسکے کارناموں کو جاننا بھی ہمارا فرض ہے اُسکی طرف مولوی ذکاءاللہ صاحب ہی نے توجہ فرمائی - اُردو زبان کے لحاظ سے مولوی ذکاءاللہ کی تاریخ ہندوستان اُن اقوام کے لیے جو ہندوستان سے تعلق رکھتی ہیں، دلچسپ اور ضروری ہے، اور مولوی شبلی کی تصانیف محض مسلمانوں کے لیے مفید اور دلکش ہوسکتی ہیں - اُردو زبان میں جو کمی مکمل تاریخ ہندوستان کے نہ ہونے سے تھی، وہ ہرگز المامون، الفاروق، سیرۃ النعمان اور دیگر کتب کے نہ ہونے سے نہ تھی - پس اس بارے میں مولوی ذکاءاللہ کی قلم فرسائی زیادہ قابلِ شکریہ اور لایق تحسین ہے -

فن تاریخ میں جو استدلال کا طریقہ مولانا شبلی کا ہے وہ ہرگز مولوی ذکاءاللہ کا نہیں ہے۔ مولانا شبلی، آزاد کی طرح الفاظ کی بھول بھلیاں میں نہیں پڑتے - اُنکے الفاظ بجائے خود موثر اور زوردار ہوتے ہیں، وہ اُنکو تشبیہات و استعارات سے دلچسپ نہیں بناتے - مولوی ذکاءاللہ الفاظ کی طرف بہت کم توجہ دیتے ہیں - جو اُس وقت قلم سے نکل گیا، وہی غالبًا کتاب کے طبع ہونے تک قائم رہا - دلائل پیش کرتے ہیں لیکن نہ اس طرح کہ پڑھنے والے کے دلنشیں ہوجائیں البتہ خفیف اثر ضرور چھوڑ جاتے ہیں - آزاد اپنی عبارت کی عمدگی سے پڑھنے والے کے دماغ کو معطل کردیتا ہے اور ایک ناول اور قصہ کی طرح اپنا ہم خیال بنا لیتا ہے - تاوقتیکہ پڑھنے والا واقف حالات و واقعات نہ ہو، بہت کم آزاد سے اختلاف کرتا ہے -

## از حالات شمس العلما مولوی محمد شبلی نعمانی

**تصنیفات و تالیفات پر عام رائے** | ایک نہایت تجربہ کار اور وسیع المعلومات جرمن مستشرق نے مولانا کی تصانیف کے متعلق رائے دی ہے - لہذا ہم اُسکو یہاں نقل کرتے ہیں :-

"علما اور مصنفین ہند میں مجھے چند باتوں کی خاص کمی محسوس ہوئی ہے - اوّل مادۂ تحقیق و تدقیق - دوم جانچ پڑتال - سوم جدت - چہارم استحکام رائے اور قوت استدلال - علما اور مصنفین ہند کا متخیلہ تو بیشک زیادہ ... ہے - لیکن اُن میں مبالغہ کی عادت ہے - انکی تاریخی حکایات اور جنگی افسانے مبالغہ اور متضاد خیالوں سے پُر ہیں - برخلاف اسکے اہل مغرب کے دماغ،

منطقی استدلال اور موزوں اور درست الفاظ استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ اہل مغرب کے محققانہ اور عالمانہ معیار کے لحاظ سے اگر کوئی ہندوستانی تصانیف تحقیق و تدقیق کا پایہ رکھتی ہیں تو وہ علامہ شبلی کی تصانیف ہیں۔ گویہ ایک گونہ اسلامی رنگ لیے ہوتی ہیں"۔

ہمارے نزدیک جرمن مستشرق کی رائے جہاں تک اُس کا تعلق مولانا شبلی کی ذات تک ہے درست ہے۔ لیکن اُسکی رائے کے بقیہ حصہ سے ہمیں اتفاق نہیں۔ اور ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس دَور کے مصنفین میں ایک یا دو کے سوا باقی تمام مصنفین اُن صفات سے جن کا ذکر جرمن مستشرق کرتا ہے متصف ہیں۔ ممکن ہے اور لوگ جن کو ہم نے اس دور کے مصنفین میں شامل نہیں کیا یا جنکا شمار ٹھیٹھ علماے اسلام کے زمرہ میں ہے ان صفات سے عاری ہوں لیکن تیسرے دَور کے مصنفین ہرگز اس الزام کے مورد نہیں ہوسکتے۔ آزاد کی کتابیں تحقیق و تدقیق، درایت اور جدت وغیرہ سے پُر ہیں۔ مولوی چراغ علی، سرسید اور مولانا حالی کی تصنیفات ان تمام خوبیوں سے بھری ہوئی ہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا شبلی کی تصانیف بلحاظ عالمانہ و محققانہ و فلسفیانہ استدلال و انداز کے کسی مستند یورپی تصنیف سے کم نہیں۔ آپ کی کتابوں کی سب سے بڑی خصوصیت فلسفیانہ تحقیق و تدقیق، مضبوطیِ رائے اور منطقی استدلال ہے۔ ان میں ایک قسم کی جدت بھی ہے اور طرزِ ادا میں دل آویزی اور عام فہمی کا خیال ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جو خصوصیتیں اوائل اسلام کے ائمہ و مجتہدین میں پائی جاتی تھیں اُن کی جھلک یہاں بھی نمودار ہے۔ عالمانہ عبور، غور و خوض کی قوت، تحقیق و تجسس، درایت، علمی جانچ پڑتال کی عادت، اپنی طبیعت سے کسی نتیجہ پر پہونچنا، پیچیدہ مسئلہ کو تیرہ و تاریک جھاڑیوں اور خارستان سے نکال کر سلجھانا اور پھر تقسیم و تحلیل کرنا، بعد ازاں اُسے ایسے طور سے ترتیب دینا کہ وہ شے اپنی اصلی حالت میں نظر آنے لگے۔ یہ وہ باتیں ہیں جو علامۂ شبلی کو درجۂ امتیاز بخشتی ہیں۔ اسی کے ساتھ علامۂ مرحوم میں ایک عجیب خوبی یہ ہے کہ قدیم و جدید میں ایسا پیوند لگاتے ہیں کہ مطلق اجنبیت باقی نہیں رہتی۔ معاملہ فہمی اور دوراندیشی بھی آپ کے خصائص میں سے ہے

آپکی تصانیف کے مطالعہ سے دنیاے اسلام کی وسعت و عظمت اور خوبیوں اور ترقیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ غیر اقوام پر انکے پڑھنے سے اسلام کی حقیقی عظمت اور خوبیاں منکشف

ہو جاتی ہیں - یہ کتابیں سہل پسندی، عام فہمی اور دلاویزی میں اپنی آپ نظیر ہیں - آپ کا مذاقِ علمی مختلف پہلو رکھتا ہے - ایک طرف تو آپ سخت فلسفیانہ اور محققانہ پہلو لیے ہوئے ہیں اور واقعاتِ تاریخی میں کسی قسم کی رنگ آمیزی آپ کو پسند نہیں - دوسری طرف آپ بجد نیچر پرست واقع ہوئے ہیں - آپ کی فارسی غزلیات سے جذباتِ لطیفہ، درد و عشق اور حُسن و جمال کا پتہ ملتا ہے۔

آپ پہلے شخص ہیں جس نے اپنی تصنیفات سے اس خیال کو دُور کر دیا کہ شاعر اور نثّار صرف دہلی اور لکھنؤ ہی کی سرزمین سے پیدا ہو سکتے ہیں - مولانا حالی پانی پت کے رہنے والے ہیں لیکن دہلی میں نشو و نما پائی ہے اس لیے آپ کے نام کے ساتھ بھی دہلی کا لفظ جزوِ لاینفک ہے - شیخ مصحفی امروہہ کے رہنے والے ہیں لیکن دہلی کے فیض یافتہ ہیں اور خود اِس بات پر نازاں ہیں چنانچہ فرماتے ہیں:-

دہلی نہیں دیکھی ہے زباں داں یہ کہاں ہیں

مولوی سید علی بلگرامی نواح لکھنؤ سے ہیں اور کھینچ تان کر وہ بھی لکھنوی ہو سکتے ہیں۔ لیکن مولانا شبلی کسی طرح دہلوی یا لکھنوی نہیں ہو سکتے - بایں ہمہ آپ کی زبان مستند ہے اور آپ اُردو زبان میں پایۂ اُستادی رکھتے ہیں -

---

# دل

ایامِ گل برفت و شد عہدِ شباب ہم　　داستان نامے و نوش سر آمد بروزگار
سرمایۂ نشاط چو ایّم رفت و ماند　　سرگشتۂ خار تمنّا دلِ فگار
نے نے، دلم کجاست؟ غلط گفتہ ام کہ ہست　　زیرا کہ ہستیش ببرم نیست آشکار
می ماند اگر بسینہ ام آں مونسِ قریں　　نے روزگار ریش ہمی رفت دنے بہار
داستانِ نامے و نوش کشیدے درازود یر　　ہرگز نمی گرفت بایں زود اختصار
تا مونس قدیم دلم از کنار رفت　　سید اظہر علی آزاد
دردا کہ سازِ عیش بروں ز اختیار رفت　　ایم اے ، ایم او - ایل الدہلی

# راماین کی تعلیم

الہ آباد یونیورسٹی کے بعض اسکولوں کے درجۂ ہشتم میں راماین کا انتخاب بہ زبانِ انگریزی پڑھایا جاتا ہے۔ یہ ایک انگریز کی تالیف ہے مگر زمانۂ حال کے مذاق میں نہیں ہے۔ راماین کے مافوق العادت واقعات اس میں بجنسہ درج ہیں۔ مثلاً راون کی سواری پر سری رام چندر جی نے ہوا میں اجودھیا تک سفر کیا۔ یہاں پر اگر لکھ دیا جاتا کہ غالباً ہوائی جہاز اُس وقت بھی ایجاد ہو چکا تھا تو مضمون بہت صاف ہو جاتا۔ اسی طرح ایک تیر کا گر کر سیکڑوں تیروں کا پیدا ہو جانا مہابھارت میں مذکور ہے۔ اسے یوں سمجھیں کہ بم کے گولے کے پھٹنے سے سیکڑوں مہلک آلات دشمنوں کی فوج میں پھیل جاتے تھے تو زمانۂ حال کے مطابق بات قابل فہم ہو جاتی ہے۔ اُس زمانہ میں بھی زمانۂ حال کی طرح سائنس کی شعبدہ بازیوں کا وجود ماننا طالب علموں کو سمجھانے کا اچھا ذریعہ ہے۔

راماین میں باپ کی اطاعت بھائی کی ہمدردی اور بی بی کی وفاداری کی بہترین صورت دکھائی گئی ہے۔ جہاں تک باپ کی اطاعت سے اسے تعلق ہے ہندوؤں کے تمدن کے لیے یہ نہایت ضروری شے ہے۔ منوجی کے قانون نے یہ تعلیم دی کہ بیٹے سن شعور کو پہونچیں تو بجبر وہ اپنے باپ کی جائداد چھین سکتے ہیں۔ یعنی بجبر اپنا حصہ بذریعہ تقسیم جدا کرا سکتے ہیں۔ یہ انوکھا قانون ہندوستان کے سوا اور کہیں کرۂ ارض پر نہ جاری تھا اور نہ اب جاری ہے۔ راماین کی تعلیم اگر مذہبی رنگ میں دلوں پر اپنا اثر نہ ڈالتی تو ہندوستان میں خانہ جنگیوں کی انتہا نہ رہتی۔ منوجی کا قانون جہاں جاری ہو وہاں راماین بھی ساتھ ساتھ نہ پڑھی جائے تو طبیعتیں اعتدال پر نہیں رہ سکتیں۔

خاندان مغلیہ میں عورتیں داخل حرم ہوئیں تو بادشاہ اپنے شاہزادوں سے برابر نالاں رہے۔ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، عالمگیر ان سب کے مقابلہ میں تقسیم سلطنت کے لیے لڑکوں نے علم بغاوت برابر بلند کیے یا بلند کرنے کی صورت پیدا کرتے رہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ ان لڑکوں میں ایرانی اور ہندوستانی دو نوں خونوں کا میل تھا۔ اس لیے نہ مسلمانوں کے قانون کا خیال رہا اور نہ ہندوؤں کی مذہبی تعلیم کا پورا اثر رہا۔ ماں کی طرف سے صرف شاستر کی یہ تعلیم ذہن میں تھی کہ لڑکا بالغ ہو تو باپ سے

جائداد تقسیم کرائے - اور باپ کے خون کا یہ اثر تھا کہ سری رام چندر کی سنت کو وہ واجب التعمیل نہ سمجھے - مسلمانوں کی تاریخ میں بیٹے کا باپ سے مخالف ہونا اگر کہیں ہے تو شاذ و نادر ہے - اور یہ سلسلۂ بغاوت جو باپ بیٹوں میں ڈیڑھ سو برس تک ہندوستان میں برابر قائم رہا آپ اپنی نظیر ہے - خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا، خلاصہ یہ ہے کہ منوجی کی شاستر جہاں سنائی جائے وہاں رامائن بھی ضرور سنائی جائے لیکن سوال یہ ہے کہ جب رامائن بطور ناٹک مذہبی میلوں میں برابر سنائی جاتی ہے تو کیا یہ ضرورت باقی ہے کہ وہ مدرسوں کے نصاب تعلیم میں بھی داخل کی جائے؟ ایک طرف لڑکوں کو سائنس، طبعیات، اور ریاضیات کی تعلیم دی جائے اور دوسری طرف رامائن کی مافوق العادۃ واقعات پڑھائے جائیں گے تو ان متضاد اور متناقض باتوں کے پڑھنے سے یا تو لڑکوں کے خیالات میں یکسوئی نہ ہوگی یا مذہب سے انھیں بے اعتنائی ہوگی - یہ دونوں صورتیں غیر مستحسن ہیں

اگر ہندوؤں کے نصاب تعلیم میں رامائن کا انتخاب جس طور سے کہ شایع ہوا ہے داخل ہو تو کسی غیر مذہب والے کو عذر کا موقع نہیں ہے، محض ہندوؤں کے سوچنے کی بات ہے کہ وہ زمانۂ موجودہ کا مذاق اپنے بچوں میں پیدا کرانا چاہتے ہیں یا اپنے بچوں کو اُس زمانہ کا سا بنانا چاہتے ہیں جب اسکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا - بہرحال عیسائیوں، پارسیوں اور مسلمانوں کو تو یہ کہنے کا حق ضرور ہے کہ اسکولوں میں اگر تعلیم اخلاق مذہبی کی کوئی کتاب داخل ہو تو اس میں صرف وہی باتیں درج ہوں جو ہندوستان کے تمام مذاہب میں جزو مشترک ہوں -

یہاں ایک بات اور بھی قابل ذکر ہے، اکبر کی پالیسی کا جہاں یہ مقتضا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی مناکحت جاری ہو وہاں مسلمانوں کو ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے پڑھنے کی رغبت بھی دلائی گئی تھی - جس طرح زمانۂ حال میں مناکحت کی آزادی کے خلاف قوم نے صدائے مخالفت بلند کی اور آزادیِ مناکحت کا بل پاس نہ ہونے دیا اسی طرح شاہجہاں نے کثرتِ رائے پر نظر کرکے ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی مناکحت کو روکا، لیکن مسلمانوں کو ہنود کے مذہبی مدرسوں میں تعلیم پانے سے اس نے باز نہیں رکھا - دارا شکوہ کا قیام گاہ جو اب پرانی عدالت کے نام سے بنارس میں مشہور ہے، شہادت اس امر کی ہے کہ دارا شکوہ نے اس میں مقیم ہوکر بنارس کے پنڈتوں سے ہنود کی مذہبی کتابیں پڑھی تھیں - عالمگیر نے جب مدرسوں کا انتظام کیا

تو مسلمانوں کو ہندوؤں کی مذہبی تعلیم گاہوں میں جانے سے روکا۔ اس پر لوگ عالمگیر کو متعصب کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ تعصب نہ تھا، زمانۂ موجودہ کے موافق نصاب تعلیم درست کرنے کا نتیجہ تھا۔ اور اُس وقت کے ہندوؤں کو جو دنیا کے لیے تعلیم دلوانا چاہتے تھے یہ بالکل ناپسند نہ تھا۔ آج ہندوؤں کی یونیورسٹی بنارس میں قائم ہے اور ہندو اُس کے مہتمم ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ وید مقدس، اُپنیشد، رامائن، اور مہابھارتھ یا دیگر علوم و فنون ہنود کی کتابیں وہاں کے انگلش ڈپارٹمنٹ کے کورس میں داخل نہیں ہیں۔ کیوں؟ محض اس لیے کہ لڑکوں کو زمانہ کے موافق بنانے کے لیے زمانہ کے موافق تعلیم دینا وہ مقدم سمجھتے ہیں۔ یہی کام عالمگیر نے کیا تو کیا بیجا کیا؟

ابو الفضل محمد احسان اللہ عباسی۔ گورکھپور

# تدلیسِ مُدَلِّل

خود را جائزہ بہ تدلیسِ مُدلّل کردہ — مردِ کامل بودہ فکرِ مکمّل کردہ
مرحبا اے شورِ طوفاں خیزیِ افلاسِ قوم — دین و ایماں غرقِ امواجِ تموّل کردہ
جوششِ سیلابِ سحر است آب تابِ حُسنِ تو — دلبرا چاہِ ذقن را چاہِ بابل کردہ
نطقِ گوہر بار شد یا از طلسم و شعبدہ — ابرنیساں را طرازِ فرشِ محفل کردہ
خوش سرائیدی تو قرآں را بلحنِ زر پرست — سامری را پیشِ گوسالہ مہلّل کردہ
مست می رقصند و می میرند رنداں ساقیا — تشنگاں را عرضۂ صہبائے مہمل کردہ

---

فتنۂ مکیال و میزان نعمتِ قومِ شعیب — قہرِ فی امو الِنا بر خلق نازل کردہ
کردہ تقلیدِ مغرب رفتہ را راہِ ہنود — لقمۂ پس خوردۂ یاراں تناول کردہ
شکرِ نعمت میکند طبلِ شکم از پُر خوری — ارزشِ حلوائے بیجا بر تعلّل کردہ
اجرتِ تسویۂ باطل حق تست اے خوشنویس — بر ملا بر رغمِ حق تائیدِ باطل کردہ
متہم فاروق را کردی بیاسے ربوا — یوسفے را از دہانِ گرگ بسمل کردہ

# دائرہ

(از مسٹر ایمرسن)

آنکھ پہلا دائرہ ہے، اس سے جو اُفق بنتا ہے وہ دوسرا دائرہ ہے، اور عالم فطرت میں اس ابتدائی شکل کی تکرار بلا اختتام کے جاری رہتی ہے۔ دنیا کے نقوش میں یہ سب سے قابلِ وقعت علامت ہے۔ سینٹ آگسٹائین نے اللہ عزوجل کی قدرت کو ایک دائرہ سے تشبیہ دی ہے جس کا مرکز ہر جگہ ہے اور جس کا محیط نامتناہی ہے۔ یہ جو اشکال میں سب سے اول ہے اس شکل کے وسیع ادراک کے متعلق ہم زندگی بھر پڑھتے چلے آئے ہیں۔ ہر انسانی فعل کو دائرہ فرض کرکے ہم ایک نتیجہ نکال چکے ہیں۔ اب دوسری تشبیہ قائم کرکے ہم یہ دریافت کریں گے کہ انسان کے ہر فعل میں یہ قابلیت موجود ہے کہ وہ اُسکے پہلے کام سے بڑھ جائے۔ ہماری زندگی صداقت کے لیے ایک قسم کی نوآموزی ہے وہ یہ کہ ہر دائرہ کے باہر ایک اور دائرہ بنایا جاسکتا ہے اور یہ کہ فطرت میں کوئی آخری سرا نہیں ہے بلکہ ہر آخر ایک آغاز ہے یعنی ہر دوپہر کے بعد ہمیشہ دوسری صبح طلوع ہوتی ہے اور ہر سمندر کی تہ میں ایک اور عمیق سمندر نکلتا ہے۔

یہ حقیقت ہر شعبہ میں انسانی قوت کے کام کرنے کی بہت اچھی مثال ہوسکتی ہے کیونکہ یہ حقیقت ایک حد تک ذات نامحدود کے اس وجود کا تصور پیش کرتی ہے جو کامل وبسیط ہے اور جس تک انسان کی دسترس ممکن نہیں اور جو ہر کوشش و کامیابی کی تحریک دلانے والی اور پھر ناکارہ ثابت کردینے والی بھی ہے۔

عالم فطرت میں کسی قسم کا ثبات نہیں ہے۔ عالم کائنات بالکل رفتنی و گذشتنی ہے۔ استقلال کی وقعت محض خیالی وقعت ہے۔ اللہ عزوجل کے نزدیک ہمارے کرہ کی حقیقت بہترین قانون کی سی ہے، واقعات کے مجموعہ کی سی نہیں ہے۔ ہماری تربیت کی بنا خیالات کے غلبہ پر منحصر ہے جو شہروں اور تعلیم گاہوں کو اپنے پیچھے کھینچے لیے چلا جارہا ہے۔ کسی خیال پر غور کرتے وقت اگر ہم دوسرے خیال پر غور کرنے لگیں تو پہلے خیالات غائب ہوجائیں گے۔ چنانچہ یونانیوں کا فن سنگ تراشی قطعی

معدوم ہوچکا ہے۔ اُسکی اب ایسی حالت ہوگئی ہے کہ گویا وہ برف کی موتیں تھیں، جنکی کہیں کہیں ایسی نشانیاں پائی جاتی ہیں جیسے کہ ہم جون یا جولائی کے مہینے میں، پہاڑوں اور گھاٹیوں میں برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو اِدھر اُدھر پڑا ہوا دیکھا کرتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ جس فراست نے جو باتیں اُنھیں سُوجھائی تھیں اب اُسی فراست نے دوسری باتیں ہمیں اور سُوجھا دی ہیں۔ یونانیوں کا علم و حکمت یہ سچ ہے کہ کچھ دنوں قائم رہا مگر اب اُس پر بھی وہی حکم لگایا جا سکتا ہے۔ اور ایسی خستہ حالت میں ہے جیسی نئے خیالات نے پُرانی چیزوں کی ابتر حالت کردی ہے۔ چنانچہ نئے براعظم پُرانی دُنیا کے کھنڈرات سے بنائے جا رہے ہیں، نئی نسلوں کا طرزِ عمل پُرانی نسلوں سے جداگانہ ہے۔ حق تو یہ ہے کہ نئے فنون پُرانے فنوں کو معدوم کردیا کرتے ہیں۔ پُرانے اعلیٰ درجہ کے پُلوں کو دیکھو، وہ پانی میں زور پیدا کرنے کی نئی ایجادات سے بیکار کردیے گئے ہیں، مستحکم قلعوں کی، بارود کی ایجاد سے کوئی حقیقت نہیں رہی۔ بادبانی کشتیوں کی بھاپ سے چلنے والی کشتیوں کے آگے، اور بھاپ سے چلنے والی کشتیوں کی بجلی کی ایجاد کے آگے کوئی وقعت نہیں رہی۔

تم اس سنگِ مرمر سے بنے ہوئے مضبوط مینار کی تعریف کرتے ہو جو مدتوں سے سردی اور گرمی کے موسموں کی سختیاں برداشت کرتا چلا آ رہا ہے۔ تاہم اس بلند مینار کو کسی کے کانپتے ہوئے ہاتھوں نے بنایا تھا اور حق تو یہ ہے کہ صانع، مصنوع سے ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔ جو شخص جو چیز بناتا ہے وہ اُسکو بہت جلد بگاڑ بھی سکتا ہے۔ وہ نظر نہ آنے والا خیال جو مینار کے بنانے کے لیے پیدا ہوا تھا حقیقت میں وہ ہاتھ سے زیادہ بہتر اور قابلِ وقعت تھا۔ اور اس طرح ہمیشہ ایک بھدّے نتیجے کے پیچھے ایک نازک سبب ہوا کرتا ہے جسکو اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ خود ایک اور نتیجہ کا زیادہ نازک سبب نظر آئے گا۔ جب تک کسی چیز کا راز نہ معلوم ہو اُس وقت تک وہ پائدار ہی معلوم ہوتی ہے عورتوں کو ایک زرخیز جائداد مستقل اور پائدار معلوم ہوا کرتی ہے، وہی جائداد ایک تاجر کو ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا وہ اینٹ اور چونے سے بنائی گئی ہے اور آسانی سے فنا ہو سکتی ہے۔ شہر کے رہنے والے کو ایک باغ کی اچھی پیداوار اُسکی اچھی زمینیں غرض یہ سب چیزیں ایسی زرخیز اور مستقل معلوم ہوا کرتی ہیں جیسی سونے کی کان یا مینا۔ مگر یہی چیزیں ایک کسان کو صرف پیداوار کے ذرائع معلوم ہوا کرتی ہیں۔ عالم کائنات ہمکو نمایاں طور پر مستقل اور باثبات معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں ہر چیز کی مانند ایسا معلوم ہونیکا ایک سبب بھی ہوتا ہے اور جب کبھی یہ بات میری سمجھ میں

آجائے تو پھر مجھے کیا یہ گمان بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کھیت ہمیشہ ایسے ہی سرسبز و شاداب رہیں گے؟ کیا پتوں کی یہ ہتات اسی طریقہ سے قائم رہے گی؟ حق تو یہ ہے کہ استقلال اور ثبات کی خیالی وقعت ہے ہر چیز اپنی اوسط پر قائم ہے۔ روحانی قوت کے سامنے چاند کی گنبد سے زیادہ وقعت نہیں ہے۔

کسی واقعہ کو ہر ختم کرنے والا واقعہ ایک نئے سلسلۂ واقعات کا آغاز ہوتا ہے۔ ہر عام قانون کسی زیادہ جامع اور بڑے قانون کی جو آیندہ جلد ظاہر ہو جائے گا محض ایک کڑی ہوتا ہے۔ ہمارے لیے کوئی بیرونی احاطہ کرنے والی دیوار نہیں ہے۔ انسان جب اپنا قصہ ختم کرتا ہے تو وہ کیسا اچھا، کیسا محیط ہوتا ہے اور وہ تمام واقعات کی صورت کیسے بدل دیتا ہے۔ پھر بھی وہ سارے منظر پر مختتم ہوتا ہے۔ لیکن کچھ دیر نہیں گذرتی کہ دوسری طرف ایک اور آدمی نمودار ہوتا ہے اور اس دائرہ کے اطراف ایک اور دائرہ بناتا ہے جسکو ہم ابھی دائرۂ نظر کی انتہا قرار دے چکے تھے۔ تب ہمارا پہلا قصہ گو محض متقدم رہ جاتا ہے اور انسان کا جامع و معنی خیز لفظ اسکے لیے صادق نہیں رہتا اور اب اسکی تلافی کی شکل صرف یہ رہ جاتی ہے کہ وہ اپنے حریف کے گرد ایک اور بڑا دائرہ بنا دے۔ اور حقیقت میں لوگ اسی طرح کرتے بھی رہتے ہیں۔ جو نتیجہ آج برآمد ہوا ہے اور دل و دماغ کو پریشان کر رہا ہے وہ کل ایک لفظ واحد میں کھنچ آئے گا اور وہ اصول جس سے آج معلوم ہوتا ہے کہ رموز فطرت حل ہو گئے کل وہ محض تعمیم کی ایک قابل تعریف مثال رہ جائے گا۔ آنے والے خیال میں ایک قوت ہوتی ہے جو صرف تمھارے ہی مذہب کو نہیں بلکہ تمام مذاہب حتیٰ کہ تمام قوموں کے علوم و فنون کو اُلٹ سکتی ہے اور پھر وہی قوت تمھیں ایسی جگہ کی سیر کرا سکتی ہے جسکو بڑے سے بڑے شاعر نے کبھی نہ خواب میں دیکھا ہوگا اور نہ اُسکو قلمبند کیا ہوگا۔ ہر شخص دنیا میں خود کاریگر نہیں ہوتا بلکہ وہ اس بات کا ایک اشارہ ہوتا ہے کہ اُسکو کس قسم کا آدمی ہونا چاہیے۔ اسی طرح موجودہ نسل سے آنے والی نسل کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

گفتگو حلقوں کے ایک کھیل کے مثل ہوتی ہے۔ خوشی کی مشترکہ زمین کی جو چاروں طرف حدود ہیں اُن کا اظہار گفتگو ہی میں ہوتا ہے۔ انسانوں کی جماعتیں جس جوش و خروش سے گفتگو میں حصہ لیتی ہیں اور جس خوشی و خرمی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہیں ان جماعتوں کی جانچ انکی گفتگو یا انکے خیالات سے نہیں ہو سکتی اس وجہ سے کہ کل وہ گفتگو کے اس بلند مقام سے

پیچھے ہٹ جائیں گی۔ پھر اسکے بعد تم انھیں دیکھوگے کہ وہ اپنی پرانی روش پر آجائیں گی۔تاہم جو خیال ہمارے دل میں پیدا ہوتا ہے اس سے ہمیں ضرور محظوظ ہولینا چاہیئے۔ جب کوئی نیا مقرر کسی خیال میں کوئی نئی بات پیدا کرتا ہے تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس سے پہلے والے مقرر کی گفتگو کی الجھنوں سے آزاد ہوگئے۔ یہ مقرر کوئی نئی بات اس لیے پیدا کرتا ہے کہ اپنے خیال کی بلندی میں ازسرنو ہمیں الجھادے۔ پھر اس خیال کی بنا پر ہم اس دوسرے نجات دہندہ کے ممنون ہوتے ہیں۔ پھر اسکے بعد ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہم حق پر آگئے ہیں اور انسانوں میں ہمارا شمار ہونے لگاہے۔ ہر صداقت کے اظہار میں، ہر زمانہ میں جیسی جیسی گہری سچائیاں و مکمل کرنے والی صداقتیں پائی جاتی ہیں ان کا کیا کہنا ہے۔ عام طور پر سوسائٹی حالت جمود و غفلت میں رہتی ہے۔ ہم خالی الذہن ہوکر اس بات کے انتظار میں رہتے ہیں کہ شاید ہم میں اچھے خیالات پیدا ہوجائیں۔ مگر حق تو یہ ہے کہ ہم قابل قدر خیالات سے گھرے ہوے رہتے ہیں۔ اگرچہ ہم انکو ایسا نہیں سمجھتے بلکہ انکو مذاق یا دلگی کی باتیں سمجھا کرتے ہیں۔ اس حالت جمود میں ایک باخدا شخص پیدا ہوتا ہے اور ان بیخبر آدمیوں کو بیدار کردیتا ہے اور اپنی نگاہ سے اس پردہ کو جلا کر خاک کردیتا ہے جو تمام چیزوں پر پڑا ہوا تھا اور پھر تمام نمایشی چیزوں مثلاً پیالے، تشتری، کرسی، گھڑی وغیرہ کی حقیقت ظاہر ہوجاتی ہے۔ وہ باتیں جو کل ہمیں بڑی باوقعت معلوم ہو رہی تھیں مثلاً جائداد، آب وہوا، اولاد، ذاتی حسن و جمال غرض اسی طرح کی اور بہت سی چیزیں۔ ان تمام چیزوں کی عجیب و غریب طریقہ سے ہیئت بدل جاتی ہے۔ جن چیزوں کو ہم پائدار سمجھے ہوے تھے وہ متزلزل اور منتشر ہوجاتی ہیں اور علوم و فنون، شہر، آب وہوا، مذاہب وغیرہ اپنی بنیاد چھوڑ دیتے ہیں اور تمھاری آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتے ہیں۔ پھر ان تمام چیزوں کے متعلق لوگ بہت احتیاط سے کام لیا کرتے ہیں۔ بحث و مباحثہ کرنا یقینی اچھا ہے مگر اس سے زیادہ خاموشی بہتر ثابت ہوتی ہے اس وجہ سے کہ بعض وقت وہ اسے محجوب کردیا کرتی ہے۔ گفتگو کی درازی گفتگو کرنے اور سننے والے کے درمیان خیالات کا فرق ظاہر کرتی ہے۔ اگر سننے والا کسی بات کو پہلے سے سمجھے ہوے ہوتا تو اسکے لیے الفاظ کی ضرورت نہ ہوتی اور اگر وہ ہر اعتبار سے ہم خیال ہوتے تو پھر الفاظ کو تکلیف دینے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی۔

محمد نجم الغنی قریشی
دارالترجمہ۔ حیدرآباد دکن

# بیرن کا کمرہ

میڈم ہلینا پٹرو ونا بلا وٹسکائی بہت سے فنوں میں طاق اور ہمہ صفت موصوف تھی اور ایسی عجیب و غریب شخصیت تھی کہ میری زندگی میں کبھی نظر سے نہیں گذری۔ اُسکے مُرید فطرةً وطبعاً اُسے علوم باطن کی زبردست اُستاد تصور کرتے ہیں جس کا ہم پر بہت بڑا احسان ہے لیکن ہم لوگوں کے نزدیک جنھیں اس سے مادی وجسمانی حالت میں واقف ہونے کا فخر حاصل ہے اسکی حیثیت اس سے کہیں زیادہ ہے اور ہمارے دلوں میں اسکی تصویریں مختلف اور بہت سے امور سرانجام دیتی ہوئی موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ان شاذ و نادر موقعوں پر جب اُسے اپنی قدرت کا کمال دکھانا منظور ہوتا تھا وہ پیانو ساحرانہ دلکش پیرایہ سے بجاتی تھی۔ اگرچہ اُسے تکلفات سے نفرت تھی اور اکثر انھیں توڑنے کے لیے غیر ضروری طور پر بیجا حرکتیں کر بیٹھتی تھی (یا ہمیں اُن دنوں ایسا ہی معلوم ہوتا تھا) لیکن جب وہ کوئی کام کرنا چاہتی تو آداب مطلق العنانی سے اُسے کرکے رہتی۔ اُسکی نظیر میری نظر سے نہیں گذری۔ ہر قسم کے مضمون پر وہ ندرت آمیز فصاحت و بلاغت کا ثبوت دیتی تھی لیکن سب سے زیادہ جس چیز پر اُسے قدرت حاصل تھی وہ علوم باطنی کی دُنیا تھی۔ اُس کا طرز بیان ظریفانہ اور حیرت انگیز تھا لیکن جب وہ کسی روح کی کہانی بیان کرتی غضب کر جاتی تھی۔

جب میں ۱۸۸۴ء میں مصر سے ہندوستان آتے ہوئے جہاز نیوریو میں اس کا ہمسفر تھا میں اُن شاموں کو بالکل فراموش نہیں کر سکتا جب ہم اُس سے کہانیاں سُنا کرتے تھے۔ ہمارے ہمسفروں کی مختلف الاقسام والالوان جماعت میں مذہبی عنصر زیادہ تھا اور ان حاملان دین میں سے بعض باطل مطلق اور تُندخو و آشفتہ مزاج تھے جنکی اس زمانہ کے مقابلہ میں اُن دنوں بہت کثرت تھی۔ تو تو میں میں اکثر ہو جاتی تھی اور ہمیں بڑا لطف دیتی تھی۔ کیونکہ میڈم بلا وٹسکائی ان خودساختہ مفتیانِ ملت کی نسبت عیسائی مقدس کتابوں اور عقائد کو کہیں زیادہ جانتی تھی۔ لیکن جب وہ کھانا کھانے کے بعد شام کو بھوتوں کی کہانیاں سُنانے لگتی اُسوقت مُنکر سے مُنکر پادری بھی اُسکی سحر بیانی کے سامنے سربسجود ہو جاتا تھا۔ وہ اپنے سامعین کو مبہوت رکھتی تھی، کسی ساز کی طرح یہ لوگ اُسکی

مُٹھی میں ہوتے تھے اور وہ جب چاہتی اُنکے رونگٹے کھڑے کر دیتی - میں نے بارہا دیکھا کہ جب اُسکی کوئی کہانی ختم ہوتی لوگ اِدھر اُدھر چلنے پھرنے کے وقت کئی کئی اکٹھے ہو کے نکلنے کی احتیاط برتتے اور ایک لمحہ کے لیے بھی تنہا رہنے سے احتراز کرتے تھے !

ان حالات میں ہم نے اُس سے "گونجوں کا غار" "مسحور زندگی" اور کئی کہانیاں سنیں جنکو جس کا جی چاہے اُسکی کتاب رات کی وحشت انگیز کہانیاں" میں پڑھ سکتے ہیں - مجھے ایک دلکش کہانی یاد ہے جو اس مجموعہ میں شائع نہیں ہوئی - اگر میں اُس طرز کی جس میں اُس نے اسے ہمیں سُنایا کچھ بھی نقل کر سکوں تو میرے ناظرین کو شاید اُس کیفیت کا احساس ہو سکے جو ہماری کہانی سنتے وقت تھی - لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ میری قدرت سے باہر ہے - میں نے اسے ایک مرتبہ اپنی ایک دوست کو جو ایک مشہور ناول نویسیہ ہے حتی الامکان عمدہ پیرایہ میں سُنایا - اسنے اس میں خوب نمک مرچ لگایا اور اُسے زیادہ موثر اور دلکش بنانے کے لیے بعض تفصیلات میں تغیر و تبدل بھی کیا اور بہت کچھ دلفریبی اور معنی آفرینی بھی دکھائی لیکن اس بہترین نگارش میں بھی وہ ساحرانہ دلآویزی نہیں آئی جو میڈم بلاوٹسکائی کی جادو بیانی سے اُسکو نصیب ہوئی تھی - اس فسانہ نگار کے برابر بھی مجھ میں بیان کرنے کی طاقت نہیں - لیکن جو کچھ بھی ہو میں ہمت کروں گا اور جس طرح میڈم مذکور نے اُسکو بیان کیا اسکی اصلی کیفیت کو جہاں تک مجھے یاد ہے حتی الامکان ضبط تحریر میں لانے کی کوشش کروں گا -

✢ ✢ ✢ ✢ ✢ ✢ ✢ ✢ ✢ ✢

دو نوجوان (جنھیں ہم چارلس اور ہنری کے نام سے یاد کریں گے) فرانس کی نظر فریب سرزمین کے ایک نہایت ہی دلکش و خوشنما علاقہ میں سیر کرتے پھر رہے تھے - ایک روز شام کے قریب ہونے پر وہ ایک خوبصورت چھوٹے سے قصبہ کے سامنے جا نکلے جو ایک الگ تھلگ وادی میں بسا ہوا تھا - اسکی سرائیں، دوکانیں اور چھوٹے مکانات ایک چھوٹے سے چشمہ کے ادرگرد جھرمٹ لگائے ہوئے تھے اور اسکے مقتدر باشندوں کے بڑے مکانات اسکی احاطہ کرنے والی پہاڑیوں کے معمولی نشیبوں میں واقع تھے - دونوں دوست اس مقام کی نمایاں سرائے میں رات گزارنا چاہتے تھے - اور ان میں سے ایک موسیو چارلس کا قصبہ کے بیرونی حصہ میں ایک واقف رہتا

جس سے وہ ملنا بھی چاہتا تھا۔

گاؤں کی طرف سڑک کا ڈھلاؤ شروع ہوتے ہی ایک پُرانا مکان جو خاص طور سے خوشنما نظر آتا تھا دکھائی دینے لگا۔ یہ عشق پیچہ اور اسی قسم کی بیلوں سے قریب قریب ڈھکا ہوا تھا اور سڑک سے کچھ فاصلہ پر پیچھے کی طرف واقع تھا۔ مکان اور اُسکے وسیع میدان سے ہر جگہ غفلت ٹپک رہی تھی جس سے صاف صاف معلوم ہوتا تھا کہ مکان غیر آباد ہے اور یہ حقیقت بھی ظاہر ہوتی تھی کہ مدتوں سے خالی پڑا ہے۔ دونوں دوست اُسکی بیرونی صورت اور اُسکی جلت وقوع کی رعنائی سے بہت متاثر ہوئے اور ہنری جو پُرانی وضع قطع کے سامان کے جمع کرنے کا بڑا ہی شائق تھا فوراً اُن گوہرہائے مقصود کے متعلق جو وہاں پوشیدہ ہوں گے خیالی پلاؤ پکانے لگا۔ چونکہ جگہ بظاہر غیر آباد تھی یہ فطرتی امر تھا کہ اُنھیں یہ خیال آئے کہ شاید وہ اسکے محافظ کو اُنھیں اسپر ایک نظر ڈالنے کے لیے آمادہ کر سکیں۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے قدموں کا رُخ ایک کُٹیا کی طرف کر دیا۔ جس سے بھی اگرچہ عام غفلت کا اظہار ہوتا تھا اور اردگرد تر و تازہ اور عمدہ نباتات کثرت سے اُگی ہوئی تھی تاہم آباد معلوم ہوتی تھی۔

اُنکی دستک کے جواب میں ایک بہت بُڈھا آدمی دروازہ پر آیا۔ اُنھوں نے اس مکان کے دیکھنے کی اجازت مانگی، لیکن بُڈھے نے خوش اخلاقی سے افسوس ظاہر کرتے ہوئے اُنھیں جواب دیا کہ اسکی اجازت نہیں ہے۔ وہ اس بُڈھے محافظ سے باتیں کرنے لگے جسکی صورت سے اُس آدمی کی سی کیفیت ظاہر ہوتی تھی جو تنہا رہتا ہو اور کسی اپنے آدمزاد بھائی سے باتیں کرنے کا موقع ملنے سے خوش ہو۔ ہنری فوراً ساز و سامان کے متعلق دریافت کرنے لگا۔ اور جب اُسے معلوم ہوا کہ یہ پُرانا اور بہت پُرانا ہے اور ہر چیز بے چھوئی اُسی طرح رکھی ہے جیسے بہت سال ہوئے یہ مکان آباد تھا اُسکے دل میں اسکے دیکھنے کی ناقابلِ ضبط آرزو پیدا ہوئی۔ اور اُس نے بڈھے سے حتی الامکان ملائمت سے کنایۃً کہا کہ اس عزت افزائی کے لیے میں ایک معقول نذر دینے کو طیار ہوں۔ لیکن بڈھے نے صرف یہ جواب دیا کہ نہیں موسیو! مجھے افسوس ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ میں آپ کی فیاضی سے فائدہ اُٹھانے پر خوب خوش ہوتا۔ کیونکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں غریب آدمی ہوں اور زمانہ میرے اوپر تنگ ہے۔ لیکن یہ تو بالکل ناممکن ہے۔

**ہنری**۔ "لیکن آخر یہ ناممکن کیوں ہے؟ یہ جگہ برسوں سے غیر آباد معلوم ہوتی ہے۔ سڑک سے فاصلہ میں واقع ہے، کوئی یہاں سے گزر نہیں رہا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ آپ ہمیں کمروں کی سیر کرنے کی اجازت دے کے ہمیں ممنون کیوں نہیں کرتے اور ساتھ ہی ساتھ خود بھی فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے؟"

**بڈھا**۔ "افسوس! موسیو۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں۔ مالک یا کارندہ کا اس میں کوئی سوال نہیں ہے جیسا کہ آپ کا خیال ہے کہ انھیں اسکی ہرگز خبر نہ ہوگی۔ بلکہ اس سے کہیں بڑھ چڑھ کے بات ہے۔ اس سے کہیں بدتر بات۔ واقعی میں اسکی جرأت نہیں کر سکتا۔"

اس موقعہ پر اسرار کی بو پاکے دونوں دوستوں نے بڈھے سے اصرار کرنا شروع کیا کہ وہ اسکی اصلی وجہ بتائے اور بالآخر بڑی مشکل اور منت سماجت سے اس سے اتنا قبلوا سکے کہ "مکان بہت بدنام ہے اور اس میں ہولناک واقعے ہو چکے ہیں اور کم از کم بیس سال سے کوئی شخص اس میں داخل نہیں ہوا بجز لمبے لمبے وقفوں کے جب کارندہ آکے اس کا ایک طرح کا معائنہ کر جاتا ہے۔"

اگر ہنری پرانے ساز و سامان کا دیوانہ تھا تو اسے روحانی معاملات سے بھی خاص طور پر دلچسپی تھی۔ فوراً اسے اس میں کسی دلچسپ کہانی کا امکان نظر آیا۔ چنانچہ اس نے دریافت کیا۔ "آپ کہتے ہیں کہ مکان کا نام نکلا ہوا ہے، تو کیا اس سے آپ کی مراد یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا آسیب ہے؟"

**بڈھا**۔ "افسوس! ہاں موسیو۔ لیکن یہ محض افواہ ہی افواہ نہیں ہے۔ اس میں تھوڑی بہت صداقت ہے۔"

اس میں شک نہیں اسکے بعد ہمارے دوستوں کو اس وقت تک کل نہیں پڑی جب تک انھوں نے سارا قصہ نہ سن لیا اگرچہ بڑی مشکلوں سے بڈھے کو اسپر آمادہ کر سکے جو اس کا ذکر کرنے سے بہت ہی گریز کر رہا تھا اور کہانی بیان کرتے ہوئے کچھ کا کچھ کہہ جاتا تھا۔ یہ ایک سیدھی سی بات تھی۔ آخری مالک کی زندگی نابکاری اور معصیت میں گزری تھی۔ جسے رندانہ عیش و عشرت اور بدمستی کی زندگی بسر کرنے، بیرحمی، خود غرضی اور شہوت پرستی کا شیطان مجسم ہونے کی شہرت حاصل تھی۔ بڈھے کو تفصیلات معلوم نہ تھیں۔ لیکن کسی نہ کسی طرح بیرن کے گناہ اسکے آگے آئے اور اسکے حالات نے اس کا ایسا ناک میں دم کیا کہ اسے خودکشی کرنے سے نجات ملی (یا اسکے خیال میں

اُسے چھٹکارا ہو گیا) وہ ایک روز شام کے وقت بالکل خلاف توقع پیرس سے وہاں آیا اور صبح کو اپنی بڑی کرسی میں بیٹھا ہوا اور گلا کٹا ہوا ملا۔

بڈھے نے بتایا کہ اسکے بعد کسی قسم کا بُرا اثر اس میں ظاہر ہوا اور طرح طرح کی ہیبت کہانیاں پھیلنے لگیں۔ اُسے انکی اصلیت کا کچھ پتہ نہیں۔ انکو بہت برس گزرے اور وہ اصل میں اسکی سمجھ میں بھی نہیں آئیں۔ اسکے خیال میں کچھ مقدمہ بازی ہوئی اور خاندان کی ساری دولت کسی طرح منقسم ہوگئی اور مکان اس خاندان کی ایک بعید شاخ میں جا پہونچا۔ بیرن کے مرنے کے بہت برس بعد مقدمہ بازی ختم ہوئی اور نئے مالک کا قبضہ ہو گیا۔ اُس وقت تک کسی نے بھی مکان کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔ نئے مالک کے معائنہ کے لیے اسے چھوڑ دیا گیا۔ مالیوں کی ایک جماعت یہاں بھیجی گئی جنھوں نے زمینیں درست اور ہموار کردیں۔ نیا آقا اپنی بیوی اور چند ملازموں کے ہمراہ آیا۔ لیکن مکان میں ایک ہی رات رہ کے وہ یہ کہتے ہوئے پیرس چلے گئے کہ دنیا کی کوئی چیز اُنھیں اس مکان میں پھر آنے کی ترغیب نہیں دے سکتی۔

ہنری نے اشتیاق سے پوچھا "اُنھیں کیا پیش آیا، اُنھوں نے کیا دیکھا؟"

بڈھا: "جناب اسکی مجھے خبر نہیں۔ بہت سی کہانیاں ہیں لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ کونسی درست ہے۔ اسکے بعد مالکوں نے اُسے کرایہ پر دینے کی کوشش کی۔ دو مرتبہ کرایہ دار آئے لیکن کوئی ایک رات سے زیادہ نہیں ٹھہرا۔ دوسرے کے ساتھ تو بڑا ہی ماجرا پیش آیا۔ اُس خاندان کی ایک عورت اسقدر ڈری کہ اُس پر دوروں کا ایک سلسلہ پڑ گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ بعد میں وہ پاگل ہو کے مر گئی۔ اسکے بعد اس جگہ کو کرایہ پر دینے کی پھر کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ لیکن چار موقعوں پر اجنبی، مالک کی چیٹھی کے ساتھ یہاں آئے جس میں اُنھیں مکان میں سو رہنے کی اجازت دی گئی تھی اور ہر صورت میں ہیبتناک بُرا نتیجہ دیکھا گیا۔ ان میں سے ایک نے موسیو بیرن کی طرح اپنا گلا کاٹ لیا۔ دوسرا تشنج کی حالت میں مردہ ملا۔ اور باقی دو خوف و دہشت سے پاگل ہوگئے۔ اس طرح اس جگہ کی شہرت بُری ہوتی چلی گئی ہے"

ہنری "میرے اچھے دوست! تم ذرا اِدھر دیکھو اور جو میں کہوں اُسے غور سے سُنو۔ میں نے تم سے کہا ہے کہ مجھے پُرانے سامان کا شوق ہے اور میں تمھیں اس کوٹھی کی سیر کر لینے کی

اجازت دینے پر ایک پنولین (ایک طلائی سکہ جو ۱۶ شلنگ ۱ ½ پنس کے برابر ہوتا ہے - محمد ظفر) دینے کو طیار رہوں - لیکن آسیب والے گھروں کا مجھے اُس سے سینکڑوں گنا زیادہ شوق ہے۔ اور تم نے جو کچھ بیان کیا اُس سے میرا مصمم ارادہ ہوگیا ہے کہ میں ایک رات یہاں گزاروں - اگر تم مجھے اسکی اجازت دو تو میں تم کو سَو فرینک (ایک نقرئی سکہ جو ۹ ½ پنس کے برابر ہوتا ہے - محمد ظفر) دوں گا۔"

**بڈھا۔** "حضرت بات یہ ہے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ ہے ہی ناممکن - آپ بیشک ضرور مرجائیں گے - اور میں آپ کا قاتل ہوں گا - کاش میں آپ کے کام آسکتا لیکن اسکے متعلق مجھ سے پوچھنا فضول ہے۔"

لیکن اس رد و قدح نے ہنری کا اصرار بڑھا دیا اور ارادہ پختہ کردیا - اور وہ برابر اپنی پیش کردہ رقم بڑھانے اور بڈھے کو یقین دلانے لگا کہ کچھ بھی پیش آئے وہ بالکل بچیلا ہوگا - اور اگر وہ پسند کرے تو وہ اپنی کُٹیا کا دروازہ بند کرکے اندر بیٹھ رہے اور اس معاملہ میں اس سے زیادہ حصہ نہ لے کہ دروازہ کھلا چھوڑ دے۔ محافظ عجب تذبذب کی بے چینی میں تھا - جو زبردست رشوت اُسے پیش کی گئی بیشک اسکے لیے نعمت عظمیٰ تھی اور اس سے بھی زیادہ اُس کا مشفقانہ فرانسیسی اخلاق اُسے اس بات کی اجازت نہ دیتا تھا کہ وہ اس منت سماجت کرنیوالے اجنبی کا دل توڑے جس نے بظاہر اس تجربہ کو کرنے کی ٹھان لی تھی - باینہمہ اس کا ضعیف الاعتقادانہ خوف اسکے لالچ سے بہت زیادہ تھا اور گھنٹہ بھر کے قریب حیص بیص کرنے کے بعد اُنھوں نے اُسے منا لیا اور اُس نے آبدیدہ ہوکے اُنھیں بیدلی سے اجازت دیدی۔

وہ اب دن کی روشنی میں اُنھیں مکان کے اندر لیجانے اور بیرن کا آسیب زدہ کمرہ دکھانے پر رضامند ہوگیا تاکہ جب وہ رات کو آئیں کیونکہ اُنھیں رات کو آنا ضرور تھا (اور وہ مایوسی سے اپنے ہاتھ ملنے لگا) اُسکے دروازہ پر آواز دینے سے وہ باہر نکل کے تالی اُنکے حوالہ کردیگا لیکن وہ اُس سے ہرگز اسکی توقع نہ کریں کہ وہ اپنی دہلیز سے باہر آئے یا اس آسیب زدہ عمارت کے قریب جائے - اس حالت میں بھی وہ باربار کہتا تھا کہ میں ہرطرح کی ذمہ داری سے بری ہوں - آپ کی موت یقینی ہے اور میں صرف آپ کی روحوں کے لیے جناب باری میں دعا کرسکتا ہوں -

وہ اُس سے کھلکھلا کے بولے اور اسکے کندھے کو ٹھونکا اور یقین دلایا کہ اگلے روز صبح کو ہم تمہارے ساتھ شراب کی بوتل پییں گے اور تمہارے اس دھڑکے اور وہم پر خوب ہنسیں گے لیکن ان تمام باتوں کے کہنے سے بھی وہ اسکے دل کو اُنکی فوری ہلاکت کے اندوہگیں تیقن سے ذرا بھی متزلزل نہ کر سکے۔ اُس نے مکان کے اوپر کی منزل دکھائی جسکے حیرت انگیز قدیم ساز و سامان کے شاندار نمونوں سے ہنری مارے خوشی کے بیتاب ہوا جاتا تھا۔ اُس نے گول کمرہ میں بیرن کی تصویر انھیں دکھائی۔ اُس نے نیچے کی منزل میں ایک لمبا کمرہ دکھایا جو بیرن کا خاص مطالعہ کا کمرہ تھا۔ اور وہ کرسی بھی دکھائی جس میں بیٹھ کر اُس نے خودکُشی کی تھی۔ رخصت ہونے سے پہلے ہنری نے موعودہ رقم زبردستی اُسکے حوالہ کی جو اُس نے اپنی سخت ضروریات کے باوجود کھلی بیدلی سے یہ کہتے ہوئے لی کہ حضرات۔ میرے لیے یہ بڑی نعمت ہے، پھر بھی میرا دل کہتا ہے کہ نہ لوں، کیونکہ مجھے یقین ہے کہ یہ آپ کی جانوں کی قیمت ہے۔ اور کسے معلوم ہے کہ یہ آپ کی غیرفانی روحوں کی بھی قیمت ہو۔ موسیو بیرن بُرے قماش کا آدمی تھا۔ کوئی کیا کہہ سکتا ہے کہ اسکی بھینٹ چڑھنے والوں کو کیا پیش آئے گا؟

چنانچہ وہ اُس سے رخصت ہوئے۔ اپنی طبیعت پر جبر کرنے کے باوجود اُنکے دلوں پر اسکی غیرمتزلزل افسردگی اور مایوسانہ انداز کا خاص اثر تھا۔ گو وہ اُس سامنے آنے والے جان جوکھوں کے کام کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے آپس میں اس بات پر ہنستے تھے۔ اُنھوں نے اُس چھوٹے سے خوشنما قصبہ کا راستہ لیا اور اُس بارونق چھوٹی سرائے میں جو ناشتہ اُنھیں میسر آسکا بیٹھ کے وہ اُس سے تازہ دم ہوئے۔ اُنھوں نے رات کے ساڑھے دس بجے اس آسیب زدہ مکان پر پہونچ جانے کا وقت مقرر کیا اور اس وقت مشکل سے چھ بجے تھے۔

ہم یہ ذکر کرچکے ہیں کہ چارلس کے اس نواح میں چند دوست تھے جنسے وہ ملنا چاہتا تھا۔ اُس نے پہاڑی سے شہر کے اندر اُترتے ہوئے ہنری کو اُنکے گھر اشارہ سے بتا دیے تھے ہنری اُن دوستوں سے واقف نہ تھا۔ اور چونکہ اُسے چند ضروری خطوط لکھنے تھے اس لیے اُس نے ملاقات کے لیے چارلس کے ہمراہ جانے سے معذوری ظاہر کی۔ تھوڑی ہی دیر بعد چارلس اپنے دوستوں کی طرف سے دونوں سیر کرنے والوں کے لیے نہایت پُرشوق دعوت کا پیام لیے ہوئے پھر آموجود ہوا۔

لیکن ہنری نے اپنے خطوط ختم نہیں کیے تھے اس لیے اُس نے چارلس سے اکیلے ہی جانے اور اُسکی طرف سے معذرت کر دینے کی خواہش کی اور خود اُسکے دوست کے مکان پر ساڑھے دس بجے پہونچ جانے کا وعدہ کیا - کیونکہ وہ مکان اس آسیب زدہ کوٹھی کی سمت میں واقع تھا اور سرائے سے جاتے ہوئے راستہ سے یوں ہی سا ہٹ کے تھا - یہ طے ہوکے چارلس پھر اپنے دوست کے گھر گیا - اس عرصہ میں ہنری نے اپنے لیے سرائے میں تھوڑا سا کھانا منگایا اور پھر لکھنے بیٹھ گیا -

وقت پر وہ کھانے سے فارغ ہوگیا اور خط بھی پورے کرلیے - اُنکو روانہ کرنے کے بعد وہ ساڑھے دس بجے سے چند لمحے پہلے اُس گھر کی طرف روانہ ہوا جو چارلس نے اشارہ سے اُسے دکھایا تھا - لکھتے وقت اُسکے خیالات اُسکے کام پر مجتمع تھے اور اب اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ مہم جس پر وہ قدم اُٹھانے والا تھا اُسکے مطلع خیال پر عظیم الشان نظر آنے لگی اور وہ اپنے دل میں اس کا قائل ہوئے بغیر نہ رہا کہ کچھ بھی ہو جیسی دلکشی اس گرمی کے تیسرے پہر کی پرلطف آب وتاب میں نظر آ رہی تھی اب رات پڑنے پر صرف کم خوشگوار و حوصلہ افزا دکھائی دیتی تھی -

وہ یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ اُسکے دل میں اس سے بالکل بچ نکلنے اور اس صاف ستھری چھوٹی سی سرائے میں آرام سے بستر پر جا لیٹنے کی خواہش کچھ کچھ قائم ہوتی جا رہی تھی - لیکن اُس نے یہ بزدلانہ خیالات اپنے دل سے ہٹائے اور خود بخود سوال کرنا شروع کیا کہ وہ کس طرح ایسے اعلیٰ درجے کے موقعہ کو ہاتھ سے دے سکتا ہے - اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ وہ کس طرح ایسی خودغرضی برت سکتا ہے کہ وہ چارلس کی دلشکنی کا خیال کرے جو اپنے چُپ چاپ طریقہ میں اس مہم کا بالکل اُتنا ہی مشتاق تھا جتنا وہ خود شروع میں تھا - اُس نے بڑی بے چینی سے اپنے دل میں تسلیم کیا کہ وہ صاف طور سے ہول رہا تھا - اور اگر وہ اکیلا ہوتا تو اس ارادہ کو ضرور ترک کر دیتا - لیکن اُس نے سوچا کہ اپنے زیادہ طبعی دوست کی موجودگی کے حوصلہ اور سہارے سے وہ اس معاملہ کو خوش اسلوبی سے انجام دے سکے گا - لیکن اُسکے خیالات بار بار اُن چار پیش روؤں کے بھیانک انجام کی طرف ناگواری سے لوٹ لوٹ آتے تھے اور وہ متعجب تھا کہ اُن میں سے کسی کو بھی اتنی گھبراہٹ محسوس نہ ہوئی ہوگی جتنی اُسے ہو رہی تھی -

تھوڑی ہی دیر بعد وہ مقررہ مقام پر پہونچ گیا - اور اُس جگہ اُن سیڑھیوں کے اوپر جو سامنے کے دروازہ تک جاتی تھیں ایک چھوٹی سی ڈیوڑھی کے سایہ میں اُسے چارلس پہلے ہی سے اُسکا انتظار کرتا ہوا نظر آیا وہ بظاہر ایک ایک لحظہ کا پابند اور اتنا شائق نظر آتا تھا کہ ذرا سا بھی وقت ضائع کرنا اسے منظور نہیں ہے - کیونکہ پکارے جانے کی بجائے وہ پہلے ہی دوستوں سے رخصت ہو لیا تھا اور اُس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا تھا - ہنری نے پُرشوق الفاظ میں اُس سے صاحب سلامت کی لیکن اُسے معلوم ہوا گویا چارلس نے جیسے ہی وہ سیڑھیوں سے اُترا کچھ سنا ہی نہیں - رات کچھ ایسی تاریک نہ تھی لیکن اسپر بھی اُسے اپنے دوست کا چہرہ صاف نظر نہ آسکا - حالانکہ اسکی طرف جہانتک کہ دیکھنے کی کوشش بھی کی - اگرچہ اُسے اتنا کم نظر آیا اُسے ایسا معلوم ہوا کہ چارلس مشکل سے اپنی اصلی حالت پر تھا - وہ بالکل محو اور کسی خیال میں غرق اور اپنے دوست کے سوالوں کے مختصر جواب دینے میں وہ تقریباً ترش اور آزردہ معلوم ہوتا تھا - اُسے ہنسی خوشی کی باتوں میں لگانے کی چند فضول کوششوں کے بعد ہنری نے ہوشیاری سے اُسے اُسکی حالت پر چھوڑ دیا - البتہ کبھی غیر متعلق مضمونوں پر اٹکل پچو اظہار خیال کر دیتا تھا جسکے جواب کی ضرورت بھی نہ تھی - اُس نے خیال کیا کہ شاید اسکے دوست کے مکان پر کسی ناخوشگوار بے موقع بات نے چارلس کو برہم کر دیا ہے - یا شاید اُسے کوئی بُری خبر ملی ہے - لیکن اُس نے اس خیال سے پھر کیفیت دریافت نہیں کی کہ اس کا دوست اپنے اطمینان کے وقت خود بخود اپنا راز اُسے بتا دیگا - اس اثنا میں اسکے جذبات بھی کچھ خوشگوار نہ تھے - اسکے دل میں ہول بڑھتی جارہی تھی اور اسے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی چیز اسکی طاقت، اسکی ہمت، بلکہ اسکی جان ہی متواتر آہستہ آہستہ لیکن بے رحمی سے چوسے چلی جاتی ہے - اس سے پہلے کبھی اُسپر اتنا حیرت انگیز اور نا ملائم اثر نہ پڑا تھا -

اس صورت میں اُس پُر آسیب مکان تک انکا راستہ کسی قدر خاموشی سے کٹا - جب اُنھوں نے بڈھے محافظ کی گھنٹی کا دروازہ کھٹکھٹایا وہ از سر نو معترض ہوتا ہوا اور حسرت و اندوہ ظاہر کرتا ہوا اُن سے ملاقی ہوا - اُس نے اُن سے کہا کہ جتنا زیادہ میں آپ کے اس منصوبہ پر غور کرتا ہوں اتنا ہی مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں کسی طرح بھی آپ کی اس کارروائی میں حصہ نہیں لینا چاہتا - اُس نے یہاں تک کہا کہ انکی رقم انھیں پھینکے واپس دینے لگا کہ میں اپنے ضمیر کو اس کے

قبول کرنے پر رضامند نہیں کر سکتا۔ لیکن ہنری نے پُرلطف اور مُلائم الفاظ میں اُسے اُسکے لیے رہنے پر اصرار کیا اور کہا کہ سب خیریت رہے گی اور جب ہم صبح کو صحیح و سالم ملیں گے میں اس رقم میں جو پہلے ہی معقول تھی کچھ اور اضافہ کر دوں گا۔

بُڈھے محافظ نے اس بات کو شائستگی سے رد کر دیا اور اُنھیں یقین دلایا کہ مجھے پہلے ہی بہت کچھ مل چکا ہے اور اگر تم اتنے خوش قسمت ثابت ہو کہ اپنی جانیں اور عقل و حواس سلامتی سے لیکے نکل آئے تو تمھیں صبح کو صحیح سالم اور خوش و خرم دیکھنے ہی میں مجھے بہت بڑی خوشی ہوگی۔ ہنری بُڈھے کے اس تعلق خاطر سے واقعی متاثر ہوا اور رات کا رخصتی سلام کہتے ہوے اُس نے اس کا ہاتھ گرمجوشی سے دبایا۔ چارلس اس تمام عرصہ میں پیچھے کی طرف رہا اور اُس نے مطلق بات نہیں کی یا کم از کم ایسی بات کوئی نہیں کہی جو قطعی ضروری نہ تھی۔ ظاہر تھا کہ اسکی افسردگی کا اثر اُس سے بالکل دُور نہیں ہوا تھا اور ہنری سخت حیران تھا کہ آخر یہ معاملہ کیا تھا جسنے چندہی مختصر گھنٹوں میں اُسکے دوست کی قلب ماہیت کر دی۔

اُنھوں نے دروازہ کا قفل کھولا اور اُس بڑے ویران گھر میں داخل ہوے۔ اپنے ساتھ چور لالٹین لے لینے کی وجہ سے اُنھیں بیرن کے مطالعہ کے کمرہ کی طرف جانے میں کچھ دقت معلوم ہوئی۔ یہ عجیب و غریب کمرہ تھا اور مکان کے ایک سرے پر باغ کے اندر کی طرف بعض اتاگھروں کی طرح بنا ہوا تھا جس سے یہ خیال پڑتا تھا کہ یہ کبھی بعد میں بنایا گیا ہے اور اصل نقشہ میں شامل نہ تھا۔ یہ ایک لمبا اور تنگ کمرہ تھا جس میں بہت سی فرانسیسی نمونہ کی کھڑکیاں برابر حصوں میں ہر جانب فرش کی طرف کُھلنے والی بنی ہوئی تھیں لیکن کمرہ کا ہر ایک سرا ایک لمبے چوڑے آویزاں آئینہ سے قریب قریب ڈھکا ہوا تھا۔ اس سے ایک قابل دید منظر پیدا ہوتا تھا۔ کیونکہ جب کوئی کمرہ کے طول میں نظر ڈالتا تو دونوں طرف یہ غیر محدود طور پر پھیلا ہوا معلوم دیتا نہ اور ہر ایک چیز بار بار نظر آنے سے بظاہر نا قابل اختتام سمان پیدا ہو رہا تھا۔ طرح طرح کا سامان اس کمرہ میں کثرت سے تھا۔ اور چاروں کونوں میں زرہ بکتر اس خوبی سے آویزاں کی گئی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اسکے اندر کوئی جسم ہے۔ کمرہ کے وسط میں ایک بڑی لمبی چوڑی اور خوشنما میز تھی۔ جسکے سامنے بیرن کی کرسی تھی ــــــ وہ کرسی جس میں اُس نے خودکشی کی تھی۔

ہمارے دوستوں نے یہ طے کرلیا تھا کہ بڈھا ایک چراغ بالکل طیار انکے لیے رکھ جائے۔ اُسے اُنھوں نے آتے ہی روشن کرلیا۔ اتنے بڑے کمرہ کو بارونق بنانے کے لیے بیس چراغوں کی ضرورت تھی۔ دُور دُور کے گوشے اب بھی اتنے تاریک تھے کہ دہشت ہوتی تھی۔ کمرہ کے ہر سرے کے آئینوں میں روشنی کے غیر محدود انعکاس سے ایک عجیب ڈراؤنی کیفیت پیدا ہورہی تھی اس مقام میں گھٹی ہوئی مرطوب بدبو آرہی تھی جیسی کہ اکثر مدت تک بند رہنے والے کمروں میں سے آیا کرتی ہے۔ ہنری کو صاف طور سے اپنے دل میں بے چینی کا احساس اور سرائے کی آرام دہ، سادہ، اُنیسویں صدی کی خوابگاہ کی خواہش پیدا ہورہی تھی۔

اسکے علاوہ وہ لحظہ لحظہ کمزور ہوتا جارہا تھا۔ اُسے بالکل وہی محسوس ہورہا تھا جو ایک مکھی کڑی کے چنگل میں پھنس کے خیال کرتی ہوگی جب وہ اُس کا سارا خون چوس کے اُسے خالی چھلکا کرکے چھوڑ دیتی ہے۔ لیکن اس بات کے تسلیم کرلینے سے مطلب حل نہیں ہوسکتا تھا اس لیے اُس نے ہنسی خوشی کی گفتگو میں اپنے خوف وہراس کو چھپانے کی کوشش کی اور چارلس کو اُسکے سکوت اور ظاہری پست ہمتی پر ملامت کرنے لگا۔ اُسے نہایت مختصر جواب ملے اور یہ ظاہر تھا کہ چارلس اب تک اپنی اُسی حیرت انگیز حالت میں تھا اور دراصل یہ معلوم ہوتا تھا کہ اگر فرق ہے تو یہ کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ اس میں غرق ہوگیا تھا۔ اسوقت ہنری اسے چراغ کی تیز روشنی میں صاف صاف دیکھ سکتا تھا۔ اسکے دل پر اسکے دوست کی عجیب وغریب ہیئت وانداز سے اور بھی زیادہ اثر ہوا۔ چارلس بھی اپنی اس حالت سے کچھ آگاہ معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہ روشنی سے بچنے کی کوشش کرتا تھا۔ اُس نے ایک چوکی پر اپنے آپ کو ٹیک دیا اور دیر تک بے حس وحرکت بیٹھا رہا۔ اس اثنا میں وہ اپنے دوست کی پُرلطف وپُرمذاق گفتگو کے چند حرفی روکھے جواب دیتا تھا

کچھ دیر بعد یہ عجیب وغریب خاموشی وسستی ایسی ہی عجیب بے چینی وبیقراری میں تبدیل ہوگئی۔ کیونکہ وہ اچانک چوکی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اس لمبے کمرہ میں ایک طرف سے دوسری طرف اس طرح گھومنے لگا جیسے ایک وحشی جانور اپنے پنجرہ میں چکر لگاتا ہے۔ ہنری کو اگر اُس کا تمثیل کسی قسم کا دھوکا نہیں دے رہا تھا وحشی جانور کا خیال محض تشبیہ سے زیادہ ہی تھا۔

یہی نہیں کہ وہ ادھر اُدھر بے چینی سے چکر لگا رہا تھا بلکہ ایک عجیب قسم کی دبی ہوئی تندی بھی تھی جو اُسکے دوست کی بالعموم ہموار اور پُرسکون طبیعت پر کسی طرح چھا گئی تھی - ہنری کی سمجھ میں خود اپنی محسوسات ء آتی تھیں اور اُنھیں لغو کہ کے اپنے دل و دماغ سے ہٹانا چاہتا تھا لیکن اِس ادھر سے اُدھر لگاتار ٹہلنے و دَوڑنے نے اُسے آخر اس قدر متوحش اور پریشان کر دیا کہ وہ مجبور ہو کے اپنے دوست سے رُک جانے کے لیے منت کرنے لگا - معلوم ہوتا تھا کہ موخرالذکر کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کم از کم اس وقت تک کہ اُس نے اپنے الفاظ ایک دفعہ سے زیادہ نہ دوہرائے - اس وقت وہ ایک عجیب نیم بےصبری کی آواز کے ساتھ پھر چوکی پر دھم سے بیٹھ گیا - اس مرتبہ چُپ چاپ سست بیٹھنے کی کوئی علامت نہ تھی - کیونکہ یہ ظاہر تھا کہ اس پر اس وقت تک بے چینی چھائی ہوئی تھی - اور وہ اس حالت میں چند لمحوں سے زیادہ نہیں رہ سکتا تھا -

ان تمام باتوں نے اب ہنری کو حقیقۃً مضطرب کرنا شروع کر دیا - اُسے معلوم ہونے لگا کہ معمولی فکر و استغراق اس تبدیل حالت کی پوری وجہ نہیں ہو سکتا اُسے اندیشہ ہوا کہ اُسکا دوست کسی عارضہ میں مبتلا ہو گیا ہے اس وقت وہ دل سے یہ آرزو کرنے لگا کہ کاش میں اس دہشتناک معاملہ پر اس قدر شوق کا اظہار نہ کرتا کیونکہ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے اپنے دوست کی امداد و موجودگی کے سہارے پر اُس نے اسکو بخوبی انجام تک پہونچانے کا بیڑا اُٹھایا تھا - اور اب یہ مدد کچھ عجیب طریقہ سے مفقود ہوتی جا رہی تھی - بہرحال آدھی رات کے وقت جبکہ بیرن کا آنا ظاہر کیا جاتا تھا اب تیزی سے قریب آتا جا رہا تھا اس نے ٹھان لی کہ اس جادو بھری گھڑی کے گذرنے کے بعد جس قدر جلد مناسب و ممکن ہوا وہ اپنے دوست کو باحتیاط تمام سرنے کو نکال لے جائے گا اور وہاں اُسے بستر پر لٹا دے گا اور اگر صبح تک اُسکو افاقہ نہ ہوا تو وہ گاؤں کے طبیب سے مشورہ کرے گا -

اس اثنا میں چارلس کی بیخودی حد سے زیادہ بڑھ گئی - وہ پھر کھڑا ہو گیا اور اُس نے وہی عجیب و بی دبی تلہ آور رفتار آگے اور پیچھے کی طرف شروع کر دی - اور اب اُس نے اپنے دوست کے فقروں سے کان بالکل بہرے کر لیے اور اپنا سارا زور اس پر اسرار اور لگاتار چہل قدمی میں لگا دیا - ہنری نے جب اسے غور سے دیکھا تو اُسے معلوم ہوا کہ اُسکا چہرہ بھی

بدل رہا ہے۔ اسے اس موقعہ پر ایک روحوں کی بیٹھک کا واقعہ یاد آگیا جس میں اس نے معمول کے اثر پذیر ہوتے ہی اُسکے چہرہ کو وقتاً فوقتاً بدلتے دیکھا تھا۔ خود اسکی وحشت اور گھبراہٹ ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ اور اگرچہ اسکے دوست کے حیرت انگیز ترشرو انداز کی وجہ سے کسی سمجھانے بجھانے یا دخل دینے کی مطلق گنجائش نہ رہی تھی لیکن اس نے سوچا کہ اسے ایک مرتبہ اور ٹوک کے اس منخطہ کی کیفیت کو دُور کرنا چاہیے۔ لیکن جیسے ہی اُس نے جی کڑا کرکے بولنا چاہا، چارلس دھانک بیٹھ گیا، اُس چوکی پر نہیں جس پر اُس نے شروع میں بیٹھنا پسند کیا تھا بلکہ میز کے سامنے کی بیرن والی کرسی پر۔ وہاں وہ نہایت سست اور بالکل ساکت و صامت بیٹھ گیا، اور اپنی آنکھوں پر روشنی کی طرف سے سایہ کرلیا۔

ہنری نے چلاکے کہا "اٹھو جلدی اٹھو! کیا کیوں گئے؟ یہ وہی کرسی ہے جس میں کہا جاتا ہے بیرن بیٹھا کرتا ہے۔ اور (اپنی گھڑی دیکھ کے) اب اُسکے وقت مقررہ میں چند ہی لمحے رہ گئے ہیں!"

لیکن چارلس نے ذرا توجہ نہ کی اور بےحس و حرکت بیٹھا رہا۔ اضطراب سے بے اختیار ہوکے ہنری اُسکی طرف لپکا اور اُسے کندھے سے ہلا ہلا کے چیخ چیخ کے کہنے لگا "خدا را ہوشیار ہو! آخر تمھیں ہو کیا گیا ہے؟"

اسکے بولتے بولتے باہر کے کنگرے کے بڑے گھنٹے نے رات کے بارہ بجانا شروع کر دیے۔ ایک اچانک آواز نے، ایک قسم کی دبی دبی ٹوٹنے کی آواز نے، جو کچھ اسکی سمجھ میں نہیں آئی اسکی توجہ کو کمرہ کے ایک سرے کی طرف ہٹا لیا اور جیسے ہی اسکی نظر بڑے آئینہ پر پڑی اس نے اُس میں اپنا اور چارلس کا باہمی عکس اپنے قریب کی میز کے بڑے لمپ کی روشنی میں نہایت منور و روشن دیکھا۔ اس نے اپنی بوکھلائی صورت دیکھی اور چارلس کو اپنا چہرہ اپنے ہاتھ سے سایہ کیے دیکھا۔ لیکن آئینہ میں نظر ڈالتے ہی دوسری صورت نے اپنا ہاتھ اُٹھایا اور خوف اور گھبراہٹ کے تصادم میں اُس نے معلوم کیا کہ جس چہرہ کا اس میں عکس پڑ رہا تھا وہ مطلق اسکے دوست کا نہ تھا۔ یہ بیرن کا چہرہ تھا، بالکل وہی جو اُنھوں نے اسکی تصویر میں دیکھا تھا۔ اور وہ ایک دفعہ پھر اپنے گلے پر اُسترا پھیرنے کی حالت میں نظر آ رہا تھا!

وحشت سے چیخ کے ہنری نے اپنی نظریں آئینہ سے ہٹائیں اور اپنے ہاتھ کے نیچے کی صورت کو دیکھنے لگا جو بلا شبہ اسکے دوست کی نہ تھی بلکہ بیرن کی شکل تھی، جو اُسکی طرف زہر خند بر باطنی کی ابلیسانہ کچلی سے دیکھ رہا تھا۔ اسکے ساتھ ہی اس نے خون کی ایک دھار اپنے ہاتھ پر پڑتے محسوس کی۔ ہنری کو معلوم ہوا کہ اُسکے دماغ کے اندر کوئی چیز جگہ سے ہل گئی اور وہ بیہوش ہوکے زمین پر گر پڑا۔

آخر اُسکے کندھے پر ایک ہاتھ' تھرتھراتے ہوئے ہاتھ کے پڑنے سے اور یہ سوال کرتی ہوئی ایک متفکر آواز سے آنکھ کھلی: "آپ کا دوست کہاں ہے؟"

چند لحظے وہ اس قدر مبہوت رہا کہ اُس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ لیکن کچھ دیر بعد اس نے پراگندہ ہوش و حواس قائم کیے اور اپنی حالت کا اندازہ لگایا۔ اُس نے اپنے آپ کو نیچ کی میز کے پاس بیرن کے کمرہ کے فرش پر پڑا پایا اور بڈھا محافظ لو کھلائے اور گھبرائے ہوئے چہرہ کے ساتھ اُسپر جھکا ہوا تھا۔ اُس نے پھر پوچھا حضرت! آپ کا دوست کہاں ہے؟ دوسرے صاحب کہاں ہیں؟"

گذشتہ شب کے مہیب واقعات ایک رَو کے ساتھ اُسکے دماغ میں عود کر آئے اور وہ بیٹھ کے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ واقعی چارلس وہاں نظر نہ آتا تھا۔ نہ وہاں اُس بھیانک صورت کا کچھ پتہ نشان تھا جس نے بیرن کی خودکشی کا سماں دوبارہ دکھلایا تھا۔ وہ بڈھے کے سوال کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اُس نے سنبھل کے اپنی داستان سنائی۔ بڈھے محافظ نے فریاد و واویلا شروع کی اور بد حواس ہوکے ہاتھ ملنے لگا اور بار بار کہنے لگا کہ مجھے شروع ہی سے معلوم تھا کہ اس مجنونانہ فعل کا نتیجہ بُرا نکلے گا۔ اور اپنے آپ کو نہایت سخت سُست کہنے لگا کہ میں کیوں اس معاملہ میں شریک کار ہوا۔ خواہ نہایت بعید اور بلا واسطہ طریقے ہی کیوں نہ ہوا ہوں۔ وہ چلّایا کہ یہ بے عجیب اور اندیشہ ناک بات کہ آپ کا دوست اِس طرح غائب ہو گیا۔"

ہنری: "بیشک ہمیں اُسکو اس مکان میں ڈھونڈھنا چاہیے۔ وہ خوفزدہ ہو گیا ہوگا۔ وہ بھاگ کے کہیں چھپ گیا ہوگا۔ وہ میری طرح کسی اور کمرہ میں بیہوش ہو گیا ہوگا۔ آؤ تو ہم اُسکی

تلاش کریں۔"

بڈھے نے پوچھا "لیکن تم بھی تو صاحب زخمی ہو رہے ہو۔ کیا نہیں ہو؟"

ہنری "نہیں تو۔ مجھے تو ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ البتہ مجھے نہایت کمزوری اور کپکپی معلوم ہو رہی ہے۔"

بڈھا "لیکن اپنے ہاتھ کو تو دیکھو۔ یہ خون میں سنا ہوا ہے۔!!"

ہنری نے نہایت پریشان ہو کے دیکھا کہ واقعی یہی بات ہے۔ بیرن یا چارلس (مطلق سمجھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا اصلیت تھی) کا خون خودکشی کے ارادہ کے وقت اسکے ہاتھ پر بہ کے گرا تھا۔ اور وہ خون ہیبتناک منظر کی حقیقت سے کہ بادی النظر شہادت کے طور پر قائم تھا۔

اُس نے بڈھے سے چلا کے کہا "پانی لاؤ۔ فوراً پانی لاؤ۔ ورنہ میں اپنا ہاتھ کاٹ پھینکوں گا۔"

بڈھا پاس کے کنوئیں سے پانی کا پیالہ بھر کے لایا اور اُس نے فوراً ان منحوس دھبوں کو دُور کیا۔ گو وہ پانی میں معمولی طور پر جاتے رہے، گو دیکھنے میں وہ غائب ہو گئے، اُسے یہی معلوم ہوتا رہا کہ وہ ابھی اُسی طرح موجود ہیں۔ گویا اُس کا ہاتھ پھر ایک ہی نہیں ہو سکتا۔ وہ چونکہ بہت کمزور تھا وہ آہستہ آہستہ اُس قدیم مکان کے ایک کمرہ سے دوسرے کمرہ میں گھستے چلے گئے کہ چارلس کا کچھ بھی پتہ نشان چلے لیکن بیکار۔ اُنھیں اپنے ہی نقش قدم خاک میں معلوم ہوے جو ایک روز پہلے اسکے مکان دیکھنے کے وقت بنگئے تھے۔ اُنھیں اور کوئی نشان نہیں نظر آیا۔ اور اُس مفقود الخبر شخص کا کسی قسم کا کوئی کھوج نہ ملا۔ بڈھے نے دفعتہً چلا کے کہا "بس اُسے وہ بھتنا اُٹھا لے گیا ہے!"

اُنھوں نے باغوں کے قریب ترین حصہ میں ڈھونڈھا لیکن ہنری کی طاقت نے جواب دیدیا اور یہ کام ادھورا رہ گیا کیونکہ اُس نے پہلے شہر میں واپس جانے اور کچھ تحقیقات کرنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن بڈھے سے رخصت ہونے سے پہلے وہ اُس کی طرف مخاطب ہو کے مؤثر پیرایہ میں کہنے لگا "تم رنج نہ کرنا۔ تم نے حق کے سوا کچھ نہیں کیا۔ تم نے اول سے آخر تک ہمیں اس مجنونانہ حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن ہمارے کانوں پر جوں نہ رینگی۔ اگر

اس سے ہمیں کچھ نقصان پہونچا تو تمہارا اس میں کیا قصور۔ خدا جانے میرا دوست کہاں ہے۔ پچھلی رات کے واقعات میری عقل سے بالکل باہر ہیں لیکن جیسا کہ تمہارا خیال ہے میں مطلق یہ باور نہیں کرتا کہ میرے دوست کو وہ بھتنا اٹھا لے گیا ہے۔ اگر اس نے وہی دیکھا جو میں نے دیکھا —— لیکن وہ یہ کیسے دیکھ سکتا تھا جب خود اس نے یہ باتیں کیں؟ میری سمجھ میں آتا ہی نہیں۔ لیکن وہ ڈر گیا ہو، وہ بھاگ گیا ہو۔ شاید میں اسے ڈھونڈھ نکالوں۔ امید تو مجھے یہی ہے لیکن کچھ بھی ہو تم اس کی تسلی رکھو۔ تم نے کم از کم کوئی بھی ایسی بات نہیں کی جس پر تم اپنے آپ کو برا بھلا کہو۔ میں خود بھی پچھلی رات کے واقعہ کی ذرا سی بھی بھنک کبھی کسی کو نہ دوں گا تاوقتیکہ میں اپنے دوست کے ہی ڈھونڈنے کی خاطر مجبور ہو جاؤں۔ میں اب گاؤں میں جاؤں گا۔ یہاں سے جانے سے پہلے اگر مجھے کوئی خبر ملی تو میں تم سے ضرور مل کے جاؤں گا۔

یہ کہہ کے اس نے بڑھیا سے ہاتھ ملایا اور اسے کسی قدر سکون میں چھوڑ کے رخصت ہوا جب وہ قصبہ کی طرف جا رہا تھا اس کے دل میں وحشت بھرے خیالات آ رہے تھے۔ اس وقت مسلسل خیال آرائی [illegible] اصلیت نہ تھی اور حقیقت میں یہ بات ایک پریشان کن خواب تھی جس نے عقل کو بیکار کر دیا تھا۔ اسے یہ بھی تو خیال نہ آتا تھا کہ اسے اب کیا کرنا چاہیے آیا اپنے دوست کے غائب ہو جانے کے متعلق مقام کو مطلع کرے یا کیا۔ کسی مفید نتیجہ پر پہونچنے سے پہلے ہی سرائے آ گئی اور وہ چپ چاپ کسی کی توجہ اپنی طرف کیے بغیر اپنے کمرہ میں چلا گیا۔ وہ چارلس کے کمرہ میں گیا لیکن وہاں بھی اس کا کچھ پتہ نہ تھا اور نہ بستر پر سونے کے آثار تھے۔ ہنری اپنے کمرہ میں واپس آ گیا اور ایک پلنگ پر گر پڑا کیونکہ اسے یہ محسوس ہوا کہ سب سے زیادہ اسے آرام و سکون کی ضرورت ہے —— اس حیرت انگیز اور ہیبت ناک حادثہ کا مقابلہ کرنے کی طاقت مہیا کرنے سے پہلے اسے سو لینا چاہیے۔ اسے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کچھ کرنا ضرور چاہیے اور وہ بھی فوراً۔ پھر بھی وہ کچھ نہ کر سکتا تھا اور نہ اسے یہ خبر تھی کہ آخر اسے کیا کرنا چاہیے؟ وہ جانتا تھا کہ اسے نیند کی ضرورت ہے۔ اس پر بھی اس کا فکر اسے سونے نہیں دیتا تھا۔ اس حالت میں وہ کچھ دیر تذبذب آمیز حیرت میں پڑا رہا کہ دیکھیے آخر ان سب باتوں کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

اس کا تھکا ماندہ جسم غنودگی کی طرف قریب قریب مائل ہوتا جا رہا تھا کہ اچانک دروازہ

چوپٹ کھل پڑا اور اُسکے سامنے چارلس اپنے معمولی لباس میں کھڑا اُسکی طرف ٹھیک اس طرح دیکھ رہا تھا گویا کچھ ہوا ہی نہیں -!

ہنری وحشت اور بوکھلاہٹ میں کچھ بے مطلب اور بے جوڑ الفاظ چیخ چیخ کے کہتا ہوا فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے حیرت زدہ چارلس کی طرف لپک کے اس کا بازو یہ دیکھنے کے لیے پکڑ لیا کہ کیا واقعی وہ چارلس ہی ہے یا یہ اسکے مجنون دماغ کا ایک وہمی کرشمہ ہے ؟

**چارلس** :- "ارے میاں، خدا کے لیے بتاؤ تمھیں یہ ہو کیا گیا ہے ؟ کیا بات ہے، کیا بات ہے ؟"

**ہنری** :- "الٰہی تیرا شکر! سچ مچ تم ہی ہو اور تم پھر بھلے چنگے نظر آئے، لیکن میں تم سے یہ ضرور پوچھوں گا کہ جب تم اس پراسرار طریقہ سے گم ہو گئے تو تم پچھلی رات کہاں گئے اور تمھارے ساتھ کیا پیش آیا ؟"

**چارلس** :- "گم ہو گیا! اس سے تمہارا کیا مطلب ہے ؟ میں تم سے چھ بجے جیسا کہ تمھیں معلوم ہے رخصت ہوا اور تمھیں میرے دوست کے مکان پر ساڑھے دس بجے آنا تھا لیکن تم بالکل نہیں آئے اور میں واقعی تمھارے لیے نہایت متفکر تھا"

**ہنری** :- "بالکل نہیں آئے! کیا معنی ؟ میں قطعی آیا - میں تم سے ملا ———"

**چارلس** :- "بات کاٹ کے) کیا! تم مجھ سے ملے ؟ لیکن جب میں اس کمرے سے چھ بجے چلا گیا - اسکے بعد تم مجھے نظر آئے ہی نہیں - اس میں کچھ اسرار ہے اور تمھاری صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ حیرت انگیز - اب بیٹھ کے مجھے سارا ماجرا سناؤ"

**ہنری** :- "سناتا ہوں - لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے رات کہاں گزاری ؟"

**چارلس** :- "بلا شبہ اپنے دوست کے مکان پر - اپنے ارادہ کے مطابق اپنے دوست کے ساتھ کھانا کھایا - لیکن سوءِ اتفاق سے کھانے کے بعد مجھ پر خفیف سی غشی طاری ہو گئی - کوئی بڑی بات نہ تھی - قطعی نہیں - لیکن رہی کچھ دیر، جسکے بعد مجھے کمزوری معلوم ہوئی اور میری طبیعت گھبرا جاتی تھی - میرے دوستوں نے اصرار کیا کہ ان حالات میں مجھے اپنی اس کا روانی کا خیال بھی نہیں کرنا چاہیے بلکہ سرائے میں بھی واپس نہ جانا چاہیے تا وقتیکہ میں رات بھر آرام لے لوں - اُنھوں نے محبت آمیز طریقہ سے بہت تعلقِ خاطر اور بڑی شدومد کا اظہار کر کے مجھے گھیر لیا - جسے

اپنے ایک فالتو کمرہ میں بستر پر لٹا دیا اور مجھے مقویات دیں اور میری تشفی کی کہ جب تم آ ؤ گے وہ تمھیں سارا ماجرا کہہ سنائیں گے اور اگر میں اُس وقت تک جاگتا ہوا تو وہ تمھیں میرے بستر کے پاس لے آئیں گے۔ لیکن تمھارے آنے کے وقت سے کہیں پہلے میں اُنکی دوا کے اثر سے سو گیا۔ میں صبح تک سوتا رہا اور جب جاگا تو میری طبیعت بالکل تروتازہ بحال اور درست تھی۔ جب یہ سُنا کہ تم آئے ہی نہیں تو مجھے فکر ہوا کہ کیا وجہ ہوئی۔ اس لیے میں جس قدر جلد ہو سکا یہاں سرائے میں آیا ہوں اور اب تمھارے سامنے ہوں! میں تمھاری داستان سننے کے لیے بیتاب ہوں۔"

ہنری نے جہاں تک ہو سکا اچھی طرح اس واقعہ کو بیان کیا اور چارلس اس اثنا میں حیرت و استعجاب کی آوازیں نکالتا رہا۔ اسکے بعد اُنھوں نے قیاس دوڑا کے کوئی نتیجہ قائم کرنا چاہا کہ اصل میں ہوا کیا۔ اتنا تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ اُس خوفناک بیرن نے کسی طرح اُنکا ارادہ بھانپ لیا تھا۔ سہ پہر کو اُنکے اُس کا مکان معائنہ کرتے وقت شاید وہ بے نظر آئے اُن کے ساتھ ساتھ رہا اور اُس نے ہنری کو خود اسکے دوست کی جگہ لے کے جس کی رفاقت اور امداد کے بھروسہ پر اسے اپنی تدبیر کو عمل میں لانے کی اُمید تھی وہ چکمہ دینے کی ٹھان لی جو بہت خوبی سے اسکی ہلاکت کا باعث ہو جاتا۔ شاید بیرن نے ہی چارلس کی طبیعت ناساز کر دی ہو۔ بہرحال اُس نے اُس کا روپ بھر کے اس سے فائدہ اُٹھانے کا بلا شبہہ تہیہ کر لیا۔ اور یہ بھی اُتنی ہی یقینی بات ہے کہ اُس نے اتنی دیر اپنی مادّی صورت ہنری کی قوت سلب کرتے رہنے سے قائم رکھی۔

اس واقعہ کا نرالا وحشت آمیز و ہیبت ناک پہلو یہی تھا کہ ہنری کے غیر معمولی طور پر ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے اور وہ اپنے دوست کی موجودگی اور مدد کے بغیر ہرگز اس تجسس میں نہ پڑتا اور عین اس نازک موقعہ پر جب سب سے قطع نظر اس مدد کی ضرورت تھی وہ دوست خود بھتنا ہی ثابت ہوا! وہ گھنٹوں تک اس مسئلہ پر گفتگو کرتے رہے لیکن وہ اس سے زیادہ اور کوئی نتیجہ نہ نکال سکے۔ ایک بات پر البتہ دونوں بالکل ہم آہنگ تھے کہ اب بیرن کے کمرہ کا راز اس سے زیادہ معلوم کرنے اور ٹٹولنے کی اُنھیں مطلق خواہش نہ تھی۔

بایں ہمہ اُنھوں نے محسوس کیا کہ اُن کا فرض ہے کہ اپنے نیک دل بڑھے دوست محافظ سے ملنے کے لیے اُسکی کٹیا پر ایک دفعہ اور ہو آئیں اور اس عجیب و غریب سانحہ کے نتائج کے متعلق اُسکے

دل کو کیسو کر آئیں لیکن اُنھوں نے اتنی احتیاط برتی کہ وہ وہاں سے ٹھیک دوپہر میں گئے۔ اور اب اُنھیں اُس مہلک مکان میں دوبارہ جانے پر دُنیا کی کوئی چیز آمادہ نہ کرسکتی تھی۔ بڈھا محافظ نہایت مایوسی میں ڈوبا پڑا تھا۔ لیکن جب اُس نے دونوں کو صحیح و سالم دیکھا تو وہ خدا کا بڑی گرمجوشی سے شکر ادا کرنے لگا۔ کہنے لگا کہ میرے دل پر سے بہت بڑا بوجھ اُتر گیا۔ کیونکہ میں صبح سے یہ خیال کر رہا تھا کہ میں پچھلی رات کے واقعات میں حصہ لینے کی وجہ سے کبھی اپنے آپ کو بری الذمہ نہیں سمجھوں گا۔

اُنھوں نے اُسے اپنی داستان سُنائی کیونکہ اُنھوں نے خیال کیا کہ یہ سب کچھ اسکی بدولت ہے۔ اُنھوں نے خاصکر اُس سے یہ پوچھا کہ تم نے پچھلی رات کو موسیو چارلس کو دیکھا تھا؟ اور کیا تم نے اُس میں کسی قسم کا فرق پایا؟ لیکن بڈھے نے کہا۔ نہیں۔ میں نے خصوصیت سے دوسرے صاحب کو نہیں دیکھا۔ اب میں جو سوچتا ہوں تو واقعی یہی بات ہے کہ موسیو چارلس روشنی کی طرف سے جو دروازہ میں سے نکل ہی تھی پیچھے کو ہٹ کے کھڑے تھے لیکن میں نے اسکی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ کیونکہ خود میرے دل کی کچھ عجیب مضطرب حالت تھی۔ یہ کہکے وہ پھر خوشی کے مارے اطمینان اور تسلی کے الفاظ کہنے لگا کہ آخر کار میری جان پر کوئی خون نہ رہا کیوں تم دونوں صحیح و سالم ہو۔

اُنھوں نے اُسے کچھ اور انعام دیا اور جب اُس نے انکار کیا تو اُسے اطمینان دلایا کہ جو تجربہ ہمیں ہوا ہے ہمارے لیے اسی قیمت کا ہے۔ لیکن گو اس عجیب کارروائی کی وجہ سے اُسے بہت سا مال ہاتھ آگیا تھا، اُس نے نہایت متانت اور سچے دل سے قسم کھائی کہ خواہ کچھ بھی ہو اب میں کبھی راتھس چائلڈ کی تمام دولت کے معاوضہ میں بھی بیرن کے کمرہ میں کسی کے ایک رات بسر کرنے پر رضامند نہ ہوں گا۔

محمد ظفر

# فلسفۂ فطرت

دنیا میں جہاں تک انسانوں کی پہونچ ہے، اُن حصوں کا ایک سطحی علم ہمیں بتاتا ہے کہ سب کی تقسیم ہوا، سمندر، اور ٹھوس زمین میں کی جا سکتی ہے۔ علم حکمت کے شیرخواری والے زمانہ میں پُرانے لوگ سمجھتے تھے کہ عنصر چار ہیں۔ آگ، ہوا، مٹی اور پانی۔ مگر زمانہ موجودہ کی بے مثال ترقیاں پکارے کہے جا رہی ہیں

ہو چکا ہے آج تک سرسٹھ عناصر کا ظہور      آپ آب و باد و خاک و نار رہنے دیجیے

فلسفۂ فطرت کی تلاش (جس کا اصلی مقصد یہ ہے کہ تمام موجودات کی عالمانہ دیکھ بھال کی جائے) ہر پہلو سے اس واقعہ سے شروع کی جا سکتی ہے۔ اور اسی سلسلہ میں وہ تمام نئی باتیں پیش کی جا سکتی ہیں جو اس صیغۂ معلومات میں انسانی دماغ کی سرگرم کوششوں کا حاصل ہیں۔ مگر جب ہم خوشیوں بھری فہرست میں اپنا "نقطۂ آغاز" منتخب کرتے ہیں تو سب سے اچھا یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم بھی بہترین تحقیقی اور منطقی سلسلہ کے دوش بدوش چلیں۔

وہ تمام ترقیاں جو ہمارے وقت میں فلسفی حضرات نے کی ہیں۔ جنھیں ہم سمجھتے ہیں، جنکی تعریفیں کرتے ہیں۔ سب کی سب محض علم حکمت کے زبردست بنیادی اصول کے صاف ستھرے حس و ادراک کا نتیجہ ہیں۔ ورنہ تمام چیزوں کی ایسی عام فہم تفصیل نہ تو صرف عقلی نقلی دلیلوں سے ممکن ہے نہ انسان کی بے بس ذہانت سے ہو سکتی ہے۔ بلکہ محض سچے سچے نظری واقعات کی دیکھ بھال ہی انکی پوری تشریح کر سکتی ہے۔ ہمارے لیے یہی واقعات شروع شروع میں "عنوان اور سرخی" کا کام دیتے ہیں اور علم و حکمت کے دور دراز ممالک میں محض ان کا حوالہ دے دینا کافی ہوتا ہے۔

کبھی تو انکی مشابہت اور کبھی انکے اختلافات کا حوالہ ایسی پیچیدہ دنیاؤں پر کافی روشنی ڈالدیتا ہے جو بغیر اس ترکیب کے ہماری سمجھ بوجھ سے باہر رہ جاتیں۔ نقاش فطرت نے تمام مادی موجودات کو ہمارے لیے عجب سلیقہ سے تین صورتوں میں تقسیم کر دیا ہے جن میں

اکثر مخصوص خط و خال بھی موجود ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ "اصل مادہ" ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ اسکے کافی سے زیادہ نمایاں ثبوت زمین و آسمان کے مٹیلے غلاف کے وہ رنگین دھبے ہیں جنھیں ہم پہاڑ، وادی، یا ساحل کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور جن کی اصلی حالت و صورت میں صدیوں تک کوئی بھی تبدیلی نہیں آتی۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ "بادِ بسیط" ہی اکیلی وہ چیز ہے جو خود بھی جلد جلد بدلتی رہتی ہے اور بظاہر یا در پردہ تمام تبدیلیوں کا سبب ہوتی رہتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ یہی چیز دو مرتبہ ایک ہی شکل میں ہمارے سامنے آ جائے۔ کیونکہ بادِ بسیط کی سیماب مزاج ہوائیں ہر وقت کچھ سے کچھ ہوتی رہتی ہیں۔ اور اس میں ہر ممکن رنگ روپ کے بادل ہر وقت تیرتے رہتے ہیں۔

حقیقۃً یہی بادِ بسیط تمام ارضی نقل و حرکت کی اصل اور وجہ ہے۔ سمندر والے طوفان صرف ہوا والے طوفان سے پیدا ہوتے ہیں بلکہ دریا کی رفتار بھی انھیں تبدیلیوں کا نتیجہ ہے جو فضائی ہواؤں میں پیدا ہوتی رہتی ہے۔

تصویر کا دوسرا رخ دیکھیے تو صاف نظر آئے گا کہ انھیں تبدیلیوں سے جو جو فائدے حاصل ہوتے رہتے ہیں ان کا احاطہ تمام لفظوں میں ممکن ہی نہیں ہے۔ یہی سہانی فضا ان تمام ان گنتی رنگ روپ والی مخلوق کی جائے پیدائش ہے جو دنیائے حیوانات و نباتات میں موجود ہیں۔ انھیں فضائی ہواؤں سے ایسے سامان مل جاتے ہیں جن کی وجہ سے شاداب پودے اپنے مختلف ڈھانچے اختیار کر لیتے ہیں اور یہی دو چیزیں ہیں جنکی مدد سے ہر قسم کے حیوان پردہ در پردہ میں اپنی غذائیں حاصل کرتے رہتے ہیں۔ یہی ہوائیں روزی رساں ہیں۔ زندگی کی آس اور حیات کا سہارا ہیں۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ہر حیوان کے وجود میں ہر گھڑی لگاتار تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ جو آخر میں موت کی زنجیر بن کر انکے جسموں کو کچھ سے کچھ کر دیا کرتی ہیں۔ یہی ہوائیں ان سڑتے گلتے ہوئے جسموں کے جوہر کھینچ لیتی ہیں اور انکو "دا شتہ آید بکار" سمجھ کر محفوظ رکھتی ہیں۔ ہمارے زمانہ کی بہترین پڑتال یہ ہے کہ یہی جوہر (جو یا تو جسموں سے مل جاتے ہیں) یعنی کا استعمال ہرے بھرے پودوں کو نشو و نما دیتا ہے اور انکی بقا و حیات کا وسیلہ بن جاتا ہے۔

اب یہ بات طے سمجھیے کہ "اصل جوہر" کبھی برباد نہیں ہوتا۔ دنیا ایک چرخی ہے اور "جوہر" اس چرخی میں اس انداز سے چکر لگایا کرتے ہیں کہ کبھی دھانی پودوں میں رنگ و بو ہو کر رہتے ہیں کبھی چالاک حیوان میں ہوش و تیزی بن کر بسر کرتے ہیں یہی جوہر فضائی ہواؤں سے آتے ہیں اور پھر اُنھیں میں واپس ہو جاتے ہیں۔

اکیلی یہی باتیں نہیں، کہ ان ہواؤں کا سہانا رنگ آسمانی ہے۔ جسے کم نگاہ حضرات آسمان کہتے ہیں، یا ان میں رات بھر نورانی قمقمے جگمگاتے رہتے ہیں، یا ان پر ملیتی پھرتی ہوئی بدلیاں چھائی رہتی ہیں جو فضائی نظارہ کو اتنا خوبصورت بنا دیتی ہیں کہ ان کا ہر رنگ نگاہوں میں کُھب جاتا ہے ہر انداز، دل میں اُتر آتا ہے یا اُن میں ایسے زبردست نسبتی رشتے موجود ہیں جن کا خاص تعلق موت وحیات کے واقعات سے ہے جو فہیم وعقیل طالب علم کی توجہ کو مبذول کر لیں بلکہ اُنکا تعلق ہمارے روزمرہ کے معمولی واقعات سے اتنا زیادہ ہے کہ ہم کو خواہ مخواہ ان کا بیان ذرا اور تفصیل کیساتھ کرنا پڑتا ہے۔

**"علم الحیات"** جاننے والوں نے پتہ لگا لیا ہے کہ فضائی ہوائیں ہماری زمین کو ہر طرف سے پچاس میل کی دبازت سے گھیرے ہوئے ہیں مگر زمین کے زبردست تودہ کے مقابلہ میں انکی جسامت ایسی کم ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لیے کہ ہر پہلو سے زمین کا عین وسط قریب قریب چار ہزار میل کے فاصلہ پر ہے اور ان ہواؤں کی دبازت اس زبردست فاصلہ کے اعتبار سے صرف اٹھارویں حصہ کے برابر ہے۔

اگر ہم اٹھارہ انچ کے گولہ پر فضائی ہواؤں کی جسامت دکھانا چاہیں تو انکی گہرائی ایک بٹے دس ($\frac{1}{10}$) انچ سے بھی کم رہ جائے گی۔ دیکھ بھال سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فضائی ہوائیں کم تعداد میں قطعی بے رنگ، بالکل اُجلی نرمل صاف و شفاف ہوتی ہیں۔ اور پانی یا ٹھوس چیز کے مقابلہ میں بہت ہلکی ٹھہرتی ہیں۔

کیمیا والوں نے ثابت کر دیا ہے کہ "ہوا" کوئی خاص عنصر نہیں ہے (جیسا پُرانے زمانہ والے حضرات خیال کرتے تھے) بلکہ اس میں بہت سے اور مادے بھی شامل ہیں، اس وقت ہمارے لیے صرف اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ ان میں دو خاص طرح کے جوہر موجود ہیں:۔

۱ - آکسیجن : وہ خاص جزو جو زندگی و روشنی کے لیے لازمی ہے -
۲ - نائٹروجن : شورہ والا مخصوص جزو -
انکے علاوہ دوسرے نسبتی اجزاء بھی کم کم تعداد میں موجود ہیں -
(الف): وہ جزو جسکی مدد سے دہکتے ہوئے کوئلوں سے تیزابی نمک نکالا جاتا ہے
(ب) : پانس سے حاصل کی ہوئی "بھاپ"

فلسفۂ فطرت والوں کے نزدیک "بادبسیط" ہر قسم کی ہواؤں کا گلدستہ (مجموعہ) ہے اور اس میں اُن سب کے خاص خاص اجزاء تمام وکمال انداز سے مخلوط و محفوظ رہتے ہیں -

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہر انفرادی ہوا میں کوئی نہ کوئی نمایاں خاصیت امانت کی ہوئی ہے مثلاً بعض پیلی ہوتی ہے بعض آسمانی - کسی کا رنگ بیر بہوٹی کی طرح لال ہوتا ہے کوئی ہلکے سرخ رنگ کی ہوتی ہے -

ہمارے نزدیک بادبسیط کی سب سے پہلی خصوصیت یہی ہے کہ اسکی حجامت معینہ حد سے کم کی جا سکتی ہے - اس میں بلا کی لچک ہے، غضب کا لنگر ہے - ان دونوں صفتوں کی ایک سہل سی مثال ملاحظہ فرمائیے -

اگر ہم شیشے کی ایک لمبی نلکی لے لیں - جسکے اوپری سرے پر ایک گول گنبد بنا ہوا ہو اسکو پانی سے لبالب بھر لیں - پھر اُسکے نچلے سرے کو پانی بھرے برتن میں ڈبو دیں - اب اگر ہم اس گول گنبد پر اولے کی تہیں جمائیں، جوہر شراب ڈالیں یا اور کسی تدبیر سے اُس میں سردی پہونچا دیں تو صاف پتہ چلتا جائے گا کہ اندرونی ہوائیں دب دب کر پہلے سے کم فاصلہ میں گھر جائیں گی اور اگر ہم اسی گنبد کو ہتھیلی سے مل کر گرم کر دیں، تو وہی دبی دبائی ہوئی ہوائیں لچک لچک کر اپنی اصلی حالت پر آجائیں گی -

یہی پھیلنے اور دب جانے والی خاصیتیں ایسی ہیں جو "بادبسیط" کو ٹھوس اور بہنے والی چیزوں سے الگ تھلگ کر دیتی ہیں - یہ سچ ہے کہ دوسری اور تیسری قسم میں بھی یہی صفتیں موجود ہیں مگر بہت تھوڑی سی ہیں -

ہم نے مان لیا ہے کہ تمام مادی چیزیں فطری طور پر ایسی بنی ہوئی ہیں کہ اُنکے اجزاء آپس

میں ملے جلے ہوئے نہیں ہیں۔ غالباً کھینچنے اور جدا کرنے والی قوتوں کی مدد سے اپنی اپنی جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ [illegible] ہوں گی تاہم ہم سمجھتے ہیں کہ "بادبسیط" میں جسے ہم فضائی [illegible] کہتے ہیں جدا کرنے والی قوت کھینچنے والی پر چھائی ہوئی ہے۔ حالانکہ ٹھوس چیزوں میں [illegible] یعنی کھینچنے والی زیادہ طاقتور ہے۔ اور بہنے والی چیزوں میں دونوں قوتیں [illegible] برابر برابر ملی جلی [illegible] ہیں کہ انکے وزن و اختیار، جسامت و مقدار میں بال برابر بھی فرق نہیں [illegible]۔

ہمارے [illegible] نسبتی وزن کا تعلق ہے فضائی ہوائیں دوسری مادی اشیاء سے کہیں زیادہ [illegible] مرتبت [illegible] رفیع الدرجات ہیں۔ کیونکہ ان میں فطرت کا وہ بہترین جوہر موجود ہے جسے ہم [illegible] (وہ جوہر لطیف جو پانی کا ایک جزو ہے) پھر اسکے علاوہ جہاں تک [illegible] "بادبسیط" تمامی موجودات میں سب سے زیادہ پھیلی چیز ہے۔ [illegible] فضائی ہوائیں چاہے کسی مقدار میں ہوں، کیسے ہی محفوظ ومعات کے برتن میں بھری گئی ہوں، کیسے ہی [illegible] قید وبند میں رہی ہوں۔ جب باہر نکلیں گی تو انکی اصلی حالت اور سابقہ شکل [illegible] کبھی کی نہ آئے گی۔

[illegible] بادبسیط کی پھیل جانے والی صفت کو بھی مدد پہونچاتی رہتی ہے۔ فرض کیجیے کہ فضائی ہوائیں کسی بے پایاں خلا میں قید کر دی جائیں، یا کسی ایسی حالت میں "نظربند" رکھی جائیں جہاں کسی قسم کی کوئی [illegible] قوت نہ پہونچ سکے تو صاف ظاہر ہے کہ اُن کا پھیلاؤ بھی بے پایاں ہوگا۔ اجزاے [illegible] کی جدا کرنے والی قوت کھینچنے والی پر چھا جائے گی۔ اور ستم یہ کہ وہاں کوئی ایسی چیز موجود نہ ہوگی جو انکی راہ میں روک سکے۔

[illegible] بادبسیط کسی ٹھوس چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے تو اُسکی صورت جداگانہ ہوا کرتی ہے۔ پھیلاؤ ضرور ہوتا ہے مگر اپنی حد وانتہا سے بڑھنے نہیں پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ زمین اور اور سیارے پہلی فضا میں ہمیشہ ہمیشہ گھرے ہوئے رہتے ہیں۔ کیونکہ جس طرح ہماری زمین کا گولا ہر معلق چیز کو (چاہے وہ بم گولے یا توپ گولے ہوں خواہ وہ کتنی تیزی اور سختی سے رہا کیے گئے ہوں) اپنی طرف گرا لیتا ہے، اسی طرح کھینچنے والی قوت ہوا کے پھیلاؤ کو محدود کر لیتی ہے۔ اور

فضا" کو اپنی اصلی حالت پر قائم رکھتی ہے' باد بسیط منتشر نہیں ہونے پاتی بلکہ ہر پہلو سے نظر بندیوں میں جکڑی ہوئی رہتی ہے اسکے علاوہ جو قوتیں ہماری زمین کو اپنی طرف کھینچتی ہیں وہ بھی فضائی ہواوں کو متصل کر سکتی ہیں۔ کیونکہ سردی سے انکے اجزا میں انقباض اور سمٹن پیدا ہو جاتی ہے۔ مشاہدات نے بتایا ہے کہ ہم فضائے فلکی میں جتنے بلند ہوتے جائیں سردی اُسیقدر بڑھتی جاتی ہے اور ہر قسم کی ہوائیں برودت کی وجہ سے زیادہ گاڑھی اور کثیف دکھائی دیتی ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زمین کی کشش اور بالائی سردی یہی دو زنجیریں ایسی ہیں جو "باد بسیط" کو بیحد و بے انتہا پھیلنے نہیں دیتیں اور اسی وجہ سے فضائی ہواؤں کی گہرائی پچاس میل سے زیادہ نہیں ہونے پاتی۔

اس اصول کی بنا پر کہ باد بسیط ایک دب جانے والی مادی چیز ہے ہم یہ غیب کی بات بتا سکتے ہیں کہ مختلف بلندیوں پر فضائی ہواؤں کی کثافت جدا جدا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انکے وہ حصے جو زمین سے زیادہ قریب ہیں اُن بیچاروں کو اپنے اوپر والے لنگر کا پورا پورا بوجھ اُٹھانا پڑتا ہے۔ مگر یہی بوجھ ہلکا اور زیادہ ہلکا.... ہوتا جاتا ہے جیسے جیسے ہم فضائی قطعات میں اونچے اور زیادہ اونچے ہوتے جاتے ہیں' چونکہ ان بلند مقامات میں دباؤ ڈالنے والی ہوائیں کم مقدار میں ہوتی ہیں۔ لہذا لازمی طور سے لنگر بھی ہلکا ہونا چاہیے۔

یہ تمام باتیں ہمارے لگاتار مشاہدات کا نتیجہ ہیں۔ وہ نچلے حصے جو سطح زمین پر پڑے ہوئے ہیں انکی کثافت سب سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ مگر ہم جتنے ہی اونچے ہوتے جائیں اُن کا گاڑھاپن اُتنا ہی کم ہوتا جاتا ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ اگر ہم چار اونی پوستینیں تلے اوپر جما کر رکھدیں تو صاف دکھائی دیگا کہ سب نچلی پوستین اوپر والی تینوں پوستینوں کے بوجھ سے دب جائیگی اور سب سے اوپر والی پوستین پر اس لنگر کا بال بھر بھی اثر نہ پڑیگا۔ بالکل یہی حالت اُن اجزا کی بھی ہے جن سے فضائی ہواؤں کی خلقت ہوئی ہے۔ اسی لیے سطح زمین پر باد بسیط زیادہ کثیف ہے اور پہاڑ کی چوٹیوں پر بہت کم کثیف ہے۔ اگر ہم ذرا بھی عقل سلیم سے کام لیں تو یہ بات خود بخود سورج سے زیادہ اُجلی ہو جائیگی کہ فضائی ہواؤں کے لنگر اور لچک میں ایک عجیب رشتہ سربستہ موجود ہے۔ ذرا سوچیے تو اگر ہمارے اردگرد ہواؤں کی لچک کم ہوتی تو اوپر والے اجسام کا لنگر انکو منتشر و برباد کر دیتا اور اگر زیادہ ہوتی تو ان پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہ پڑتا اور "باد بسیط" پھیل کر خدا جانے کیا سے کیا ہو جاتی۔ لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ کسی ہوا کی لچک نہ تو کم ہے نہ زیادہ' بلکہ ٹھیک اُسی لنگر کے برابر ہے جو اُسکے اوپر چھایا ہوا ہے۔

طالب

# مسلمانانِ اندلس (اسپین) کی پہیلیاں

بچوں کو اپنے دماغ پر زور ڈالنے اور بڑوں کی ذہانت آزمانے کے لیے پہیلیوں سے بڑھ کر کوئی تدبیر نہیں ہے - ہر ایک مہذب و متمدن ملک میں ان کا رواج ہے - بوڑھے کہتے ہیں، بچے بوجھتے ہیں، جوان غور و خوض کرتے ہیں - شعرا انھیں کے ذریعہ سے چھوٹی چھوٹی بچیوں کے دربار میں ہو پہنچتے ہیں - فلسفی انگوٹھن کر سر دُھنتے ہیں - ہر چیز اور ہر بات کے لیے ایک موقعہ و محل ہوتا ہے، مگر پہیلیاں گویا مارشل لا ہیں کہ وقت اور غیر وقت کی پابند نہیں - مثلاً کہانیوں کو لیجیے کہ ان سے زیادہ دلچسپی کا باعث اور نہیں ہو سکتا - ذرا دن کے وقت یہ کہہ تو دیکھیے کہ "ہم کہانی کہتے ہیں" چھوٹی سی بچی آ کر آپ کو دھمکا دیگی کہ "خبردار! مسافر راستہ بھول جائیں گے" مگر پہیلیاں ہیں کہ کسی وقت کی پابند نہیں -

ہمارے ہندوستان میں حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کو پہیلیوں میں بجا شہرت حاصل ہے اندلس میں یہی رتبہ ابو جعفر احمد بن ابراہیم کو حاصل تھا - انکی پہیلیاں بہت مشہور اور زبان زد تھیں - یہ غرناطہ کے رہنے والے بہت بڑے شاعر تھے - ٦٧٣ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور ٧٤٩ھ ہجری میں انتقال کیا - ان کی فضیلت اسی سے ظاہر ہے کہ یہ وزیر لسان الدین جیسے ادیب کے اساتذہ میں سے ہیں - وزیر موصوف (رحمہ اللہ) نے انکی نظم و نثر کو جمع کر کے اُس کا نام "نافہ من نم و نفطۃ من یم" رکھا تھا - افسوس کہ یہ کتاب اب ناپید ہے، مگر بعض نظمیں اب بھی جواہرات کی طرح اکثر کتب ادب میں چمک رہی ہیں -

میں ذیل میں ممدوح کی چند پہیلیاں لکھتا ہوں - امید ہے کہ باوجود ایک غیر زبان ہونے کے لطف سے خالی نہ پائی جائیں گی :-

### کانون (انگیٹھی)

وما اسم لشیئین ولم یجمعہما جنس

بتایئے دو چیزوں کا کیا نام ہے جو نام میں ایک اور جنس میں مختلف ہیں

فہذا کلما یاتی　　فبا الآخر لی انس
یہ (ایک) جب کبھی آتا ہے تو دوسرے سے مجھے اُنس ہوتا ہے۔
وہذا ما لہ تشخص　　وہذا ما لہ حس
اس کا (ایک کا) تو کوئی تشخص نہیں ہے۔ اور اس میں (دوسرے میں) کوئی حس نہیں ہے
وہذا ما لہ سوم　　وذا قیمتہ فلس
اس کا (ایک کا) تو کوئی مول بھاؤ نہیں ہے۔ اور اس کی (دوسرے کی) قیمت ایک پیسہ۔
وہذا اصلہ الارض　　وہذا اصلہ الشمس
اس کی (ایک کی) اصل زمین ہے۔ اور اس کی (دوسرے کی) اصل آفتاب ہے۔
وہذا واحد من سبعۃ تحیا بہا النفس
یہ ایک ایسے سات میں سے ہے جن سے زندگی ہے۔
فمن نحو لہ الجن　　ومن موضوعہ الانس
اس کا (ایک کا) محمول جن ہے۔ اور اس کا (دوسرے کا) موضوع انسان ہے
فقد بان الذی الغزت　　ما فی امرہ لبس
جو پہیلی میں نے بوجھائی وہ ایسی واضح ہو گئی ہے کہ شک کی مجال نہیں۔

## مائدہ (دسترخوان)

حاجیت کل فطن نطار　　ما اسم لاُنثیٰ من بنی النجار
ہر ایک سمجھدار سے پہیلی بوجھواتا ہوں۔ بنی نجار کی عورت کا کیا نام ہے
وفی کتاب اللہ جاء ذکرہا　　فقلما یغفل عنہا القاری
قرآن میں بھی اُس کا ذکر ہے۔ اور پڑھنے والا اُس سے بہت کم غافل ہوگا۔
فی خبر المہدی فاطلبہا تجد　　ان کنت من مطالعی الاخبار
اگر تم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہو تو مہدی کے اخبار میں اسے تلاش کرو۔
ماہی الا العید عید رحمۃ　　ونعمۃ ساطعۃ الانوار
وہ عید ہے اور رحمت عید۔ اور نعمتِ روشن۔

یشر کہا فی الا سم وصف حسن من وصف قضب الروضۃ المعطار
خوشبو والے باغ کی شاخوں کے اوصاف میں سے ایک اچھا وصف اُسکے نام میں شریک ہے۔
نہا کہہ کالشمس فی وقت الضحیٰ قد شق عنہا حجب الاستار
لو - یہ واضح پہیلی ایسی روشن ہے جیسے چاشت کے وقت آفتاب -

مسک (مشک) نمبرا

ما طاہر طیب و لا کن ما اصلہ ذوی الطہارہ
وہ کون سی پاک چیز ہے جس کی اصل پاک نہیں ہے -
من الظباء الحسان لاکن اذ رتا ملتہ فغارہ
وہ خوبصورت ہرنوں سے (ماخوذ) ہے اور غور سے دیکھو تو چھپا ہے - (الغارۃ - نافۂ مشک)
نص حدیث الرسول فیہ شہادۃ تقتضی بشارہ
آنحضرت علیہ الصلوۃ والسلام کی حدیث اس کی اس شہادت ہے جو متضمن بشارت ہے
تصحیفہ بعد حذف حرف منزل الاہل العمارہ
اس میں ایک حرف حذف کرکے غلط پڑھو تو وہ ایک آباد قبیلہ کی منزل ہے

نمبر۲

کتبتم کثیراً و لم تکتبوا کہذا الذی سبلہ واضحہ
تم نے بہت لکھا لیکن ایسا نہیں جیسے کہ اس کی (یعنی ہمارے لکھے ہوے کی) راہیں واضح ہیں۔
فما اسم جری ذکرہ فی الکتاب فان شئتہ فاقرأ الفاتحہ
اس کا کیا نام ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں بھی ہے - اگر تم چاہو تو فاتحہ پڑھ کر دیکھ لو۔
ففیہا مصحف مقلوبہ یعبر عن حالہ صالحہ
اس میں (یعنی فاتحہ میں) اس کا اُلٹا ہوا نام غلط ہے جو اس کی اچھی حالت ظاہر کرتا ہے۔
ولیت بنا دیۃ فاعلموا ولکنہا ابداً رائحہ
یہ سمجھ لو کہ وہ صبح ہی نہیں بلکہ ہمیشہ مہکتی ہی رہتی ہے۔

## فلک (آسمان)

ما اسم شئ مرتقی فی مغرب و مشرق

جو مشرق و مغرب میں بلند ہے اُس کا کیا نام ہے

اذا حذفت فاء ہ کان لک الذی بقی

اسکی فا، کو اگر حذف کردو تو جو باقی رہتا ہے وہ سب تمھارا ہو جائے۔"لک" کے معنی عربی میں "تیرا" ہے

## نوم (نیند)

ما اسم مسماہ بہ یسقط حکم التکلیف

اُس کا کیا نام ہے جس سے موسوم ہونے سے حکم تکلیف دُور ہو جاتا ہے۔

وان دخلت البیت بالتصحیف حق التعنیف

اور اگر اسکے لفظ کو غلط کرکے گھر میں داخل ہو تو مستحق سرزنش قرار پاؤ۔

وان امردت شبہہ فقلبہ بالتصحیف

اور اگر تم اسکے ہمشکل (مشابہ) چاہو تو اُسے غلط کرکے اُلٹ دو۔

بینہ فھو فی کتاب اللہ بادی التعریف

بتاؤ۔ قرآن میں اس کی تعریف واضح ہے۔

## نمل (چیونٹی)

ما حیوان اسمہ قد جاء فی الذکر الحکیم

وہ کونسا جانور ہے جس کا نام کلام پاک میں آیا ہے۔

وھو اذا قلبتہ لمن بہ انت علیم

اور جب تم اُسے اُلٹ دو تو لمن ہوگا جسے تم خوب جانتے ہو۔

وان تصحفت اسمہ فبعض اوصاف اللئیم

اور اگر اس کا نام غلط کردو تو کمینہ کے بعض اوصاف ہو جائیں۔

## قلم

موم بہ عرف الامام کما باہت بصحبتہ الکرام

اور یہ مقتدی جس سے امام پہچانا جاتا ہے۔ اور وہ ایسے ہی مفاخرت کرتا ہے جیسے شرفا اپنے حباب پر فخر کرتے ہیں

لہ ..یہ توی ملیشان صاو ولکن حین یعیروہ الاوام

جو پیاس کے وقت ... رہ ہو جاتا ہے تو اس میں ایسی تیزی ہوتی ہے جیسی پیاس (کے وقت پیاسے کو)

..ری حین یستقی و هو عا یرق کما یرق الابتسام

جب وہ چلتا ہے تو (اسکے بعد) بیئے (خوشی آئندہ) آنسو بہاتا ہے جیسے مسکراہٹ میں دانت خوش آئند معلوم ہوتے ہیں۔

## لبن (دودھ)

اذکیف ما اسم اذا ما صحفته فهو سبع

مجھ کو بتاؤ کہ وہ کونسا نام ہے جسے غلط پڑھو تو وہ درندہ ہو جائے۔

وان تصحفه معکوساً ففیه للقبط شرع

اور اگر اسے بالعکس غلط پڑھا جائے تو اس میں قبط کا شرع ہو۔

والاسم یعرب عما لدیه ری و شبع

اور اُس کا اصلی نام ایسی بات ظاہر کرتا ہے جس سے سیرابی و شکم سیری ہے۔

فی النحل یلفی ولا کن لا یتقی فیه لسع

شہد کی مکھیوں میں وہ پایا جاتا ہے۔ لیکن اس میں ڈنک کا ڈر نہیں ہے۔

فلیس للنحل اصلاً ولا لها فیه فرع

تو شہد کی مکھیوں کے لیے اس میں نہ کوئی اصل ہے نہ فرع۔

فهاکه قد تبدی لحجبه عنه رفع

لو یہ (پہیلی) پردہ ہائے حجاب سے نکل کر بالکل ظاہر ہے۔

## حوت (مچھلی)

ما حیوان فی اسمه ان اعتبرته فنون

وہ کونسا جانور ہے جس کے نام میں اگر ان میں غور کرو تو نون ہو۔

احرفه ثلاثة والکل منها هو نون

اس کے تین حرف ہیں۔ اور اُن میں سے ہر ایک نون ہی ہے۔

ان انت صحفت اسمہ　　فما جنٰہ المذنبون
اگر تم اُسے غلط پڑھو تو وہ ہو جائے جس کا ارتکاب گنہگار کیا کرتے ہیں۔
او ابیض او اسود　　او صفتہ النفس الخؤن
وہ سفید ہوتی ہے یا سیاہ یا اُس کے اوصاف خائن نفس کے سے ہیں۔
قلب اسمہ مصحفا　　علیہ دارت السنون
غلط کرکے اُسکے نام کو پلٹ دو (تو ایسی حالت میں) اُس پر برسیں گذر گئیں۔
کانت بہ فی ماسطٰے　　عبرۃ قوم یعقلون
گذرے ہوے زمانہ میں اس میں سمجھدار قوموں کے لیے عبرت تھی۔
اودع فیہ زمنا　　سر من السر المصون
ایک زمانہ میں اس میں ایک نہایت محفوظ بھید ودیعت کیا گیا تھا۔
فہا کہ کالنار فی الزند کہ فیہا کمون
لو جیسے چقماق میں آگ مستور رہتی ہے اُسی طرح یہ پہلی بھی ان الفاظ میں مستور ہے۔

---

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ یکایک خیال آیا کہ وہ بھی عجیب وقت اور سماں ہوگا کہ عرب کے جواہر پارے اپنے کاشانوں میں اور بربری کاشتکاروں کے لخت جگر اپنی جھونپڑیوں میں بیٹھے ہوے یہ پہیلیاں کہتے سنتے ہوں گے۔ اسکے ساتھ ہی یہ خیال ہوا کہ ظالموں نے نہ کہنے والوں کا نشان چھوڑا نہ سننے والوں کی قبریں باقی رکھیں۔ اسکے ساتھ ہی دل بھر آیا۔ کتاب بند کر دی۔ پھر جو کھولتا ہوں تو ابن جیابؒ کی ایک نظم پر نظر پڑی۔ اُس کا پہلا شعر لکھتا ہوں:-

قضی الامر فیا نفس اصبری　　صبر تسلیم لحکم المقدر
(خدا کا حکم پورا ہو چکا تو اے نفس تقدیر کے حکم پر صبر و تسلیم اختیار کر)

گو معقول مزاج حضرات مجھ نا معقول پر ہنسیں، مگر میں اس کو ابن جیابؒ کی کرامات سمجھتا ہوں۔

محمد خلیل الرحمٰن

# نقد و تبصرہ

"ناظر"

## ادب

(۱) **زبانِ اُردو پر سرسری نظر** - از رشید احمد صدیقی صاحب ایم اے - لکچرر اُردو مسلم یونیورسٹی۔ ضخامت ۵۲ صفحے - تقطیع ۲۰×۲۶ - قیمت درج نہیں - غالباً منیجر مسلم یونیورسٹی پریس علیگڈھ سے مل سکے - (کتاب بغرض فروخت نہیں شایع ہوئی بلکہ محض خراجِ تحسین وصول کرنے کے لیے - (ایڈیٹر)

پچھلے سال کانفرنس نے ایک مفید جدت یہ کی، کہ مختلف ماہرینِ فن کے لکچروں کا مختلف عنوانات پر اپنے زیرِ اہتمام انتظام کیا - ایک عنوان "اُردو زبان" تھا، اُس کے لیے قرعۂ انتخاب خوش قسمتی سے علیگڈھ میگزین کے ہیرو، رشید صاحب پر پڑا، جو یونیورسٹی میں زبانِ اُردو کے اُستاد بھی ہیں - یہی لکچر نظرِ ثانی کے بعد اب کتابی صورت میں شایع ہوگیا ہے، اور اسوقت زیرِ تبصرہ ہے -

موضوع بیحد وسیع تھا، اس پر لکچر دینا آسان نہ تھا - اُردو زبان کی تاریخ، اس کی موجودہ ضروریات، رسم الخط، مصطلحاتِ علمی، ادبیاتِ حاضرہ پر تبصرہ، وغیرہ بیسیوں عنوانات پیدا ہونے لازمی تھے، جن میں سے ہر عنوان بجاے خود ایک مبسوط بحث کا محتاج تھا - نہایت مسرت ہے، کہ نوجوان مصنف اس دشواری پر پوری طرح غالب آگیا - اُس نے اپنے خداداد ذوقِ سلیم سے کام لیکر ہر ضروری بحث کو لیا، ہر بحث پر سنجیدگی سے اظہارِ خیال کیا، اور کتاب کے وصفِ جامعیت کو کہیں سے بھی ہلکا نہیں ہونے دیا -

بعض مسائل متعلقہ پر اس قدر صحیح، اور اتنے جنچے تُلے الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے، کہ اس میں کسی ترمیم یا اضافہ کی گنجایش نہیں رہ جاتی - ہوا خواہانِ اُردو کے لیے یہ ایک ہمت شکن حقیقت ہے، کہ اُردو کے خدمتگزار بہت ہی قلیل تعداد میں ہیں - فاضل لکچرر اس گتھی کو یوں سُلجھاتے ہیں :-

"میں یہ نہیں عرض سکتا کہ ہمارے یہاں ماہرانِ اُردو کی کمی ہے، یا خود اُردو میں استعدادِ بہم پہنچانے کی

نہیں ہے - میں صرف یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ اُردو کی پُرسش نہیں ہے ..... اُردو کا کوئی معاوضہ نہیں ہے - اُردو لکھنے پڑھنے اور سیکھنے میں لوگ تامل کرتے ہیں، اس لیے کہ آزوقۂ حیات میں اس سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا ...... حصول معاش میں اس سے کوئی معتدبہ نفع نہیں ہوتا - یہی سبب ہے کہ لوگ خلوص، شوق، یا ضرورت کی بنا پر اسکی طرف متوجہ نہیں ہوتے - جب تک اُردو کی قدر و قیمت روپیوں میں تحویل نہ کی جاسکے، لوگوں کی توجہ اس طرف بمشکل منعطف کرائی جاسکتی ہے - ہم تمام عمر انگریزی زبان سیکھنے میں صرف کر دیتے ہیں ... لیکن یہ دقت ہمت شکن نہیں معلوم ہوتی، اس لیے کہ حصول معاش یا ملازمت میں یہ بوجوہ معلومہ معین ہوتی ہے - اُردو داں دونوں حالتوں میں محروم رہتا ہے، یہاں نہ ڈگری کی پُرسش ہے، اور نہ ذاتی قابلیت کی کوئی قیمت - پھر آپ ہی بتائیں کہ اُردو سیکھنے کی دردسری سے فائدہ؟ ...... اُردو میں تبحر حاصل کرکے کسی کو نفع کی کیا توقع ہو سکتی ہے؟ کتنے اسکول یا کالج ہیں جہاں ان کے لیے جگہ نکل سکتی ہے؟ کتنے دفاتر یا محکمہ جات ہیں جو ان کی پذیرائی کے لیے آمادہ ہیں؟ ... آپ گھر بیٹھے تصنیف و تالیف کی ابتدا کیونکر کر سکتے ہیں، جب اُنکے پڑھنے والے ہی معدوم ہیں" (ص۲۲-۲۳)

ریویو نگار کو مرحوم لسان العصر الہ آبادی کا یہ ارشاد کبھی نہیں بھولتا کہ "لوگ کہتے ہیں کہ ابوالفضل و فیضی اب نہیں پیدا ہوتے، میں کہتا ہوں کہ کیوں پیدا ہوں، پہلے کوئی اکبر تو پیدا ہولے"۔

مصنف کا یہ خیال بالکل درست ہے، کہ ملک میں عالمگیر بھاشا (لنگوا فرینکا) بننے کی صلاحیت اگر کسی زبان میں ہے، تو وہ اُردو ہی زبان یعنی اُردو رسم الخط کے ساتھ ہے، اور اپنے اس دعوے کو اُنھوں نے جس دلنشیں پیرایہ میں ثابت کیا ہے، وہ اصل کتاب میں قابل دید ہے - اور ہر حیثیت سے قوی و مستحکم ہے (ص۲۶-۲۴) البتہ اس سلسلہ میں اُنھوں نے مہاتما گاندھی کے پیش کردہ خاکہ زبان "ہندوستانی" سے جو اختلاف کیا ہے، اسکی چنداں حاجت نہ تھی - گاندھی جی جس شے کو "ہندوستانی" سے موسوم کر رہے ہیں، وہ دراصل اُردو ہی ہے - نام کے بدل دینے سے کسی شے کی ماہیت و حقیقت نہیں بدل جاتی - اگر ہندو برادران وطن بجائے اُردو کے "ہندوستانی" کہنے سے خوش ہوتے ہیں، تو ہمیں کسی اسکے قبول کر لینے میں تامل نہ ہونا چاہیے - اور قدیم انگریز تو اُردو کو ہندوستانی کہتے ہی تھے -

رسم الخط کا سوال البتہ کسی قدر دشوار ہے۔ اُردو اور ہندوستانی تو مرادف الفاظ ہیں، البتہ اُردو (فارسی) رسم الخط، بیشک ہندی رسم الخط سے مختلف ہے، اور ایک فریق بعض سطحی دلائل کی بنا پر ہندی رسم الخط کو رواج عام کے لیے پیش کر رہا ہے۔ لیکن جیسا کہ رشید صاحب نے تفصیل سے دکھایا ہے، "اس دعوے کی بنیاد کسی قوی دلیل پر نہیں، بلکہ حق ترجیح اگر پہونچتا ہے تو اُردو کے مروجہ رسم الخط ہی کو پہونچتا ہے" (صفحہ ۳۰-۳۲)

آغاز کتاب میں مصنف نے حالی، اکبر، اقبال پر جو تبصرہ کیا ہے اور اُردو کی تاریخ ارتقائی میں ان کے جن مدارج کی تعیین کی ہے، وہ نہایت نکتہ سنجانہ ہے، اور خود ریویو نگار کے خیال کا بالکل توارد ہے۔ ماضی، حال، مستقبل کے ادوار ثلثہ سے ہر قوم کو گذرنا ناگزیر ہے، اور یہ تینوں بزرگ، علی الترتیب اپنے اپنے دور کے پیمبر ہوئے ہیں۔ ایک نے اجداد و اسلاف کی عظمتوں پر نوحہ خوانی کی، دوسرے نے زمانے عصر کی جدت طرازیوں پر خوب خوب چٹکیاں لیں، تیسرے کا کام اقدام عمل پر قوم کو آمادہ کرنا ہے۔

آخر حصۂ تصنیف میں مصنف نے اُردو زبان کی ترقی و تحفظ کے لیے سات تجویزیں پیش کی ہیں۔ (۱) ایک جامع کتبخانہ اُردو۔ (۲) علیگڈھ میں انجمن اُردوئے معلّٰی کا قیام۔ (۳) معلمین اُردو کی کانفرنس کا سالانہ انعقاد۔ (۴) مشاہیر اساتذہ و ماہرین اُردو کی ایک مجلس یا اکاڈمی، جو مسائل زبان پر ٹکسال کا کام دے۔ (۵) اُردو مکاتب کا بکثرت اجرا۔ (۶) ایک وسیع دارالترجمہ و دارالتصنیف کا قیام۔ اور (۷) صحیح اصول پر افسانہ نویسی کی ترویج۔ اور ان میں سے ہر عنوان کے متعلق مصنف نے تفصیلی گفتگو بھی کی ہے۔ یہ سب تجاویز بجائے خود معقول ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ بلحاظ اہمیت سب مساوی نہیں، بعض کا تعلق مخصوص علیگڈھ سے ہے، اور سب کا قابل عمل ہونا تو یقیناً خارج از بحث ہے، جیسا کہ اس اثنا میں خود لکچرر صاحب کو بھی تجربہ سے نظر آگیا ہوگا۔

کتاب شروع سے آخر تک جس ادیبانہ و انشا پردازانہ عبارت میں ہے اُس کا کسی قدر اندازہ اقتباس ذیل سے ہوگا:۔

"اُردو زبان اور موجودہ دور کے متعلق مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا، وہ کم و بیش عرض کر چکا۔ اب میں اپنے فرض کے اُس حصہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جس سے بڑھ کر آسان اور کوئی چیز نہیں، یعنی صلاح و مشورہ! قبل اسکے کہ میں کچھ اور عرض کروں، اس امر کا اظہار ضروری

سمجھتا ہوں کہ اس وقت دہلی اور لکھنؤ دونوں اُردو کی طرف سے انتہائی استغنا برت رہے ہیں حالانکہ ان دونوں مقامات پر یونیورسٹیاں قائم ہو چکی ہیں، اور ہر قسم کی سہولتیں موجود ہیں، لیکن مجھے افسوس ہے، کہ یہ خانقاہیں صرف اپنے گذشتہ سجادہ نشینوں کی سوگوار ہیں، کنعان و مصر دونوں ویران ہیں اور رستاخیز یوسفی کے لیے آنکھیں بیقرار ہونے لگی ہیں۔ اب وہ دن دُور نہیں ہے، جب ہماری مایوس نگاہیں صرف حیدرآباد کی فضا کو اپنا نشیمن بنائیں۔ جنوبی ہند کے اُردو پر جو کچھ احسانات رہے ہیں، اُن سے آپ واقف ہیں۔ کیا تعجب ہے، زمانہ کا انقلاب اُنھیں لیل و نہار کو پھر ہمارے سامنے کر دے، جن کی کروٹیں کبھی اُردو کی گہوارہ جنبانی کر چکی تھیں۔" (صـ۳۵)

ایک صفحہ کیا معنی ایک سطر بھی کتاب بھر میں غیر دلچسپ نہ ملے گی۔ رشید صاحب سے توقع بھی اسی کی تھی۔ البتہ دلاویزی عبارت کے علاوہ جس اصابتِ رائے، نقد صحیح، پختگی خیالات، و امعانِ نظر کا اندازہ اس کتاب سے ہوتا ہے، وہ توقع سے زائد ہے۔

طبعِ آئندہ کے وقت اگر امور ذیل پر لحاظ رکھ لیا جائے، تو یہ آئینہ روشن سے روشن تر ہو جائے۔

(۱) بعض الفاظ مثلاً صـ۳۵ پر "اصلحات"۔ یا صـ۴۲ پر "محاذ"۔ صـ۴۳ پر "خدوخال" کی صحت کے متعلق مزید اطمینان کر لیا جائے۔

(۲) اس قسم کے انگریزی الفاظ کے استعمال پر رشید صاحب کو خود اپنے ہی ذوقِ سلیم سے ایک بار پھر استفتاء کرنا چاہیے:۔ "ری مائینس"، "کلاسکس" "لائبریری" "ایجنسی" "انسٹی ٹیوشن" وغیرہ۔ یا پھر اس قسم کے فقرے، کہ "تمھاری تحریر کا نم سے بہتر ترجمہ نہیں ہو سکتا"۔

(۳) صـ۴۳ پر اُن چند اصحاب کے نام لیے گئے ہیں، جو اپنے اپنے رنگ میں اُردو زبان و انشاء کے مالک کہے جا سکتے ہیں۔ یہ کیسا ظلم عظیم ہے، کہ یہ صفحہ محمد حسین آزاد، شبلی و حالی کے ذکر سے خالی ہے، اور نذیر احمد کی قلمرو کو صرف "مضحکات و ملزیات" تک محدود رکھا ہے! اسی صفحہ میں ایک لفظ "ملگوریت" بھی آیا ہے۔ کاش رشید صاحب اس جرم کے سب سے بڑے مجرم کا نام بھی آزادی کے ساتھ لکھ دیتے۔

مصنف کی یہ پہلی تصنیفی کوشش تھی، جو ہر پہلو سے نہایت کامیاب و قابل قدر ثابت ہوئی ہے۔

انشاء اللہ وہ دن دُور نہیں، جب ہم اس نوجوان اہل قلم کو اُردو مصنفین کی صف اول میں ایک ممتاز مرتبہ پر پائیں گے۔

(۲) **مکمل شرح دیوان غالب** - مولفہ مولوی عبدالباری آسی اُلدنی - ضخامت ۳۷۴ - تقطیع ۱۸ × ۲۲ سلنے کا پتہ صدیق بُک ڈپو، امین آباد، لکھنؤ۔ قیمت باختلاف کاغذ سے، و ع

غالب کے دیوان اُردو کی متعدد شرحیں لکھی جا چکی ہیں، اور یہ غیر ضروری سلسلہ برابر جاری ہے - اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ شرح بھی ہے - بعض اشعار کے معانی تحریر کرنے میں آسی صاحب نے یقیناً تلاش و محنت سے کام لیا ہے اور اس لحاظ سے اُنکی کوشش قابل داد ہے - جابجا مقابلہ و توضیح مطالب کے لیے دوسرے شاعروں کے کلام کو بھی پیش کیا گیا ہے - دلی اور لکھنؤ کی زبان کے فرق کو بھی بعض مقامات پر واضح کیا گیا ہے، البتہ شارح صاحب کا اپنے کلام کو سنداً یا تمثیلاً پیش کرنا مذاق سلیم کو خوشگوار نہیں معلوم ہوتا آیندہ اس سے احتیاط بہتر ہوگی -

(۳) **حجاب زندگی اور دیگر افسانے** - مولفہ سید عابد علی عابد بی اے - ناشر اشاعت اردو ہاؤس، لاہور - تقطیع خُرد - ضخامت ۱۶۰ صفحے - قیمت عہ

یہ سات مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے، جو پنجاب کے ایک جدید اہل قلم کا ثمرۂ فکر ہے - ان افسانوں کا مقصد "اخلاقی تعلیم نہیں" بلکہ بقول مولف "صرف یہ ہے کہ" زندگی کی فطرت کے تاریک پہلو کو .... دکھایا جائے" افسانوں کے پلاٹ میں انگریزی قصوں کا تتبع کیا گیا ہے - کہیں کہیں صاف ترجمہ پن نظر آتا ہے - صحت زبان و شستگی عبارت کے اندازہ کے لیے ذیل کا نمونہ کافی ہوگا:-

"عشق و محبت کے زیر تحت عنوانات سے" (صـ۱۳)

"یہ ایک نفس الامری حقیقت ہے" (صـ۱۳)

"ایک معصوم بچہ کا دل ہر ایک طرح کے گرد و غبار سے مخلّی ہوتا ہے" (صـ۱۵)

"ان افسانوں کے محزن کو زیادہ واضح ... کروں گا" (صـ۱۵)

## مذہب

(۱) **بشریٰ** - مصنفہ مولانا سید سلیمان ندوی - ضخامت ۸۴ صفحہ - تقطیع خُرد - سلنے کا پتہ:- احمد برادران، تاجران کتب، علیگڈھ - قیمت ۴ر

مولانا سید سلیمان ندوی نے کچھ عرصہ ہوا، اپنے رسالۂ معارف میں ایک مضمون اس بحث پر تحریر فرمایا تھا، کہ اسلام کا خدا، غصہ ور و سخت گیر نہیں، جیسا بعض مستشرقین نے اپنی غلطی سے سمجھ رکھا ہے، بلکہ رحمٰن و رحیم، مہربان و شفیق، اور دلدار و محبوب ہے۔ یہی مضمون، بعد اصلاح و اضافہ، ایک رسالہ کی صورت میں شایع ہوا ہے۔ مولانا کا یہ دعویٰ آیات قرآنی، احادیث نبوی سے مدلل، اور عقیدۂ اسلام کی بالکل صحیح تعبیر ہے۔ طرز بیان صاف، سلیس و دلکش۔ ہر شخص پر جو اسلام کی صحیح تعلیم سے واقف ہونا چاہتا ہے، یا جو اپنے دل میں خدا اور رسولؐ کی محبت کا کوئی جز و بھی رکھتا ہے، اس کا مطالعہ واجب ہے۔

(۲) خیر الوصیۃ۔ مترجمہ مولوی ابو الخیر محمد خیر اللہ۔ ضخامت ۲۲ صفحہ۔ تقطیع خُرد۔ قیمت صرف ار ملنے کا پتہ:۔ حاجی محمد محی الدین، تاجر کتب، نمبر ۳۹۹ ـ موچی بازار، لشکر بنگلور۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، جس پایہ کے محقق شریعت و امام طریقت گذرے ہیں، اُس سے ہر شخص واقف ہے۔ یہ رسالہ اُنھیں کے وصایا کا اُردو ترجمہ ہے۔ کُل بارہ وصیتیں ہیں، جن میں سے اکثر ایسی ہیں، جنکی اشاعت آج مسلمانوں میں نہایت ضروری ہوگئی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے طریقۂ اتباع رسول، اور پابندی احکام شریعت کی سخت تاکید کی ہے، اور تقاریب شادی و غم کے مواقع پر بدعات و مراسم پرستی سے بچنے کی شدید مخالفت کی ہے۔ سالکان طریقت و طالبان تصوف اُنکی ہدایات ذیل کو اپنے لیے خصوصیت کے ساتھ سبق آموز پائیں گے:۔

> "اس زمانہ کے مشائخ جو قسم قسم کی بدعتوں میں مبتلا ہیں، اُن کا ہرگز مرید نہ ہونا چاہیے اور اُن سے کبھی بیعت نہ کی جائے۔ اُنکی کرامات اور عام لوگوں کے رجوع ہونے پر دھوکا نہ کھانا چاہیے، کیونکہ عام لوگوں کا رجحان ایک رسمی بات ہے، اور ایسی رسمی چیزیں فی الحقیقت اعتبار کے لائق نہیں ہیں ........
>
> بہتر طریقہ یہ ہے کہ طالب کتب حدیث مثلاً صحیح بخاری و مسلم و سنن ابی داؤد و ترمذی اور کتب فقہ حنفیہ و شافعیہ کو پڑھتا رہے۔ اور ظاہر سنت پر عمل اختیار کرے۔ اگر حق سبحانہ تعالیٰ اُس کے دل میں شوق صادق عطا فرمائے، اور اس روحانی راستہ کی طلب غالب ہو جائے، تو کتاب عوارف المعارف کے آداب نماز و روزہ اور اوراد و وظائف میں مشغول رہے

اور سلسلۂ نقشبندیہ کے رسالوں کا روحانی نسبت کے پیدا کرنے کے لیے مطالعہ رکھے۔"
اس دورِ فتن میں، جبکہ حقیقی تصوف کے بجائے شعبدہ بازی کا رواج عام ہوگیا ہے، اس رسالہ کا مطالعہ ہر مسلمان کے لیے مفید ہوگا۔ زبان صاف و سادہ ہے۔

(۳) فتویٰ اکفرِ بے نماز مع رسالہ بے نمازاں (منظوم) ضخامت ۳۲ صفحہ۔ تقطیع خُرد قیمت ار ملنے کا پتہ۔ حاجی محمد محی الدین۔ تاجر کتب ۳۹۹۔ سوچی بازار۔ لشکر بنگلور۔

تارکین نماز پر زجر و تہدید۔ بے نمازیوں کے کافر ہونے کا فقہاء حنفیہ کی کتابوں سے ثبوت۔ حاشیہ سے بھی استدلال کیا ہے۔

(۴) برقِ جہندہ۔ حجم ۱۶ صفحہ۔ تقطیع ۲۰ × ۲۶۔ قیمت اور پتہ درج نہیں، بلکہ "المشتہر" کا نام "شیخ الدین شاہ صاحب" درج ہے، اپنی فتنہ انگیزیوں کے لحاظ سے یقیناً اس قابل ہے کہ اسکا شمار ہفتم رقومات میں کیا جائے۔ "ٹائیٹل" پر بجائے مصنف کے اسم گرامی کے، پوری چار سطروں میں "ان بزرگان کرام" کے اسمائے پاک درج ہیں، جن کی "حسب فرمائش" یہ رسالہ طبع ہوا ہے۔ ان اشخاص کے نام اس نمونے کے ہیں:-

"خلیفہ مخدوم معدنیہ صاحب شاہ صاحب"۔

"شیخ المشائخ یحییٰ اللہ شاہ صاحب" وغیرہ۔

جس عجیب تراشتی کے یہ لوگ آلہ رہا ہیں، اس کا نام ان الفاظ میں درج ہے:-

"جناب سرکار حضرت خواجہ شاہ نعیم قدرتی صاحب صدر نشین"

یہ تصریح کہیں نہیں ملتی، کہ یہ "جناب سرکار" "صدر نشین" کس بزم کے ہیں؟ بزم ارتداد کے؟ مجلس تخریب ایمان کے؟ محفل القاء شیطانی کے؟ رسالہ کا خلاصہ یہ ہے، کہ نماز پڑھنی ناجائز ہے! اور "صوفی" کو تارکِ صلوٰۃ ہونا چاہیے! قصبہ فتحپور ضلع بارہ بنکی میں ایک دجّال گھورو شاہ پیدا ہوا ہے، جس کی تبلیغ ترک نمازی ہے۔ مسلمانوں نے اپنے قصبہ کے مشہور مقدس بزرگ مولانا عابد حسین مدظلہ کے حسب ہدایت اس شیطانی گروہ سے اپنے تعلقات منقطع کر لیے، یہ رسالہ اسی گروہ کی حمایت میں شائع ہوا ہے۔ دلائل ایک سے ایک بڑھ کر مہمل ولغو پیش کیے ہیں۔ جا بجا آیات قرآنی نقل کی ہیں، مگر ایک آیت سے بھی اس نتیجہ کی تائید نہیں نکلتی۔ اقوالِ رسول کریمؐ

بجائے کتب احادیث کے مخزن الانوار نامے کسی کتاب سے نقل کیے ہیں۔ وہاں تو انھیں حدیث کہنا ہی سرے سے غلط ہے، پھر اگر مان بھی لیا جائے، تو مصنف کا مدعا کسی تاویل کے ساتھ بھی ان سے ثابت نہیں ہوتا۔ مولانائے رومؒ کے اشعار بھی بکثرت درج کیے ہیں۔ ان میں بے عقلی اور بددیانتی دونوں سے کام لیا ہے، بعض اشعار دوسروں کے ہیں، انھیں مولاناؒ کی جانب منسوب کر دیا ہے۔ جو اشعار واقعۃً مولانا کے ہیں، اُن سے محض نمازِ ریائی، اور عبادت نمائشی کی منقصت نکلتی ہے (جو ایک کھلی ہوئی معصیت ہے) نہ کہ نفس نماز کی۔ "غروری" "سلی لوگ" وغیرہ کثیر غلط الفاظ، لکھنے والے کی جہالت ثابت کر رہے ہیں۔ اس سے زائد اس شیطانی گردش قلم، اور جاہلانہ تالیف پر کچھ لکھنا تضیع وقت کرنا ہے۔

## متفرق

(۱) **خطابت و تقریر** - مولفہ حکیم خواجہ شمس الدین احمد لکھنوی - ضخامت ۴۸ صفحہ تقطیع خرد۔ قیمت درج نہیں۔ پتہ غالباً، نامی پریس، نخاس، لکھنؤ۔

فن خطابت، دراصل فلسفہ ہی کی ایک شاخ ہے۔ یونانیوں میں ارسطو نے اس پر مستقل کتاب لکھی۔ مسلمانوں میں ابن رشد، ابن سینا، و فارابی نے اس پر لکھا۔ انگریزی میں بین، وغیرہ کی کتابیں اس موضوع پر موجود ہیں اُر [illegible] اس حیثیت سے بے مایہ تھی۔ شکر ہے کہ حکیم شمس الدین صاحب لکھنوی کو ادھر توجہ ہوئی، اور انھوں نے پہلے مسلم اکاڈمی کے سامنے اس عنوان پر لکچر دیا، اور پھر اُس لکچر کو کتابی صورت میں طبع کر دیا۔

حکیم صاحب کا یہ رسالہ مختصر ہے، لیکن ناقص نہیں۔ تعریف، موضوع و غایت کے بتانے کے بعد اُنھوں نے دلائل، تحریک جذبات، ترتیب، آداب، وغیرہ ہر ضروری عنوان پر گفتگو کی ہے، اور ماہرانہ انداز سے ہر مسئلہ کی دلنشیں توضیح کی ہے۔ آخر میں "دینی خطبات" اور "قدیم و جدید خطبات" کے زیر عنوان اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اُس پر عمل کرنے سے ہماری بہت کچھ اصلاح ہو سکتی ہے۔ اعلیٰ خطابت کی مثالیں اُنھوں نے قرآن، حدیث، اور بعض اقوال مشاہیر سے پیش کی ہیں، اور اپنے ہر بیان کو مدلل کرنے کے ساتھ ہی دلچسپ بھی رکھا ہے۔ اُمید ہے کہ اس رسالہ کو ملک میں مقبولیت حاصل ہوگی، اور حکیم صاحب بھی آیندہ اسی موضوع پر کسی مبسوط تالیف کے لیے وقت نکال سکیں گے۔

(۲۰) **مسلمانوں کی مالی اصلاح** - از سید طفیل احمد - ضخامت ۱۶ صفحہ - تقطیع خرد - غالباً مفت، مولف سے ملے -

ترویج سود سید طفیل احمد صاحب کا خاص مضمون ہے، وہ اسی ایک موضوع پر عنوانات بدل بدل کر متعدد رسالے شایع کر چکے ہیں - رسالۂ پیش نظر میں سود لینے کی مختلف صورتیں بتائی گئی ہیں۔ سید صاحب کے دلائل مذہبی و منطقی دونوں حیثیتوں سے جس قدر کمزور و بے ثبات ہیں، اُن کے تذکرہ سے آج کل مختلف اخبارات و رسائل لبریز نظر آتے ہیں، خود الناظر میں بھی کافی بحث ہو چکی ہے، اس لیے کسی تفصیلی تنقید کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی - خدا اس فتنہ سے ہر مسلمان، بلکہ ہر ذی عقل انسان کو محفوظ رکھے -

## ریویو

**کتاب الحدائق** - حصہ اول - مرتبۂ محمد قربان علی صاحب - بن بن زرسری سہارنپور قیمت ۴ر

اس کتاب میں لائق مصنف نے یہ کوشش کی ہے کہ زراعت اور اُسکے متعلق دیگر علوم کے اصول عام فہم طریقہ اور دلچسپ پیرایہ میں سمجھائے جائیں - زبان کے متعلق نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اُردو میں اصطلاحات علمیہ کا ذخیرہ بہت مختصر ہے - اور مجبوراً انگریزی یا عربی کے وہ الفاظ استعمال کرنا پڑتے ہیں جن سے کان مانوس نہیں ہوتے - اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اگر صرف معنی لکھ دیے جائیں، اور تشریح پورے طور سے نہ کی جائے تو اصطلاحات کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتا - صفحہ ۶۰ پر "کاربونی فرس نظام" ایک ایسی ترکیب ہے جو ایک مرتبہ کے پڑھنے میں فوراً سمجھ میں نہیں آسکتی -

کتاب کو دلچسپ بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ علمی مضامین اس طرح سے ادا کیے جائیں کہ پڑھنے والے کے دماغ کو بیکار نہ معلوم ہوں - یہ صفت اس کتاب میں نہیں ہے - مجموعی لحاظ سے یہ کتاب مفید معلومات سے بھری ہوئی ہے - اکثر زراعت کے اصول سیدھے سادے الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں - عملی طریقہ پر جو حضرات زراعت کا کام کرتے ہیں وہ اس کو پڑھ کر فائدہ اُٹھا سکتے ہیں -

سید کاظم رضا بی اے

# میر کے بہتر نشتر

(بسلسلۂ مضمون کلام میر مطبوعۂ الناظر ماہ ستمبر سنہ ۲۴ء)

کیا کروں شرح خستہ جانی کی — اب بھی پوچھا تو مہربانی کی
حال بد گفتنی نہیں میرا — تم نے پوچھا تو مہربانی کی

نازکی اُسکے لب کی کیا کہیے — پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
بار بار اُسکے در پہ جاتا ہوں — حالت اب اضطراب کی سی ہے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز — اُسی خانہ خراب کی سی ہے
میرؔ اُن نیم باز آنکھوں میں — ساری مستی شراب کی سی ہے

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا — آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

مبارک تمھیں میرؔ ہو عشق کرنا — بہت ہم تو پچھتائے دل کو لگا کر

مرتے ہیں میرؔ سب پہ نہ اس بیکسی کے ساتھ — ماتم میں تیرے کوئی نہ رویا پکار کر

خط بھیج کے بھی شوق کی باتیں رہی گئیں — قاصد کے پیچھے دور تلک میں لگا گیا

بہت سعی کرتے تو مر رہتے میرؔ — بس اپنا تو اتنا ہی مقدور تھا

ہم نے اپنی سی کی بہت لیکن — مرضِ عشق کا علاج نہیں

اب جو اک حسرتِ جوانی ہے — عمر رفتہ کی یہ نشانی ہے

اُسکے ایفاءِ عہد تک نہ بچے — عمر نے ہم سے بیوفائی کی

اب کرکے فراموش تو ناشاد کروگے — پر ہم جو نہ ہوں گے تو بہت یاد کروگے

فقر پر بھی تھا میرؔ کے اک رنگ — کفنی پہنی سو زعفرانی تھی

بیخودی پر نہ میرؔ کے جاؤ — تم نے دیکھا ہے اور عالم میں

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ — صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

کچھ موج ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی — شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

یوں اُٹھے آہ اُس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے

رات گذری ہے مجھے نزع میں روتے روتے
آنکھیں پھر جائیں گی اب صبح کے ہوتے ہوتے

دمِ آخر ہی کیا نہ آنا تھا
اور بھی وقت تھے بہانے کو

متصل روتے ہی رہیے تو بجھے آتشِ دل
ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

مہر کی تجھ سے توقع تھی ستمگر نکلا
موم سمجھے تھے ترے دل کو سو پتھر نکلا

دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں
وقت ملنے کا مگر داخلِ ایام نہیں

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید ہی کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
نادان پھر وہ دل سے بھلایا نہ جائیگا

کسو سے دل نہیں ملتا ہے اب
ہوا تھا کس گھڑی اُن سے جدا میں

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

دل گیا رسوا ہوئے آخر کو سودا ہو گیا
اس دو روزہ زیست میں ہم پر بھی کیا کیا ہو گیا

کوئی کانٹا سرِ رہ کا ہماری خاک پر بس ہے
گلِ گلزار کیا درکار ہے گورِ غریباں کو

اک وہم سی رہی ہے اپنی نمود تن میں
آتے ہو اب تو آؤ - پھر ہم میں کیا رہے گا

دل مجھے اُس گلی میں لے جا کر
اور بھی خاک میں ملا لایا

اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دل کے جانے کا نہایت غم رہا

صبحِ پیری شام ہونے آئی میرؔ
تو نہ چیتا - یاں بہت دن کم رہا

سرسری تم جہان سے گذرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

مسجد ایسی بھری بھری کیا ہے
میکدہ اک جہان ہے گویا

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

کل نہ آنے میں ایک یاں تیرے
آج سو سو طرف گمان گیا

میر صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامیئے دستار

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے
سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

دل سے شوقِ رُخِ نکو نہ گیا
جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہبِ عشق اختیار کیا

کبھو آتے ہیں آپ میں تجھ بن
گھر میں ہم میہمان ہوتے ہیں

نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں
کھنچیں میر تجھ سے ہی یہ خواریاں

عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں
اُس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں

عشق کا گھر ہے میر سے آباد
ایسے پھر خانماں خراب کہاں

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

رہنے سے مرے پاس کے بدنام ہوئے بہت
اب جا کے رہو واں کہیں رسوا نہ جہاں ہو

ہو گا کسی دیوار کے سایہ میں پڑا میر
کیا کام محبت سے اُس آرام طلب کو

اک وہم نہیں بیش مری ہستیِ موہوم
اس پر بھی تری خاطرِ نازک پہ گراں ہوں

آنے میں اس کے حال ہوا جائے ہے تغیر
کیا حال ہوگا پاس سے جب یار جائے گا

داغِ فراق و حسرتِ وصل آرزوئے شوق
میں ساتھ زیرِ خاک بھی ہنگامہ لے گیا

برسوں ہوئے۔ گئے اُسے۔ پر بھولتا نہیں
یادش بخیر میر۔ رہے خوش۔ جہاں ہو اب

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا
جی کا جانا ٹھہر رہا ہے صبح گیا یا شام گیا

دُور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھے طرز غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آجاتا
یہ کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

معیشت ہم فقیروں کی سی اخوانِ زماں سے کر
کوئی گالی بھی دے تو کہہ بھلا بھائی بھلا ہوگا

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے — جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
آنے کے وقت تم تو کہیں کے کہیں رہے — اب آنے تم تو فائدہ ہم ہی نہین رہے
تم چھیڑتے ہو بزم میں مجھکو تو ہنسی سے — پر مجھ پہ جو ہو جائے ہے پوچھو مرے جی سے
الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش — ہمیں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے خدا ہوتے
مرا سر نزع میں زانو پہ رکھکر یوں لگا کہنے — کرلے بیار میرے تجھ پہ جلد آساں ہو مرجانا
ہارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو — ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

وصیت میر نے مجھ کو یہی کی
کہ سب کچھ ہو تو عاشق نہ ہونا

"الف - ع"

---

میدانِ قیامت میں جو اک حشر بپا ہے — اپنے دلِ غمگیں کی یہ دھیمی سی صدا ہے
محرومیٔ پیہم نے بالآخر یہ بتایا — شامل ہے وہ ہر رنگ میں ایسا کہ جدا ہے
ہر جلوۂ صورت میں ہے سامانِ لطافت — شاید پسِ ہر پردہ وہی جلوہ نما ہے
آغازِ حیاتِ ابدی تھا دمِ آخر — غافل تھا جو سمجھا کہ یہ پیغامِ قضا ہے
باطل نہیں اس عالمِ امکاں کے تماشے — باطل انھیں سمجھا تو یہ اپنی ہی خطا ہے
سازِ دلِ مایوس ہوا بربطِ امید — سینہ میں غرض میرے کوئی بول رہا ہے
نذرِ خلشِ شوق کیے پھر تپشِ دل — اک آبلہ پا دشت نوردی کو چلا ہے
اللہ رے ترے ذوقِ محبت کے کرشمے — ہر دل دلِ پر درد ہے ہر درد دوا ہے
دیکھی گئی کس سے تری اعجاز نگاہی — بیخود ہوں جو میں آئینہ تصویر نما ہے
وارفتگیٔ شوق میں اتنا نہیں معلوم — خود تم ہیں جدا دل سے کہ دل ہم سے جدا ہے

صحرائے محبت میں جلیل آپ کی ہستی
اک نقشِ تمنا ہے جو زیرِ کفِ پا ہے

جلیل قدوائی (علیگ)

# غمزدہ کوئل

دیکھو صحرا بصحرا پھر رہی ہے کیوں اُداس — خیر تو ہے کیوں سراسیمہ ہے کیوں ہے بے حواس
غمزدہ کوئل یہ کیسی درد کی بھری آواز ہے — تیرے ہر نالے میں تیری زندگی کا راز ہے
خانماں برباد نکلا عشقِ افسوں گر ترا — محشر انگیز تمنا ہے دلِ مضطر ترا
تیرے دردانگیز نالوں میں نہیں کچھ بھی اثر — کیوں تجھے تڑپا رہی ہے شدتِ دردِ جگر
تیری جانِ ناشکیبا میں ہے کتنا اضطرار — باغ و صحرا میں کہیں بھی تو نہیں تجھ کو قرار
رکھتا ہے بیتاب کیسا شوقِ گوناگوں تجھے — مخلصی دیتا نہیں ہے عشق کا افسوں تجھے
اے شکارِ دردِ غم کیوں اسقدر رنجور ہے — شاہدِ مقصود کیا تیری نظر سے دور ہے
رنگ ماتم کا ہے تجھ پر کس قدر چھایا ہوا — نالہ کرتی ہے تو اُڑ جاتا ہے ہوش آیا ہوا
آسماں سنتا نہیں ہے کچھ تری فریاد کو — صبر بھی دیتا نہیں تیرے دلِ ناشاد کو
تیری [illegible] کا ابھی مجھ پر نہیں عقدہ کھلا — کس سے پوچھوں میں تری سرگشتگی کا ماجرا
تو ہے میرا گم شدہ دل یہ تو میں کیونکر کہوں — ہاں کسی بیتاب کا تجھکو دلِ مضطر کہوں
[illegible] عبرت ہے تیرا حال دنیا کے لیے — زندگی ہے تلخ تجھسے ناشکیبا کے لیے
آ ادھر آ پاس او سرمایہ دارِ زندگی — میں بھی تیرا ہمنوا ہوں غمگسارِ زندگی

تجھ سے سننا چاہتا ہوں داستانِ دردوغم
پھر سنانا چاہتا ہوں کچھ بیانِ دردوغم

اقدس ۔ حیدرآبادی

# سفرِ حجاز کی مختصر رُوداد

(بسلسلۂ الناظر ماہ جولائی ۱۹۲۴ء)

۱۴ - جون روز پنجشنبہ علی الصباح پڑاؤ کا گشت لگایا اور تقریباً قافلہ کی ہر چھوٹی بڑی ٹکڑی پر نظر دوڑائی مگر نظام الدین لاہوری کی تلاش میں کامیابی نہ ہوئی - وسط میں ایک شکستہ قلعہ نظر آیا جسکے اطراف میں پڑاؤ کا بازار تھا - دوسرے مقامات کی طرح اگرچہ یہاں کوئی مستقل بازار نہیں ہے لیکن چونکہ بندرگاہ ینبوع کی طرف سے جو قافلے مدینۂ منورہ جاتے ہیں اُن کا رہگذر یہی ہے اور اسوقت تو مکہ معظمہ کا تقریباً پورا قافلہ یہیں یکجا تھا اس لیے بکثرت دوکانیں لگی ہوئی تھیں - گوشت اور دیگر ضروری اشیا کی فراوانی کے علاوہ جو تقریباً ہر پڑاؤ پر ملتی تھیں یہاں سبزی، پیاز اور مسالے بھی زیادہ مقدار میں نظر آئے -

پڑاؤ چونکہ قلعہ کے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا اس لیے بہت دیر میں گشت تمام ہوا - اپنے مقام پر واپس آکر پہلا کام یہ کیا کہ میر صاحب سے ایک گنّی مستعار لیکر بازار سے مجیدیاں بھنائیں اور رحمت شاہ کے مصارف تجہیز و تکفین ادا کیے - پھر اُنکے آلودہ بستر اور کپڑوں کو ایک پشاوری مولوی صاحب کی معرفت جو ہمارے ہمراہ تھے مساکین حجاج میں تقسیم کیا - عصر کے بعد ایکبار پھر نظام الدین کی تلاش کے لیے نکلا مگر اِس دفعہ بھی ناکامیاب رہا - البتہ اس سلسلہ میں یہ خبر دریافت ہوئی کہ ترابع سے حیدرآبادی قافلہ اور حضرت شمس المشائخ معہ اپنے ہمراہیوں کے اور بعض اور ٹکڑیاں ادھر نہیں آئیں بلکہ انھوں نے احمدیوں کو مجیدیاں دینے سے انکار کردیا اور اس بنا پر غائر کا رستہ اختیار کیا جس میں ایک بلند پہاڑی پر سے گذرنے میں بہت دشواری ہوتی ہے -

۱۵ - جون روز جمعہ آج صبح سے چل چلاؤ کا سامان ہے - رحمت شاہ کے انتقال سے میرے شغدف میں جو جگہ خالی ہوگئی تھی میں چاہتا تھا کہ اُس پر پشاوری مولوی صاحب کو بٹھالوں جو بیرحسانی سے برابر اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہوکر منازل طے کر رہے تھے - مگر جمّال باوجودیکہ مدرسیہ کے بجائے اب اُس سے کہا گیا کہ صرف مہر بخشش کے ملیں گے کسی طرح راضی نہ ہوا - اور میزان برابر کرنے کے لیے

خالی شغدف پر میرے زائد سامان کا بورہ لاد دیا۔ قافلہ ظہر کے قریب روانہ ہوا۔ مگر تھوڑی دور بھی نہ گیا تھا کہ ٹھہر گیا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ بدوؤں کا کوئی اور شیخ نمودار ہو گیا ہے اور حملہ کرنے کی دھمکی دیتا ہے اس لیے قافلہ آج قیام کرے گا۔ خدا خدا کر کے ایک ہفتہ کے بعد روانگی ہوئی تھی اور اب جو دوبارہ اقامت کی اطلاع ملی تو بہت ناگوار ہوئی جس معصوم کو ہم سبھوں نے مل کر گھیر لیا اور خدا مجھے معاف فرمائیں کہ میں نے اُس غریب کو بہت ڈانٹا۔

۱۶۔ جون روزِ شنبہ | صبح کو کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد معمول کے مطابق تمازتِ آفتاب سے بچنے کے لیے ہم نے رضائیوں کا تنبو تان لیا تھا۔ چاشت کے اخیر وقت میں تپش سے بچنے کے لیے ہمارے جمالوں کے ساتھ کئی اور بدو اور جمال ہمارے تنبو کے نیچے آ کر جمع ہو گئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ بدو احمدی فرقہ کے ہیں، تو میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی میں اُن سے شکایت کی کہ تمام اہلِ عرب اپنے مہمانوں کی بڑی خاطر کرتے ہیں اور تم لوگ کیسے ہو کہ حجاج کو جو اس وقت صرف اہلِ عرب کے بلکہ خدا اور اُسکے رسولؐ کے مہمان ہیں پریشان کرتے ہو۔ اُن میں سے ایک نے میری گفتگو سننے کے بعد فوراً ہی کہا "اور شریف کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے جو حجاج سے چودہ گنی فی اونٹ وصول کرتا ہے اور جمالوں کو صرف پانچ چھ گنیوں پر ٹرخا دیتا ہے اور باقی خود ہضم کر جاتا ہے"۔ احمدی کی اس بات کا کوئی جواب میرے پاس نہ تھا۔ اور یقیناً امیر الحج کے اس مہماں نوازانہ طرزِ عمل کے بعد غریب بدوؤں سے یہ توقع رکھنا عبث ہی ہوگا کہ وہ اپنی روایاتِ مہماں نوازی کو برقرار رکھنے کے لیے اس موقع پر سال بھر کا آذوقہ جمع کرنے کی فکر سے باز رہیں گے۔

بالآخر ظہر کے بعد قافلہ روانہ ہوا۔ مغرب کے وقت بیر الروحہ پر نماز کے لیے قافلہ رکا تو چار پانچ گھنٹے وہیں رُکا رہا۔ معلوم ہوا کہ کچھ بدوی قبائل نے یہاں بھی روک لیا ہے۔ قافلہ چل رہا ہو تو شب کے وقت شغدف میں پڑے رہنے کے سوا چارہ نہیں مگر قافلہ رکا ہوا تھا اسلیے شغدف میں پڑا رہنا کسی طرح گوارا نہ ہوا۔ میں کچھ دور تک ٹہلتا ہوا گیا تو معلوم ہوا کہ ایک جگہ پر قہوہ اور چائے کی چند دوکانیں لگی ہوئی ہیں۔ ایک جمال کو ہمراہ لیکر میں بھی وہاں پہونچا اور اُسکے ساتھ بیٹھکر چائے پی۔ عشاء پڑھکر پھر شغدف میں سوار ہو گیا۔ اور جب قافلہ چلا تو نیند آ گئی۔

۱۷۔ جون روزِ یکشنبہ | صبح کو قافلہ پھر ایک مقام پر رُکا جس کا نام غالباً تہ ربتا یا گیا۔ یہاں روانہ

بھاڑیاں تھیں جن پر سے ہم برابر بندوقوں کے چھوٹنے کی آوازیں آتی تھیں - بعد کو پتہ چلا کہ سوا مجیدی کی مطالبہ ... پھر بھی ادا کی گئی - تب قافلہ روانہ ہوا اور دوپہر کے قریب سویقہ میں مقیم ہوا - یہاں کا پانی اس قدر کھاری تھا کہ دال چاولوں کا گلنا بھی مشکل نظر آیا - ہم لوگ بازار سے ہٹ کر ایک کنوئیں کے قریب ٹھہرے تھے - بقیہ قافلہ بازار کے قرب میں اور ہم سے کسی قدر فاصلہ پر تھا - ایک کنواں اس مقام پر بھی تھا - یہاں ککڑیاں بہت بکنے آئیں جنکو بڑے شوق سے سب لوگوں نے خریدا - رات بہت ٹھنڈی ہوئی - سردی کی وجہ سے اس قدر چھینکیں نکل آئے کہ نصف شب کے بعد سونا دشوار ہوگیا - آخر پریشان ہوکر شغدفوں کے اندر پناہ لی -

۱۸ ... شنبہ - سویرے ہی سے روانگی کا اہتمام ہوا - عجلت میں صرف چاول پکائے اور شکر ملا کر کھائے گئے - ایک مجیدی آج اور طلب کی گئی تھی مگر مقومین نے نہیں دلائی بلکہ قافلہ کو ہمارے لیجانا ... کیا - ظہر پڑھ کر سوار ہوئے - عصر کے بعد ایک جگہ ایک پتھر نظر پڑا جس پر اس خط میں کچھ عبارت منقوش دیکھی جو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے نامہ جات سے مشابہ تھی - جی چاہا کہ قافلہ رک کر یہاں قیام کیا جائے اور اس تحریر کو کسی سے پڑھوا کر دیکھا جائے شاید یہ کوئی اہم آثار ثابت ہو - مگر قافلہ کا روکنا بس کی بات نہ تھی - مغرب کے قریب جب ٹھنڈا ہوگیا تو جی چاہا کہ قمری مہینہ کی ابتدا ہے آج کچھ دیر شب ماہ میں اونٹ کی کھلی پیٹھ پر سوار ہونا چاہیے - لہذا نماز مغرب سے فارغ ہوکر جمال کو اپنی جگہ شغدف میں بٹھایا اور اسکے کوتل اونٹ پر تقریباً ایک گھنٹہ تک بیٹھا رہا - مگر اتنی ہی دیر میں ہچکولوں نے خستہ کر دیا - اس منزل میں اگرچہ تمام راستہ پتھریلی اور ناہموار زمین سے سابقہ رہا مگر مغرب کے بعد ہی پہاڑ کی چڑھائی شروع ہوگئی تھی اور عشاء کے وقت سے تو ایک نہایت ہی دشوار گذار گھاٹی میں چل رہے تھے - پہاڑی زیادہ بلند نہ تھی مگر راستہ نہایت ناہموار تھا جسکی وجہ سے اکثر اونٹ چلتے چلتے اگلے گھٹنوں کے بل گر پڑتے الحمد للہ کہ ہمیں اس قسم کی کوئی افتاد نہیں پڑی لیکن جب تک پہاڑی کے اوپر نہیں پہونچ گئے، ایک منٹ کے لیے بھی چین سے بیٹھنا نہیں نصیب ہوا - نصف شب کے بعد پہاڑی راستہ تمام ہوا اور مسطح میدان آگیا - جہاں پہونچکر دفعۃً خنکی بڑھ گئی -

# نظرے خوش گذرے

الناظر کا پرچہ مشترکہ شایع کرنے میں مجھے تامل تھا مگر بغیر اسکے ممکن نہ ہوا کہ پرچہ کی ماہ بماہ اشاعت کا انتظام ہو سکے۔ لہذا اس دفعہ دو ماہ کا پرچہ شایع کیا جاتا ہے۔ اس پرچہ کا حجم اگرچہ ڈیڑھ سو ۱۵۰ صفحے کے قریب ہے مگر افسوس ہے کہ جلیلی صاحب کی جولانی قلم نے روداد سفر حجاز کے اوراق بہت کم کر دیے۔ حالانکہ مدینہ منورہ کی منزل کے کافی حالات لکھ گئے تھے جو انشاء اللہ آیندہ پرچہ میں پیش کیے جائیں گے۔ خدا کرے اب ماہ بماہ اشاعت میں کوئی امر مانع نہ ہو کہ ناظرین کرام تقاضا کرنے کی زحمت سے اور ایڈیٹر اظہار ندامت و عذر خواہی سے محفوظ رہے۔ آمین یارب العالمین۔

---

ہمیں افسوس ہے کہ ستمبر نمبر میں عزیز صاحب کی غزل کے دوسرے شعر میں "غلط انداز اک نظر" کی جگہ "غلط انداز اک ادا" چھپ گیا ہے۔ غلطی اتنی نمایاں ہے کہ کسی صاحب نظر کو یہ بدگمانی نہ ہوگی کہ عزیز صاحب نے اسی طرح نظم کیا ہوگا۔ البتہ ایک کرم فرمانے اس میں شک ظاہر کیا ہے کہ "دل کی بستی تمام لوٹ گئی" میں "لوٹ گئی" کا استعمال جائز، مناسب یا پسندیدہ ہو سکتا ہے۔ خود عزیز صاحب یا اور کوئی صاحب مناسب جانیں تو اس بارے میں اپنے افادات سے مستفید فرمائیں۔

---

انجمن اردو نے گذشتہ دو ماہ کے اندر کم سے کم اتنا تو کیا ہے کہ مجلس انتظامیہ کے متعدد جلسے کرکے پیش نظر مقاصد کے لحاظ سے تین شعبوں میں کام تقسیم کر دیا ہے۔ اور ان میں جو سب سے اہم شعبۂ تصنیف و تالیف ہے اُسکی باقاعدہ تنظیم بھی ہو گئی ہے۔ شعبہ کے پانچ رکن علاوہ اُن اصحاب کے رکھے گئے ہیں جو بحیثیت اپنے عہدہ کے رکن رہیں گے۔ ڈاکٹر بذل الرحمن ایم اے معلم اعلیٰ عربی و فارسی لکھنؤ یونیورسٹی شعبہ کے ناظم مقرر کیے گئے ہیں اور مولانا عبد الحلیم شرر۔ مولوی عبد الماجد بی اے پنڈت منوہر لال زتشی ایم اے و ایڈیٹر الناظر اُسکے ارکان بنائے گئے ہیں۔ شعبہ کے اجلاس اول میں ایک نظام عمل مرتب کر لیا گیا ہے اور جن کتابوں کا انتخاب اس وقت کیا گیا ہے امید ہے کہ سال آیندہ کے اندر اندر ان میں سے بعض شایع ہو جائینگی۔ مفصل نظام عمل انشاء اللہ آیندہ پرچہ میں شایع کیا جائیگا۔

ہردوئی سے صادق حسین صاحب نے جو مزاحاً اپنے تئیں فلسفہ کا گریجویٹ ظاہر کرتے ہیں کرمی سلطان حیدر صاحب جوش کی تائید اور حلیبی صاحب کی تردید میں ایک مضمون ارسال فرمایا ہے اور بخیال خویش الناظر کی اخلاقی جرأت کا امتحان لینا چاہا ہے۔ اگر مضمون کی اشاعت میں ناظرین الناظر، ایڈیٹر، حلیبی یا خود جوش صاحب کا کچھ نفع ہوتا، یا کسی علمی و ادبی، اخلاقی و معاشرتی، اقتصادی و سیاسی، تاریخی و مذہبی مسئلہ پر اس میں کوئی معلومات فراہم کی گئی ہوتی تو یقیناً اس خیال سے اُسکی اشاعت نہ روکی جاتی کہ حلیبی صاحب کے مضمون کی تردید ہے لیکن مضمون کو شروع سے لیکر آخر تک پڑھنے کے بعد میں یہ رائے قائم کرنے پر مجبور رہوں کہ اُسکی اشاعت سے احتراز کروں۔ میں جانتا ہوں کہ فیہ ما فیہ کی بندوق داغ جانے کے بعد اس قسم کی تحریروں کا قلمبند ہونا کچھ تعجب انگیز نہیں۔ اور اگر سلطان حیدر صاحب پسند کرتے تو وہ اپنے دلچسپ افسانوں کے ذریعہ تنہا الناظر میں نہیں بلکہ دوسرے رسائل میں بھی حلیبی صاحب کے نقطۂ نظر سے پوری طرح اختلاف کر سکتے تھے۔ اور اس ضمن میں وہ چاہتے تو انتقام کے کافی سے زائد مواقع حاصل ہو سکتے۔ گو میں اُن سے بھی یہی عرض کروں گا کہ

درعفو لذتیست کہ در انتقام نیست

---

افادات مہدی پر ایک نظر" کے عنوان سے جو مضمون گذشتہ پرچہ میں شایع ہوا تھا اُس پر ایک تنقید وصول ہوئی ہے۔ مرحوم مہدی حسن کی زندگی ہی میں الناظر میں اُنکی بعض تحریروں پر تنقیدیں شایع ہو چکی ہیں اور اگر اب بھی کوئی صاحب اُنکے مجموعۂ مضامین پر مفصل تنقید لکھیں تو ضرور شایع کی جائیگی۔ لیکن اخباری مضامین کی طرح اگر رسالہ کے ہر مضمون پر سلسلۂ بحث چھڑ جائے تو اصل مقصد فوت ہو جائیگا اس لیے اس تنقید کی اشاعت سے معذوری ظاہر کر دیگئی ہے۔ البتہ اس تحریر کے بعض ضروری حصوں کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔ صاحب مضمون نے لکھا تھا کہ "مرحوم کی عمر کا کوئی اندازہ بیگم صاحبہ نے نہیں فرمایا" عبد القیوم صاحب فدسی بتاتے ہیں کہ

"افادات کے صفحہ ۲۵ پر "انکی یاد" کے تحت میں لکھا ہوا ہے کہ "عمر کوئی ۴۶ - ۴۷ برس کی ہوگی لیکن اتنی بھی اُنکی صورت یا اُنکے کسی انداز سے معلوم نہیں ہوتی تھی"۔

افادات مہدی کے متعلق خود معترض صاحب کا خیال یہ ہے:- "اس میں شک نہیں کہ بعض ادبی لغزشیں نظر انداز کر دی جائیں جنکا حضرت مہدی سے ہونا تعجب انگیز ہے تو اُنکے مضامین افادات عالیہ کے تحت میں آسکتے ہیں اور واقعۃً آپ کے مضامین خوب ہیں خصوصاً مہدی مرحوم کی اصابت رائے، نکتہ فہمی، ذوق ادبی ایسی چیزیں ہیں جنکی داد نہ دینا ظلم ہے مگر اس حد تک کہ اُنکے مضامین مضامین سمجھے جائیں ورنہ مجموعۂ مضامین پر بحیثیت تصنیف نظر ڈالی جائے تو مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں کوئی اچھی رائے ظاہر نہ کر سکوں گا"۔

## کلام حالی

مولانا حالی کی متفرق نظمیں جو بیحد مقبول ہیں
شکوہ ہند۔ بیوہ کی مناجات۔ عرض حال
مسدس تک۔ خدمت۔ مناظرہ رحم و انصاف
حب وطن۔ پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ
(خریداران الناظر کے لیے تین چوتھائی قیمت)

## مثنوی امید و بیم

لکھنؤ کے مشہور شاعر و انشا پرداز جناب مرزا محمد ہادی رسوا بی اے کی لاجواب نظم جسے اردو میں اعلیٰ درجہ کے فلسفیانہ خیالات کی پہلی نظم کہنا بجا ہوگا۔ قیمت ۴ر
(خریداران رسالہ کے لیے ۳ر)

## کلام اقبال

ڈاکٹر اقبال کی مقبول عام نظمیں:-
شکوہ۔ جواب شکوہ۔ شمع و شاعر
بلال۔ فریاد امت۔ تصویر درد
(خریداران رسالہ کو تین چوتھائی قیمت پر)

## مسلمانان اندلس

مشہور مورخ اسٹینلی لین پول کی کتاب "مورس ان اسپین" کا اردو ترجمہ از مولوی سید عبدالغنی وارثی قیمت ۱۲ر
(خریداران رسالہ سے ۸ر)

## خوان دعوت

لڑکیوں کو کھانا پکانا سکھانے کیلیے م۔ ب صاحب لکھنوی نے افسانہ کے دلکش پیرایہ میں یہ کتاب مرتب کی ہے جسمیں باورچی خانہ کے ضروری انتظامات اور عمدہ و لذیذ کھانوں کی مجرب ترکیبیں ذاتی تجربہ کی بنا پر تحریر کی ہیں۔
قیمت ۸ر
(خریداران رسالہ کے لیے ۶ر)

## تذکرہ حزیں

مشہور شاعر شیخ علی حزیں۔ جو ایران سے ہجرت کرکے ہندوستان میں آئے انکی دلچسپ سوانحعمری قیمت ۴ر
(خریداران رسالہ سے ۳ر)

## دلچسپ مختصر افسانے

ایک نادان خدا پرست اور دنیا دار کی کہانی ار۔ مساوات۔ از مسٹر سلطان محمد جوش ار۔ انقلابات زمانہ ...
(خریداران رسالہ کے لیے نصف قیمت)

## حیات نظامی

مشہور شاعر حضرت نظامی گنجوی کی سوانحعمری۔
قیمت ۴ر
(خریداران الناظر کے لیے ۳ر)

## جمیل و شہینہ

عرب کے حسن و عشق کا دلچسپ افسانہ
قیمت ۳ر
(خریداران الناظر کے لیے ۲ر)

## عورتوں کی انشا

خواتین اعلیٰ کی صاحبزادیوں کو خطوط نویسی سکھلانے والی کتاب مصنفہ بیگم صغریٰ علی صاحبہ۔ قیمت ۸ر
(خریداران رسالہ کے لیے ۶ر)

## مصنوعی شوہر

انقلاب ایران کی ایک ظریفانہ داستان۔ ہنستے ہنستے لوٹ جایئے گا۔
قیمت ار
(خریداران الناظر کے لیے ...)

ملنے کا پتہ:- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رجسٹرڈ نمبر لے ۴۷۸

رسالۂ

# الناظر

لکھنؤ

ایڈیٹر۔ ظفر الملک علوی

قیمت سالانہ للعہ مع محصول

نئی جلد ۳

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر و پبلشر: آفاق علی علوی

نمبر

بسم اللہ

# فہرست مضامین الناظر بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۲۴ء

نمبر ۱۶۲ — جلد ۲۷



ضمیمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# الناظر

نمبر ۱۶۲ جلد ۲۷ — دسمبر سنہ ۱۹۲۴ء

## فیہ ما فیہ

(اثر خامہ : چلپی)

### ایک مسلم کی اسلام نوازی

پنجاب کے سر میاں محمد شفیع کا نام نامی مسلمانان ہند کے لیے نامانوس نہیں، مدتوں آپ اس بد نصیب قوم کی "لیڈری" کے تخت پر رونق افروز رہ چکے ہیں۔ اور چند سال سے حکومت ہند کے اعلیٰ ترین مناصب، وزارت تعلیم و وزارت قانون پر فائز تھے۔ اور اب ان مناصب جلیلہ سے سبکدوشی کے بعد غالباً پھر قومی لیڈری کے مشغلۂ قدیم کی جانب توجہ فرمائیں۔ سرکاری گروہ میں آپ کو جو مقبولیت و محبوبیت حاصل تھی، اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ وایسرائے بہادر سے لیکر چھوٹے چھوٹے "صاحبوں" تک سب کو آپ کی مفارقت پر قلق و تاسف ہوا۔ حکام والا مقام کی طرف سے آپ کی الوداع میں بکثرت تقریبات ہوئیں، اور سب نے آپ کو انھیں جذبات حزن و ملال کے ساتھ رخصت کیا، جو دنیا میں ہر "یار عزیز" و "حبیب لبیب" سے چھوٹنے کے وقت قدرۃً ہر قلب بشری میں پیدا ہوتے ہیں۔

جناب وائسرائے بہادر —— ہاں وہی وائسرائے جن کا عہدِ حکومت گاندھی جی، محمد علی، شوکت علی، حسین احمد، موتی لال، داس، جواہر لال، کچلو، حسرت، اور دیگر محبانِ وطن کے اسیرِ زنداں کرانے کے لیے تاریخِ ہند میں ہمیشہ یادگار رہیگا —— نے اپنی الوداعی تقریر میں اپنے اس "یارِ وفادار" کے جہاں اور سب فضائل و مناقب ارشاد فرمائے، وہاں اس کارنامہ کو خاص اہمیت و امتیاز دے کر بیان فرمایا، کہ جس زمانہ میں خلافت کے متعلق مسلمانانِ ہند میں خاص "شورش" برپا تھی، اس "نازک زمانہ" میں

"خوش قسمتی سے مجھے سر شفیع کی رفاقت نصیب تھی"

اور اس کا اعتراف کیا کہ اس زمانہ میں سر موصوف کی ذات سے

"مجھے نہایت گراں قدر و بیش بہا امداد ملی"

اس امداد و اعانت کی کیا نوعیت تھی؟ اسکی تفصیل بیان کرتا اگر "حاکم" و "فاتح" قوم کے سب سے زیادہ مقتدر فرد کے مصالح کے خلاف تھی، تو "محکوم" و "مفتوح" قوم کے ضعیف و پست افراد کو بھی اسکے معلوم کرنے پر زیادہ اصرار نہیں۔ خلوت کے بہت سے اسرار اغیار کے سامنے لانے کے قابل نہیں ہوتے، لیکن اسے کیا کیجیے، کہ کسی کی نگاہِ شرمگیں، خود ہی زبان بن کر، صحبتِ شب کے سارے رازو نیاز بے پردہ کر دیتی ہے!

میں اپنی چشمِ شوق کو الزام خاک دوں،
تیری نگاہِ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں!

یہ تو فراست شاعرانہ کا کرشمہ تھا، پھر جب فراست شاعرانہ کے ساتھ فراست ایمانی بھی شامل ہو جائے تو جماعت مومنین کے لیے وائسرائے بہادر کی تصریح و اخفاء، تفصیل و اجمال، تکلم و سکوت، سب یکساں ہے!

---

بہرحال، اس خدمت جلیلہ کی جزئیات تو اُسوقت معلوم ہو کر رہیں گی، جب ہر شے اپنی اصلی صورت میں بے نقاب ہو کر آئے گی، جب شملہ و لندن کے گورے دیوتا اپنے سے کہیں قادر تر و توانا تر حاکم کے حضور میں اپنے کالے پرستاروں کے ساتھ صف بستہ حاضر ہوں گے، اور جب لارڈ کرزن اور محمود الحسن، لارڈ ریڈنگ اور حسین احمد، لائڈ جارج اور محمد علی کے درمیان انصاف ہو کر رہے گا، سردست، اس مسلمان وزیر سلطنت کے ایک روشن تر کارنامہ کی داد دینا مقصود ہے۔ بیگم شفیع صاحبہ ہر زنِ مسلمہ کی طرح، سارے مسلمانوں کے لیے ایک واجب الاحترام خاتون تھیں، لیکن اب معلوم ہوا، کہ وہ شملہ کی بلندیوں پر انگریزی

صحبتوں میں، سرکاری کوٹھیوں میں "بیگم شفیع" کے بجائے "لیڈی شفیع" ہوتی تھیں، اور گو وحشی و بدتہذیب مسلمانوں کے سامنے پردہ کرنا ضروری سمجھتی ہوں، لیکن ظاہر ہے کہ مہذب و شائستہ، قدسی خصال و ملائک سرشت حکام انگریز کے درمیان ان کا پردہ کی جاہلانہ و وحشیانہ رسم پر مصر رہنا بالکل بے معنی تھا۔ دہلی و شملہ کے گورے دیوتاؤں سے ملیں، اور ملتی رہیں، اور نہ صرف خود، بلکہ اپنی صاحبزادیوں اور اپنی بہو کو بھی شریکِ بزم فرماتی رہیں، چنانچہ ۱۵- نومبر کی شب کو جو عظیم الشان ڈنر ہوا، اور جس میں بجز سر شفیع کے شاید ایک بھی مسلمان شریک نہ تھا، اس میں لیڈی شفیع مع اپنی بہو اور دونوں صاحبزادیوں کے رونق افروز تھیں۔ ڈنر کے بعد لیڈی صاحبہ کا "جام صحت" خود جناب وائسرائے بہادر نے تجویز فرمایا، اور دوران تقریر میں اُنکے شوہر نامدار کے سارے مناقب و کمالات بیان کرنے کے بعد، آخر میں حسب ذیل گُہر فشانی کی:-

"سر محمد شفیع کے ہم پر صرف اسی قدر احسانات نہیں، بلکہ یہ بھی ہے، کہ اُنھیں نے لیڈی شفیع کو ہمارے حلقۂ احباب (سوشل سرکل) میں شامل کرایا۔ میرے ورود شملہ کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا، کہ جبھی مجھے لیڈی شفیع سے ملنے کی مسرت حاصل ہوگئی، اور میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے کس قدر مسرت اس امر سے ہوئی کہ اُنھوں نے ہمارے درمیان آنا پسند فرمایا۔ اور ہماری صحبتوں کو خود اپنی، نیز اپنی صاحبزادیوں کی شرکت سے پُرلطف بنایا۔"

تقریباً اسی قسم کے الفاظ سر الگزنڈر مڈی مین (ہوم ممبر) نے بھی کسی دوسرے موقع پر، لیڈی ممدوحہ کی شان میں اپنی زبان مبارک سے صادر فرمائے ہیں!

امت محمدیہ کی اس عزت افزائی پر، ملت اسلامیہ کے اس فخر و شرف پر، اور مسلمانان ہند کے اس اوج تقدیر پر، خود دین اسلام سر شفیع اور لیڈی شفیع دونوں کا تہ دل سے ممنون و سپاس گزار ہے!

---

## تہذیب کی معراج کمال

اہل ہند کے مطالبۂ حقوق کا ایک جواب خدایان مجازی کی طرف سے ہمیشہ یہ ملتا رہا ہے، کہ فضائے ہند میں ابھی حریت و حکومت خود اختیاری کی اہلیت ہی نہیں، اور اسکے ثبوت میں دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ کونسل یا میونسپلٹی کے انتخاب کے مواقع پر اُمیدواروں میں باہم سخت کشمکش ہوتی ہے۔ گویا انتخاب اور کاؤنسل کی کارروائیوں میں، مجلس وعظ و پند کی طرح انتہائی سنجیدگی و سکون برقرار رہنا چاہیے! غریب ہندوستان تو اس پارلیمنٹری انتخاب کے فن میں ہنوز بالکل نوآموز ہے، ابتدا میں جتنی بھی ٹھوکریں

کھائے کم ہے۔ اور پھر یہاں کے باشندوں کے درمیان قومی، مذہبی، و لسانی اختلافات سب پر روشن، پس یہ اگر اختلافات رونما ہوں بھی، تو حیرت کی کوئی وجہ نہ ہوگی۔ سوال یہ ہے، کہ جو ملک اس فن میں اُستادی کا مدعی ہو جو تہذیب و شائستگی کے معراج کمال پر پہنچا ہوا ہے، جو صدہا سال سے انتخابات کا خوگر ہے، اور جو مختلف اقوام و ملل کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک متحد قوم ہے، خود وہاں کے انتخابات میں سکون و سنجیدگی کا پارہ کس درجہ پر قائم رہتا ہے؟

---

اس کا جواب مانچسٹر گارڈین کی حسب ذیل سرخیاں دینگی، جو پچھلے پارلیمنٹری انتخاب کے واقعات کے متعلق اس نے اپنے صفحات میں قائم کی تھیں:۔

"ویلش اُمیدوار کا جسم نوچ ڈالا گیا"

"تقریر سننے کے بعد مجمع نے حملہ کر دیا"

"ایک امیدوار کو ضرب سے بیہوش کر دیا"

"علاقہ نارتھ ڈیون میں بلوہ کے آثار"

"ایک ٹوری اُمیدوار کو پتھر کا ہدف بنایا گیا"

"مقرر پر چاقو پھینک مارا گیا"

"پیشانی چاقو سے زخمی ہوئی"

"شور و ہنگامہ کے باعث تقریر ناتمام چھوڑنا پڑی"

"جلسہ پولیس کی نگرانی میں"

"مقرر کو سنگ باری کی دھمکی"

یہ صرف ایک اخبار کی سرخیاں ہیں۔ اس طرح کے واقعات، زمانۂ انتخاب میں، انگلستان میں بکثرت پیش آتے رہے، اور ہر اخبار دوسری پارٹی کے متعلق سنگین سے سنگین الزامات لگاتا رہا۔ کیا بدتہذیبی و شورش، بیہودگی و شہدپن اہل فرنگ کے لیے سب کچھ جائز ہے؟ اور اس کا عشر عشیر بھی اگر ہندوستان میں ہو جائے تو ناجائز۔

---

آئرش انڈیپنڈنٹ لکھتا ہے، کہ یہ واقعات تو پھر بہت ہلکے ہیں، ایک صدی قبل، انتخاب کے موقع پر، ہر فریق ایک پوری معرکہ آرائی کا سامان کرتا تھا، حریف پر سنگریزوں کی بارش کی جاتی تھی، اور اکثر اوقات

ہاتھ پیر ٹوٹنے تک کی نوبت آجاتی تھی۔ ہمارے ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب بالقابہ انگلستان میں جاکر ایک جگہ ہندوستان کی تاریک خیالی و جہالت کی انتہائی مثال یہ پیش فرماتے ہیں کہ "وہاں ایک انتخاب کے موقع پر عذاب و ثواب، دوزخ و جنت کو معرض بحث میں لایا گیا"! واقعی، عذاب و ثواب، دوزخ و جنت کے تذکرہ سے بڑھ کر، جہالت و تاریک خیالی کی دلیل اور کیا ہوسکتی ہے۔ باقی درشت کلامی کرنا، ایک دوسرے کی تفضیح کرنا، اتہامات لگانا، فریق مقابل پر حملہ کردینا، اینٹ پتھر برسانا، چھری چاقو کے وار کرنا، ضرب شدید سے بیہوش کردینا، ہاتھ پیر توڑ دینا، یہ سارے واقعات، منتہائے کمال، و معراج شائستگی کے علامات ہیں!

---

یہ اخلاقی زندگی کا نمونہ تھا۔ اب مالی پہلو ملاحظہ ہو۔ اُمیدواران انتخاب کی کُل تعداد ۱۴۲۶ تھی اور ان سب کو مجموعی مصارف ۹۸۲۲۴۰ پونڈ پڑے۔ گویا اوسطاً ہر امیدوار کو تقریباً سات سو پونڈ (۱۰۵۰۰ روپیہ) خرچ کرنے پڑے! چند امیدواروں کے مصارف متعین طور پر بھی شایع ہوچکے ہیں، مثلاً

| | | |
|---|---|---|
| مسٹر ریمزے میکڈانلڈ | کے مصارف | ۱۰۵۲ پونڈ |
| مسٹر ہالڈین | " | ۸۴۴ " |
| مسٹر اسکویتھ | " | ۷۴۳ " |
| مسٹر لائڈ جارج | " | ۵۰۷ " |
| سر جارج ہملٹن | " | ۱۴۹۲ " |

مشرقی تہذیب میں کسی شخص کا کسی اعلیٰ منصب و جاہ کے لیے اپنے تئیں پیش کرنا، جس حد تک درست ہوسکتا ہے سب کو معلوم ہے، چہ جائیکہ اس پر زر کثیر صرف کرنا، اور اپنے کمالات و مناقب کو خود اپنی زبان سے یا اپنے احباب کی طرف سے شایع کرنا۔ لیکن مغرب کے فلسفۂ اخلاق میں خودستائی و خودنمائی عیب نہیں ہنر، نقص نہیں کمال، موجب ننگ و عار نہیں، باعث فخر و مباہات ہے۔ اور کون ہے، جو دانایان مغرب کے کسی قول و فعل پر اعتراض کی جرأت کرسکتا ہے؟

---

**بدایونی پروپگنڈا** سلطان نجد و اہل نجد کی مخالفت میں بدایونی پروپگنڈا، اب تک اپنے صدر مقام نیز مختلف شاخوں سے، زور و شور کے ساتھ جاری ہے، لیکن یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ملک اب اس سے غیر متاثر ہے، اور

ہمدرد، زمیندار، سیاست، مدینہ، تنظیم، وغیرہ اسلامی اخبارات نے جو صحیح روش اس باب میں ابتدا سے اختیار کی تھی اُس پر برابر قائم ہیں۔ وفد نجد و حجاز بھی الحمد للہ روانہ ہوگیا۔ خداوند کریم اُسکی کوششوں کے نتائج تو اسلام و مسلمین کے حق میں مفید ثابت کرے۔ جو شے اس پروپگینڈا میں سب سے زیادہ تاسف انگیز ہے وہ یہ ہے، کہ اہل نجد کو بدنام کرنے کے لیے اُنکی جانب خواہ مخواہ ایسے عقائد کا انتساب کیا جارہا ہے، جو اُن کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں۔ یہ ایک کُھلی ہوئی حقیقت ہے، کہ اہل نجد کے عقائد، بعض مسائل میں علماء حنفیہ و صوفیہ کے عقائد سے مختلف ہیں، لیکن اسکے یہ معنی تو نہیں، کہ اُنکے سر وہ گندے عقائد تھوپ دیے جائیں، جن سے وہ بیچارے بارہا، اور پُرزور طور پر تبرّی و تحاشی کرچکے ہیں، مثلاً یہ کہ وہ (نعوذ باللہ) توہین قرآن و توہین رسولؐ کرتے ہیں، یا یہ کہ شفاعت رسولؐ کے منکر ہیں، یا یہ کہ درود خوانی کے مانع ہیں۔ وقس علے ہٰذا۔

---

اس قسم کے اتہامات کے جواب میں ہم خود نجدیوں کا بیان پیش کرتے ہیں۔ یہ عبارت شیخ سلیمان بن سحمان نجدی کی کتاب "الہدیۃ السنیۃ والتحفۃ الوہابیۃ النجدیہ" کی ہے، جو اہل نجد کی ایک مستند تالیف ہے، اور مطبع منار، مصر سے سلطان عبد العزیز بن سعود کے حکم سے اسی سال شایع ہوئی ہے:۔

| | |
|---|---|
| .... واما ما یکذب علینا ستراً للحق وتلبیساً علی الخلق بانا نفسر القرآن برأینا ونأخذ من الحدیث ما وافق افہامنا ...... وانا نضع من رتبۃ نبینا محمد صلعم بقولنا ان النبی رمۃ فی قبرہ وعصا احدنا انفع منہ ولیس لہ شفاعۃ وان زیارتہ غیر مندوبۃ ... سبحانک ہذا بہتان عظیم فمن روی عنا شیئاً من ذلک او نسبہ الینا فقد کذب علینا وافتری ومن شاہد حالنا وحضر مجالسنا وتحقق ما عندنا علم قطعیاً ان جمیع ذلک وضعہ وافتراہ اعداء | اور جو امور حق پوشی اور فریب خلق کے لیے ہماری طرف جھوٹ منسوب کیے جاتے ہیں، مثلاً یہ کہ ہم قرآن کی تفسیر بالرّاے کرتے ہیں، اور صرف وہی احادیث قبول کرتے ہیں جو ہمارے فہم کے مطابق ہوں، ... اور یہ کہ ہم اپنے نبی محمد صلعم کی توہین یہ کہکر کرتے ہیں کہ وہ اپنی قبر میں سڑ چکے، اور ہمارا عصا اُن سے زیادہ بکار آمد ہے، اور اُنکی شفاعت باطل اور اُنکے روضہ کی زیارت ناجائز ... حاشا، یہ سب ہمارے اوپر افتراء عظیم ہے۔ جس نے ان امور میں ہم سے کچھ بھی روایت کی، یا ہماری جانب منسوب کیا اُس نے ہم پر افتراء کیا، اور ہم کو جھوٹ لگایا۔ جو شخص ہم سے واقف ہے، اور ہمارے جلسوں میں شریک ہوتا ہے اور ہمارے عقائد کا صحیح علم رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ سب اتہامات ہم پر |

الدین و اخوان الشیاطین ... نعتقد
ان رتبۃ نبینا محمد صلعم اعلیٰ مراتب المخلوقین
علی الاطلاق وانّہ حیّ فی قبرہ حیوۃ برزخیۃ
ابلغ من حیوۃ الشہداء للنصوص علیہا فی
التنزیل اذ ھو افضل انہم بلا ریب و انہ
یسمع سلام المسلم علیہ وتسن زیارتہ ....
ومن انفق نفیس اوقاتہ بالاشتغال
بالصلوۃ علیہ الصلوۃ والسلام الواردۃ عنہ
فقد فاز بسعادۃ الدارین وکفی ہمہ وغمہ
کما جاء فی الحدیث عنہ . لا ننکر کرامات
الاولیاء ونعترف لہم بالحق وانہم علیٰ
ہدًی من ربہم ..... ونثبت الشفاعۃ
لنبینا محمد صلعم یوم القیامۃ حسب ما ورد
وکذا نثبت لسائر الانبیاء والملٰئکۃ والاولیاء
والاطفال حسب ما ورد (ص ۴۶-۴۷)

اعدائے دین و اخوان الشیاطین نے لگائے ہیں.... ہمارے اعتقادات
تو یہ ہیں، کہ ہمارے نبی محمد صلعم کا مرتبہ تمام مخلوقات سے قطعاً برتر ہے،
اور آپ اپنی قبر میں برزخی زندگی کے ساتھ زندہ ہیں، جو شہداء
کی زندگی سے، حسب تصریح قرآن مجید، کہیں افضل ہے، اس لیے کہ
آپ خود اُن سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں۔ اور آپ سلام کرنے والے
کا سلام سنتے ہیں، اور آپ کے روضہ کی زیارت مسنون ہے .....
اور جو شخص اپنے اوقات عزیز کو آپ کے بتائے ہوئے درود کو آپ پر
پڑھنے میں صرف کرے، تو وہ شخص دونوں جہان کی مراد پائے گا
اور اُسکے غم و افکار سب بحکم حدیث دور ہو جائیں گے۔ اور
نہ ہم اولیاء اللہ کی کرامات کے منکر ہیں، بلکہ اُن کا حق پہچانتے ہیں
اور اُن کو ہدایت الٰہی پر جانتے ہیں۔ اور ہم روز قیامت میں
اپنے نبی محمد صلعم کی شفاعت پر یقین رکھتے ہیں، اور نہ صرف
اُن کی بلکہ حسب فرمان شریعت تمام انبیاء و ملائکہ و اولیاء
اور بچوں کی شفاعت پر بھی ۔

کیا ان تصریحات، ان واضح بیانات کے بعد بھی وہابیہ بدستور صدہا ناکردہ گناہوں کے مجرم برقرار رہیں گے ؟

---

## سلام

جناب سلطان حیدر صاحب تحصیلدار کی خدمت مبارک میں ستمبر نمبر میں جو کچھ عرض کیا گیا تھا، اُس سے قدرۃً اُنکی برافروختگی کا پارہ حد سے تجاوز کر گیا۔ تحصیلداروں اور مجسٹریٹوں کا غصہ ضرب المثل ہے، خدا کا شکر ہے، کہ غریب الناظر اُن کے قلمرو کے حدود سے باہر ہے۔ بہر حال ایک راوی معتبر کا بیان ہے کہ روزانہ اخبارات سے لیکر ماہوار رسائل تک اور دہلی سے لیکر بھوپال تک "پُرغضب جوابات" کی ڈاک بٹھا دی گئی ہے۔ دُنیا کے لیے یہ تجربہ نیا نہیں، اس سے پیشتر بارہا ایسا ہو چکا ہے کہ آیات قرآنی

کا وعظ سنانے والوں کو ان قلمی" جوابات" سے کہیں بڑھ کر خطرات درپیش رہے ہیں۔

| | |
|---|---|
| وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْھِمْ آیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِی وُجُوْہِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الْمُنْکَرَ یَکَادُوْنَ یَسْطُوْنَ بِالَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ عَلَیْھِمْ آیٰتِنَا (حج ع ۹) | ان منکروں کو جب ہماری واضح آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کے چہروں سے برہمی ٹپکنے لگتی ہے۔ اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ ہماری آیات کے سنانے والوں پر حملہ ہی کر بیٹھیں گے۔ |

ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد اگر اسی سایکالوجی (ذہنیت) کا ظہور آج اپنی پوری قوت کے ساتھ ہو رہا ہو، تو یہ عین قانون الٰہی کی ایک تازہ تصدیق ہے۔ چڑھے ہوئے تیوروں اور چڑھی ہوئی آستینوں دونوں کے مقابلہ میں کلام الٰہی کی ہدایت ہے کہ صرف "سلام" کہکر سکوت اختیار کر لیا جائے۔ چنانچہ جناب سلطان حیدر صاحب کی خدمت گرامی میں بصد ادب و نیاز "سلام" عرض کیا جاتا ہے، اُمید ہے کہ وہ قبول فرمائیں گے۔

# انعامی مضمون

اگست کے الناظر میں ایک اعلان کیا گیا تھا اور اہل قلم حضرات کو دعوت دی گئی تھی کہ مقابلۂ انعامی میں شرکت کریں۔ اعلان کو تقریبًا دو درجن اخبارات و رسائل میں بھی شایع کرا دیا تھا۔ اور بہت سے احباب کے نام خطوط بھی چھپوا کر بھیج دیے تھے۔ غرض مشکل سے کوئی اہل قلم باقی رہا ہو گا جس نے اس اعلان کو نہ دیکھا ہو۔ مگر افسوس ہے کہ اہل قلم کی طرف سے جس سرگرمی و مستعدی کی توقع تھی اُس کے آثار کم نظر آتے ہیں۔ چونکہ آخری تاریخ ۳۱- دسمبر ہے، اس لیے ابھی صحیح رائے قائم کرنے کا موقع نہیں۔ انشاء اللہ آیندہ نمبر میں اطلاع دی جائے گی کہ کتنے مضامین آئے اور اُن میں سے کن کن اصحاب کے مضامین 'شرائط مقابلہ' کے مطابق مجلس انتخاب کے حوالہ کیے گئے۔

اڈیٹر

# طنجہ و مراکش

غالباً دس برس ہوے کہ معاہدۂ طنجہ کا معاہدہ وپیش تھا۔ متعاقدین اسپین اور فرانس ہونیوالے تھے، کیونکہ ریف پر اسپین قابض تھا، اور تونس وغیرہ پر فرانس؛ اسکے علاوہ مراکش کا گلا فرانس کے ہاتھ میں ہے۔ بعدمیں بوجہ طرابلس کے اٹلی بھی اپنے حق کو بغل میں دبائے ہوے پہونچا اور ایک فریق بننا چاہا۔ یہ دیکھکر انگلستان بھی آگے بڑھا۔ مگر اب سے چند روز پیشتر تک باہمی رقابت نے یہ معاہدہ مکمل نہ ہونے دیا، اور اس لیے معرض تعویق میں پڑا رہا کہ اصلی مالکان ملک غافل تھے۔ حضرت امیر عبدالکریم غازی ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کے متعلق کسی کو شان گمان بھی نہ تھا کہ انکو رب الافواج اس قابل کردے گا کہ اس معاہدہ کی تکمیل کی اتنی جلد ضرورت پڑ جائیگی۔ چنانچہ جو معاہدہ دس برس میں مکمل نہ ہوسکا تھا وہ پورے دس روز میں تکمیل پذیر ہوگیا اور اُس پر فریقین کے دستخط بھی ہوگئے۔ اس معاہدہ کی شرائط کا علم مجھے نہیں ہے اور خیال یہ ہے کہ شاید ہندوستان میں ذی خبر لوگوں کو بھی اس کی خبر نہ ہو۔

"کنٹیمپریری ریویو" میں ایک صاحب، آرگاڈن کیننگ نے ایک مختصر سا مضمون عنوان بالا پر لکھا ہے جو ریف اور مراکش کے معاملات پر بہت کچھ روشنی ڈالتا ہے۔ میں انتظار میں تھا کہ مجھ سے بہتر کوئی بزرگ اس مضمون پر توجہ فرمائیں گے۔ مگر مایوسی ہوئی۔ لاچار باوجود اعتراف ناقابلیت اس کا ترجمہ کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ دلچسپی سے پڑھا جائے۔ یہ امر شاید باعث دلچسپی ہو کہ مسٹر کیننگ امیر عبدالکریم کی مدد کے لیے ریف گئے ہیں۔

---

گورنمنٹ اور باشندگان انگلستان نے طنجہ کی اہمیت بلحاظ مصالح جنگی اور مراکش کی اہمیت بنظر امکانات فوائد اقتصادی، اور وہاں کے باشندوں کی قابلیت اور خواہشات کے یا تو بالکل نظرانداز کردی ہے یا ان امور کا تخمینہ بہت کمی کے ساتھ لگایا ہے۔ حالانکہ کیفیت یہ ہے کہ طنجہ دنیا کے مقبوضات کی کنجیوں میں سے ایک کنجی ہے۔ برطانیہ عظمیٰ اپنی ضروریات زندگی کے لیے بحری تجارت کا محتاج ہے،

اس لیے جو اولیت نہر سویز کو حاصل ہے وہی اہمیت طنجہ کی بھی ہے۔ اس سے کیا فائدہ ہے کہ ہم ممالک مشرقیہ کے بیرونی راستہ کی حفاظت میں آتنی احتیاطیں کریں۔ درانحالیکہ مغربی دروازہ کی یہ حالت ہے کہ جس وقت جس کا جی چاہے اُسکو بند کر دے، یا کسی تجارتی جہاز کے لیے یہ راستہ بے حد خطرناک بنا دے۔ شاید طنجہ کے سوال کو کسی قدر غیر اہم سمجھ کر پس پشت ڈال دینے کے مختلف وجوہ میں ایک یہ بھی ہو کہ جبل الطارق (جبرالٹر) ہمارے قبضہ میں ہے۔ آینہ درونہ لوگوں کی نگاہ میں جبل طارق ایک مضبوط اور دشمنوں کے لیے مدہش قلعہ ہے، جو بحر روم کا مغربی دروازہ روکے ہوئے ہے اور ساحل افریقیہ پر جو کچھ بھی گذرتا ہے اُس میں برطانیہ کے فوائد کا نگہبان ہے۔ لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ یہ خیال واقعیت اور اصلیت سے بہت دور ہے۔ جبل طارق کی اس چٹان کو زمانۂ حال کا توپ خانہ اور جنگی طیارے ذراسی دیر میں ناقابل ماندوبود بنا سکتے ہیں۔ ماسوا اسکے یہ قلعہ آنکھوں میں کھٹکتا ہے اور دو قوموں کی نزاع کا باعث بنا ہوا ہے؛ اگر یہ نہ ہوتا تو یہ دونوں ایک دوسرے سے ملکر یکجہتی کے ساتھ کام کر سکتی تھیں۔ منجملہ اور باتوں کے بڑی بات یہ ہے کہ جبل طارق میں جنگی طیارے نہیں رہ سکتے۔

نظر بریں حالات ایک بین الاقوامی علاقہ قائم کرنے اور ریف اور فرانسیسی علاقہ کے معاملات روز بروز برطانیہ کے لیے اہم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور اسکی ضرورت ہے کہ یہاں بہت جلد کوئی کارروائی شروع کر دینا چاہیے۔ یہ معاملات ایسے ہیں کہ جس کی طرف ہماری گورنمنٹ اور باشندگان انگلستان کو تن دہی کے ساتھ متوجہ ہونا چاہیے۔ یہ کہکر کہ حال ہی میں طنجہ کا معاملہ طے ہوچکا ہے، اس طرف سے چشم پوشی کر لینی غیر مناسب ہے۔

دیگر علاقہ ہائے مراکش کی طرح اس ملک کے بین الاقوامی علاقہ کے باشندے ایسی نسل کے ہیں جن میں عربوں، سوسیوں اور ریفیوں کا خون ملا ہوا ہے۔ موخر الاسم لوگ ازروے تعداد زیادہ ہیں۔ اصل میں یہ لوگ اُس بڑی قوم کے افراد ہیں جو صدیوں سے بربر کہے جاتے ہیں اور جن کی اصلیت اب تک صحیح طور پر کوئی قرار نہیں دے سکا ہے۔ چونکہ اہالی ریف ساحل کے قریب رہتے ہیں اسلیے ممکن ہے کہ اُن میں یورپ کے خون کا کچھ حصہ ملا ہوا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ ونیڈال اور وزی گاتھ

لے اخبار الاندلس اور تاریخ مغرب دیکھنے سے انکی اصلیت پوری طرح معلوم ہو سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ مسٹر کیننگ نے تحقیق سے کام نہیں لیا۔ (مترجم)

کے حملوں کا بقیہ ہوں۔ یہ لوگ اُس زمانہ کی زنجیر کی بھی ایک کڑی ہو سکتے ہیں کہ جب اندلس میں تہذیب کا دور تھا، اشبیلیہ[1]، المریہ، اور غرناطہ شہرت کے بام اعلیٰ پر تھے؛ یا اُن مسلمانوں کی اولاد ہوں جو اسپین سے جلا وطن کیے گئے تھے اور ۱۴۹۲ء سے لیکر ۱۶۱۰ء تک طیطوان اور طنجہ میں آ آکر بستے رہے تھے، اور جن کے قبضہ میں اب تک اپنے بزرگوں کے اندلسی مکانات کی کنجیاں چلی آتی ہیں - لیکن خواہ وہ عرب ہوں یا ریفی، یہودی ہوں یا برطانی، فرانسیسی ہوں یا باشندگان اٹلی و اسپین، وہ یہ جانتے تھے کہ نومبر ۱۹۲۳ء میں ہماری زندگی کی وہ حالت نہیں رہی جو اکتوبر ۱۹۱۹ء میں تھی۔ تمام شہر میں بیداری تھی؛ اُسکی ملی جلی آبادی کو یہ اُمید لگی ہوئی تھی کہ اس بندر کے متعلق ایک معاہدہ ہونے اور ایک قانون بننے والا ہے؛ اس سے پہلے تو یہ کیفیت تھی کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس خوشنما اور دلکش مقام میں زہریلی ہوا پھیلی ہوئی ہے - ہر شخص کو یہ اُمید تھی کہ طنجہ کا عقدہ حل ہو جائےگا، اور خود اُنکے اور اُس شہر کے فوائد کئی قدم آگے بڑھ جائیں گے۔ شاید باشندگان طنجہ میں سب سے زیادہ انتظار موش (مسلمان) شرفاے شہر کو تھا، کیونکہ وہ اس اُمید کو لیے ہوے خوش تھے کہ اس معاہدہ سے اُنکا مستقبل خوشگوار ہو جائےگا اور اُن کے ساتھ انصاف کا برتاؤ ہوگا[2]۔

نقشہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بین الاقوامی علاقہ سمندر اور اسپین کے زیر اثر علاقہ سے محیط ہے - پھر موخر الذکر علاقہ کو سمندر اور فرانس کے مقبوضات گھیرے ہوے ہیں - اس صورت میں بین الاقوامی علاقہ کی سرسبزی اور خوشحالی کی کیا امید ہو سکتی ہے؟ یہ (بین الاقوامی) علاقہ مراکش کا جزو لاینفک ہے، نہ صرف خود اپنے فوائد کے لیے بلکہ خود مراکش کے واسطے - اس وقت چونکہ یہ الگ الگ ٹکڑے ہیں اس لیے دونوں کو خوشحالی نصیب نہیں ہو سکتی - طنجہ اپنے قدرتی جاے وقوع کے لحاظ سے بندر ہے اور مراکش کے لیے یہیں سے ریل شروع ہوتی ہے - ایک سابق سلطان کی یہ خواہش تھی کہ طنجہ اور طفلہ کو بذریعہ ریل ایک دوسرے سے ملا دیا جائے اور یہ تمام علاقہ تجارت کے لیے کھول کر اسکی نشو و نما کی جائے - یہ سب کچھ ہو جاتا مگر یورپ کی اقوام کی باہمی رقابت نے

[1] اندلس کے شہروں کے نام ہیں (مترجم) [2] گمان غالب ہے کہ یہ قول صحیح ہو، کیونکہ طنجہ گو اسپین کے قبضے میں تھا مگر ان لوگوں سے یہ امید رکھنی کہ وہ مسلمانوں سے اچھا سلوک کریں گے یا انصاف کو مد نظر رکھیں گے بالکل غلط ہے - (مترجم)

رکاوٹیں ڈالیں اور اس تدبیر و انتظام کو قوۃ سے فعل میں نہ آنے دیا - ہم آگے چل کر اس پر بحث کریں گے کہ اس معاہدہ و قانون نے کیا کیا؛ پہلے ہم ان اقوام کے زیر اثر علاقوں پر نظر ڈالنا اور یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آیا یہ اپنے یہاں کے باشندوں کے لیے فائدہ بخش ہیں یا سلطنتِ برطانیہ کے لیے اندیشہ کا ذریعہ -

جب سے کہ ملکۂ ازابیلا نے اپنے ملک میں مسلمانوں کے خلاف دینی جنگ کی آگ لگائی، وہ علاقے جن کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ اسپین کے زیر اثر ہیں، متواتر و مسلسل باعث نقصان رہے ہیں؛ نہ صرف مال کے بلکہ جانوں کے بھی - آخر اسپین کو کیا ضرورت داعی ہوئی تھی اور اُسکے کون سے حقوق کو صدمہ پہونچتا تھا کہ وہ افریقیہ میں پہونچا اور اُسکے علاقوں کو اپنے زیر اثر لے لیا؟ آیا اسکی یہ وجہ تھی کہ افریقیہ کا ساحل اسپین سے ملحق ہے، یا یہ سبب تھا کہ ملک اُن کفار (مسلمانوں) کا وطن اصلی تھا جن کو اسپین نے پندرہویں سولھویں صدی میں اپنے یہاں سے جلا وطن کیا تھا، یا اس کا باعث صرف یہ تھا کہ وہ افریقیہ کے اُن علاقوں میں اپنی تہذیب پھیلانا اور اُسکے لیے مشن بھیجنا چاہتا تھا؟ مُوجب جو کچھ بھی ہوا ہو - موجودہ حالت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یا تو یہ خیال ہی سرے سے غلط تھا یا آنکہ حصول مقصود کے لیے جو کارروائی کی گئی وہ صحیح طور پر نہیں کی گئی؛ یا تو یہ ہوا کہ اپنے مقاصد کو لیکر جس ملک پر حملہ کیا گیا اُس کے باشندوں نے اُسکو قبول نہیں کیا، یا اُنھوں نے ضرورت نہیں دیکھی؛ اگر یہ نہیں ہوا تو شاید یہ ہوا کہ خود اسپین کے لوگوں نے یکدلی کے ساتھ اُس مقصود کی حمایت نہیں کی - ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ سنہ ۱۹۰۶ء سے اسپین کی یہ خواہش رہی ہے کہ ریف کو مغلوب کر کے وہاں حکومت کرے - اسپین کی آبادی تین کروڑ ہے - وہ پچاس ہزار سے لیکر ڈیڑھ لاکھ تک فوج رکھتا ہے - باوجود اسکے وہ ان اٹھارہ برسوں میں ایسے ملک کو فتح نہیں کر سکا کہ جس میں کُل دس لاکھ آدمی بستے ہیں، جس کا طول دو سو میل ہے اور عرض صرف پچیس میل اور جس کی فوج کم و بیش ہوتے رہنے پر بھی پانچ ہزار سے تیس ہزار تک ہے ؛ نتیجہ یہ ہے کہ اتنے برسوں میں اس چھوٹے سے علاقہ نے سخت نقصان اُٹھایا، اور آج سے پچاس برس پہلے جو حالت تھی اُس میں از روے اخلاق یا مال و منال ذرا سی بھی ترقی نہیں کی ! ........ زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ چند چھوٹی بڑی کی لیں مکمل ہوگئی ہیں اور طنجہ اور القصر کا درمیانی حصۂ ملک تھوڑا بہت محفوظ ہوگیا؛ لیکن طیطوان

کی یہ حالت ہے کہ شام ہوتے ہی تمام یورپیوں کو اپنے گھروں میں گھس جانا پڑتا ہے، اور دن کے وقت شہر کے باہر سڑکوں پر پہرہ لگانا اور گرداوری کرانا پڑتی ہے - یہ وہ بڑی سے بڑی کامیابی ہے جو اس قبضہ کے بعد سے اسپین کو حاصل ہوئی ہے، حالانکہ یہ علاقہ ۱۹۰۵ء سے اُسکے قبضہ میں ہے - سچی بات یہ ہے کہ نہ تو اسپین کے باشندے اسکو چاہتے ہیں نہ اہالیِ ریف، کہ اسپین کی فوج علاقۂ ریف میں رہے؛ اب جو دس لاکھ پسیٹا[1] روزانہ وہاں خرچ کیے جا رہے ہیں، اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ کسی طرح اسپین کا اقتدار وہاں قائم رہے - ہم یورپ کے رہنے والے (مسیحی) اسپین کی گذشتہ عظمت پر جتنا چاہیں عش عش کریں لیکن مجھے یہ اندیشہ ہے کہ مسلمان اُسکو یورپ کی نگاہ سے نہ دیکھیں گے کیونکہ وہ (مسلمان) اسکو کبھی نہیں بھول سکتے کہ اندلس میں صدیوں (اُن ہی کے طفیل میں) تہذیب رہی ہے؛ نہ وہ اسکو بھولیں گے کہ جب سے (۱۶۱۰ء) وہ وہاں سے نکالے گئے ہیں، وہ ملک برابر رجعتِ قہقری کر رہا ہے[2]۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ (امیر) عبدالکریم (ایدہ اللہ بنصرہ العزیز) ریف کے مسلّمہ رہنما ہیں؛ وہ نہ بے رحم ظالم ہیں نہ غیر تعلیم یافتہ، بلکہ اسکے بالکل برعکس ہیں[3] - برسوں گذر گئے کہ وہ حیثیت

[1] ایک گنی یعنی ۲۱ شلنگ = ۲۶ (سوا چھبیس) پسیٹا کے - ۱ شلنگ = بارہ آنہ (۹) ہندوستانی کے (مترجم)

[2] مسٹر کیننگ کو مختصراً یہ کہنا چاہیے تھا کہ مسلمان اپنی حکومت اندلس کو کبھی نہ بھولیں گے - چونکہ صابر و متوکل مسلمان اپنی تقدیر اور مشیت ایزدی کے قائل ہیں اس لیے اپنی حکومت اور اپنی تہذیب کو شاید بھول جائیں مگر نہیں بھول سکتے تو اُس ستم ناروا کو جو بادشاہان اسپین نے اُن پر روا رکھا تھا، اور جس کا شمہ میری کتاب "مولدین" سے معلوم ہوتا ہے۔ استغفر اللہ! میں کیا کہہ رہا ہوں! ممکن ہے کہ اس جور و ظلم کو اہالی افریقیہ نہ بھولے ہوں، میرا تجربہ تو یہ ہے کہ باقی دنیا کے مسلمان تو بھول گئے - اللہ اللہ!! یہ قوم کتنی سادہ، کتنی عفو کرنے والی، کتنی قانع ہے - جہاں اُنھوں نے اہل اسپین کے قصور معاف کیے وہیں یہ بھی بھلا دیا کہ قرآن مجید نے یہ مشورہ دیا ہے کہ فی القصاص حیاۃ (مترجم)

[3] ایک اور مقام پر مسٹر کیننگ لکھتے ہیں کہ "میں اکثر یہ لکھا ہوا دیکھتا ہوں کہ اہالی ریف وحشی ہیں، مگر کیفیت یہ ہے کہ امیر عبدالکریم نے میڈرڈ میں تعلیم پائی ہے، اور وہ مہینوں دیگر ممالک یورپ میں رہے ہیں - ایک انگریز اُنکے پاس گیا تو اُس سے اُنھوں نے دریافت کیا کہ یورپ کی اس جنگ عظیم میں کتنے آدمی مارے گئے - اُسنے لاکھوں کا حساب بتلایا، پھر مسکرا کر کہا کہ ہم نے تو اسکے لاکھویں حصہ کا بھی خون اپنے سر نہیں لیا، پھر بھی ہم وحشی ہی کہلاتے ہیں اور جنھوں نے لاکھوں آدمی مروا ڈالے وہ مہذب و متمدن!!"

رکھتے ہیں؛ اسکی وجہ صرف اُنکی ذاتی قابلیت ہے، بلکہ یہ بھی کہ وہ شریفی خاندان کے فرد ہیں۔ اُنھوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ اُن چند لوگوں میں سے ہیں جن میں قبائل کو مجتمع کر دینے اور اُنکی باہمی رنجشوں اور رقابتوں کو مٹا دینے کی قابلیت ہے، حالانکہ یہی کام مشکل ترین ہے۔ اسی قابلیت نے اُنکی قوت کو قائم کیا اور بڑھایا ہے۔ اُنھوں نے یورپ میں تعلیم پائی ہے۔ اور اپنے ملک کی نشو و نما اور ترقی کے متعلق ایک پختہ رائے قرار دے چکے ہیں۔ وہ کسی طرح یہ نہیں چاہتے کہ کسی کے باجگذار ہو کر رہیں، نہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ مالی ضرورت سے مجبور ہو کر یورپ کے سرمایہ داروں کے پنجہ میں آجائیں کیونکہ اس کا نتیجہ اکثر یہ نکلتا ہے کہ یہی قرضہ حملہ اور فوجی قبضہ کا بہانہ بنا لیا جاتا ہے۔ اُن کا باڈی گارڈ بہت شاندار ہے۔ اور اُنکی فوج میں سات ہزار سے دس ہزار تک آدمی اُس قبیلہ کے ہیں جو ریف میں نہایت طاقتور اور معزز سمجھا جاتا ہے۔ اُنکی باقی فوج ایسی ہے کہ جو کم و بیش ہوتی رہتی ہے قبائل کا ہر ایک آدمی ایسا نشانہ باز ہے کہ جسکی نسبت بلا مبالغہ افعل التفضیل کی صفت استعمال کی جا سکتی ہے۔ ہر شخص بہادر ہے، وطن پرستی کے صحیح جذبات سے سرشار ہے، اور ہر فرد کو اپنے دین کے پُرشکوہ ہونے کا احساس ہے۔ جتنے مقامات میں ممکن ہوا اُنھوں نے ٹیلیفون کا جال بچھا دکھا ہے۔ (امیر) عبدالکریم (ایدہ اللہ) کے یہ ارادے ہیں کہ وہ اپنے تمام ذرائع کے ساتھ اپنے ملک کو بیرونی تجارت وغیرہ کے لیے کھولدیں۔ اگر اقتصادی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ رائے نہایت صائب ہے۔ اسی سے اُن کا ملک آزاد رہ سکتا ہے۔ وہ اس سے بہت ڈرتے ہیں کہ کوئی اُنکے ملک میں اُلٹی ترکیبوں اور چالوں سے درخور حاصل کرلے؛ اصل یہ ہے کہ اُنکے یہاں وہی لوگ کامیاب ہونگے جو صداقت دلی اور انصاف کو لیے ہوے اُن سے ملیں گے۔

اس خوف سے کہ اسپین کی سلطنت، ریف پر شاہی اقتدار و حق نہ جمالے، اہالی ریف جب تک ممکن ہوگا لڑتے جائیں گے، کیونکہ اسپین کو نہ یہ حق حاصل ہے کہ وہ ایسے ملک میں آئے جہاں فوجی قبضہ ہے، نہ اسپین ریف کے کسی چھوٹے سے چھوٹے حصہ پر دعوی کر سکتا ہے۔ مسلمانان ریف اسکو کسی وقت نہیں بھولتے کہ جب وہ جزیرہ نماے اسپین پر حکمراں تھے تو اُنھوں نے مسامحانہ حکومت کی تھی اور ہر طرح کی مسامحت کو روا رکھا تھا؛ لیکن جب وہ کمزور ہوے اور اُنکی سلطنت گئی تو مسیحیت نے بدترین تعصب کو کام میں لائی، تعذیب مذہبی سے مسلمانوں ہی کا شکار کیا۔

اور ہر طرح کی دغا بازی سے کام لیا - جب وہ موجودہ اسپین کو دیکھتے ہیں تو فوراً یہ پوچھتے ہیں کہ کیا ایسا ملک جس کے ذرایع اب تک نشو و نما نہیں پا سکے ہیں، اور جس کے باشندے ننگے اور ایسی حالت میں ہیں کہ جیسے وحشی، ہم کو کچھ سکھا اور تہذیب کے راستہ پر ڈال سکتا ہے؟ اہالی ریف اپنے دین کو قائم و باقی رکھنا چاہتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں کہ مبادا وہ روند ڈالا جائے، یا اُس میں خرابی پڑ جائے - (امیر) عبد الکریم (ایدہ اللہ بنصرہ) اسپین سے صلح کرنے، اُسکو حقوق فایق دینے، بلکہ شاید ملیلہ اور طیطوان اُسکے لیے چھوڑ دینے کے لیے بالکل تیار ہیں - اسپین کے پچھلے اصحاب حل و عقد نے (امیر غازی) عبد الکریم کو کئی مرتبہ رشوتیں دینے کی کوشش کی، مگر اُنھوں نے منظور نہ کیا؛ وہ صلح کرنا چاہتے ہیں مگر صرف اس شرط پر کہ اُن کا ملک آزاد رہے - وہ کہتے ہیں کہ جب ملک کی آزادی تسلیم کر لی جائے گی تو اہالی اسپین کو ریف میں داخل ہونے کی اجازت دیدی جائیگی اور وہ قیمتی مراعات بھی اُن سے نہ چھینی جائیں گی جن پر وہ بجبر قابض ہیں - اسپین کی جغرافی جاے وقوع اُنکے مفید مطلب ہے، اس لیے ملک کے اقتصادی نشو و نما میں وہ تفوق حاصل کر سکیں گے - اگر سلطان مراکش کسی بہانہ یا کسی تدبیر سے ریف پر اپنے حقوق شاہانہ جمانا چاہیں تو اہالی ریف اسکو بھی اُسوقت تک منظور نہ کریں گے کہ جب تک وہ (سلطان مراکش) کسی غیر سلطنت کے دباؤ سے بالکل آزاد نہ ہو جائیں - مراکش کی تاریخ کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس طرح جنوبی کوہ اطلس کے قبائل ہمیشہ حکمران سلطان کی تکلیف کا باعث رہے ہیں وہی کیفیت اہالی ریف کی رہی؛ لیکن اگر اسوقت کوئی ایسا آزاد مسلمان بادشاہ تخت فیض پر ہوتا جو اُنکی مادی و روحانی ضروریات کا کفیل ہو سکتا تو اہالی ریف اُسکو اپنا سلطان تسلیم کر لینے پر آمادہ تھے - اس وقت تو سلطان کی حمایت بیجا ہے گفت ہی ہے -

فرانس اپنی اس اُمید کے پورے ہونے کا انتظار کر رہا ہے کہ (غازی) عبد الکریم (ایدہ اللہ) اور اسپین کی صلح ہو جائے؛ بلکہ بعض وقت یہ بھی شبہہ کیا جاتا ہے کہ فرانس نے امیر کو مدد دی ہے[لہ]؛

لہ یہ بالکل لغو ہے - اول تو یہ اُمید ہی نہیں کہ فرانس امیر غازی کو مدد دے - دوسرے کیا فرانس سے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اسپین اور امیر غازی (ایدہ اللہ) دونوں سے ریف خالی کرالے - تیسرے نہایت معتبر خبر تو یہ ہے کہ امیر غازی (ایدہ اللہ) نے حال ہی میں سرکاری طور پر تمام دنیا کو مطلع کیا ہے کہ یہ خیال سرتاپا غلط ہے کہ ہمیں کوئی سلطنت مدد دے رہی ہے؛ برعکس اسکے جو قیدی اسپین سے ہم گرفتار کر رہے ہیں اُن میں یورپ کی کئی اقوام کے لوگ شامل ہیں (دیکھیے صفحہ آیندہ)

نہ اس لیے کہ انصاف اسکا متقاضی ہے بلکہ اس واسطے کہ وہ وہاں کے معاملات کو زمانۂ آیندہ میں اپنے قبضہ میں کرنا چاہتا ہے - اس وقت تو وہ بیصبری کے ساتھ اُس گھڑی کا انتظار کر رہا ہے کہ جب ریف آزاد ہو جائیگا - اُس وقت اگر انگلستان یا کسی پُر زور لیگ آف نیشن نے ریف کی آزادی کی حفاظت و حمایت نہ کی تو وہ کوئی چھیڑ خانی کر کے یہ بہانہ پیدا کرلے گا کہ ریف کے قبائل نے اُسکے محفوظہ ملک پر حملہ کیا ہے' اور اس ترکیب سے وہ اُس آخری حصۂ ملک پر قبضہ کرلے گا جو اُس کا نصب العین یعنی اَوران سے لیکر طنجہ تک کے قبضہ کا خارراہ ہے - جب فرانس یہ کر چکے گا تب کہیں جاکر وہ شمالی افریقیہ کے قبضۂ کامل میں کامیاب سمجھا جائے گا' اور یہی فرانس کی مدت مدید کی آرزو ہے۔ حقیقت یہ بھی ہے کہ جب تک یہ نہیں ہوتا اُس کا ایک بازو محفوظ نہیں ہوتا - نہ بحر روم پر اُسکی قوت کو تمام اقوام پر تفوق حاصل ہو سکتا ہے - کیونکہ صرف یہی صورت ایسی ہے کہ آبناؤں پر اُس کا قبضہ بلا شارکت غیرے ہو سکتا ہے -

یہ ظاہر ہے کہ ریف فرانس کی مسلح' قواعد داں اور منظم فوج کا کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتا - اس لیے (امیر) عبد الکریم (ایدہ اللہ) کو بہت محتاط رہنا چاہیے کہ کہیں وہ اسپین کے ادعاے حفاظت و حمایت کو تباہ کر کے بڑے خطرات میں نہ مبتلا ہو جائیں -

ریف کے اندرونی اور اقتصادی معاملات ایسے ہیں کہ اُنکا نشو و نما کرنا بہت مناسب ہے - جنگ کے شروع ہونے سے پہلے ایک جرمن انجینیر نے یہاں کوئیلہ' تانبہ اور سونے کی کانیں

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اور سلطنتیں اسپین کو مدد دے رہی ہیں - شاید حضرات ناظرین کو یاد ہوگا کہ پچھلے دنوں مسلمانوں کے شفیق مسٹر لائڈ جارج نے انگلستان کے لوگوں کو اجازت دیدی تھی کہ اگر وہ چاہیں تو اسپین کی فوج میں بھرتی ہو کر امیر عبد الکریم ایدہ اللہ کے خلاف لڑ سکتے ہیں - ہندوستان اور مصر کے مسلمانوں نے اسکی مخالفت کی - جناب لائڈ جارج کو اپنی یہ اجازت منسوخ کرنا پڑی - اب یہ کہا جاتا ہے کہ اگر اُن قیدیوں میں جو امیر غازی ایدہ اللہ گرفتار کر رہے ہیں علاوہ اور ممالک کے انگلستان کے لوگ بھی شامل ہیں تو اسکی توجیہ یہ ہے کہ انگلستان میں بیکار لوگ زیادہ ہیں اسلیے "شاید" وہ چلے جاتے ہوں - بہت ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو مسلمانوں کو غیر ممالک سے شکایت کرنے کا چنداں حق نہیں ہے اگر ہم کچھ کر سکتے ہیں تو اُس سلطنت سے جسکو یہ دعویٰ ہے کہ ہمارے یہاں دنیا بھر سے زیادہ مسلمان بستے ہیں - خدا تعالیٰ نے اپنی مشین میں بھی برکت دی ہے مگر شاید امیر غازی ایدہ اللہ اس قابل نہیں کہ اُنکی مدد کیجائے یہ شرف صرف ترکوں ہی کو حاصل تھا! (مترجم)

تبلائی ہیں اور اُنکے متعلق اُمید افزا رپورٹ کی ہے - حال ہی میں ایک انگریز ماہر تسکین بخش رپورٹ لیکر آیا ہے - انکے علاوہ وہاں لیموں و نارنگیوں کے درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ ہیں - یہ ساحل بحر کے بہت قریب ہیں - اور ایک اول درجہ کا بندر وہاں موجود ہی ہے - وہاں کے باشندوں کی خصلت و جہالت ایسی وحشیانہ اور بُری نہیں ہے جیسی کہ ظاہر کی گئی ہے - ان لوگوں کی جسمانی حالت نہایت اچھی ہے - مجھے طنجہ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اُن میں تعلیم حاصل کرنے کی غیر معمولی قابلیت ہے، خاص کر انجنیری کی - اُن میں جو کٹر پن اور مذہبی دیوانگی سی معلوم ہوتی ہے یہ اصل میں احتیاط ہے اس امر کی کہ عیسائی اقوام میں سے کوئی اُن پر یک لخت حملہ نہ کر بیٹھے - جیسے ہی اُن کا یہ شبہہ جاتا رہے گا یہ کٹر پن بھی ختم ہو جائے گا، کیونکہ مسامحت اُنکے دین کا ایک جزو ہے - مراکش کا ماضی کافی عظمت رکھتا تھا، اس لیے اُسکے مستقبل کی نسبت بھی اچھی اُمیدیں ہیں - ہر ایک انگریز کو چاہیے کہ وہ ریف کو محبت اور قدر کی نگاہ سے دیکھے - باوجود اسکے کہ اس ملک کی آبادی چند لاکھ نفوس کی ہے، مگر وہ اپنی مردانگی اور حب وطنی کی وجہ سے برسوں ہو گئے کہ ایسے ملک کی فوجوں سے مقابلہ کر رہا اور ٹکر جھیل رہا ہے کہ جس کی آبادی کروڑوں ہے - کیا انگلستان سے یہ نہیں ہو سکتا کہ اسپین کو زیادہ نقصان پہونچائے بغیر ریف کے سوال کو لیگ آف نیشنس میں پیش کر دے، اور اسکی نگرانی کرے کہ اسکی آئندہ عفت اور آزادی قائم رکھے؟ (امیر عبدالکریم (ایدہ اللہ) کی روشن خیالی اور اعلیٰ درجے کے اخلاق کی قدر کی جائے، سلطنتہائے یورپ کی رقابتوں سے اُن کو دل تنگ نہ ہونے دیا جائے - ہم کو اس شخص کی مدد کرنی چاہیے کیونکہ وہ ملک مغرب میں اسلام کے احیاء ثانیہ کا اصل باعث ہے - بالکل اُسی طرح جس طرح مصطفیٰ کمال (ایدہ اللہ) باوجود ہر قسم کی مشکلات کے مشرق وسطیٰ میں احیاء ثانیہ کر رہے ہیں - ماسوا اسکے چند لمحوں کے لیے نقشہ پر نگاہ ڈال کر فرانسیسی مراکش اور فرانسیسی شمالی افریقیہ کے باہمی تعلق کو دیکھنا چاہیے - آپ یہ پائیں گے کہ اُسکے بازو اُس راستہ کو دھمکا رہے ہیں جو مارسیلز سے سینیگال کو جاتا ہے - سنہ ۱۹۰۶ء میں بمقام الجزائر گورنمنٹ مراکش کی حیثیت پر یورپ کی گیارہ یا کچھ زیادہ سلطنتوں اور سلطان مراکش کے نمایندوں کے آپس میں بحث ہو کر ایک معاہدہ لکھا گیا تھا - اُسکی پہلی ہی دفعہ میں یہ قرار دیا گیا تھا کہ مراکش کی آزادی قائم رکھی جائے گی اور اُس

کی اقتصادی نشو و نما میں ہر طرح کی مدد دی جائیگی۔ مگر اسوقت ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ مراکش کی جو حیثیت قرار پائی تھی۔ اُس میں اور اب میں کتنا فرق ہے[1]۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں فرانس اور انگلستان کے درمیان میں ایک معاہدہ ہوا تھا کہ یہ دونوں جو حقوق فائق مراکش و مصر میں حاصل کر چکے ہیں اُن میں ایک دوسرے سے تعرض نہ کریگا۔ اس معاہدہ پر برطانیہ اتبک قائم ہے جس کو اہل مراکش حیرت کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ لوگ اپنے اس خیال پر مُصر ہیں کہ برطانیہ کو جو دقتیں مصر میں پیش آ رہی ہیں وہ فرانس کی عنایت سے ہیں۔ وہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ انگلستان نے اُن (مراکشیوں) کے ملک میں کبھی پراپیگنڈا نہیں کیا۔ سنہ ۱۹۰۴ء کے معاہدہ میں صاف طور پر درج ہے کہ فرانس صرف امن و امان سے مراکش میں داخل ہونے کے ذرائع استعمال کر سکتا ہے سنہ ۱۹۰۷ء میں ایک خفیف سے معاملہ پر فرانس نے کاسابلینکا پر گولہ باری کر دی؛ بس اُسی دن سے سلطان کے اختیارات سلب ہو گئے اور فرانس کی گورنمنٹ وہاں قائم ہو گئی۔ مولا عبدالعزیز اور مولا حفیظ کو بے عزت کر کے نکال دیا گیا، اور اُن کا چھوٹا بھائی یوسف بنام نہاد سلطان تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اُس روز سے یہ غریب بلا چون و چرا فرانس کے احکام کی تعمیل کر رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ باوجود اسکے کہ یوسف کو سلطان کا باشان و شکوہ خطاب حاصل ہے، مگر مراکش کے مسلمانوں کو نہ اُس سے محبت ہے نہ اُنکے دلوں میں اُسکی کوئی قدر و منزلت ہے۔

فرانس کی حکومت صرف دو چیزوں پر قائم ہے؛ ایک سونا، دوسرے مشین گن۔ سونا وہ اُن اضلاع میں بکھیرتے ہیں جہاں نسبۃً امن ہو چکا ہے، اور جو لوگ اپنے سلطان کے حامی رہے تھے؛ مشین گنیں اُس علاقہ میں استعمال کرتے ہیں جس کو اُنھوں نے چند روز پیشتر مغلوب کیا ہے۔ زمانۂ جنگ میں تو کچھ نہ ہو سکا؛ تاہم مارشل لایوٹی کے استقلال مزاج اور بہترین تدبیر سے وہ علاقہ فرانس

[1] مسٹر کیننگ اس کا اقبال کیوں نہیں کر لیتے کہ عیسائی سلطنتوں کی یہ عادت مستمرہ ہے کہ وہ اپنی زبان و قلم پر کبھی قائم نہیں رہتے۔ کیا فرڈننڈ اور ازابیلا نے اپنے آپ کو اور اپنی اولاد در اولاد کو ایک معاہدہ کی رو سے اسکا پابند نہیں کیا تھا کہ وہ اسپین میں مسلمانوں کو مساوی حقوق دیں گے، مساجد کی توہین نہ کریں گے، اُنکے دین سے تعرض نہ کرینگے وغیرہ وغیرہ۔ پھر چند روز کے بعد انھیں دونوں ملعونوں اور انکی اولاد در اولاد و جانشینوں نے کیا کچھ نہیں کیا جسکا مختصر نتیجہ یہ ہو کہ مسلمان تو ایک طرف وہاں مسلمانوں کی قبریں بھی نہیں ملتیں۔ اسکا تماشا دیکھنا ہو تو میری کتاب "سولدین" ملاحظہ فرمائیے اور اگر آپ سے رد یا جائے تو رو دیجئے۔ مترجم

ہی کے ہاتھ میں رہا جو امن کی حالت میں تھا۔ اُنھوں نے جرمن قیدیوں سے وہ سڑکیں بنوالیں جو اس وقت ملک میں اول درجہ کی سمجھی جاتی ہیں۔ جنگ کے بعد جو چار برس گذرے ہیں اُن میں اور فتوحات ہوئیں؛ اب صرف پہاڑی علاقہ اور سوس فتح ہونا باقی ہے۔ ان ہی چار برسوں میں سول گورنمنٹ نے ملک میں اور بھی ترقیات کی ہیں، کاسابلیکا کا بندر تیار کرلیا ہے، بڑی بڑی سرکاری عمارتیں بنادی ہیں، عرب آبادی کے باہر نئی چھاؤنی بنگئی ہے، چھوٹی پٹری کی ریل تیار ہوگئی ہے اور اب اُسکو چوڑی پٹری میں منتقل کیا جارہا ہے۔

اگر کوئی شخص اس ملک میں موٹر پر سفر کرے تو اُسکو دفعتہً تو بظاہر یہ معلوم ہوگا کہ یہ ملک خوشحال، پُرامن اور قانع ہے۔ لیکن باوجود مارشل لایوٹی کی محنت، بلند نظری اور ہمدردی کے یہ حالت صرف سطحی ہے۔ ملک کے اوپر قرضہ کا بڑا بار ڈال دیا گیا ہے؛ زراعتی پالیسی سے بہت غفلت کی گئی ہے، حالانکہ ملک مراکش قدرتی طور پر زراعتی ملک ہے۔ نہ ذرایع آبپاشی میں کوئی ترقی کی گئی ہے، نہ بھیڑ بکریوں اور دیگر جانوروں کے پالنے اور بڑھانے پر توجہ کی گئی ہے حالانکہ آسٹریلیا کے ماہرین یہ رپورٹ کرچکے ہیں کہ ملک کے بہت سے حصے مرنیہ[1] کی نسل کشی کی بہترین قابلیت رکھتے ہیں۔ سرکاری عمارتوں پر بے دردی کے ساتھ روپیہ خرچ کیا گیا ہے، لیکن یہ سب بیکار، کیونکہ جو سرمایہ اُن پر لگایا گیا ہے نہ اُس سے کوئی منافع کی اُمید، نہ ان عمارتوں سے یہ توقع کہ وہ ملک کے ترفہ کو بڑھائیں گی۔ بندر بنانے کے لیے جو مقام اور جگہ انتخاب کی گئی ہے وہ بدترین ہے۔ جو ساحل تجویز کیا گیا ہے وہ خطرناک ہے، جو بند دیوار کی صورت میں لگایا گیا ہے اُسکے متعلق ماہرین کی رائے ہے کہ وہ بہت دیر تک اطلانٹک کی امواج کا مقابلہ نہ کرسکے گا۔

جنوبی مراکش میں قائدین کے ہاتھ میں حکومت ہے ان کو فرانس سے بیش قرار معاش ملتی ہے۔ بہت سے قبائل کو ہتھیار رکھنے کی اجازت ہے۔ اب تک فرانس کو یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ اُن سے ہتھیار چھین لے۔ ان تمام باتوں کے پس پردہ فرانس کی موجودہ طرز حکومت کے خلاف ملک میں

[1] مرنیہ اُس بھیڑ کا نام ہے جس کی پشم سے مرنیہ نامی کپڑا بنتا ہے۔ جب اسپین میں مسلمانوں کی سلطنت تھی تو ان بھیڑوں کی طرف خاص توجہ کی جاتی تھی۔ اور ان کے متعلق الگ قانون وضع کیا گیا تھا۔ ملاحظہ ہو میری اخبار الاندلس۔ (مترجم)

بے چینی اور بے اطمینانی ہے؛ لوگ اُسکے طریق داد رسانی سے خوش نہیں ہیں، حالانکہ وہ حج اور زیارات کے راستہ میں رُکاوٹیں نہیں ڈالتی۔ جوانانِ مراکش میں وہی مادۂ فساد اور وہی آزادی کی خواہش موجود ہے جو ایسے ملکوں کے جوانوں میں ہوتی ہے جو کسی غیر ملکی حکومت کے ماتحت رہ کر فائدہ یا نقصان اُٹھاتے ہیں؛ چند ہی سال کے بعد یہ ہونے والا ہے کہ وہ منظم طور پر حکومت خود اختیاری کا دعویٰ کریں گے اور اُسکو لے کر رہیں گے۔ مراکش کی آبادی اَسّی لاکھ نفوس کی ہے۔ اسکے واسطے فرانس نے وہاں اتنی فوج رکھی ہے جتنی انگریزوں نے ہندوستان میں؛ حالانکہ اس ملک کی آبادی تیس کروڑ سے بھی زیادہ ہے۔ شاید زمانۂ مستقبل میں فرانس کے قبضہ و غلبہ کا نشان مارشل لایوٹی کی معدودے چند عمارتیں رہ جائیں یا بعض اور خوبصورت چیزیں۔

مسلمانانِ عالم کے جو خیالات انگلستان کے متعلق ہیں وہ ہم اخبارات وغیرہ میں پڑھ چکے تھے۔ جب ہم طنجہ پہونچے تو ہم کو یہ دیکھ کر تعجب اور خوشی ہوئی کہ ہر شخص کے دل میں اُمید اور اُمنگ تھی۔ انگلستان پر وہاں والوں کو بہت کچھ اعتماد تھا اور وہ اسکے خواہشمند تھے کہ اُنکے تعلقات انگلستان سے بڑھ جائیں اور وہ لوگ اُسکے زیر سایہ آجائیں؛ انگلستان کے انصاف کی بہت کچھ قدر تھی۔ انگلستان نے جو حال ہی میں مصر کی حکومت سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا ہے اور وہاں کی مالی حالت بہت اچھی چھوڑی ہے اُسکی سب تعریفیں کرتے تھے۔ لیکن جب اُن سے معاہدہ طنجہ کا ذکر کیا تو وہ بہت خاموش، مایوس اور بددل معلوم ہوئے؛ اُن کے بشرہ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ انگلستان نے ایک مرتبہ پھر اپنے دوستوں کو ملکی پالیسی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا ہے۔

نئے سال کو اپنے ساتھ امید ترقی لانی چاہیے؛ اب کے نیا سال آیا تو اہل طنجہ کے لیے کوئی ایسی خوشخبری نہیں لایا جس پر وہ شکر کرتے۔ اگر انہیں خوشی نظر آتی تھی تو فرانس کے پولیٹیکل ایجنٹ کے یہاں، کیونکہ سلطان کے نمایندوں نے آکر فرانس کی ملکی چالوں کی کامیابی کی خوب تعریفیں کیں؛ شاید اس سے یہ مطلب ہوگا کہ ان کی مدد معاش میں ترقی ہو جائے گی، یا آئندہ اپنے اپنے عہدوں پر بحال رہ جائیں گے۔ عوام میں، جیسا کہ اب ہمیں معلوم ہوا ہے، ایک طرح کا غصہ تھا، گر اُنکی آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا تھا۔ رہ گئے مسلمان، اُن میں خوف کے علاوہ غصہ بھی تھا کہ اُنکو دھوکا دیا گیا۔ اُنھیں الفاظ "حکومت سلطانی" سے سخت نفرت ہے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ سلطان کوئی

چیز نہیں ہے، جو کچھ ہے وہ فرانس ہے۔ وہ بین الاقوامی گورکھ دھندے کو "فرانس کے انصاف" پر ترجیح دیتے ہیں۔ معاہدہ کی بیخ و بنیاد "بین الاقوامی" ہے، اور مجلس آئین و قوانین مختلف سلطنتوں کے ارکان سے مشتمل ہونے والی ہے۔ انکی تعداد ۲۶ ہوگی، ان میں سے گیارہ یا تیرہ آدمی وہ ہونگے جو فرانس کے تنخواہ دار ہوں گے، اور باقی منتظم اور مندوب سب فرانس کے منتخب کردہ!

یہ گورنمنٹ کسی طرح بین الاقوامی نہیں کہلا سکتی۔ اس معاہدہ کو فرانس، اسپین، انگلستان اور مراکش نے تو فوراً مان لیا اور اٹلی اور امریکہ کے نمایندوں نے بھی تسلیم کر لیا، مگر آخری تینوں سلطنتیں اسپر دستخط کرنے کے خلاف ہی رہیں۔ باشندگان انگلستان نے اس سے چنداں اعتنا بھی نہ کیا، بہرحال معاہدہ مکمل ہو گیا: مگر سوال یہ ہے کہ کیا اقتصاداً معاملہ اس سے بھی زیادہ بگڑ سکتا ہے؟ طنجہ کے معاہدہ کو صرف اس نظر سے دیکھ کر بیشتر انگریزوں نے صبر کر لیا لیکن وہ اہم معاملہ کو نظرانداز کر رہے ہیں۔ یعنی طنجہ کی حیثیت فوجی ضروریات کے لحاظ سے۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں جو ہمارا معاہدہ فرانس کے ساتھ ہوا تھا اُس میں طنجہ کا کہیں ذکر نہیں ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہمارے نمایندوں نے ان بین الاقوامی رقبہ، نیز فرانسیسی مراکش پر فرانس کی فوقیت کو تسلیم کر لیا ہے۔ معاہدہ ورسلیز کے موافق جرمنی اور آسٹریا کے جہازات تجارتی تجارت کی غرض سے یہاں نہیں آ سکتے، لیکن اسوقت یہ کیفیت ہے کہ سوائے فرانس کے تمام سلطنتیں یہ چاہتی ہیں کہ جرمنی اور آسٹریا کے تاجر پھر یہاں آ جائیں لیکن باوجود اسکے یہ معاہدہ نہیں بدلا جا سکتا۔ یہ ہے رقبہ طنجہ کے بین الاقوامی ہونے کی تمام حقیقت!

معاہدہ تو مکمل ہو چکا، اس لیے ہمیں اپنی توجہ دوسری طرف مبذول کرنی چاہیے، اور اسپر غور کرنا چاہیے کہ جو تفوق ایک سلطنت کو یہاں حاصل ہو چکا ہے اُس کا اثر کیونکر زائل کیا جائے۔ اگر لیگ آف نیشنس اب تک اس قابل نہیں ہوئی ہے کہ اس چھوٹے سے رقبہ کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں لے لے۔ یا اُس کا اقتدار اتنا نہیں ہوا ہے کہ وہ امور متنازع کا تصفیہ کر سکے تو ہم کو خود اپنی عاقبت اندیشانہ پالیسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ مراکشی مسلمانوں میں بڑی تعداد مالکیوں کی ہے، تاہم وہ سلطان قسطنطنیہ کو اپنے سلطان پر بھی فوقیت دیتے ہیں، اور قسطنطنیہ کو مرکزی حکومت گاہ سمجھتے ہیں۔ چند مرتبہ سلطان مراکش نے اپنے آپ کو امیر المومنین بھی کہلایا ہے، مگر یہ ظاہر ہے کہ اُسکو اس کا حق حاصل نہیں ہے، اور دنیا کے بیس کروڑ سنی مسلمانوں میں اسکی کوئی وقعت نہیں

ہوسکتی۔ چونکہ ترک خلیفہ کو جلا وطن کر چکے ہیں اس لیے فرانس اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کی تعداد کثیر کی رائے سے مراکشی سلطان یوسف کو امیر المومنین قرار دلوا دے۔ یہ سازش ممکن ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے کامیاب ہو جائے لیکن اس کا انجام یہ ہوگا کہ فرانس کا جو کچھ اثر و اقتدار مسلمانوں میں ہے وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائیگا؛ کیونکہ سلطان یوسف کو خود اُنکی رعایا کا فرو مرتد سمجھ رہی ہے۔ سُنّی مسلمانوں کے نزدیک خلیفہ دینی و دنیوی حکومت کا مجموعہ ہونا چاہیے؛ یہی دنیوی حکومت تھی کہ جس کی وجہ سے سلطان سلیم نے خاندان آل عثمان میں خلافت کو منتقل کر لیا۔ فرانس کی تدابیر کو بار آور ہونے اور اسکے امکانات پر غور کرنے سے پہلے ہر شخص یہ سوال کر سکتا ہے کہ موجودہ سلطان مراکش کو کونسی دنیوی حکومت حاصل ہے؟ شاہ حجاز کے دعوے کی تائید کرتے ہوئے ہمیں بہت ہوشیاری سے کام لینا چاہیے، کیونکہ یہ شخص بھی عیسائیوں کا غلام اور تنخواہ دار سمجھا جاتا ہے۔ رہ گیا یہ امر کہ وہ مسلمانوں کے دو مقدس ترین شہروں پر قابض ہے، اس کا سنّیوں پر کوئی اثر نہیں، کیونکہ مسلمانوں کی تعداد کثیر اس سے خوش نہیں [1]ہے۔

پچھلی صدی میں مسیحی سلطنتیں مسلمانوں کے بہت سے ملکوں پر قبضہ کر چکی ہیں۔ ایسی صورت میں مسلمانوں کی رائیں عیسائیوں کے متعلق جیسی کچھ ہونی چاہییں ظاہر ہے۔ اہالی مراکش نسبتہً انگلستان کے متعلق اچھی رائے رکھتے ہیں۔ ہم کو چاہیے کہ ہماری نسبت جو حُسن ظن اُنکو ہے اُسکی قدر کریں اُسکو صحیح کر کے دکھلا دیں اور اُنکی مشکلات میں اُنکے ساتھ ہمدردانہ پیش آئیں۔ کیا ہم یہ امید نہیں رکھ سکتے کہ وقت پڑنے پر وہ ہمارے مددگار رہوں گے؟

ہم کو، خواہ یہ سودا کتنا ہی گراں کیوں نہ پڑے، اسپین کو علاقہ ریف واقع ساحل بحر روم سے بغیر کسی ضمانت کے نہیں نکلنے دینا چاہیے اور طنجہ میں سوائے فرانس کے کسی کو نہیں رہنے دینا چاہیے۔ نور النقشہ پر نگاہ ڈالیے تو ایک ہی نظر میں معلوم ہو جائیگا کہ شمالی افریقیہ میں کتنا علاقہ اور کتنے آدمی فرانس کے زیر نگیں ہیں۔ اگر اُسے فوجکشی کرنا پڑے تو اُسے ہر طرح کی مدد مل سکتی ہے۔ انگلستان کے باشندوں سے ان واقعات کا چھپانا بیکار ہے، کیونکہ فرانس اپنے ارادہ کو پکار کے گلے اور اکثر ظاہر کرتا رہتا ہے۔ ہم کو ایک فرانسیسی کا یہ قول ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ "یورپین پالیسی میں انگلستان اور فرانس کا اتفاق رائے ہو سکتا ہے؛ لیکن ایشیا

[1] اب تو بساط اُلٹ چکی ہے۔ شریف حسین بلکہ بنی دو دو گوش عرب ہی سے تشریف لے جا چکے۔ (مترجم)

اور افریقیہ میں دونوں کے مفاد ایک دوسرے سے اتنے متضاد ہیں کہ اس کا امکان ہی نہیں کہ ان دونوں کے درمیان کبھی حقیقی اتفاق ہو جائے گا۔"

جو ترکیب کہ ہم کو مغربی ساحل بحرِ روم پر اپنے اغراض و مقاصد کی حفاظت کے لیے چلنی چاہیے اُس کا نقشہ تیار رہے۔ ہم کو فوراً کارروائی شروع کر دینا چاہیے؛ ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جائے اور ہمیں پچھتانا پڑے۔ طنجہ اور اُس کا ملحقہ ساحل دنیا کے قدیم کے پرانے مقامات میں سے ایک ہے۔ وہ ہمیشہ سے اہم رہتا آیا ہے اور ہمیشہ اہم رہے گا۔ فقط

یہاں مسٹر کننگ کا مضمون ختم ہوتا ہے۔ اس کا خلاصہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ وہ فرانس سے سخت ناراض ہیں، نہ اس لیے کہ اُس نے سلطان مراکش کو شاہ شطرنج بنا رکھا ہے، بلکہ اس لیے کہ انگلستان کا وہاں عمل دخل نہیں ہونے دیتا، نہ تجارت کرنے دیتا ہے۔ امیر غازی ایدہ اللہ سے وہ ہمدردی دکھلاتے ہیں، نہ اس لیے کہ وہ حق پر لڑ رہے ہیں، بلکہ اس واسطے کہ انجام کار فرانس کا اقتدار بڑھے گا۔ بظاہر وہ اسپین کو ملزم گردانتے ہیں، مگر یہ بھی نہیں چاہتے کہ اُس کا قدم بالکل اُکھڑ جائے۔ سلطان مراکش سے تو اُنکو بے حد ہمدردی ہے مگر "نہ بجب علی بل یبغض معاویہ"۔ وہ چاہتے ہیں کہ انگلستان بلطائف الحیل انکو اپنا بنالے اور وہ انگلستان کو اپنا سمجھنے لگیں۔ مشورہ تو نہایت معقول ہے، مگر شاید ہندوستان والوں کو حضرت سعدی علیہ الرحمہ کی وہ حکایت نہ بھولے گی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ "چو دیدم عاقبت خود گرگ بودی"۔

جہاں تک مسلمانانِ ہند کا تعلق ہے یہاں امیر غازی ایدہ اللہ سے سرد مہری رہی ہے؛ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے (اور یہ موقع تفصیلی بحث کا نہیں ہے) تو امیر غازی کی خدانا کردہ ناکامی اور بعون اللہ کامیابی پر مسلمانانِ دنیا کے اکثر حصہ کی موت و حیات منحصر ہے۔ خلافت کے لیے خوب خوب مرثیے پڑھے گئے اور وہ وہ ماتم ہوئے کہ "زمیں ساری ہلا کے اُٹھے" لیکن وہ ہانڈی کا اُبال جو ختم ہوتا ہے تو ہر جگہ اوس پڑی معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ دو وجہ ہوں۔ اوّل تو ہندوستان سے ریت کا بُعد۔ مگر حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا تو یہ ہے کہ مسلمان، خواہ کہیں کے ہوں، ایک دوسرے کے بھائی اور ایک دوسرے کے پشتیبان ہیں۔ غالباً یہ اصول کہ "چو عضوے بدرد آورد روزگار دگر عضوہا را نماند قرار" غلط ہو گیا۔ یاد رکھیے کہ جس وقت "کاش" انسان کی

زبان سے نکلتا ہے اُسکے بعد ہر تدبیر ناکام ہی رہتی ہے۔ خدا کرے کہ ریف اور مراکش کے معاملہ میں وہ وقت آپ نے اوپر نہ آئے کہ آپ یہ کہیں کہ "کاش ہم نے اس سے پہلے امیر غازی سے ہمدردی دکھائی ہوتی۔ الحذر! الحذر!!

دوسری وجہ ممکن ہے کہ یہ ہو کہ مسلمانان ہندوستان کو یہ نہ معلوم ہو کہ اسپین کے کفار نے وہاں مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا۔ یہ نہ سمجھیے کہ میں خود ستا ہوں، خوب جانتا ہوں کہ "چو زن پستان خود بالد حظوظ نفس کے یابد"۔ اس کا خیال نہ کیجیے کہ میں اپنی کتاب کا اشتہار دیتا ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ "کار ساز ما بفکر ما"۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ان اسپین والوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا، میری کتاب مولدین ملاحظہ فرمائیے تو آپ کو معلوم ہو کہ وہ کونسا ظلم تھا جو اُن پر نہیں ہوا، وہ کونسی رسوائی تھی کہ باقی چھوڑ رہی گئی۔ آپ کے بھائیوں کو بجبر عیسائی بنایا گیا، مسلمان ماؤں کی گودوں سے مسلمان بچوں کو چھینا گیا کہ عیسائی بنائے جائیں گے۔ مسلمان عورتوں کی عصمت دری ہوی، مسلمان مردوں کو بے رحمی کے ساتھ قتل کیا گیا۔ واللہ کہ اُن مصائب کے زبان پر لانے سے روح کانپتی ہے، اُن باتوں کو یاد کرکے بدن سے شعلے نکلتے ہیں۔ یہ مشورہ ایزدی ہرگز نہ بھولیے کہ "فی القصاص حیات یا اولی الالباب"۔ اگر آپ میں کچھ بھی حمیت ہے تو دامے، درمے، قدمے اُس شخص کی مدد کیجیے جو آپ کی عزت قائم رکھنے کے لیے یکہ و تنہا قریباً ایک ربع صدی سے ان ظالم اسپین والوں سے لڑ رہا ہے۔

میری آخری صدا (خدا کرے کہ وہ صدا بصحرا نہ ہو) یہ ہے کہ:۔

آتا تو نہ چھپ کے لے کفن کا
گھبرا کے نقاب زندگانی

محمد خلیل الرحمن

(مترجم اخبار الاندلس وغیرہ)

اخبار الاندلس۔ مشہور امریکن مورخ اسکاٹ کی تاریخ کا ترجمہ تین مبسوط جلدوں میں، تینوں کا مجموعی حجم تین ہزار صفحوں کے قریب ہے قیمت ۲۵

مولدین۔ ایک امریکن عالم ہنری چارلس کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ قیمت ؏

دونوں کتابیں دفتر الناظر سے مل سکتی ہیں۔ ایڈیٹر

# غوث الاعظم

مکرم و محترم جناب مرزا احمد عسکری بی۔ اے سکریٹری انجمن اُردو لکھنؤ نے یہ مضمون انسائیکلوپیڈیا آف اسلام سے لیا ہے، جو اقوام اسلامی کے جغرافیہ و انساب و سیر وغیرہ کے متعلق ڈاکٹر ہوتسما کی ادارت میں شایع ہو رہی ہے۔ صاحب ممدوح نے اضافۂ حواشی کے علاوہ متن میں بھی ضروری موقعوں پر الفاظ اور جملے بڑھا دیے ہیں جنکو ممتاز کرنے کے لیے قوسین سے محدود کر دیا ہے۔ انجمن اُردو نے بھی اسی قسم کی ایک کتاب کی ترتیب و اشاعت اپنے نظام کار میں شامل کی ہے جو ادب اُردو میں یقیناً ایک نہایت ہی مفید اور قیمتی اضافہ ہوگا۔ ایڈیٹر

(حضرت شیخ) عبد القادر جیلی (جیلانی یا گیلانی) محی الدین ابو محمد بن ابی صالح زنگی دوست[1] مشہور واعظ اور صوفی، جنکے نام سے سلسلۂ قادریہ مشہور ہے، ۴۷۰ھ ہجری مطابق ۱۰۷۷ء میں پیدا ہوئے[2] اور ۵۶۱ھ ہجری مطابق ۱۱۶۶ء میں انتقال فرمایا۔ آپ کی متعدد سوانح عمریاں موجود ہیں جن میں روایات ضعیفہ کثرت سے پائی جاتی ہیں مگر صحیح واقعات بھی مل سکتے ہیں۔ مثلاً آپ کا شجرۂ نسب آپ کے پدر بزرگوار کی جانب سے (حضرت امام) حسن (علیہ وعلیٰ آبائہ الصلوٰۃ والسلام) دختر زادۂ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) تک پہونچایا جاتا ہے۔ حالانکہ آپ کے پدر بزرگوار کا عجمی نام اور خود (حضرت) شیخ کا بغداد میں "عجمی" کے لقب سے مشہور ہونا اسکے منافی پڑتا ہے۔[3]

---

[1] معتبر کتب عربی میں جن میں حضرت شیخ کے حالات درج ہیں، "جنگی دوست" ہے۔

[2] بعض کتابوں میں آپ کی پیدائش کی تاریخ لفظ "عاشق" (۴۷۱) اور وفات لفظ "معشوق الٰہی" (۵۶۲) سے نکلتی ہے۔ اس حساب سے بھی آپ کی عمر ۹۰ سال ہوتی ہے۔

[3] امام یافعی نے "مرآۃ الجنان" (نسخۂ قلمی [illegible]) اور خواجہ محمد پارسا نے "فصل الخطاب" (نسخۂ قلمی ص۴۲) میں آپ کا شجرۂ نسب حضرت امام حسن علیہ السلام تک پہونچایا ہے۔ اسی طرح زبیدی نے "شرح قاموس" میں لفظ "بشتیری" کے تحت میں بحوالۂ امام ذہبی آپکو "حسنی" لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے لوگ اور ائمۂ فن آپ کی سیادت کے قائل تھے۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فائیوں نے دشمنی یا رشک و حسد سے آپ کو سید ماننے سے انکار کر دیا۔ اور ممکن ہے کہ آپ کے زمانہ میں بھی لوگ اسی نسبت کی وجہ سے اور آپ کے پدر بزرگوار کے "جنگی دوست" لقب سے آپ کو "عجمی" کہتے ہوں۔ جو لوگ آپ کے نسب سے انکار کرتے ہیں وہ آپ کا سید نہیں مانتے وہ بھی کوئی قوی دلایل اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش نہیں کر سکتے۔

فی الواقع شجرۂ مذکورہ آپ کے پوتے قاضی ابوصالح نصر کا تیار کردہ ہے جن تک اکثر روایات غیر صحیح جو (حضرت) شیخ کی جانب منسوب ہیں پہونچائی جا سکتی ہیں۔ آپ کی والدۂ ماجدہ فاطمہ بنت عبداللہ الصومعی تھیں۔ اور یہ دونوں (حضرات) اولیاء اللہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اُس گاؤں کا نام جس میں آپ کی ولادت ہوئی نیف (بالکسر یا بالفتح) ہے جو بحر کاسپین کے جنوب ضلع گیلان میں واقع ہے۔ (حضرت) شیخ اٹھارہ برس کی عمر میں بغرض تعلیم بغداد تشریف لائے جہاں آپ کی والدۂ ماجدہ ابتداءً آپ کے اخراجات کی متکفل تھیں۔ آپ نے صرف و نحو کی تعلیم امام تبریزی (متوفی ۵۰۲ھ) سے اور فقہ حنبلی (اور بعض کے نزدیک فقہ شافعی) متعدد شیوخ سے حاصل کی۔ اور اپنی تصانیف میں آپ ہبۃ اللہ بن مبارک، اور ابونصر محمد بن البناء سے بکثرت روایت کرتے ہیں۔ آپ کے حالات زندگی مابین ۴۸۸ھ اور ۵۲۱ھ بہت کم معلوم ہیں سوائے اسکے کہ آپ نے اس عرصہ میں فریضۂ حج سے فراغت حاصل کی اور نکاح کیا اس وجہ سے کہ آپ کی اُنچاس اولاد میں سے ایک کی ولادت ۵۰۸ھ میں واقع ہوئی تھی بعض مورخین لکھتے ہیں کہ آپ امام ابوحنیفہؒ کے مزار کے متولی تھے۔ آپ نے طریقۂ سلوک و تصوف (حضرت) ابوالخیر محمد بن مسلم الدباس[۵۴] سے حاصل کیا۔ جنکا پایۂ بزرگی اس قدر بلند ہے کہ شعرانی کی فہرست میں اُن کا نام داخل ہے۔ انھیں بزرگ کی نظر توجہ کے اثر سے (حضرت) شیخ پر فقر و تصوف غالب ہوگیا۔ اس طرح کہ آپ اُنکے پاس ایک مرتبہ ملنے آئے تھے اور چونکہ اس موقع پر کسی نے ایک باز پکڑا تھا اسی وجہ سے دمیری کے نزدیک آپ کا لقب "باز الاشہب" ہوگیا[۵۵]۔ (شیخ) دباس کے طریقۂ تعلیم میں سخت مشکلات اور تکالیف

---

۵۴ اکثر کتابوں میں بجائے "محمد" کے "حماد" لکھا ہے۔

۵۵ تعجب ہے پروفیسر گولیو تھ ایسے عربی داں بلکہ عربی نژاد محقق نے اس مقام پر فاش غلطی کی اور سخت دھوکا کھایا ہے۔ انگریزی کی اصل عبارت بالکل وہی ہے جیسا کہ ترجمہ میں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی دوسرے شخص کے باز پکڑنے اور حضرت غوث الاعظم کو باز اشہب کا لقب ملنے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ صحیح واقعہ یہ ہے کہ جب غوث الاعظمؒ شیخ دباس کی خدمت میں بغرض ارادت حاضر ہوئے تو شیخ نے فرمایا کہ "میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ میں نے ایک باز شکار کیا ہے، او مغالطہ وہ باز تمہیں ہو" یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ آگے دیکھیے صفحہ آئندہ)

سے سامنا تھا اور اُنکے دیگر صوفی مشرب مُریدوں اور شاگردوں کو ایک فقیہ کی شرکت اپنے سلسلۂ طریقت و درس میں نہایت گراں معلوم ہوتی تھی۔ بہرحال (حضرت) شیخ بہت تھوڑے ہی عرصہ میں اس قابل ہوگئے اور مراحلِ سلوک اس قدر طے کر لیے کہ آپ کو خرقۂ تصوف قاضی ابوسعید مبارک المخزمی کے دستِ مبارک سے عطا ہوا جو اُسوقت فقہ حنبلی کے مشہور امام اور بغداد میں باب الازج کے قریب ایک مدرسہ میں درس دیتے تھے جہاں (حضرت) شیخ بھی بغرض استفادہ حاضر ہوتے تھے۔ ۵۲۱ھ میں شیخ یوسف الہمدانی (۴۴۰ھ لغایت ۵۳۵ھ) کی صلاح سے (حضرت) شیخ نے اپنا سلسلۂ وعظ علانیہ طور پر شروع کر دیا۔ جہاں گو ابتدا میں سامعین کی تعداد مختصر تھی مگر رفتہ رفتہ اتنی بڑھ گئی کہ آپ بغداد میں باب الحلبا کے قریب وعظ و نصیحت کی پُرجوش و فصیح تقریریں فرماتے۔ اور مشتاقان سخن کی کثرت کی وجہ سے اکثر آپ کو باب مذکور کے باہر نکل جانا پڑتا تھا۔ اسی جگہ آپ کے واسطے ایک رباط تعمیر کی گئی۔ اور ۵۲۸ھ میں باشندگانِ شہر کی فراخ حوصلگی سے المخزمی کا یہ مدرسہ اس قدر وسیع کر دیا گیا کہ آس پاس کے مکانات بھی اُس میں شامل کر لیے گئے۔ اور (حضرت) شیخ اس کے مدرس اعلیٰ (امام) قرار دیے گئے۔ اس مدرسہ کے درس کی نوعیت تقریباً وہی تھی جیسا کہ جمال الدین الجوزی (ابن جوزی) کے درس کی تھی جس کا حال ابن جبیر نے نہایت تفصیل و وضاحت سے قلمبند کیا ہے۔ جمعہ کے دن صبح کو اور دوشنبہ کے دن شام کو (حضرت) شیخ اسی مدرسہ میں وعظ بیان فرماتے اور یکشنبہ

---

ص دمیری کی کتاب الحیوان جلد اول صفحہ ۹ میں درج ہے اور قرینہ کہتا ہے کہ اُسی سے پروفیسر موصوف نے نقل کیا ہوگا۔ مگر بجائے اسکے کہ خود شیخ ویا س نے "خواب میں" بازپکڑا ہو لکھ گئے کہ کسی دوسرے شخص نے "فی الواقع" بازپکڑا تھا۔ اور یہی وجہ اس لقب کی ہوئی۔ یہ مبارک لقب جو پیر نے جوش محبت میں دیا تھا آپ کو اس قدر پسند آیا کہ اپنے ایک مشہور قصیدہ میں جس کا مطلع ہے

سقانی الحب کاسات الوصال　　　　فقلت لخمرتی نحوی تعالی

اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں:-

انا البازی واشہب کل شیخ
ومن ذا فی الرجال اعطی مثالی

کے دن صبح کو حضرت کی خانقاہ میں محفل وعظ منعقد ہوتی تھی۔ آپ کے حلقۂ مریدین و تلامذہ میں بہت سے مشہور اولیا اللہ ہوئے مگر بعض نے مثل آپ کے سوانح نگار سمعانی کے، دیگر علوم میں کامل دستگاہ حاصل کی۔ مشہور ہے کہ (حضرت) شیخ کے وعظ و نصائح اتنے پُر جوش و با اثر ہوتے تھے کہ انکو سُن کر اکثر یہود و نصاریٰ دولتِ اسلام سے مشرف ہوئے اور اکثر مسلمان صوفیٔ صافی ہوگئے۔ اکثر تحف و ہدایا جو زیادہ تر نذر و نیاز کی صورت میں ہوتے تھے مقامات دور دراز سے جہاں آپ کی شہرت پہونچ گئی تھی (حضرت) شیخ کی خدمت میں بھیجے جاتے تھے جو تلامذہ اور ارادت مندوں کی مہماں نوازی کے لیے وقف تھے۔ اسی طرح سوالات فقہیہ استفتے کی صورت میں دور دور سے بکثرت آپ کی خدمت میں پیش کیے جاتے جنکا جواب فی البدیہہ آپ ارشاد فرماتے۔ اکثر خلفا اور وزرا بھی آپ کے ارادت کیشوں اور معتقدوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

(حضرت) شیخ کی تصنیفات جن میں زیادہ تر آپ کے خطبے اور مواعظ ہیں سب مذہبی رنگ میں ہیں۔ آپ کی وہ تصانیف جن کا ہم کو علم ہے حسب ذیل ہیں :۔

(۱) "الغنیہ لطالب طریق الحق" ۔ ایک مذہبی اور اخلاقی رسالہ ہے (مطبوعہ قاہرہ ۱۲۸۸ھ)

(۲) "الفتح الربانی" ۔ باسٹھ خطبوں کا مجموعہ ۔ جو ۵۴۵-۵۴۶ھ میں دیے گئے تھے مع تتمہ (مطبوعہ قاہرہ ۱۳۰۲ھ) بعض قلمی نسخوں میں اس کا نام "ستین مجالس" ہے۔

(۳) "فتوح الغیب" اٹھتر خطبوں کا مجموعہ مختلف مضامین پر مشتمل ہے جسکو (حضرت) شیخ کے صاحبزادہ (شیخ) عبد الرزاق نے جمع کیا تھا۔ اسکے آخر میں آپ کے وصایا، آپ کا شجرۂ پدری و مادری، حضرات ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ آپ کے تعلق کا ثبوت، آپ کے مذہبی اعتقادات اور آپ کی بعض نظمیں درج ہیں۔ (حاشیہ بہجۃ الاسرار مطبوعہ قاہرہ ۱۳۰۴ھ)

(۴) "حزب بشایر الخیرات" ایک صوفیانہ دعا ہے۔ (مطبوعہ اسکندریہ ۱۳۰۴ھ)

(۵) "جلاء الخاطر" (متذکرۂ حاجی خلیفہ) خطب کا مجموعہ ہے جن میں پہلے خطبہ کی تاریخ وہی ہے جو نمبر (۲) کے خطبہ ۵۹ کی اور آخری خطبہ کی وہ ہے جو نمبر (۲) کے خطبہ نمبر ۷۵ کی ہے۔ شاید یہ اُسی کتاب کا دوسرا نام ہو۔

(۶) "المواہب الرحمانیہ والفتوح الربانیہ فی مراتب الاخلاق السنیہ والمقامات العرفانیہ"

جس کا ذکر روضۃ الجنات صفحہ ۴۴۱ میں ہے۔ شاید یہ وہی کتاب ہو جو مذکورۂ بالا نمبر ۲ یا ۳ ہے۔

(۷) "مواقیت الحکم" (تذکرۂ حاجی خلیفہ)

(۸) "الفیوضات الربانیہ فی الاوراد القادریہ" - مجموعۂ ادعیہ (مطبوعۂ قاہرہ ۱۳۰۳ھ)

(۹) مجموعۂ خطب مشمولۂ بہجۃ الاسرار و دیگر رسالجات۔ (اس کا ناتمام قلمی نسخہ انڈیا آفس کی فہرست میں نمبری ۶۲۲ ہے۔ فارسی مورخین اس کا ذکر عام طور پر "ملفوظات قادری" کے نام سے کرتے ہیں)

تمام تصانیف مذکورۂ بالا میں (حضرت) شیخ من حیث المصنف ایک زبردست فقیہ اور ایک پُرزور راستباز اور فصیح واعظ نظر آتے ہیں۔ الغنیہ میں بہت سے اعلیٰ درجہ کے خطبے شامل ہیں اور اسلام کے تہتر فرقوں کے حالات بھی درج ہیں جو دس ابواب پر منقسم ہے۔ اس میں اکثر مشہور نحویوں کا ذکر ہے مثلاً مبرد اور قدمائے مفسرین اور اولیاء اللہ کے حالات بھی مندرج ہیں۔ اس کتاب سے (حضرت) شیخ کے مذہبی اعتقادات ایک پورے پیر و شریعت کے ایسے معلوم ہوتے ہیں اور طرز بیان من اولہ الیٰ آخرہ متانت سے خالی نہیں۔ البتہ بعض آیات قرآنی کی تفسیر و توضیح میں متصوفانہ تاویل سے کام لیا گیا ہے اور پوشیدہ معنی بیان فرمائے ہیں۔ اسکے ساتھ بعض اوراد کا بھی ذکر ہے جن کو پچاس پچاس یا سوسو مرتبہ پڑھنے کی تاکید ہے۔ کتاب نمبر (۲) مذکورۂ بالا میں بعض خطب ایسے ہیں جو ادب اسلامی میں بے نظیر ہیں۔ ان میں مذہبی رواداری اور انسان دوستی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خطیب کا دل چاہتا ہے کہ تمام بنی نوع انسانی پر دوزخ کے دروازے بند اور جنت کے دروازے کھول دیئے جائیں۔ اصطلاحات صوفیہ بہت شاذونادر استعمال ہوئے ہیں اور مطالب ایسے عام فہم طریقہ سے بیان فرمائے ہیں کہ معمولی قابلیت کے پڑھنے والے بھی اس سے اچھی طرح بہرہ اندوز ہوسکتے ہیں۔ البتہ یہ بھی مشہور ہے کہ (حضرت) شیخ کے ایک شاگرد کا قول ہے کہ میں اس کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکتا۔ خطب کا لب لباب اور عام مفہوم یہ ہے کہ ابتدائی مراحل طے کرنے کے لیے جویائے حق کو لازم ہے کہ دنیوی عیش و آرام، لذات و نعمات کو خیرباد کہے البعد کو جب اس قابل ہوجائے کہ دوسروں کو اپنے دائرۂ ارادت میں لے سکے تو پھر عود کرے۔ اسی طرح یہ مسئلہ بھی کہ ہر چیز جو خواہ اس عالم سے تعلق رکھتی ہو یا دوسرے عالم سے، وہ درمیان طالب و مطلوب کے

ایک حجاب ہے اور طالب کا مقصد اصلی فنا فی المطلوب ہونا چاہیے، بہت خوبی اور شرح وبسط سے بیان کیا گیا ہے۔ سامعین یا قارئینِ وعظ کو ہدایت ہے کہ وہ اپنے اموال سے اولیاء اللہ کی خدمت کریں اور اُنکو اپنے اہل خاندان پر ترجیح دیں۔ خطبوں میں خود خطیب اپنی طرف اشارہ بہت کم کرتا ہے اور جہاں کہیں ہے وہ بھی زیادہ تفاخر کے لہجہ میں نہیں۔ مثلاً جس جگہ اپنے تئیں "اہل عالم کی کسوٹی" فرمایا ہے تو مراد اُس سے صرف اتنی ہے کہ میں اہل حق اور اہل باطل یا سچے اور مصنوعی جویائے حق میں بخوبی تمیز و تفریق کر سکتا ہوں۔ مگر اسکے ساتھ اسپر بھی زور دیا گیا ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں فرمان الٰہی کے مطابق کہتا ہوں۔

(حضرت) شیخ کے حالات جو آپ کے مریدین عبد اللہ بن محمد البغدادی اور عبد المحسن البصری اور عبد اللہ بن نصر الصابقی نے لکھے ہیں (جن کا نام "انوار الناظر" ہے اور بہجۃ الاسرار کے صفحہ ۱۰۹ پر مذکور ہیں) بالفعل ہم کو نہیں مل سکتے۔ سمعانی نے اپنی لغت (کتاب الانساب) میں (حضرت) شیخ کا نام "جیل" لکھ کر اُسکے آگے کچھ جگہ چھوڑ دی ہے۔ آپ کے حالات سمعانی کے صاحبزادہ نے بھی کچھ قلمبند کیے ہیں۔ جن میں تہذیب و متانت تو منزور ہے مگر ارادت سے خالی ہیں۔ پھر آپ کے کچھ حالات موفق الدین عبد اللہ المقدسی نے بھی جمع کیے ہیں جو (حضرت) شیخ کی آخر عمر میں ۵۰ دن تک آپ کی خدمت میں برابر حاضر رہے۔ ان کا بیان ہے کہ اہل بغداد (حضرت) شیخ کی بڑی عزت کرتے اور بہت مانتے تھے اور کشف و کرامات کے بھی قائل تھے مگر میں نے کوئی کشف و کرامت (حضرت) شیخ کی اپنی آنکھ سے نہیں دیکھی۔ مقدسی مذکور اور ایک شخص اور زمانہ مذکور میں (حضرت) شیخ کے تنہا تلامذہ تھے۔ محی الدین ابن عربی (ولادت ۵۶۰ھ) نے بھی اپنی تصانیف میں (حضرت) شیخ کا اکثر جگہ ذکر کیا ہے۔ کہیں لکھتے ہیں کہ "وہ عادل ہیں" "اپنے زمانہ کے قطب ہیں"۔ (فتوحات مکیہ جلد اول صفحہ ۲۶۳) "امام طریقت ہیں" "اہل عالم کے مستند قاضی ہیں" (ایضاً جلد دوم صفحہ ۲۴) "فرقۂ ملامتیہ سے تھے" (جلد سوم صفحہ ۴۴) کہیں یہ بھی لکھا ہے کہ (حضرت) شیخ بطن مادر میں معروف حمد تھے۔ اور یہ کہ اُن کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ سوا خدا کے سب سے بالا تر ہیں۔ صاحب بہجۃ الاسرار (متوفی ۷۱۳ھ) نے (حضرت) شیخ کی اکثر کرامات کا ذکر کیا ہے اور ایک زبردست سلسلۂ شواہد پیش کیا ہے۔ جس وجہ سے ابن تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ)

کا قول ہے کہ شواہد مذکور کافی طور سے اطمینان بخش ہیں۔ مگر بعض کے نزدیک کتاب مذکور قابلِ اطمینان نہیں۔ مثلاً ذہبی اُن کو "مصنوعی قصوں" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر ابن الوردی نے (تاریخ جلد دوم۔ صفحات ۷۰ و ۷۱ میں) اُسکی نقل کی ہے۔ بعض جملے اس قسم کے بھی آپ کی طرف منسوب ہیں جو تفاخر آمیز ہونے کی وجہ سے بعض کو ناگوار معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً بہجۃ الاسرار میں اُن اشخاص کی پوری فہرست دی ہے جنھوں نے (حضرت) شیخ کو فرماتے ہوئے سُنا "قدمی ہذہ علیٰ رقبۃ کل ولی اللہ" (میرا پاؤں ہر ولی اللہ کی گردن پر ہے) اسی طرح یہ جملہ بھی آپ کی طرف منسوب ہے کہ ستر ابواب علم مجھ پر کشادہ ہیں جن میں سے ہر ایک اتنا وسیع ہے جتنا زمین و آسمان کے درمیان کا فاصلہ۔ متقدمین متاخرین (حضرت) شیخ کے (مثلاً صاحب رسالہ "مخازن قادریہ" فارسی۔ قلمی نسخہ برٹش میوزیم نمبری ۲۴۸) ایک طرف تو جملہ مقدم الذکر کی عمومیت کو محدود کرنا چاہتے ہیں مگر دوسری طرف اسکے بھی قائل ہیں کہ (حضرت) شیخ اس قسم کے ادعا کے ہر طرح مجاز ہیں اور نیکدل مصنفین مثل دمیری کے اس قسم کے جملوں سے صرف (حضرت) شیخ کی نفضیلت استنباط کرتے ہیں (دمیری جلد اول صفحہ ۳۲۰) معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے جملے (حضرت) شیخ کی مستند تصانیف میں نہیں پائے جاتے۔ البتہ اس قبیل کی باتیں اُن نظموں میں ملتی ہیں جو آپ کی طرف منسوب ہیں۔ اور آپ کے پیروؤں اور مریدوں کے وفور جوش اعتقاد کی دلیل ہیں۔ ان لوگوں میں آپ کی شہرت اور محبت خود پیغمبر اسلام (علیہ الصلوۃ والسلام) سے بھی بڑھ کے پائی جاتی ہے۔ آپ "سلطان الاولیا" کے لقب سے مشہور ہیں۔ اور کبھی بھی آپ کا نام نہیں لیا جاتا جب تک اُسکے ساتھ ذیل کے لقب نہیں شامل کیے جاتے: شاہد اللہ، امر اللہ، فضل اللہ، امان اللہ، نور اللہ، قطب اللہ، سیف اللہ، فرمان اللہ، برہان اللہ، آیات اللہ، غوث اللہ، غوث الاعظم۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس شہرت و نمود کو آپ کے صاحبزادوں نے ترقی دی، جن میں سے گیارہ کے نام بہجۃ الاسرار میں اس طرح گنوائے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ (حضرات) اپنے پدر بزرگوار کے قدم بہ قدم چلتے تھے (۱) شیخ عیسیٰ متوفی ۵۷۳ھ مصر میں۔ (۲) شیخ عبداللہ متوفی ۵۸۹ھ بغداد میں (۳) شیخ ابراہیم متوفی ۵۹۲ھ واسط میں (۴) شیخ عبدالوہاب متوفی ۵۹۳ھ بغداد میں (۵) و (۶) شیخ یحییٰ و محمد متوفی ۶۰۰ھ بغداد میں (۷) شیخ عبدالرزاق متوفی ۶۰۳ھ بغداد میں۔

(۸) شیخ موسیٰ متوفی ۶۱۸ھ دمشق میں (۹) شیخ عبدالعزیز۔ جو سنجار کے ایک گاؤں میں رحلت کر گئے تھے جہاں ۶۰۲ھ میں انتقال کیا (۱۰) شیخ عبدالرحمن متوفی ۵۸۷ھ (۱۱) شیخ عبدالجبار متوفی ۵۷۵ھ - بعض ارباب تاریخ اس فہرست میں کچھ اور نام بھی اضافہ کرتے ہیں۔ ان میں سے شیخ عبدالوہاب اپنے پدر بزرگوار کے قائم مقام اور جانشین ہوئے۔ پھر انکے بعد انکے صاحبزادے شیخ عبدالسلام (۵۴۸ھ تا ۶۱۱ھ) اور انکے بعد انکے برادر عم زاد شیخ ابو صالح نصر بن عبدالرزاق (۵۶۴ھ لغایت ۶۳۳ھ) ہوئے۔ خلیفہ ناصر بامر اللہ کے زمانۂ حکومت میں (حضرت) شیخ کی اولاد اور متوسلین کے کچھ لوگ تھوڑے عرصہ کے لیے بغداد سے جلا وطن کیے گئے اور بعض حضرات تاتاریوں کے مشہور حملہ میں شہید ہوئے مگر سلسلۂ قادریہ کا مستقل مقام اور مرکز ہمیشہ بغداد ہی رہا۔

**فہرست اسناد** (حضرت) شیخ کی سوانح عمریوں کی ایک فہرست جرمن مستشرق اہلوردٹ نے دی ہے۔ جن میں سے کتب ذیل شایع ہو چکی ہیں: — (۱) شطنوفی "بہجۃ الاسرار" (مطبوعۂ قاہرہ ۱۳۰۴ھ) (۲) محمد بن یحییٰ تاذفی "قلائد الجواہر" (قاہرہ ۱۳۰۳ھ) (۳) محمد الدلائی "نتیجۃ التحقیق" (مطبوعہ فیز ۱۳۰۹ھ) جس کا ترجمہ "ویئر" کا رسالہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۰۳ء میں چھپ گیا ہے۔ انکے علاوہ "غبطۃ الناظر" جو ابن حجر کی طرف منسوب ہے مگر اہلوردٹ کی فہرست میں داخل نہیں۔ اسکوڈ اکٹر ڈینزن راس نے کلکتہ میں ۱۹۰۳ء میں ایڈٹ کیا تھا۔ شاید بہترین موجودہ سوانح (حضرت) شیخ کے ذہبی کی "تاریخ الاسلام" میں ملیں گے۔ جس کا ماخذ ابن النجار ہے اور رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۰۷ء کے صفحات ۲۶۷ الخ میں شایع ہو چکی ہے۔ موجودہ زمانہ میں شیخ سنوسی نے بھی کچھ حالات (حضرت) شیخ کے تحریر کیے ہیں۔ اگر کسی کو (حضرت) شیخ یا سلسلۂ قادریہ کے متعلق یورپی تحریروں سے فائدہ اٹھانا ہو تو کتب ذیل مطالعہ کرے: (۱) ال رن "مرابوتے خوان" (پیرس ۱۸۸۴ء) (۲) لے شاتیلیر کا "نفریر یسلمانی دو حجاز" (پیرس ۱۸۸۶ء) (۳) دیپون اور کاپولانی "کانفریر یلیجوسے مسلمانی" (الجیرس ۱۸۹۷ء) (۴) قرادیوز "غزالی" (پیرس ۱۹۰۲ء)

محمد عسکری

# افغانیہ

(ڈراما)

| | | | |
|---|---|---|---|
| بابر | مغل بادشاہ | آدو | ملک احمد کا دوسرا بھائی |
| ملک احمد | یوسف زئی جرگہ کا سردار | الف | " کا تیسرا بھائی |
| شاہ منصور | ملک احمد کا بڑا بھائی | ب | " کا چوتھا بھائی |
| بی بی مبارکہ | شاہ منصور کی لڑکی | خوش دل خاں | دلازاک قوم کا سردار |
| رونہ | بی بی مبارکہ کی انّا | | |

جہانگیر مرزا - خریم طغائی - عبدالرزاق مرزا - بابا روغوکی - سید قاسم — اُمرائے بابری

**تاریخی نوٹ:** - بابر بادشاہ کا آفتاب اقبال بلندی پر ہے الغ بیگ کی وفات (۸۵۳ھ) کے بعد کابل کا حکمراں محمد مقیم بابر سے ۹۱۰ھ میں شکست کھا کر پہاڑوں میں چلا جاتا ہے اور یوسف زئی پشاور و سوات کی طرف کابل سے ہجرت کر کے آ بستے ہیں - کابل پر بابر کا قبضہ ہو جاتا ہے -

## پہلا سین

کابل - شاہی محل - خوش دل خاں دلازاک بابر بادشاہ کے حضور میں پیش کیا جاتا ہے - خوش دل خاں حاضر ہوتا ہے دور سے آداب بجا لا کر دست بستہ کھڑا ہو جاتا ہے -

**بابر** - "تمھارا ہی نام خوش دل ہے اور دلازاک کے تمھیں سردار ہو؟"

**خوش دل خاں** - "بادشاہ کا اقبال ترقی پر ہے - اسی غلام کا نام خوش دل ہے اور دلازاک قوم کی طرف سے حاضر ہوا ہے"

**بابر** - "تم لوگوں کی آخر کیا خواہش ہے - میرے کئی ایک امیروں نے تمھارا اور تمھاری قوم کا ذکر کیا ہے کہ تم لوگ بڑے بہادر ہو مگر یوسف زئیوں سے تمھاری قدیم دشمنی چلی آتی ہے"

**خوش دل خاں** - "یوسف زئی ایک دھوکا دینے والی جاہل قوم ہے - اُس میں وفاداری کا مادّہ نہیں، اور غرور سے سر تا پا بھری ہوئی ہے - انکا سردار ملک احمد ایک نہایت مدمغ آدمی ہے اور بادشاہ کے سلام کو ابھی تک حاضر نہیں ہوا

وہ سمجھتا ہے کہ اُنکی قوم اور اُسکے دست و بازو بادشاہی عظمت وجلال کا مقابلہ کرنے کو کافی ہیں۔

**بابر**:- یوسف زئی ایک بہادر قوم ضرور ہے مگر بہت مغرور ہے۔ ملک احمد کے باپ سلطان شاہ اور اسکے بھائی سلیمان شاہ کا حال ما بدولت نے سنا ہے کہ کس طرح الغ بیگ نے باوجودیکہ سلیمان کا داماد تھا اُسے قتل کرکے کابل پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسی الغ بیگ کے داماد و جانشیں محمد مقیم سے ہم نے اس ملک کو پاک کیا اور یوسف زئیوں کے غلبہ سے کابل کو نجات دلادی "۔

**خوش دل**:- جہاں پناہ۔ میں اور میری قوم بادشاہ کے قدموں تلے سرفروشی کو حاضر ہے اور ستر ہزار شاہرخی نذرانہ پیش کرنے پر راضی ہے "۔

**بابر**:- "ما بدولت تمھاری وفاداری اور دلازاکوں کی شجاعت کی قدر کریں گے اور ملک احمد کو قتل کرکے اُسکے وجود سے اس ملک کو پاک کردیں گے۔ اب تم جاؤ۔ دوبارہ جب ہم طلب کریں تو حاضر ہونا "۔

(خوش دل خاں کے جانے کے بعد یوں اپنے دل سے کلام کرتا ہے) " ملک احمد کو میں بلاتا ہوں مگر مصلحت یہی ہے کہ دوستانہ طریق پر بلایا جائے ورنہ نہیں آئے گا اور خود اُسکے کوہستانی گھونسلہ میں جاکر لڑائی لڑنی ہوگی "۔

(ایک دوستانہ خط ملک احمد کے نام لکھتا ہے)

## دوسرا سین

وادی سوات۔ وادی سوات میں ملک احمد کا سادہ مکان۔ ملک احمد اپنی بیوی بچوں میں بیٹھا ہوا باتیں کر رہا ہے۔

**شاہ منصور** (باہر سے آکر) "بھائی جان۔ شہنشاہ ظہیر الدین محمد بابر کا ایلچی یہ ایک خط لایا ہے "۔ (خط دیتا ہے)

**ملک احمد**:- "بابر کا؟ خدا خیر کرے۔ آجکل دلازاک اُسکے دربار میں بہت گھسے ہوئے ہیں اور بادشاہ ہماری اور اُنکی پرانی دشمنی سے ناواقف ہے "۔ (خط کھول کر پڑھتا ہے۔ چہرے پر بشاشت کے آثار بڑھتے جاتے ہیں اور خوشی سے رنگ چمکنے لگتا ہے۔ پھر بھائی سے مخاطب ہوکر کہتا ہے) " الحمد للہ۔ میں ڈرتا تھا کہ کہیں کوئی اندیشہ ناک بات نہ ہو۔ یہ تو بہت محبت کا خط ہے اور ہمیں کابل بلایا ہے۔ ہم پانچوں بھائی چلیں گے اور بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوں گے "۔

**شاہ منصور**:- "نہیں میری رائے نہیں۔ خوش دل خاں دلازاکی کو آپ جانتے ہیں۔ آجکل دربار میں اُسکی رسائی ہے۔ اور کچھ اچھی خبریں نہیں آرہی ہیں "۔

**ملک احمد**:- "نہیں۔ نہیں۔ تمھارا یہ وہم ہے۔ بادشاہ کے دل میں اگر کینہ ہوتا تو ہمارے ملک پر چڑھائی کرتا اُسے ہماری حالت معلوم ہے۔ اگر دل میں میل ہوتا تو ایسے دوستانہ لہجہ میں خط لکھنے اور کابل آنے کی دعوت نہ دیتا۔ ہم اسکے حملہ کی تاب نہیں لا سکتے ہیں۔

شاہ منصور۔ میری رائے نہیں۔ دل میں کھٹکا سا معلوم ہوتا ہے۔"

(اتنے میں اور تینوں بھائی آ جاتے ہیں اور سب رخ کرتے ہیں مگر ملک احمد کی سادہ طبیعت کسی طرح فریب کو ماننے کے لیے آمادہ نہیں ہوتی)

ملک احمد" میں تمہارے وسواس کو وہم و اندیشہ سے زیادہ وقعت نہیں دیتا۔ بادشاہ سے ملنے کے بعد تمہیں سب معلوم ہو جائے گا"

شاہ منصور" خیر جو آپ کی مرضی ہو ہم سب حاضر ہیں۔ مگر ہمارے دل میں جو کھٹکا ہے وہ کم نہیں ہوتا۔ مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ ہم چاروں بھائی آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم سب ہمراہ چلیں گے۔"

ملک احمد" ہاں اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

(کابل جانے کی تیاریاں ہوتی ہیں)

## تیسرا سین

کابل شہر۔ ملک احمد معہ چاروں بھائیوں کے کابل پہنچتا ہے اور ایک مکان میں جو بابر نے انکے لیے تجویز کیا تھا قیام پذیر ہوتا ہے۔

شاہ منصور (ملک احمد سے) "لیجیے بھائی جان۔ آخر میرا اندیشہ صحیح نکلا۔ آج مجھے ایک پرانے دوست کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ بادشاہ کی نیت خراب ہے اور ہمیں کیوں بلایا ہے۔"

ملک احمد" کیا؟ کیا واہیات باتیں کرتے ہو؟"

(دوسرے بھائی بھی آ جاتے ہیں اور وہ بھی اپنی اپنی اطلاع دیتے ہیں اور شاہ منصور کے بیان کے موافق بیان کرتے ہیں)

ملک احمد" تو کیا واقعی بابر کا ارادہ مجھے قتل کرنے کا ہے؟ مجھے اُسکی ذات سے یہ توقع نہ تھی۔ وہ ایسا بزدل نہیں تھا۔"

شاہ منصور" اب بہتر یہ ہے کہ جلد کوئی انتظام کیا جائے ورنہ اچانک کوئی بات ہو جائے گی اور پھر کوئی تدبیر نہ ہو سکے گی۔"

(دوسرے بھائی شاہ منصور کے کان میں کچھ کہتے ہیں۔ ایک تدبیر سمجھ میں آتی ہے جس پر سب اتفاق کرتے ہیں)

شاہ منصور (ملک احمد سے) "بھائی جان۔ ایک تدبیر ہم لوگوں نے سوچی ہے۔ آج شب کو ہم چاروں اپنی اپنی پگڑیوں کے سرے ایک دوسرے سے باندھ کر ایک رسی سی بنائیں اور آپ کو اُسکی مدد سے فصیل سے نیچے اُتار دیں۔ پھر ہم سب اسی شہر کے کسی گوشہ میں چھپ رہیں۔ موقعہ ملتے ہی فوراً نکل جائیں گے۔"

ملک احمد" واہ! کیا تدبیر سوچی ہے! بابر کا ارادہ تو ابھی تک ظاہر نہیں ہوا، لیکن آپ صاحبوں کی تدبیر معلوم ہو گئی۔ جو مجھے بابر کے ارادہ سے بھی پہلے موت کے گھاٹ اُتار دیگی۔ تم سمجھتے ہو ان سر بفلک دیواروں سے اس طرح نکل جانا آسان ہے؟

کیا کوئی پہرہ والا نہیں ہے - کیا دیواریں اتنی نیچی ہیں ؟ میں اپنی جان کو اس جوکھم میں نہیں ڈالتا - کل دربار میں طلبی ہے - جاؤں گا - خدا مالک ہے - جو کچھ ہوگا ہوگا - منصور - تم اور دو بھائی کہیں چلے جاؤ اور میرے ساتھ جانے کے لیے صرف آدو کو چھوڑ دو "

**شاہ منصور** " یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم آپ کو اس طرح موت کے مُنہ میں جانے دیں اور خود جان بچا کر چلے جائیں "

**ملک احمد** " نہیں - میرا کہنا مانو - میرا دل مطمئن ہے - خدائے جل وعلا پر بھروسہ ہے - تم تینوں اسی شہر میں چھپے رہو اور جب موقعہ پاؤ نکل جاؤ - کیا تم چاہتے ہو کہ ہمارا خاندان برباد ہو جائے اور کوئی گھر میں ملک تاج الدین کا نام لیوا بھی نہ رہے - تمھیں ریش پدر کی قسم میرے حکم کی تعمیل کرو "

(ملک احمد کے بڑے اصرار پر اُسکے بھائی تعمیل حکم کرتے ہیں اور کہیں چلے جاتے ہیں اور صرف چھوٹا بھائی ساتھ رہ جاتا ہے)

## چوتھا سین

**نوٹ** :- خوش دل خاں دلازاک بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہتا ہے کہ ملک احمد کو باتیں کرنے کا موقعہ نہ دیا جائے - یہ جانتا تھا کہ ملک احمد کی زبان میں جادو ہے - اگر اس نے کلام کیا تو پھر کامیابی محال ہے - اس لیے بادشاہ کے کان بھر کر یہاں تک آمادہ کر دیا کہ ملک احمد کو کلام کرنے کا موقعہ ہی نہ ملے - اور قتل کر ڈالا جائے

[شاہی دربار - بابر بادشاہ تخت پر جلوہ فرما ہے - اور تمام درباری دو رویہ ادب سے کھڑے ہیں - بادشاہ کے سامنے تیر و کمان رکھی ہوئی ہیں -]

ملک احمد حاضر ہو کر دُور سے آداب بجا لاتا ہے - بادشاہ اُسے دیکھ کر تیر کمان پر ہاتھ ڈالتا ہے - یہ دیکھ کر ملک احمد اپنے دل سے کہتا ہے "دشمنوں نے اتنے کان بھر دیے ہیں اب بات کرنے کا موقعہ ہی کیا نہ ملے گا - دو باتیں مجھ سے ہو جائیں اسکے بعد جو کچھ ہوتا ہو تا - اے خدا میرے دل کو ہمت اور زبان کو یارا دے اور اس ناسمجھ بادشاہ کو ہدایت فرما (پھر چشم زدن میں کچھ سوچ کر) اپنے چلتہ کی گھنڈیاں کھول دیتا ہے اور بادشاہ کے سامنے سینہ کھول کر خاموش آ کھڑا ہوتا ہے -

**بابر** (ملک احمد کی اس حرکت سے حیرت زدہ ہو کر) "ملک احمد یہ کیا حال ہے - کیا اپنی جان عزیز نہیں رکھتے جو اس طرح سینہ برہنہ کر کے میرے تیر کے سامنے آ کھڑے ہوئے ہو؟"

**ملک احمد** (اسی طرح بے جھجک خاموش کھڑے رہ کر) جہاں پناہ یہ مجھ سے نہ پوچھیں - میرے

اس فعل کی لم نہ دریافت فرمائیں اور جو مرضیِ مبارک میں آئے کریں - اس غلام کے نصیب کہاں تھے جو یہ نعمت ملتی ۔"

بابر ۔" نہیں - میرے سوال کا جواب دو - یہ جواب میں نہیں سنتا - تم جو اس طرح بے جھجک سینہ کھول کر میرے تیر کے سامنے کھڑے ہو گئے تو اسکی کیا وجہ ہے ؟"

ملک احمد ۔" جہاں پناہ سے یہ غلام کچھ زیادہ نہیں عرض کر سکتا - صرف یہ تمنی ہے کہ اگر مرضیِ مبارک یہی ہے تو جاں نثار حاضر ہے ۔"

بابر ۔" نہیں - تمھارے اس فعل کی وجہ معلوم ہونی چاہیے اور جب تک تم صاف جواب نہ دوگے یہ قضیہ ختم نہیں ہو سکتا ۔"

ملک احمد ۔" جہاں پناہ بادشاہوں کے بادشاہ ہیں جس کی صولت سے بڑے بڑے قاہر و جابر کانپ رہے ہیں - جس نے زمانہ سے ظلم و تعدی کی بنیاد اُکھاڑ کر پھینکدی اور انصاف کا پایہ مضبوط کیا - فخر آل تیمور! و فخر اہل زمانہ! جسکے مقابلہ کی طاقت روے زمین کا کوئی بادشاہ نہیں رکھتا - بدولت شاہنشاہی کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بج رہا ہے - اور فوج ظفر موج کی قہرمانی اسکندر و داریوش اعظم کے نام کو بھلا رہی ہے - اس بڑے مجمع میں جہاں پناہ کا نشانہ دیکھنے کے لیے سب کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں - میرا یہ چلتہ دیز زیادہ ہے - اس لیے اندیشہ ہوا کہ مبادا تیر اُچٹ نہ جائے اور نشانہ خطا نہ ہو جائے اور تمام تماشائی یہ نہ سمجھیں کہ بادشاہ کا نشانہ ٹھیک نہیں پڑا - اس خیال سے اس غلام نے اپنا سینہ ننگا کر دیا ہے کہ تیر کی راہ میں کوئی شے حائل نہ ہو -

نبود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی"

بابر ۔" تمھارا جواب بہت اچھا اور تمھاری زبان نہایت شیریں ہے - ابدولت ایسے شخص پہ ہاتھ نہیں اُٹھانا چاہتے ۔" (یہ کہکر تیر کمان رکھ دیتا ہے - اور پھر ملک احمد سے پوچھتا ہے) " ہاں - بہلول لودی کس قسم کا آدمی ہے ؟"

ملک احمد ۔" بہلول فرس بخش ہے ۔"

بابر ۔" اور اُس کا لڑکا سکندر لودی ؟"

ملک احمد ۔" وہ خلعت بخش ہے ۔"

بابر - اچھا، بابر کیسا ہے ؟"

ملک احمد ۔" وہ سر بخش ہے ۔"

بابر (اس جواب سے بہت خوش ہوتا ہے، اور ایک شاہانہ انداز سے کہتا ہے) " جاؤ ہم نے تمھاری سر بخشی کی - (پھر ملک احمد کا ہاتھ پکڑ کر) اور چلو - ہمارے ساتھ چلو ۔" (یہ کہکر ملک احمد کو اپنے ہمراہ محل شاہی کے ایک سنج کمرہ میں لے جاتا ہے)

## پانچواں سین

محل شاہی - ایک عالیشان جلسہ مے نوشی کا انتظام - بابر، ملک احمد، اُس کا بھائی - اور دیگر اسباب مینوشی - ساقی و صراحی -

بابر (اپنے ہاتھ سے ملک احمد کو جام شراب بھر کر دیتا ہے) "یہ لو ملک احمد - ہمارے ہاتھ سے شراب پیو - (پھر اُس میں سے خود کچھ پی کر) اچھا اس میں سے ایک گھونٹ ہم پیے لیتے ہیں اب تم لو"

ملک احمد (آداب بجا لاکر) "جہاں پناہ کی ذرہ نوازی ہے - لیکن کہاں یہ ذرہ کہاں یہ آفتاب - کہاں یہ عاجز اور کہاں یہ عاجز نوازی" (یہ کہکر پی لیتا ہے)

بابر "ملک احمد - تم بہت خوب آدمی ہو - ہم تم سے مل کر بہت محظوظ ہوئے - تم خلوت کے یار اور جلوت کے بڑے ہوشیار ہو - (پھر ایک گلاس بھرتا ہے اور کچھ پی کر اُسکے حوالہ کرتا ہے) لو یہ ایک گلاس اور پیو"

ملک احمد (آداب بجا لاکر پیالہ چڑھا جاتا ہے) "بادشاہ کے یہ نوازش و اکرام دیکھ کر یہ فقیر اپنی قسمت پر نازاں ہے اور شک میں پڑ جاتا ہے کہ الٰہی یہ خواب ہے کہ بیداری"

بابر (پھر ایک گلاس بھرتا ہے اور قدرے پی کر ملک احمد کو دیتا ہے) "لو یہ اور پیو"

ملک احمد (پیالہ لیکر اور خالی کرکے) "یہ بادشاہ کے الطاف ہیں - ان الطاف و مکرمت کا بادشاہ روے زمین پر کوئی نہ ہوگا"

بابر (پھر خود شراب پینا شروع کرتا ہے اور جب عالم سرخوشی طاری ہوتا ہے تو کھڑا ہو جاتا ہے اور ایک گردش کرکے ملک احمد کو اپنا لباس اُتار کر دیتا ہے) "ملک احمد یہ اس عالم مسرت و انبساط کی تقریب میں تمہیں خلعت دیا جاتا ہے - اسے پہنو - اسی وقت پہنو"

ملک احمد (خود اپنا لباس اُتار کر اپنے بھائی آدو کو دیدیتا ہے اور بادشاہ کا لباس نہایت ادب سے ہزاروں آداب بجا لاکر پہن لیتا ہے - ملک احمد کا بھائی آدو جو فن موسیقی میں صاحب کمال ہے ستار بجاتا رہتا ہے جس سے سب پر ایک کیفیت طاری رہتی ہے) "جہاں پناہ کی یہ غلام نوازی اس ذرہ بے مقدار کی بساط سے زیادہ ہے - ہمارے بادشاہ کو خدا سلامت رکھے"

(تھوڑی دیر یہ جلسہ اور رہتا ہے پھر برخاست ہو جاتا ہے اور ملک احمد بادشاہ سے اجازت حاصل کرکے امن و امان کے ساتھ اپنے وطن کا رخ کرتا ہے)

## چھٹا سین

کوہستان یوسف زئی - ملک احمد کا مکان

تاریخی نوٹ :- بادشاہ ملک احمد کو دوبارہ طلب کرتا ہے لیکن وہ بجاے اپنے شاہ منصور کو بھیجتا ہے

جسے بابر واپس کر دیتا ہے اور ملک احمد کے نہ آنے سے ناخوش ہوتا ہے۔

شاہ منصور: "بھائی جان۔ بادشاہ آپ کے نہ جانے ناخوش ہو گیا۔ مگر کچھ پروا نہیں۔ ناخوش ہو گیا ہو تو ہو جائے۔ اُسکے پاس جانا خطرہ سے خالی نہ تھا ان بادشاہوں کی حالت یہ ہے کہ "گاہے بسلامے برنجند وگاہے بدشنامے خلعت دہند"۔ درباریں ولازانکوں نے پھر بابر کو بھڑکا دیا ہے اور اب وہ خفا بھی ہو گیا ہے۔ اندیشہ ہے کہ جلد اس طرف کا رُخ کرے گا"۔

ملک احمد: "ہم اُسکے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے۔ افسوس کہ یوسف زئی برباد ہو جائیں گے مگر ہمیں اپنی جان کی حفاظت کے لیے پہاڑوں کے اندر ایک قلعہ بنانا چاہیے۔ مہورا پہاڑ ہمارے وطن کی بہترین جائے امن واماں ہیں۔ ہمیں اس قلعہ کی تعمیر مناسب ہوگی"۔

شاہ منصور: "آپ کی رائے درست ہے۔ ان سیدانوں کو چھوڑ کر اب ہمیں پہاڑوں میں رہنا ضرور ہے"۔

(مہورا پہاڑ پر قلعہ تیار کر کے ملک احمد اور اُسکے خاندان کے چھوٹے بڑے سب چلے جاتے ہیں اور باہر کے حملوں سے محفوظ رہ کر آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔)

## ساتواں سین

دیارون میں بادشاہ کا کیمپ

خوش دل خاں: "جہاں پناہ نے ان متکبر خودسر یوسف زئیوں کو خوب سزا دی۔ پہاڑی چوہوں کی طرح اب وہ اپنے بلوں میں جا چھپے ہیں اور عساکر شاہنشاہی کے سامنے نہیں آسکتے"۔

بابر: "اس مغرور جرگہ کی ہم نے تمام اراضی برباد کر دی۔ اور اُنہیں گھر سے نکال باہر کیا۔ مگر ملک احمد ابھی ہاتھ نہیں آیا ہے"۔

خوش دل خاں: "ملک احمد ایک حیلہ باز لومڑی کی طرح ہے۔ اُسے باتیں بنانا بہت آتی ہیں۔ انہیں باتوں نے ایک مرتبہ اُس کی جان بچالی۔ اب پھر وہ کوئی تدبیر سوچ رہا ہوگا۔ ایسے شخص کا کامل استیصال ہو جانا چاہیے"۔

بابر: "خوش دل، تم نے ملک احمد کے متعلق صحیح رائے نہیں ظاہر کی اور اپنی قومی دشمنی کی باتیں کرتے ہو۔ میں ایسی باتوں کو نہیں مانتا اور تمھاری باتوں پر اب زیادہ اعتماد نہیں کرتا۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں یہ ملک احمد کیسا شخص ہے۔ تم جاؤ اب میں عبدالرزاق مرزا و سید قاسم سے بات کرنا چاہتا ہوں"۔

خوش دل خاں فوراً آداب بجا لا کر باہر چلا جاتا ہے۔ اور تھوڑی دیر بعد عبدالرزاق مرزا

و سید قاسم حاضر ہوتے ہیں۔

بابر: " میں اس شخص ملک حمد کے خانگی حالات سے واقف ہونا چاہتا ہوں۔ کل عید قرباں ہے آؤ بھیس بدل کر اسکے قلعہ میں چلیں اور شریم طغائی تم دونوں اور بابا او غولی۔ بس یہ لوگ کافی ہیں۔ ہم سب قلندروں کے بھیس میں رہیں گے۔ تھوڑا پہاڑ یہاں سے صرف ایک دن کے راستہ پر ہے۔ کسی کو ہمارے یہاں سے غائب ہونے کا علم بھی نہ ہوسکے گا"

عبدالرزاق مرزا اور سید قاسم نے سر تسلیم خم کیا اور باہر چلے گئے۔

بابر (اپنے دل سے) " ملک حمد بڑا شیریں زبان ہے اور بادشاہوں کی مجلس کے آداب خوب جانتا ہے میں نے اس شخص کو بلایا تھا مگر خواہ مخواہ اُسکے دل میں خوف پیدا ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ ایسے آدمی کو اپنے ہاں رکھ کر کام لوں۔ اس میں تمام قابلیتیں موجود ہیں۔ اب بھیس بدل کر اُس کے قلعہ میں جاتا ہوں اور تمام حالات معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔ کہ یہ لوگ کیسے ہیں، انکے بیوی بچے کہاں ہیں، اور کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔

## آٹھواں سین

دررا پہاڑ میں ملک احمد کا قلعہ۔ عید قرباں کی چہل پہل۔ اس ہنگامہ میں چند قلندر نظر آتے ہیں جو ملک احمد کے مکان کی پشت پر دوسرے لوگوں کے ساتھ کھڑے ہوئے ہیں۔

**ایک قلندر**: (مکان دیکھ کر) " یہ مکان کی پشت ہے۔ کوئی آنے جانے والا نظر آئے تو اُس سے کچھ حال دریافت کیا جائے۔ رات کی یہ تاریکی اچھی ہے مگر روشنی کی کثرت کسی قدر طبیعت کو بےچین کر رہی ہے"

**دوسرا قلندر**: " نہیں اسی مجمع میں کھڑے رہیں تو اچھا ہے۔ کوئی نہیں دیکھے گا۔ اور اگر کوئی نوکر چاکر آیا تو اُس سے بات چیت بھی کر سکیں گے"

**پہلا قلندر**: "تم نے ٹھیک کہا۔ مکان کے احاطہ کے اُس طرف پشت پڑتی ہے ملک احمد و شاہ منصور وغیرہ ادھر نہیں آئیں گے۔ اور نہ اُن کی ادھر نظر پڑے گی"

**تیسرا قلندر**: " یہ دیکھو ایک نوکر جا رہا ہے۔ آپ لوگ یہیں ٹھہریں میں اس سے بات کر کے آتا ہوں"

**پہلا قلندر** (جو بابر تھا) " نہیں تم مت جاؤ میں خود جاؤں گا" (نوکر کے پاس جاتا ہے) " بابا۔ یا اللہ"

**نوکر**: " کیا ہے سائیں جی۔ کیا تمھیں کچھ نہیں ملا؟"

**قلندر**: " بابا سب کچھ ملا۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ یہ مکان کس کا ہے؟"

**نوکر**: " یہ مکان شاہ منصور کا ہے"

**قلندر**: " انکے بال بچے بھی ہیں؟"

**نوکر**: " ہاں کیوں نہیں۔ سب یہیں ہیں۔ مگر تمھیں اس سے کیا مطلب؟"

قلندر:" میں نے یوں ہی پوچھا کہ آخر یہ ہنگامہ کس امیر کے یہاں ہے"۔

نوکر چلا جاتا ہے اور قلندر اپنے ہمراہیوں کے پاس واپس آتا ہے اور کہتا ہے کہ "وہ کچھ جلدی میں تھا اس لیے زیادہ حال نہیں معلوم ہو سکا۔ آؤ۔ اس خیمہ کی طرف چلیں۔ وہاں شاہ منصور کا زنانہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر کوئی دوسرا نوکر آیا تو اور کچھ حال معلوم ہو جائے گا"۔

سب قلندر ایک قلندرانہ صدا لگاتے ہوئے جھومتے جھامتے ڈیرہ کے قریب آ گئے کہ اتنے میں ایک نوکر پاس سے گذرتا ہوا نظر آیا اسے دیکھتے ہی وہی پہلا قلندر آگے بڑھا اور سلام کرکے پوچھنے لگا "بابا - یہ ڈیرہ کس کا ہے؟"

نوکر:" شاہ منصور کے بیوی بچے یہاں ہیں عید قرباں کا تماشہ دیکھ رہے ہیں"۔

قلندر:" کیا شاہ منصور کے لڑکے ہی لڑکے ہیں یا کوئی لڑکی بھی ہے؟"

نوکر:" ہاں ایک لڑکی بھی ہے۔ بی بی مبارکہ اسے کہتے ہیں"۔

نوکر چلا جاتا ہے۔ اتنے میں بی بی مبارکہ کی نظر اس قلندر پر پڑتی ہے اور وہ دو روٹیوں پر کچھ بھنا ہوا گوشت رکھ کر قلندر کے پاس نوکر کے ہاتھ بھیجتی ہے۔

قلندر:" بابا یہ کس نے بھیجا ہے؟"

نوکر:" شاہ منصور کی لڑکی بی بی مبارکہ نے بھیجا ہے"۔

قلندر:" وہ کہاں ہیں؟"

نوکر:" وہ دیکھو تمھارے سامنے عورتوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ہوئی ہیں"۔ نوکر چلا جاتا ہے۔

قلندر۔ (یعنی بابر بادشاہ) اس ماہ طلعت کو دیکھتے ہی ہکا بکا سا ہو جاتا ہے اور ایک خادمہ سے جو ادھر سے گذرتی ہے آگے بڑھ کر سوال کرتا ہے۔

"یہ کس کی لڑکی ہے؟"

خادمہ:" یہ شاہ منصور کی لڑکی بی بی مبارکہ ہے"۔

قلندر:" اس کا مزاج کیسا ہے کس طبیعت کی لڑکی ہے؟"

خادمہ:" جیسا اس کا حسن بے نظیر ہے اسی طرح اس کا حسن سیرت لاجواب ہے۔ وہ ایک پاک نفس، صالحہ، حق پسند اور نہایت درجہ نیک طبیعت لڑکی ہے"۔

قلندر:" عمر کیا ہے؟"

خادمہ:" ابھی خاصی جوان ہے"

قلندر:" کیا ابھی تک اس کی منگنی نہیں ہوئی؟"

خادمہ:" پیام بہت جگہ سے آئے ہیں مگر نسبت کہیں ابھی تک نہیں ٹھہری"۔ (خادمہ چلی جاتی ہے)

(بابر یہ سب معلوم کرکے اپنے ہمراہیوں کے پاس جاتا ہے اور مکان کے پیچھے وہ پتھروں کے بیچ میں ان دو روٹیوں اور گوشت کو چھپا دیتا ہے)

**قلندر:** "آؤ اب چلیں۔ سب حال معلوم ہو گیا"

(سب قلندر اُسی طرح صدا لگاتے چلے جاتے ہیں)

## نواں سین

کیمپ دیا رودن

**بابر بادشاہ** (اپنے دل سے) "یہ حضرت عشق کا دوسرا حملہ ہے۔ ایک مرتبہ آہوری کی محبت نے کوہ و بیابان کی خوب سیر کرائی۔ اب دیکھیں اس افغانیہ کا عشق کیا رنگ لاتا ہے۔ کہیں لاہور کے پہاڑ میری آوارہ گردی کے جولاں گاہ نہ بنائیں۔ کہیں دیا رودن کا یہ کیمپ اس دیوانگی کی یادگار نہ قائم کرے۔ ملک احمد کو میں ایک خط لکھتا ہوں وہ بہت غیور شخص ہے۔ مگر اچھے الفاظ میں اور عمدہ انداز سے لکھوں گا۔ اُسکی قوم کو میرے ہاتھ سے نقصان پہونچا ہے۔ شاید وہ اور شاہ منصور اس وجہ سے خفا ہوں گے۔ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ راضی ہونگے یا نہیں۔ مگر نا اُمیدی کی بات کونسی ہے۔ میں اپنے ہاتھ سے خط لکھوں گا۔ دیکھوں کیا اثر ہوتا ہے"

غرضکہ ملک احمد کے نام خود ایک خط لکھتا ہے جس میں بی بی مبارکہ شاہ منصور کی بیٹی کے لیے اپنا پیام بھیجتا ہے اور بابا او غولی کو دیتا ہے کہ لیکر جائیں۔

**بابا او غولی:** "اس غلام سے جو کچھ ہوسکے گا دریغ نہ کرے گا۔ اگر دونوں بھائی راضی نہ ہوے تو میں اُنکی قوم کو سمجھاؤں گا"

**بابر:** "ہاں ایسی کوشش کرو کہ کامیاب آؤ"

(او غولی باہر جاتا ہے)

## دسواں سین

قلعہ ماہورا۔ شاہ منصور کا مکان

**شاہ منصور** (ملک احمد سے) "بابر نے یہ پیام بھیجا ہے۔ آپ کی کیا راے ہے۔ اس شخص سے جس قدر ہمیں سابقہ پڑا کچھ اچھی راے اس کے متعلق قائم نہیں ہوئی"

**ملک احمد:** "نہیں، بابر اتنا برا نہیں ہے۔ مگر ان مغلوں کو ہم اپنی لڑکی نہیں دینا چاہتے۔ الغ بیگ اور سلطان ویس (خاندان مرزا ہے) کو لڑکیاں دی تھیں انھوں نے کیا کیا۔ حضرت شیخ عثمانؒ نے ہمارے چچا شاہ سلیمان کے پاس خان مرزا کو بیٹھا دیکھکر کہا بھی تھا کہ اسکی آنکھ مجھے یزید کی آنکھ کی طرح نظر آتی ہے۔ اسے لڑکی مت دو۔ جس طرح یزید نے خاندان نبوت کو قتل کیا یہ بھی تمہارے ساتھ ایسا ہی کرے گا۔ مگر شاہ سلیمان نے نہ مانا اور لڑکی دیدی۔ نتیجہ وہی ہوا جو حضرت شیخ فرما چکے تھے۔ تمام یوسف زئیوں کو دھوکے سے کابل بُلا کر مرزا نے سلیمان اور اُسکے ... ہمراہیوں کو قتل کر ڈالا۔ کابل کے قریب سیاہ سنگ جہاں

یہ قتل عام ہوا اب ہیں اس واقعہ کی یاد تازہ کر رہا ہے۔"

**شاہ منصور۔** "آپ صحیح فرماتے ہیں۔ اس ہنگامہ میں خود آپ کی جان بھی جا رہی تھی۔ اگر خدا اس کمبخت مرزا کے دل میں رحم نہ ڈالتا تو آپ بھی شہید ہو گئے ہوتے۔"

**ملک احمد۔** "آن بیگ نے ہماری لڑکی کی اور سنہ [illegible] سے سنہ [illegible] تک ہماری قوم پر طرح طرح کی آفتیں ڈھائیں۔ حتیٰ کہ ہم لوگ پشاور اور سوات میں ان ظالموں سے پناہ لینے کے لیے ہجرت کر آئے بارے بابر بادشاہ نے محمد مقیم سے ہمارا بدلہ لیا۔ اور سنہ ۹۱۰ھ میں اُس کا قلع قمع کر کے خود ملک پر قابض ہو گیا۔ اب یہ حضرت بھی ہماری لڑکی مانگ رہے ہیں۔ خدا خیر کرے۔"

**شاہ منصور۔** "نہیں۔ ہم اپنی کوئی لڑکی ان مغلوں کو اب نہیں دیں گے۔ ان کا کوئی اعتبار نہیں۔ بابا اوغولی کو بلا کر میں کہے دیتا ہوں کہ ہمارے یہاں کوئی لڑکی نہیں ہے" (بابا اوغولی داخل ہوتا ہے) "بابا۔ آپ کو غلط خبر ملی ہے۔ ہمارے ہاں کوئی لڑکی نہیں ہے۔"

**بابا اوغولی** (حیرت زدہ ہو کر) "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بادشاہ کو خبر غلط ملی ہو۔ اور بلا تحقیق اُس نے پیام بھیجا ہو۔"

**شاہ منصور۔** "میں عرض کرتا ہوں کہ ہمارے یہاں کوئی لڑکی نہیں ہے۔ آپ کے بادشاہ کو ضرور غلط خبر ملی ہے۔"

**بابا اوغولی۔** "اچھا تو میں بادشاہ کی خدمت میں یہیں سے معروضہ بھیجتا ہوں اور آپ کا جواب کہلا بھیجتا ہوں۔"

(ملک احمد و شاہ منصور چلے جاتے ہیں اور بابا اوغولی بابر کو خط لکھتا ہے جس کے جواب میں دوسرے دن بابر کا ایک اور خط ملک احمد و منصور کے نام آتا ہے۔)

**بابا اوغولی** (اپنے دل میں) "یہ خط میں ان دونوں بھائیوں کو ابھی دیتا ہوں مگر عجیب اُلٹی کھوپڑی کے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ اس بدگمانی کی بھی کوئی حد ہے۔" (ملک احمد و شاہ منصور داخل ہوتے ہیں) "لیجیے صاحب بادشاہ کا یہ دوسرا خط آیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔"

**ملک احمد** (خط کھول کر پڑھتا ہے اور شاہ منصور کے ہاتھ میں دیتا ہے) "بادشاہ نے بہت اچھے الفاظ میں یہ خط لکھا ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہ یہاں کیسے تشریف لائے۔"

**شاہ منصور** (حیرت سے) "عجیب بات ہے۔ واقعی بابر عجیب شخص ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ میں خود قلندروں کے بھیس میں تمہارے گھر پر آیا تھا۔ تمہاری لڑکی

نے دو روٹیاں اور گوشت دیا تھا جو اسی مکان کے پشت پر دو پتھروں کی آڑ میں چھپا کر رکھ دیا ہے۔ آئیے چلیں یہ روٹیاں دیکھیں کہاں ہیں اور مبارکہ سے بھی اس واقعہ کو دریافت کریں "

(بابا اغولی جاتا ہے اور یہ دونوں بھائی مشورہ کرتے ہیں - مبارکہ کو بلاتے ہیں)

**شاہ منصور**: "تم نے کسی فقیر کو بکریدکے روز روٹیاں اور گوشت دیا تھا؟"

**بی بی مبارکہ**: "جی ہاں ابا جان - دو تین فقیر میرے ڈیرہ کے سامنے بہت محتاج سے نظر آتے تھے - اُنھیں دو روٹیاں میں نے بھیجی تھیں "

**شاہ منصور**: "تم جانتی ہو وہ فقیر کون تھا؟"

**بی بی مبارکہ**: "کوئی فقیر ہوگا - مجھے کیا معلوم"

**شاہ منصور**: "وہ ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ تھا اور ہمارے گھر کا حال دریافت کرنے آیا تھا - اُس نے وہ دونوں روٹیاں دو پتھروں کے بیچ میں چھپا دی ہیں - میں جا کر دیکھتا ہوں کہ آیا اُس نے جھوٹ لکھا ہے یا سچ - (اپنے مکان کے پس پشت جا کر وہ تلاش کرتا ہے اور ایک مقام پر دو پتھروں کے بیچ میں دو روٹیاں اور گوشت رکھا ہوا ملتا ہے)

**شاہ منصور** (ملک احمد سے) "بھائی جان - بابر نے سچ لکھا ہے - وہ بیشک یہاں آیا تھا اور اُس نے ہم کو دیکھ گیا - لڑکی سے ہم انکار نہیں کر سکتے "

**ملک احمد**: "مگر یہ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ بادشاہ و رعایا کا کوئی کفو یا میل نہیں - کہاں وہ کہاں ہم "

اتنے میں بابا اغولی پھر آتا ہے -

**بابا اغولی**: "آپ دونوں صاحبوں نے اب غالباً تصفیہ کر لیا ہوگا - ایسا پیام بھلا کہاں آتا ہے؟ خود بادشاہ کی خواہش ہے! آل تیمور سے بڑھ کر آج کل دنیا میں کون ہے؟ یہ آپ لوگوں کے نصیب ہیں کہ بابر بادشاہ اتنی مراعات سے پیش آرہا ہے اور ایک ایسی درخواست کر رہا ہے جو اسلامی نقطۂ نظر سے کچھ بیجا نہیں ہے "

**شاہ منصور**: "بابا اغولی - ہم کیسے بادشاہ سے نسبت کر سکتے ہیں؟ وہ اتنا بلند مرتبہ ہے کہ اُسکے دامن تک ہمارا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا - چہ جائیکہ اُس سے نسبت ناتہ کیا جائے - جو برابر کے لوگوں میں ہوا کرتا ہے "

**ملک احمد**: "مغلوں میں دو شخصوں کو ہم نے لڑکیاں دی تھیں - یہ دونوں نسبتیں نہایت نامبارک ثابت ہوئیں - اب پھر یہ سبق ہم دہرانا نہیں چاہتے "

**بابا اغولی**: "آپ صاحبوں نے بابر بادشاہ کو سمجھا نہیں - خان مرزا اور الغ بیگ سے آپ اس کا مقابلہ کرتے ہیں "چہ نسبت خاک را با عالم پاک" آپ کو اُنکا ذکر نا چاہیئے اپنے

خیال سے نہیں تو کم سے کم اپنی قوم کے خیال سے اس پیوند کو منظور کر لیجیے۔"

اتنے میں دو تین بڈھے بڈھے یوسف زئی سردار اور آ جاتے ہیں جنھیں بابا ادغولی نے پہلے ہموار کر رکھا تھا اور وہ سب ملک احمد اور شاہ منصور کو سمجھاتے ہیں کہ "اپنی قوم پر رحم کھاؤ تم نے ہمیشہ آڑے وقت میں قوم کی مدد کی ہے اور قوم کے لیے بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں۔ یہ وقت بڑا نازک ہے۔ اگر بابر کو غصہ آیا تو پھر کسی کی خیر نہیں۔ لڑکی دیکر ہم سب کو اُسکے غصہ سے امن میں رکھو۔"

**ملک احمد** (ان بڈھے یوسف زئیوں کا کلام سُن کر) "آپ لوگوں کے لیے میری جان حاضر ہے اگر قوم کی بھلائی کا معاملہ ہے تو خیر ہم دونوں راضی ہیں۔"

## گیارہواں سین

(قلعہ لاہور۔ بی بی مبارکہ کا کمرہ۔ ملک احمد۔ شاہ منصور۔ و بی بی مبارکہ۔)

**شاہ منصور**: "مبارکہ۔ بابر بادشاہ نے تمھارے لیے پیام دیا ہے۔ بھائی جان اور میں دونوں اس نسبت سے راضی نہیں تھے مگر قوم کے لیے رضامندی دینی پڑی۔ اب تم بھائی جان سے سُن لو کہ کیا کرنا چاہیے۔"

**ملک احمد**: "دیکھو بیٹی۔ تم ایک عظیم الشان بادشاہ کی بیوی بنکر جا رہی ہو۔ اپنے فرائض مت بھولنا۔ اور یہ یاد رکھنا کہ گو تم بیوی ہو مگر بادشاہ ہوں سے کس طرح ملنا چاہیے؟ ہمیشہ حد درجہ کا ادب و لحاظ مد نظر رکھنا۔ اُسکی خدمت اپنے ہاتھ سے کرنا اور اُس کا ادنیٰ سے ادنیٰ کام بھی خود انجام دینا۔ اور سب پر مقدم یہ ہے کہ اپنی قوم کے لیے معافی نامہ لینا۔ اگر تمھاری قوم پر یہ مصیبت نہ آتی تو ہم کبھی تمھیں مغلوں میں نہ دیتے اس لیے جو اصلی غرض ہے وہ سب سے پہلے حاصل کرنی چاہیے۔ تم خود سمجھدار ہو۔ میرا اس قدر اشارہ کافی ہے۔"

**بی بی مبارکہ**: "یوسف زئیوں کے لیے میری جان حاضر ہے۔ جو کچھ چچا جان آپ فرما رہے ہیں میں انشاءاللہ تعالیٰ ویسا ہی کروں گی۔"

(باجوں اور شادیانوں کی آوازیں آنے لگتی ہیں اور ایک نوکر آکر اطلاع دیتا ہے)

**نوکر**: "سرکار۔ بادشاہ نے یہ خوان اور تحفے بھیجے ہیں اور تمام یہ جلوس باجے گاجے کے ساتھ آ رہا ہے۔"

(تمام تحفے سامنے لاکر رکھے جاتے ہیں۔ اس میں دولھن کے لیے بیش قیمت زیورات ہیں اور بابر کی خود ایک تلوار ہے۔ اتنے میں شاہ منصور کے

زنانہ کی عورتیں آتی ہیں)

شاہ منصور (عورتوں سے) "یہ دولھانے تحفے بھیجے ہیں اب لڑکی کو دولھن بناؤ - تاکہ ہم سب دور تک رخصت کر آئیں "

(غرضکہ بی بی مبارکہ دولھن بنائی جاتی ہے عقد ہوتا ہے - ایک شاہی پالکی میں وہ بٹھائی جاتی اور بڑے جلوس کے ساتھ روانہ ہوتی ہے ملک داھر وشاہ منصور تھانہ سے سب عمورہ (؟) پر آتے ہیں - دریا کو چلدرہ کے پاس عبور کرتے ہیں - پہاڑیوں کے بیچ میں سے ایک تنگ پگڈنڈی جاتی ہے - اس راستہ پر موضع تلاش سے گذرتے ہوئے تیری (؟) کے پشت تک جاتے ہیں جہاں بادشاہی اُمرا استقبال کے لیے کھڑے نظر آتے ہیں - یہاں سے باپ اور چچا دونوں لوٹ جاتے ہیں اور دولھن شاہی جلوس کے ساتھ کیمپ دیارون میں داخل ہوتی ہے)

## بارھواں سین

کیمپ دیارون کے وسط میں ایک خیمہ

مبارکہ "انّا - بادشاہ کہاں ہیں ؟"

روشنہ (مبارکہ کی انّا ہے) "بادشاہ سلامت اپنے ڈیروں میں ہیں - میں نے سنا ہے کہ جمعہ کے دن آئیں گے "

مبارکہ "میرا اکیلے اس مجمع میں جی گھبراتا ہے اچھی انّا - میرے پاس سے تم جانا نہیں "

روشنہ "نہیں بیٹی - میں کہاں جاؤں گی - اب میرا دانہ پانی سب تمھارے پاس ہے - یہیں جیوں گی یہیں مروں گی "

مبارکہ "جب بادشاہ اس ڈیرے کی طرف آئیں تو میری انّا، مجھے پہلے سے خبر کر دینا - میں نہیں چاہتی کہ بیخبری میں وہ آجائیں "

روشنہ "اچھا بیٹی - میں اس کا انتظام رکھوں گی اور لوگوں کو بٹھا دوں گی - پرسوں ہی تو جمعہ ہے - میں ابھی سے سب چیزوں کا انتظام کرتی ہوں -

مبارکہ " انّا یہ کون عورتیں آرہی ہیں ؟ "

روشنہ "بیٹی - گھبراؤ نہیں - یہ بادشاہ کے بڑے بڑے امیروں کی بیویاں ہیں - تم سے ملنے آرہی ہیں تم چپکی بیٹھی رہنا - کسی سے کوئی بات نہ کرنا "

اُمراے شاہی کی بیبیاں یکے بعد دیگرے آتی جاتی ہیں مگر مبارکہ کسی طرف متوجہ نہیں ہوتی - چُپ سر جھکائے بیٹھی رہتی ہے -

ایک "بہن - یہ لڑکی کیسی خاموش سی ہے کسی سے بات ہی نہیں کرتی "

دوسری "اسکے حسن کو تو دیکھو - میں نے تو آجتک اس حسن و جمال کی کوئی عورت نہیں دیکھی "

تیسری "حسن و جمال سب ہی مگر منہ سے تو بولتی ہی نہیں - معلوم نہیں بادشاہ سے بھی بولیں گی یا نہیں "

**دوسری** : "ہاں اُن سے کیوں نہ بولیں گی (مُسکرا کر) دولہا سے کہیں پردہ رہ سکتا ہے"

**چوتھی** : "بہن عجب چُپ سی دُلھن ہے۔ مجھے اس میں کوئی بھید معلوم ہوتا ہے"

**تیسری** : "بھید کیا کونسی بات ہے۔ بیچاری نئی دُلھن ہے۔ سُسرال میں آئی ہے۔ جہاں سب نئی صورتیں ہیں۔ تم چاہتی ہو کہ ایک ہی دن میں پھٹاک پھٹاک باتیں کرنے لگے"

(غرضکہ اس طرح کی باتیں کرتے سب عورتیں چلی جاتی ہیں اور بالآخر جمعہ کا دن آتا ہے اور باجوں نقاروں اور شاہی جلوس کا منظر نظر آتا ہے)

**مبارکہ** (روشنہ سے) "انا۔ یہ جلوس کیسا ہے؟"

**روشنہ** : "میں نے نوکروں سے پوچھا تھا معلوم ہوا بادشاہ سلامت جمعہ مسجد جا رہے ہیں۔ وہاں سے لوٹتے ہوئے اس طرف آئیں گے"

**مبارکہ** : "انا۔ تم نے انتظام کر دیا ہے کہ جس وقت بادشاہ ادھر کا رخ کریں مجھے اطلاع ہو جائے"

**روشنہ** : "ہاں بیٹی۔ میں نے سب طرح کا انتظام کر دیا ہے۔ اطمینان رکھو۔ گھڑی گھڑی کی خبر ہوتی رہیگی"

(اتنے میں نماز جمعہ کے بعد جلوس کا رخ اس طرف نظر آتا ہے اور انا جلدی سے آکر بی بی مبارکہ سے کہتی ہے) "بیٹی۔ بادشاہ سلامت آ رہے ہیں"

(مبارکہ جلدی سے اُٹھ کر صحن میں باہر کی طرف جاتی ہے۔ بادشاہ سلامت داخل ہوتے ہیں۔ مبارکہ آداب بجا لاتی ہے۔ اور ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑی رہتی ہے۔ اُس کا چہرہ نقاب سے ڈھکا ہوا ہے)

**بابر** (دالان میں آکر مسند پر بیٹھ کر) "افغانیہ ادھر آؤ۔ یہاں بیٹھو"

**مبارکہ** (سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے اور مُنہ سے کچھ نہیں کہتی۔ بابر پھر کہتا ہے) "افغانیہ بیٹھ جاؤ" (مبارکہ بابر کے قریب جا کر ادب سے جھک جاتی ہے لیکن بیٹھتی نہیں۔ بادشاہ پیار سے ہاتھ ڈال کر چہرہ سے نقاب اُلٹ دیتا ہے اور مبارکہ کا حسن دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے)

**بابر** : "افغانیہ بیٹھتیں کیوں نہیں۔ بیٹھ جاؤ"

**مبارکہ** (ہاتھ باندھے ہوئے نہایت ادب سے جُھک کر) "ایک التجا ہے اگر حکم ہو تو عرض کروں"

**بابر** : "ہاں ہاں۔ کہو"

**مبارکہ** (اپنے دوپٹے کے دونوں دامنوں کو ہاتھ میں لیکر) "حضور یہ سمجھیں کہ کُل یوسف زئی قوم میرے اس دامن میں ہے۔ میری خاطر حضور اُنکی خطا بخش دیں"

**بادشاہ** : "یوسف زئیوں کی تمام خطائیں تمھارے سامنے معاف کرتا ہوں اور اُن سب کو تمھارے دامن کی پناہ میں دیتا ہوں۔ یوسف زئیوں سے

اب کوئی کینہ میرے دل میں نہ رہے گا۔"
زیبا رکہ یہ عنایت آمیز الفاظ سن کر پھر آداب بجا لاتی ہے اور بادشاہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر کمرہ میں داخل ہوتا ہے۔

عصر کی نماز کے لیے جب بادشاہ باہر جاتا ہے تو بی بی مبارکہ آگے بڑھ کر بابر کے جوتے اٹھا کر سامنے رکھ دیتی ہے۔ جوتے پہن کر بابر مسکراتا ہوا کہتا ہے)
"میں تم سے اور تمہاری قوم سے بہت خوش ہوا تمہاری خاطر میں نے اُن سب کی خطائیں معاف کر دیں۔ (پھر مسکرا کر) ہم جانتے ہیں ملکہ ہمارے یہ سب گن تمہیں سکھلاتی ہوں گے" (یہ کہکر بابر نماز کے لیے باہر چلا جاتا ہے اور بی بی مبارکہ خیمہ کے اندر اپنی نماز کی تیاریاں کرتی ہیں۔)

## خاتمہ

چند روز بعد دیاروں سے کیمپ برخاست کر دیا جاتا ہے اور باجور اور تنگی کے راستہ سے بابر کابل میں داخل ہوتا ہے۔ اس فدائے قوم بی بی مبارکہ کا ذکر گلبدن بیگم نے اکثر کیا ہے انکی کوئی اولاد نہیں ہوئی اور اکبر کے ابتدائی زمانہ میں عزو وقار کے ساتھ اُنھوں نے اپنی زندگی کے آخری دن ختم کر کے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ان کے بھائی میر جمال بابر۔ ہمایوں اور اکبر تینوں کے عہد میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔

حامد علی خاں نائب ناظم رامپور

# شکریہ

اگست نمبر کے بعد سے الناظر کی توسیع اشاعت کا ذکر کرنے کا موقع نہ ملا۔ اس اثنا میں جن احباب نے نئے خریدار بنائے اُن کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں :-

| | | |
|---|---|---|
| منشی محمد ظفر ایم اے ایل ایل بی وکیل | ۲ | خریدار |
| مسٹر عبدالشکور بریلوی ایم اے | ۳ | ״ |
| مسٹر فدا حسین واثق صدیقی | ۴ | ״ |
| خواجہ منظور حسین (علیگ) | ۲ | ״ |
| مولوی مقبول احمد مقیم سری نگر | ۱ | ״ |
| مولانا سید ہاشمی فریدآبادی | ۱ | ״ |
| قاضی انتظار علی خاں عباسی بی اے | ۱ | خریدار |
| سید محمد ہادی دہلوی بڑودہ | ۱ | ״ |
| مسٹر معظم علی بی اے انجینیر بمبئی | ۱ | ״ |
| مسٹر منظور محمود قدوائی رامپور | ۱ | ״ |
| منشی امیر احمد علوی بی اے | ۵ | ״ |
| پروفیسر رشید احمد صدیقی ایم اے | ۲ | ״ |

سب احباب دلی شکریہ قبول فرمائیں۔

ظفر الملک

# فاتح مصر

(مولانا اسلم جیراجپوری کی ایک تازہ تالیف)

مولانا اسلم فن تاریخ میں اس قدر، جو کمال حاصل کر چکے ہیں اور اُن کی بے نظیر تاریخ الامۃ کو ملک میں اس قدر شہرت و قبولیت نصیب ہو چکی ہے کہ انکی کسی جدید تالیف کو پبلک سے روشناس کرنے کے لیے طویل تمہید کی حاجت نہین - مولانا کا طرز بیان دل آویز ہے اور اُن کی تحریر اس قدر دلچسپ ہوتی ہے کہ تاریخ میں ناول کا سا لطف آتا ہے -

اُن کی جدید ترین تالیف "سیرۃ عمرو بن عاص" جو ابھی حال میں شایع ہوئی ہے، مورخانہ موشگافیوں کا ایک خوبصورت مجموعہ ہے - فاتح مصر کی سوانح عمری اس قدر دلکش انداز سے بیان کی گئی ہے اور انکی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات اس کد و کاوش سے فراہم کیے ہیں کہ انکی داد نہ دینا سخت نا انصافی ہے - لیکن مولانا نے اس کتاب میں ایک بڑا غضب ڈھایا ہے کہ اپنے ہیرو کے باپ کی بابت ارشاد فرماتے ہیں کہ کلام مجید نے اُسکے مقطوع النسل ہونے کی پیشین گوئی کی تھی !!

صفحہ ۴ پر تحریر فرماتے ہین کہ عمرو بن عاص کے والد عاص بن وائل اپنے قبیلہ کے سردار تھے اور آنحضرت و صحابہ کو ایذائیں دیتے تھے "جب قاسم و عبد اللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں بیٹے مکہ میں گذر گئے تو اُنھوں نے ہی کہا تھا کہ محمد ابتر یعنی مقطوع النسل ہیں جس پر سورۂ کوثر نازل ہوئی - ہجرت نبوی کے ایک مہینے کے بعد ۸۵ سال کی عمر میں مکہ میں انتقال کر گئے "

جس سورت کا مولانا نے اشارہ کیا ہے اُس کی آخری آیت ہے "ان شانئک ھو الابتر" اگر "ابتر" کے معنی مقطوع النسل لیے جائیں جیسا کہ مولانا نے تحریر فرمایا ہے تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ "تیرا دشمن مقطوع النسل ہے" اور اگر دشمن سے اشارہ عاص بن وائل کی طرف ہو جیسا کہ مولانا کی تحقیق سے ثابت ہوا ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عاص کی بابت کلام مجید کی وعید

(عیاذاً باللہ) غلط تھی۔

افسوس ہے کہ تاریخ اسلام کے پروفیسر نے سیر کی کم رتبہ کتابوں سے یہ روایت عاص کی بابت اخذ کرلی اور احادیث و تفاسیر سے اسکی تحقیق نہیں کی۔ اگر وہ تفاسیر کی طرف رجوع کرتے تو اُن کو معلوم ہو جاتا کہ اس سورت کا مکہ میں نازل ہونا مختلف فیہ ہے۔ بلکہ ائمۂ فن سورۂ کوثر کو مدنی بتاتے ہیں۔ چونکہ عاص مولانا ہی کی تحقیق کے مطابق ہجرت سے صرف ایک مہینہ کے بعد انتقال کر گیا تھا لہذا اس سورت میں "دشمن" سے اُسکی طرف اشارہ ہونا ممکن ہی نہ تھا۔

امام مسلم، ابوداؤد، اور نسائی کا جو مرتبہ علم حدیث میں ہے وہ شاید مولانا نے بھی سنا ہوگا وہ تینوں حضرات بالاتفاق......... حضرت انس بن مالک سے روایت کرتے ہیں کہ

"ایک وقت رسول اللہ ہمارے درمیان مسجد میں تشریف رکھتے تھے کہ ناگاہ آپ پر وحی کی بیہوشی طاری ہوئی۔ پھر مسکراتے ہوئے سر مبارک اُٹھایا۔ ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کس چیز سے مسکرائے؟ آپ نے فرمایا کہ ابھی مجھ پر ایک سورت نازل ہوئی۔ پھر اُس کو تلاوت فرمایا (بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ انا اعطیناک الکوثر۔ فصل لربک وانحر۔ ان شانئک ھو الابتر) الی آخر الروایۃ"

انس بن مالک صاف الفاظ میں فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ ہمارے درمیان مسجد میں تشریف رکھتے تھے"۔ مولانا مورخ ہیں؛ وہ غالباً جانتے ہوں گے کہ انس بن مالک کا وجود جماعت صحابہ میں ہجرت سے پیشتر نہ تھا۔ لہذا یہ سورت یقیناً مدینہ میں نازل ہوئی جبکہ مسجد نبوی تعمیر ہو چکی تھی۔ اور عاص بن وائل کی ہڈیاں بھی باقی نہ تھیں۔

نزول کا وقت تو معلوم ہو گیا۔ اب شان نزول سنیئے: البزار، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ جنگ بدر کے بعد کعب بن اشرف یہودی مکہ میں گیا تو قریش کے مشرکوں نے اُس سے کہنا شروع کیا کہ تو اس ملک کا سردار و عالم ہے۔ ہم تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم لوگ حاجیوں کی خدمتگاری کرتے ہیں، آب زمزم پلاتے ہیں، اور خانہ کعبہ کے خادم ہیں۔ ہم اچھے ہیں کہ یہ "صابی ابتر" اپنی قوم سے خارج اچھا ہے؟ یہودی کہنے لگا کہ تم اچھے ہو۔ تب اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ "ان شانئک ھو الابتر"۔

غرض ایک کثیر جماعت محدثین کی دعویٰ کرتی ہے کہ یہ سورت مدنی ہے اور اسکو عاص بن

وائل سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔

اگر تھوڑی دیر کے لیے مان لیا جائے کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی تو اس میں "دشمن" سے اشارہ ابولہب کی طرف ہے۔ جیسا کہ عطاء رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ "ابولہب نے رسول اللہ کے صاحبزادوں کے انتقال پر خوشی ظاہر کی اور آپ کو 'ابتر' کہا تو یہ آیت نازل ہوئی کہ ان شانئک ہو الابتر" (ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر)۔

علاوہ اس کے "ابتر" کے لغوی معنی "مقطوع النسل" نہیں ہیں۔ بلکہ "ابتر" "دُم بریدہ" "پراگندہ" یا اُس ذلیل و خوار شخص کو کہتے ہیں جس کا کوئی نیکی سے نام نہ لیتا ہو۔ لہذا بفرض محال اگر اس سورت میں عاص بن وائل ہی کی طرف اشارہ ہو تو مولانا کو "ابتر" کے معنی "مقطوع النسل" نہیں لکھنا چاہئے تھے بلکہ اس کا ترجمہ "ذلیل و خوار" کرنا مناسب تھا۔ تاکہ مذہب اسلام کی بنیاد متزلزل نہ ہو جاتی !!

قطع نظر ان تمام دلائل کے مفسرین کو اتفاق ہے کہ اس آیت میں کسی خاص دشمن پر طعن نہیں ہے بلکہ یہ وعید عام ہے تمام دشمنان رسول کے لیے۔ یعنی جو نبی عربی کو ایذا دیگا وہ "ابتر" ہوگا۔ (ایسا ذلیل کہ اُس کا نام کوئی نیکی سے نہ لیگا) حیرت ہے کہ مولانا باوجود اپنے علم و فضل کے ایسی فاش غلطی کے کیونکر مرتکب ہوئے۔ اگر فاتح مصر کے مناقب و فضائل میں اُنکے باپ کی بابت کلام مجید کے ساکت ہونے سے کوئی نقص رہ جاتا ہے تو (علیٰ رغم انف مورخ) عمرو بن عاص اس نعمت عظمیٰ سے یقیناً محروم تھے اور سورۂ کوثر یا "تبت یدا" انکے والد ماجد کی شان میں ہرگز نہیں نازل ہوئی۔

دوسرا ستم مولانا نے اس کتاب میں یہ کیا ہے کہ صفحہ ۹۷ پر "صفات عمرو بن عاص" کے ضمن میں ایک عنوان "تقویٰ" کا بھی قائم کیا ہے۔ اور اُس میں ایک راوی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "میں نے اُن سے بڑھ کر راہِ حق پر مستقیم، دوستوں میں محترم، اور ظاہر و باطن میں یکساں کسی کو نہیں پایا"۔ مولانا نے اس روایت پر کوئی نکتہ چینی نہیں کی اور نہ کسی جگہ اسکے خلاف اپنی رائے ظاہر کی۔ لہذا قیاس ہو سکتا ہے کہ مولانا بھی عمرو بن عاص کو "راہ حق پر مستقیم" اور "ظاہر و باطن میں یکساں" تصور فرماتے ہیں۔ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اگر اس مقام پر مختصر طور سے

فاتح مصر کے چند واقعات زندگی کا جو مولانا کو بھی تسلیم ہیں حوالہ دیا جائے۔ اور اُس وقت غور کیا جائے کہ اس "حاطب اللیل" راوی کا قول عمرو بن عاص کے تقویٰ کی بابت کس حد تک درست ہے؟

فاتح مصر کی زندگی میں سب سے بڑا نازک وقت انکے تقویٰ کے امتحان کا وہ تھا کہ حضرت امیر اور جناب معاویہ کے درمیان صلح کرانے کے لیے دو حَکَم مقرر کیے گئے اور ۱۳ رصفر ۳۷ھ کی منحوس تاریخ کو وہ ثالثی نامہ تحریر کیا گیا جس کی رو سے حضرت ابو موسیٰ اشعری منجانب حضرت علیؓ کے اور عمرو بن عاص منجانب جناب معاویہ کے حَکَم تھے۔ اور فریقین سے عہد لیا گیا کہ یہ دونوں پنچ جو فیصلہ کریں وہ سب کو منظور ہوگا۔ مولانا ... صفحہ ۱۰۰ پر تسلیم کرتے ہیں کہ "فاتح مصر نے ابو موسیٰ سے جو چاہا لکھوا لیا" اور صفحہ ۹۰ پر اس روایت متواترے سے انکار کرتے ہیں کہ اعلانِ فیصلہ کے وقت ابو موسیٰ نے علی و معاویہ دونوں کو معزول کیا اور عمرو بن عاص نے علی کی معزولی سے متفق ہوکر معاویہ کو اُن کی جگہ قائم کر دیا۔ اور اس انکار کی دلیل یہ قائم کرتے ہیں کہ "شہادتیں قلمبند ہوئی تھیں تو فیصلہ زبانی کے کیا معنی۔ علاوہ بریں عمرو بن عاص کچھ نادان نہ تھے کہ اس قسم کی مخالفت کرتے جس سے اُنکے فریق کا کوئی نفع نہ تھا!!

اس دلیل کی کمزوری پر بحث کرنا راقم الحروف کو منظور نہیں کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ باوجود شہادتیں قلمبند ہونے اور فیصلہ تحریر کیے جانے کے اعلانِ فیصلہ کا ہمیشہ زبانی ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ فریقین مقدمہ اور اُنکے تمام ہوا خواہ ہمیشہ عالم، فاضل، ماہر تاریخ کے پروفیسر نہیں ہوا کرتے ہیں مقصود صرف یہ دکھانا ہے کہ فاتح مصر نے اگر اپنے فریق کا فائدہ پیش نظر رکھا تو یہ اعلیٰ درجہ کی ڈپلومیسی تھی۔ مگر اس میں اور دیانت میں زمین و آسمان کا تفاوت ہے۔ اگر فاتح مصر راہ حق پر مستقیم تھے تو اپنے فریق کا فائدہ پیش نظر رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی۔ دونوں کو معزول کرنا چاہیے تھا جیسا کہ منصوبہ میں طے ہو چکا تھا!!

ابو موسیٰ کی بابت مولانا کا فتویٰ ہے کہ "انھوں نے دیانت کے ساتھ کام کیا۔ جو رائے انھوں نے دی وہی اُس وقت ایک بڑے گروہ کی رائے تھی جو اس فتنہ سے کنارہ کش تھا" کیا عمرو بن عاص کی بابت بھی ایسا ہی فتویٰ مولانا کے قلم سے صادر ہو سکتا ہے؟ کیا انھوں نے بھی دیانت و امانت کے ساتھ "ابو موسیٰ سے جو چاہا لکھوا لیا"؟

ایک مثال اور ملاحظہ فرمائیے۔ صفحہ ۸۲ پر مولانا جنگ صفین کے تذکرہ میں فرماتے ہیں :
"متواتر سخت معرکوں کے بعد عراقی فوجیں غالب آئیں۔ قریب تھا کہ شامیوں کو شکست ہو۔
اُس وقت عمرو بن عاص نے یہ مشورہ دیا کہ لوگ نیزوں پر قرآن اُٹھا لیں اور پکاریں کہ اسی کے
روسے ہمارا اور تمھارا فیصلہ ہے۔ اہلِ عراق نے جب معاحف دیکھے تو جنگ سے رک گئے
اور کہا کہ ہم کو کتاب اللہ کا فیصلہ منظور ہے "۔ یہ تدبیر فاتحِ مصر کو دانش مندیوں میں کیا ثابت
کرتی ہے۔ مگر مولانا اپنے راوی سے پوچھیں کہ کیا ظاہر و باطن یکساں ہونے کے یہی معنی ہیں ؟
ایک حکایت اور سنئے۔ جب خلیفۂ دوم کو مولانا کے ہیرو کے حساب جانچنے کی ضرورت محسوس
ہوئی تو انھوں نے محمد بن مسلمہ کو حساب کے لیے مصر بھیجا اور محاسب نے فاتحِ مصر سے مال تقسیم کرلیا
اس موقع پر محاسب اور فاتح سے جو گفتگو ہوئی وہ مولانا نے صفحہ ۷۹ پر اس طرح تحریر فرمائی ہے
" یہ زمانہ جس میں ابن حنتمہ (حضرت عمر) ہمارے ساتھ ایسی سخت گیری کا برتاؤ کرتا ہے بُرا زمانہ
ہے۔ میرے باپ عاص نے ہمیشہ ریشمی لباس پہنے اور دیبا کے سنجاف لگائے۔ ابن مسلمہ نے کہا
کہ بس بس۔ اگر ابن حنتمہ کا یہ زمانہ جسکو تم کوستے ہو نہ ہوتا تو تم عرب میں بکریاں چراتے ہوتے۔ عمرو
بن عاص نے کہا کہ یہ آپس کی باتیں ہیں۔ کہیں ان کا تذکرہ امیرالمومنین سے نہ کر دینا۔ بولے
کہ ہرگز نہیں "

مولانا فاتحِ مصر کی تعریف جس قدر چاہیں کریں اُنکو یہی مناسب ہے۔ اب کیوں نہ ہوں
باتوں میں طرفدار اُنھیں کے۔ پروردہ اُنھیں کے ہیں نمکخوار اُنھیں کے۔ لیکن یہ گفتگو جو مولانا نے
نقل کی ہے (اگر خدا نخواستہ صحیح ہو) تو اس سے فاتحِ مصر کا ظاہر و باطن یکساں ہونے کا کیسا
بیّن ثبوت ملتا ہے !! اور اُن کا " دوستوں میں محترم " ہونا اس روایت سے روزِ روشن کی طرح
آشکارا ہے۔ " راہِ حق پر مستقیم " ہونے کی اس سے زیادہ کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ ایامِ جاہلیت کے
عیش و آرام یاد کیے جائیں اور باپ کے ریشمی لباس پر فخر کیا جائے جس کو اسلام نے حریت
اور مساوات کی تعلیم کے لیے حرام کر دیا !! اگر مولانا اپنی بیش قیمت تالیف کو ایسی لغو روایات
سے آلودہ نہ کرتے تو عمرو بن عاص کی عظمت میں کیا فرق آسکتا تھا ؟ ۔

لیکن باوجود ان لغزشوں کے مولانا اسلم کی یہ جدید تالیف ادبِ اُردو میں ایک گرانبہا

اضافہ ہے ۔ مرا بہ سادہ دلیہائے من تواں بخشید ۔ خطا گرفتہ ام و چشم آفریں دارم ۔ مولانا سے ایک اور شکایت ہے کہ اُنھوں نے کاپی کی تصحیح کا مناسب انتظام نہیں کیا اور کوئی غلط نامہ بھی کتاب کے ساتھ شامل نہیں کیا ۔ بعض جگہ عبارت خبط ہوگئی ہے ۔ مثلاً " وہ اسوقت عمان میں چلے تھے" (صفحہ ۱۱) یا " صالحیہ اور قصامین کے بہت آئے" (صفحہ ۳۳) بعض جگہ سنہ غلط ہوگیا ہے مثلاً " اس حصہ کو سنہ ھ میں عبداللہ نے فتح کیا" (صفحہ ۵۸) ۔ ایک مقام پر کاتب نے " ارلیان" کا لفظ لکھا ہے (صفحہ ۲۶) وغیرہ وغیرہ ۔

المختصر اس تالیف میں جس قدر نقائص یا خامیاں نظر آئیں وہ اوپر درج کردی گئیں ۔ اسکے علاوہ کتاب میں سب محاسن ہی محاسن ہیں اور اسکی خوبیوں کا پلہ برائیوں سے بہت زیادہ وزنی ہے ۔ خدا کتاب کو قبولیت نصیب کرے ۔ قیمت صرف عہ ہے اور " مولانا اسلم جیراجپوری جامعہ ملیہ علی گڈھ" کے پتہ سے مل سکتی ہے ۔

" الف ۔ ع "

# تعزیت

موت اگرچہ بے پناہ ہے اور بچے سے بڑھے تک کسی کی بھی ہو، خوش آیند نہیں ہوتی ۔ مگر نوجوانوں کی موت سے دل بہت متاثر ہوتا ہے اور پھر جب کوئی ایسا نوجوان دنیا سے اُٹھ جاتا ہے جس سے کسی خاندان یا قوم کی بہت سی توقعات قائم ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کن الفاظ میں درد و غم کا اظہار کیا جائے ۔ جعفر حسین مرحوم کے بعد ہی دو نوجوانوں کی وفات سے بیرے کمزور قلب کو بہت صدمہ پہونچا ۔ عزیزی سجاد علی انصاری کیل بارہ بنکی مرحوم کی نظم و نثر سے اوراق الناظر کی گو کبھی زینت نہیں ہوئی مگر جو لوگ اُن سے واقف تھے اور جنکو ملک کے متعدد رسائل میں اُنکا پاکیزہ کلام اور نثر مضامین دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اب یقیناً اُنکی ذہانت اور شوخی طبع کو برسوں یاد رکھیں گے ۔ غریب نے دق میں مبتلا ہو کر اس دنیا سے رحلت کی ۔ تازہ اطلاع یہ ملی ہے کہ مولوی ابوالحسنات ندوی رفیق دار المصنفین نے بھی حال ہی میں شدید علالت کے بعد انتقال کیا ۔ مرحوم کو الناظر میں زیادہ لکھنے کا موقع نہیں ملا مگر معارف میں وہ تقریباً ہر ماہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے اور ان تحریروں سے وسیع خدمت علمی کی توقعات قائم ہوگئی تھیں ۔ اللہ تعالیٰ دونوں نوجوانوں کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائیں ۔ اور وارثوں کو تعزیت قبول کریں ۔

ظفر الملک

# سیر المصنفین

الناظر کی تازہ اشاعت سے یہ اطلاع باعث مسرت ہے کہ ایک معروف اہل قلم مولوی محمد یحییٰ تنہا بی اے (علیگ) نے مصنفین اُردو کا ایک کامل تذکرہ مرتب کر لیا ہے۔ کتاب کی اشاعت سے پہلے اس کا جو انتخاب الناظر میں شایع ہوا ہے اس پر ابھی کوئی تبصرہ کرنا شاید قبل از وقت سمجھا جائے، مگر اس خیال سے کہ اسکے متعلق بعض مشورے اگر کوئی اہمیت رکھتے ہوں تو کتاب کی اشاعت سے پہلے انکی طرف توجہ اور انسداد بہر حال اشاعت کے بعد رسمی تنقید و تبصرہ سے زیادہ سودمند ہوگا۔

مصنفین اُردو کا کوئی تذکرہ ابتک مدوّن نہیں ہوا اور اس قسم کی تالیف مشکلات سے خالی نہیں۔ شعرائے اُردو کے تذکرہ میں بھی صرف دو تالیفیں دکھی جاتی ہیں۔ ایک تو آب حیات مولفہ شمس العلما محمد حسین آزاد، دوسری خمخانۂ جاوید مرتبۂ پنڈت سری رام منصف۔ آب حیات اپنی اولیت اور زیادہ تر طرز بیان کی دلفریبی کے سبب بہت زیادہ مقبول ہے۔ خمخانہ میں نے بالاستیعاب پڑھی نہیں، سرسری نظر میں مجھے یہ اُردو کے بیشمار موزوں گو اشخاص کی سائیکلو پیڈیا نہیں بلکہ ڈائرکٹری سی دکھائی دی۔ مولف نے دور اوّل سے مرزا غالب تک کے حالات میں جہاں تک مجھے یاد آتا ہے آب حیات ہی کو ماخذ قرار دیا ہے۔ تنہا صاحب نے بھی اُسی کی بنیاد پر اپنی عمارت کھڑی کی ہے۔ درحقیقت اس موضوع پر مواد کی کیابی کے باعث ایک اُردو تذکرہ نگار کو اس ہر دلعزیز پیش رَو سے استفادہ کرنا بہت حد تک ضروری ہے مگر

پنہاں ہے دام سخت قریب آشیانہ کے

سطور ذیل میں اسی خطرہ سے متنبہ کرنا مقصود ہے۔

پروفیسر آزاد کی قادرانہ انشا پردازی، اُسکی دلآویزی اور تاثیر مسلم اس سے بڑھ کر میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ انکا کلام نثر وزن شعری کے اعتبار سے ناموزوں ہونے کے باوجود اعلیٰ درجہ کی شاعری کیا، ساحری ہے۔ تحقیق کا اسم اعظم ہی اس سحر کو باطل کرتا ہے۔ انکی تصنیف یا تخیل کو تاریخی حقائق کی اہمیت دینا ایسا ہی ہے جیسے ہومر کی الیڈ اور مہابھارت یا الف لیلہ کے

بعض تاریخ نما افسانوں کو تاریخ قرار دینا پردازِ تخیّل اور شاعرانہ رنگ آمیزی کی گنجائش ہی کی رعایت سے تصانیفِ آزاد اسناد کے حوالوں سے آزاد ہیں۔ اگر آبِ حیات میں پانسو برس پیشتر کے شعرائے اُردو اور وقائع سے متعلق کتابوں کے حوالے نہیں دیے جا سکتے تھے تو روایتوں کے حوالے ضرور ممکن تھے۔ سخندانِ فارس میں ہر ایک تذکرہ اور واقعہ صرف کتابی سندوں پر مبنی ہونا چاہئے تھا مگر یہ تالیف بھی ایسے حوالوں کی رہینِ منت نہیں۔ بالخصوص ایسے مقامات میں جہاں پروفیسر نے اس قسم کے سنسنی پیدا کر دینے والے دعوے کیے ہیں، دلائل و شواہد کی ضرورت نہیں دیکھی :—

"ریگستانِ عرب سے ایک آندھی اُٹھی، اُسکے پیچھے گرجتا بادل بجلی چمکاتا تھا ........ خلاصہ یہ کہ ساسانی سلطنت کا اقبال شمشیرِ اسلام کی قربانی ہوگیا ......... عالیشان آتش خانے ڈھائے گئے۔ دینی و دنیاوی کتابیں ورق ورق اُڑیں اور جل کر خاک در خاک ہوگئیں۔ اُس وقت میں میرے پارسی بھائی وہاں سے بھاگے اور جانوں کے ساتھ ایمانوں کو بھی بچا لائے ....... تحقیق کی آنکھیں رو رہی ہیں اُس گئے وقت پر جو کسی طرح نہیں آسکتا .......... ان خانہ بربادوں کے ہاں بھی تاریخ، اخلاق، افسانے، نظم و نثر سب کچھ ہوں گے۔ کیا ان کی عبارتوں کا بھی یہی سیدھا سادہ بے تکلف رنگ تھا۔ افسوس افسوس آج اُس عہد کو کہاں سے لائیں اور جو کچھ فنا ہوگیا کیونکر پائیں کہ دوستوں کو دکھائیں اور کچھ فائدہ اُٹھائیں!"

اللہ اکبر! کس قدر درد انگیز و دل آویز نوحہ ہے جیسے پچھلے پہر کی کوئل کی کوک! لیکن

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ — جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا

واقعہ یہ ہے کہ ان مضامینِ مُبکیہ میں سے ایک کو بھی حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ سبحانک هذا بهتان عظيم! "پارسی علوم اور اسلام" کے عنوان سے ایک طویل الذیل مضمون جامعہ علیگڈھ میں فروری سے اپریل ۱۹۲۳ء تک مسلسل شائع کرکے ان بہتانات کی مدلل تردید کرچکا ہوں۔ پھر بھی اس سحر بیانی کی کس کس سحر آفرینی کا چارہ کیجئے۔ تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم؟

جہانگیر کے دامنِ شہرت پر آزاد کے قلم نے جو گلکاری کی ہے اُسکے دھونے کے لیے مولانا شبلی مرحوم کو ایک مستقل مضمون "جہانگیر اور تزکِ جہانگیری" لکھنا پڑا جس میں فرطِ ملال یا حقارت سے انکا نام نہیں

لیتے، بلکہ "ہندوستان کے سب سے بڑے انشاپرداز" کے لقب سے یاد کرتے ہیں، اور نیرنگ خیال سے انکی عبارت نقل کرکے فرماتے ہیں "آؤ دیکھیں اس جھوٹ میں کچھ سچ بھی ہے؟" پھر تو زک سے اسے سراسر جھوٹ ثابت کرتے ہیں[۱]۔

آزاد نے آبِ حیات میں جو زہر گھولا ہے اُس میں سے بعض اجزا کا تجزیہ بعض لائق کیمیا گروں نے کر دکھایا ہے۔ چنانچہ میر تقی پر خود پرستی، بد دماغی، بدگوئی کا طوفان باندھنے کے لیے آزاد نے خود میر صاحب کے لکھے ہوئے جس قلمی تذکرہ (نکات الشعرا) کی سند پیش کی ہے۔ بدقسمتی سے وہ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو ہاتھ آگیا۔ اور اس سے حقیقت برعکس ثابت ہوئی اور میر صاحب کی طرف جو نا ملائم کلمات منسوب کیے گئے تھے وہ بے اصل ہی نہیں، برعکس کامل پائے گئے[۲]۔ امیر خسرو کی پہیلیوں، مکرنیوں، دوہروں، اور دوسرے بولوں کے دل خوش کن لطائف کے سلسلہ میں چھوسا قن والے لطیفے اس لیے بے بنیاد ٹھہرے کہ خسرو کا زمانہ تمباکو سے قطعاً نا آشنا تھا۔ الغرض آزاد کی سندوں پر بھی بلاتحقیق و تصدیق اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ راسخ عظیم آبادی کا دیوان دیکھنے کا دعویٰ کیا گیا ہے، پھر راسخ کے بیسیوں مقطعوں میں میر سے تلمذ کے اعلان کے باوجود اُسے اپنے ہیرو مرزا سودا کا شاگرد بتایا جاتا ہے[۳]۔

روایاتِ آزاد کے ان عیوب سقط و شطن، تدلیس، وضع، کذب کے باوجود تنہا صاحب کا "تیسرے دور" کے تحت میں مولانا شبلی کے تذکرہ میں ضمناً یہ فرمانا کہ

"آزاد کی کتابیں تحقیق و تدقیق، درایت، جدت وغیرہ سے پر ہیں" ص۲۴

کہاں تک بجا ہو سکتا ہے؟ "جدت وغیرہ" تو مسلّم ہے، باقی ادعاات اہل نظر کی "تحقیق و تدقیق و درایت" کے محتاج ہیں۔

موجودہ حالت میں ہر سیرت نگارِ مصنفین اُردو کا فرض ہے کہ (۱) اپنی سیرت میں آزاد سے

---

[۱] ملاحظہ ہو مضمون مذکور مندرجہ مقالات شبلی۔ یہ مضمون علحدہ رسالہ کی حیثیت سے بھی شایع ہوا ہے۔ صفحہ ۱-۲

[۲] مخزن سلسلۂ قدیم۔ ضروری اقتباس ہم نے "راسخ عظیم آبادی" کی تمہید میں درج کیا ہے۔ الناظر اپریل ۱۹۱۶ء

حاشیہ ۲ ملاحظہ ہو۔ نکات الشعرا اب چھپ کر شایع بھی ہو گئی ہے۔

[۳] مضمون ایضاً صفحہ ۳-۴

استفادہ کرنے میں کامل احتیاط ملحوظ رکھے (۲) اپنی بے لاگ تحقیق و تلاش کے بعد جا بجا آزاد کی غلطیوں کے ازالہ کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ دے۔ (۳) جہاں آزاد کا موازنہ بہ حیثیت مصنف حالی شبلی وغیرہ سے کیا جائے وہاں انکی دونوں حیثیتیں علٰحدہ علٰحدہ نمایاں کی جائیں۔ ایک تو انشا پردازانہ دوسرے مورخانہ و محققانہ۔ ان دونوں مختلف حیثیتوں سے وہ جن جن صفوں کے لائق ٹھہریں اُن میں انکو موزوں کرسیاں دی جائیں۔

---

ایک گذارش اور ہے۔ اس تیسرے دَور کے تحت میں صفحہ ۶۴ (الناظر) میں تنہا صاحب مولانا شرر کی نسبت فرماتے ہیں:۔

"مگر تاریخی ناول فرضی افسانے ہیں، اور دو چار باتوں کے سوا قصہ کی تمام جزئیات تاریخ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتیں۔"

میری رائے میں شرر پر سب سے بڑا ظلم یہی ہے کہ اُنکے ناولوں کے متعلق اس قسم کا خیال عام ہے۔ یہ بھی مولانا کی اس فروگذاشت کا نتیجہ ہے کہ وہ صرف تاریخی ناولوں ہی میں نہیں بلکہ اپنے علمی و تاریخی مضامین و تصانیف میں بھی ماخذوں کے حوالے دینے کے عادی نہیں۔ حالانکہ اگر بامعان نظر دیکھا جائے تو اُنکے اکثر تاریخی ناولوں کی جزئیات یہاں تک کہ اکثر مناظر بھی بالکل تاریخی و واقعی ملیں گے۔ انکے ہیرو اور ہیروئن بھی زیادہ تر تاریخی و حقیقی افراد ہیں۔ افسانہ کی خاطر انکی رنگ آمیزی اتنی ہلکی ہوتی ہے جتنا آٹے میں نمک یا شربت میں چاشنی۔ شاید بعض ناول اس کلیہ سے مستثنٰی ہوں تو ہوں۔ البتہ تنہا صاحب کی یہ رائے حکیم محمد علی مرحوم کے تاریخی ناولوں پر پوری صادق آتی ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا میرا یہ استقراء اکثریت کی بنا پر ہے۔ اگر تنہا صاحب نے مولانا شرر کے بعض تاریخی ناولوں کو جانچ کر یہ رائے قائم کی ہے جب بھی اُنھیں اپنا قضیہ کُلّی سے جزئی میں منتقل کرنا پڑے گا۔

میری سمجھ میں مولانا شرر کے علمی کارنامے اُنھیں یہ استحقاق بھی بخشتے ہیں کہ انھیں صرف افسانہ نگاروں کی بزم میں حکیم محمد علی مرحوم اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کے بغل میں جگہ دے کر انکی اہانت نہ کی جائے، بلکہ مورخوں کی مجلس میں اُنھیں مولانا شبلی مرحوم کے پہلو میں بٹھایا جائے۔ اگر وہ تصانیف تاریخی کی تعداد، حجم اور زور بیان میں شبلی کو نہیں پہونچتے تو بعض دوسرے محاسن میں اُن سے

برتر رتبہ رکھتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس اجمال کی تفصیل ایک طویل داستان ہے جس کا نہ یہ موقع ہے نہ فرصت۔ بہتر ہوتا کہ تنہا صاحب سیر المصنفین کے کچھ اور اجزا یوں ہی الناظر میں شایع فرماکر کافی بحث و نظر اور مشورہ کا موقع اہل نظر کو دیتے۔ اور ان کی اس تالیف کے نظری مسائل حتی الامکان نکھر جاتے اور یہ تالیف اُردو کے حق میں ایک حقیقی کامیابی اور نعمت ہوتی۔ وکفا بہ فخرا۔

محمد مُسلم

# حکایات پنجاب

"ٹیلز آف دی پنجاب" کے نام سے ایک کتاب انگریزی میں شایع ہوئی تھی جس میں وہ کہانیاں جو عام طور پر پنجاب میں رائج ہونگی درج ہیں۔ اب میکملن اینڈ کمپنی لمیٹڈ (بوبازار کلکتہ) نے اس کا ترجمہ شایع کرایا ہے۔ قیمت عہ ہے۔ ترجمہ سید عبدالحق ایم اے پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور نے کیا اور مشن کالج لاہور کے پروفیسر لالہ مہرچند سیٹھی صاحب ایم ایس سی نے نظرثانی کے وقت اُس میں ترمیم فرمائی۔ اس اہتمام کے بعد یہ کتاب شایع ہوکر ریویو کے لیے آئی ہے۔ کہانیاں حسب معمول دلچسپ ہیں اور کتاب کی عبارت بھی بچوں کے لایق ہے مگر ہمیں اس میں تامل ہے کہ اس قسم کی کہانیاں جن میں خلاف فطرت واقعات درج ہوں اس زمانہ میں بچوں کو پڑھانا بھی چاہیے۔ اگر صرف دلچسپی کے لحاظ سے ان کی اشاعت کی گئی ہے تو اُردو میں بفضلہ تعالیٰ اسکی کمی نہیں۔ ایک طلسم ہوشربا کی داستان سے ایسی ایسی ہزاروں کہانیوں کی کتابیں تیار ہوسکتی ہیں۔ ایک محترم عزیز نے عرصہ ہوا طلسم ہوشربا کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کا خیال کیا تھا۔ اور اس میں شبہہ نہیں کہ اُس کا انگریزی ترجمہ کسی لائق ادیب کے قلم سے تیار ہوکر شایع ہو جائے تو انگلستان، امریکہ اور برطانوی آبادیات میں اسکی کثیر اشاعت کی توقع ہو سکتی ہے۔ میکملن کمپنی اور دوسری سرمایہ دار کمپنیوں کو اس طرف توجہ کرنا چاہیئے کہ اس سودے میں منفعت زیادہ ہے۔ غریب ہندوستانیوں کے بچوں کی تو پرورش ہی ایسی جہالت میں ہوتی ہے کہ وہ بچپن سے خلاف فطرت واقعات سننے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اب انکو مدرسوں میں بھی اگر اس قسم کی کتابوں سے دوچار ہونا پڑا تو جو کچھ دماغی ترقی موجودہ حالات میں ممکن ہے اُسکا بھی سدباب ہو جائیگا۔ ہمارے کالجوں کے لائق پروفیسر صاحبان اگر توجہ فرمائیں تو ہندوؤں اور مسلمانوں کی تاریخ کے ایسے بہت سے واقعات قصہ کے پیرایہ میں لکھے جائیں جنکا مطالعہ ہندو مسلمان بچوں میں اعلیٰ اخلاق پیدا کرنے میں معین ہو سکے کہ ساری تعلیم و تربیت کا یہی مقصد ہے۔

# مُسلم جوانمرد سے خطاب

اں بطریق اہل دل حق کی ہو جلوہ گستری
دوش خلیل سے ہٹا زلف بتانِ آذری

کھول خدا کے واسطے چشم حقیقت آشنا
بزم جہاں کی تا کجے سیر کرے گا سرسری

تو ہے خلیل آذری، شعلوں کو گلستاں بنا
تو ہے عصائے موسوی، توڑ دے سحر سامری

تیری نظر سے ہے نہاں مرتبہ اپنی ذات کا
دہر میں تو وہ جنس ہے جسکا خدا ہے مشتری

خُلق ترے رسولؐ کا، وجہِ قیام کائنات
صبر ترے حسینؓ کا تکملۂ پیمبری

اے کہ ترے دماغ پر لرزشِ پرتوِ صفا
اے کہ ترے ضمیر میں کاوشِ نور گستری

دیکھ تو دل کو کھول کر دفن ہے تیرے قلب میں
رازِ جمالِ مصطفیٰ، سرِّ جبینِ حیدری

یہ دلِ سرد تا کجا؟ اپنی سرشت کو تو دیکھ
تیری رگوں میں ہے نہاں برق گدازِ بوذری

چھوڑ یہ خامکاریاں تیشے سے کام لیکے دیکھ
خفتہ ہے قلبِ سنگ میں رقصِ شرارِ دلبری

پھر سے دلِ شکستہ میں پھونکدے ولولوں کی روح
پھینک گلیم خستگی، چھوڑ فسردہ خاطری

گردِ زوال میں دکھا رقص کواکبِ عروج
بخت سیاہ کو بنا آئینۂ قلندری

شانۂ جمال کے عوض زینتِ موئے حق بنے
شرع سے یوں سنوار دے زلفِ دراز کافری

سینۂ شر کو دے جلا پرتوِ نورِ امن سے
چہرۂ رہزنی پہ ڈال عکس جبینِ رہبری

آتشِ دل کو تیز کر، سوز دروں سے نے ہوا
موج نسیم میں بدل "بادِ سموم خودسری"

خاک بسر ہے آج کیوں، یاد کر اپنی رفعتیں
کل ترے نقشِ پا میں تھی شانِ کلاہ قیصری

آج یہ تجھکو کیا ہوا، کل ترے رخ کے روبرو
زنگ تھی شکلِ آئینہ آبروئے سکندری

منزلِ ماہ و مہر تھی کل تری محفلِ شباب
ماند ہیں آج کیوں ترے نقش و نگارِ دلبری

بزم کا رنگ دیکھ کر سازِ عمل کو یوں ملا
نغموں کو تیرے تال دے گردشِ چرخ چنبری

مسلمِ خفتہ دیکھ تو، سینۂ ذوالفقار میں
کب سے ہے محوِ خواب ناز روحِ جلالِ حیدری

تیغ زن و رجز سرا، عرصۂ جنگ میں درا
طبل و غا سے پھر جگا زمزمۂ دلاوری!

خاک پہ دیکھ گر نہ جائے جوش کے دل کا ہے لہو
نظم نہیں یہ درس ہے، پڑھ نہ لیجیے تو سرسری

# "دل"

کیا کہوں کس لیئے فریاد و فغاں کرتا ہوں          اہل عالم پہ عیاں سوز نہاں کرتا ہوں
حال پوشیدہ جو ہے اُسکو عیاں کرتا ہوں          سب جگر تھام لیں میں دل کا بیاں کرتا ہوں
لوگ سن سُن کے تڑپ اُٹھیں وہ تاثیر بھی ہے
نظم بھی ہے۔ دل پر درد کی تصویر بھی ہے

---

پارۂ گوشت ہے۔ پہلو میں جگہ تیری ہے          شکل و صورت کا یہ انداز کہ مخروطی ہے
ظرف کا حال کہوں کیا کہ بہت عالی ہے          ٹوٹ جانے پہ بھی دلکش ہی صدا آتی ہے
باعثِ زیست ہے کمبخت و دھڑکنا تیرا
مرغ بسمل کا پھڑکنا ہے۔ پھڑکنا تیرا
کبھی پیمانہ ہے اے دل کبھی ساغر تو ہے          تو کبھی موم ہے اے دل۔ کبھی پتھر تو ہے
نورِ عرفاں کی تجلی کا مگر در تو ہے          تن بدن پھونک جو دیتا ہے وہی گھر تو ہے
سب سمجھتے ہیں حرم بھی تجھے۔ بتخانہ بھی
کبھی آباد بھی تو ہے۔ کبھی ویرانہ بھی
کیا کہے کوئی کہ سب کہتے ہیں کیا کیا تجھکو          کوئی کہتا ہے کلی اور کوئی غنچہ تجھکو
دیکھنے والے سمجھتے ہیں تماشا تجھکو          داغِ الفت نے بنایا گلِ لالہ تجھکو
لوگ کہتے ہیں کہ کیا خوب بہار آئی ہے
جس کو دیکھو تری حسرت کا تماشائی ہے
کیا کہوں اے مرے دل تجھسے کہ کیا کیا تو ہے          شیشہ کہتے ہیں تجھے آئینہ سیما تو ہے
حُسن والوں کے لیے ایک کھلونا تو ہے          سامنے آٹھ پہر ہے وہ تماشا تو ہے
تجھسے ظاہر ہوئی ہر ایک کی رعنائی بھی

تو ہی کمبخت بنا باعثِ رسوائی بھی

تو جو صد چاک ہوا۔ شانہ کی صورت پائی    زلف جاناں ہوئی سو جاں سے تری شیدائی
سر چڑھایا تجھے اُس بُت نے بصد رعنائی    تیرے ہوتے ہوئے اغیار نے منہ کی کھائی
تو نے اپنے کو مٹایا تو ترا نام ہوا
ابتدا کیا تھی مگر دیکھ یہ انجام ہوا

مجھ کو تسلیم ہے اے دل تری غمخواری بھی    اور ہنگام مصیبت کی وفاداری بھی
اپنے بیگانے کی بے وجہ وہ بیزاری بھی    مئے الفت سے مگر وہ تری سرشاری بھی
رازداں ہو کے مرے راز کو افشا نہ کیا
تو نے سب کچھ کیا اے دل مرے کیا کیا نہ کیا

صاف ظاہر ہے کہ کوئی تجھے آزار بھی ہے    کہتے ہیں سب مرضِ عشق کا بیمار بھی ہے
کام کا بھی ہے مگر ساتھ ہی بیکار بھی ہے    ہے قوی بھی تو بہت اور بہت زار بھی ہے
کتنے غم تجھ میں ہیں میں کیا کہوں وسعت تیری
پھر بھی مایوس نہیں واہ ری ہمت تیری

لوگ ناداں جسے کہتے ہیں وہ عاقل تو ہے    جس سے آسان ہو مشکل وہی مشکل تو ہے
جس نے بسمل کیا قاتل کو وہ بسمل تو ہے    زندگی کا ہے سبب کون؟ مرے دل تو ہے
سوز تھا پہلے سراپا مگر اب ساز ہے تو
اسکو کچھ میں ہی سمجھتا ہوں عجب راز ہے تو

میرے دل کیا کہوں بُرجِ مہِ عرفاں تو ہے    خانۂ دیں ہے تو ہی خانۂ ایماں تو ہے
گھر ہے اللہ کا منزل گہِ یزداں تو ہے    جس نے حیرت میں پھنسایا ہے وہ ساماں تو ہے
تو طپاں بھی ہے مگر جلوہ گہِ نور بھی ہے
برق بھی اے دل باسط ہے تو ہی طور بھی ہے

باسط۔ بسوانی

# سفر حجاز کی مختصر روداد

## چھٹی منزل

علی الصباح جو آنکھ کھلی تو ہوائے سرد چل رہی تھی۔ گویا بارگاہ رحمۃ للعالمین کی طرف سے زائرین مدینۂ منورہ کو خوش آمدید کہنے کے لئے نسیم سحر مقرر ہوئی تھی۔ جیسے جیسے اُجالا ہوتا جاتا تھا، گنبد خضراء کے نظارہ کی امیدیں مبدل بہ اشتیاق ہوتی جاتی تھیں۔ آہ وہ انتظار کہ اُس گھڑی کا سماں دکھانا اور اس کا نقشہ کھینچنا امکان میں نہیں ہے جب ہر چند ساعت کے بعد زیارت روضہ اطہر کی تمنا میں آنکھیں بار بار حد نظر کی طرف دوڑائی جاتیں اور پھر اس خیال سے دل بیتاب کو تسلی دی جاتی کہ ابھی فاصلہ بہت ہے۔ یہاں تک کہ آفتاب نکل آیا۔ آفتاب ہر روز نکلتا تھا اور نہایت آب و تاب سے چمکتا تھا۔ مگر اُسکی نمود کا جیسا انتظار آج کیا گیا اور اُسکی روشنی کا جس طرح آج استقبال کیا گیا یہ بالکل نئی بات تھی۔ اب ہر اُس شے پر جو دور سے نظر کے مقابل آجاتی گمان ہونے لگتا کہ گوہر مراد یہی ہے اور جب وہ شے قریب آجاتی اور معلوم ہوتا کہ کوئی درخت، ٹیکری یا پتھروں کا ڈھیر ہے تو مایوس نہ ہونے والی آنکھیں پھر کسی دوسری شے پر نگاہِ اُمید جما دیتیں۔ تقریباً ایک گھنٹہ اسی حالت میں گذر گیا۔ بالآخر دور سے مسجد شریف کے میناروں کی زیارت نصیب ہوئی۔ اور میں شغدف سے کود کر درود شریف اور دیگر ادعیہ پڑھتا ہوا پا برہنہ شغدف کے قریب قریب گر گنبد خضراء کی تمنائے زیارت میں سامنے کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے چلتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد یہ دیرینہ آرزو بھی پوری ہوگئی میں نے توقف کر کے ضروری دعائیں پڑھیں اور پھر روانہ ہوا۔ مکہ معظمہ کے قریب جس قسم کی پہاڑیاں ہیں بعینہ ویسا ہی پُرپیچ و خم یہ بقیہ راستہ نظر آیا کہ ہر موڑ کے بعد خیال ہوتا تھا کہ اب مدینۃ الرسول کی زیارت نصیب ہوگی۔ ایک گھنٹہ یا اس سے کچھ کم عرصہ تک چلنے کے بعد جب ایک مقام پر ریل کی پٹری عبور کی تو معلوم ہوا کہ اب منزل مقصود بالکل قریب ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد باغیچوں اور اُجڑی ہوئی عمارتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اور کہیں کہیں عبا پوش انسان بھی ملنے لگے۔ آگے بڑھے تو ان عبا پوش اصحاب کا ایک معقول مجمع نظر آیا۔ جنھوں نے نہایت خندہ پیشانی

اور خوش خُلقی سے استقبال کیا۔ معلوم ہوا کہ یہ سب مزوروں کے کارکن ہیں۔ سلام و مصافحہ کے بعد اپنے مزور صاحب کو دریافت کیا تو ایک صاحب نے اپنے تئیں اُن کا کارندہ بتایا۔ دوپہر کے قریب مدینہ منورہ کی فصیل سے ملحق ایک میدان میں جسکو مناخہ کہتے ہیں شغدف اُتارا گیا۔ اور مجھے یہ معلوم ہو کر افسوس ہوا کہ میر عبدالعزیز صاحب اور ہمارے دوسرے ساتھیوں کے اونٹ ہمراہ نہیں ہیں۔ پہلے تو کچھ دور تک میں نے اُنکو تلاش کیا مگر جب اُن کا پتہ نہ چلا تو میں نے اپنا شغدف مع سامان کے وہیں جمال کے پاس چھوڑا۔ اور اُن صاحب کے ہمراہ مولوی عبدالباقی صاحب فرنگی محلی سے جا کر ملا۔ جنھوں نے نہایت شفقت و کرم سے میرا استقبال کیا۔ اور مجھے اور میرے ساتھیوں کو اپنے مکان میں ٹھہرانے کا وعدہ فرمایا۔ مناخہ واپس آکر اپنا سامان اُٹھوا لایا۔ اور غسل کر کے مسجد نبوی میں حاضر ہوا۔ نماز ظہر کا وقت تھا اس لیے پہلے نماز ادا کی پھر روضۂ اقدس پر حاضری سے مشرف ہوا۔ الحمد للہ علیٰ احسانہ۔ اس وقت کی شادمانی و انبساط کا بیان ناممکن ہے۔ میں اپنی خوش بختی پر باغ باغ تھا اور رویاں رویاں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے اس لطفِ عمیم پر شکر گزار کہ مجھ جیسے فاسق و فاجر کو دربارِ رسالت میں جبہ سائی کا افتخار بخشا گیا۔

حضورؐ کا روضۂ اطہر مسجد نبوی کے اندر شمالی و مشرقی کونے پر واقع ہے۔ نماز کے بعد مزور صاحب کے عامل نے مجھے اور دیگر زائرین کو پہلے کچھ فاصلہ پر قبلہ رُخ کھڑا کیا اور ایک دعا پڑھی۔ سب لوگ اُس کی تکرار آہستہ یا باآواز کہتے رہے۔ بعد ازاں رُخ بدل کر روضۂ اطہر کی جانب متوجہ ہوئے اور بارگاہ والا میں سلام پڑھا۔ سلام پڑھکر روضۂ اطہر کی جالی کے قریب حاضر ہوئے جس میں تین گول سوراخ اس انداز سے رکھے گئے ہیں کہ روضۂ اطہر کے غلاف پر جہاں سنہرے حروف میں حضور انورؐ کا اسمِ گرامی منقوش ہے ایک سوراخ اس مقام کے مقابل ہے اور بقیہ دو سوراخ ذرا ہٹ کر حضرات شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اسمائے گرامی کے مقابل واقع ہیں۔ اکثر لوگ ان سوراخوں کے اندر ہاتھ ڈال کر مصافحہ کرتے ہیں۔ اسوقت ہجوم بہت تھا۔ کیونکہ قافلہ کی تمام ٹکریاں اپنے اپنے مزورین کے ہمراہ سلام خوانی و زیارت کے لیے جمع تھیں۔ آستانۂ عالی پر صرف چند ساعت کے لیے قیام ہو سکتا تھا۔ لہذا جلدی جلدی لوگوں نے مصافحہ کیا۔ درود و سلام پڑھا۔ دعائیں مانگیں اور گھوم کر شمالی جانب گئے جہاں دیوار پر ایک روشندان ہے جس کی راہ سے بتایا گیا کہ جبرئیل امین علیہ السلام

حجرۂ عائشہؓ یا مسجد نبوی میں حاضر ہو کر وحی سناتے تھے۔ یہاں بھی ایک دعا پڑھوائی گئی۔ پھر پائین روضۂ مبارک کی طرف بڑھے اور ایک دوسری جالی کے قریب کھڑے ہو کر جسکے اندر جگر گوشۂ رسولؐ حضرت فاطمۂ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مزار بتایا گیا، سلام پڑھا۔ حضرت فاطمۂ زہراؓ کی جائے دفن کے متعلق ارباب سیر میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ جنۃ البقیع میں قبۂ اہلبیت کے نیچے آپ دفن کی گئیں تھیں اور بعض کے نزدیک حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے پائین روضہ آپ دفن ہوئیں۔ اس اختلاف کا یہ نتیجہ ہے کہ دونوں جگہ آپ کے نشانات مزار بنے ہوئے ہیں جہاں زائرین حاضر ہو کر نذر عقیدت پیش کرتے ہیں۔ صحن مسجد میں حضرت فاطمہؓ کی کیاری بنی ہوئی ہے اور اُسی سے ملحق ایک کنواں ہے جسکے پانی کو آب کوثر کا لقب ملا ہے۔

مزور صاحب کے عامل سید زین العابدین نے ہم لوگوں کو ہدایت کی تھی کہ عشا کے سوا جملہ نمازوں کے بعد وہ یا اُنکا کوئی مددگار روضۂ اطہر کے قریب سلام پڑھوانے کے لیے موجود رہے گا۔ اس لیے سب لوگ نماز پڑھ کر یکجا ہو جاتے اور سلام پڑھتے۔ مجھے لکھنؤ سے روانگی کے وقت ہدایت ہوئی تھی کہ روضۂ اطہر کے قرب میں مودب رہوں اور با آواز بلند صلوٰۃ وسلام نہ پڑھوں، مگر جو طریقہ یہاں رائج ہے وہ اسکے بالکل منافی تھا۔ بلکہ نماز کے بعد جب زائرین کی مختلف ٹکڑیاں جمع ہوتی تھیں تو اُن کے صلوٰۃ وسلام سے مسجد گونج اُٹھتی تھی۔ بہرحال میں حتی المقدور اہتمام کے ساتھ اس ہدایت پر عمل کرتا رہا۔ البتہ ہجوم کی وجہ سے مجھے کسی قدر وحشت ہوتی تھی اور میں قافلہ کی واپسی کا بیصبری سے انتظار کر رہا تھا کہ سکون کے ساتھ روضۂ اطہر پر حاضری سے سعادت اندوز ہو سکوں۔ عصر کے بعد پھر مناخہ گیا۔ میر عبد العزیز صاحب معہ دیگر ہمراہیوں کے اُسی وقت پہونچے اور اپنا سامان وغیرہ دیکھ بھال رہے تھے۔ میں سب کو ہمراہ لے آیا۔ اور نماز مغرب کے بعد مولوی سید احمد صاحب ایجنٹ علی جان کمپنی سے ملا اور حوالہ کا کاغذ دکھا کر روپیہ لیا۔

دوسرے روز جنۃ البقیع میں حاضر ہو کر سب ہمراہیوں کے ساتھ بزرگوں کے مزارات پر فاتحہ پڑھا۔
تیسرے دن سب ساتھیوں نے طے کیا تھا کہ سید زین العابدین کی معیت میں جبل احد پر جا کر سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مزار مبارک پر فاتحہ پڑھیں گے مگر میں نہ جا سکا۔ ساتھیوں کی واپسی سے قبل میں ڈاکخانہ گیا اور وہاں سے خطوط لایا۔ اور چونکہ یہ معلوم ہوا تھا کہ اُسی روز ڈاک

جانے والی ہے اس لیے جلدی جلدی وطن کے خطوط لکھے اور عصر سے پہلے پوستہ (ڈاک خانہ) کے حوالہ کیے۔ منگل کو قافلہ پہونچا اور سنیچر کو واپسی کی اطلاع دی گئی تھی۔ میں چونکہ پہلے ہی سے یہ سوچ کر آیا تھا کہ اس قافلہ کا ساتھ چھوڑ دوں گا اور مدینہ منورہ میں اُس وقت تک حاضر رہوں گا کہ حج کے لیے وہاں سے آخری قافلہ روانہ ہو۔ اس لیے بے فکر تھا۔ مگر احباب اور ساتھیوں کو واپس جانا تھا اس لیے وہ لوگ جلد جلد زیارتوں سے فراغت کرکے تبرکات اور سفر کے لیے اشیاء خوردنی وغیرہ کی خریداری میں مصروف تھے۔ جمعہ کو بعد نماز مغرب جنۃ البقیع میں فاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہوا۔ عم مکرم منشی اطہر علی صاحب مرحوم و مغفور کی قبر یہیں ہے۔ پہلی بار چونکہ نشان دریافت نہیں کیا تھا اس لیے باوجود تلاش نہ ملی۔ اب کی مولوی عبد الباقی صاحب سے پوچھ کر آیا تو مل گئی قبۂ اہلبیت کے بالکل پشت پر واقع ہے۔ وہاں فاتحہ پڑھ کر کچھ دیر قبر کو دیکھتا رہا۔ قبر کی مرمت اور کتبہ میں سیاہی بھرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پہلے چاہا کہ میں خود اس کا انتظام کر دوں پھر یہ سوچ کر رُک گیا کہ مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے عزیز از جان انور علی سلمہٗ بھی بعد ادائے حج یہاں پہونچیں گے اس خدمت کے وہی زیادہ مستحق ہیں۔

قافلہ کی واپسی کا وقت قریب آیا تو ہمارے مقوم، ترجمان اور جمال سب کی خواہش پر میں نے ایک تحریر اپنے معلم کے نام اس مضمون کی لکھ دی کہ ان اصحاب کے طرز عمل سے شاکی ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ میں نے برضا و رغبت اپنا اونٹ چھوڑ دیا ہے اور شغدف رکھ لیا ہے جو بعد واپسی مکہ معظمہ میں داخل کر دیا جائے گا۔ تمام ساتھی صبح کو مناخہ روانہ ہو گئے تھے میں بعد عصر وہاں اس اس غرض سے گیا کہ قافلہ روانہ ہو گیا ہوگا اپنا شغدف مکان پر اُٹھوا لاؤں۔ مگر شغدف نہ ملا جس کی اطلاع سید زین العابدین کو کر دی۔ اُنھوں نے اطمینان دلایا کہ شغدف مل جائے گا۔

جب تک قافلہ اور ہمراہی موجود رہے مسجد نبوی میں ہجوم کی وجہ سے اطمینان کی حاضری نہ ہو سکی اور ہمراہیوں کی وجہ سے مدینہ منورہ کے مقیم اصحاب میں سے سوا مولوی سید احمد صاحب اور حافظ شہراتی صاحب کے کسی سے نہ مل سکا۔ مولوی صاحب تو گویا زائرین کے لیے بمنزلہ بنک کے ہیں اس لیے اُن سے ملے بغیر چارہ نہ تھا۔ حافظ صاحب قدیم تعلقات کی بنا پر پہلے ہی روز آکے ملے اور وہ ملتے رہتے۔

قافلہ جا چکا تو حافظ شبراتی صاحب کی وساطت سے مولوی ضیاء الدین سیالکوٹی سے نیاز حاصل ہوا جو مسجد نبوی کے قریب ہی ایک رباط میں مقیم ہیں۔ رباط سے مراد وہ موقوفہ مکانات ہیں جو صاحبان خیر کی طرف سے مساکین، مسافرین اور درویشوں کے لیے بنا دیے گئے ہیں۔ مولوی ضیاء الدین صاحب ایک نوعمر بزرگ ہیں جو وطن سے ہجرت کر کے یہاں مقیم ہیں۔ ہندوستان کے حالات سے آپ کی دلچسپی کم نہیں ہوئی ہے اور اخبارات وغیرہ کے ذریعہ سے جملہ ممالک اسلامیہ کے حالات سے آپ باخبر ہیں اس لیے آپ سے مل کر میں بہت محظوظ ہوا۔ دوسرے روز مولوی عبدالباقی صاحب کے ہمراہ حضرت شیخ احمد شمس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت شیخ کی عظمت و بزرگی بہت مشہور ہے۔ مدینہ منورہ میں آپ سے زائد کسی شخص کی عظمت نہیں کی جاتی حتیٰ کہ عہد ترکیہ سے والی مدینہ کے سوا صرف آپ ہی کو اس بات کا شرف حاصل ہے کہ حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر کی جالی کھلوا کر روضۂ اطہر کے قریب حاضر ہو سکتے ہیں۔ تمام عرب اور بدوی قبائل آپ کا اس درجہ احترام کرتے ہیں کہ جب آپ اپنے مختصر قافلہ کے ساتھ حج کرنے کے لیے روانہ ہوتے ہیں تو راہ میں کسی قسم کا اندیشہ نہیں ہوتا بلکہ آپ کا قافلہ پانچوں وقت نماز باجماعت ادا کرنے کے لیے راہ میں ٹھہرتا ہے۔ نیز یہ کہ عام راستوں کے علاوہ آپ کا قافلہ جس راستہ سے جانا چاہے جاتا ہے۔

حضرت شمس مغربی الاصل ہیں اور شاذلی (قادری) سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کی عمر اسّی برس کے قریب ہوگی اور ضعف اتنا ہو گیا ہے کہ آپ کا مکان اگرچہ مسجد نبوی سے کچھ زیادہ فاصلہ پر نہیں ہے مگر سوائے جمعہ کے آپ عام طور پر کسی روز مسجد نبوی میں حاضر نہیں ہوتے۔ مجھے آپ کی زیارت کا بھی اشتیاق تھا، اور چونکہ آپ کی ہمرکابی میں مکہ معظمہ واپس جانا چاہتا تھا اس لیے اسکی اجازت بھی حاصل کرنا تھی۔

میں ہندوستان میں بھی بعض بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں مگر حضرت شمس کے حسن اخلاق سے بہت متاثر ہوا۔ آپ مکان کے اندر تشریف رکھتے تھے۔ صدر دروازہ پر اطلاع کرنے کے بعد ایک خادمہ نے ہم لوگوں کو اندر لیجا کر مجلس میں بٹھایا اور کہا کہ شیخ تشریف لاتے ہیں۔ چند لمحوں میں شیخ تشریف لائے تو چلتے نہایت تپاک سے مصافحہ فرمایا اور مزاج پرسی فرمائی۔ اسکے بعد ایک چھینکہ پر سے کھجوریں آ رہے اور باصرار کھلائے گئے۔ پھر چاء پلائی گئی۔ اور جب اثنائے گفتگو میں مولوی

عبد الباقی صاحب نے میرا تعارف کرایا تو یہ سُن کر بہت مسرت کا اظہار فرمایا کہ میں حضرت محمدؐ بن حنفیہ کی اولاد میں سے ہوں۔ اور میری اس درخواست پر کہ مجھے ہمرکابی کی عزت بخشی جائے نہ صرف بخوشی اسے منظور فرمایا بلکہ وعدہ فرمایا کہ جب قصدِ روانگی ہوگا تو آپ کو اطلاع دیدی جائیگی۔ حضرت شیخ کے نصف چہرہ پر ایک سفید رومال پڑا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے آپ کی گفتگو جو یوں ہی آہستہ ہوتی ہے بمشکل سمجھ میں آتی ہے۔ اثنائے گفتگو میں میں نے عرض کیا کہ آپ میری ہندوستانی نہیں سمجھتے اور میں آپ کی عربی نہیں سمجھتا البتہ لسانِ قلب سے اگر گفتگو ہو تو یہ دشواری رفع ہو جائے۔ اس جملہ سے بہت محظوظ ہوئے اور دیر تک مختلف امور کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ رخصت حاصل کرتے وقت میں نے پھر حاضری کی اجازت چاہی اور اندیشہ ظاہر کیا کہ اوقات میں ہرج ہوگا تو بڑی خندہ پیشانی سے فرمایا کہ نہیں جب جی چاہے بے تکلف آؤ۔ چنانچہ اسکے بعد ایک بار تنہا اور ایکبار مولوی ضیاء الدین صاحب کے ہمراہ حاضری کی نوبت آئی اور ہر دفعہ نہایت اخلاق سے پیش آئے۔ چلتے وقت دروازہ تک پہونچانے آتے۔

میرے ساتھی میر عبد العزیز صاحب قنوج میں عطر کا بیوپار کرتے ہیں۔ وہ بہت سی شیشیاں اپنے ہمراہ لائے تھے اور چلتے وقت میرے سپرد کر گئے تھے کہ کچھ روضۂ اطہر پر اور مسجد نبوی میں خاص خاص مقامات پر صرف کی جائیں اور بقیہ تقسیم کر دی جائیں۔ میں نے اُنکی جانب سے جہاں اور بزرگوں کو دیں وہاں دو شیشیاں حضرت شمس کی خدمت میں بھی پیش کیں۔ خوش ہو کر قبول فرمائیں اور دیر تک مجھے اور میر صاحب کو دعائیں دیتے رہے۔

قافلہ کی روانگی کے بعد مسجد نبوی میں ہجوم کم ہو گیا۔ صرف نماز کے اوقات میں مجمع ہو جاتا تھا۔ اس لیے مجھ کو اب اطمینان سے نماز کے بعد ٹھہر کر تلاوت کرنے اور درود شریف پڑھنے کا موقعہ ملا۔ نیز سید زین العابدین کی وساطت سے خوجوں کے سردار سے اس بات کی بھی اجازت حاصل ہو گئی کہ رات کو بھی مسجد نبوی میں حاضر رہ سکوں۔ نماز عشاء کے بعد ہی حرم نبوی کے دروازے بند کر لیے جاتے ہیں اور جن چند آدمیوں کو رات کی حاضری کی اجازت ہوتی ہے اُنکے سوا کوئی رہنے نہیں پاتا۔ ایسے تمام لوگ سنگین کٹہرے کے نیچے جمع ہو جاتے ہیں جو منبر شریف سے تھوڑے فاصلہ پر قدِ آدم بلند بنا ہوا ہے۔ ہمارے قافلہ میں جنوبی افریکہ کے ایک میمن تاجر بھی تھے جنھوں نے زرِ کثیر صرف کر کے اپنے اور اپنے

ساتھیوں کے اونٹ مدینہ منورہ میں روک لیے تھے - انھیں میں حکیم محمد قاسم سورتی بھی تھے جنھوں نے ازراہِ ہمدردی اسلامی ترآہ میں رحمت شاہ کا علاج کیا تھا - اور اس سلسلہ میں مجھے انکی خدمت میں نیاز حاصل ہوگیا تھا - شب دو شنبہ کو جب میں نے پہلی بار حرم نبوی میں حاضری شبانہ کا ارادہ کیا اور نماز عشا کے بعد حسب ہدایت منبر کے نیچے جا کر بیٹھ گیا تو وہ سیٹھ مع حکیم صاحب اور چند دیگر رفقا کے وہیں نظر آئے - انکے علاوہ ایک بدوی عرب بھی تھا - غرضکہ ہم سب نصف درجن آدمی تھے - مسجد نبوی کے دروازے بند ہوگئے تو ایک خوجہ صاحب نے مجھے اپنے ہمراہ لیجا کر حرم شریف کے مغربی دروازہ سے متصل وضوخانہ اور استنجے خانہ دکھایا - اس اثنا میں اکثر جگہ سے روشنی رخصت ہوگئی تھی صرف کہیں کہیں ایک ایک بتی رہ گئی تھی - روضۂ مطہر کے اندر بھی صرف چند ہی بتیاں رہ گئیں - تھوڑی دیر کے بعد سب خوجے بھی چلے گئے - جن میں سے بعض صحن مسجد میں بستر بچھا کر لیٹ رہے - صرف دو ایک مشغول عبادت تھے رہ گئے - اب حرم نبوی میں کامل سکون ہوگیا - جس کے ہم غلامان رسول مشتاق تھے اور ہم میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے خیال کے مطابق بارگاہ رسالت پناہی کے قریب کوئی گوشہ منتخب کر لیا - کہ یہی ہماری کامرانیوں اور دلی مرادوں کا مقام عروج تھا - دوسروں کا حال مجھے کیا معلوم مگر میں اپنے متعلق کہہ سکتا ہوں کہ زندگی کی وہ تمام ساعتیں جو کسی قسم کی مسرت و انبساط میں گذری ہوں اس رات کے مقابلہ میں بے تکلف قربان کر دی جا سکتی تھیں - اور میں حیران تھا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا کیسے شکریہ ادا کروں کہ مجھ جیسے فاسق و فاجر کو بارگاہ رسالت پناہی میں یہ سرافرازی نصیب ہوئی -

شب کا حصۂ وافر اسی عالم سکون میں بسر ہوا - اور غلس کے وقت حرم نبوی کا دروازہ کھلتے ہی جب نمازیوں کی آمد شروع ہوگئی تو میں بائیں جانب کے دالان میں جا کر تھوڑے وقفہ کے لیے لیٹ رہا - اور نماز فجر ادا کر کے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتا ہوا اپنے مقام پر واپس آیا -

روداد سفر میرے اندازہ سے کہیں زیادہ پھیلی - لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم - اور درمیان میں کبھی میری عدیم الفرصتی کے باعث اور زیادہ تر اوراق الناظر میں گنجایش نکلنے کے سبب سے شایع بھی نہ ہوئی - خدا کی مرضی ہے تو اب ماہ بماہ کچھ صفحے ضرور درج ہونگے تاکہ سنہ ۲۵ء کی پہلی ششماہی میں حتی الامکان ختم ہوسکے - ظفر الملک

خدا کا شکر ہے کہ سال کا آخری پرچہ ختم سال سے پہلے ہی شایع ہو رہا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے تو سیح کے اجرا کی وجہ سے میری ذمہ داریوں میں کافی اضافہ ہو جانے کے باوجود آیندہ سال النّاظر کی اشاعت میں یہ بدنظمی نہ ہونے پائے گی۔ کم سے کم سال رواں میں میری طبیعت پر جو افسردگی ناموافق اسباب اور طرح طرح کی پیچیدگیوں کے رونما ہونے کے باعث کارفرما رہی اُس کا اثر بحمداللہ کہ احباب کی ہمت افزائی نیز امتدادِ زمانہ سے بہت کچھ زائل ہو گیا ہے اور اس بنا پر جہاں تک کہ میری ناچیز کوشش کا تعلق ہے اُمید ہے کہ اُس میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی۔ واللہ المستعان۔

---

ہردوئی کے صادق حسین صاحب کے متعلق اُنکی تحریر کے بعض جملوں کی وجہ سے خیال ہوا تھا کہ اُنھوں نے مزاحًا اپنے تئیں فلسفہ کا گریجوئٹ ظاہر کیا۔ اب جبھی سلطان حیدر صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ وہ واقعی فلسفہ کے گریجوئٹ ہیں۔ اگر یہ دوسری تحریر مذاق سے نہیں لکھی گئی تو صادق حسین صاحب کی خوش مذاقی قابلِ رشک ہے۔

---

عزیز صاحب کو تسلیم ہے کہ "دل کی بستی تمام لوٹ گئی" میں پورا محاورہ نہیں بندھا اور اُن سے فروگذاشت ہوگئی۔ سید اظہر علی صاحب آزاد کے جو فارسی اشعار گذشتہ نمبر میں صفحہ ۲۰ پر شایع ہوئے تھے اُنکو پڑھکر ایک مخلص نے توجہ دلائی ہے کہ آخری شعر میں "رفت" کی "ت" گر گئی ہے۔ آزاد صاحب کیا فرماتے ہیں؟

---

انجمن اُردو کے شعبہ تصنیف و تالیف کا نظام کار مولوی بدل الرحمٰن صاحب ناظم شعبہ کے باہر چلے جانے کی وجہ سے اس دفعہ فراہم نہ ہوا۔ آیندہ دیکھا جائیگا۔ اب انجمن کا سال تمام ہونے پر ہے اور جنوری میں اس کا سالانہ جلسہ ہوگا۔ اس موقع پر یہ تجویز ہوئی ہے کہ جلسہ کے ساتھ ایک نمایش کی جائے جس میں اُردو کی نادر قلمی کتابیں اساتذہ و مصنفین کے مسودات اور مرقعے، خطاطی اور صحافت کے نمونے اور ۱۹۲۴ء کی جدید مطبوعات وغیرہ فراہم کی جائیں۔ اگرچہ وقت تنگ ہے تاہم امید ہے کہ ابتدا کرنے کے لیے کافی سامان لکھنؤ میں اور خاص خاص مقامات سے فراہم ہو جائے گا۔ جو احباب ۱۹۲۴ء کے مطبوعات یا نمایش کے متعلق اور کوئی چیز بھیجنا چاہیں ۲۰ جنوری سے قبل ارسال فرمائیں۔ بحفاظت واپسی کا میں ذمہ دار ہوں۔ نمایش کے متعلق انتظامات کے لیے انجمن نے جو مجلس قائم کی ہے اُسکے معتمدین مسٹر مسعود الحسن رضوی ایم اے لکچرار اردو یونیورسٹی اور شیخ ممتاز حسین صاحب جونپوری مقرر ہوئے ہیں۔ ۲۲ - دسمبر ۱۹۲۴ء

---

عزیز مکرم جناب منشی امیر احمد علوی کا مضمون جو گوتم بودھ پر بہت طولانی تھا اس لیے اُسکو کتابی صورت میں شایع کرنا مناسب معلوم ہوا۔ احباب اوراق جمع کر لیں۔

(حقوق محفوظ)

# گوتم بودھ

سری کرشن کی وفات کو مدتیں گذریں - بھگوت گیتا کی تعلیم فراموش ہوگئی - مہابھارت کی لڑائی قصہ کہانی بن گئی - ہندوستان کی شاہنشاہی جسکے لیے دریودھن اور راجہ جودھشٹر نے اٹھارہ چھاؤنی فوج آٹھ دن میں کٹوادی نہ فاتح کے پاس ہے نہ مفتوح کے قبضہ میں - شمالی ہند سولہ سلطنتوں میں تقسیم ہے جنکے علاوہ چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستیں بھی بہت ہیں - جنوب میں ڈراوڈن قوم کی جداگانہ حکومتیں قائم ہیں - مغربی سرحد پر کیانیوں کا اختر اقبال ترقی پہ ہے پنجاب کو مملکتِ فارس کا ایک صوبہ بنانے کے خواب دیکھے جاتے ہیں - بابل میں بخت نصر کا جاہ و جلال نقطۂ نصف النہار پر ہے - یروشلم تباہ ہوچکا اور شوکت سلیمانی کے وارث اپنی مٹی ہوئی عظمت پر آنسو بہا رہے ہیں - فراعنۂ مصر جو کسی وقت خدائی کے دعویدار تھے فاتح بیت المقدس کی سطوت سے لرزہ براندام ہیں - رومتہ الکبریٰ کا عالم طفلی ابھی شباب تک نہیں پہونچا - وہ دن دُور ہے کہ یونان کے دانشمندوں کو غلام بنالے اور دجلہ و فرات پر دُرفش کاویانی سے مقابل ہو - یونان علم و فضل میں گوے سبقت لے گیا لیکن وہ منزل کمال ابھی بہت آگے ہے کہ اُس کا ایک شہزادہ سلطنتِ ایران کو تباہ کرے اور شہنشاہی عالم کی خطرناک ہوس کا شکار ہو-

شریعت زردشت فارس کا قومی مذہب ہے - آگ صرف قبلہ نہیں بلکہ معبودِ برحق ہے - ستارہ پرستی بابل اور اُسکے مقبوضات میں رائج ہے - آفتاب مظہر قدرت نہیں بلکہ قادر مطلق ہے - روما اور یونان کا مذہب عجائب پرستی - عظمت شجاعت، اور سنگین مورتوں کے سامنے سر جھکانا ہے بنی اسرائیل کا مقدس شہر ویران و سنسان ہے اور ملک شام میں توحید کا چراغ جلانے والے ایک عالم جابر کی قید میں گرفتار ہیں -

ہندوستان میں بنارس اور ٹکسلا[1] کی درس گاہیں وید کا سبق پڑھاتی ہیں لیکن ویش-

[1] ٹکسلا قدیم زمانہ میں ایک مشہور شہر تھا - مدت تک پنجاب و کشمیر کا دارالسلطنت رہا - اب اُسکے کھنڈروں کے کچھ نشانات راولپنڈی کے قریب پائے جاتے ہیں - ۱۲

شودر اور اچھوت ذاتوں کے لیے اُن کے دروازے بند ہیں - ویدانت پر عمل موقوف اور کرم کھنڈ کا سکہ رائج ہے - برہمنوں کا فرمان وید کے رسوم سے بالاتر ہے - تمام شمالی ہندوستان ذات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے - نفس کشی اور ریاضت صرف برہمنوں کے لیے مخصوص ہے لیکن اُنکو اس شغل بیکاری کے لیے فرصت نہیں - لڑنا مرنا چھتری کا دھرم ہے لیکن مقصود یہ ہے کہ وہ دشمنوں کو دفع کر کے برہمنوں کو عیش و عشرت سے دل بہلانے کا موقع دیں - ویش سوداگری کریں اور دولت کمائیں تاکہ برہمنوں کو اپنی فیاضی و گہرپاشی سے مالا مال کر سکیں - شودر خدمت کریں اور اونچی ذاتوں کو آرام پہونچائیں تاکہ اگلے جنم میں کسی برہمن یا چھتری کے گھر پیدا ہوں -

ویش و شودر نہ اپنے نیک اعمال سے نجات حاصل کر سکتے ہیں اور نہ اُنکو عبادت و ریاضت کی اجازت ہے - برہمنوں کی شفاعت سے دنیوی فوائد اُنکو مل سکتے ہیں - لیکن سفارش قبول ہونے کے لیے بڑی بڑی قربانیوں کی ضرورت ہے - دیوتاؤں کو راضی کرنے کے لیے ایک بار بنارس میں مچھلی اور گوشت کا سڑکوں پر انبار کیا جاتا ہے اور دیگوں میں شراب بھری جاتی ہے - ایک دفعہ راجگڑھ میں آدھی رات تک قبولیتِ دعا کے لیے تمام خلقت شراب نوشی میں مصروف رہتی ہے - راجہ بنارس کے محل میں سولہ ہزار خوبصورت ناچنے والیاں پرورش پاتی ہیں - پروہتوں کے گھر میں بھیڑ، بکری اور سُوَر ذبح کیے جاتے ہیں - ایک مرتبہ ہاتھی، گھوڑے، سانڈ اور طیور کے علاوہ انسانوں کی بھی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے - تب آسمانی حاکموں کا غصہ فرو ہوتا ہے -

اس عیاشی - خونریزی اور مذہبی تاریکی کے عہد میں بنارس سے ڈیڑھ سو میل شمال کی طرف نیپال کی ترائی میں ایک رحم و انصاف کا اوتار جنم لیتا ہے جو اپنے اثر روحانی وعظ سے قربانی ممنوع قرار دیکر اور ذات کی زنجیریں توڑ کر مذاہبِ عالم کی تاریخ میں ایک زبردست انقلاب پیدا کر دیتا ہے اور جسکی غلامی کو آج شائستہ دُنیا کی آبادی کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ اپنی نجات

لے جاتکا - جلد ۳ - نمبر ۳۱۴ (یہ کتاب سنگھالی زبان سے پالی میں ۱۸۳۰ء میں ترجمہ کی گئی - اور اس کا انگریزی ترجمہ چھ جلدوں میں کیمبرج یونیورسٹی پریس نے شایع کیا ہے - اس کتاب میں ۵۵۰ قصے ہیں - جن میں سے چند کا حوالہ اس مضمون میں دیا گیا ہے - ملاحظہ ہو! جلد ۱ - نمبر ۱۱۳، ۲۲۰، ۱۲۰ و ۳۴۷ و جلد ۴ نمبر ۴۹۵ -

سرمدی کا وسیلہ سمجھتا ہے۔

ہندوستان کے شمالی حصہ میں جو چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں تھیں اُن میں سے ایک کا دارالسلطنت کپل وستو، نیپال کے دامن کوہ میں واقع تھا۔ اس شہر کا رئیس راجہ شدھودن چھتری ذات کی ایک شاخ شاکیہ کا ممبر تھا۔ شرق میں گیارہ میل کے فاصلہ پر کولین ذات کا راج تھا اور وہاں کے راجہ کی دو لڑکیاں راجہ شدھودن کے محل میں تھیں لیکن نعمت اولاد سے اُسوقت تک محروم رہی تھیں۔ خدا کی قدرت سے ۴۵ سال کی عمر میں بڑی رانی کی تقدیر جاگی اور ایک ایسے فرزند کی ماں بننے کا شرف اُسکو حاصل ہوا کہ آج تک "مہا مایا دیوی" کے نام سے وہ خوش نصیب زندہ ہے۔

اُس زمانہ میں عام رواج تھا کہ لڑکیوں کی پہلی اولاد میکے میں ہوا کرتی تھی اور ایام ولادت جب قریب آتے تھے تو بیوی اپنے باپ کے گھر چلی جاتی تھی۔ اسی اصول پر مہا مایا بھی کپل وستو سے اپنے دیس کو روانہ ہوئی۔ راستہ میں لمبنی گاؤں کے قریب ایک باغ میں آسائش کے لیے فروکش تھی کہ یکایک دردِ زہ شروع ہوا اور وہ مولودِ مسعود عالم وجود میں آیا جسکی نورانی برکت اور روحانی عظمت کے سامنے بڑے بڑے متکبر تاجداروں نے سرنیاز خم کیا اور تقریباً تین سو برس کے بعد اُسکے ایک بندۂ بے درم مہاراجہ اشوک نے اس مقدس مقام پر ایک سنگین کتبہ نصب کرایا جو زمانہ حال میں پڑھا گیا اور جس نے ڈھائی ہزار برس کے بعد اُس متبرک زمین کا یقینی نشان دیا جسکو پہلی بار گوتم بودھ کے مبارک قدم چھونے کا شرف حاصل ہوا تھا۔

امتدادِ زمانہ سے ولادت کی صحیح تاریخ مشتبہ ہو گئی تھی حتیٰ کہ ۱۸۵۴ء تک آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ولسن صاحب مہاتما گوتم کو ایک فرضی اور خیالی انسان تصور فرماتے تھے اور محققین اُنکی پیدائش ۶۲۳ قبل مسیح بتاتے تھے لیکن مہاراجہ اشوک کے ایک کتبہ سے یہ بھی پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا کہ مہاتما کا سال ولادت[1] پانچ سو باسٹھ برس قبل مسیح تھا۔

[1] امپیریل گزیٹیر۔ جلد ۲ صفحہ ۴۲، ۴۳، ۵۴ و ۵۵ مطبوعہ ۱۹۰۸ء (اس کتبہ میں درج ہے کہ یہ ۲۵۶ برس بعد وفات گوتم اور ۳۸ سال بعد تخت نشینی اشوک کے نصب کیا گیا۔ اشوک کا سال جلوس ۲۶۴ قبل مسیح معلوم ہے اور گوتم کی عمر مسلمہ طور پر ۸۰ سال کی ہوئی تھی۔ لہذا ۲۵۶ + ۸۰ + ۲۶۴ - ۳۸ = ۵۶۲)

ایک عقیدت کیش سوانح نگار لکھتا ہے کہ "مایا دیوی لمبنی کے باغ میں گلگشت کر رہی تھی یکایک ایک درخت دیوی کو سجدہ کرنے کے لیے جھکا۔ رانی نے ہاتھ بڑھا کر اُسکی ایک شاخ تھام لی اور آسمان کی طرف سر اُٹھا کر دعا میں مصروف ہوئی۔ اُسی وقت مہاتما ظاہر ہوئے۔ راجہ اندرا اور برہما نے اپنی گود میں لیا۔ کنول کا پھول زمین سے اُگا اور اس مقدس مولود کا گہوارہ بنا۔ پانی کے سرد و گرم چشمے صاجزادہ کو غسل دینے کے لیے اُبل پڑے۔ آسمان سے چھتری سایہ کرنے کو نازل ہوئی۔ کل مخلوقات کے اجسام میں مسرت و سرور کی برقی لہر دوڑ گئی۔ تمام عالم خوشبو سے معطر ہو گیا۔ غصہ، نفرت، جہالت، غرور، اور حسد وغیرہ کمینہ خصلتیں ہر شخص کے دل سے دور ہو گئیں اور ہر طرف سے ناچ گانے کی صدائیں آنے لگیں۔"

آج مادہ پرست دنیا کہے گی کہ یہ شاعرانہ خیالات ہیں یا محبت کے متوالے کی بڑ۔ بانیان مذہب کی ولادت کے متعلق خوش عقیدہ پیرو ایسے ہی قصے بنا لیا کرتے ہیں۔ لیکن مورخ دیکھتا ہے کہ اس روایت سے بھی گوتم کی ولادت بمقام لمبنی باغ واقع ہونے کی تائید ہوتی ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ ایام معہود سے کچھ پیشتر یہ واقعہ ظہور میں آیا تھا جبکہ رانی نہ اپنے باپ کے گھر تک پہونچ چکی تھی اور نہ اپنے شوہر کے محل میں تھی۔

کپل واستو میں یہ خوشخبری پہونچی تو راجہ کی مسرت کی کوئی حد نہ رہی لیکن شادی و غم چولی دامن کی طرح ساتھ ساتھ ہیں۔ جہاں نقارے بجتے ہیں وہاں ماتم بھی ہوتا ہے۔ ساتویں دن مایا دیوی کا انتقال ہو گیا اور مجلس نشاط کی جگہ صف ماتم بچھ گئی۔

ہندوستان میں اُس وقت علم نجوم کا بہت زور تھا۔ کسی پنڈت نے ستاروں کی چال سے نتیجہ نکالا کہ یہ لڑکا ایک دن زندگی کی مصیبتیں دیکھ کر تارک الدنیا ہو جائیگا اور جنگل میں قیام اختیار کرے گا۔ راجہ اس خبر سے بہت آزردہ ہوا اور نیت کی کہ اپنے عزیز بیٹے کو اس طرح پردہ میں رکھے کہ دنیا کی کوئی تکلیف اور پریشانی اُسکے سامنے نہ آئے۔ اور جوگ اختیار کرنے کی رغبت نہ پیدا ہو۔ مہربان باپ محبت کی ترنگ میں بھول گیا کہ پیشانی کی تحریر مٹ نہیں سکتی۔ جو ہونی ہے وہ ہو کر رہے گی اور اُسکو ٹالنے کی کوئی تدبیر نہیں! دانشمند نجومیوں سے آیندہ کی خبر دریافت کرنے کو اسی لیے منع کرتے ہیں کہ اگر اُن کا قول صحیح بھی ہو اور حسب نتیجہ پر وہ اپنے قواعد کے مطابق پہونچے ہیں

واقعی ظہور میں بھی آئے تو اُسکی بُرائیاں دُور کرنے کی کوئی ترکیب نہیں۔!!

بہر حال۔ گوتم کی پرورش اُسکی خالہ پراج پتی کے زیر نگرانی راج محل کے اندر کی گئی اور سوائے چند خاص خادموں کے کسی کو شہزادہ کے دیدار کی اجازت نہ تھی۔

ابتدائی تعلیم و تربیت کیونکر ہوئی اور علوم و فنون کا باقاعدہ درس دیا گیا یا نہیں۔ اس وقت تک ثابت نہیں ہو سکا۔ عقیدتمندوں کو تو اس عنوان پر کچھ تحریر کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ کیونکہ اُنکے خیال کے مطابق مہاتما اس دنیا میں تشریف لانے سے قبل تمام علوم میں درجۂ کمال حاصل کر چکے تھے۔ اور اپنی خوشی سے راجہ شدھودن کے گھر رونق افروز ہوئے تھے لیکن ظاہربین تعجب کریں گے کہ قصرِ شاہی کے اندر شہزادہ کو فنون سپہ گری میں اس قدر دستگاہ کیونکر حاصل ہوئی کہ عنفوان شباب کے وقت جب کپل واستو کی رعایا نے شکایت کی کہ ہمارا راج کمار ضروری فنون حرب سے بیگانہ رکھا جاتا ہے، تو دشمنوں کے حملہ سے ہم کو کس طرح بچائے گا۔ تو شہزادہ نے سرکاری احاطہ کے اندر شورش کرنے والوں کو شہسواری اور تیراندازی کے وہ جوہر دکھلائے کہ سب عش عش کرنے لگے۔ اور اعتراضات کی زبان ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ اور یہ بھی حیرت ہو گی کہ سنسکرت کے ادب میں گوتم نے اس قدر استعداد کیسے حاصل کی کہ ترکِ دنیا کا عہد کرنے کے بعد ہی مگدھ کے پنڈتوں سے فلسفہ کا درس لینے لگے۔

اگر نوعمری میں گوتم کو باقاعدہ تعلیم نہیں دی گئی تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اُنکے والدین ایسے عالم و فاضل تھے کہ اُنکی شرفِ صحبت سے تمام ضروری علوم و فنون شہزادہ کو بغیر کسی معلم کی مدد کے حاصل ہو گئے اور یہی زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

القصہ جب شاہزادہ کی عمر ۱۸ یا ۱۹ سال کی ہوئی تو راجہ شدھودن نے اپنے فرزند کو شادی کی بیڑی پہنانا چاہی تاکہ دنیا سے تعلق قائم رکھنے کی زنجیروں میں ایک اور کڑی کا اضافہ ہو جائے۔

گرد و نواح میں چھتریوں کے جو خاندان بستے تھے اور جن سے شاکیہ قوم شادی بیاہ کر سکتی تھی اُنکی کنواری لڑکیاں اور ناکتخدا بہنیں ایک تقریب کے حیلہ سے کپل واستو کے شاہی محل میں جمع کی گئیں اور راجکمار کی تحریک پر اُسکو اختیار دیا گیا کہ اس مجمعِ خاص میں سے اپنے لیے

ایک شادی وغم کا رفیق انتخاب کرلے۔

یہ نازنینیں اور انکے عزیز رشتہ دار کئی دن راجہ کے مہمان رہے لیکن گوتم نے نہ تو ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دی اور نہ یہ ظاہر ہونے دیا کہ اُنکے جمع کرنے کا مقصود شہزادہ کے لیے دولھن تجویز کرنا ہے۔

تقریب ختم ہوئی تو گوتم نے دستور کے مطابق ہر ایک مہمان کو رخصت کرتے وقت اپنے ہاتھ سے نشانی تقسیم کی۔ کسی کو زیور دیا کسی کو جواہر، کسی کو موتیوں کا ہار اور کسی کو سونے چاندی کے بیش قیمت تحفے۔ مگر جب بےمثال جسودھرا کی باری آئی جو اُسکے ماموں کی لڑکی تھی تو اُسکو کوئی قیمتی یادگار نہیں دی۔ صرف ایک پھول نذر کیا اور الوداع کہا۔

حاضرین مجلس کچھ نہ سمجھے، مگر دوسرے روز راجہ شدھودن نے کولین راجہ کے پاس اپنے لڑکے کی نسبت کا پیام بھیجا تو معلوم ہوا کہ روشن ضمیر جسودھرا کو اس خواستگاری کا پہلے ہی سے یقین تھا۔

میانِ عاشق و معشوق رمزیست   کراماً کاتبیں را ہم خبر نیست

نجوم کا معتقد راجہ۔ گوتم کو قصر شاہی سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا اس لیے راج کماری کا ڈولا کپل واستو آیا، اور مراسم ضروری ہیں بجا لائے گئے۔

شادی ہوئی تو گوتم وجسودھرا اپنے وقت کے سری کرشن اور رادھا بن گئے۔ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں غرق اور دنیا کی تمام فکروں سے بےخبر تھے!!

اسی عشرت و کامرانی میں دن، ہفتے، مہینے، بلکہ دس سال گذر گئے۔ اور نہ راجہ اندر اپنے اکھاڑے سے باہر نکلے نہ دنیوی زندگی کا کوئی عبرتناک منظر اُنکے سامنے آیا۔

بیسویں صدی کی آزادی اور مطلق العنانی کی گرم بازاری میں مشکل سے یقین آتا ہے کہ گوتم ۲۹ سال کی عمر تک راج محل کی چاردیواری میں کیونکر قید رکھا گیا۔ لیکن ابھی کل کی بات ہے کہ قسطنطنیہ کے ترکی شہزادے تخت نشینی کی ساعت تک قصر سلطانی میں محبوس رکھے جاتے تھے اور بیشتر اسی تنہائی میں بوڑھے ہوکر مرجاتے تھے لیکن سرکاری احاطہ کے باہر قدم نہیں نکال سکتے تھے۔ بودھ کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ ۲۹ سال کی عمر تک شاہزادہ راج محل سے باہر نہیں نکلا۔ اور اس

روایت پر اعتماد نہ کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔

بالآخر کارکنانِ قضا و قدر نے جو مبارک ساعت گوتم کی زندگی میں حیرت انگیز تغیر پیدا کرنے کی مقرر کی تھی وہ آگئی اور راجہ شدھودن کی کُل دوراندیشیاں بیکار ثابت ہوئیں۔

برسات کا موسم تھا اور جیبودھرا کی طبیعت کچھ سست تھی۔ راجکمار کا دل بیٹھے بیٹھے گھبرایا۔ سیر کرنے کو گاڑی تیار کرائی اور رتھ بان کو حکم دیا کہ سواری شہر کی طرف لے چلے۔ قلعۂ شاہی سے باہر قدم نکالنا راجہ شدھودن کے مروّج احکام کے خلاف تھا لیکن رتھ بان کے دل کی ... کے ہاتھ میں تھی۔ راجکمار کو آزردہ کرنے کی اُسے ہمت نہ ہوئی اور بادبہاری شہر کی طرف چلی۔

بازار کے قریب پہنچے تو ایک نہایت ضعیف بڈھا نظر آیا جسکی کمر جھکی ہوئی تھی، بال سفید تھے، ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا اور دو قدم چلنے سے بھی اُسکی سانس پھولتی تھی۔ راجکمار کو اُسکی حالت دیکھکر ترس آیا۔ گاڑی رکوائی اور بڈھے کی دلجوئی کرنے لگا۔ رتھ بان نے کہا کہ اس شخص کی ضعیفی اور کمزوری ... حیرت نہیں۔ یہ وقت تو ہر انسان پر گذرتا ہے جو پوری عمر تک زندہ رہے۔ شہزادہ نے تعجب سے پوچھا کہ کیا ہمارا تن بھی کسی وقت ایسے ہی کمزور ہو جائیں گے؟ رتھ بان نے کہا کہ ضرور، بلکہ حضور بھی! شہزادہ خاموش رہ گیا۔ اُسکے دل پر پہلی چوٹ لگی۔ اور گاڑی آگے بڑھانے کا اشارہ کیا۔ سواری چند قدم گئی تھی کہ ایک بیمار ملا جو سفید داغ یا کوڑھ کی بیماری میں (باختلافِ روایات) مبتلا تھا۔ اُسکی خوفناک صورت اور قابلِ رحم بیکسی دیکھکر شہزادہ نے مریض کو اپنے پاس بلایا۔ رتھ بان نے گزارش کی کہ حضور اُسکے بدن پر ہاتھ نہ لگائیں ورنہ اندیشہ ہے کہ اس مرض متعدی سے دشمنوں کو گزند پہونچے۔ شہزادہ نے حسرت اور حیرت سے دریافت کیا کہ اس غریب کو ایسی سخت تکلیف کیوں ہے؟ جواب ملا کہ یہ اُسکے کرموں کا پھل ہے۔ دُکھ اور بیماری ہر آدمی کے ساتھ ہے۔ پوچھا کہ شہر میں کوئی اور بھی بیمار ہے؟ جواب سنا کہ دنیا میں بیماروں کی تعداد بہت ہے اور ایسے آدمی تو کم ہوں گے جنکو کبھی کوئی آزار نہ ہوا ہو۔ یہ دوسری چوٹ تھی جو شہزادے کے نازک دل پر لگی۔ اور سواری آگے بڑھی۔

یکایک ایک مجمع نظر آیا۔ چار آدمی اپنے کاندھوں پر نعش لیے جا رہے ہیں اور اُنکے پیچھے پیچھے بہت سے لوگ روتے جاتے ہیں۔ شہزادہ کو تعجب ہوا۔ دریافت کیا کہ کاندھوں پر کپڑے سے ڈھکی ہوئی

کیا چیز ہے ؟ اور اس جماعت کے رونے کا کیا سبب ہے ۔ رتھ بان عرض پرداز ہوا کہ کوئی مرگیا ہے اس کی لاش اول منزل لیے جاتے ہیں ۔ اور اُسکے عزیز روتے ہیں ۔ شہزادہ نے ابھی تک موت کا نام نہ سنا تھا متحیر ہوا کہ "مرنا" کیا ہوتا ہے ۔ اور اس پر رونے کی کیا وجہ ہے ؟ خادم نے سمجھایا کہ دنیا میں جو ذی روح پیدا ہوتا ہے وہ ایک دن مرتا ہے ۔ اور سب رشتہ داروں کو چھوڑکر اکیلا اُسی عالم کو واپس جاتا ہے جہاں سے آیا تھا ۔ دنیا والے جو اس سے محبت رکھتے تھے یا اُس سے نفع پاتے تھے روتے دھوتے ہیں اسلیے کہ اب دوبارہ اُسکے دیکھنے کی آس نہیں ۔ یہ وہ جدائی ہے جسکے بعد وصال نہیں ۔ وہ سفر ہے جسکے بعد واپسی نہیں ۔ وہ غربت ہے جس میں کوئی ساتھ نہیں دے سکتا ۔ وہ بوجھ ہے جسکو کوئی ہلکا نہیں کرسکتا ۔ وہ غم ہے جسکی کوئی تسلی نہیں اور وہ مصیبت ہے جس کا کوئی چارہ نہیں ۔ !!

یہ چوٹ بہت سخت تھی ۔ شہزادہ اس غم کی تاب نہ لاسکا اور سوچنے لگا کہ جب اس عالم کو ایک دن چھوڑنا ہے تو دُنیا والوں سے محبت کرنا ہی بیکار ہے ۔

خدا کی شان ! اُسی وقت ایک جوگی سامنے آیا جو باوجود سن رسیدہ ہونے کے کمزور نہ تھا ۔ آنکھوں سے بجلیاں کوندتی تھیں اور چہرہ پر نور برستا تھا ۔ شہزادہ نے سوال کیا کہ اس آدمی پر بیماری اور بوڑھاپے کا کیوں اثر نہیں ہے ؟ رتھ بان نے کہا کہ یہ فقیر ہے اس نے دنیا سے قطع تعلق کرلیا ہے لھذا نہ اسکو موت کا غم ہے نہ بیماری کا دکھ ۔ یہ مرتے دم تک ایسا ہی خوش اور مضبوط بنا رہے گا ۔

اس گفتگو میں گاڑی ندی تک پہونچ چکی تھی ۔ شہزادہ سواری سے اُترا ۔ دریا میں غسل کیا ۔ اور دل میں یہ خیال پختہ کرنے لگا کہ دنیا مصائب کا گھر ہے اسکو چھوڑ دینا چاہیے ۔ کئی گھنٹے اسی غور و فکر میں مصروف رہا ۔ صبح سے دوپہر ہوئی اور وہ بھی ڈھل گئی ۔ تیسرے پہر کو واپسی کے لیے سواری منگائی ۔ جس وقت گاڑی پر قدم رکھ رہا تھا راج محل سے ایک قاصد یہ نوید مسرت لایا کہ شکودھے محل میں فرزند ارجمند پیدا ہوا ۔ راجکمار نے کہا کہ "یہ ایک نئی اور مضبوط زنجیر ہے جو مجھکو توڑنا پڑیگی ۔"

جب محل کے قریب پہونچا تو ہر طرف مبارک سلامت کی دھوم تھی ۔ اعزہ اور خدام تہنیت کے لیے آئے ۔ راجکمار کی ایک رشتہ دار لڑکی نے شادیانہ کا گیت گایا اور اُسکی خوش گلوئی کا